



فضل محمد رضا
عقروانا

بانی المعطول والفتول اساتذہ العزیز جامعہ العلوم الاسلامیہ
دارالحدیث - فٹ پوری ماہانہ کراچی

ناشر

المکتبۃ العربیۃ

0331-3788677, 0300-9268449

Email : mustaqbilwani@yahoo.com

تَوْضِیْحَاتُ

اُردو شرح

مَشْكُوتُ الْمَصَالِحِ

مقن و ترجمہ، تشریح و توضیح کے ساتھ

تألیف

مولانا فضل محمد رؤیف رزوی

امتان حبیبیت جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

ناشر: المکتبۃ العشرینیہ

0092-21-35470973

0321-3788955

حکومت پاکستان کالی راسٹ کے تحت

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

رجسٹرڈ نمبر (20554)

کتاب کا نام : توضیحات شرح مشکوٰۃ (جلد اول)

مصنف : استاذ الحدیث حضرت مولانا فضل محمد صاحب یوسف زئی مدظلہ

سن اشاعت : 2011ء

تعداد صفحات : (736)



(0315-3788955)

(021-35470973)

(0321-3788955)



ناشر

ملنے کے لیے

مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

دارالکتاب اردو بازار لاہور

مکتبہ ظیل اردو بازار لاہور

مکتبہ الحرمین اردو بازار لاہور

وحیدی کتب خانہ پشاور

مکتبہ علمیہ اکوڑہ خٹک

مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی

کتب خانہ اشرفیہ اردو بازار کراچی

مکتبہ انعامیہ، اردو بازار کراچی

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ القرآن، بنوری ٹاؤن کراچی

کتب خانہ مظہری، بکشن اقبال کراچی

بیت الاشاعت، بہار کالونی، کراچی

نَصْرَ اللَّهِ أَمْرًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا
وَوَعَاَهَا وَأَدَّاهَا (الحديث طبرانی)

انتساب

میں اپنی اس محنت شاقہ کو اپنی مادر علمی اور عالمی مرکز علمی
جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کی طرف منسوب کرتا ہوں

جس کے سایہٴ حفاظت میں

بندۂ حق حضرت اقدس حضرت مولانا محمد یوسف بنوری
اور صدر مدرس حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد ستوائی رحمۃ اللہ علیہ

آحادیث مقدسہ کی سند حاصل کی
رضی اللہ عنہما

روزِ شہر کے باغیچہ دار و توشہ
من نیز حاضر می‌شوم "توضیح" کتب کوۃ در بغل



وَمِنْ مَّذْهَبِي حُبُّ النَّبِيِّ وَكَلَامِهِ
وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ



كَمْ شُكْوَةٍ فِيهَا مُصْبَاحٌ
الْمُصْبَاحُ فِي رُجَا جَةٍ
الرُّجَا جَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ

فہرست مضامین

توضیحات شرح مشکوٰۃ (جلد اول)

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۸	سند حدیث		فہرست مضامین
۳۸	فراغت و تدریس	۲۳	مقدمہ در مصطلحات حدیث از شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ
۳۹	مکہ مکرمہ میں شرح کی ابتداء	۲۵	فصل اول سند کے بیان میں
۴۰	مدینہ منورہ مسجد نبوی میں شرح کی ابتداء	۲۷	فصل دوم روایت بالمعنی کے بیان میں
۴۱	کچھ اس شرح کے متعلق	۲۸	فصل سوم
۴۲	علماء، طلباء اور مدارس کا ثبوت	۲۹	فصل چہارم اقسام الحدیث کے بیان میں
۴۵	مدارس کا تاریخی پس منظر	۳۰	فصل پنجم وجوہ طعن کے بیان میں
۴۶	ترقی کے بعد زوال	۳۱	فصل ششم
۴۶	صحة النية في العلم	۳۲	فصل ہفتم تعداد رواۃ کے بیان میں
۴۸	جہد العلم	۳۲	فصل ہشتم
۵۲	ادب العلم	۳۳	فصل نہم
۵۳	العمل بالعلم	۳۳	فصل دہم
۵۵	طبقات المحدثین بحسب تدوینہم	۳۴	فصل یازدہم مراتب کتب کے بیان میں
۵۵	دوسری صدی کی تصنیفات	۳۵	فصل دوازدہم
۵۶	تیسری صدی کی تصنیفات	۳۶	فصل سیزدہم
۵۶	چوتھی صدی کی تصنیفات	۳۷	عرض حال
۵۶	پانچویں صدی کی تصنیفات		

۷۰	حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا صحیفہ	۵۶	مراتب کتب حدیث
۷۱	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ	۵۷	حدیث کی تعریف
۷۱	حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کا صحیفہ	۵۸	علم الحدیث روایت کی تعریف
۷۱	صحیفہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	۵۸	علم الحدیث حدیث کی تعریف
۷۱	صحیفہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	۵۹	حدیث، خبر، اثر اور سنت میں فرق
۷۱	صحیفہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ	۵۹	انبیاء، اُخودنا اور حدیث میں فرق
۷۲	صحیفہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ	۶۰	چند اصطلاحی الفاظ
۷۲	صحیفہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ	۶۰	شرائط اخذ حدیث
۷۲	صحیفہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ	۶۱	علم حدیث اور محدثین کی فضیلت
۷۲	صحیفہ ابو شاہ یمنی رضی اللہ عنہ	۶۲	حدیث کی اقسام و تعریفات
۷۲	عام صحابہ کرام کے نوشتے	۶۲	تواتر کی قسمیں
۷۳	صاحب مضامین	۶۲	خبر واحد کی پہلی تقسیم
۷۳	نام و نسب	۶۲	خبر واحد کی دوسری تقسیم
۷۳	تحصیل علم	۶۳	خبر واحد کی تیسری تقسیم
۷۳	زہد و تقویٰ	۶۳	خبر واحد کی چوتھی تقسیم
۷۵	محی السنۃ لقب کی وجہ	۶۳	خبر واحد کی پانچویں تقسیم
۷۵	تصانیف	۶۵	اقسام کتب الحدیث
۷۵	صاحب مشکوٰۃ	۶۶	مسائل محدثین
۷۵	نام و نسب	۶۷	حجیت حدیث
۷۶	تصانیف	۶۷	دلائل
۷۶	طرز تالیف	۶۸	منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات

۱۰۹	اخلاص نیت والی حدیث کی توضیح	۷۷	احادیث مشکوٰۃ کی تعداد
۱۰۹	اس حدیث کی شان	۷۷	مشکوٰۃ شریف کی وجہ تالیف
۱۱۰	شان ورود حدیث	۷۸	مشکوٰۃ شریف کی شروحات
۱۱۰	یہ حدیث غریب ہے	۸۰	بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بحث
۱۱۱	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	۸۱	حضرت شاہ انور شاہ کی تحقیق
۱۱۱	اجما کی تحقیق	۸۱	ایک عام توجیہ
۱۱۱	الاعمال کی تحقیق	۸۲	بسم اللہ میں تین ناموں کی تخصیص کیوں؟
۱۱۱	ہالنیات میں باء کا متعلق کیا ہے؟	۸۲	بسم اللہ کا متعلق کیا ہے
۱۱۳	فقہاء کا اختلاف	۸۳	بسم اللہ کی فضیلت، حکایات
۱۱۳	مفسرین کا اختلاف	۸۵	لفظ اللہ جل جلالہ
۱۱۵	مقدور کا لئے پر جانین سے اعتراض	۸۶	اس مبارک اسم کی خصوصیات
۱۱۶	دونوں جملوں میں ربط	۸۷	خطبہ کتاب
۱۲۰	کتاب الایمان	۹۲	رسول اور نبی میں فرق
۱۲۱	کتاب، باب اور فصل کی تعریفات	۱۰۵	قواعد متفرقہ
۱۲۱	ایمان کی لغوی تحقیق	۱۰۵	قواعد ہمزہ ابن
۱۲۱	ایمان کی شرعی اصطلاحی تعریفات	۱۰۶	محمد بن یزید ابن ماجہ رحمہ اللہ
۱۲۳	کفر کی حقیقت و اقسام	۱۰۶	الجمع بین الصحیحین للحمیدی
۱۲۳	کفر انکار	۱۰۷	جامع الاصول
۱۲۳	کفر جھوٹ	۱۰۷	محدث شہیر ابو الحسن رزین بن معاویہ رحمہ اللہ
۱۲۳	کفر عناد و معاندہ	۱۰۷	الہراء البغوی
۱۲۳	کفر نفاق	۱۰۸	مذکورہ اسم کی سن وفات

۱۳۹	ایمان میں استثناء کا حکم	۱۲۴	اعتراض (۱) و جواب
۱۳۹	محل ایمان	۱۲۵	اعتراض (۲)
۱۴۰	حدیث جبرائیل	۱۲۵	جواب
۱۵۱	علامات قیامت	۱۲۸	ایمان کی حقیقت میں مشہور مذاہب
۱۵۴	فوائد حدیث جبرائیل برائے طلباء دین	۱۲۸	معتزلہ کا مذہب
۱۵۵	ایمان کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے	۱۲۹	خوارج کا مذہب
۱۵۷	ارکان خمسہ میں ترتیب	۱۲۹	جہمیہ کا مذہب
۱۵۸	ایمان کی شاخیں	۱۳۰	مروجہ کا مذہب
۱۵۹	حیاء کی تعریف اور قسمیں	۱۳۰	کرامیہ کا مذہب
۱۶۱	مومن اور مسلم کا مفہوم	۱۳۱	مذہب احناف وغیرہم
۱۶۴	حضور اکرم ﷺ سے محبت کے درجات	۱۳۱	مذہب شوافع وغیرہم
۱۶۵	اقسام محبت	۱۳۱	ایمان بیٹھ ہے یا مرکب
۱۶۸	اسباب محبت جمال، کمال، نوال	۱۳۲	احناف کے دلائل
۱۷۰	ایمان کی لذت کا حصول	۱۳۳	شوافع کے دلائل
۱۷۲	ایمان کا لطف کب حاصل ہوتا ہے	۱۳۳	خلاصہ بحث
۱۷۴	اسلام ہی مدار نجات ہے	۱۳۵	ایمان میں زیادت و نقصان کی بحث
۱۷۵	دو ہرا اجر پانے والے	۱۳۶	محدثین کو احناف اور متکلمین کا جواب
۱۷۸	دین کے غلبہ تک کفار سے جنگ کا حکم	۱۳۶	ایمان و اسلام میں نسبت کی بحث
۱۷۹	تبارک صلوٰۃ کا حکم	۱۳۷	تراویح کی مثالیں
۱۸۱	مطلب حدیث	۱۳۷	تباہین و تضاد کی مثالیں
۱۸۱	ترتیب احکام	۱۳۸	ایمان و اسلام میں تداعل

۲۱۳	ایمان پر خاتمہ جنت کی ضمانت ہے	۱۸۱	عجیب مناظرہ
۲۱۷	مدار نجات کیا ہے؟	۱۸۱	محفوظ مسلمان کون ہوتا ہے؟
۲۱۸	جکایات	۱۸۳	جنت میں لے جانے والے اعمال
۲۱۹	قبول: امام سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں	۱۸۵	ایمان پر استقامت
۲۲۱	سابقہ گناہ مٹنے کا ضابطہ اور علماء کی آراء	۱۸۶	استقامت کا مفہوم
۲۲۲	علامہ طیبی رحمہ اللہ کی تحقیق	۱۸۶	فرائض اسلام
۲۲۳	ارکان دین اور جہاد	۱۸۹	شروع نوافل کا حکم
۲۲۸	ایمان کامل کیا ہے؟	۱۹۰	حدیث وفد عبد القیس
۲۲۹	سب سے افضل عمل کیا ہے؟	۱۹۱	وفد عبد القیس کب مدینہ آیا تھا؟
۲۲۹	سچا مومن کون اور جہاد کا مفہوم کیا ہے؟	۱۹۲	وفد عبد القیس کی آمد کا سبب
۲۳۲	دیانت اور ایقانے عہد کی اہمیت	۱۹۶	اسلام کے احکامات
۲۳۳	ابدی نجات کی ضمانت	۱۹۷	بیعت کی بحث
۲۳۳	توحید کی اہمیت	۱۹۸	عرب میں قتل اولاد کا فلسفہ
۲۳۴	جنت اور دوزخ کو واجب کرنے والی باتیں	۲۰۰	حدود کفارات ہیں یا اجرات؟
۲۳۴	جنت کی بشارت	۲۰۱	عورتوں کیلئے آنحضرت ﷺ کا فرمان
۲۳۹	جنت کی گنجی	۲۰۵	انسان کو سرکشی زیب نہیں دیتی
۲۴۰	کلمہ توحید نجات کا ذریعہ ہے	۲۰۷	زمانے کو برامت کہو
۲۴۳	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کچھ تذکرہ	۲۰۸	اللہ تعالیٰ کا صبر تحمل
۲۴۴	پوری دنیا میں اسلام کے غلبے کی پیش گوئی	۲۰۹	توحید کی اہمیت
۲۴۵	کلمہ توحید کے ساتھ نیک اعمال کی ضرورت	۲۱۰	حق العبد علی اللہ کی بحث
۲۴۶	ایک نیکی کا ثواب سات سو تک بڑھ سکتا ہے	۲۱۲	دوزخ سے رہائی کا سبب توحید ہے

۲۷۱	نود و اٹھ احکام سے متعلق یہود کا سوال	۲۳۷	ایمان کی علامت
۲۷۳	تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں	۲۳۷	ایمان اور اسلام کا تعارف
۲۷۵	ارتکابِ زنا کے وقت ایمان باہر آ جاتا ہے	۲۵۰	خلقِ حسن کی تعریف
۲۷۶	حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دس باتوں کی وصیت	۲۵۲	ایمان و اسلام پر مرنے والا جنتی ہے
۲۷۸	اب یا کفر یا ایمان ہے	۲۵۳	افضل ایمان کون سا ہے؟
۲۷۹	باب فی الوسوسة	۲۵۴	تحفہ لا الہ الا اللہ
۲۸۰	وسوسوں کی معافی	۲۵۵	باب الکبائر
۲۸۱	دوسرے آثارِ مکمل ایمان ہے		وعلامات العناق
۲۸۲	شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ مانگو	۲۵۵	صغیرہ و کبیرہ کی تقسیم
۲۸۲	وسوسوں دفع کرنے کا وظیفہ	۲۵۵	صغیرہ و کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف
۲۸۳	ہر انسان کے ساتھ جن اور فرشتہ مقرر ہے	۲۵۷	سب سے بڑے گناہ
۲۸۳	شیطان انسان کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے	۲۶۰	چار بڑے گناہ
۲۸۳	شیطان بچوں کی پیدائش کے وقت کچھ کے لگاتا ہے	۲۶۱	سات مہلکات سے بچو
۲۸۵	گھبراہٹ بھانہ کرنا شیطان کا پسندیدہ عمل ہے	۲۶۲	شرک کی تعریف
۲۸۶	جزیرہ عرب سے شیطان مایوس ہو گیا	۲۶۳	جادو کی تعریف و اقسام
۲۸۷	وسوسہ سے پریشان نہ ہوں	۲۶۳	سحر و سحر کا حکم
۲۸۸	اپنے اندر نیکی کی تحریک پر اللہ کا شکر ادا کرو	۲۶۴	وہ بدترین گناہ جن کے ارتکاب سے ایمان جاتا ہے
۲۹۰	شیطانی وسوسوں سے بچنے کے تین طریقے	۲۶۷	منافق کی علامتیں
۲۹۰	شیطانی وسوسوں سے چوکنا رہو	۲۶۹	منافق بنانے والی چار باتیں
۲۹۱	نماز کے دوران شیطان کی دخل اندازی	۲۶۹	منافق کی مثال
۲۹۲	دوسرے کا خیال نہ کرو نماز پڑھو	۲۷۰	تحریک اسلام کی ابتداء

۳۱۰	بدکاری کے مراتب	۲۹۳	خلاصہ
۳۱۱	نوشتہ تقدیر واقعات کے ظہور سے پہلے ہے	۲۹۴	باب الایمان بالتقدیر
۳۱۲	تقدیر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا	۲۹۴	تقدیر کا مفہوم
۳۱۳	انسان ہر وقت خطرہ میں ہے	۲۹۴	تقدیر پر ایمان کا مطلب
۳۱۴	ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے	۲۹۵	تقدیر کیا چیز ہے؟
۳۱۷	سوجانا اللہ کے شایان شان نہیں	۲۹۵	منکرین تقدیر کا فتنہ کب سے شروع ہوا؟
۳۱۸	اللہ کے جُود کے خزانے بھرے ہوئے ہیں	۲۹۶	تقدیر و قضاء میں کیا فرق ہے؟
۳۱۹	مشرکین کی اولاد کہاں ہوگی؟	۲۹۶	مسئلہ تقدیر میں مختلف مذاہب
۳۱۹	اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا	۲۹۷	جبریہ کا مذہب
۳۲۰	انسان کی ابتداء آفرینش کا قصہ	۲۹۷	اختیار کس طرح ہے؟
۳۲۳	تقدیر کے دو مکتوب	۲۹۸	معتزلہ قدریہ کا مذہب
۳۲۵	دوا اور علاج بھی تقدیر کے تحت ہے	۲۹۹	دلچسپ مکالمہ
۳۲۶	تقدیر میں بحث نہ کرو	۳۰۰	شرکی تخلیق میں حکمت
۳۲۷	انسان میں مٹی کی صفات نمایاں ہیں	۳۰۱	تنبیہ
۳۲۸	اب نور ہدایت صرف اسلام میں ہے	۳۰۱	کائنات کی تخلیق سے پہلے تقدیر لکھی گئی
۳۲۸	انسان ہر وقت خطرہ میں ہے	۳۰۲	ہر چیز تقدیر کے تحت ہے
۳۲۹	چار چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے	۳۰۳	تقدیر میں دونوں کی بحث
۳۳۰	قدریہ جبریہ کون ہیں	۳۰۵	تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے
۳۳۲	تقدیر کے منکرین کو سزا	۳۰۷	خاتمہ کا اعتبار ہے
۳۳۲	اس امت کے مجوس	۳۰۸	کسی پر یقینی حکم نہیں لگانا چاہیے
۳۳۳	اہل باطل سے میل جول نہ رکھو	۳۰۹	جنت و دوزخ میں ہر ایک کا ٹھکانہ لکھا گیا ہے

۳۵۱	اہل حق کے دلائل	۳۳۳	چھ قسم کے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے
۳۵۲	منکرین عذاب قبر کے شبہات اور ان کے جوابات	۳۳۵	جہاں موت آئے گی انسان وہاں جائے گا
۳۵۳	گلہ شہادت سے قبر میں استقامت ملتی ہے	۳۳۵	قوت شدہ چھوٹے بچے کا حکم
۳۵۵	مردے جو توں کی آہٹ سنتے ہیں	۳۳۶	اپنے بچے کو قتل کرنے والی ماں کی سزا
۳۵۷	مردے کو اپنا ٹھکانہ نظر آتا ہے	۳۳۶	پانچ چیزوں کا فیصلہ ہو چکا ہے
۳۵۷	قبر کا عذاب حق ہے	۳۳۷	تقدیر میں گفتگو نہ کرو
۳۵۸	عذاب قبر کا مشاہدہ	۳۳۷	وہی ہو گا جو تقدیر میں لکھا ہے
۳۵۹	قبر میں منکر نکیر کا سوال	۳۳۹	منکرین تقدیر پر پتھر برسیں گے
۳۶۱	قبر میں سوال و جواب	۳۴۰	اپنے بچوں کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سوال
۳۶۳	قبرستان رونے کی جگہ ہے	۳۴۱	حضرت آدم نے حضرت داؤد کو اپنی کچھ عمر دیدی
۳۶۴	تدفین کے بعد دعا کا ثبوت	۳۴۳	نکتہ
۳۶۵	قبر میں ۱۹۹ اثر دھے	۳۴۳	حضرت آدم کی اولاد
۳۶۶	قبر کا ٹنگ ہو جانا	۳۴۴	تقدیر کے معاملہ میں خوف رکھنا چاہیے
۳۶۷	قبر کا فتور و جال کے فتنے کے برابر ہے	۳۴۴	مطلب
۳۶۷	قبر میں نماز پڑھنے کی خواہش	۳۴۵	عہد الست کا قصہ
۳۶۸	احوال قبر	۳۴۶	غریب و مالدار کیوں؟ اقرار کے بعد انکار کیوں؟
۳۷۰	سماع موتی کا مسئلہ	۳۴۷	جیل گرد و جبلت نہ گرد
۳۷۱	طرفین کے دلائل	۳۴۹	باب اثبات عذاب القبر
۳۷۲	ایک دوسرے کو جوابات	۳۵۰	عالم برزخ کی مثال
۳۷۳	غلط نتیجہ	۳۵۰	قبر میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق
۳۷۴	دوسرا غلط نتیجہ	۳۵۰	عذاب قبر کی کیفیت میں اختلاف

۳۹۷	وقت گزرنے کے ساتھ دجال لوگ پیدا ہوں گے	۳۷۳	بحث سماع موتی کا خلاصہ
۳۹۸	ہدایت یا گمراہی کی طرف بلانے والے کا حکم	۳۷۶	باب الاعتصام
۳۹۹	اسلام کو گناہم لوگ اپناتے ہیں		بالکتاب والسنة
۳۹۹	آخرت میں اسلام مدینہ میں پناہ لے گا	۳۷۷	دین میں نئی بات نکالنا بدعت ہے
۴۰۰	حضور اکرم ﷺ کی مثال	۳۷۷	بدعت کی تعریف اور اس کی شناخت
۴۰۱	منکرین حدیث کی تردید	۳۷۹	ہر بدعت گمراہی ہے
۴۰۲	قرآن کی طرح احادیث بھی واجب العمل ہیں	۳۸۰	سب سے زیادہ بغض لوگ
۴۰۳	بھرے پیٹ والے غافل لوگ	۳۸۱	فرشتوں نے حضور ﷺ کی حیثیت کو واضح کر دیا
۴۰۵	ہر بدعت گمراہی ہے	۳۸۳	عمل میں اپنے نبی سے آگے نہ بڑھو
۴۰۶	سنت کی روشن شاہراہ پر چلو	۳۸۵	عصمت انبیاء کرام کا مسئلہ
۴۰۷	دین اطاعت کا نام ہے	۳۸۶	حضور اکرم ﷺ کی اطاعت میں کامیابی ہے
۴۰۸	سنت زندہ کرنے کا ثواب	۳۸۶	تاہیر نخل میں آنحضرت ﷺ کا ایک حکم
۴۰۸	دین اسلام حجاز میں ٹھکانہ پکڑے گا	۳۸۸	حضور اکرم ﷺ کی مثال
۴۱۰	یہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی	۳۸۹	ہدایت کے لئے حضور اکرم ﷺ کی مثال
۴۱۱	بدعت کی مثال	۳۹۰	وحی کی مثال
۴۱۲	اجماع امت حجت ہے	۳۹۱	مطلب حدیث
۴۱۳	سودا اعظم کا کیا مطلب ہے؟	۳۹۱	مثال اور مثل لہ کی وضاحت
۴۱۴	دل کو کھوٹ سے پاک رکھنا بہت اہم ہے	۳۹۳	حکمت اور قضا بہات کی بحث
۴۱۵	ایک سنت کو زندہ کرنے سے سو (۱۰۰)۔۔۔۔۔	۳۹۵	بلا ضرورت مسائل میں نہیں الجھنا چاہیے
۴۱۵	قرآن وحدیث کی موجودگی میں تو ارات۔۔۔۔۔	۳۹۵	دجالوں سے ہوشیار رہنا چاہیے
۴۱۶	کاسیانی کی تین باتیں	۳۹۷	ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنا صحیح نہیں

۴۳۴	علم کو عام کرو اور جھوٹ کو تھمسیلاؤ	۴۱۷	دور اول میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت تھی
۴۳۵	حدیث گھڑنے کی شدید وعید	۴۱۸	اگر ہدایت ہاتھ سے چلی گئی تو جھگڑے -----
۴۳۶	جھوٹی حدیث بیان کرنے کی وعید	۴۱۸	اعمال میں تشدد اختیار کرنے سے اجتناب کرو
۴۳۶	علم بڑی دولت ہے	۴۱۹	قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ
۴۳۷	انسانی ملکات کا ذکر	۴۲۰	دین اسلام واضح مذہب ہے
۴۳۸	دو قابل رشک چیزیں	۴۲۰	اہل حق سے الگ ہونے کا نقصان
۴۳۹	تین چیزیں صدقہ جاریہ ہیں	۴۲۲	بدعت کی نحوست
۴۴۰	اسلامی تعلیمات	۴۲۳	بدعت اپنانے والوں سے سنت چھینی جاتی ہے
۴۴۱	ریا کاری بڑی بلا ہے	۴۲۴	بدعتی کا اکرام کرنا بڑا گناہ ہے
۴۴۳	لوگوں سے علم کیسے اٹھتا ہے؟	۴۲۴	قرآن پر عمل کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا
۴۴۴	ہر روز وعظ و نصیحت نہ کرو	۴۲۵	اپنے ایمان کی حفاظت ہر آدمی کی ذمہ داری ہے
۴۴۶	نیکی کی راہنمائی بھی نیکی ہے	۴۲۶	صحابہ کرام کی شان
۴۴۶	فقراء کے لئے صدقہ کی اپیل	۴۲۷	یہ دور صرف اسلام کا دور ہے
۴۴۸	برائی کی بنیاد رکھنا بھی بُرائی ہے	۴۲۸	ناخ و منسوخ کا مسئلہ
۴۴۹	علماء اور طلباء کے فضائل	۴۲۹	فقہاء کرام کا اختلاف
۴۵۱	علماء کی تین قسمیں	۴۳۰	حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو
۴۵۲	عابد پر عالم کی فضیلت	۴۳۰	بدعت کی مثال
۴۵۳	دینی مدارس کے طلباء مہمانانِ رسول ہیں	۴۳۲	کتاب العلم
۴۵۳	علمی نکتہ متاعِ گمشدہ ہے	۴۳۲	علم اور اس کی فضیلت کا بیان
۴۵۴	ایک عالم ایک ہزار عابدوں پر بھاری ہے	۴۳۲	علم کی تعریف
۴۵۵	نالائق کو علم سکھانا علم کی توہین ہے	۴۳۳	علم کی اقسام

۴۷۵	عابد پر عالم کی انتہائی فضیلت	۴۵۸	دین کی سمجھ سے منافق محروم رہتا ہے
۴۷۵	عالم کو بے نیاز رہنا چاہیے	۴۵۸	طالب علم اللہ کی راہ میں رہتا ہے
۴۷۶	زیادہ وعظ نہ کرو	۴۵۹	طالب علم کے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں
۴۷۷	ناکام طالب علم بھی کامیاب ہے	۴۵۹	عالم کبھی علم سے سیر نہیں ہوتا
۴۷۷	میت کے لئے صدقہ جاریہ	۴۵۹	علم چھپانا گناہ ہے
۴۷۸	طلب علم کے راستے جنت کے راستے ہیں	۴۶۰	جھگڑے اور ریاکاری کا علم و بالی ہے
۴۷۹	تدریس کرنا تہجد سے افضل ہے	۴۶۱	دنیا کے حصول کے لئے علم جنت سے -----
۴۷۹	آنحضرت ﷺ معلم بن کر آئے تھے	۴۶۲	احادیث پڑھانے والے کی فضیلت
۴۸۰	چالیس احادیث یاد کرانے کی فضیلت	۴۶۳	احادیث میں جھوٹ بولنا موجب نار ہے
۴۸۰	علم دین کا عالم سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے	۴۶۳	قرآن کی تفسیر میں رائے شامل نہ کرو
۴۸۱	علم کا حریص کبھی سیر نہیں ہوتا	۴۶۵	قرآن میں جھگڑا انا کفر ہے
۴۸۲	دنیا داروں سے علماء کو دور رہنا چاہیے	۴۶۶	قرآن کا سات لغات پر نازل ہونے کا مطلب
۴۸۳	عالم کو اپنے علم کی حفاظت خود کرنی چاہیے	۴۶۸	اصل علم کس چیز کا نام ہے؟
۴۸۴	ضیاع علم کے اسباب	۴۶۸	شرعی منصب دار کے علاوہ کسی کا وعظ جائز نہیں
۴۸۵	حقیقی عالم کون ہوتا ہے؟	۴۶۹	علم کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں
۴۸۵	علماء سوء سے بچو	۴۷۰	چیتان اور معمر کا حکم
۴۸۷	بے عمل عالم کی مذمت	۴۷۰	علم میراث کی اہمیت
۴۸۷	دین کو گرانے والی چیزیں	۴۷۱	مدینہ کا عالم بڑا عالم ہوگا
۴۸۷	علم نافع اور غیر نافع کی پہچان	۴۷۲	مجدد کون ہوتا ہے
۴۸۸	ہر جگہ مسئلہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا	۴۷۳	دین کی حفاظت
۴۸۹	واللہ اعلم کہنا بھی علم ہے	۴۷۴	طالب علم کی انتہائی فضیلت

۵۰۸	وضو والے لوگ قیامت کے دن چمکتے ہوں گے	۳۸۹	ہر قسم کے استاد سے علم نہیں لینا چاہیے
۵۱۱	نواقض وضو کا بیان	۳۹۰	غلط قاریوں کی مذمت
۵۱۱	وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں	۳۹۰	علماء سوء کی مذمت
۵۱۲	مسئلة فاقد الطهورین	۳۹۱	زوال علم کا بڑا سبب عمل نہ کرنا ہے
۵۱۲	فقہاء کا اختلاف	۳۹۲	علم میراث سب سے پہلے ضائع ہوگا
۵۱۳	دلائل	۳۹۳	عم بلا عمل کی مثال
۵۱۴	مذی کا حکم	۳۹۴	کتاب الطہارۃ
۵۱۵	مسئلة الوضوء مما مست النار	۳۹۴	پاکیزگی کا بیان
۵۱۵	اختلاف مع دلائل وجواب	۳۹۵	پاکیزگی نصف ایمان ہے
۵۱۶	مسئلة الوضوء من لحوم الابل	۳۹۷	تین چیزوں سے گناہ مٹ جاتے ہیں
۵۱۷	فقہاء کا اختلاف	۳۹۸	وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں
۵۱۸	شک کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرو	۵۰۰	اچھا وضو اور اچھی نماز گناہوں کا کفارہ ہے
۵۱۸	چکناہٹ والی چیز کھانے کے بعد کھلی کرنا ضروری ہے	۵۰۲	وضو کرنے کا طریقہ
۵۱۹	ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں	۵۰۲	وضو کے بعد دو نفل کا ثواب
۵۱۹	ما مست النار کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا	۵۰۳	وضو کے بعد کی دعا
۵۲۰	ہوا خارج ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے	۵۰۴	قیامت میں وضو کے اعضاء چمکتے ہوں گے
۵۲۱	مسئلة تکبیر التعریمۃ	۵۰۵	استقامت کی فضیلت
۵۲۱	فقہاء کا اختلاف و دلائل	۵۰۶	وضو پر وضو کی فضیلت
۵۲۲	جواب	۵۰۶	وضو نماز کی کنجی ہے
۵۲۳	اپنی بیوی سے اغلام بازی کرنا حرام ہے	۵۰۷	مقتدی کا خراب وضو امام کے نماز کو خراب کرتا ہے
۵۲۳	مسئلة: النوم ناقض للموضوء ام لا؟	۵۰۷	پاکیزگی نصف ایمان ہے

۵۳۸	بیت الخلاء جانے کی دعا	۵۲۵	فقہاء کا اختلاف
۵۳۹	قبروں پر پھول چڑھانے کا حکم	۵۲۵	دلائل وجوہات
۵۵۱	لوگوں کے راستے میں پاخانہ کرنا موجب لعنت ہے	۵۲۷	مسئلة من الذکر
۵۵۲	دائیں ہاتھ سے ذکر کو چھونا منع ہے	۵۲۷	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۵۵۳	قابل احترام چیز کو بیت الخلاء تلے جاؤ	۵۳۰	مسئلة تعقیب المرأة
۵۵۴	نرم جگہ میں پیشاب کرنا چاہیے	۵۳۰	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۵۵۵	دایاں ہاتھ پاخانہ کے لئے نہیں کھانے۔۔۔۔	۵۳۲	جواب
۵۵۶	کن چیزوں سے استنجاء جائز اور کن سے۔۔۔۔	۵۳۳	آگ پر پکی ہوئی اشیاء کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا
۵۵۷	قائدہ	۵۳۶	مسئلة الوضوء من کل دمر سائل
۵۵۸	ڈاڑھی میں گرہ باندھنا منع ہے	۵۳۶	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۵۵۸	استنجاء میں پتھر استعمال کرنا مستحب ہے	۵۳۸	جواب
۵۵۹	عسل خانہ میں پیشاب کرنے کا حکم	۵۴۰	بَاب آداب الخلاء
۵۶۲	قضائے حاجت کے وقت باتیں کرنا منع ہے	۵۴۰	چند آداب
۵۶۲	بیت الخلاء میں جانے کی دعا	۵۴۱	مسئلة استقبال القبلة واستدبارها
۵۶۳	بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا	۵۴۱	فقہاء کا اختلاف
۵۶۴	شرم گاہ پر چھینٹے دینے کا مطلب	۵۴۲	دلائل
۵۶۴	بیاری یا مجبوری کی وجہ سے برتن میں پیشاب کرنا	۵۴۳	مسئلة احتاف کی ترجیحات
۵۶۵	کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا حکم	۵۴۴	الزامی جواب
۵۶۶	بیٹھ کر پیشاب کرنا مسنون ہے	۵۴۶	مسئلة الاستنجاء بالأحجار
۵۶۸	استنجاء کے آداب	۵۴۷	فقہاء کا اختلاف، شریعت کا اختلاف و دلائل
۵۶۸	مسلمان اپنے معاملات میں کسی کے۔۔۔۔۔	۵۴۸	الزامی جواب

۵۸۹	مضمضہ کی کیفیت	۵۷۱	ہڈی اور گوبر سے استنجاء کی ممانعت
۵۹۱	اولیٰ درجہ کا وضو	۵۷۲	باب السواک
۵۹۱	متوسط درجہ کا وضو	۵۷۲	سواک کی مقدار
۵۹۱	اعلیٰ درجہ کا وضو	۵۷۳	مسئلة السواک
۵۹۲	مسئلة غسل الرجلین	۵۷۳	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۵۹۲	دلائل شیعہ	۵۷۴	سواک استعمال کرنے کے مواضع
۵۹۳	اہل سنت کے دلائل	۵۷۵	ڈاڑھی بڑھانا اور دس فطری چیزیں
۵۹۵	جواب	۵۷۷	سواک کرنے کے فوائد
۵۹۶	مسئلة مسح العمامة	۵۷۸	سواک کی اہمیت
۵۹۶	فقہاء کا اختلاف	۵۸۰	سواک کی عظیم فضیلت
۵۹۶	دلائل و جواب	۵۸۰	ملاحظہ
۵۹۸	مسئلة التسمية عند الوضوء	۵۸۱	وضو کی سنتوں کا بیان
۵۹۸	فقہاء کا اختلاف	۵۸۱	مسئلة غمس اليد في الاثام
۵۹۹	دلائل و جواب	۵۸۲	فقہاء کا اختلاف
۵۹۹	انگیوں کا خلال	۵۸۲	مسئلة المضضة والاستنشاہ
۶۰۱	ڈاڑھی کا خلال	۵۸۳	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۶۰۱	وضو میں ڈاڑھی کا حکم	۵۸۵	مسئلة مسح الرأس
۶۰۳	مسح سر کے لئے نیا پانی لینا	۵۸۶	فقہاء کا اختلاف و دلائل
۶۰۳	مسئلة مسح الاذنین	۵۸۶	جواب
۶۰۳	فقہاء کا اختلاف و دلائل فقہاء	۵۸۸	مسح میں تکرار کا حکم
۶۰۵	جواب	۵۸۹	گردن کا مسح

۶۲۵	غسل جنابت میں بدن کا کوئی حصہ خشک۔۔۔	۶۰۶	دعاؤں میں تجاوز نہ کرو
۶۲۶	چند احکام میں تخفیف	۶۰۷	شیطان وضو میں دوسو سے ڈالتا ہے
۶۲۷	جنبی سے اختلاط کا بیان	۶۰۸	وضو کے بعد تولیہ وغیرہ کا استعمال
۶۲۷	جنابت کی حالت میں سونے کا حکم	۶۰۹	وضو علی الوضو کے بدلے مسواک کا حکم
۶۲۸	جذب آدمی کھانے پینے اور سونے کیلئے۔۔۔۔	۶۱۰	وضو میں بھی پانی کا اسراف منع ہے
۶۲۸	دوبارہ محبت کے لئے وضو کرنا مستحب ہے	۶۱۰	بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنے سے پورا بدن۔۔۔۔۔
۶۳۰	بے وضو آدمی یا د سے قرآن پڑھ سکتا ہے	۶۱۱	انگوٹھی ہلا کر وضو بنایا جائے
۶۳۰	جنبی اور حائضہ کا قرآن پڑھنا	۶۱۲	غسل جنابت کا بیان
۶۳۱	مسئلة عبور المسجد للحائض والمجنب	۶۱۲	مسئلة انما الماء من الماء
۶۳۲	فقہاء کا اختلاف و دلائل و جواب	۶۱۳	مسئلة احتلام المراهقة
۶۳۳	تصاویر کی ممانعت	۶۱۶	غسل کا مسنون طریقہ
۶۳۴	بلا وضو مسحف کا بیان	۶۱۷	حائضہ کے غسل کا طریقہ
۶۳۴	سلام کے جواب کے لئے وضو	۶۱۸	غسل میں سر کے بالوں کا مسئلہ
۶۳۶	جنابت کی حالت میں آدمی سو سکتا ہے	۶۱۹	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب
۶۳۶	وضو میں سات مرتبہ پانی بہانے کا مطلب	۶۱۹	وضو اور غسل میں پانی کی مقدار
۶۳۷	عورت کے غسل اور وضو سے بچے ہوئے۔۔۔۔۔	۶۲۰	مرد اور عورت کا ایک ساتھ غسل کرنا
۶۳۷	مرد و عورت ایک دوسرے کے بچے۔۔۔۔۔۔۔	۶۲۱	مسئلة الاحتلام
۶۳۹	پانی کے مسائل	۶۲۲	احکام کی صورتیں
۶۳۹	پانی میں پیشاب نہ کرنا چاہیے	۶۲۳	حشفہ غائب ہو جانے سے غسل واجب۔۔۔۔۔
۶۴۲	مسئلة بذر بضاہ و حدیث القلتین	۶۲۳	بر بال کے نیچے جنابت ہے
۶۴۳	مسئلة وقوع النجاسة فی الماء	۶۲۳	ایک بال کی جگہ خشک رہ گئی تو غسل نہیں ہوگا

۶۶۳	مسئلة سؤر الكلب	۶۴۳	فقہاء کا اختلاف
۶۶۵	کتے کے جھوٹے میں اختلاف	۶۴۳	مالکیہ کے دلائل
۶۶۷	طریقہ تطہیر میں اختلاف	۶۴۴	جمہور کے دلائل
۶۶۸	الطیفہ	۶۴۵	جواب
۶۶۸	مسئلة تطہیر الارض	۶۴۷	حدیث قلتین کی بحث
۶۶۹	زمین کی طہارت کے طریقے میں فقہائی	۶۴۷	دلائل و جواب
۶۷۱	مسئلة الجہنی	۶۴۹	حدیث قلتین کا مصداق
۶۷۱	فقہاء کا اختلاف، دلائل	۶۵۰	مسئلة ماء البحر ومیثتہ
۶۷۳	الجواب	۶۵۱	سمندری جانوروں کا شرعی حکم
۶۷۳	مسئلة غسل بول الغلام	۶۵۱	فقہاء کا اختلاف
۶۷۴	فقہاء کا اختلاف	۶۵۲	دلائل
۶۷۵	مردار کھانوں کی دباغت کا حکم	۶۵۲	جھینگے کا حکم
۶۷۶	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب	۶۵۳	احناف کی طرف سے جمہور کو جواب
۶۷۷	لڑکی کا پیشاپ مکمل دھونا ہوگا	۶۵۵	مسئلة لبید التمر
۶۷۷	راستے کی گندگی کا حکم	۶۵۶	فقہاء کا اختلاف
۶۷۸	فقہاء کا اختلاف	۶۵۶	دلائل، اعتراض و جواب
۶۷۸	توہم نجاست کچھ نہیں	۶۵۷	مسئلة سؤر الهرة
۶۷۸	دردوں کی کھال پر بیٹھنے کا حکم	۶۵۸	سؤر الهرة میں فقہاء کا اختلاف و دلائل
۶۸۰	خشک گندگی گنے سے وضو نہیں	۶۵۹	وحشی جانوروں کے جھوٹے کا بیان
۶۸۱	مسئلة بول ما یو کل لحمہ	۶۵۹	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب
۶۸۲	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب	۶۶۳	نجاستوں سے پاک کرنے کا بیان

۶۹۸	غسل جنابت کے لئے تیمم	۶۸۳	باب المسح علی الخفین
۷۰۰	سلام کے جواب کے لئے تیمم	۶۸۳	مسئلۃ التوقیت فی المسح
۷۰۰	پانی نہ ملے تو تیمم کرتے رہو	۶۸۳	فقہاء کا اختلاف
۷۰۱	بغیر علم مسئلہ نہ بتاؤ	۶۸۳	مالکیہ کے دلائل
۷۰۲	تیمم کر کے نماز پڑھی پھر پانی ملا تو کیا کرے؟	۶۸۵	جہور کے دلائل
۷۰۳	تیمم کے لئے دو ضرعین کا جوت	۶۸۵	الجواب
۷۰۵	مسنون غسل کا بیان	۶۸۶	آنحضرت ﷺ کی ایک رکعت نفل گئی
۷۰۵	غسل یوم الجمعة	۶۸۷	مقیم اور مسافر کے لئے مدت مسح
۷۰۵	غسل جمعہ میں فقہاء کرام کا اختلاف و دلائل	۶۸۸	محل المسح فی الخف
۷۰۷	الجواب	۶۸۸	فقہاء کا اختلاف
۷۰۷	غسل جمعہ دن کے لئے ہے یا نماز کے لئے؟	۶۸۹	مسئلۃ المسح علی الجودین
۷۰۷	اختلاف کا شرع	۶۹۰	فقہاء کا اختلاف
۷۰۸	جمعہ کے غسل میں نری	۶۹۲	باب التیمم
۷۰۸	چار چیزوں کی وجہ سے غسل	۶۹۳	تمام امتوں پر امت محمدیہ کی فضیلت
۷۱۰	غسل جمعہ کا پس منظر	۶۹۳	سید المرسلین ﷺ کی خصوصیات
۷۱۱	اظہار تشکر	۶۹۳	مسائل تیمم میں فقہاء کرام کا اختلاف
۷۱۲	باب الحيض	۶۹۵	دلائل
۷۱۲	حيض کی تعریف	۶۹۵	دوسرا اور تیسرا اختلاف
۷۱۲	حيض کا پس منظر	۶۹۶	دلائل
۷۱۳	مباحث حيض	۶۹۷	الجواب
		۶۹۷	چوتھا اختلاف

۷۲۳	باب المستعاضۃ	۷۱۳	بحث اول
۷۲۳	بحث اول	۷۱۳	حیض میں فقہاء کرام کا اختلاف
۷۲۴	بحث دوم، مستعاضۃ کی اقسام	۷۱۴	دلائل و جواب
۷۲۴	مقارنہ، مبتدأ، متخیرہ کا حکم	۷۱۵	مسئلۃ الاستمتاع من الحائض
۷۲۵	بحث سوم، خون کے رنگوں میں تمیز کرنا	۷۱۵	بحث دوم
۷۲۵	فقہاء کا اختلاف	۷۱۶	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب
۷۲۶	جواب	۷۱۷	حائضہ عورت سے میل جول رکھنے کی اجازت
۷۲۷	بحث چہارم، مصداق احادیث	۷۱۸	تین افعال پر کفر کا حکم
۷۲۷	بحث پنجم، مستعاضۃ کے وضو کا حکم	۷۲۰	حالت حیض میں جماع کا کفارہ
۷۲۷	فقہاء کا اختلاف، دلائل و جواب	۷۲۱	حائضہ سے بوس و کنار جائز ہے
۷۲۹	مستعاضۃ کے غسل کا مطلب	۷۲۱	حیض کے اثرات

تذکرہ

قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس جدید ایڈیشن میں حتی الوسع اغلاط کی تصحیح کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے ادارہ کو مطلع فرما کر ممنون و مشکور ہوں۔

نقطہ ناشر

0213-5470973

0315-3788955



مقدمہ در مصطلحات حدیث از شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: از مولوی عبدالمعلیم علوی

جمہور محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے (قول و فعل کا مطلب تو واضح ہے، تقریر کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی موجودگی میں کسی شخص نے کوئی کام کیا یا کچھ کہا اور آپ نے اس پر انکار کیا نہ اس سے روکا بلکہ سکوت اختیار فرما کر اس کی توثیق کر دی) اسی طرح صحابی اور تابعی کے قول و فعل اور تقریر پر بھی حدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو حدیث نبی کریم ﷺ تک پہنچے اسے مرفوع کہتے ہیں اور جس کی سند صحابی تک پہنچے اسے موقوف کہتے ہیں جیسے کہا جائے: قال ابن عباس یا فعل ابن عباس یا قتر ابن عباس یا عن ابن عباس موقوف یا موقوف علی ابن عباس۔

اور جس حدیث کی سند صرف تابعی تک پہنچے اسے مقطوع کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کو مرفوع اور موقوف تک ہی مخصوص رکھا ہے (مقطوع کو حدیث میں شمار نہیں کیا اس لئے کہ مقطوع کو (حدیث نہیں) اثر کہا جاتا ہے اور بعض دفعہ مرفوع حدیث پر بھی اثر کا اطلاق ہوتا ہے جس طرح نبی کریم ﷺ سے منقول دعاؤں کو ادعیہ ماثورہ کہا جاتا ہے اور جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی کتاب کا نام شرح معانی الآثار رکھا جو نبی ﷺ کی احادیث اور آثار صحابہ پر مشتمل ہے اور بقول امام سخاوی امام طبرانی کی ایک کتاب کا نام تہذیب الآثار ہے حالانکہ وہ مرفوع حدیثوں کے لئے خاص ہے اور اس میں جو موقوف روایات ہیں وہ محض ضمنی طور پر ہی ذکر کی گئی ہیں، خبر اور حدیث ایک ہی معنی میں مشہور ہیں، بعض حضرات حدیث مرفوع اس کو کہتے ہیں جو نبی ﷺ صحابہ اور تابعین سے منقول ہو اور خبر اس کو کہتے ہیں جو ملوک و سلاطین اور گزشتہ زمانوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ہو اسی وجہ سے ان لوگوں کو جو سنت میں مشغول ہوئے ”محدث“ اور ان کو جو خبر میں مشغول ہوئے ”اخباری“ کہا جاتا ہے۔

حدیث کا مرفوع ہونا کبھی تو صراحتاً ہوتا ہے اور کبھی حکماً ہوتا ہے۔

حدیث مرفوع صریحی کی تین قسمیں ہیں: ① قولی ② فعلی ③ تقریری

صریح قولی کی مثال:

جیسے صحابی کہے: ”سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول“ کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ کہتے

ہوئے سنا، یا صحابی یا غیر صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا (اس میں صحابی کے سماع کی تصریح نہیں ہے) یا عن کے صیغے کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے منقول ہو کہ آپ نے یوں ارشاد فرمایا..... الخ
صریح فعلی کی مثال:

جیسے صحابی کہے کہ ”رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعل کذا“ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا یا عن کے صیغے کے ساتھ منقول ہو کہ آپ نے یوں کہا یا صحابی یا غیر صحابی آنحضرت ﷺ کے کسی فعل کو نقل کر لے اور ”رفعه“ یا ”مرفوعاً“ کے الفاظ استعمال کر لے۔

صریح تقریری کی مثال:

جیسے صحابی یا غیر صحابی یہ کہے کہ فلاں نے یا یوں کہے کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں یوں کیا اور آپ نے اس پر انکار نہیں فرمایا۔

حدیث مرفوعہ حکمی کی بھی تین ہی قسمیں ہیں: ① قولی ② فعلی ③ تقریری۔

حکمى قولی کی مثال:

جیسا کہ کوئی ایسا صحابی جس کو کتب سابقہ کا علم نہ ہو ماضی یا مستقبل کے امور میں سے کسی ایسے امر کی خبر دے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو، ماضی کے امور جیسے انبیاء علیہم السلام کے حالات، مستقبل کے امور جیسے کہ آئندہ آنے والی جنگوں اور آنے والے فتنوں کا بیان، قیامت کے دن کی ہولناکیوں کا بیان یا کسی مخصوص فعل پر کسی مخصوص جزا یا سزا ملنے کا بیان کہ ان چیزوں کا علم بجز آنحضرت ﷺ کے کسی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

حکمى فعلی کی مثال:

جیسے کہ صحابی کا کوئی ایسا فعل جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو (کیونکہ ایسا فعل بجز آنحضرت ﷺ سے صادر ہونے کوئی نہیں کر سکتا)۔

حکمى تقریری کی مثال:

جیسے صحابی کا ارشاد فرمانا کہ ہم رسول اللہ کی زندگی میں یوں کیا کرتے تھے، یہ بھی مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ضرور اس بات کا علم ہو گا یا (اگر علم نہ ہو اور یہ کام درست نہ ہوتا) تو اس بارے میں وحی اتر جاتی یا صحابہ کا یوں کہنا ”ومن السنة کذا“ کہ سنت میں سے ایک عمل یہ بھی ہے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ سنت سے مراد سنت نبوی ہی ہوتی ہے اگرچہ بعضوں نے فرمایا کہ سنت کا لفظ چونکہ سنت صحابہ اور سنت تابعین پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

فصل اول سند کے بیان میں

سند طریق حدیث کا نام ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اسے روایت کیا، اسناد بھی اسی معنی میں ہے اور کبھی یہ سند کے ذکر اور طریق متن کے ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور متن وہ ہے جس پر سند کا سلسلہ منتهی ہو۔

اگر درمیان سے کوئی راوی ساقط نہ ہو تو وہ حدیث متصل ہے، عدم سقوط کو ہی اتصال کہا جاتا ہے اور اگر ایک یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہوں وہ حدیث منقطع ہے، اس سقوط کا نام ہی انقطاع ہے، اگر یہ سقوط سند کی ابتداء ہی میں ہو تو اسے معلق کہتے ہیں اور اس اسقاط کا نام تطیق ہے اور ساقط ہونے والا کبھی ایک ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زیادہ، کبھی پوری سند حذف کر دی جاتی ہے، جیسا کہ عام مصنفین کی عادت ہے، وہ اس طرح روایت کرتے ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

تراجم صحیح بخاری میں بکثرت تعلیقات ہیں لیکن یہ سب تعلیقات اتصال کے حکم میں ہیں اس لئے کہ امام بخاری نے اپنی اس کتاب میں صحیح احادیث ہی لانے کا التزام کیا ہے لیکن ان تعلیقات کے سوا جن کی سند اپنی کتاب میں دوسری جگہ بیان کر دی ہے اور تعلیقات ان کے مسانید کے درجہ کی نہیں ہیں اور بعض لوگوں نے اس میں یہ فرق کیا ہے کہ جس کو امام بخاری نے جزم اور یقین کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا ہے اور وہ دلالت کرتا ہو اس بات پر کہ اس کی سند امام بخاری کے نزدیک ثابت ہے تو وہ قطعاً صحیح ہے جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا "قال فلان اوذکر فلان" فلاں نے کہا فلاں نے ذکر کیا اور اگر صیغہ تریض و مجہول کے ساتھ بیان کیا ہو جیسے "قیل یا یقال یا ذکر" یعنی کہا گیا یا کہا جاتا ہے یا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی صحت میں ان کے نزدیک کلام ہے لیکن جب وہ اپنی کتاب میں لائے ہیں تو اس کی اصل ان کے نزدیک ثابت ہے، اس لئے محدثین کا قول ہے کہ بخاری کی تعلیقات متصل اور صحیح ہیں۔

اگر سقوط سند کے آخر میں اور تابعی کے بعد ہو تو وہ حدیث مرسل ہے اور اس فعل کا نام ارسال ہے جس طرح کوئی تابعی کہے: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کبھی محدثین کے نزدیک مرسل اور منقطع کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے لیکن پہلی اصطلاح زیادہ مشہور ہے۔

جہور علماء کے نزدیک مرسل روایت کا حکم توقف ہے اس لئے کہ یہ غیر معلوم ہے کہ ساقط ہونے والا ثقہ ہے یا غیر ثقہ، علاوہ ازیں تابعی دوسرے تابعی سے روایت کرتا ہے اور تابعی ثقات وغیر ثقات دونوں ہی ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرسل مطلقاً مقبول ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ارسال کرنے والے نے کمال وثوق اور اعتماد کی بناء پر ہی ارسال کیا ہو گا کیونکہ گفتگو ثقہ راوی سے متعلق ہے اگر وہ تابعی ارسال کرنے والے کے نزدیک صحیح نہ ہوتا تو وہ ارسال ہی نہ کرتا اور نہ یہ کہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرسل اور سند اگرچہ ضعیف ہو تاہم اس کی تائید کسی چیز سے حاصل ہو جائے تو وہ مقبول ہو جاتی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں، یہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے جب یہ معلوم ہو کہ تابعی کی

عادت صرف روایات ہی سے ارسال کرنے کی ہے اور اگر اس کی عادت بغیر کسی امتیاز کے ثقات وغیر ثقات دونوں سے ارسال کر کے کی، تو پھر بالاتفاق اس کا حکم توقف کا ہے، اس میں اور بہت سی تفصیلات ہیں جن کو ستاویں نے شرح الفیہ میں ذکر کیا ہے۔ اگر سقوط سند کے درمیان سے ہو اور پے در پے دو راوی درمیان سے ساقط ہوں تو ایسی حدیث کو "معضل" ("بلخ الضاد) کہتے ہیں، اگر ایک راوی ساقط ہو یا ایک سے زیادہ ہوں لیکن پے در پے نہیں بلکہ مختلف جگہوں سے ساقط ہوں تو اسے "منقطع" کہتے ہیں اس معنی میں منقطع غیر متصل حدیث کی ایک قسم بن جاتی ہے اور کبھی منقطع مطلقاً غیر متصل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تمام اقسام کو شامل ہے، اس صورت میں یہ ایک مقسم قرار پائے گا۔

انقطاع اور سقوط راوی کا حکم راوی اور مروی عنہ کے درمیان عدم ملاقات سے ہوتا ہے اور عدم ملاقات ہم عصر نہ ہونے یا اجتماع نہ ہونے کے سبب ہو گا یا اس وجہ سے کہ روایت حدیث کی اجازت نہ ملی ہو اور ان سب چیزوں کا علم راویوں کی تاریخ ولادت، ان کی تاریخ وفات، ان کے طلب علم اور سفر کے اوقات کی تعیین ہی سے ہو سکتا ہے اسی لئے محدثین کے نزدیک علم تاریخ بھی ایک بنیادی اور ضروری علم ہے۔

منقطع حدیث کی ایک قسم "مدلس" (بضم میم و فتح لام مشدودہ) ہے اس فعل کا نام تدلیس اور اس کا مرکب مدلس (بکسر لام) ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک راوی اپنے اس شیخ (استاد) کا نام تو نہ لے جس سے اس نے حدیث سنی ہے البتہ اس کے اوپر کے راوی سے ایسے الفاظ میں روایت کرے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس نے (اسی) اوپر والے راوی سے سنا ہے جیسے عن فلان یا قال فلان کہے۔ تدلیس کے لغوی معنی فروختی سامان کے عیب کو بیچ کے وقت چھپانے کے ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دلس سے مشتق ہے جس کے معنی گھمبیر تاریکی کا چھا جانا ہے۔ حدیث کو مدلس اس لئے کہا گیا کہ اس میں بھی اسی طرح خفاء (تاریکی) ہے۔ شیخ (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ جس سے تدلیس ثابت ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اس سے حدیث قبول نہ کی جائے گی، یہاں تک کہ وہ تحدیث کی راحت کر دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر فن کے نزدیک تدلیس حرام ہے۔ امام وکیع رحمہ اللہ کے نزدیک جب تدلیس کپڑوں میں بازن نہیں تو حدیث میں کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے تو اس کی بہت زیادہ مذمت کی ہے۔

مدلس کی روایت قبول کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، اہل حدیث و فقہ کے ایک گروہ کے نزدیک یہ تدلیس جرح (عیب) ہے اور جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ تدلیس کرتا ہے اس کی حدیث مطلقاً غیر قبول ہے اور بعض کے خیال میں مقبول ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اس شخص کی تدلیس قابل قبول ہے جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ثقہ ہی سے تدلیس کرتا ہے جیسے امام ابن عیینہ رحمہ اللہ ہیں اور اس کی تدلیس مردود ہے جہ ضعیف وغیر ضعیف۔ سب سے تدلیس کرتا ہے یہاں تک کہ وہ الفاظ میں سماعت یا حدیث و خبر نامہ کے ذریعے سے سماعت کی صراحت نہ کر دے۔

تدلیس کے مختلف اہم باب ہیں:

بعض دفعہ اس کے پس پردہ کوئی غرض فاسد ہوتی ہے جیسے کوئی راوی اپنے شیخ (استاد) کی نوعمری کے باعث اس سے اپنے

سماع کو چھپانے کی کوشش کرے یا اس وجہ سے کہ وہ (شیخ) لوگوں میں کوئی خاص شہرت یا مقام و مرتبہ نہیں رکھتا اور بعض اکابر سے جو تدلیس واقع ہوئی ہے تو اس کی حیثیت یہ نہیں ہے، اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ انہیں حدیث کی صحت پر کامل اعتماد تھا اور شہرت وغیرہ سے وہ بے نیاز تھے۔ شمسی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ ثقات کی ایک جماعت سے حدیث سنی ہو اور اس شخص سے بھی، اس لئے اس کے ذکر نے دیگر لوگوں کے ذکر سے مستغنی کر دیا جیسا کہ مرسل میں ہوتا ہے۔

اگر اسناد یا متن میں راویوں کا اختلاف تقدیم و تاخیر یا کمی بیشی کے ذریعے ہو، ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی یا ایک متن کی جگہ دوسرا متن ہو یا اسمائے سند یا اجزائے متن میں تصحیف ہو یا اختصار ہو یا حذف ہو یا اسی طرح کی دیگر چیزیں ہوں تو حدیث ”مضطرب“ ہے، اگر ان کے درمیان جمع و توفیق ممکن ہو تو وہ مقبول ہے ورنہ اس کا حکم توقف ہے۔
اگر راوی نے کسی حدیث میں اپنا یا کسی صحابی و تابعی کا کلام اس غرض سے درج کر دیا کہ اس طرح لغت کے مفہوم یا معنی کی وضاحت یا مطلق کی تفسید ہو جائے گی تو وہ حدیث ”مدرج“ کہلائے گی۔

فصل دوم: روایت بالمعنی کے بیان میں:

تنبیہ: اس بحث سے ایک اور بحث احادیث میں روایت بالمعنی پیدا ہو جاتی ہے اس میں کافی اختلاف ہے۔ اکثر اس بات کے قائل ہیں کہ ایسا اس شخص کے لئے جائز ہے جو عربی زبان کا عالم ہو، اسلوب کلام کا ماہر، ترکیبوں کے خواص اور خطاب کے مفاہیم سے واقف ہو، تاکہ زیادتی اور کمی کے ذریعے غلطی نہ کر سکے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مفرد الفاظ میں جائز ہے، مرکبات میں نہیں۔ بعض کے نزدیک اس شخص کے لئے جائز ہے جس کو حدیث کے الفاظ زبانی یاد ہوں اور اس میں تصرف پر وہ پوری طرح قادر ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے لئے جائز ہے جسے حدیث کے معانی تو یاد ہوں لیکن الفاظ بھول گیا ہو حالانکہ ایسا کرنا تحصیل احکام کی بناء پر ضروری ہے اور جسے الفاظ حدیث یاد ہوں اس کے لئے روایت بالمعنی جائز نہیں، اس لئے کہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ اختلاف جواز اور عدم جواز میں ہے، جہاں تک بغیر کسی تصرف کے الفاظ حدیث روایت کرنے کا تعلق ہے تو اس کی افضلیت میں سب کا اتفاق ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری باتیں سنیں، انہیں یاد رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا جس طرح مجھ سے سنا۔“ روایت بالمعنی صحاح ستہ اور دیگر کتب میں بکثرت موجود ہیں۔

عن عدۃ: عن فلان عن فلان کے الفاظ کے ساتھ حدیث بیان کرنے کو کہتے ہیں اور معتن وہ حدیث ہے جو معنعنہ کے طور پر بیان کی جائے۔ معنعنہ میں امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک معاصرت (ہم زمانہ ہونا) امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ملاقات شرط ہے اور دوسرے محدثین کے نزدیک حدیث لینا شرط ہے۔ امام مسلم نے دونوں فریقوں کا بڑی شد و مد سے رد کیا ہے، ہدیس کا معنعنہ غیر مقبول ہے۔
بر وہ مرفوع حدیث جس کی سند متصل ہو ”مسند“ ہے۔ مسند کی یہی مشہور اور معتمد علیہ تعریف ہے، بعض کے نزدیک ہر متصل السند مسند ہے، چاہے موقوف ہو یا مقطوع اور بعض کے خیال میں ہر مرفوع مسند ہے، چاہے مرسل ہو، معضل ہو یا منقطع۔

فصل سوم:

شاذ، منکر اور معطل بھی حدیث کی قسمیں ہیں، شاذ لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو جماعت سے الگ ہو گیا اور اس سے نکل گیا ہو اور اصطلاح محدثین میں اس حدیث کو کہتے ہیں جو ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہو۔ اگر اس کے راوی ثقہ نہیں تو وہ ”مردود“ ہے اور دیگر وجوہ ترجیحات کے مطابق ترجیح دی جائے گی۔ راجح کا نام ”محفوظ“ اور مرجوح کا نام ”شاذ“ ہے۔ ”منکر“ وہ حدیث ہے جسے کوئی ضعیف راوی روایت کرے اور وہ اپنے سے بھی ضعیف تر راوی کی روایت کے خلاف ہو، منکر کا مقابل ”معروف“ ہے منکر اور معروف دونوں روایتوں کے راوی ضعیف ہوتے ہیں لیکن ایک راوی دوسرے سے زیادہ ضعیف ہوتا ہے اور شاذ اور محفوظ میں راوی قوی ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے زیادہ قوی ہوتا ہے، شاذ اور منکر مرجوح اور محفوظ اور معروف راجح ہوتے ہیں۔

اور بعض نے شاذ اور منکر میں کسی دوسرے کی مخالفت کی قید نہیں لگائی، چاہے وہ ضعیف ہو یا قوی، اور انہوں نے کہا کہ شاذ وہ حدیث ہے جسے ثقہ روایت کرنے میں متقدم ہوں اور اس کی موافقت اور حمایت میں کوئی اصل بھی نہ ہو اور یہ صحیح وثقہ پر بھی صادق آتا ہے اور بعض نے ثقہ اور مخالفت کا اعتبار نہیں کیا۔ اسی طرح منکر ہے کہ وہ اسے صورت مذکورہ کے ساتھ خاص نہیں کرتے اور اس شخص کی حدیث کو بھی منکر کہتے ہیں جو فسق، فرط غفلت اور کثرت اغلاط کے ساتھ مطعون ہو، یہ الگ الگ اصطلاحات ہیں جن میں کوئی مضائقہ نہیں۔

”معطل“ (بفتح لام) وہ سند ہے جس میں صحت حدیث کو مجروح کرنے والی علل اور غلطی اسباب پائے جاتے ہوں۔ کبھی معطل (بکسر لام) کی عبارت اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرنے میں قاصر رہتی ہے جس طرح دینار و درہم کے پرکھنے میں سزاف اپنے دعویٰ پر دلیل نہیں پیش کر سکتا۔

ایک راوی اگر کوئی حدیث بیان کرے اور دوسرا راوی دوسری حدیث بیان کرے جو اس کے موافق ہو تو اس حدیث کو متابع (بصیغہ اسم فاعل) کہتے ہیں اور محدثین جو کہتے ہیں ”تابعہ فلان“ اور امام بخاری رحمہ اللہ جو اپنی صحیح میں اکثر فرماتے ہیں اور اکثر محدثین بھی کہتے ہیں کہ ”ولہ متابعات“ تو اس کے معنی یہی ہیں، متابعت تقویت اور تائید کو واجب کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ متابع مرتبہ میں اصل کے برابر ہو، متابع کم مرتبہ رکھنے کے باوجود متابعت کی صلاحیت رکھتا ہے، متابعت کبھی نفس راوی میں ہوتی ہے، اور کبھی اس شخص میں جو اس سے اوپر ہوتا ہے، پہلا دوسرے سے اکمل اور اتم ہے اس لئے کہ کمزوری اکثر اول اسناد میں ہوتی ہے۔

متابع اگر لفظوں میں اصل کے موافق ہو تو ”مثله“ اور اگر لفظوں میں نہیں صرف معنی میں موافقت ہو تو ”نحوہ“ کہا جاتا ہے، متابعت میں یہ شرط ہے کہ دونوں روایتیں ایک ہی صحابی سے ہوں، اگر دو الگ صحابیوں سے ہوں تو اسے ”شاهد“ کہتے ہیں

جیسے کہا جائے "لہ شاهد من حدیث ابی ہریرۃ" یا کہا جائے "لہ شواہد" یا "شہد بہ حدیث فلان" اور بعض لوگ متابعت کو صرف لفظوں میں موافقت اور شاہد کو معنوی موافقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں خواہ وہ ایک صحابی سے منقول ہو یا دو صحابیوں سے اور کبھی شاہد اور متابع ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، وجہ اس کی ظاہر ہے متابع اور شاہد کے جاننے کی غرض سے طریق حدیث اور اس کے اسناد کے تتبع اور تلاش کو اعتبار کہا جاتا ہے۔

فصل چہارم: اقسام حدیث کے بیان میں:

حدیث کی اصل قسمیں تین ہیں: ① صحیح ② حسن ③ ضعیف صحیح سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے، ضعیف اونٹنی اور حسن متوسط درجہ ہے۔ تمام وہ قسمیں جو پہلے گزر چکی ہیں وہ انہی تین قسموں میں داخل ہیں۔

"صحیح" حدیث وہ ہے جس کا نقل کرنے والا عادل، تام بالضبط ہو جو نہ معلل ہو نہ شاذ ہو، اگر یہ صفات علی وجہ الکمال پائی جائیں تو وہ "صحیح لذاتہ" ہے اور اگر اس میں کسی قسم کا نقص ہو لیکن کثرت طرق سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے تو وہ "صحیح لغیرہ" ہے اور اگر اس نقص کی تلافی کرنے والی کوئی چیز نہ ہو تو وہ "حسن لذاتہ" ہے۔

"ضعیف" وہ حدیث ہے کہ جس میں وہ شرائط کلی طور پر یا جزوی طور پر مفقود ہوں جو صحیح کے لئے معتبر ہیں، اگر ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کے ضعف کی تلافی ہو جاتی ہو تو وہ "حسن لغیرہ" ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفات جو صحیح کے لئے ضروری ہیں وہ حسن میں ناقص ہوتی ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ حسن میں جس نقصان کا اعتبار کیا گیا ہے وہ صرف خفت ضبط ہے ورنہ باقی صفات اپنی جگہ بحال رہتی ہیں۔

"عدالت" اس ملکہ کا نام ہے جو انسان کو تقویٰ اور مروت کے التزام پر آمادہ کرتا ہے اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعات جیسے برے اعمال سے بچنا ہے، گناہ صغیرہ سے اجتناب کے بارے میں اختلاف ہے: مختار مذہب یہ ہے کہ یہ شرط نہیں اس لئے کہ اس سے بچنا انسانی طاقت سے باہر ہے بجز اس صورت کے کہ صغیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے کہ اس طرح وہ بھی کبیرہ گناہ بن جاتا ہے، اور مروت سے مراد ان بعض خسیس اور چھوٹی باتوں سے بچنا ہے جو گو مبارح ہیں مگر ہمت اور مروت (مردانگی) کے خلاف ہیں جیسے بازار میں اکل و شرب اور راستے میں پیشاب کرنا وغیرہ۔

ملاحظو رہنا چاہیے کہ روایت کی عدالت، شہادت کی عدالت سے عام ہے، اس لئے کہ عدل شہادت آزاد کے لئے مخصوص ہے اور عدل روایت آزاد اور غلام دونوں کو شامل ہے۔

اور ضبط سے مراد ہے سنی ہوئی چیز کو غفل اور ضیاع سے بایں طور محفوظ رکھنا کہ اس کو حاضر کرنا ممکن ہو اس ضبط کی دو قسمیں ہیں: ضبط صدر اور ضبط کتاب۔ پس ضبط صدر دل میں محفوظ رکھنے کا نام ہے اور دوسروں تک پہنچانے کے وقت تک اس کو محفوظ رکھنے کا نام ضبط کتاب ہے۔

فصل پنجم: وجوہ طعن کے بیان میں:

عدالت سے متعلق طعن کے وجوہ پانچ ہیں: ① کذب ② اتہام کذب ③ فسق ④ جہالت ⑤ بدعت

کذب راوی سے مراد یہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت ہو گیا ہو، یہ ثبوت کذب یا تو خود حدیث گھڑنے والے کے اقرار سے ہو یا دیگر قرائن سے ہو، ایسے مطعون بالکذب راوی کی حدیث موضوع کہلاتی ہے، جس شیخ کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے حدیث میں عدا جھوٹ سے کام لیا ہے گو کہ اس نے پوری عمر میں ایک مرتبہ ہی ایسا کیا ہو اور پھر اس سے تائب بھی ہو گیا ہو، تاہم اس کی حدیث کبھی قابل قبول نہ ہوگی۔ بخلاف جھوٹے گواہ کے جب وہ تو بہ کر لے تو اس کے بعد اس کا قول مقبول ہو جاتا ہے۔ پس محدثین کی اصطلاح میں موضوع حدیث سے مراد یہی ہے (جس کا ذکر کیا گیا ہے) نہ کہ اس راوی کی حدیث جس کا کذب ثابت ہو گیا اور اس کا بطور خاص اس حدیث کا گھڑنا معلوم ہو اور یہ مسئلہ ظنی ہے۔

وضع اور افتراء کا حکم ظن غالب پر ہوتا ہے اس میں قطعیت اور یقین ممکن نہیں، اس لئے کہ جھوٹے سے بھی کبھی سچ کا صدور ہو جاتا ہے اس سے اس قول کا بھی رد ہو جاتا ہے کہ وضع حدیث کا علم وضع کے اقرار کی بناء پر ہو اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہ اس قرار میں بھی کاذب ہو اس کا اچھا ہونا ظن غالب کی بناء پر سمجھا جائے گا، اگر ایسا نہ ہوتا تو قتل کا اقرار کرنے والے کا قتل اور زنا کا اعتراف کرنے والے کا رجم جائز نہ ہوتا۔

راوی کے کذب کے ساتھ مُتَّفَقٌ ہونے کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ عام گفتگو میں اس کا جھوٹا ہونا مشہور و معروف ہو۔ تاہم حدیث نبوی میں اس کا کذب ثابت نہ ہو، اسی حکم میں اس شخص کی روایت بھی داخل ہے جو شریعت کے قواعد ضروریہ معلومہ کے خلاف ہو، اسی قسم کے راوی کا نام متروک ہے جیسے کہا جائے کہ اس کی حدیث متروک ہے اور فلاں متروک الحدیث ہے۔ اگر اس شخص نے صدق دل سے توبہ کر لی ہو اور صدق کی علامات اس کے طرز عمل سے ظاہر ہوں تو اس کی حدیث کا سماع جائز ہے اور وہ شخص جس سے حدیث نبوی ﷺ کے علاوہ گفتگو میں کبھی کبھی کذب واقع ہو تو یہ اس کی حدیث کو موضوع یا متروک کہنے کے لئے کافی نہ ہوگا اگرچہ عام گفتگو میں کسی وقت بھی کذب بیانی (معصیت ہے۔

فسق سے مراد عملی فسق ہے اعتقادی فسق نہیں، اعتقادی فسق تو بدعت میں داخل ہے، اکثر بدعت کا استعمال اعتقادی میں ہوتا ہے اور کذب اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو علیحدہ اور مستقل اصل شمار کیا گیا ہے اس لئے کہ کذب انتہائی شدید طعن ہے۔

راوی کی جہالت بھی حدیث میں طعن کا سبب ہے اس لئے کہ جب راوی کا نام اور اس کی ذات معلوم نہ ہو تو اس کے حالات بھی معلوم نہ ہوں گے اور نہ اس کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا پتہ چلے گا۔ جیسے کوئی شخص کہے "حدثنی رجل یا اخیری شیعہ" (مجھ سے کسی آدمی نے حدیث بیان کی یا مجھے شیخ نے خبر دی) تو اس کا نام مبہم ہے اور حدیث مبہم غیر مقبول ہے الا یہ کہ راوی صحابی ہو، اس لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔ اگر تعدیل کے الفاظ کے ساتھ بیان کیا جائے جس

طرح کوئی کہے: "اخبار فی عدل یا حدیثی ثقہ" تو امام میں اختلاف ہے لیکن صحیح تر بات یہی ہے کہ نامقبول ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ راوی کے خیال میں تو عادل ہو لیکن نفس الامر میں عادل نہ ہو البتہ کوئی امام ہذا فوق بیان کرے تو مقبول ہے۔ بدعت سے مراد یہ ہے کہ دین کی معروف باتوں کے خلاف اور اس کے خلاف جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے منقول ہیں کسی امر محدث (نو ایجاد کام) کا اعتقاد شبہ اور تاویل کی بناء پر کرنا، بطریق جمود و انکار نہیں، اس لئے کہ ایسا انکار تو کفر ہے۔ اور بدعتی کی حدیث جمہور کے نزدیک مردود ہے اور بعض کے نزدیک مقبول ہے بشرطیکہ صدق لہجہ اور زبان کی حفاظت کے ساتھ متصف ہو، اور بعض کہتے ہیں اگر وہ کسی ایسے تواتر شرعی کا انکار کرے جس کے متعلق یقینی علم ہو کہ وہ امر دین میں سے ہے تو وہ مردود ہے، اور اگر اس طرح پر نہ ہو تو وہ مقبول ہے، گویا یقین اس کی تکفیر کریں بشرطیکہ اس میں ضبط و درع، تقویٰ و احتیاط اور صیانت کی صفات پائی جائیں۔ بدعتی کے بارے میں مذہب مختاریہ یہ ہے کہ اگر وہ بدعت کا داعی اور اس کا رائج کرنے والا ہو تو وہ مردود ہے، ورنہ مقبول، بشرطیکہ وہ ایسی چیز روایت نہ کرتا ہو جس سے اس کی بدعت کو تقویت پہنچتی ہو، کیونکہ اس صورت میں وہ ظلم مردود ہے۔ مختصر یہ کہ اہل بدعت و جمہوری اور باطل مذاہب والوں سے حدیث اخذ کرنے میں اختلاف ہے، صاحب جامع الاصول نے کہا کہ محدثین کی ایک جماعت نے خوارج، قدریہ، رافضی و شیعہ اور دیگر اصحاب بدعت سے حدیثیں اخذ کی ہیں، اور ایک دوسری جماعت نے احتیاط سے کام لیا ہے اور ان تمام بدعتی فرقوں سے حدیث حدیث میں اجتناب کیا، ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی نیت ہے۔ بلاشبہ ان فرقوں سے حدیث اخذ کرنا بہت زیادہ تلاش و جستجو کے بعد ہوتا ہے، تاہم پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ ان سے حدیث اخذ نہ کی جائے اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہ فرق مبتدع اپنے مذاہب کی ترویج کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور توبہ و رجوع کے بعد اس کا اقرار کر لیتے تھے۔ (واللہ اعلم)

فصل ششم:

ضبط سے متعلق بھی وجوہ طعن پانچ ہیں: (۱) فرط غفلت (۲) کثرت غلط (۳) مخالفت ثقات (۴) وہم (۵) سوء حافظہ فرط غفلت اور کثرت غلط دونوں قریب المعنی ہیں، غفلت کا تعلق سماع اور تحصیل حدیث اور غلط کا تعلق بیان کرنے اور پہنچانے سے ہے۔ اسناد یا متن میں ثقات کی مخالفت چند طریقوں پر ہوتی ہے جو شذوذ کا باعث ہوتی ہے اور اسے ضبط سے متعلق وجوہ طعن میں اس لئے شمار کیا گیا ہے کہ ثقات کی مخالفت کا سبب عدم ضبط و حفظ اور تغیر و تبدل سے محفوظ نہ ہونا ہے اور طعن، وہم اور نسیان کے سبب ہوتا ہے کہ راوی ان دونوں کی وجہ سے غلطی کرے کہ وہم کے طور پر روایت کرتا ہے۔ اس وہم کی اطلاع اگر ایسے قرائن سے ہو جائے جو اس کی غفلت اور قدح کے اسباب و علل پر دلالت کرنے ہوں تو وہ حدیث معطل ہوگی، اور علم حدیث میں یہ سب سے زیادہ دقیق اور غامض مسئلہ ہے، اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں اللہ نے فہم ناقب اور وسیع حافظہ عطا کیا ہو اور وہ اسانید و متون کے احوال اور رواۃ کے مراتب کی معرفت تامہ رکھتے ہوں، جیسے متقدمین اس فن کے ارباب کمال ہیں جن کا سلسلہ امام دارقطنی تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے کہ ان کے بعد اس فن میں ایسا صاحب کمال کوئی

پیدا نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

سوء حفظ سے مراد محدثین کے نزدیک یہ ہے کہ راوی کی اس بات اس کی خطا پر غالب نہ ہو اور اس کا حفظ و اتقان سہو و نسیان سے زیادہ نہ ہو یعنی اگر خطا و نسیان اس کے صواب و اتقان کے مساوی ہو یا غالب ہو تو یہ سوء حفظ میں داخل ہوگا۔ پس معتد علیہ صواب و اتقان اور ان کی کثرت ہے، حافظہ کی خرابی (سوء حفظ) اگر ہر وقت اور تمام عمر راوی کے شامل حال رہی ہو تو اس کی حدیث غیر معتبر ہوگی، بعض محدثین کے نزدیک یہ بھی شاذ میں داخل ہے۔

اگر سوء حفظ کسی عارض کے سبب طاری ہو جیسے کبر سن، بینائی کے جاتے رہنے یا کتابوں کے ضائع ہو جانے کے سبب حافظہ میں خلل پیدا ہو جائے تو اسے "مختلط" کہا جائے گا۔ پس ایسے راوی کی اختلاط سے قبل روایت کردہ حدیثیں مقبول ہوں گی بشرطیکہ وہ روایات اس حالت کے طاری ہونے کے بعد کی روایوں سے ممتاز ہوں، اگر ممتاز نہ ہوں تو توقف کیا جائے گا، اگر مشتبہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے اور اگر ایسے مختلط راوی کی بیان کردہ حدیثوں کے متابعات اور شواہد ہوں تو پھر وہ بجائے مردود ہونے کے قبولیت و رجحان کا درجہ پائیں گی، اور یہی حکم مستور، مدلس اور مرسل حدیثوں کا ہے۔

فصل ہفتم: تعدادِ رواۃ کے بیان میں:

صحیح حدیث کے مختلف مراتب و درجات ہیں۔ اگر اس کا راوی ایک ہے تو وہ غریب ہے، دو راوی ہیں تو وہ حدیث عزیز ہے، اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو وہ مشہور یا مستفیض ہے، اور کسی حدیث کے رواۃ کی کثرت اگر اس حد کو پہنچ جائے کہ ان کا کذب پر متفق ہونا محال ہو تو اس حدیث کو متواتر کہیں گے۔ اور غریب کا ایک نام فرد بھی ہے اور مراد اس سے راوی کا کسی جگہ ایک ہونا ہے۔ اگر استاد میں کسی ایک جگہ ہو تو اسے فرد بھی کہتے ہیں اور ہر جگہ میں ہو تو فرد مطلق، اور دو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ ایسا ہی ہوا اگر صرف ایک جگہ میں ہو تو وہ حدیث عزیز نہیں غریب ہوگی۔ اسی طرح حدیث مشہور میں کثرت کے معنی یہ ہیں کہ ہر جگہ دو سے زیادہ راوی ہوں اور یہی مطلب ہے محدثین کے اس قول کا کہ اس فن میں اقل اکثر پر حاکم ہے۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ غرابت صحت کے منافی نہیں اور یہ ممکن ہے کہ حدیث صحیح غریب ہو یا اس طور پر کہ اس کے سب راوی ثقہ ہوں اور غریب کبھی شاذ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی وہ شذوذ جو حدیث میں طعن کے اقسام میں سے ہیں، یہی شذوذ مراد ہیں۔ صاحب المصابیح کے اس قول سے "هذا حديث غريب" جبکہ وہ بطریق طعن بیان کریں اور بعض نے ثقات کی مخالفت کا لحاظ کئے بغیر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے شاذ کی تفسیر مفرد راوی کے ساتھ کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ (یہ حدیث) صحیح شاذ اور صحیح غیر شاذ ہے پس شذوذ اس معنی کے لحاظ سے بھی غرابت کی طرح صحت کے منافی نہیں البتہ جب مقام طعن میں ذکر کیا جائے تو وہاں ثقات کی مخالفت معتبر ہوگی اس لئے وہ صحت کے منافی ہے۔

فصل ہشتم:

ضعیف حدیث وہ ہے جس میں وہ شرائط صحیح اور حسن حدیثوں میں کیا جاتا ہے، تمام یا ان میں سے بعض

مفقود ہوں اور اس کے راوی کی شد و ذکاوت یا کسی علت کی وجہ سے مذمت کی گئی ہو۔ اس اعتبار سے ضعیف حدیث کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں، اسی طرح صحیح لذاتہ اور صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ ان کمال صفات میں مختلف مراتب و درجات کی حامل ہوں گی، جن کا ان دونوں کے مفہوم میں اعتبار کیا جاتا ہے، درآں حالیکہ اصل صحت اور حسن میں ان کے مابین اشتراک ہے۔

محدثین نے مراتب صحت کا انضباط اور اس کی تعیین کر دی ہے اور اسناد میں اس کی مثالیں دی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عدالت اور ضبط تمام رجال حدیث کو شامل ہے تاہم بعض پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مطلقاً کسی خاص سند کو اصح الاسانید (سب سے زیادہ صحیح سند) کہنے میں اختلاف ہے! بعض نے "زین العابدین عن أبیہ عن جدہ" کو اصح الاسانید کہا ہے، بعض نے "مالک عن نافع عن ابن عمر" کو اور بعض نے "سالم عن ابن عمر" کو لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کسی ایک مخصوص سند پر اصح ہونے کا مطلقاً حکم لگا دینا ٹھیک نہیں کیونکہ صحت میں بہت سے مراتب ہیں اور بہت سی اسناد اس میں داخل ہوتی ہیں البتہ اس میں اس انداز کی قید لگا دی جائے کہ یہ فلاں شہر میں اصح الاسانید ہے یا فلاں باب یا فلاں مسئلے میں اصح الاسانید ہے تو صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

فصل نہم:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ اپنی جامع ترمذی میں ایک ایک حدیث پر بیک وقت کئی کئی حکم لگا دیتے ہیں مثلاً یہ "حدیث حسن صحیح" ہے، یہ "غریب حسن" ہے، یہ "حدیث حسن غریب اور صحیح ہے" اس کی توجیہ یہ ہے کہ حسن اور صحیح کے اجتماع کے جواز میں بایں طور شبہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو، اسی طرح غرابت اور صحت کے اجتماع میں بھی شبہ نہیں البتہ غرابت اور حسن کے اجتماع میں لوگوں نے کچھ اشکال محسوس کیا ہے اس لئے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن میں تعدد و طرق کا اعتبار کیا ہے پھر وہ غریب کیونکر ہو سکتی ہے (غریب میں تو طرق متعدد نہیں ہو سکتے) اس کا جواب محدثین یہ دیتے ہیں کہ حسن میں تعدد و طرق کا اعتبار علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس کی ایک قسم میں ہے اور جب حسن اور غرابت کے اجتماع کا حکم لگایا جائے تو اس سے مراد دوسری قسم ہوگی اور بعض طریقوں میں حسن اور بعض کے نزدیک داؤد کے معنی میں ہے یعنی انہیں اس بارے میں یقینی علم نہ ہونے کی وجہ سے شک اور تردد ہے کہ آیا یہ حدیث غریب ہے یا حسن اور بعض نے کہا کہ یہاں حسن سے اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو لیکن یہ قول بہت مستبعد ہے۔

فصل دہم:

حدیث صحیح کا احکام میں حجت ہونا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، اسی طرح عام علماء کے نزدیک حسن لذاتہ ہے کہ وہ بھی قابل حجت ہونے میں صحیح کے ساتھ ملحق ہے گو رتبہ میں صحیح سے کم ہے، ایسے ہی اس حدیث ضعیف کے قابل احتجاج ہونے

میں بھی اتفاق ہے جو تعدد طرق کی وجہ سے حسن لغیرہ کے درجے کو پہنچ جاتی ہو۔

یہ جو مشہور ہے کہ حدیث ضعیف فضائل اعمال میں معتبر ہے اس کے ماسوا میں نہیں تو اس سے مراد مفرد احادیث ہیں نہ کہ وہ احادیث جو متعدد طرق سے مروی ہوں اس لئے کہ ایسی احادیث تو ضعیف میں نہیں بلکہ حسن کے درجے میں داخل ہیں، اس کی صراحت ائمہ حدیث نے کر دی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اگر ضعیف سوء حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے ہو تو اس کا راوی صدق و دیانت سے متصف ہو تو اس کی تلافی تعدد طرق سے ہو جائے گی اور اگر اس کا ضعف اتہام کذب یا شذوذ یا خطائے فاحش کی بنا پر ہو تو تعدد طرق سے اس کی تلافی ممکن نہیں، ایسی حدیث ضعیف ہی قرار پائے گی جو صرف فضائل اعمال میں ہی کارآمد ہوگی، یہی حکم محدثین کے اس مقولے کے لئے بھی ہوگا کہ ”ضعیف کا ضعیف کے ساتھ ملنا قوت کے لئے مفید ہے“ یعنی اس سے بھی وہی ضعیف روایات مراد ہیں جن کے ضعف کی تعدد طرق سے تلافی نہیں ہوتی اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو محدثین کا یہ قول لغو قرار پائے گا۔ فتحدیہ۔

فصل یازدہم:..... مراتب کتب کے بیان میں:

جب مراتب صحیح میں تفاوت ہے کہ بعض بعض سے زیادہ صحیح ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ جمہور محدثین کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ صحیح بخاری حدیث کی تمام تصنیف شدہ کتابوں میں مقدم ہے یہاں تک کہ ان کا قول ہے کہ ”اصح الکتاب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری“ ”کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے“ البتہ بعض مغاربہ نے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے صرف حسن بیان، وضع و ترتیب کی خوبی، دقیق اشارات کی رعایت اور اسناد میں نکات کی خوبیوں کو ہی پیش نظر رکھا ہے حالانکہ اس بناء پر ترجیح وغیرہ ترجیح خارج از بحث ہے، اصل گفتگو صحت و قوت اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں ہے اور اس لحاظ سے کوئی کتاب ان شرائط اور کمال صفات کی بنا پر صحیح بخاری کے برابر نہیں، جن کا امام بخاری نے صحت کے متعلق رجال حدیث میں خیال رکھا ہے اور بعض نے ان دونوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں توقف کیا ہے لیکن پہلا مسلک صحیح ہے (جس کی رو سے صحیح بخاری کو ترجیح حاصل ہے)۔

وہ حدیث جس کی تخریج میں امام بخاری و امام مسلم متفق ہوں اسے ”متفق علیہ“ کہا جاتا ہے، شیخ (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ) کہتے ہیں بشرطیکہ وہ ایک ہی صحابی سے ہوں، محدثین نے کہا کہ متفق علیہ احادیث دو ہزار تین سو چھپیس ہیں۔ مختصر یہ کہ جس پر شیخین (امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ) متفق ہوں وہ دوسری حدیثوں پر مقدم ہیں۔ دوسرے نمبر وہ احادیث ہیں جنہیں صرف امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا، پھر وہ جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا، اس کے بعد ان احادیث کا نمبر ہے جو بخاری و مسلم کی شرطوں کے مطابق ہوں۔ اس کے بعد ان کے علاوہ ان ائمہ کی روایت کردہ حدیثیں ہیں جنہوں نے صحت کا التزام کیا ہے اور ان کی تصحیح کی ہے، اس طرح کل سات قسمیں ہوں گی۔

بخاری و مسلم کی شرط سے مراد یہ ہے کہ رجال حدیث ان صفات کے ساتھ متصف ہوں جن کے ساتھ بخاری و مسلم کے رجال ضبط و عدالت، عدم شذوذ و نکارت اور عدم غفلت میں متصف ہیں، اور بعض کے نزدیک شرط بخاری و مسلم سے مراد یہ ہے کہ اس

کے رجال وہی ہوں جو بخاری و مسلم کے ہیں۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے جس کو ہم نے "مقدمۃ شرح مسند السعاده" میں بیان کیا ہے۔

فصل دوازدهم:

صحیح احادیث صرف بخاری و مسلم میں ہی مضمون نہیں ہیں نہ ان دونوں نے صحیح احادیث کا استقصاء کیا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ان میں جو احادیث ہیں وہ سب صحیح ہیں اور بہت سی ایسی احادیث ہیں جو ان کے نزدیک صحیح تھیں اور ان کی شرائط کے مطابق بھی تھیں

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں میں نہیں لائے چہ جائیکہ ایسی احادیث لاتے جو ان کے علاوہ دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اپنی اس کتاب (جامع صحیح) میں صرف صحیح احادیث ہی لایا ہوں اور بہت سی صحیح احادیث چھوڑ بھی دیں ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں اپنی اس کتاب میں جو احادیث لایا ہوں وہ سب صحیح ہیں تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ جن احادیث کو میں نے چھوڑ دیا ہے وہ ضعیف ہیں۔ البتہ اس ترک و اخذ میں وہ وجوہ محنت اور دیگر مقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور انہیں کے مطابق ایسا کیا گیا ہے۔

امام حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری رحمہ اللہ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "مستدرک" ہے جن صحیح حدیثوں کو بخاری و مسلم نے چھوڑ دیا ہے، ان کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں بیان کر کے اس کی تلافی کی ہے، ان کے علاوہ بعض وہ احادیث بھی بیان کی ہیں، جو ان دونوں کی شرطوں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں اور کچھ ایسی احادیث بھی اس میں لائے ہیں جو تخمین کے علاوہ دیگر ائمہ کی شرائط پر ہیں، امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے آغاز میں کہا ہے کہ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے یہ فیصلہ بھی نہیں دیا کہ ان کی کتابوں میں بیان کردہ احادیث کے علاوہ جو احادیث ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ ہمارے زمانے میں بدعتوں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے ائمہ دین پر زبان طعن و راز کی کہ ان احادیث کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی اور امام بخاری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد تھیں، اس صحیح سے ان کی مراد بظاہر (واللہ اعلم) وہ صحیح ہے جو ان کی شرطوں کے مطابق ہو۔

اس کتاب یعنی بخاری میں تکرار کے ساتھ بیان کی ہوئی احادیث کی تعداد سات ہزار دوسو پچھتر (۷۲۷۵) اور حذف تکرار کے بعد چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔ دوسرے کئی ائمہ نے بھی صحاح تصنیف کی ہیں جیسے "صحیح ابن خزیمہ" انہیں امام الائمہ کہا جاتا ہے اور ابن حبان کے شیخ (استاد) ہیں، ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کی تعریف میں کہا ہے کہ میں نے روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو علم حدیث میں ان سے بڑھ کر ہو اور حدیث کے صحیح الفاظ ان سے زیادہ رکھنے والا ہو۔ گویا تمام احادیث ان کی نظروں کے سامنے تھیں اور جیسے ان (ابن خزیمہ رحمہ اللہ) کے شاگرد ابن حبان رحمہ اللہ کی صحیح ہے جو ثقہ ثابت فاضل اور فہیم امام ہیں، امام حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری رحمہ اللہ جو حافظ و ثقہ ہیں، کی صحیح ہے جس کا نام "مستدرک" ہے،

ان کی اس کتاب میں کچھ مسائل راہ پایا گیا ہے جس پر لوگوں نے گرفت کی ہے، لوگوں نے کہا ہے کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان حاکم رحمہما اللہ سے زیادہ قوی و مستند اور اسانید و متون میں زیادہ بہتر اسلوب کے حامل ہیں اور جیسے حافظ ضیاء مقدسی کی مختارہ (مجموعی حدیث) ہے جس میں انہوں نے وہ صحیح حدیثیں بیان کی ہیں جو بخاری و مسلم میں نہیں ہیں اور محدثین نے ان کی کتاب ”مختارہ“ کو مستدرک سے اچھا قرار دیا ہے اور جیسے ابن عوانہ اور ابن اسکن کی ”صحیح“ اور ابن جارود کی ”المستقی“ یہ بھی وہ کتابیں ہیں جن میں بطور خاص صحیح احادیث کا اہتمام کیا گیا ہے تاہم بعض لوگوں نے ان کتابوں پر غلط یا صحیح تنقید بھی کی ہے۔ و فوق کل ذی علم علیہ ہر صاحب علم سے بڑھ کر صاحب علم موجود ہے۔

فصل سیزدہم:

وہ چھ کتابیں جو مشہور ہیں اور اہل اسلام میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں ان کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:

① صحیح بخاری، ② صحیح مسلم، ③ جامع ترمذی، ④ سنن ابی داؤد، ⑤ سنن نسائی، ⑥ سنن ابن ماجہ

اور بعض کے نزدیک چھٹی کتاب ابن ماجہ کی جگہ موطا امام مالک ہے۔ صاحب جامع الاصول نے بھی موطا کو اختیار کیا ہے (اور بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر چار کتابوں میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں ہیں لیکن ان سب کا نام ”صحاح ستہ“ تغلیب کے طور پر ہے۔ صاحب المصاحح نے صحیحین کی حدیثوں کے علاوہ دیگر کتابوں کی احادیث کا نام حسن رکھا ہے جو اسی طریق تغلیب اور معنی لغوی کے قریب ہے یا یہ ان کی اپنی کوئی نئی اصطلاح ہے، اور بعض کے خیال میں سنن دارمی کو چھٹی کتاب شمار کیا جاتا زیادہ مناسب اور لائق ہے، اس لئے کہ اس کے رجال میں ضعف کم اور اس کی احادیث میں منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں، اس کی سندیں عالی ہیں اور اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں۔

یہ مذکورہ کتب وہ ہیں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں تاہم ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں شہرت کی حامل ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”جمع الجوامع“ میں بہت سی کتابوں سے حدیثیں لی ہیں جن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور جو صحیح و حسن و ضعیف حدیثوں پر مشتمل ہے، اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اس کتاب میں ایسی کوئی حدیث نہیں لایا جو وضع کے ساتھ موسوم ہو اور جس کے زرد اور ترک پر محدثین کا اتفاق ہو اور صاحب مشکوٰۃ نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کئی ائمہ محققین کا ذکر کیا ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دار قطنی، امام بیہقی اور امام رزین رحمہما اللہ، ان کے علاوہ دوسرے ائمہ کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ ہم نے ان سب ائمہ کے حالات الگ ایک کتاب ”الا کمال ہذا کر اسماء الرجال“ میں لکھے ہیں۔ ومن اللہ التوفیق وهو المستعان فی البیداء والمعاد۔

تنبیہ: مصطلحات حدیث کا یہ مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ہے جو عربی زبان میں ہے اور یہ اردو ترجمہ مولانا عبدالحلیم علوی رحمہ اللہ صاحب کا ہے، میں نے اسی کو نقل کیا ہے۔



عرض حال

بندۂ عاجز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عرض کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہوئی تو میں نے قریباً سولہ سال کی عمر میں ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء میں ہری پور ہزارہ صوبہ سرحد کے مدرسہ ربانیہ ریلوے اسٹیشن میں درجہ اولیٰ میں پڑھنا شروع کیا، پھر میں نے درجہ ثانیہ الہیاء القرآن مدرسہ ایبٹ آباد میں پڑھا اور درجہ ثالثہ میں نے پھر مدرسہ ربانیہ ہری پور میں پڑھا، میں نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء دو سال تک دارالعلوم کورنگی کراچی میں درجہ رابعہ اور خامسہ پڑھا، ۱۹۷۳ء میں نے درجہ سادسہ کی کتابیں گوجرانوالہ اشرف العلوم میں پڑھیں، ۱۹۷۴ء میں نے جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں درجہ سادسہ کی مختلف کتابیں شروع کیں مگر بیماری کی وجہ سے تین ماہ بعد ایبٹ آباد پر کیمال میں جا کر سال گزارا، ۱۹۷۵ء میں مزید علوم پڑھنے کے لئے میں نے مدرسہ مظہر العلوم چنگورہ سوات میں داخلہ لیا اور درجہ سابعہ وہیں پر حضرت اقدس مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پڑھا، ان کے ہاں میں نے دو سال گزارے ہیں، آپ سے میں نے مشکوٰۃ شریف مکمل پڑھی اور فن ادب میں دیوان شتبی، فقہ میں ہدایہ آخرین پڑھی، یہ میری زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں میرے رب نے مجھے حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض سے فن حدیث اور فن ادب دونوں سے وافر حصہ عطا فرمایا۔ حضرت مولانا کی اجازت سے میں دورہ حدیث کے لئے ۱۹۷۷ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی آیا اور داخلہ لیا، بخاری شریف کے دونوں حصے محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھے، سہ ماہی امتحان کے دوران حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے تو بخاری جلد ثانی ان سے پڑھی، جامع ترمذی حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹوکی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، بنوری ٹاؤن میں حضرت بنوری کا یہ آخری سال تھا، اسی مہارک جامعہ سے میں نے تکمیل تعلیم کی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں اجازت حدیث اور سلسلہ سند بھی درج کروں کیونکہ "الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء" محدثین عظام کے ہاں معروف ضابطہ اور قابل اعتماد اور قابل بھروسہ سلسلہ ہے چنانچہ میرے بڑے اساتذہ میں سے حضرت اقدس حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد سواتی اور حضرت اقدس حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹوکی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہیں جو براہ راست شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اس طرح بندہ کو ایک واسطہ سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، بندہ نے بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں اپنے رفقاء کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف کا ایک سبق پڑھا ہے اس سے بھی سند عالی درجہ تک جا پہنچتی ہے لیکن ہمیں برکتہ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں جو دو سندیں عطا فرمائی ہیں پہلے ان کو یہاں نقل کرتا ہوں۔
سند حدیث ①:

① فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن شیخ الحدیث مولانا زکریا عن مولانا محمد یحییٰ عن مولانا رشید احمد گنگوہی عن مولانا شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

② فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا عن مولانا خلیل احمد سہارنپوری عن شیخ عبدالقیوم بدھانوی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

③ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن محدث العصر مولانا محمد یوسف البنوری عن شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی و شاہ انور شاہ کشمیری عن شیخ الہند محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ عن جتہ الاسلام قاسم نانوتوی عن شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

④ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن فقیہ العصر شیخ کامل مولانا فضل محمد سواتی عن شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی عن امام الہند و شیخ الہند محمود حسن عن جتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی و فقیہ النفس مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی عن شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

⑤ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن محدث العصر مولانا سید محمد یوسف البنوری عن الشیخ لمة اللہ عن ابیہا شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ۔ رحمہ اللہ هؤلاء الاماثل الاجہاد رحمة واسعة وجعل قبورهم روضات من ریاض الجنة۔

فراغت و تدریس:

فراغت کے بعد میں نے ایک سال ایک گمنام مدرسہ میں تدریس کی اور پھر جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی میں آٹھ سال مسلسل تدریس کے فرائض انجام دیئے، طحاوی شریف اور سنن ترمذی جلد ثانی پڑھانے کا موقع بھی ملا، پھر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی شاخ مدرسہ عربیہ اسلامیہ بلیر میں بندہ کا تقرر مفتی احمد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہاں دو سال تک ابتدائی درجات میں تدریس کا موقع ملا اور پھر ۱۹۸۷ء میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمان رحمۃ اللہ علیہ کی نوازش اور فرمائش پر مرکز علوم جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تبادلہ ہوا اور جمعرات ۱۹ شوال ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء میں اس مقدس درسگاہ میں تدریس کا آغاز کیا، اسی سال بندہ کو پڑھانے کے لئے مشکوٰۃ شریف جلد اول ملی اور ۱۴۰۹ھ سے لے لے ۱۴۱۷ھ تک مکمل آٹھ سال میں نے مشکوٰۃ شریف جلد اول پڑھائی اور پھر ۱۴۱۷ھ سے، اس وقت ۱۴۲۲ھ تک الحمد للہ مشکوٰۃ

شریف جلد ثانی پڑھا رہا ہوں۔

مشکوٰۃ شریف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس مولانا فضل محمد صاحب سوانی رحمہ اللہ کو خصوصی مہارت عطا فرمائی تھی، بندے نے آپ کے درس کو مکمل طور پر قلم بند کیا اور پھر پڑھانے کے زمانے میں رات بھر کی محنت سے مختلف شروحات کا مطالعہ کیا اور مختلف شروحات سے واضح اور اہم مباحث کو ایک مسودہ میں جمع کیا، ہر درس کے ساتھ تاریخ بھی لکھ دی اور پھر درس کی مقدار سبق کو الگ الگ لکھ دیا، اس طرح سوال سے لے کر رجب کی دس تاریخ تک ہر سبق مع تاریخ متعین ہو گیا، میں مسلسل اس مسودہ سے استفادہ کرتا رہا کیونکہ یہ کئی کتب اور کئی شروحات کا چمچڑ ہوتا تھا پھر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جب مشکوٰۃ جلد دوم کے پڑھانے کا موقع ملا تو میں نے اس کے اسباق کا بھی اسی طرح انضباط کیا، رات گئے تک صبح کے درس کے لئے مطالعہ بھی ہوتا تھا اور روزانہ مسودے کا ایک پرچہ بھی تیار ہوتا تھا اس طرح مشکوٰۃ شریف کے مباحث کا مکمل مسودہ تیار ہو گیا، جس نے تقریباً چودہ سال بعد شرح کی صورت اختیار کی۔

مجھے بعض اوقات بعض طلبہ اور بعض احباب اس طرف توجہ دلاتے رہے کہ آپ اس مجموعہ کو کتابی شکل میں شائع کر دیں مگر میں دل و دماغ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے کہ یہ ایک بھاری بھر کم کام تھا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک داعیہ پیدا فرمایا جس کی وجہ سے میں خود بعض بزرگوں سے مشورہ کرنے لگا کہ میں یہ ارادہ رکھتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ بعض احباب نے ہاں کہہ کر تحسین فرمائی مگر بعض کرم فرماؤں نے تو اس پر زور دیا کہ اس کام کو ضرور کرنا ہے، مدینہ منورہ میں جب ادائیگی عمرہ کے مبارک موقع پر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ میں بندہ نے ایک علم دوست اور بیدار مغز شخصیت حضرت مولانا عبدالوحید عبدالحق مدظلہ کے سامنے یہ تذکرہ کیا تو آپ نے ضرورت سے زیادہ اس میں دلچسپی لی اور فرمایا کہ میں نے مشکوٰۃ شریف برکتہ اعصر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے پڑھی ہے اور کیسٹوں میں موجود ہے، میں اس کو بھی نکال لوں گا، اگر اس میں مباحث مشکوٰۃ سے متعلق مفید باتیں آئیں تو آپ اس کو بھی اپنے تشریحات میں شامل کر لیں اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی لیکن حضرت مولانا نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس سفر مبارک میں بندہ نے دیگر اہل اللہ اور اولیاء اللہ سے اس کام کی تکمیل اور قبولیت کے لئے دعاؤں کی درخواست کی اور پھر مکہ مکرمہ مذاہل اللہ شرقاً میں بیت اللہ کی آغوش میں جمعہ ہفتہ کی درمیانی شب ساڑھے بارہ بجے میزاب رحمت کے سامنے ۱۳ رمضان ۱۴۲۱ھ کو بطور تحریک ان آیات سے ابتداء کی:

مکہ مکرمہ میں شرح مشکوٰۃ کی ابتداء

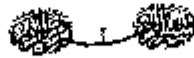


لله نور السنوات والارض مثل نوره كمشكاة فيها مصباح المصباح في زجاجة الزجاجة كأنها كوكب دري يوقد من شهباء مباركة ليتونة لا شرقية ولا غربية يكاد زيتها يقطع ولو له حماسة

نار نور علی نور یدی اللہ لنورہ من یشاء (سورۃ نور ۳۰)

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی (مشکوٰۃ) طاق میں چراغ شیشے کی قدیل میں ہے قدیل گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے جو ریتوں کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے، نہ شرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف، اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، روشنی پر روشنی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں شرح مشکوٰۃ کی ابتداء



وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لكل امرء ما نوى فمن كانت هجرته الى اللہ ورسوله فہجرته الى اللہ ومن كانت ہجرته الى دنیا یصیبها او الى امرأۃ یتزوجها فہجرته الى ما ہاجر الیہ۔

(متفق علیہ)

لیلة الجمعة ساعة واحدة ونصف في المدينة المنورة زادها الله شرفاً في روضة من رياض الجنة
بين منبر النبي وبين بيته وروضته المقدسة۔ (۱۴ رمضان ۱۴۲۱ھ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۰ء)

اللهم تقبله مني واجعله مقبولاً عند العلماء والأولياء وعند طلبة الدين وانفعني به في الدنيا والآخرة واجعله نافعاً للمسلمين آمين يا رب العالمين۔

اما بعد!

بندہ عاجز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عرض کرتا ہے کہ ”توضیحات“ کے نام سے شرح مشکوٰۃ شریف کی ابتداء مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفاً میں جمعہ کے دن بوقت ڈیڑھ بجے رات منبر نبوی اور روضۃ اقدس کے درمیان ریاض الجنۃ کے وسط میں سب سے زیادہ متبرک مقام اسطوانہ عاکثرہ صدیقہ میں ہوئی۔ والحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیراً کثیراً۔

میں اپنے اس رب کا شکر کس زبان اور کس قلم اور کس دل و دماغ سے ادا کروں جس پروردگار نے مجھ جیسے حقیر و فقیر اور مجھ جیسے ہمہ جہت ناکارہ اور مجھ جیسے ضعیف و کمزور کو ان جیسے مقدس مقامات میں حاضری کا موقع عطا فرمایا اور میرے دل میں پیارے نبی ﷺ کی احادیث مقدسہ اور انھیں قدس کی خدمت اور اس کی شرح و توضیح کا داعیہ پیدا کیا پس میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ:

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك الله لا اله الا انت لا شريك لك ولا

مغال لك ولا مثيل لك أنت الفرد الأحد الصمد الذي لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً أحد.
 اللهم صل على سيد الأولين والآخرين امام المتقين جيش الأنبياء والمرسلين صاحب
 جوامع الكلم وصاحب الجمل الاحمر والسيف المشهور وعلى آله الطاهرين واصحابه الطيبين
 الى يوم الدين آمين يا رب العالمين.

کچھ اس شرح کے متعلق

کچھ باتیں اس سے قبل عرض حال کے عنوان کے تحت لکھ چکا ہوں مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ میں نے ”توضیحات شرح مشکوٰۃ“ میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ سب سے پہلے حدیث شریف لکھوں گا اور اس پر مکمل اعراب لگاؤں گا تا کہ حدیث کی عبارت کے پڑھنے میں غلطی نہ ہو پھر حدیث شریف کا واضح لفظی ترجمہ ہوگا اور پھر عنوان کے طور پر توضیح کا لفظ ہوگا، حدیث میں اگر کوئی لغت مشکل ہوگی تو اس کی تحقیق لغوی ہوگی اور پھر اس حدیث کی فقہی بحث ہوگی جو فقہائے کرام کے مذاہب اربعہ کی روشنی میں ہو گی، ہاں اگر مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی مکتب فکر کا کوئی تحقیقی کلام ہوگا تو اس کو بھی زیر بحث لایا جائے گا، فقہی مباحث میں یہ طرز اختیار کروں گا کہ سب سے پہلے یہ بتایا جائے گا کہ زیر بحث حدیث میں کل مذاہب کتنے ہیں اور کن کن فقہائے کرام کے ہیں مثلاً مالکیہ، حنابلہ، شوافع اور احناف کے مسلک کا تذکرہ ہوگا اور پھر ہر ایک کی دلیل کو ذکر کیا جائے گا اور پھر احناف کی دلیل کو ترجیح دی جائے گی اور دیگر حضرات کے مستدلات کی توجیہ، تطبیق اور جواب ہوگا۔

اسی طرز پر مجھے میرے مشفق استاد حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمہ اللہ نے پڑھایا ہے اور یہ طرز بہت آسان اور عام فہم ہے۔ اس شرح میں اس کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا کہ یہ قول کس کا ہے اور کتاب کا حوالہ کیا ہے البتہ یہ اہتمام کیا جائے گا کہ اس شرح میں جن کتابوں اور شروحات سے مسودہ بنانے میں استفادہ کیا گیا ہے اس کو اجمالاً ذکر کر کے مراجع اور مآخذ کی طرف اشارہ کیا جائے گا تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ کلام خود ساختہ نہیں ہے، بعض مواضع میں حوالہ جات بھی آئیں گے لیکن شرح کو آسان رکھنے کے لئے قارئین پر حوالہ جات کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، میرے محترم استاد کا طرز بھی یہی تھا، حدیث شریف جس صحابی سے منقول ہوگی اس صحابی سے متعلق تاریخی بحث نہیں ہوگی کیونکہ میرے استاد محترم نے یہی فرمایا کہ ”ہمارے اساتذہ کا طرز مشکوٰۃ میں کسی صحابی کے حالات بیان کرنے کا نہیں رہا“۔ بہر حال اس کے باوجود بندۂ عاجز نے مشکوٰۃ شریف کی بالکل ابتدائی احادیث میں بعض صحابہ کرام کے متعلق کچھ تاریخی بحث کی ہے جو بالکل قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے ایک چیز کا اہتمام اس شرح میں کیا ہے وہ یہ کہ جتنا سبق میں نے طلبہ کو ایک دن کے درس میں پڑھایا ہے ان کے ساتھ میں نے تاریخ درج کی ہے کہ یہ سبق فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ میں پڑھایا گیا ہے لہذا جب ایک دن اور ایک درس کی احادیث مکمل لکھی جائیں گی تو جب تک ان کی توضیح و تشریح مکمل نہیں ہوگی کسی اور حدیث کو نہیں لکھا جائے گا خواہ شرح کی وجہ سے پورا صفحہ حدیث سے خالی کیوں نہ ہو، اس میں طلبہ اور مدرسین حضرات کے لئے یہ آسانی ہوگی کہ آج کتنا سبق ہونا چاہئے اور اس ماہ میں سبق کہاں تک پہنچ

جاننا چاہئے، اس سے کتاب کے پڑھانے اور وقت پر پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سہولت ہوگی اور ایک تجربہ حاصل ہوگا، ہاں بعض مقامات میں ایسا ہوا ہے کہ مقدار سبق زیادہ لکھی گئی ہے، عنوان میں بھی ایک متعین تاریخ کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن وہ سبق ایک دن میں نہیں ہو سکا بلکہ بحث و مباحثہ کی وجہ سے اس میں دو دن لگے ہیں تاہم یہ بہت کم پیش آیا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ میں نے اس شرح میں ایک خالص مدرس کے لئے مواد اکٹھا کیا ہے لہذا وہ مدرس کے دوران تمام متعلقہ چیزوں کو ایک جگہ پائے گا، خصوصاً ہر کتاب کے ابتدائی مباحث میں آسانی ہوگی، میں نے اس شرح میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا ہے کہ یہ نہ اتنی طویل ہو کہ طلبہ اور قارئین اکتا جائیں اور نہ اتنی مختصر ہو کہ طلبہ تشنگ رہ جائیں بلکہ میں نے اس کو معتدل اور متوسط رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ میں نے بیان کا انداز اس طرح رکھا ہے کہ ہر پڑھنے والا بہت آسانی سے اس کو سمجھ سکے۔ بعض احادیث کے متعلق میں نے آخر میں ”مطلب“ یا ”تعلیم“ کا لفظ لکھا ہے اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ حدیث ہمیں کیا تعلیم دیتی ہے اور اس کا مطلب کیا ہے، میں نے اس شرح میں جمہور امت کا مسلک اختیار کیا ہے اور کسی کے تفرد یا شاذ قول پر اعتماد نہیں کیا ہے نیز میں نے اس شرح میں مشکوٰۃ شریف کی ہر کتاب اور باب کی ابتداء میں اس سے متعلق عمومی بحث بھی کی ہے جو باب کی تمام احادیث سمجھنے کے لئے کافی ہے، اسی طرح میں نے کتاب مشکوٰۃ کے آخر تک تحقیق و توضیح کو جاری رکھا ہے ایسا نہیں کیا ابتداء میں تفصیل اور آخر میں تھلیل ہو بلکہ جلد ثانی میں تفصیل جلد اول سے کم نہیں ہے۔

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا وہ مقدمہ جو انہوں نے اصول حدیث سے متعلق عربی زبان میں لکھا ہے اور علماء نے اسے مشکوٰۃ شریف کی ابتداء میں رکھا ہے اس کا صرف اردو ترجمہ اس شرح کی ابتداء میں لکھا ہے تاکہ طلباء اس سے استفادہ کر سکیں اور خوف طوالت سے عربی عبارت چھوڑ دی ہے، میں نے مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کو مستثنیٰ اور اعراب کے ساتھ بہتر انداز سے کمپوز کروانے کی مکمل کوشش کی ہے، اور ہر باب اور ہر کتاب کی احادیث کو نمبر لگا کر لکھا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ میں نے ہر ہر حدیث کا ترجمہ لکھ دیا ہے خواہ حدیث کی تشریح ہو یا نہ ہو پھر جن شروحات سے میں نے اس شرح میں استفادہ کیا ہے ان میں مندرجہ ذیل شروحات قابل ذکر ہیں:

۱	مرقات شرح مشکوٰۃ	علامہ علی قاری رحمہ اللہ
۲	شرح الخطیبی	حسین بن محمد بن عبد اللہ طبری رحمہ اللہ
۳	لمعات شرح مشکوٰۃ	شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ
۴	اشعة اللمعات	شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ
۵	التعلیق الصبیح	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ
۶	التعلیق الفصیح	حضرت مولانا ٹیپس الدین رحمہ اللہ
۷	تنظیم الاشتات	شیخ حافظ ابوالحسن مدظلہ

علامہ امام طحاوی رحمہ اللہ	طحاوی شریف	۱
مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ ابن مولانا مظفر حیدر آبادی الہند رحمہ اللہ	زجاجة المصابیح (مشکوٰۃ حنفی)	۲
مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری	مظاہر حق جدید	۳

اگر کسی کو حوالہ دیکھنے کی ضرورت ہو یا تسلی کے لئے حوالہ دیکھنا چاہتا ہو تو ان شروحات کے اندر ضرور حوالے ملے گا کیونکہ میں نے انہیں شروحات اور انہیں کتب سے استفادہ کیا ہے پھر بھی میں حوالہ دینے کی کوشش کروں گا لیکن چونکہ میں تھا اس کام کا احاطہ آسانی سے نہیں کر سکوں گا اس لئے معذرت خواہ ہوں، بہر حال ان تمام شروحات سے استفادہ کے باوجود اس شرح میں میرے محترم استاد محقق زمان حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمہ اللہ کی وہ توضیحات اور وہ مبارک دروس بھی شامل ہیں جو مشکوٰۃ شریف پڑھنے کے دوران میں نے ان سے سن کر ضبط کر لئے تھے، بلکہ اس شرح میں حضرت اقدس کے یہ مبارک دروس بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر شرح کی عمارت کھڑی ہے۔

قارئین سے ایک بار پھر عرض ہے کہ میں نے جمع و ترتیب میں کافی محنت اور احتیاط سے کام لیا ہے لیکن چونکہ یہ شرح ایک طویل الذیل کام ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس میں مسائل و فضائل کے بیان میں کہیں کوئی فرق آگیا ہو اور غلطی رہ گئی ہو اس لئے قارئین سے امتحان ہے کہ وہ بطور خیر خواہی بندہ ناچیز کو مطلع فرمائیں، اللہ تعالیٰ میری سوچ اور میرے قلم کو ہر لغزش اور اغراط و تفریط سے بچائے۔ آمین یا رب العالمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی نبیہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

گو تالہ تار سا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

(حضرت مولانا) فضل محمد یوسف زئی (صاحب دامت برکاتہم)

استاد حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

یکم محرم الحرام سال نو ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۷ مارچ ۲۰۰۱ء



علماء و طلباء اور مدارس کا ثبوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے لئے دو دعائیں مانگی تھیں، ایک کا تعلق کھانے پینے اور مادیات سے تھا اور دوسری دعاء کا تعلق روحانیات سے تھا، رزق اور مادیات کی دعا اس طرح تھی:

وَاذْ قَالِ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَاَرْزُقْ اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مِنْ اٰمِنٍ مِنْهُمْ بِاٰلِهَةِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالِ وَمَنْ كَفَرًا فَمَتِّعُهُ قَلِيْلًا ثُمَّ اضْطَرُّهُ اِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَهُوَ الْبَصِيْرُ

(سورۃ بقرہ ۱۲۶)

”یعنی اہل مکہ میں سے جو اللہ تعالیٰ اور حشر نشر پر ایمان لائے ان کو دنیا کے پھلوں سے روزی عطا فرما اللہ تعالیٰ چونکہ رب العالمین ہے اس لئے فرمایا کہ روزی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کافروں کو بھی دوں گا البتہ کفر و شرک کی سزا آخرت میں کافروں کو دوں گا۔“

روحانیات کی دعاء اس طرح تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (سورة بقره ١٢٩)

اس دعا میں ایک شان والے رسول کی درخواست تھی جو انہی قریش میں سے ہو اور سرزمین مکہ سے ہو یعنی انہی کے خاندان کا ایک فرد ہو، فرشتہ اور جنات میں سے نہ ہو نیز اسی علاقے کا ہو، باہر سے نہ آیا ہو، یہ دعا درحقیقت محمد عربیؐ کے لئے تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور خود نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میں دعائے ابراہیم اور بشارت عیسیٰ اور والدہ آمنہ کے خواب کے نتیجہ میں آیا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں نبی کریم ﷺ کے چار وظائف اور ذمہ داریوں کا بھی ذکر فرمایا تھا کہ اس رسول کی پہلی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ تیری آیتوں کو پڑھ پڑھ کر اہل مکہ کو سنائے گا، دوسری ذمہ داری یہ کہ وہ ان کو تیری کتاب کی تعلیم دے گا، تیسری یہ کہ ان کو حکمت و دانائی اور احادیث کی تعلیم دے گا، چوتھی ذمہ داری یہ کہ وہ ان کا تزکیہ نفس فرمائے گا۔

ان چار فرائض نبوت میں جو دوسری قسم "و یعلہم الکتاب" کی ذمہ داری ہے اس سے منصوص طور پر علماء و طلباء اور نظام تعلیم ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ یعلہم میں معلم آگیا خواہ وہ قاری ہو، حفظ و ناظرہ کا استاد ہو یا درس نظامی کا مدرس ہو یا شیخ الحدیث ہو، معلم میں سب آگئے بشرطیکہ وہ دینی مدارس میں پڑھا رہا ہو، اسکول کالج میں نہیں کیونکہ شریعت نے انگریزی کے محکمہ تعلیم کی ترغیب نہیں دی ہے۔

”یعلّمہ“ کے بعد آیت میں لفظ ”ھم“ ہے، اس لفظ سے طلباء ثابت ہو گئے کیونکہ معلم پڑھانے والا مدرس ہو، اور جن کو وہ پڑھا رہا ہے وہ ان کے طالب علم ہوئے تو دو چیزیں یعنی مدرس اور طالب علم قرآن کی صریح آیت سے ثابت ہوئے تو اب اگر کوئی کہے

کہ یہ مولوی اور طلباء کدھر سے آگئے ہیں؟ تو ان کو جواب دینا چاہیے کہ جس وقت سے لوح محفوظ اور آسمان اول سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے علماء و طلباء آئے ہیں، اس آیت میں تیسری چیز "الکتاب" ہے کہ معلم طالب علم کو کیا پڑھائے گا، ان کا نظام تعلیم کیا ہوگا؟ تو بتا دیا کہ "الکتاب" یعنی قرآن کریم ان کا نظام تعلیم ہوگا خواہ اجمال سے پڑھائے یا تفصیلات میں جائے، اس لفظ سے مسلمانوں کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا تعین ہو گیا۔ اب اگر کوئی کہہ دے کہ مدارس دینیہ میں یہ تعلیم کہاں سے آئی؟ تو ان کو جواب ملے گا کہ جب سے آسمان سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے دینی مدارس کی یہ تعلیم اور یہ نصاب آیا ہے، یہ تین چیزیں تو قرآن کریم کی نص اور واضح آیت سے ثابت ہیں، اب یہ معلم اور استاد جب طلبہ کو پڑھائے گا تو ایک طرف استاد بیٹھے گا، سامنے طالب علم ہوگا اور بیچ میں دینی تعلیم کی کتاب ہوگی، اس بیٹھنے کے لئے جگہ چاہیے لہذا وہ جگہ یا مسجد ہوگی یا مدرسہ ہوگا لہذا اقتضاء النص کے طور پر اس آیت سے مسجد اور مدرسہ ثابت ہو گیا، اب اگر کوئی پوچھے کہ یہ مدارس کہاں سے آئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے مدارس آئے ہیں، لہذا معلم، متعلم، نظام تعلیم اور مدارس سب نص قرآنی سے ثابت ہیں اور مستند ہیں، اس میں کسی کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

مدارس کا تاریخی پس منظر

مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے دارالرقم بن ابی ارقم میں مدرسہ قائم فرمایا جو نو وارد یا مقامی صحابہ دین اسلام کے متعلق سیکھنا چاہتے تھے وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس اس خفیہ مدرسہ میں جاتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یہیں پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مسجد نبوی ﷺ میں "صفہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا جس میں کبھی اسی اور کبھی کم یا زیادہ طالب علم ہوتے تھے، یہ طلبہ جہاں علم حدیث اور مسائل سیکھتے تھے وہیں پر قطعہ منظرہ کے طور پر جہاد کے لئے بھی تیار رہتے تھے اور ضرورت پڑنے پر میدان جنگ میں نکلتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ انہیں طلباء میں سے ایک تھے، پھر جب اسلام جزیرہ عرب سے باہر نکلا اور شام فتح ہوا تو جامع دمشق میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں سینکڑوں صحابہ کرام اور تابعین دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور چونکہ دمشق افریقہ اور مغربی ممالک کے لئے دروازہ تھا تو یہی لوگ آگے چل کر میدان جہاد میں حصہ لیتے تھے۔

پھر جب مصر فتح ہوا تو وہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مساجد اور مدارس کی بنیاد ڈال دی، کچھ تغیر اور تبدیلی کے بعد جامع ازہر کو اسی علمی سفر کا تاریخی ثبوت حاصل ہے، پھر جب فارس اور عراق فتح ہوئے تو جامع کوفہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا جو مدرسہ عبداللہ بن مسعود کے نام سے مشہور ہوا جس میں ہزاروں طلبہ صحابہ کرام اور تابعین علوم سیکھتے تھے، کہتے ہیں یہ ایک فوجی چھاؤنی بھی تھا اور مدرسہ بھی تھا جس میں کبھی کبھی تیس ہزار تابعین اور صحابہ کرام ہوتے تھے، یہ مدرسہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں تھا اور کوفہ چونکہ مشرقی ممالک کے لئے دروازہ تھا، لہذا یہیں سے پڑھ کر طلبہ آگے جاتے تھے اور میدان جہاد میں حصہ لیتے تھے، حضرت ابن

مسعود بنی ہاشم کے بعد آپ کے شاگرد اسود و علقمہ رضی اللہ عنہما نے اس مدرسہ کو سنبھالا پھر ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ نے اس کی نگرانی کی اور پھر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کا اہتمام سنبھالا اور اس کے بعد آپ کے شاگردوں نے اسے چلایا۔

کوفہ کے بعد وسط ایشیا اور برصغیر مدارس اسلامیہ سے بھر گیا، سلطان محمود غزنوی رضی اللہ عنہ نے جب ہندوستان فتح کیا تو ہزاروں مدارس ان علاقوں میں قائم کئے، مثل بادشاہوں نے بڑھ چڑھ کر مدارس کے قیام میں حصہ لیا حتیٰ کہ عورتوں نے بھی مدارس بنائے اور چلائے، مدرسہ النساء میں ایک ہزار عورتوں نے حفظ قرآن کیا پھر سلطنت عثمانیہ نے مدارس کا سرکاری طور پر اہتمام کیا اور ہر طرف دینی مدارس کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

ترقی کے بعد زوال:

چونکہ یہ مدارس حکومت کی سرپرستی میں چلتے تھے لہذا جب اسلامی خلافت کمزور پڑ گئی اور سلطنت عثمانیہ زوال پذیر ہو گئی تو مدارس بھی گھٹ گئے اور جب خلافت بالکل ختم ہو گئی اور انگریز برصغیر پر قابض ہو گیا تو تقریباً مدارس کا وجود ختم ہو گیا، عرب حکمرانوں نے اسکول و کالج کے ساتھ اسلامی مدارس کو جوڑ دیا اور آزاد مدرسے ختم ہو گئے اس لئے آزاد علماء کا پیدا ہونا بھی ختم ہو گیا۔

اسی مابوسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو علمی درس گاہ مدرسہ عالیہ اسلامیہ دیوبند کے نام سے قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور آپ نے ایک آزاد اسلامی مدرسہ قائم فرمایا اور لکھا کہ جب تک یہ مدرسہ عام مسلمانوں کے چندوں سے چلے گا یہ ترقی کرتا رہے گا، چنانچہ الحمد للہ آج تک یہ مدرسہ کسی شخص یا حکومت کے احسان کے نیچے دبا ہوا نہیں ہے لہذا اس سے آزاد علماء پیدا ہو رہے ہیں جو حق کا خوب اعلان کرتے ہیں، عرب کو یہ چیز میسر نہیں، دیوبند کے طرز پر الحمد للہ اب ہزاروں مدرسے ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں قائم ہو گئے، اب انگریز ظالم پھر پریشان ہو گیا کہ یہ مدارس کیوں چل رہے ہیں؟ حالانکہ اس ظالم نے پہلے خود ان مدارس اور مساجد میں علماء کو محدود کر کے رکھا اور معاشرہ میں علماء کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تاکہ یہ علماء ان مساجد و مدارس میں بھوکے مرجائیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں مدارس میں علمائے کرام کو ترقی عطا فرمائی، اب یہ ظالم انگریز علماء کو مساجد و مدارس سے بھی نکالنا چاہتے ہیں مگر انشاء اللہ جس طرح انگریز ذلیل و خوار ہو کر برصغیر اور پھر افریقی ممالک سے نکل کر بھاگ گیا ہے اور اب لندن و برطانیہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے یہ اس سے زیادہ محدود ہو جائے گا اور دینی مدارس ترقی کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

موسم ۱۸ شوال ۱۴۰۹ھ

۱۔ صفة النية في العلم:

قال الله تعالى: وما أمروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين. (سورة البقرة)

ترجمہ: ”اور ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ غاص اللہ کی عبادت کرو۔“

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دین اسلام کا کوئی عمل صحیح نیت کے بغیر مقبول نہیں، ہر نیک عمل پر ثواب اس وقت مرتب ہوتا ہے جبکہ اس میں نیت خالص اللہ کی رضا کی ہو، اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جو عمل اچھی نیت کے ساتھ ہو وہ پائیدار ہوتا ہے خواہ چھوٹا عمل ہی کیوں نہ ہو اور جس عمل میں اخلاص نہ ہو وہ پائیدار نہیں ہوتا اگرچہ بڑا عمل ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے نیک ارادے سے صفاء مردہ کے درمیان ایک دوڑ لگائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا قبول فرمایا کہ قیامت تک کے آنے والے حاجیوں پر لازم قرار دے دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے منیٰ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے شیطان پر کنکریاں ماری تھیں، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو تمام حاجیوں پر واجب کر دیا، یہ اخلاص کی علامت اور نتیجہ ہے، لہذا علم دین شروع کرنے سے پہلے نیت کو خالص رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”انما الاعمال بالنیات“ کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ ”تعلیم المتعلم“ میں ایک حدیث مذکور ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بہت سارے اعمال ظاہری شکل سے دنیاوی لگتے ہیں مگر اچھی نیت کی وجہ سے وہ آخرت کے اعمال بن جاتے ہیں اور بہت سارے اعمال ایسے ہیں جو ظاہری صورت میں آخرت کے اعمال دکھائی دیتے ہیں مگر بری نیت کی وجہ سے وہ دنیوی عمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صحیح نیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طالب علم یہ نیت کرے کہ میں یہ علم حضور اکرم ﷺ کی نیابت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور دین اسلام کی اشاعت و ترقی کے لئے پڑھتا ہوں۔

سلف صالحین کے زمانے میں نیت کی خرابی کا خطرہ زیادہ ہوتا تھا اس لئے کہ اس وقت دنیاوی مناصب اور دنیا کے عہدے سب علم دین کی وجہ سے ملتے تھے، جو آدمی زیادہ بڑا عالم ہوتا تھا وہ حکومت کے زیادہ بڑے منصب پر فائز ہوتا تھا، خلیفہ ہوتا، وزیر، گورنر اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بننا اسی علم دین سے وابستہ تھا تو نیتوں میں فتور آنے کا امکان زیادہ تھا، چنانچہ مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ تھا جو وقت کے بادشاہ نے سرکاری طور پر قائم کیا تھا جس میں امام غزالی رحمہ اللہ بھی طالب علم تھے، بادشاہ وقت بھییں بدل کر آئے اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ سچ بتاؤ علم پڑھنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ ہر ایک نے اپنا مقصد بتایا، کسی نے کہا علم پڑھ کر وزیر بنوں گا، کسی نے کہا گورنر بنوں گا، کسی نے کہا قاضی اور جج بنوں گا۔ الغرض ہر ایک نے دنیوی مناصب میں سے کسی نہ کسی منصب کا ذکر کیا، بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا میں تو چاہتا ہوں کہ اس مدرسے کو تالا لگا کر بند کر دوں کیونکہ یہاں تو سب دنیوی غرض لے کر پڑھنے آئے ہیں پھر آخر میں بادشاہ نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ بتاؤ اس علم پڑھنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا میں ”نیابۃ عن رسول اللہ ﷺ“ اس دین کی خدمت کروں گا، بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ بس اب مدرسہ جاری رہے گا کیونکہ اگر ایک طالب علم بھی اس اچھی نیت کی بنیاد پر پڑھ رہا ہے تو ہمارا سال بھر کا خرچ ضائع نہیں جائے گا، یہ طالب علم غزالی تھے جو بعد میں امام غزالی کے نام سے مشہور ہوئے جس پر سال بھر کا خرچ کرنا واقعی مناسب تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پہلے زمانے میں نیتوں میں خرابی کا امکان زیادہ تھا، آج کل تو علوم دینیہ پڑھنے والوں کی نیتیں خود بخود

درست ہو جاتی ہیں کیونکہ اس علم کے ساتھ حکومتی سطح پر کوئی منصب وابستہ نہیں ہے بلکہ جو جتنا زیادہ پڑھے گا اتنا ہی زیادہ حکومت کے مناصب سے دور ہوتا جائے گا، آج کل اگر کوئی طالب علم اپنی نیت خراب رکھتا ہے تو وہ صرف امامت و خطابت کی امید پر یا اپنے والد کی جگہ اہتمام یا نظامت و امامت یا دیگر معمولی سے کاموں کی وجہ سے نیت خراب کرے گا جس میں دو تین ہزار تنخواہ کے سوا کچھ نہیں اور مشقت بہت ہے، اگر یہی طالب علم دین اسلام کی خدمت کا ارادہ دل میں رکھے تو اللہ تعالیٰ یہ حقیر دنیا بھی اس کو عطا کرے گا اور دین کے لئے بھی اسے قبول فرمادے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا۔

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِلْمَعَادِ
فَازَ بِفَضْلِ مِنَ الرَّشَادِ
فِيَا لِحُسْرَانِ طَالِبِيهِ
لَنَيْلِ فَضْلٍ مِنَ الْعِبَادِ

”جس نے آخرت کے لئے علم پڑھا وہ ہدایت و رہنمائی میں خوب کامیاب ہوا اور وہ طلبہ کتنے ہی خسارے میں پڑ گئے جو بندوں سے حصول مال کے لئے علم پڑھتے ہوں۔“

خلاصہ یہ ہے کہ طالب علم کو چاہئے کہ وہ خوب سوچ کر یہ دیکھے کہ ان کی یہ بڑی محنت کہیں حقیر و ذلیل دنیا کی بھینٹ تو نہیں چڑھ رہی ہے۔ ”انما الاعمال بالنیات“ کی حدیث سب کو معلوم ہے کہ ہجرت جیسا عظیم عمل نیت کی خرابی سے کس طرح خراب ہوا۔

طالب علم کو یہ بھی چاہئے کہ وہ کسی کے سامنے اپنی عزت نفس کو پامال نہ کرے اور بے جا لالچ اور حرص سے اپنے علمی سفر کو تباہ نہ کرے بلکہ عزت و عظمت اور سنجیدگی اور وقار اور استقناء سے وقت گزارے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے ”عَظِّمُوا عَمَلَكُمْ كُمْ وَوَسَّعُوا أَنْفُسَكُمْ“ یعنی اپنی پگڑیاں بڑی رکھو اور کرتوں کی آستین کھلی رکھو۔

(تعلیم النفع)

یہ اس لئے فرمایا تا کہ طالب علم اور عالم عوام الناس میں باوقار معلوم ہوں نہ کہ محتاج اور لالچی و حقیر، اسی طرح صحت نیت کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم اس لئے علم حاصل نہ کرے کہ میں لوگوں کے ہاں مرجع بن جاؤں گا، سب لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف موڑ دوں گا یا علامۃ الدھر اور فقیہ العصر کے نام سے مشہور ہو جاؤں گا، یہ سب تباہی کی چیزیں ہیں، نیت صحیح رکھے گا تو دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔

② جہد العلم:

کسی بھی علم کے لئے اس میں محنت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اگر کوئی طالب علم بہت اچھی نیت رکھتا ہے مگر محنت نہیں کرتا ہے تو وہ حصول علم کے مقصد کو نہیں پاسکتا، گویا مقصود تک پہنچنے کے لئے جس طرح صحیح نیت کی ضرورت ہے اسی طرح صحیح محنت کی بھی ضرورت ہے، صرف محنت بغیر نیت کے یا صرف صحیح نیت بغیر محنت کے دونوں صورتیں ناکامی کی ہیں، اس لئے ہر طالب علم پر

لازم ہے کہ وہ صحیح نیت کے ساتھ ساتھ بھرپور محنت کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ”الٰہی لا اضعیٰ عمل عامل منکم من ذکر او انسیٰ“ کہ میں کسی کا عمل اور محنت ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔“

اسی طرح احادیث مقدسہ میں بھی محنت و مشقت کی بڑی ترغیب اور فضیلت موجود ہے، قرآن کریم میں ہے: ”والذین جاہدوا فیہا لنہدیہم سبلنا“ ایک جگہ ارشاد ہے: ”یا یحییٰ خذ الکتاب بقوة“ اسی طرح اس امت کے حکماء اور عقلاء اور علماء نے فرمایا ہے کہ ”مَنْ ظَلَبَ شَيْئًا وَجَدَ وَجَدَ وَمَنْ قَرَعَ الْبَابَ وَجَدَ وَجَدَ“ یعنی جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنا مقصود پالیتا ہے۔ اس جملہ کو اس طرح مختصر بھی پڑھا جاسکتا ہے ”مَنْ جَدَّ وَجَدَ وَمَنْ قَرَعَ الْبَابَ وَجَدَ“ یہ بھی حکماء نے لکھا ہے: ”يَقْنَدُ مَا تَتَبَلَى تَنَالُ مَا تَتَبَلَى“ یعنی جتنی محنت ہوگی اسی قدر مقصود حاصل ہوگا۔ بعض حکماء نے لکھا ہے: ”اَلْجِدُّ اللَّيْلُ بِحَلَا تُدْرِكُ بِهِ اَمَلًا“ یعنی پوری رات محنت کرو مقصود پا لو گے، کسی شاعر نے کہا:

اَلْجِدُّ يُدْنِي كُلَّ اَمْرٍ شَاسِعٍ
وَالْجِدُّ يَفْتَحُ كُلَّ بَابٍ مُّغْلَقٍ

”یعنی محنت ہر مشکل اور بعید کام کو قریب کرتی ہے اور ہر بند دروازے کو کھول دیتی ہے۔“
بعض نے یہ شعر کہا ہے:

تَمْتَكِدُ اَنْ تَمْسِيَ فَيَقْبَلَنَا مُنَاطِرًا
يَغْدُو عَنَاءٌ وَالْجُنُونُ فُنُونُ
وَلَيْسَ اَكْتِسَابُ النَّالِ كُنْ مَشَقَّةُ
تَحْمِلُهَا فَالْعِلْمُ كَيْفَ يَكُونُ

”یعنی کمال کے حصول کی تمنا بغیر محنت کے پاگل پن ہے اگر مال بغیر محنت حاصل نہیں ہو سکتا ہے تو علم کیسے حاصل ہوگا؟“
طالب علم کا رات بھر جاگنا کامیابی کے لئے بہت ضروری ہے یعنی رات کے اکثر حصے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔
شاعر نے کہا:

يَقْنَدُ الْكَدِ تَكْتَسِبُ الْمَعَالِي
وَمَنْ ظَلَبَ الْعُلَى سَهَرَ اللَّيَالِي
تَرَوُّمُ الْعِزِّ نَمَّ تَنَامُ لَيْلًا
يَقْوُضُ الْعَمَلُ مَنْ ظَلَبَ اللَّالِي
وَمَنْ رَامَ الْعُلَى مِنْ غَيْرِ كَدٍ
أَفْهَاعُ الْعَمَلِ فِي ظَلَبِ الْمَعَالِي

”یعنی محنت کے حساب سے بلندی ملتی ہے اور اس کے لئے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے، تم مقام حاصل کرنا چاہتے ہو اور پھر راتوں کو سوتے بھی ہو حالانکہ موتی تلاش کرنے والا سمندر میں غوطہ کھاتا ہے جو شخص بغیر محنت کے مقام چاہتا ہے وہ فضول وقت ضائع کرتا ہے۔“

محنت کے میدان میں یہ بھی ضروری ہے کہ طالب علم درس میں حاضری دے، غور سے سنے اور رات کو خوب مطالعہ کرے گویا مطالعہ واجب ہے، درس کی حاضری فرض ہے اور غور سے سننا سنت ہے۔ پھر جو کچھ پڑھا اس کا بار بار تکرار کرے، علماء نے لکھا: ”الَّذِي يَسْتَعِينُ بِتَحْقِيقِ حَرْفٍ وَالشُّكْرِ أَرْزُ الْفَلَّاحِ“ اسی طرح محنت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ہاتھ سے لکھے اور پھر صرف لکھنے اور فوٹو کاپی کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ یاد کرے، علماء نے لکھا ہے کہ ”الْعِلْمُ صَيِّدٌ وَالْكِتَابَةُ قَيْدٌ“ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اسْتَعِينْ بِتَحْقِيقِ حَرْفٍ وَمَا كَتَبْتَ قَرَّ وَمَا حَفِظْتَ قَرَّ“ یعنی صرف حافظہ پر اعتماد نہ کرو بلکہ لکھ کر یاد کرو تا کہ مکمل حفاظت ہو جائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لکھنا اور تکرار کر کے یاد کرنا جس طرح ضروری ہے اسی طرح اپنے لکھے پڑھے کا سمجھنا اور اس کی حقیقت تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ صرف رٹنے رٹانے سے فائدہ نہیں ہوگا، کسی نے کہا ہے: ”حَفِظَ حَرْفَيْنِ خَيْرٌ مِّنْ سَمَاعِ وَقَرْنَيْنِ وَفَهُمُ حَرْفَيْنِ خَيْرٌ مِّنْ حَفِظِ وَقَرْنَيْنِ“ یعنی دو ہنڈل علم سننے سے دو حرف یاد کرنا زیادہ بہتر ہے اور دو ہنڈل یاد کرنے سے دو حرف کا سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔

علمی محنت یہ بھی ہے کہ علمی مجلس میں آپس میں علمی مباحثہ اور مناظرہ ہو، اس سے علم پختہ ہو جاتا ہے، کسی نے کہا ہے: ”مُطَارَاةُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ تَكْرَارِ شَهْرٍ“ علمی محنت یہ بھی ہے کہ طالب ہر کہہ دمہ سے چھوٹا بڑا مسئلہ بغیر شرم و عار کے معلوم کیا کرے۔ کسی نے کہا:

تَعَلَّمْ يَا فَتَى وَالْجَهْلُ عَارُ
وَلَا يَزُحِي بِهِ إِلَّا الْجَمَارُ

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ”الْعِلْمُ عِزٌّ لَا ذُلَّ فِيهِ وَيَخْصُلُ بِالنِّلِّ لَا عِزَّ فِيهِ“ آپ نے یہ بھی فرمایا:

”الْعِلْمُ لَا يُعْطِيكَ بَعْضَهُ حَتَّى تُعْطِيَهُ كُلُّكَ“ آپ نے یہ بھی فرمایا جب کسی نے پوچھا:

”يَمَّ أَدْرَكْتَ الْعِلْمَ؟ قَالَ مَا اسْتَقْفَيْتُ مِنَ الْإِسْتِفَادَةِ وَمَا تَعَلَّمْتُ بِالْإِفَادَةِ“

علمی محنت میں یہ بھی آتا ہے کہ آدمی اپنی محنت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ کسی نعمت پر شکر ادا کرنا اس نعمت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ”إِنَّمَا أَدْرَكْتَ الْعِلْمَ بِالتَّحْقِيقِ وَالشُّكْرِ“ علمی محنت کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کالی سستی اور کسل سے بچتا رہے۔ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ مَعََالِيَ الْأُمُورِ وَيَكْرَهُ سَفْسَافَهَا۔

وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ لَا يَنْبِي يُسُفُ: إِيَّاكَ وَالْكَسَلَ فَإِنَّهُ شُوْمٌ وَآفَةٌ۔ کسی نے خوب فرمایا ہے:

دَعَى نَفْسِي الْكَاسِلَ وَالْكَوَانِي
وَالْأَلَا فَاتَّبَعْنِي دَارَ الْهَوَانِ
فَلَمْ أَرِ لِلْكَسَالِ الْحُظَّ يُعْطَى
يَسْوَى تَلْمِزٍ وَجِزْمَانِ الْأَمَانِي

علمی محنت کا حصہ یہ بھی ہے کہ ماہر فن استاد کو تلاش کیا جائے اور پھر جم کر اسی کے پاس پڑھے، یہ نہیں کہ آج ادھر ہے کل ادھر اور شیطان اس کو ورغلا تا رہے کہ وہاں بہتر ہے، وہاں بہتر، ایسے گھومنے والے طالب کے ورغلانے والے شیطان کا نام "شہ الخیر" ہے کہ وہاں بہتر ہے، وہاں بہتر ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "قَبْتُ عِنْدَ حَمَّادٍ قَنْبَرًا" آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حصول علم کے لئے یکسوئی ضروری ہے، پوچھا گیا کہ یکسوئی کیسے آئے گی؟ فرمایا سارے تعلقات ختم یا کم سے کم کر دو، کسی نے سچ کہا: مَنْ فَرَ فَقَدْ عَزَرَ۔ اسی طرح ایک استاد کے پاس اور ایک مدرسہ میں مختلف حالات اور مصائب پر صبر کرے کیونکہ عقلاء نے لکھا ہے:

"خَزَانَةُ الْعِلْمِ عَلَى قَنَاطِيرِ الْيَعْنِ"

کسی نے حصول مطلوب اور حصول علم کے لئے چھ اشیاء کو شرط قرار دیا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

أَلَا لَا تَنَالُ الْعِلْمَ إِلَّا بِسِتَّةٍ
سَأُنبِّئُكَ عَنْ مَجْمُوعِهَا بِبَيَانٍ
ذَكَاءٌ وَجِرْصٌ وَاضْطَبَازٌ وَبِلُغَةٌ
وَأَرْشَادٌ أَسْتَاذٍ وَظُلُوفٌ زَمَانٍ

شیخ الاسلام علامہ سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے طلبہ کو ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ جس طالب علم کا مزاج جس فن سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو اسی میں کمال پیدا کرنا چاہیئے، پھر فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ تمام فنون میں کمال پیدا کر لو تو تمام فنون کے کمال سے محروم رہ جاتے ہو اور پھر کہتے ہو معاشرہ ہماری قدر نہیں کرتا تم ایک فن میں کمال حاصل کر دو پھر دیکھو کہ معاشرہ کس طرح تم کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سر پر اٹھاتا ہے۔

اس لئے بعض عقلاء نے کہا کہ "کمال" چار حروف پر مشتمل ہے اور اسی کمال کے اندر مال ہے یعنی کاف کو ہٹاؤ تو مال رہ جاتا ہے۔ محنت کا حصہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہزار مرتبہ کوئی مسئلہ سنا ہوا ہے اور پھر سننے کا موقع ملے تو غور سے سنے ورنہ نا قدری ہوگی۔

۳ ادب العلم:

یہ بات یاد رکھیں کہ علم بغیر ادب اور بغیر تعظیم کے حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر کسی کو ذہن و حافظہ کے زور پر حاصل ہو بھی گیا تو وہ علم بابرآ اور بابرکت نہیں ہوتا، اسی لئے کسی نے کہا ہے:

”مَنْ وَصَلَ مَنْ وَصَلَ إِلَّا بِالْحُرْمَةِ وَمَا سَقَطَ مَنْ سَقَطَ إِلَّا بِتَوَلُّكِ الْحُرْمَةِ“

استاد کا احترام اور تعظیم علم کے آداب میں داخل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”اَكَا عَيْنُ مَنْ عَلَّمَنِي حَرْفًا وَاحِدًا اِنْ شَاءَ تَبَاعَ وَاِنْ شَاءَ اُعْتَقِيَ وَاِنْ شَاءَ اِسْتَعْتَفَنِي“

اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

رَأَيْتُ أَحَقَّ الْحَقِّ حَقَّ الْبُعْلَمِ
وَوَاجِبُهُ حِفْظًا عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ
لَقَدْ حَقَّ أَنْ يُهْدَى إِلَيْهِ كَرَامَةٌ
بِتَعْلِيمِهِ حَرْفٍ وَاحِدٍ أَلْفَ دِرْهَمٍ

استاد کا ادب یہ بھی ہے کہ ان سے آگے نہ چلے، ان کی خاص جگہ پر نہ بیٹھے، ان کی اولاد کی قدر کرے اور استاد کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کرے۔

آداب علم میں کتاب کا ادب بھی شامل ہے پس طالب علم کو چاہیے کہ وہ کسی کتاب کو بغیر وضو کے نہ پڑھے۔ امام شمس الاعظمیٰ حلوانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”إِنَّمَا يِلْكُ الْعِلْمُ بِالشَّعْطِیْمِ فَإِنِّي مَا أَخَذْتُ الْكَاعْدَ إِلَّا بِالْظَهَارَةِ“

کیونکہ علم نور ہے اور وضو بھی نور ہے تو نور سے نور میں اضافہ ہوتا ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے متعلق منقول ہے کہ کبھی کوئی اردو در سالہ بھی بغیر وضو کے نہیں چھوا۔

ادب کتاب یہ بھی ہے کہ اس پر سر نہ رکھے، نہ اسے تکیہ بنائے، نہ اسے زمین پر رکھے اور نہ کتاب کے اوپر کوئی سامان رکھے۔ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم نے کتاب پر سیاہی کی دو ات رکھی تھی تو استاد نے فارسی میں کہا ”بر نیابی“ یعنی کوئی پھل حاصل نہیں کر سکو گے۔ کتاب کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اس پر لکھ کر خراب نہ کرے، ادب العلم میں یہ بھی ہے کہ اپنے ساتھیوں کا احترام کرے، اپنی درس گاہ اور بیٹھنے کی جگہ کا احترام کرے، مدرسہ کا احترام کرے اور مدرسہ سے قلبی تعلق اور قلبی

محبت رکھے، علماء نے لکھا ہے کہ استاد کے احترام سے درس و تدریس اور علم میں برکت آتی ہے اور والدین کے احترام سے عمر اور رزق میں برکت آتی ہے۔

۱۲) العِلُّ بِالْعِلْمِ:

علم حاصل کرنے کا مقصد اس پر عمل کرنا ہے کیونکہ بغیر علم کے عمل کا حال ایسا ہوگا جیسا ایک عارف کا مقولہ ہے کہ: **عِلْمٌ يَلَا عَمَلٌ كَشَجَرٍ يَلَا ثَمْرًا** اور کسی نے کہا ہے:

فَسَادٌ كَبِيرٌ عَالِمٌ مُتَعَتِّقٌ
وَأَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَعَتِّقٌ

یعنی حد و شریعت کو پامال کرنے والا عالم بہت بڑا فتنہ ہے لیکن عبادت گزار جاہل اس سے بھی بڑا فتنہ ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے: **هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ إِنَّ أَجَابَ وَلَا قَائِلًا تَحَلَّى** کہ علم پہلے آکر عمل کو پکارتا ہے، اگر عمل آگیا تو ٹھیک ورنہ علم کوچ کر کے چلا جائے گا، ایک روایت میں آیا ہے: **مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَذُقَّ اللَّهُ عِلْمَهُ مَا لَمْ يَعْلَمْ** "ان آثار و روایات کو دیکھ کر ہر طالب پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے ورنہ بے عمل علم سے نبی کریم ﷺ نے اس طرح پناہ مانگی ہے: **أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ**"

صاحب "تعلیم المتعلم" نے کسی کی روایت نقل کی ہے کہ جو طالب علم زمانہ طالب علمی میں تقویٰ اختیار نہیں کرتا ہے (اور معصیت میں لگا رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو تین مصیبتوں میں سے کسی ایک میں مبتلا کرتا ہے:

① یا جوانی میں موت آجائے گی۔ ② یا اس کو دیہاتوں اور غیر آباد جگہوں میں ڈال دیتا ہے۔

③ اور یا اس کو کسی حاکم اور گورنر وزیر کا چہرہ اسی اور خادم بنا دیتا ہے۔ یہ روایت کسی تجربہ کار اللہ والے کا قول ہے، علماء نے کہا کہ جب طالب علم فرائض کو پورا کرتا ہے اور کبار سے بچتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اگرچہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ ولی ہے۔

طالب علم کی پرہیزگاری کے لئے یہ چیز لازم ہے کہ وہ کم کھائے، کم سوئے، کم بولے، بازار کا کھانا نہ کھائے، قبلہ کی طرف بغیر ضرورت پیٹھ نہ کرے، فتنہ پرداز اہل معاصی کے پاس نہ بیٹھے اور ترک سنن سے اجتناب کرے کیونکہ جو شخص مستحب میں سستی کرتا ہے اس سے سنت چھینی جاتی ہے اور جو سنن میں سستی کرتا ہے وہ واجبات سے محروم کیا جاتا ہے اور جو واجب کو چھوڑتا ہے اس کو فرائض سے محروم کیا جاتا ہے اور جو شخص فرائض میں سستی کرتا ہے وہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے استاد سے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو استاد نے نسخہ بتا دیا فرمایا:

شَكُوتٌ إِلَى وَكَيْعٍ سُوءَ حِفْظٍ
فَأَوْصَانِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي

فَإِنَّ الْعِلْمَ نُورٌ مِّنْ إِلَهِ وَنُورُ اللَّهِ لَا يُعْطَى لِعَاصِي

حافظ کی قوت کے لئے سب سے عمدہ نسخہ قرآن کریم کی تلاوت ہے مگر دیکھ کر تلاوت ہو، زیادہ مسواک کرنا، شہد پینا اور ”کنڈر“ یعنی شکر کے ساتھ چیز کھانا، نہار منہ کشمش اور منی کھانا، نہار منہ کشمش خاص منہ کھانا۔

حافظ کو نقصان دینے والی چیزیں بہت ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

زیادہ گناہ کرنا، دنیا کا غم کرنا، زیادہ تعلقات رکھنا اور ہر وہ چیز کھانا جو بلغم پیدا کرتی ہو، ہر ادھنیا کھانا، ترش سیب کھانا، سولی پر لٹکائے ہوئے مردے کو دیکھنا، قبروں کی تختیوں کو پڑھنا اور زندہ جو کس زمین پر پھینکنے وغیرہ سے حافظ کا نقصان ہوتا ہے۔

یہ چند آداب تھے، یہ دو دن کا درس ہوتا ہے، میں نے کچھ تفصیل سے اس لئے لکھ دیا کہ یہ طلباء کے لئے مفید تر ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ (اکثر باتیں ”تعلیم المتعلم“ میں موجود ہیں)۔



طبقات المحدثین بحسب تدوینہم

۹۱ھ کے قرب وجوار میں بصرہ میں سب سے آخر میں صحابی رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اس وقت عالم دنیا پر ان کے علاوہ صرف پانچ صحابہ موجود تھے۔ ۹۹ھ میں خلیفہ عادل و صالح حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے، آپ نے محسوس کیا کہ صحابہ کرام دنیا سے اٹھ کر چلے گئے ہیں اور کبار تابعین بھی جا رہے ہیں اس لئے ان کو خوف ہوا کہ کہیں احادیث مہارکہ کا مقدس علم ان کے ساتھ قبروں میں نہ چلا جائے۔

دوسری طرف خوارج وروافض اور قدریہ کے ہر قسم کے فتنے سر اٹھا رہے تھے، اس نازک موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے احادیث مقدسہ کو جمع کرنے اور اسے لکھنے کے لئے ایک سرکاری فرمان کے ذریعہ علمائے کرام کے نام ایک خط جاری کیا چنانچہ مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر بن حزم رضی اللہ عنہ کے نام آپ نے لکھا:

”انظر ما کان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاكتبه فانی خفت حدوس العلم وذهاب العلماء۔“

(بخاری)

”یعنی نبی اکرم ﷺ کی جو حدیث مل جائے اسے لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے غٹنے کا خوف لاحق ہو گیا ہے۔“

اس قسم کا ایک خط خلیفہ عادل نے امام ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ کے نام بھی لکھا اور امام شعبی رضی اللہ عنہ کو بھی لکھا تھا، ابن حزم رضی اللہ عنہ نے احادیث کو جمع کیا، امام شعبی رضی اللہ عنہ نے بھی اکٹھا کیا اور امام ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ نے بھی جمع کر کے ابواب کے انداز سے اکٹھا کیا لہذا ہر ایک کو اول عدون کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے، کوئی تعارض نہیں ہے، تینوں حضرات اس ابتدائی مرحلے میں کسی نہ کسی طریقہ سے شریک ہوئے ہیں۔ احادیث مقدسہ کی جمع و تدوین کی یہ پہلی صدی ہے، گویا جامع قرآن امیر المؤمنین عمر اول عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہوئے اور جامع احادیث امیر المؤمنین عمر ثانی عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ ہوئے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ احادیث کی کتابت و تدوین دیر سے ہوئی، اگر دور اول میں سب احادیث لکھی جاتیں تو سب میں قطعیت آجاتی اور قرآن کی طرح ایک کلمہ کو ضعیف کہنے یا انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا، جب احادیث میں ظہیت آگئی تو امت اس خطرہ سے بچ گئی اور بحث میں وسعت پیدا ہو گئی۔

دوسری صدی کی تصنیفات:

دوسری صدی میں پہلی تصنیف امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ولادت ۸۰ھ التوفی ۱۵۰ھ کی کتاب الآثار ہے جو جامع کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مدرسہ میں بیٹھ کر چالیس ہزار احادیث و آثار سے انتخاب کر کے آپ نے تصنیف فرمائی اور فقہی ابواب کے طرز پر مستند احادیث و آثار پر مشتمل کتاب ترتیب دی، یاد رہے کہ فقہی ابواب اور سنن کے طرز پر یہ اسلام میں پہلی تصنیف ہے، امام دارالہجرۃ امام مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب مؤطا میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے کذا قال السیوطی فی تبہیض الصحیفۃ۔ نیز امام محمد رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب الآثار میں زیادہ تر روایات

اسی سے لی ہیں پھر اسی صدی میں امام مالک رحمہ اللہ نے موطا مالک تصنیف فرمائی، یہ احادیث و آثار اہل مدینہ اور ان کے فتاویٰ پر مشتمل عظیم ذخیرہ ہے، امام ابو زرہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر کوئی طلاق کی قسم کھائے کہ موطا مالک صحیح ذخیرہ ہے تو وہ حانت نہیں ہوگا۔

اسی صدی میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی تصنیف جامع سفیان ثوری ہے جو آپ نے ۱۹۰ھ میں تالیف کی ہے، اسی صدی میں ابن مروزی کی کتاب الزہد والرقاق ہے جو ۱۸۱ھ کے قرب و جوار میں تصنیف ہوئی ہے، اسی صدی کی تصنیف موطا امام محمد التوفی ۱۸۹ھ کی ہے جو موطا مالک سے ماخوذ ہے اسی صدی میں مسند ابوداؤد طیالسی وجود میں آئی ہے اور اسی میں مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند حمیدی کی تصنیف عمل میں آئی ہے۔

تیسری صدی کی تصنیفات:

اس صدی میں علم الحدیث اور فن حدیث پر بہت بڑا کام ہوا، فن حدیث کا انتخاب و اختصار ہوا اور جرح و تعدیل کا بہت بڑا میدان قائم ہوا اور صحاح ستہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی کتابیں منظر عام پر آ گئیں، سنن دارمی، کتاب الدعاء لابن ابی الدنیا، مسند حارث بن ابی اسامہ، مسند بزار، مسند ابی یعلیٰ موصلی، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابی عوانہ اور امام طبرانی کی معجم کبیر، معجم صغیر، معجم اوسط ابی شان کے ساتھ وجود میں آ گئیں گویا یہ حدیث اور محدثین کی صدی تھی۔

چوتھی صدی کی تصنیفات:

چوتھی صدی کی تصنیفات میں کتاب صحیح ابن حبان، سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم ہیں۔

پانچویں صدی کی تصنیفات:

اس صدی میں حدیث کی مشہور کتاب سنن بیہقی وجود میں آئی ہے اور بیہقی ہی کی دوسری تصنیف معرفۃ السنن والاثر ہے، حمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" بھی اسی صدی کی تصنیف ہے۔

مراتب کتب الحدیث

یعنی وہ کتاب جن میں سے ہر کتاب کا مقام متعین کر دیا گیا ہو یہ بھی کل پانچ طبقات ہیں۔

پہلا طبقہ:

اس طبقہ میں وہ کتابیں داخل ہیں جس کے متعلق ہم آنکھیں بند کر کے کہیں گے "هذا صحیح" اور مخالف سے دلیل مانگیں گے کہ کیوں صحیح نہیں ہے؟ اس طبقہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا مالک، صحیح ابن حبان، اور صحیح ابی عوانہ ہیں۔

دوسرا طبقہ:

دوسرا طبقہ وہ ہے کہ ہم ان کو صحیح تو نہیں کہہ سکتے ہیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قابل استدلال اور صالح للاحتجاج ہیں کیونکہ احتجاج

حسان سے بھی کیا جاسکتا ہے اس طبقہ میں ابوداؤد، ترمذی اور نسائی شامل ہیں۔

تیسرا طبقہ:

وہ ہے کہ ہم نہ اسے صحیح کہیں گے اور نہ غلط بلکہ غور کریں گے کہ کس درجہ کی احادیث ہیں، اس میں مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ اور زوائد المسند شامل ہیں یعنی امام احمد رحمہ اللہ کے بیٹے نے مسند احمد پر جو اضافہ کیا ہے وہ زوائد المسند ہے۔

چوتھا طبقہ:

یہ وہ طبقہ ہے جو اول طبقہ کے بالکل برعکس ہے یعنی ہم آگکھ بند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، اس طبقہ میں مسند فردوس دلیلی ہے اور حکیمی ترمذی کی نوادر الاصول ہے، یہ وعظ کی کتابیں ہیں، اسی طرح تفسیری روایات و حکایات بھی اس میں داخل ہیں۔

یا نچوال طبقہ:

اس طبقہ میں وہ کتب شامل ہیں جو احادیث موضوعہ کے مجموعے ہیں جو اہل بدعت و اہواء نے گھڑ لی ہیں ان گھڑی ہوئی روایات سے احادیث کپاک کرنے کے لئے موضوعات کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جیسے الموضوعات الکبیر، اللالی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة وغیرہ وغیرہ۔

2000

حدیث کی تعریف:

الحديث ضد القديم لئلا، حدث محدث نصر بنصر سے بات کرنے کے معنی میں آتا ہے نیز ”حادیث“ کسی نئے واقعے کے پیش آنے کو بھی کہتے ہیں، اور ”تحدیث و تحدیث“ گفتگو کے معنی میں آتا ہے، احدث احدثا نیا کام پیدا کرنا، ”المحدث“ دوسرے تک بات پہنچانا اور روایت کرنا، کہا جاتا ہے ”رجل حدیث الملوك“ یعنی بادشاہوں کی مجالس میں باتیں اور قصے بیان کرنے والا۔ ”حدثان الدهر ای وقائعہ، حدثاثة السن“ یعنی نئے عمر ہونا بہر حال حدیث کے لغوی معنی میں ایجاد اور ضد قدیم کا مفہوم پڑا ہوا ہے، حدیث کی جمع احادیث ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ حدیث کو حدیث اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہے اور نبی اکرم ﷺ کا کلام حادث ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ لفظ حدیث قرآن کریم کی آیت ”و اما بدعۃ ربك فحدث“ سے لیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے بھی ایک دفعہ قصہ سناتے ہوئے فرمایا ”حدثنی تمیہ الداری“ مجھے تمیہ داری نے بیان کیا ہے۔ اس لغوی تحقیق کے بعد حدیث کی اصطلاحی تعریف سے متعلق پہلے یہ سمجھ لیں کہ حدیث کے دو فن اور دو علوم ہیں، دونوں کی الگ الگ تعریف، موضوع اور غرض و غایت ہیں۔

ایک علم الحدیث روایت ہے اور دوسرا علم الحدیث درایت ہے، لوگوں کو دونوں کی تعریف و غرض میں بھی شبہ لاحق ہو جاتا ہے اور دونوں کی تعریفیں غلط ملط ہو جاتی ہیں اس لئے الگ الگ تعریفات ملاحظہ ہوں۔

علم الحدیث روایت کی تعریف:

”هو علم مشتمل علی ما اضيف الی رسول اللہ ﷺ سواء کان فعلاً او قولاً او تقریراً أو صفة۔“
صفت کا مطلب یہ ہے کہ صحابی نے نبی اکرم ﷺ کی صفات بیان کر کے کہا کہ آپ اس طرح حسین تھے، احسن اخلاق کے مالک تھے، اس تعریف کے اعتبار سے علم حدیث کا موضوع یہ ہے۔

موضوعہ:

”ذات الرسول من حیث انہ رسول۔“

حیثیت رسول کے لفظ سے فن طب سے امتیاز آ گیا کیونکہ وہاں ذات انسان سے بحث ہوتی ہے۔

غرضہ:

علم الحدیث روایت کی دو غرض خاص ہیں اور ایک غرض عام ہے۔

غرض خاص نمبر ایک یہ ہے کہ ”الاحتراز عن الخطاء فیما اضيف الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔“

اور غرض خاص نمبر دو اس طرح ہے۔ ”معلومية كيفية الاقتداء بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔“

اور غرض عام اس طرح ہے ”هو الفوز والسعادة فی الدارين۔“

تعریف میں ”ما اضيف الی رسول اللہ“ کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ جو اقوال و افعال اور جو احادیث نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہیں اس پر مشتمل علم کا نام علم حدیث ہے۔

علم الحدیث درایت:

علم حدیث درایت کی تعریف اس طرح ہے:

”هو علم يعرف به أحوال المتن والسند صحة وحسنًا واتصالًا۔“

موضوعہ:

”أحوال الراوی والمروی وقیل أحوال المتن والسند۔“

اس فن کو اصول الحدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کے لئے بھی دو غرض خاص اور ایک عام ہے۔

غرضہ:

غرض خاص نمبر ایک "تمییز المقبول من المرحود" اور غرض خاص نمبر دو "تمییز الضعیف من شید الضعیف".

اور غرض عام "الفوز والسعادة فی الدارين" ہے۔

حدیث، خبر و اثر اور سنت میں فرق

حدیث اور سنت میں ترادف ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں اور حدیث و خبر کے متعلق علماء کی دو رائے ہیں:

اول یہ کہ ان دونوں میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے یعنی ہر حدیث خبر ہے مگر ہر خبر کا حدیث ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہذا حدیث وہ ہے جو حضور ﷺ کی طرف منسوب ہو تو اس سے موقوف روایت خارج ہوگئی اور خبر وہ ہے جو موقوف اور مرفوع دونوں پر صادق آتی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر خبر حدیث نہیں بلکہ صرف مرفوع خبر حدیث ہے اور ہر حدیث خبر ہے۔ بعض علماء کے ہاں موقوف اور مرفوع دونوں پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر ان کے ہاں ان دونوں میں ترادف ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث وہ ہے جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہو اور جو غیر سے منقول ہو وہ خبر ہے تو اس صورت میں تباہی کی نسبت ہو گی۔ اثر کا اطلاق عام طور پر اقوال صحابہ اور اقوال تابعین پر ہوتا ہے لہذا اثر حدیث کا مابین ہے لیکن کبھی اس کا اطلاق حدیث مرفوع پر بھی ہوتا ہے جیسے ادعیہ ماثورہ پھر دونوں میں ترادف ہوگا۔

أنبأنا، أخبرنا اور حدثنا میں فرق

اس سلسلے میں علماء کے دو طبقے ہیں ایک طبقہ مثلاً امام مالک، ابن شہاب زہری، جمہور کوفیین، علماء متقدمین اور علماء مغاربہ رحمہم اللہ کا ہے ان حضرات کا خیال ہے کہ جس طرح ان الفاظ میں لغت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح اصطلاح میں بھی کوئی فرق نہیں ہے مگر بعض دوسرے علماء مثلاً امام شافعی، امام اوزاعی اور جمہور مشرقہ رحمہم اللہ کے ہاں ان الفاظ میں فرق ہے اور وہ اس طرح کہ جب شیخ پڑھ رہا ہو اور تلمیذ سن رہا ہو یا کئی تلامذہ سن رہے ہوں تو جب بعد میں شاگرد بیان کر رہا ہو تو وہ کہے گا حدثنا فلان اور اگر اکیلا ہے تو کہے گا حدثنی فلان، اور جب شاگرد پڑھ رہا ہو اور استاد سن رہا ہو تو بعد میں شاگرد أنبأنا اور أخبرنا کے الفاظ استعمال کرے گا۔ امام بخاری پہلے طبقے کے ساتھ ہیں جبکہ امام مسلم دوسرے طبقے کا ساتھ دیتے ہیں۔

ان الفاظ کے رسم الخط کا بھی خیال کرنا چاہیے کیونکہ محدثین اس میں اختصار کر کے "ثنا" لکھتے ہیں یہ حدثنا کا مخفف ہے یا "انا" کہتے ہیں یہ أخبرنا وغیرہ کا مخفف ہے۔

بعض جگہوں میں محدثین "ح" کا لفظ لکھتے ہیں یہ تحویل سند کی طرف اشارہ ہے اس کو ح قال وحدثنا پڑھنا چاہیے۔

”متفق علیہ“ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو بخاری و مسلم دونوں نے ایک ہی الفاظ اور ایک ہی صحابی سے نقل کیا ہو، اگر صحابی الگ الگ ہیں تو اگرچہ مضمون والفاظ ایک ہیں وہ حدیث متفق علیہ نہیں ہوگی۔

چند اصطلاحی الفاظ:

اسی طرح محدثین کے ہاں چند اصطلاحی الفاظ شیخ الحدیث کے رتبہ و مقام کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مسند:

یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حدیث کو سند کے طور پر بیان کرتا ہو۔

۲۔ محدث:

یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو احادیث کا قابل ذکر ذخیرہ جانتا ہو اور متن حدیث کے ساتھ ساتھ بطور جرح و تعدیل روایت کا علم بھی رکھتا ہو۔

۳۔ حافظ:

اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو متن اور سند کے ساتھ ایک لاکھ احادیث یاد ہوں۔

۴۔ حجتہ:

اس شیخ الحدیث کو کہتے ہیں جن کو متن و سند کے ساتھ تین لاکھ احادیث از بر یاد ہوں۔

۵۔ حاکم:

یہ اس شخص کے لئے اعزازی ڈگری ہے جس کو تمام ذخیرہ احادیث یاد ہو۔

کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سات لاکھ احادیث کے حافظ تھے اسی طرح امام ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ سات لاکھ کے حافظ تھے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ تین تین لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ اور امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ پانچ لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔

شرائط اخذ حدیث

امام حازمی رحمۃ اللہ علیہ نے شروط الآخر میں لکھا ہے کہ روایت اور راویوں کے پانچ طبقات ہیں، ان سے احادیث لینے کا ہر محدث کا اپنا پنا انداز ہے جس نے شرائط میں سختی کی اس کی کتاب کی شان بڑھ گئی۔ وہ طبقات یہ ہیں:

۱۔ کفیر الضبط والاتقان و کفور الملازمة بالشیخ۔

یعنی ذہین بھی ہو، حافظ بھی قوی ہو اور اپنے استاد کے ساتھ طویل عرصے تک رہا ہو۔

۲۔ کفور الضبط والاتقان و قلیل الملازمة بالشیخ۔

② قليل الضبط والاتقان وكثير الملازمة بالشيخ.

③ قليل الضبط والاتقان وقليل الملازمة بالشيخ.

④ الضعفاء والمجهولين.

امام بخاری طبقہ اولیٰ کی احادیث بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ ثانیہ سے کبھی کبھی تعلیقاً لیتے ہیں۔ امام مسلم طبقہ اولیٰ و ثانیہ سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ ثالثہ سے کبھی کبھی لیتے ہیں۔ امام ابو داؤد اور امام نسائی طبقہ اولیٰ و ثانیہ اور ثالثہ سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ رابعہ سے کبھی کبھی لیتے ہیں۔ امام ترمذی چاروں طبقات سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور کبھی کبھی پانچویں طبقہ سے بھی لیتے ہیں۔ امام ابن ماجہ پانچوں طبقات سے لیتے ہیں اور لے کر خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔

علم حدیث اور محدثین کی فضیلت

سب سے بڑی فضیلت تو خود یہ ہے کہ ایک شیخ الحدیث گھنٹوں گھنٹوں تک نبی اکرم ﷺ کا نام لے کر روزانہ درود کا ورد کرتا رہتا ہے یہ بہت بڑی برکت ہے اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ نے محدثین کو خاص ڈگری بھی عطا فرمائی ہے۔ فرمایا:

اللَّهُمَّ ارْحَمْ خَلْفَانِي قُلُوبًا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمِنْ خَلْفَاءِ لِي قَالَ الَّذِينَ يَأْتُونَ مِنْ بَعْدِي يَرْوُونَ أَحَادِيثِي وَيَعْلَمُونَهَا النَّاسُ. (ترمذی مشکوٰۃ ص ۴۰)

قال عليه الصلوة والسلام: نظر الله عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها وأداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو أفقه منه. (طبرانی اوسط مجمع الزوائد)

اسی دعا کی برکت سے محدثین عظام کے چہرے تروتازہ اور روشن و بارکت ہوتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سیدہ اطہر سے اس محدث کے سیدہ تک گویا ایک اتصالی زنجیر ہے جس سے ان پر برکات کا نہ ختم ہونے والا نزول جاری رہتا ہے کسی نے کہا:

اصحاب الحديث هم اهل النبي وان

لم يصحبوا نفسه انفاسه صحبوا

ومن عادني حب النبي وكلامه

وللناس فيما يعشقون مذاهب

ما برح خوانده ايم ستراموش کرده ايم

الاحديث يار كه تکرار می کنیم

حدیث کی اقسام و تعریفات

حدیث دو قسم پر ہے: ① خبر متواتر ② خبر واحد۔

خبر متواتر وہ ہے کہ اس کے راوی اتنے کثیر ہوں کہ عقلاً ان کا کذب و جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو (یعنی مختلف ممالک میں رہتے ہوں، ایک دوسرے کو نہ دیکھا ہو اور بات ایک ہی نقل کرتے ہوں) اور ان کا علم حس پر منتہی ہوتا ہو (یعنی کہتا ہو کہ میں نے سنا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اور یہ عمل کیا، عقل سے بات نہ کرتا ہو) خبر متواتر علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے نیز اس میں کسی خاص تعداد کی قید نہیں ہے۔

تواتر کی قسمیں:

تواتر چار قسم پر ہے:

- ① تواتر طبقہ جیسے نقل قرآن کریم کہ امت کے ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو دیا ہے اس میں انفرادی راوی نہیں ہوتے ہیں۔
- ② تواتر اسنادی یہ وہ تواتر ہے جو اوپر متواتر کی تعریف میں بیان ہو چکا ہے۔
- ③ تواتر عملی جیسے مسواک کا عمل کہ اس میں اخبار آحاد ہیں مگر امت کے عمل نے اس کو متواتر بنا دیا ہے۔
- ④ تواتر قدر مشترک کہ فرداً فرداً اخبار آحاد ہیں مگر مجموعی طور پر جو قدر مشترک سامنے آتی ہے وہ متواتر ہے جیسے معجزات النبی ﷺ یا شجاعت علی رضی اللہ عنہ یا جو حاتم طائی۔

خبر متواتر کے مقابلے میں خبر واحد ہے پھر خبر واحد مختلف اعتبارات سے پانچ بڑی قسموں پر منقسم ہے۔

خبر واحد کی پہلی تقسیم:

خبر واحد اپنے منتہا ہے سند کے اعتبار سے تین قسم پر ہے: ① مرفوع ② موقوف ③ مقطوع۔

مرفوع وہ حدیث ہے جس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف کی گئی ہو اور وہ حدیث حضور ﷺ تک پہنچتی ہو وہ مرفوع کہلاتی ہے۔

دوم موقوف ہے یہ وہ حدیث ہے جو صحابی تک جا کر پہنچی ہے جیسے قال ابن عباس رضی اللہ عنہما، قال ابن عمر رضی اللہ عنہما۔

سوم وہ ہے جو تابعی تک جا کر پہنچتی ہے جیسے قال الاعمش رضی اللہ عنہ، قال سعید بن المسیب رضی اللہ عنہما یہ مقطوع کہلاتی ہے۔

خبر واحد کی دوسری تقسیم:

خبر واحد تعداد رواۃ کے اعتبار سے تین قسم پر ہے: ① مشہور ② عزیز ③ غریب۔

خبر مشہور وہ ہوتی ہے کہ تین اور تین سے زیادہ راوی اس کو بیان کریں مگر حد تواتر تک نہ پہنچے اگر کسی طبقہ میں راویوں کی تعداد

دو تک گر جائے تو پھر وہ حدیث عزیزی کہلاتی ہے کہ ایک نے دوسرے کو کچھ مضبوط، قوی اور عزیز بنا دیا اور اگر کسی طبقہ میں راویوں کی تعداد ایک تک نیچے آگئی تو پھر حدیث غریب کہلاتی ہے یعنی اوپر، نا آشنا کہ اکیلا ہے کوئی اس کو نہیں جانتا۔ اب اگر پوری سند میں ایک ایک راوی ہے تو یہ غریب مطلق اور فرد مطلق ہے اور اگر صرف ایک جگہ ایک راوی ہے باقی سند میں ایک سے زیادہ ہیں تو اس کو غریب نسبی اور فرد نسبی کہتے ہیں۔ حدیث میں اقلیت حاکم ہوتی ہے اکثریت پر یعنی حکم جانب قلیل پر لگتا ہے، کثیر پر نہیں۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم:

خبر واحد اپنے راویوں کی صفات کے اعتبار سے سولہ اقسام پر ہے۔

① صحیح لذاتہ ② صحیح لغیرہ ③ حسن لذاتہ ④ حسن لغیرہ ⑤ ضعیف ⑥ موضوع ⑦ متروک ⑧ شاذ ⑨ محفوظ ⑩ منکر ⑪ معروف ⑫ معلل ⑬ مضطرب ⑭ مقلوب ⑮ مصحف ⑯ مدرج۔ صحیح لذاتہ وہ ہے جس کے تمام راوی کامل البصیہ، عادل ہوں، اس کی سند متصل ہو اور علت و شذوذ سے محفوظ ہو۔ اگر راوی کے صرف ضبط میں نقص آگیا ہو باقی صفات مکمل ہوں لیکن اس نقصان کو تعدد طرق نے پورا کیا ہو تو یہ صحیح لغیرہ ہے۔ حسن لذاتہ وہ ہے کہ جس میں ضبط راوی میں نقصان آگیا ہو باقی صفات صحیح کی موجود ہوں۔ صحیح لغیرہ اور حسن لذاتہ ایک ہی چیز ہے، صحیح لغیرہ کو صرف تعدد طرق نے بلند کر دیا ہے۔

ضعیف وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کی اعلیٰ صفات نہ ہوں۔

حسن لغیرہ بعینہ ضعیف ہے لیکن تعدد طرق یا قبولیت کے کسی قرینے نے اس کو بلند کیا ہو۔ صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ کی مختصر تعریف یوں ہے کہ صحیح لغیرہ بعینہ حسن لذاتہ ہے صرف تعدد طرق نے اس کو صحیح لغیرہ بنا دیا اور حسن لغیرہ بعینہ ضعیف ہے صرف تعدد طرق نے اس کو حسن لغیرہ بنا دیا ہے۔

یاد رہے کہ صفات قبولیت چار ہیں: عدالت، ضبط، اتصال، سند، علت و شذوذ سے خالی ہونا۔

عدالت اس ملکہ کا نام ہے جو انسان کو ادراک کباب کبار اور اصرار علی البصائر سے بچائے۔ ضبط و اتقان یا حفظ دو طرح پر ہوتا ہے: اول حفظ و ضبط بالصدر کہ جس سے جس طرح سنا ہے، ادا نیکی حدیث کے وقت تک اسی طرح محفوظ ہے۔ دوم حفظ بالکتابہ کہ لکھنے سے ایسا محفوظ کر لیا جائے کہ وقت ادا نیکی تک کسی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے۔

موضوع وہ حدیث ہے جس کے راوی پر حدیث نبوی ﷺ میں عمد آجھوتہ بولنے کا طعن ثابت ہو جائے، اس شخص کی تمام مرویات ناقابل اعتبار ہو جاتی ہیں خواہ یہ تو بہ کیوں نہ کر لے، ایسے روای کو وضاع، روایت کو موضوع اور اس عمل کو وضع کہتے ہیں۔

متروک وہ حدیث ہے جس کے راوی پر کذب کی جہت ہو یا وہ روایت قواعد شرعیہ کے خلاف ہو۔

شاذ وہ ہے جس کا راوی خود ثقہ ہے لیکن وہ اوثق کے خلاف بیان کرتا ہے، اس کا مقابل محفوظ ہے۔

منکر وہ حدیث ہے کہ ضعیف راوی ثقہ کی مخالفت کرتا ہے اس کا مقابل معروف ہے۔

معلل وہ ہے کہ جس میں علتِ قادحہ خفیہ ہو، یہ عیب ماہرین حدیث معلوم کر سکتے ہیں۔
 مضطرب وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں ایسا اختلاف ہو کہ جس میں تطبیق دینا مشکل ہو۔
 مقلوب وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں بھولے سے تقدیم و تاخیر ہوئی ہو۔
 مصحف وہ روایت ہے جس کے نقطوں میں یا حرکات سکناات میں تغیر آ گیا ہو اگرچہ صورت خطی بحال ہو۔
 مدرج وہ ہے جس میں کہیں پر راوی نے اپنا کلام داخل کیا ہو۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم:

خبر واحد سقوط و عدم سقوط راوی کے اعتبار سے سات قسم پر ہے: ① متصل ② مسند ③ منقطع ④ معلق ⑤ معضل ⑥ مرسل ⑦ مدلس۔

متصل وہ حدیث ہے کہ اس کی سند میں مکمل راوی مذکور ہوں۔

مسند وہ حدیث ہے جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو۔

منقطع وہ حدیث ہوتی ہے کہ جس کی سند متصل نہ ہو بلکہ کہیں نہ کہیں سے راوی گرا ہو۔

معلق وہ ہے جس کے شروع سے راوی گرا ہو۔ (امام بخاری نے اپنی کتاب میں تعلیقات سے بہت کام لیا ہے)

معضل وہ روایت ہے جس میں درمیان سند سے مسلسل دو یا زیادہ راوی گرے ہوں۔

مرسل وہ ہے جس کے آخر سے راوی گرا ہو۔

مدلس وہ روایت ہے جس میں راوی اپنے استاد کے نام کو چھپا کر روایت کی نسبت کسی اور شیخ کی طرف کرتا ہے۔ یہ عمل

تدلیس ہے روایت مدلس (بفتح اللام) ہے اور یہ عمل کرنے والا مدلس (بکسر اللام) ہے۔

خبر واحد کی پانچویں تقسیم:

صیغہ اداء کے اعتبار سے خبر واحد دو قسم پر ہے: ① معصن ② مسلسل

معصن وہ حدیث ہے جس میں راوی عن فلان عن فلان کا لفظ استعمال کرتا ہو۔

مسلسل وہ حدیث ہے جس میں راوی نے ایک طرز پر صیغہ استعمال کئے ہوں جیسے پوری سند "سمعت فلاں قال

سمعت فلاں" یا "حدثنا فلان قال حدثنا فلان" یا "اخبرنا فلان قال اخبرنا فلان" یہ مسلسل بالقول

ہے اور دوسرا مسلسل بالفعل ہوتا ہے یعنی مسلسل بالتشبیہ کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی کا ہاتھ پکڑا پھر راوی نے بھی ایسا ہی کیا

کبھی مسلسل بقرینہ الشفتین ہوتا ہے اور کبھی مسلسل بالمصافحہ ہوتا ہے۔

اقسام کتب الحدیث

مکمل فائدہ کی غرض سے اقسام کتب حدیث سے متعلق پہلے یہ شعر یاد رکھ لیں:

جامع و مسند و معجم و مسائل

رسائل سنن، احزاب و ابن ماجہ

یعنی جامع، مسند، معجم، رسائل، اجزاء اور ابن ماجہ سات قسم کی کتب حدیث کو سوچ کر دیکھو۔

● جامع:

وہ ہے جس میں آٹھ اصناف علوم جمع ہوں جس کو کسی نے اس شعر میں اکٹھا کیا ہے۔

سیر آداب و تفسیر و عتائد

فستن اشراط و احکام و مناقب

بخاری اور ترمذی جامع ہے کہ یہ سب علوم ان میں درج ہیں، مسلم میں تفسیر بہت کم ہے وہ جامع نہیں۔

● مسند:

وہ ہے جس میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب یا رتبوں پر احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے مسند احمد اور مسند دارمی۔

● معجم:

وہ ہے جس میں ناموں کے حروف کی ترتیب یا رتبوں کی ترتیب سے اپنے شیوخ کی احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے معجم طبرانی، معجم کبیر، معجم صغیر، معجم اوسط وغیرہ۔

● سنن:

وہ کتب ہیں جس میں احکام کی احادیث فقہ کے ابواب کی ترتیب پر ہوں جیسے سنن ترمذی وغیرہ۔

● جزئی:

وہ ہے جو ایک ہی شیخ کی مرویات پر مشتمل ہو یا ایک ہی موضوع سے وابستہ ہو جیسے جزاء رفع الیدین۔

● مستدرکات:

وہ کتب ہیں جس کے مؤلف نے کسی محدث کی کتاب کی احادیث کا استدراک کیا ہو جو اس سے کسی وجہ سے رہ گئی ہوں اور ان کی شرائط کے مطابق ہوں جیسے مستدرک علی الصحیحین۔

● علل ۱ شامل ۲ اربعینات:

مسائلک محدثین:

- امام بخاری ایک قول میں شافعی ایک میں حنبلی ایک میں مجتہد تھے، آخر قول رائج ہے۔
- امام مسلم مقلد محض نہیں تھے البتہ شوافع کی طرف مائل تھے، بعض نے مانگی کہا ہے۔
- امام ابوداؤد حنبلی مسلک سے وابستہ تھے۔
- امام ترمذی بعض نے شافعی بتایا ہے۔
- امام ابن ماجہ شافعی یا حنبلی یا آزاد مائل باہل حجاز تھے۔
- امام نسائی عام خیال ہے کہ شافعی تھے۔
- امام طحاوی پہلے شافعی تھے پھر پکے حنفی بن گئے۔



حجیت حدیث

منکرین حدیث کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ دین اسلام جڑ سے اکھڑ کر ختم کیا جائے اور اس پر کسی کا اعتماد و بھروسہ باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے احادیث کے انکار کا فتہ کھڑا کر دیا کیونکہ احادیث کے بغیر قرآن عظیم خود بخود معطل ہو کر رہ جاتا ہے یہ لوگ قرآن کریم کی آڑ میں پورے دین کو یکسر ختم کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ علمائے کرام قرآن و حدیث سے حجیت حدیث کو ثابت و مستحکم کریں اور پھر منکرین حدیث کے شبہات کا سنجیدگی سے جائزہ لے لیں چنانچہ یہاں بھی حجیت حدیث پر مختصر کلام ملاحظہ ہو:

قرآن عظیم کی متعدد آیتوں سے حدیث کا حجت ہونا اور اس کا واجب العمل ہونا ثابت اور مسلم ہے، علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”احادیث کے بغیر قرآن مجھ میں نہیں آسکتا ہے“۔ علامہ محمد یوسف البنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ”قرآن کریم احادیث کی تائید و توثیق کیلئے اتر آیا ہے اور قرآن پر ایمان نہیں لایا جاسکتا جب تک کہ احادیث پر ایمان نہ ہو“ فرمایا کہ آیت ”الذک علی صراط مستقیم“ اسی تائید میں آئی ہے۔ ”انک علی الحق المبین“ اسی توثیق کا حصہ ہے۔ ”وأسلفک للناس رسولاً“ وغیرہ آیات اس کی بین دلیل اور واضح ثبوت ہیں۔

دلائل:

① وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الہم ولعلہم یتفکرون۔ (صل ۴۴)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو قرآن کی آیتوں کا تبیین یعنی بیان کرنے والا کہا گیا اور جو آپ ﷺ بیان کریں گے وہ احادیث ہیں۔

② وما أأنکم الرسول لخذوہ وما نہاکم عنہ فانہوہ۔ (حشر ۶)

اس آیت میں ہر اس چیز کو واجب العمل اور واجب الاخذ قرار دیا گیا جو بغیر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان کیا اور جس سے روکا ہے وہ واجب الاحتراز قرار دیا اور یہ سب احادیث کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

③ فلیحذر الذین یخالفون عن أمرہ أن تصیبہم فتنة أو یصیبہم عذاب الیم۔ (نور ۴۴)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے اوامر کو واجب الاطاعت قرار دیا گیا ہے اور مخالفت پر وعید کا بیان ہے تو امر رسول یہ احادیث ہیں۔

④ ویحل لہم الطیبات ویمحرم علیہم الخبائث۔ (اعراف ۱۵۷)

اس آیت میں احادیث کے وسیع فیصلوں کا ذکر ہے۔

۵ انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله (نساء: ۵۹)

اس آیت میں ”بما اراك الله“ نے احادیث کے ذخیرہ کو بیان کیا ہے۔

۶ لا تعجل به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علينا بيانه. (ہیامہ: ۱۱)

اس بیان سے مراد احادیث ہیں کیونکہ قرآن کا بیان اگر قرآن ہی سے مراد لیا جائے تو پھر ہر نئی آنے والی آیت کا بیان ایک اور آیت سے ہوگا جس سے تسلسل لازم آئے گا۔

۷ وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله. (نساء: ۶۴)

اس آیت میں اطاعت رسول کا مطلب ان کی احادیث اور فرمان میں مبارکہ کی اطاعت ہے۔

۸ لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة. (آل عمران: ۱۷۳)

اس آیت میں تعلیم کتاب کا ذکر ہے اور یہ بغیر احادیث کے ممکن ہی نہیں، اسی طرح تزکیہ نفوس بغیر احادیث کے کیسے ہو سکتا ہے نیز ”الحکمتہ“ دانائی کی باتوں کی تعلیم خود احادیث ہیں۔

۹ فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما. (نساء: ۵۹)

اس آیت میں حکیم، حکم دینا، فیصلہ سنانا بغیر احادیث کے کیسے ممکن ہے؟ ”ہما قضیت“ کا کلمہ بتا رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا سنایا ہوا فیصلہ ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے، یہ فیصلہ اور یہ جھگڑے کا نمنا سب احادیث ہی ہیں لہذا قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث کا ماننا خود قرآن کا حکم ہے، اب اگر کوئی آدمی انکار حدیث کرتا ہے تو وہ خود گمراہ ہونا چاہتا ہے تو گمراہ ہونا پھرے۔

دو فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے

نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

مریضان گناہ کو دو خبر فیض محمد کی

بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے

منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات

۱ پہلا شبہ: یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بیان کردہ احکامات آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھے بعد میں تبدیلی آگئی۔

چکا اُٹے: آنحضرت ﷺ قیامت تک کے لوگوں کے لئے خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد احکامات کی تبدیلی کا عقیدہ نبوت کا انکار ہے اس نظریہ سے تو یہود و نصاریٰ کی طرح دین اسلام منسوخ ہو جائے گا۔

② دوسرا شبہ: یہ ہے کہ قرآن مجھے کے لئے احادیث کی ضرورت نہیں کیونکہ ”ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر“ نے سب کو آسان کر دیا۔

چکا اُٹے: یہاں ذکر سے نصائح اور واقعات سابقہ و لاحقہ مراد ہیں، شرعی احکام اور دقیق تحقیقات کو یہ نہیں کہا، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل لسان تھے، نزول قرآن کے معنی گواہ تھے وہ کئی مسائل اور کئی مطالب خود نہ سمجھ سکے بلکہ نبی اکرم ﷺ کی طرف لمحہ بہ لمحہ رجوع فرماتے تھے تو آج اس جہالت مرکب کے دور میں کون خود سمجھ سکتا ہے؟۔ میں پوچھتا ہوں کیا تعداد رکعات اور اوقات نماز اور اس کی کیفیات تم بغیر احادیث کے سمجھ سکتے ہو؟ زکوٰۃ کی مقدار اس کے انواع و اقسام اور نصاب کی تکمیل کے اوقات تم قرآن سے پیش کر سکتے ہو؟ حج کے اعمال و افعال اور اوقات و مقامات کا تعین تم قرآن سے بنا سکتے ہو؟ یہ تو سراسر باطل نظریہ ہے اور دین کا انکار ہے۔ دین اسلام کے تمام احکام ان کی ہیثیات و کیفیات اور ترتیب و تفصیلات کے ساتھ صرف قرآن سے کون سمجھ سکتا ہے؟ مبی حرام ہے، شیر حرام ہے، گدھا حرام ہے، بھیڑ یا حرام ہے، رچھ حرام ہے، گدھ حرام ہے اور کبوتر حلال ہے، مرغی حلال ہے، ہرن حلال ہے۔ یہ تفصیلات قرآن میں کہاں ہیں؟ چلو پھر یہ بتاؤ کہ تمہارا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک ساتھ قرآن کریم میں کہاں ہے؟ نیز یہ بتاؤ یہ قرآن حجت ہے اللہ کا کلام ہے اس پر عمل کر دینے کی خبر؟ آخر کسی حدیث اور فرمانِ رسول ﷺ کی خبر سے اس کی خبر ہوئی پھر احادیث کا انکار کیسے؟

”بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالنبی است“

اسی لئے تو امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”الکتاب احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب“۔ یعنی کتاب اللہ اپنے سمجھنے میں سنت و حدیث کی طرف زیادہ محتاج ہے۔ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف، امام مکیول رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

③ تیسرا شبہ: یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

”لا تکتبوا عنی (شیئاً سوی القرآن) ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ“ (رواہ مسند ج ۲ ص ۴۳)

پہلا چکا اُٹے: اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابتدا میں عارضی طور پر منع فرمایا تھا تا کہ قرآن و حدیث میں اختلاط و التباس نہ آئے نیز احادیث بطون و اوراق کی بجائے صدور رجال میں محفوظ ہو جائیں جب صحابہ کرام نے قرآن و حدیث میں فصاحت و بلاغت اور طرز بیان میں خوب امتیاز پیدا کر لیا اور اختلاط و التباس کا خوف نہ رہا تو آنحضرت ﷺ نے

احادیث لکھنے کی اجازت دیدی اور یہ عارضی ممانعت ختم ہوگئی۔

یہ ہے کہ تمام صحیح احادیث کے مقابلے میں اس حدیث کو چھوڑنا پڑے گا یہ روایت اجازت کتابت کی تمام روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس حدیث کا محمل وہی عارضی ممانعت تھی جو ختم ہوگئی۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ لکھنے کی یہ ممانعت قرآن و حدیث کو ایک ہی صحیفہ اور ایک ہی جگہ لکھنے کی تھی الگ الگ نہیں۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۵)

● چوتھا شبہ: یہ ہے کہ حدیث حجت نہیں صرف قرآن حجت ہے کیونکہ احادیث تابعین کے دور میں لکھی گئی ہیں اسنے طویل عرصہ تک اس کی حفاظت کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ دعویٰ غلط ہے کہ کتابت حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی بلکہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کئی نوشتے اور کئی صحیفے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لکھے گئے تھے ملاحظہ ہوں:

● حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا صحیفہ:

انہوں نے احادیث نبویہ پر ایک جامع صحیفہ لکھا جس کا نام آپ نے ”الصادقہ“ رکھا تھا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے مجھ سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کسی نے نقل نہیں کیں سوائے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جو کچھ سنا وہ لکھتا تھا، مجھ سے ایک دفعہ قریش نے کہا کہ تم جو کچھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو وہ لکھ دیتے ہو حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کبھی غضب میں اور کبھی خوشی میں بات کرتے ہیں، میں ان کے کہنے پر لکھنے سے رک گیا اور پھر میں نے اس کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ فرمایا کہ ”لکھو اس رب کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔“

(جوہر الاصول فی مصطلح احادیث الرسول ص ۶۰ و سند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس صحیفہ سے متعلق محبت کے طور پر فرمایا کرتے تھے۔

مَا يَرْغَبُنِي فِي الْحَيَاةِ إِلَّا الصَّادِقَةُ وَالْوَهْطُ أَمَا الصَّادِقَةُ فَصَحِيفَةُ كَتَبَهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَا الْوَهْطُ فَارْضُ تَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُو بْنُ الْعَاصِ.

یعنی مجھے زندگی سے محبت دو وجہ سے ہے ایک صادقہ کی وجہ سے دوسرا وہط کی وجہ سے، صادقہ تو احادیث کا وہ مجموعہ ہے جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا تھا اور وہط وہ قلمی زمین ہے جو میرے باپ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وقف کر رکھی

ہے (اس کی نگرانی سے مجھے خوشی ہوتی ہے)۔

۱۰ حضرت علی کا صحیفہ:

چنانچہ بخاری شریف کتاب العلم میں ابو حمید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ حضرات کے پاس کوئی (خصوصی) کتاب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ اور کسی مسلمان کو عطا شدہ فہم کے اور جو اس صحیفے میں ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے کہا اس صحیفے میں کیا ہے؟ فرمایا دیت کے احکام ہیں، قیدیوں کی رہائی کے مسائل ہیں اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔

۱۱ عمرو بن حزم کا صحیفہ:

سنن نسائی ج ۲ ص ۲۵۱ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل درج تھے آپ نے یہ مکتوب عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ارسال فرمایا تھا اور انہوں نے اہل یمن کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا تھا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کا گورنر مقرر فرمایا تھا جبکہ ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔

۱۲ صحیفہ عمر بن الخطاب:

ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات سے متعلق ایک تحریر لکھوائی تھی مگر ابھی تک اسے گورنروں کے نام روانہ نہیں کیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی تلوار کے نیام میں محفوظ رکھا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس سے استفادہ کیا آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے خوب استفادہ کیا یہاں تک کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ نوشتہ محفوظ رہا۔

۱۳ صحیفہ عبداللہ بن مسعود:

حافظ ابو عمرو "جامع بیان العلم" ج ۱ ص ۷۲ میں متصل سند کے ساتھ حضرت معن سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے ایک نوشتہ دکھایا اور حلفیہ بیان کیا کہ یہ نوشتہ میرے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔

۱۴ صحیفہ ابو ہریرہ:

حافظ ابن عبدالبر نے بیان العلم میں ابن وہب اور حسن بن عمرو کے طریقے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا میں نے کہا کہ حضرت آپ ہی سے تو میں نے وہ حدیث سنی تھی، فرمایا اگر تم نے مجھ سے سنی ہے تو وہ میرے پاس تحریری شکل میں ضرور موجود ہوگی۔ چنانچہ میرا ہاتھ پکڑ کر آپ مجھے اپنے گھر لے گئے اور مجھے احادیث نبویہ کے بہت سارے نوشتے دکھائے اور وہ حدیث بھی مل گئی۔

① صحیفہ رافع بن خدیج:

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ سے بہت سی باتیں سن لیتے ہیں کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھ لیا کرو۔ (تدریب الروای ص ۲۷۶)

② صحیفہ جابر بن عبد اللہ:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث مقدسہ کا ایک نوشتہ تھا جس میں احادیث مرقوم تھیں اس کا تذکرہ امام بخاری نے تاریخ کبیر ج ۴ ص ۱۸۶ پر کیا ہے۔ ترمذی میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

③ صحیفہ سمرہ بن جندب:

جلیل القدر صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں بہت سی احادیث درج تھیں اس صحیفہ کا تذکرہ ابو داؤد شریف کی احادیث شہد میں آیا ہے۔

④ صحیفہ ابو شاہ یمنی:

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے خطبے کا تذکرہ ہے۔ اس بیان کے آخر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یمن سے ایک آدمی آیا تھا جس کا نام ابو شاہ تھا انہوں نے کہا یا رسول اللہ! یہ خطبہ مجھے لکھ کر دے دیں، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: "اكتبوا لابی شاة" یعنی ابو شاہ کے لئے خطبہ کے یہ مسائل لکھ دو۔

⑤ عام صحابہ کے نوشتے:

سند دارمی میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ارد گرد نکلنے میں مشغول تھے کہ اتنے میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ ان دو شہروں میں سے پہلے کونسا فتح ہوگا قسطنطنیہ یا روم؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ ہر قرا کا شہر۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے ارد گرد حدیث لکھنے کے لئے ایک فرد نہیں بلکہ ایک جماعت بیٹھا کرتی تھی۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا مجموعہ احادیث لکھا ہوا تھا۔ کنز العمال میں ایک روایت ہے "اكتب ولا حرج" حدیث لکھو کوئی حرج نہیں۔ مجمع الزوائد میں ہے کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں بہت زیادہ بھولتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"استعن بيمينك" یعنی دائیں ہاتھ سے لکھ کر اپنی بدکردی۔

یہ تمام واقعات و روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک عہد میں کتابت حدیث تھی البتہ قرآن کریم کے ساتھ ملا کر ایک جگہ لکھنے کی ممانعت وقتی تھی۔ صحابہ کے دور سے متصل خیر القرون کے دور میں تابعین نے احادیث کے ذخیرے مختلف بلاد میں جمع کر دیئے۔ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ میں موطا مالک لکھ دی۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے مکہ مکرمہ میں حدیث کا ذخیرہ لکھا، امام اوزاعی رحمہ اللہ نے شام کی سرزمین پر احادیث کا ذخیرہ لکھ ڈالا۔ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ نے بصرہ میں علم حدیث میں تصنیف لکھ دی۔ معمر نے یمن میں کتاب لکھ دی اور سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کوفہ میں ایک تصنیف تیار کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخارا میں، امام مسلم رحمہ اللہ نے نیشاپور میں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے ازبکستان میں، امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھتجان میں اور دیگر محدثین نے اپنے اپنے بلاد میں احادیث کے ذخیرہ لگا دیئے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے مغازی پر کام کیا۔ یثیم نے واسط میں احادیث لکھنے کا کام کیا۔ لیث اور ابن لہیعہ نے مصر میں کتابیں لکھ دیں۔ پھر عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کتاب لکھ دی اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب لکھ دی اسی طرح علم الحدیث کا ایک فزائدا کٹھا ہو گیا۔ کتابت حدیث کے اس اہتمام و انتظام کے بعد بھی جو شخص شک و شبہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت احادیث سے قلبی نفرت رکھتا ہے اور قلبی عداوت کا کون علاج کر سکتا ہے یہ سچ ہے:

فَعَيْنُ الرِّضَاءِ عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كُلِّيَّةٍ
وَلَكِنْ عَيْنُ السَّعْطِ تَبْدِي الْمَسَاوِيَا



صاحب مصابیح

مصابیح اور مشکوٰۃ المصابیح دو الگ الگ مصنفوں کی الگ الگ تصنیفات ہیں۔ پہلے صاحب مصابیح کے احوال لکھے جاتے ہیں۔
نام و نسب:

آپ کا نام حسین تھا، کنیت ابو محمد تھی، لقب محی السنۃ تھا والد کا نام مسعود اور دادا کا نام محمود تھا۔ یعنی

هو الامام محی السنۃ قاضی البیت ابو محمد حسین بن مسعود بن محمود الفراء البغوی۔

آپ ۳۳۵ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۵۱۶ ہجری میں اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف چلے گئے، آپ مرد میں مدفن ہیں۔
"الفرو" عربی میں پوتین کو کہتے ہیں آپ کے داداؤں میں کوئی فرد پوتین کا کاروبار کرتا تھا بعض نے کہا کہ زیادہ پوتین
پہنتا تھا اس وجہ سے فراء مشہور ہوا۔

"بغوی" آپ کے وطن بغوی کی طرف منسوب ہے بغوی اصل میں بخشور تھا جو "باغ کور" یعنی گھر کا باغ کے معنی سے عرب
ہے۔ "بخشور" ہرات اور مرد کے درمیان ایک آباد و معمور شہر ہے نسبت کے وقت بغوی ہو جاتا ہے شور کو تخفیف کی غرض سے
حذف کر دیتے ہیں۔

تحصیل علم:

صاحب مصابیح شیخ محی السنۃ اپنے زمانے کے مشہور محدث، مفسر قرآن اور مشہور تاتاریوں میں سے تھے، فقہ میں قاضی حسین
بن محمد کے شاگرد تھے آپ نے علاقے کے مشہور محدثین سے علم الحدیث کا علم حاصل کیا اور پھر بڑے بڑے شیوخ حدیث
آپ کے شاگرد بنے جو آپ کے کمال کے لئے واضح دلائل ہیں آپ خود کا بر شیعہ افع میں شمار ہوتے تھے۔

زہد و تقویٰ:

آپ زہد و تقویٰ میں بھی اپنی مثال آپ تھے ساری عمر تالیف و تصنیف اور حدیث و فقہ کی تعلیم و تدریس میں گزاری، ہمیشہ
با وضوء درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے انتہائی قناعہ و صبر کی زندگی گزاری ہے نفل روزہ رکھنے کی پابندی کیا کرتے تھے
اور افطار کے وقت خشک روٹی کے چند ٹکڑے پانی میں جھگو کر کھایا کرتے تھے اس پر آپ کو اطباء نے کہا کہ اس سے دماغ
میں خشکی آجائے گی اور حافظہ بھی خراب ہونے کا خطرہ ہے پھر آپ نے زیون کا روٹی کے ساتھ بطور سائن استعمال کرتا
شروع کر دیا۔

آپ کی بیوی کا انتقال آپ سے پہلے ہو چکا تھا اس نے میراث میں بہت مال چھوڑا تھا لیکن محی السنۃ نے کمال تقویٰ کی وجہ
سے میراث سے اپنا حصہ نہیں لیا۔

محی السنۃ لقب کی وجہ:

جب آپ نے شرح السنۃ کی تصنیف مکمل فرمائی تو آپ نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا حضور اکرم ﷺ فرما رہے تھے "احیاء اللہ کہا ا حییۃ سلفی" یعنی جس طرح تم نے میری سنت کو زندہ کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھے بھی زندہ رکھے اسی دن سے آپ کا لقب بھی محی السنۃ ہو گیا۔ محی باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

۸۰ یا ۸۱ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور "مرو" جو کہ ولایت ہرات میں ہے اپنے استاد فقہ قاضی حسین بن محمد غلطیہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

تصانیف:

آپ کی مشہور تصانیف میں سے ایک کتاب "المصاہیح" ہے جس میں (۲۳۸۴) احادیث درج ہیں اسی کتاب کے خطبہ میں مصنف نے لفظ مصابیح استعمال کیا ہے اسی وجہ سے کتاب کا نام مصابیح ہو گیا اس مقبول و مشہور کتاب کی تقریباً ۱۶ شروحات ہیں اس کتاب کی افادیت اور طرز تالیف کی مکمل تفصیل صاحب مشکوٰۃ نے اپنے مقدمہ مشکوٰۃ میں درج کی ہے جو انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفسیر میں بھی بڑا مقام عطا کیا تھا لہذا تفسیر بغوی کے نام سے آپ کی تفسیر بھی موجود ہے نیز فقہ اور قرأت میں بھی آپ کی تصنیفات ہیں:

بنا کر دند خوش رکی بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

صاحب مشکوٰۃ

چونکہ کتاب المصابیح ترمیم و اضافہ کے بعد مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے منظر عام پر آئی اور درس و تدریس کے لئے علماء و مدارس نے اسے قبول کر لیا اس لئے صاحب مشکوٰۃ کا بھی کچھ تذکرہ قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

نام و نسب:

صاحب مشکوٰۃ المصابیح کا نام محمود یا محمد ہے کنیت ابو عبد اللہ لقب ولی الدین اور والد کا نام عبد اللہ ہے۔ نسباً عمری ہیں اور خطیب تبریزی سے مشہور و معروف ہیں۔ یعنی ابو عبد اللہ ولی الدین محمد بن عبد اللہ العمیری الخطیب التبریزی۔

آپ اپنے وقت میں بہت بڑے محدث تھے اور فصاحت و بلاغت کے امام تھے۔ احادیث میں آپ کے اونچے مقام کا اندازہ آپ کی تصنیف مشکوٰۃ سے ہو جاتا ہے آپ کا زمانہ حیات آٹھویں صدی تھا اس صدی میں تاتاریوں کا بہت بڑا فتنہ اٹھا تھا اس لئے آپ کے حالات ضبط نہ ہو سکے تخمیناً اندازے کے مطابق آپ کی وفات ۴۰۰ ہجری کے بعد ہوئی ہے

کیونکہ ”اکمال فی اسماء الرجال“ کی تالیف سے آپ ۷۴۰ ہجری میں فارغ ہوئے۔ لہذا انتقال اس کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اتنا ہی معلوم ہو سکا، اور اس کے سوا کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا البتہ آپ کے شیخ علامہ حسین بن محمد طبری رحمہ اللہ نے آپ کو ”ہقیمة الاولیاء“ اور ”قطب الصلحاء“ کے شاندار الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقات شرح مشکوٰۃ میں آپ کو ”البحر العلامة والبحر الفہامة مظهر الحقائق وموضع الدقائق الشیخ التقی الدقی“ کے شاندار القاب سے یاد کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ آپ کے فضل و کمال کے لئے مشکوٰۃ کی تالیف ہی کافی شافی ہے۔

تصانیف:

اس وقت امت کے سامنے آپ کی دو تصنیفات ہیں، اول الاکمال فی اسماء الرجال جو مشکوٰۃ المصابیح کے آخر میں اس کے ساتھ ضم کر دی گئی ہے اور دوسری تصنیف مشکوٰۃ المصابیح ہے جو آپ کا مایہ ناز مجموعہ احادیث ہے جو صرف صحاح ستہ پر نہیں بلکہ دیگر کئی حدیث کی کتابوں کی احادیث پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قبولیت عامہ و خاصہ سے نوازا ہے۔ ہندوستان میں ایک طویل مدت تک مشکوٰۃ شریف تکمیل کے طلبہ کو تکمیل کے وقت پڑھائی جاتی تھی اسی طرح اس زمانے میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ شریف دونوں کو پڑھا کر حدیث کا دورہ مکمل ہو جاتا تھا کوئی اور کتاب نہیں تھی پھر جب دورہ حدیث کے لئے صحاح ستہ کا تعین ہو گیا تب بھی مشکوٰۃ شریف کو موقوف علیہ میں پڑھانا لازم قرار دیا گیا یہ اس کتاب کی عند اللہ مقبولیت کی نشانی ہے بلکہ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ لوگ قرآن شریف کی طرح مشکوٰۃ شریف کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔

علماء ہند میں ایک آدمی بابا داؤد مشکوٰۃ کے نام سے مشہور تھا جو مشکوٰۃ شریف کو متن و سند کے ساتھ یاد رکھتا تھا اسی وجہ سے اس کو بابا مشکوٰۃ کا لقب دیا گیا تھا۔

طرز تالیف:

کتاب المصابیح میں محی السنۃ نے صرف احادیث جمع فرمائیں تھیں نہ سند حدیث کا تذکرہ تھا نہ ان صحابی کا نام تھا جن سے حدیث بیان کی گئی تھی اسی طرح حدیث صحیح، ضعیف، حسن اور تخریج و مخرج کا تذکرہ بھی نہیں تھا، صاحب مشکوٰۃ نے ان تمام چیزوں کا اہتمام کیا اور حدیث کی ہر حیثیت کو تذکرہ کر کے حقیقت کو واضح کر دیا۔

صاحب مصابیح نے اپنی کتاب کے ہر باب میں دو فصل مقرر کئے تھے پہلی فصل میں بخاری و مسلم اور صحاح کی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ اور فصل ثانی میں ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی حدیثیں لائے ہیں جن کا نام آپ نے حسان رکھا ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے فصل سوم کا اضافہ اپنی کتاب میں کر دیا جس میں انہوں نے ان حدیثوں کا ذکر کیا ہے جو اس باب سے مناسبت رکھتی ہیں اور صاحب مصابیح نے ان کو ذکر نہیں کیا ہے۔ نیز اقوال صحابہ اور اقوال تابعین کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس تیسری فصل میں وہ کبھی کبھی بخاری اور مسلم کی حدیثیں بھی لاتے ہیں۔

احادیث مشکوٰۃ کی تعداد:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان الحدیث میں لکھا ہے کہ کتاب المصانع کی احادیث کی کل تعداد (۴۴۸۴) تھی اس پر صاحب مشکوٰۃ نے پندرہ سو گیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ کیا ہے تو اب مشکوٰۃ کی ساری حدیثیں (۵۹۹۵) ہیں۔ بعض نے مصانع کی احادیث کی تعداد (۴۴۳۳) لکھی ہے پھر مجموعہ (۵۹۳۵) ہوگا۔ مشکوٰۃ شریف میں عنوان کے اعتبار سے کل (۲۹) کتب ہیں اور کتاب الایمان سے پہلا عنوان شروع ہو جاتا ہے اس کتاب میں ابواب کی تعداد (۳۲۷) ہے اور اس میں کل (۱۰۳۸) فصلیں ہیں۔

مشکوٰۃ شریف کی وجہ تالیف:

صاحب مشکوٰۃ نے اپنے مقدمہ میں اپنی تالیف و تصنیف کی وجہ خود بتائی ہے لیکن وہاں یہ بات نہیں ہے کہ اصل میں صاحب مشکوٰۃ کے استاد علامہ حسین بن محمد طبری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ آپ حدیث شریف میں ایک کتاب تصنیف کریں جس میں کتاب مصانع کی وہ کمی پوری ہو جائے جس کی وجہ سے سطحی نظر والے لوگ مصانع پر کچھ اشکالات پیش کرتے ہیں چنانچہ آپ نے اپنے شیخ کے حکم پر مشکوٰۃ شریف کی تالیف شروع فرمائی۔ ہر حدیث کی ابتدا میں صحابی کا نام درج کیا اور آخر میں یہ حوالہ دیا کہ یہ حدیث کس کتاب میں ہے جس سے پوری سند کا بھی انتظام ہو گیا۔ آپ نے مصانع کی دو فصلوں پر تیسری فصل کا اضافہ کیا پہلی فصل میں بخاری و مسلم کی احادیث اور دوسری فصل میں سنن اربعہ وغیرہ سے احادیث جمع فرمادیں۔

اور تیسری فصل میں باب سے مناسبت رکھنے والی حدیثیں جمع کیں، اس جمع کرنے میں صاحب مشکوٰۃ نے کسی خاص کتاب کی قید نہیں لگائی بلکہ بشمول بخاری و مسلم جہاں سے جو حدیث مل گئی خواہ مرفوع حدیث ہو یا آثار صحابہ میں۔ سے کوئی اثر ہو یا تابعین کا اثر ہو سب کو یکجا کر کے احادیث کا دافرغینہ اور گلدستہ علم و فضل امت کے سامنے پیش فرمایا۔ **فجزاه اللہ علی ذلک احسن الجزاء**۔

آپ نے اپنی اس تصنیف کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا یعنی چراغوں کا حلق تو گویا یہ کتاب طاق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث چراغ ہدایت ہیں اس کتاب میں رشد و ہدایت کی وہ تمام قد بلیں روشن ہیں جن سے ہر انسان روشنی حاصل کر سکتا ہے جس کا جی چاہے آئے اور مینارہ نور اپنے ساتھ لے جائے۔

دو فیض محمد دا ہے آئے جس کا جی چاہے
نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
مریض گناہ کو دو خبر فیض محمد کی
بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے

مشکوٰۃ شریف کی شروحات:

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قبولیت عامہ و خاصہ سے ایسا نوازا ہے کہ صدائیاں گزرنے کے باوجود یہ کتاب علمائے کرام کی توجہات کا مرکز ہے اور دنیا کے طول و عرض میں اس کا تعلیم و تعلم اور درس و تدریس برابر جاری ہے اسی وجہ سے اس کی بہت زیادہ شروحات بھی منظر عام پر آگئیں ہیں میں چند شروحات کی طرف اشارہ کرتا ہوں:

① شرح الطیبی:

یہ کمال کی شرح ہے اور اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ خود صاحب مشکوٰۃ کے استاد اور شیخ ہیں۔ پہلے آپ نے اپنے شاگرد کو حدیث میں کتاب لکھنے کے لئے حکم دیا اور پھر اسی شاگرد کی تصنیف کردہ کتاب کی شاندار شرح لکھ دی جو بارہ جلدوں میں اس وقت بھی موجود ہے جس میں احادیث کی فصاحت و بلاغت اور دقیق نکات کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ علامہ طیبی شافعی مسلک گزرے ہیں، شرح کا پورا نام "الکشاف عن حقائق السنن" ہے۔

② المرقات شرح المشکوٰۃ:

یہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی کئی جلدوں میں مایہ ناز اور ضخیم شرح ہے جس میں احادیث مقدسہ کی تشریحات کا ہر لحاظ سے حق ادا کیا گیا ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ حنفی مسلک کے بکے امام اور مصنف گزرے ہیں۔

③ لمعات التنقیح:

یہ عمدہ شرح عربی زبان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ کاش کہ ناتمام ہے۔

④ اشعة اللمعات:

یہ عمدہ شرح فارسی زبان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تصنیف ہے۔

⑤ مظاہر حق:

یہ شرح اردو میں ہے اور زیادہ تر مرقات اور طیبی سے ماخوذ ہے۔ محترم نواب قطب الدین خان رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۸۹ھ نے لکھی ہے۔

⑥ التعلیق الصبیح:

یہ شرح حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی زبان میں لکھی ہے۔

⑦ التعلیق الفصیح:

یہ شرح حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جو عربی زبان میں ہے۔

۱ تنظیم الاشبات:

یہ اردو زبان میں حضرت مولانا محمد ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ بنگلہ دیش کی تعریف ہے۔

۲ شرح مشکوٰۃ:

یہ شرح عربی زبان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غور عشتوی رحمۃ اللہ علیہ سرحدی کی ہے۔

۳ نفاذ فی شرح مشکوٰۃ المصابیح:

اردو میں یہ شرح ابھی ابھی آئی ہے ابھی صرف ایک جلد چھپ کر آئی ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کے تلامذہ نے آپ کے فوائد مشکوٰۃ اور دیگر شروحات سے یہ مجموعہ اکٹھا کیا ہے۔ مگر صرف منتخب احادیث کی تشریح ہے۔

۴ اشرف التوضیح:

مشکوٰۃ کی یہ شرح شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب کی اردو تقریر ہے۔ جو صرف تین جلدوں میں ہے۔

۵ توضیحات اردو شرح مشکوٰۃ:

یہ شرح آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، بندہ ناخیز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی کی ایک محنت ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ یہ شروحات وہ ہیں جو اس وقت متداول اور طلبہ و مدرسین حضرات کے استعمال میں ہیں اس کے علاوہ عربی کی کافی قدیم شروحات ہیں جو بڑے مشہور علماء اور کامل شخصیات کی طرف منسوب ہیں لیکن چونکہ اس وقت وہ شروحات نایاب ہیں اور کسی کے استعمال میں نہیں ہیں اس لئے میں نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اتنا سمجھنا چاہیے کہ مشکوٰۃ شریف کی عمدہ ترین شروحات کل سولہ ہیں اور اس کے علاوہ دروس مشکوٰۃ وغیرہ کے ناموں سے کئی تقاریر کتابی شکل میں چھپ کر سامنے آگئی ہیں اور آئندہ بھی آئیں گی۔

ان شروحات میں ہر شارح کا انداز جدا اور علمی تحقیقات و تشریحات اپنے اپنے رنگ میں ہیں لہذا ہر ایک کا ذاتی بھی الگ الگ ہے۔ اس لئے ایک شرح نہ حرف اول ہے اور نہ حرف آخر بلکہ ”وفوق کل ذی علم علیہ“ ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور تعلیمات عام کرنے کی مزید توفیق اور ہمت عطا فرمائے اور طلبہ کرام کو ہر اچھی محنت کی قدر دانی کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین یا رب العالمین۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بحث

سلفاً و خلفاً یہ طریقہ جاری ہے کہ جب علمائے کرام کتاب کی تصنیف کرتے ہیں یا کتاب شروع کرتے ہیں تو اتباع قرآن و حدیث اور سلف صالحین کی ترتیب کے مطابق ابتداء میں بسم اللہ اور الحمد للہ ضرور لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مؤلف مشکوٰۃ نے بھی ایسا ہی کیا ہے اس کی وجہ آنحضرت ﷺ کے وہ فرامین و احادیث ہیں جو مختلف الفاظ سے تسمیہ و تحمید کے بارے میں وارد ہیں چنانچہ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

کل امر ذی ہال لم یبدأ فیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم فهو ابتداء۔ (خطیب فی الجامع)

اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ:

کل امر ذی ہال لا یبدأ فیہ بالحمد للہ فهو اجزاء۔ (ابو داؤد و نسائی)

بعض روایت میں مندرجہ بالا روایت کے آخری الفاظ "فهو اقطع" آئے ہیں جیسا کہ مشکوٰۃ میں یہ روایت ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۷۷۲) بعض روایات میں بسم اللہ اور الحمد للہ کی جگہ ذکر اللہ کے الفاظ بھی آئے ہیں جیسا کہ علامہ رحاوی نے اربعینات میں لکھا ہے۔

اب یہاں علماء کے ہاں ایک بحث چلی ہے کہ ابتدا تو "کون الشیء اولاً" کا نام ہے اور اول تو ایک ہی چیز ہو سکتی ہے لہذا اگر بسم اللہ سے ابتدا ہوگی تو الحمد للہ سے نہیں ہوگی اور اگر الحمد للہ سے ابتدا ہوگی تو بسم اللہ سے نہیں ہو سکے گی۔ گویا دونوں روایتوں میں تعارض ہے پھر اس فرض تعارض کو دور کرنے کے لئے شارحین لکھتے ہیں کہ ابتدا کی تین قسمیں ہیں:

① ابتداء حقیقی ② ابتداء اضافی ③ ابتداء عرفی

پھر یہ حضرات بسم اللہ کے لئے ابتداء حقیقی مان کر جان چھڑاتے ہیں اور الحمد للہ کے لئے ابتداء اضافی یا عرفی مانتے ہیں تاکہ تعارض دور ہو جائے۔ پھر اعتراض کرتے ہیں کہ ابتداء حقیقی کو بسم اللہ کے ساتھ کیوں خاص کیا الحمد للہ کے ساتھ کیوں نہ کیا؟ تو جواب دیتے ہیں کہ بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی موجود ہے اور حمد کا تعلق صفات سے ہے اور ذات صفات پر مقدم ہوتی ہے۔ یا یہ جواب دیتے ہیں کہ کتاب اللہ کی ترتیب میں اور سلف صالحین کی کتابوں میں بسم اللہ مقدم تھی اس لئے اس طرز کو اختیار کیا گیا تاکہ سلف کی اقتدا ہو جائے۔

بعض حضرات جمع بین الروایات کا طریقہ اس طرح اپناتے ہیں کہ بسم اللہ سے ذکر اللہ مراد ہے، الحمد للہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر مراد ہے اور بعض روایات میں ذکر اللہ کا لفظ آیا بھی ہے۔ تو اس عمومی مفہوم کے تحت خواہ بسم اللہ پہلے ہو خواہ الحمد للہ پہلے ہو تو رض نہیں آئے گا کیونکہ ذکر اللہ کا مقصد تسمیہ و تحمید دونوں سے حاصل ہو جاتا ہے اسی توجیہ کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک خطوط میں کبھی صرف حمد پر اکثاف فرمایا ہے اور بعض مصنفین نے صرف بسم اللہ پر

اکتفا کر کے حمد کو ترک کیا ہے۔

بعض حضرات یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ ابتدا باللسان سے بھی حدیث کا مقبوم و مقصود پورا ہو جاتا ہے لہذا اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کی ابتدا میں تسمیہ و حمد میں سے کچھ بھی نہیں لکھتا ہے مگر زبان سے پڑھتا ہے تو یہ بھی کافی ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

اوپر مذکورہ تمام توجیہات کے علاوہ حضرت علامہ سید شاہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق الگ ہے ہمیں بخاری شریف پڑھاتے ہوئے محدث العصر اور شاہ صاحب کے علوم کے امین سید محمد یوسف المنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اصحاب فنون علماء نے تسمیہ و تحمید کی روایتوں میں جو تعارض بتایا ہے یہ درحقیقت غیر اہل فن نے فن حدیث میں بے جا مداخلت کی ہے حقیقت میں یہاں دو الگ الگ حدیثیں نہیں ہیں کہ اس میں تعارض کا احتمال آجائے یہاں ایک ہی حدیث ہے۔ جس میں دو مقاصد کو بیان کیا گیا ہے یعنی جب بھی کوئی شخص قائل احترام اور متم بالشان چیز کی ابتدا کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ بسم اللہ یا الحمد للہ سے ابتدا کرے۔

تو اصل مقصود ابتدا کرنے میں تبرک حاصل کرنا ہے اب یہ برکت تسمیہ سے حاصل کی جائے یا تحمید سے حاصل کرے۔ حدیث کے مقصود و مطلوب پر عمل ہو جاتا ہے یہاں دو حدیثیں نہیں کہ تعارض آجائے بلکہ ایک حدیث کے دو مطالبے ہیں کہ برکت کے لئے ابتدا میں تسمیہ و تحمید میں سے کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے ورنہ وہ کام قطع دم بریدہ بے برکت ہو کر رہ جائے گا اس عموم کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے جس میں ذکر اللہ کا لفظ آیا ہے۔

ایک عام توجیہ:

بعض علماء نے کتابوں کے خطبوں کی ترتیب میں پہلے بسم اللہ پھر الحمد للہ پھر رسولوں کا تذکرہ اور پھر صحابہ کا ذکر اور پھر مقاصد کتاب سے پہلے اپنی تصنیف کردہ کتاب کے تذکرہ سے متعلق ایک عام قاعدہ بیان کیا ہے جس سے خطبہ کتاب میں ہر چیز کی ترتیب آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر مصنف جو کتاب کی تصنیف کرنے لگتا ہے تو گویا یہ مصنف موجودات میں ایک نئے موجود کا اضافہ کرتا ہے لہذا وہ ترتیب کے ساتھ تمام موجودات کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ موجودات میں سب سے قدیم اور اول موجود واجب تعالیٰ کا وجودی وجود ہے اس کا حق ادا کرنے کے لئے ہر مصنف بسم اللہ کا تذکرہ کرتا ہے دوسرے نمبر پر موجودات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا وجود ہے اس کے لئے الحمد للہ سے تذکرہ کرتا ہے پھر خالق و مخلوق کے درمیان افادہ و استفادہ کے لئے رسولوں کا وجود ضروری ہے کیونکہ خالق غایت تقدس میں ہے اور مخلوق غایت تدنس میں ہے استفادہ ممکن نہیں تو رسول رسالت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ سے ہدایت لیتا ہے اور عالی انسانیت کی حیثیت سے عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔

لہذا مصنف اپنی کتاب میں وجود رسول کے حق ادا کرنے کے لئے بطور شکر یہ درود و سلام لاتا ہے چوتھے نمبر پر رسول کے

آل و اصحاب کا وجود ہے لہذا ان کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور اس کے بعد پانچویں نمبر میں اپنی کتاب کا تذکرہ کرتا ہے تاکہ تمام موجودات کا درجہ بدرجہ حق ادا ہو جائے۔ یہی طریقہ صاحب مشکوٰۃ نے بھی اپنایا ہے، اور سب ایسا ہی کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں تین ناموں کی تخصیص کیوں؟

اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ بسم اللہ میں ایک اسم ذاتی اور دو اسم صفتی کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں میں سے کیوں کی گئی؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ اللہ تو اسم ذاتی لو جب الوجود تھا اس کا ذکر سب سے پہلے ضروری اور بدیہی تھا، یہی اسم اعظم ہے جو قرآن میں (۲۳۶۰) بار مکرر آیا ہے اور جب تک یہ نام کسی کی زبان پر ہوگا قیامت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد اسماء صفات میں سے رحمان اور رحیم کو ذکر کیا کیونکہ صفات میں سے یہ دو نام سب سے زیادہ عام اور ہمہ گیر تھے کیونکہ یہ دونوں مبالغہ کے سیغے ہیں یعنی سبہ حد مہربان اور نہایت رحم والا اور دونوں کا تعلق دو جہانوں سے ہے یعنی عالم دنیا اور عالم آخرت، پھر ”رحمت“ رقتہ القلب کو کہتے ہیں اس لحاظ سے ان الفاظ کا اطلاق ابتدا اللہ تعالیٰ پر نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم کی ترکیب سے پاک ہے۔ اسی لئے علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پر بعض الفاظ کا اطلاق مبداء اور ابتدا کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا ہے مگر غایت اور نتیجہ کے اعتبار سے ہو جاتا ہے لہذا رقتہ القلب کا نتیجہ افاضہ خیر اور شفقت و مہربانی ہوتا ہے اس اعتبار سے رحمت کا اطلاق اللہ کی ذات پر جائز ہے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ رحمان کو رحیم پر کیوں مقدم کیا تو علماء کا کہنا ہے کہ رحمن کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے نیز یہ رحمت مسلم غیر مسلم انسان اور حیوان تمام کائنات کو شامل ہے اس لئے اس وسعت کی وجہ سے اس کو رحیم پر مقدم کیا اسی لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رحمان میں رحیم کے مقابلہ میں حروف زیادہ ہیں۔ اور ”کثرة الہبائی تدل علی کثرة المعانی“ قاعدہ ہے لہذا اس کو مقدم کیا، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ رحمان کا تعلق چونکہ براہ راست دنیا سے ہے اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے اور دنیا مقدم ہے اس لئے اس کو مقدم کیا چنانچہ بعض ادیبہ ماثورہ میں ”یا رحمان الدنیا و رحیم الاخرۃ“ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

گویا رحمان کا تعلق ربوبیت عامہ سے ہے اور رحیم کا تعلق ربوبیت خاصہ سے ہے ربوبیت عامہ جیسے مخلوقات کو کھانا پلانا وجود دینا نعمتوں سے مالا مال کرنا، ہواؤں، دریاؤں چاند ستاروں سورج اور دیگر نعمتوں سے لطف اندوز کرنا ہے اور ہر ایک کے دائرہ علم میں اس کو زندگی گزارنے کا شعور دینا خواہ وہ انسان ہو یا حیوان ہو خواہ مسلمان ہو یا کافر ہو یہ ربوبیت عامہ ہے لیکن رحیم کا تعلق ربوبیت خاصہ سے ہے یعنی عالم آخرت میں صرف فرمانبردار اور وفادار مسلمانوں پر مہربان ہونا اور نافرمان کفار کو سزا دینا، رب العالمین کے لفظ میں ربوبیت عامہ و خاصہ کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں بہر حال ان وجوہات اور نکات کی وجہ سے یہ تقدیم و تاخیر ہے۔

بسم اللہ کا متعلق کیا ہے؟

چونکہ بسم اللہ کے شروع میں باحروف جارہ میں سے ہے اور حرف جر کلام عرب میں کسی اور کلمہ سے وابستہ رہتا ہے لہذا علماء

نے بسم اللہ کے متعلق کو بیان کیا ہے۔ علامہ نحاۃ میں سے بصریین نے اس کے متعلق محذوف کو فعل قرار دیا ہے مثلاً: "ابتداً بسم اللہ الرحمن الرحیم" بصریین کا خیال ہے کہ فعل کو مقدر ماننے سے جملہ فعلیہ بن جائے گا جو زیادہ بہتر ہے نحاۃ کوفیین نے اس کے مقدر متعلق کا شہ فعل اسم قائل، اسم صفت وغیرہ ہونا راجح قرار دیا ہے لہذا ان کے ہاں یہ جملہ فعلیہ کے بجائے شہ جملہ اسمیہ بنے گا۔

پھر نحاۃ کے درمیان اس پر بھی کلام ہے کہ اس مقدر کو بسم اللہ سے مقدم مانا جائے مثلاً "اقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم" یا اس مقدر کو بسم اللہ سے موخر مانا جائے مثلاً "بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرأ" دونوں طرف نحاۃ گئے ہیں اور الگ الگ نکات کی وجہ سے اپنے اپنے مذہب کو ترجیح دی ہے پسند اپنی اپنی، خیال اپنا، پنا، تاہم لفظ "ابتدا" کے مقدم ہونے کو رائج خیال کیا گیا ہے (کشاف) پھر یہاں با جا رہ اور لفظ اللہ کے درمیان اسم کے لفظ کو دو وجہ سے بڑھا یا ہے۔ اول یہ کہ اگر با جا رہ لفظ اللہ پر داخل ہو جائے تو باللہ قسم کے ساتھ التباس آ جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسم بڑھانے میں ادب اور عاجزی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ تو بہت اونچی ہے اگر اس کے نام سے ابتدا ہو جائے تو یہ بھی بڑی غیبت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب

ہنوز نام تو گفتن کمال ہے ادبی است

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی جس کام کو شروع کرتا ہے اس کی مناسبت سے مقدر فعل نکالنا ہوگا مثلاً پڑھنے لگتا ہے تو "اقرأ بسم اللہ" کہے یا کھانا پیتا ہے تو "اکل واشرب بسم اللہ" کہے یا کوئی اور کام کرتا ہے تو اس کی مناسبت سے فعل مقدر نکالا جائے پھر با کے الف کو بڑھا کر اوپر کی طرف نکال دیا ہے تاکہ با کے الف کے حذف پر نشانی باقی رہے، یہ باستعانت کے لئے بھی ہے، الصاق کے لئے بھی ہے۔

بسم اللہ کی فضیلت:

طفل غنچہ کی چمن میں آج ابتدا ہے

جس طرف دیکھو ادھر اللہ ہی اللہ ہے

بسم اللہ کی سب سے بڑی فضیلت تو یہی ہے کہ قرآن عظیم میں بار بار اس کو دہرا گیا ہے ہر سورت کی پیشانی پر اس کی خوشنامہ ثبت ہے گویا بسم اللہ ایک سرکاری نشان ہے جس چیز پر یہ نشان ہوگا اس میں برکت ہوگی اور شیطان اس کے قریب نہیں آئے گا۔

تفسیر کبیر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! جب تم وضو بنانے لگو تو بسم اللہ پڑھا کر دو جب تک وضو سے فارغ نہیں ہو گے فرشتے تیرے لئے نیکیاں لکھیں گے۔ جب اپنی بیوی سے ہمبستری کرو تو پہلے بسم اللہ پڑھا کر دو غسل جنابت تک فرشتے تیرے لئے نیکیاں لکھیں گے اس جماع کے نتیجہ میں اگر بچہ

ہو تو اس کے اور اس کی اولاد کے سانس لینے کی مقدار نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اسے ابو ہریرہ! جب تم سواری پر سوار ہونے لگو تو بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھا کرو ہر قدم پر ایک نکل لکھی جائے گی، اور جب تم کشتی پر سوار ہونے لگو تو بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھو جب تک کشتی سے باہر نہیں آؤ گے برابر نیکیاں لکھی جائیں گی۔

اسی طرح تفسیر کبیر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انسان جب لباس اتار دیتا ہے تو اس کی شرمگاہ اور شیطین کی نظروں کے درمیان پردہ صرف یہ ہے کہ انسان بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۱)

حکایت ۱:

تفسیر کبیر میں ایک قصہ لکھا ہے کہ قیصر روم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا کہ میرے سر میں ہمیشہ درد رہتا ہے آپ مجھے کوئی دوا بھجوادیں۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک ٹوپی روانہ فرمائی کہ اس کو پہنا کر قیصر روم جب اس ٹوپی کو سر پر رکھتا تو سر کا درد ختم ہو جاتا مگر جب ٹوپی سر سے ہٹا دیتا تو درد پھر شروع ہو جاتا، شاہ روم کو اس پر تعجب ہوا اس نے ٹوپی کو ٹٹولا تو اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۱)

حکایت ۲:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فارس کے مجوسیوں نے کہا کہ آپ اسلام کی حقانیت کا دعویٰ کرتے ہیں لہذا آپ ہمیں اس پر کوئی کراماتی نشانی بتادیں تاکہ ہم بھی اسلام قبول کریں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ زہر قاتل لاؤ، وہ لوگ زہر قاتل کا ایک پیالہ لے آئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پیالہ لے کر اس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ لیا اور سارا زہر پی لیا اور ٹھیک ٹھاک کھڑے ہو گئے۔ مجوسیوں نے کہا یہ دین واقعی سچا دین ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۲)

حکایت ۳:

کہتے ہیں کہ فرعون نے دعویٰ الوہیت سے پہلے ایک مکان بنوایا تھا اور اس کے باہر والے دروازہ پر بسم اللہ لکھوایا تھا۔ جب فرعون نے ربوبیت کا دعویٰ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے آکر ان کو وحدانیت کی دعوت دی اور فرعون نے انکار کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ! میں نے اس شخص کو بار بار دعوت دی ہے لیکن اس میں خیر و بھلائی کی کوئی چیز ہی نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! تم شاید اس شخص کی ہلاکت چاہتے ہو کیونکہ تم اس کے کفر کو دیکھتے ہو لیکن میں اس کے دروازے پر اس کی لکھی ہوئی بسم اللہ کو دیکھتا ہوں۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۸)

حکایت ۴:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبرستان پر گزر ہوا آپ نے دیکھا کہ ایک مردے پر قبر میں عذاب کے فرشتے مسلط ہیں اور اس کو سخت عذاب ہو رہا ہے آپ آگے چلے گئے اور کچھ دیر کے بعد واپس آئے آپ نے دیکھا کہ اس مردے کے پاس قبر

میں رحمت کے فرشتے ہر قسم کی نعمتوں کے ساتھ موجود ہیں اور وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے نماز پڑھ کر اللہ سے دعا مانگی کہ اصل حقیقت کھول دے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج کر بتا دیا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! یہ شخص گنہگار تھا، جب مر گیا تو اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب قبر میں مبتلا ہو گیا مرتے وقت اس نے حاملہ بیوی چھوڑی تھی جس کا بعد میں بچہ پیدا ہوا اس عورت نے اس بچے کو پالا جب بچہ بڑا ہو گیا تو اس کی ماں نے اسے معلم کے پاس بھیج دیا معلم نے اس سے کہا پڑھ بیٹا بسم اللہ الرحمن الرحیم، بچے نے پڑھ لیا تو مجھے حیا آئی کہ میں اس شخص کو زمین کے نیچے عذاب دے رہا ہوں اور اس کا بیٹا زمین کے اوپر میرا نام لے رہا ہے۔ (یعنی معصوم زبان سے کہتا ہے کہ اللہ بڑا مہربان ہے اور بے حد رحم کرنے والا ہے اور اس کے باپ کو عذاب میں رکھوں یہ نہیں ہوگا)۔

بسم اللہ کے بے شمار فوائد اور بے حساب برکات ہیں، بس ہمیں چاہیے کہ ہم جب تک زندہ رہیں تو قدم قدم پر کہیں بسم اللہ جب موت آئے تو کہیں بسم اللہ جب قبر میں سوال ہو تو کہیں بسم اللہ جب میدان حشر میں آئیں تو کہیں بسم اللہ جب ثلثہ اعمال دیا جائے تو کہیں بسم اللہ جب وزن اعمال ہو تو کہیں بسم اللہ جب پل صراط پر ہوں تو کہیں بسم اللہ جب جنت میں داخل ہوں تو کہیں بسم اللہ جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو تو کہیں بسم اللہ۔

لَقَدْ بَسَمَلْتُ لَيْلٍ غَدَاةً لَقِيعَهَا
فِيَا حَبْلًا ذَاكَ الْحَبِيبَ الْبَسَمَلُ

”جب صبح کو میری ملاقات لیلیٰ سے ہوئی تو اس نے بسم اللہ کہہ کر ملاقات کی واہ واہ۔ بسم اللہ کہنے والا یہ محبوب کیا ہی اچھا تھا۔“

لفظ اللہ جل جلالہ:

جس طرح ذات باری تعالیٰ میں عارفین کی معرفتیں حیران ہیں اور نعرہ زن ہیں کہ ”ما عرفناك حق معرفتك“ اسی طرح لفظ اللہ کی تحقیق و تدقیق میں علماء و عقلاء کی عقلیں حیران ہیں کہ آیا یہ لفظ عبرانی یا سریانی ہے یا عربی ہے؟ بعض علماء مثلاً ابو زید لٹنی کا خیال ہے کہ یہ لفظ یا عبرانی ہے یا سریانی ہے کیونکہ اہل کتاب اس کو ”الاحا“ بولتے ہیں اور عبرانی و سریانی کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں الف بڑھایا جاتا ہے جس طرح بسم الاھا رحیمانا مرحیمانا بسم اللہ میں پڑھتے ہیں عرب نے آخری الف کو حذف کیا تو اللہ کہہ دیا یہ تو ان حضرات کا خیال ہے جو اس لفظ کو گنجی مانتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے، کلام اللہ عربی ہے کلام الرسول عربی ہے کلام اہل الجنت عربی ہے۔ کیونکہ باقی جتنے اسماء حسنی ہیں اسماء صفات میں سے ہیں تو صفت کے لئے موصوف اور نعت کے لئے منعوٰت کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہاں علماء نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ یہ لفظ اگر عربی ہے تو پھر یہ علم ہے یا اسم صفت ہے جامد ہے یا مشتق ہے تو راجح یہی ہے کہ یہ جامد ہے مشتق نہیں اسم علم ہے صفت نہیں، اسی قول کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، امام غزالی رحمہ اللہ اور ائمہ شیعہ میں سے سیبویہ غلیل ابن احمد، زجاج ہمدانی و ابن کثیر نے اختیار کیا ہے۔

جن حضرات نے اس لفظ کو مشتق مانا ہے وہ اس کو یا باب فتح یفتح الہ یا لہ بمعنی عبادت و بندگی لیتے ہیں مالوہ ای معبود اور اللہ

معبود ہے یا باب سمع سمع الہیالہ بمعنی تعجب و حشمت لیتے ہیں کیونکہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے دہشت زدہ ہے اور اس کی ذات میں حیران ہے۔ سعدی بابا ~~عظیم~~ نے فرمایا:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و ہم
وزیر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما بچیاں در اول وصف تو ماندہ ایم

کسی نے کہا:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے
بعض نے کہا یہ اصل میں ولاۃ تھا واذ کو ہنزہ سے تبدیل کیا تو الاۃ ہو گیا جیسے و شاح اشاح ہے۔
صاحب کشف نے کہا کہ یہ اصل میں "الاۃ" تھا ابتدا سے ہنزہ کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں الف لام لایا گیا تو
اللہ ہو گیا۔ بہر حال اللہ حاجت روا اور مشکل کشا کو کہتے ہیں چنانچہ سیبویہ کی طرف منسوب ہے:

معنی اللہ گفت سیبویہ
یولہون فی حوائجہم للیہ

یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ ہر وقت ہر حاجت میں اس کے سامنے گڑا کرتا ہے اور وہ کسی وقت کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں۔

اس مبارک اسم کی خصوصیات:

اس مبارک نام کی چند لفظی خصوصیات یہ ہیں:

- یہ نام صرف اللہ ہی کا ہے مخلوق میں سے کسی کا نام نہ ہوا ہے اور نہ جائز ہے۔
- اس نام کی طرف دیگر اسماء تو منسوب ہوتے ہیں جیسے کتاب اللہ، ناقۃ اللہ، ارض اللہ، بیت اللہ، مگر یہ کسی کی طرف منسوب نہیں ہوتا ہے۔
- حرف ندا کے حذف کے موقع پر اس کے آخر میں میم مشدود بڑھا کر اللہم کہنا درست ہے۔
- لفظ اللہ کے الف لام تعریف کے ساتھ یا حرف ندا کا آنا جائز ہے دیگر اسماء ایسے نہیں جیسے یا اللہ۔
- قسم واللہ باللہ تاللہ کے ساتھ خاص ہے۔



خطبہ کتاب

الْحَمْدُ لِلّٰهِ كُنْهَهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِيْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَاشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ شَهِادَةً تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَبِسْمِلَةٍ. وَلِيَرْفَعَ الدَّرَجَاتِ كَقِيْلَةٍ.

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، ہم سب اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طلبگار اور مغفرت کے خواستگار ہیں اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بد اعمالیوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں چھوڑ دیا اس کو کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ایسی گواہی جو نجات کے لئے وسیلہ ہو اور درجات کی بلندی کے لئے ضامن ہو۔

توضیح: الحمد للہ: حمد معنی ہے اس میں الف لام استفراق کے لئے بھی ہو سکتا ہے یعنی حمد و ثناء کا ہر فرد اللہ ہی کے لئے ہے اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ تعریف تو مخلوق کی بھی ہوتی ہے تو یہ اختصاص کس طرح؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا جس چیز کی بھی تعریف ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ اصل میں کائنات کے ہر کمال و جمال کا خالق و مالک اللہ ہے یہی وجہ ہے کہ عارفین کہتے ہیں کہ جب کسی اچھی آواز یا اچھی صورت یا اچھے کمال پر کسی کی تعریف کرو تو کہو کہ وہ اللہ کا کلام ہے جس نے اس مخلوق کو یہ اچھی آواز اور خوبصورت شکل اور اعلیٰ کمال عطا کیا ہے۔

الف لام جنس کے لئے بھی ہو سکتا ہے جنس حمد اور حقیقت حمد و ثناء اللہ کے لئے ہے جو افراد کے ضمن میں ہے۔ کیونکہ جنس کی حقیقت بھی افراد کے ضمن میں ہوتی ہے تو نتیجہ وہی نکلا کہ حمد کے تمام افراد اللہ کے لئے ہیں۔ الف لام عہد خارجی کے لئے بھی لیا جاسکتا ہے پھر اس سے اللہ تعالیٰ کے وہ حماد و صفات مراد ہوں گے جو کسی مخلوق کے لئے کسی صورت میں جائز نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص صفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اس صورت میں الحمد للہ کا اختصاص پر کوئی اعتراض نہیں آئے گا کیونکہ یہ صفات غیر اللہ میں آہی نہیں سکتی ہیں "الحمد هو العناء باللسان علی الجمیل الاختیاری علی جهة التعظیم"۔

یہ حمد کی اصطلاحی تعریف ہے اس میں لسان سے مراد آلہ تعبیر ہے تو اب یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی تعریف کی ہے وہاں لسان و زبان کہاں ہے؟ نیز کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی تعریف میں لگا ہوا ہے وہاں زبان کہاں ہے تو جواب ہو گیا کہ ہر چیز کی زبان سے مراد آلہ تعبیر ہے جو اس کے مناسب جال ہو۔

وہی	کل	شی	لہ	آیہ
تدل	علی	انہ	واحد	

مجمل اختیاری سے وہ جمال نکل گیا جو اختیار میں نہ ہو جیسے موتی کی چمک دمک ہے کہ اس کی تعریف حمد میں بلکہ اس کی تعریف کو مدح کہتے ہیں مثلاً مدحت اللؤلؤ علی صفائہ۔

اسی طرح علی حمد انتظیم سے استہزاء کی صورت نکل گئی جیسے کسی ان پڑھ کو کوئی شخص کہتا ہے علامہ صاحب آگئے یہ استہزاء ہے۔ حمد اور شکر میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ حمد کے لئے ضروری ہے کہ زبان سے ہو مقابلہ میں احسان و انعام ہو یا نہ ہو لیکن شکر کے لئے مقابلہ میں نعمت و احسان کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

پھر شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور زبان کے علاوہ جسم سے بھی ہو سکتا ہے لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے درمیان اس طرح کی نسبت ہے کہ حمد اپنے مورد کے اعتبار سے خاص ہے مگر متعلق کے اعتبار سے عام ہے اور شکر مورد کے اعتبار سے عام ہے لیکن متعلق کے اعتبار سے خاص ہے۔ مورد سے مراد وارد ہونے کی جگہ یعنی زبان ہے۔ شکر کی تعریف یہ ہے کہ:

فعل ینبغ عن تعظیم النعم۔

نحمدہ: پہلے حمد کو جملہ اسمیہ استمراریہ کی صورت میں ذکر کیا تھا اب حمد کو جملہ فعلیہ کی صورت میں لائے تاکہ تجدید اور حدوث پر دلالت کرے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تجدید ہوتا ہے اسی طرح مخلوق کی طرف سے حمد میں بھی تجدید کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اب یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جمع مشکلم کا صیغہ لا کر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ میں اکیلے اللہ تعالیٰ کی حمد کیسے ادا کر سکتا ہوں ہم سب مخلوق مل کر کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔

ونستعینہ: استعانت مدد طلب کرنے کے معنی میں ہے چونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہر وقت ہر ضرورت میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اس لئے مجموعی طور پر ہم سب اللہ تعالیٰ سے مدد و استعانت چاہتے ہیں اس لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ لائے ہیں اور سین اور تا طلب کے لئے ہے۔

ونستغفرہ: استغفار میں بھی سین تا طلب کے لئے ہے اور "غفر غفران" چھپانے اور ڈھانکنے کے معنی میں ہے مغفرت و معافی دینے سے بھی گناہوں کو چھپایا جاتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس جملہ سے پہلے حمد و استعانت کا ذکر تھا مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا کہ حمد و استعانت میں اگر کوتاہی رہ گئی ہو تو اس پر ہم اجتماعی استغفار کرتے ہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ کی رفعت و عظمت اور جلال و کمال کے لائق اخلاص کے ساتھ حق کہاں ادا ہو سکتا ہے۔

ونعوذ باللہ من شرور أنفسنا: کوتاہی اور قصور پر استغفار کرنے کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس جملہ میں یہ واضح فرما رہے ہیں کہ نفس و شیطان کی داخلی شرارت، خرابی نیت، ریا کاری، کینہ و حسد اور عجب و تکبر سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یعنی تمام باطنی قبائح اور ظاہری رذائل سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ومن سیدئات اعمالنا: اور تمام ظاہری اعمال سیدئہ کے ارتکاب سے اور محرمات و مکروہات کے صادر ہونے سے اور عبادات و ریاضات میں سستی و غفلت کے ارتکاب سے پناہ مانگتے ہیں۔

من یدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ: اس سے پہلے اعمال اور شر و سیدئہ کی نسبت نفس کی

طرف کی گئی جس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ نفس خود اپنے افعال کا خالق ہے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بندہ صرف کا سب ہے۔ افعال و اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے خلق شر میں تخلیق کمال ہے اگرچہ شر کا استعمال معیوب ہے تو ہدایت و اضلال اور اس کی حکمت صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اسی کو تکمیل اختیار ہے وہ جسے ہدایت دینا چاہے تو ہدایت دیدے کسی کو گمراہ کرنا چاہے تو گمراہ کر دے بندہ کو اختیار نہیں۔

ہدایت راہ نمائین کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے ایک "اراء الطریق" یعنی کسی کو زبان سے سمجھا دیا کہ سیدھا راستہ اس طرف گیا ہے فلاں نشان کے بعد پہنچ جائے۔ یہ اراء الطریق کہلاتا ہے کہ راہ راست پر لگا دیا، چلا دیا اس میں یہ ضروری نہیں کہ وہ آدمی منزل مقصود تک پہنچ ہی جائے بلکہ ممکن ہے کہ وہ اس راستہ کو چھوڑ دے اور ممکن ہے کہ منزل تک پہنچ جائے۔ ہدایت کی دوسری قسم "ایصال الی المطلوب" ہے وہ یہ کہ کسی کو ہاتھ سے پکڑ کر منزل مقصود پر جا کر اتارا جائے اس میں منزل تک پہنچنا یقینی ہوتا ہے اور بھٹکنے کا احتمال نہیں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں انبیائے کرام علیہ السلام سے ہدایت دینے کی نفی آئی ہے جیسے "انک لا تہدی من احببت" وہاں ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب ہے، ورنہ انبیائے کرام کو تو ہدایت مخلوق ہی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح "واما مود فہدیہا ہم فاستحبوا العمی علی الہدی" میں ہدایت سے مراد صرف اراء الطریق ہے ایصال الی المطلوب نہیں۔

باقی اللہ کی طرف اجلال کی نسبت اثر مرتب اور تخلیق کے طور پر ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے قلوب بنی آدم میں ہدایت کی جو استعداد پیدا کئی کے وقت رکھ رکھا ہے وہ ماحول اور معاشرہ کے ارد گرد کے اثرات سے خود انسان ضائع کرتا ہے جب وہ استعداد ختم ہو جاتی ہے تو اس پر اثر مرتب کا نام مہر جباریت ہے اور یہی اضلال ہے تو قصور خود اس انسان کا سب کا ہے۔

واشہد ان لا الہ الا اللہ: مصنف رحمہ اللہ یہاں شہادت کے ذکر کرنے میں مفرد کا صیغہ لائے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شہادت اور گواہی انرا باطنی، امر قلبی ہے جس کی ذمہ داری ہر آدمی کی اپنی اپنی ہے لہذا دوسروں کو اس میں شریک کرنا مشکل ہوتا ہے نیز شہادت کا صیغہ عام طور پر احادیث میں بھی مفرد لایا گیا ہے اس کی پیروی میں مفرد کا صیغہ لائے اور صرف اپنی شہادت کا ذکر کیا۔

توحید کی شہادت یہ ہے کہ اس کا رجا بہ عالم کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے اور اس میں ہر حرکت و سکون بلا شرکت غیر صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ فاعل مختار ہے اس کی ذات و صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ سلطان باہو رحمہ اللہ نے کہا:

یقین دہم دریں عالم کہ لا معبود الا هو

ولا مقصود فی الکونین ولا موجود الا هو

چوں تیغ لا بدست آری بیاتجا چہ غم واری

بحو از غیر حق یاری کہ لا فتاح الا هو

شہادۃ تکون للنجاة وسیلة ولرفع الدرجات کفیلة: شہادت منسوب ہے اور یہ مفعول مطلق ہے، پھر یہ موصوف ہے اور بعد کی عبارت اس کی صفت ہے، نجات سے مراد دنیا و آخرت کے عذاب سے خلاصی ہے اس عذاب سے خلاصی پا کر جنت پہنچنا نجات ہے۔ وسیلہ یہ سبب اور ذریعہ کے معنی میں ہے علت کے معنی میں نہیں کیونکہ اصل علت اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل ہے، رفع الدرجات کا مطلب یہ ہوا کہ جب بار بار اس شہادت سے ایمان کو تازہ رکھے گا تو درجات بلند ہوں گے اور یہی شہادت توحید ان درجات کی بلندی کی ضمانت بنے گی شہادت کے ساتھ یہ فوائد لگا کر مصنف رحمہ اللہ بتا رہے ہیں کہ یہ شہادت اس وقت نافع اور فائدہ مند ہوگی جب اس میں ریا کاری نہ ہو۔

وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ الَّذِي بَعَثَهُ وَطَرَفِي الْإِيمَانِ قَدْ عَقَفْتُ أَثَرَهَا، وَتَحَبَّتْ أَثَرُهَا، وَوَهَبْتُ أَزْكَائِهَا، وَجُهِلْ مَكَائِهَا:

ترجمہ: اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاجت روا مشکل کشا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنا رسول بنا کر بھیجا جب ایمان کی راہوں کے نشان مٹ چکے تھے اور اس کی روشنیاں بھج چکی تھیں، اور اس کے آثار و ستون کمزور پڑ چکے تھے اور اس کی بنائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ توضیح: توحید اور وحدانیت کی گواہی سے فارغ ہو کر مصنف اقرار رسالت اور شہادت رسالت کی شہادت بیان فرما رہے ہیں۔ محمد: یہ آنحضرت ﷺ کے اسماء مبارکہ میں سب سے مشہور نام ہے آپ ﷺ کا دوسرا نام احمد ہے سابقہ کتب کا وہ میں اور آسمان پر فرشتوں کے ہاں آپ کا نام احمد زیادہ مشہور ہے۔ آپ ﷺ کے سوا ناموں کا ہونا مشہور ہے ان ناموں میں صرف کثرت اسماء کا فلسفہ کارفرما نہیں بلکہ ہر نام ایک طویل حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ طویل صفات آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور ذات مبارکہ میں موجود تھیں چنانچہ محمد اسم مفعولی کا صیغہ ہے۔ صفت سے اسمیت کی طرف منقول ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات جو ستودہ کائنات ہے یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا مدح خواں ہے۔

تاریخ اسلام کی کتابوں میں لکھا ہے کہ قریش نے حضور اکرم ﷺ کے ردو ا عبدالمطلب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے پوتے کا نام محمد ﷺ کیوں رکھا؟ آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ زمین و آسمان والوں کی طرف سے ان کی تعریف و مدح ہو۔ اسی نکتہ کی طرف دربار رسول ﷺ کے شاعر حضرت حسان بن ثابتؓ اس طرح اشارہ فرماتے ہیں:

وهم الإله اسم النبي باسمه
إذا قال في الخمس المؤذن اشهد
فشق له من اسمه ليجله
فلو العرش محمود وهذا محمد

”اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر رکھا جب مؤذن پانچ وقت کی اذان میں اٹھد کہہ کر نام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور اعزاز و اکرام آپ ﷺ کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے پس عرش والا محمود ہے اور یہ محمد ہے۔“ اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے ”ورفعناک ذکورک۔“

اس مبارک نام کو جو شخص زبان پر لاتا ہے تو دودفعہ میم پر ہونٹوں کو ملا کر ایک دوسرے کو بوسہ دیتا ہے۔ یہ نام عرب میں بہت کم ملتا ہے بلکہ سابقہ کتب میں آنحضرت ﷺ کی بشارات کے پیش نظر بعض لوگوں نے اپنی اولاد کا نام محمد رکھا تھا تا کہ وہ نبی آخر زمان بن جائے مگر پورے عرب میں یہ صرف چھ آدمی تھے جو نہ ہونے کے برابر تھے۔

بہر حال نام محمد ﷺ میں چونکہ صاحب صفات حمیدہ کا مفہوم پڑا تھا اس لئے قریش نے جب اس مشکل کو محسوس کیا کہ زبان سے جب محمد کا نام لیا جائے تو صفات حمیدہ کا اقرار لازم آتا ہے۔ اور پھر مذمت کرنے سے واضح تضاد نظر آتا تھا تو انہوں نے محمد ﷺ کے بجائے مذم کی مذمت شروع کی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح مجھ سے قریش کی مذمت بٹادی ہے اب وہ مذم کی مذمت کرتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔

احمد: بھی آنحضرت ﷺ کے مشہور ناموں میں سے ایک نام ہے جو وصفیت سے اسمیت کی طرف منتقل ہو گیا۔ احمد کے معنی سب حامدین سے زیادہ حمد و ثناء کرنے والا یعنی احمد الفائدین اور آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء کرنے والے تھے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے عمدہ اور سب سے اعلیٰ تعریف آنحضرت ﷺ کی فرمائی ہے کسی نے کیا خوب فرمایا:

خدا	در	انتظار	حمد	ما	نیست
محمد	چشم	بر	راہ	منا	نیست
خدا	مدح	آفرین	مصطفیٰ	بس	
محمد	حامد	حمد	خدا	بس	
محمد	از	تو	میخواہم	خدارا	
خدایا	از	تو	عشق	مصطفیٰ	را

عبدہ و رسولہ: منصب رسالت اگرچہ اونچا مقام ہے اور مقامات بشریت میں انتہائی ارفع و اعلیٰ کمال ہے مگر عبد کا رتبہ چونکہ اصل وضع میں عبدیت میں مضمر ہے اس لئے اس کو رسالت پر مقدم کیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عبد کا ذکر سب سے زیادہ اعزاز و اکرام کے مواقع میں آنحضرت ﷺ کے لئے کیا ہے چنانچہ معراج پر لے جانے کے وقت ”سبحان الذی اسرئلی بعبدہ“ فرمایا اور پھر سدرۃ المنتہی کے شریف ترین مقام پر عبد کی طرف اضافت تشریفی کر کے فرمایا ”واوحی الی عبدہ ما اوحی“ لہذا یہاں بھی عبد کے محبت بھرے الفاظ سے انتہائی قرب کا اشارہ فرمایا ایک شاعر نے لوگوں سے کہا کہ مجھے محبوبہ کا عبد کہہ کر پکارا کرو:

لا تدعنی الا بیاً عبدہا
فانہ اشرف اسمائیا

نیز اس لفظ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ عبد کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے وہ پھر بھی عبد ہے معبود نہیں۔ معبود صرف اللہ کی ذات ہے خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ کسی نے کہا:

محمد بشر لیس کالبشر
ویاقوت حجر لیس کالحجر
وکم طیب یفوح ولا کمسک
وکم طیر یطیر ولا کبازی

رسول اور نبی میں فرق:

رسول لغت میں قاصد اور پیغام پہنچانے والے کے معنی میں آتا ہے اور اصطلاح میں رسول کی تعریف اس طرح ہے:

انسان بعثہ اللہ الی الخلق لتبلیغ الاحکام معہ کتاب متجدد۔

یہاں انسان کہہ کر جنات اور ملائکہ سے احتراز کیا کیونکہ انسان بشر کے معنی میں فرشتوں اور جنات کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ہدایۃ الخوکی شرح الہامیہ میں رسول کی یہی مندرجہ بالا تعریف کر کے قیودات میں لکھا ہے کہ ”انسان“ کہا ”رجل“ نہیں کہا تا کہ انسان کا لفظ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی شامل رہے پھر صاحب الہامیہ نے لکھا ہے کہ عورتوں کو بھی نبی بنایا گیا جیسے حضرت مریم، حضرت آسیہ اور حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

اس اللہ کے بندے نے اس مقام میں دانستہ یا نادانستہ طور پر کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا اول تو اس نے ایک اجماعی عقیدہ اور نصوص قرآنیہ کی واضح تصریحات و اشارات کے خلاف عورتوں کے لئے نبوت اور رسالت ثابت کرنے کی کوشش کی دوم انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے نبوت ثابت کرنے کی بات کر کے ختم نبوت کے قطعی نصوص کی واضح خلاف ورزی کی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین نہیں تھے بلکہ آپ کے بعد عائشہ اور فاطمہ بھی نبی بنیں۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب الہامیہ نے اپنی ہی ایک بنائی ہوئی تعریف کی ایک قید احترازی کے لئے اتنی بڑی بات کہہ دی حالانکہ یہ تعریف کوئی آسمانی وحی نہیں ہے اور اس میں اس قید کی حیثیت بھی ایک شخص کی ذہنی نکتہ سنجی ہے۔ نہ یہ حدیث ہے نہ آیت ہے نہ کوئی اجماع امت کا فیصلہ ہے جس کے سامنے ہم مجبور ہوں۔ الہامیہ چھاپنے والوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے متصادم یہ باتیں آئندہ نکال دیں۔

نبی کی تعریف یہ کہ:

انسان بعثہ اللہ الی الخلق لتبلیغ الأحکام۔

اب علماء کے ہاں یہ بحث چلی ہے کہ رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟

بعض علماء نے لکھا ہے کہ دونوں میں ترادف ہے کیونکہ قرآن کریم میں رسول اور نبی کا اطلاق بیک وقت ایک ہی ذات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً "وکان رسولاً نبیاً" یہ اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے۔ بعض علماء نے رسول اور نبی کی تعریفوں کو دیکھ کر بتایں کہ رسول کیا کہ رسول کے پاس نئی شریعت ہوتی ہے اور نبی نئی شریعت لے کر نہیں آتا ہے بلکہ سابقہ شریعت کی تجدید کے لئے آتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں سورہ حج کی آیت: "وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی" میں رسول پر نبی کا عطف ہوا ہے جو مغایرت کو چاہتا ہے اسی طرح احادیث میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے اور رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ بتائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں تغایر و تباین ہے۔

رسول کی اس تعریف پر ایک اعتراض ہے کہ آسمانی صحیفے کل ایک سو ہیں اور بڑی کتابیں کل چار ہیں اور رسول کل تین سو تیرہ ہیں تو ہر رسول کے پاس کتاب کہاں سے آئے گی؟

نیز اسماعیل علیہ السلام کو قرآن، رسول کے نام سے ذکر کرتا ہے حالانکہ ان کے پاس کوئی نئی کتاب نہیں تھی اس اعتراض کا جواب محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے درس بخاری کے دوران شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے حوالہ سے اس طرح دیا تھا کہ شاہ صاحب نے ایک دفعہ مجھے بلا کر نہایت خوشی کے عالم میں مجھ سے فرمایا کہ کتابوں میں مجھے رسول اور نبی کا فرق مل گیا اور وہ اس طرح کہ نبی وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کی طرف بھیجا گیا ہو، معاشرہ میں غیر مسلم بھی ہوں اور مسلم بھی ہوں مگر رسول وہ ہوتا ہے جو خالص قوم کفار کی طرف بھیجا گیا ہو اور ان کا اس قوم کے ساتھ خوب مقابلہ بھی ہو جائے۔ لہذا حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے جتنے پیغمبر آئے ہیں وہ انبیاء تھے۔ اور نوح علیہ السلام کے وقت رسولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مقابلے ہوئے چنانچہ آخر میں آپ ﷺ مکہ کے کفار کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ جب آپ آئے تو ردائے زمین پر کفر و شرک ہی تھا آپ ﷺ نے مقابلہ کیا اور غلبہ پایا۔

الذی بعثہ: یہ رسول کی صفت ہے آنحضرت ﷺ کی بعثت مکہ میں چالیس سال کی عمر میں ہوئی اور جن وانس کے لئے آپ ﷺ کی نبوت عام تھی صرف ان پڑھ عرب کے لئے نہ تھی جیسا کہ عیسائی دھوکہ دیتے ہیں کہ قرآن نے آپ کو "لیکون للعالمین نذیراً" فرمایا اور آپ نے خود فرمایا: "وارسلنا الی الخلق كافة" یعنی تمام انسانوں اور جنات کے لئے مجھے رسول بنا کر بھیجا گیا۔

طرق الایمان قد عرفت آثارها: طرق جمع طریق ہے اور طریق راستہ کو کہتے ہیں اور یہاں داؤد حالیہ ہے۔ اور طرق الایمان سے مراد انبیائے کرام، ان کی تعلیمات اور آسمانی کتابیں ہیں کہ ہدایت کے یہ سارے راستے مٹ چکے تھے اور اس کے نشانات ختم ہو چکے تھے۔

یعنی آپ ﷺ کی بعثت کے وقت انبیائے کرام کی تعلیمات ناپید ہو چکی تھیں، صحیح رہبری کا وجود نہیں تھا، کہیں کہیں خفیہ غاروں میں کوئی عیسائی پادری براہب ہوگا لیکن وہ عامۃ الناس کے سامنے آنے کی حالت میں نہیں تھے اور نہ قیادت کر سکتے

تھے۔ انبیائے کرام کے علوم و معارف کی قدر و منزلت سے ناواقفیت عام تھی اور ان مراکز دینیہ کے مراجع لوگ بھول چکے تھے الغرض تاریخ کی اور گمراہی کا دور دورہ تھا۔

مذہب ۳۰ شوال ۱۲۰۹ھ

فَشَيْدَ صَلَوَاتُ اللَّهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ مِنْ مَعَالِيهَا مَا عَفَا، وَشَفَى مِنَ الْعَلِيلِ فِي تَأْيِيدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيدِ مَنْ كَانَ عَلَى شَفَا، وَأَوْضَحَ سُبُلَ الْهِدَايَةِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَسْلُكَهَا، وَأُظْهِرَ كُنُوزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَ أَنْ يَمْلِكَهَا.

پس نبی اکرم ﷺ نے ان لئے ہوئے نشانات کو از سر نو نمایاں اور مستحکم کر کے بلند اور مضبوط کیا اور کلمہ توحید کی تعلیم سے اس بیمار کو شفا پہنچائی جو ہلاکت کے کنارے جا پہنچا تھا اور اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو اور نیک بخئی و سعادت کے خزانے اس شخص کے لئے ظاہر کئے جو اس کے مالک ہونے کا قصد کرتا ہو۔

توضیح: شید: تشدید سے ہے یہ سچ کرنے، پستر کرنے اور بلند و مضبوط کرنے کے معنی میں آتا ہے "وقصر مشید" اسی سے ہے۔

"معالم" معلم کی جمع ہے راستے وغیرہ کے نشان کو کہتے ہیں۔

"ما عفا" میں ما موصولہ ہے اور عفا صلہ ہے۔ موصول صلہ سے مل کر شید کے لئے مفعول یہ ہے۔

اور من معالما یہ بیان مقدم ہے ما عفا کے لئے اور صلوات اللہ علیہ و سلامہ ﷺ میں جملہ محترضہ ہے

"ای شید ما عفی من معالما صلوات اللہ علیہ و سلامہ"۔

وشفی من العلیل فی تأیید کلمۃ التوحید من کان علی شفا: شفی کا عطف شید پر ہے اور شید میں ضمیر فاعل آنحضرت ﷺ کی طرف لوثی ہے اور من کان علی شفا اس کا مفعول یہ ہے اور شفا اول اور شفا ثانی میں صفت جناس ہے کہ لفظ دونوں کلمے مشابہ ہیں۔ اس جملے میں قرآن کریم کی آیت "وکنتم علی شفا حفرة من النار" کی طرف اشارہ ہے۔

اور من العلیل کو مقدم کیا تاکہ عبارت میں سمجھ کا حسن پیدا ہو جائے، یہ من کان کا بیان ہے اور فی تأیید کلمۃ التوحید جار و مجرور "شفی" کے ساتھ متعلق ہے اور فی تعلیل کے لئے ہے۔ عبارت اس طرح ہے: "وشفی بسبب کلمۃ التوحید من کان علی شفا من العلیل" یعنی کلمہ توحید کی تعلیم کے ذریعہ سے آنحضرت ﷺ نے اس بیمار کو شفا پہنچائی جو تباہی کے کنارے پہنچ گیا تھا۔

سبیل: لفظ سبیل مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس لئے "سلکھا" میں مؤنث کی ضمیر سبیل کی طرف لوثائی گئی ہے نیز یہ بھی یاد رکھیں کہ ضمیر مؤنث و مذکر میں "یدھا" کی طرح دونوں کی گنجائش ہے یعنی لفظ زید اگر مراد

ہے تو ہو ضمیر ہے اور اگر لفظ زید سے مراد کلمہ لیا جائے تو ہا ضمیر لوٹا ناجائز ہے۔ تو کہہ سکتے ہیں زید ہا ہو۔
کنوز السعادات: سے مراد نیک بختی اور سعادت دارین کے معنوی خزانے ہیں جیسے علوم دینیہ اچھے اور حمیدہ اخلاق اور صالح اعمال یہ سب کنوز سعادت ہیں۔

اما بعد: کلام کا ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کرنے کے لئے فصحاء اور بلغاء اما بعد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تاکہ کلام میں فصل آجائے یہ لفظ قدیم عرب کے خطباء نے بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

قد علم الحی الیائین الہی
اذا قلت اما بعد انی خطیبہا

کتاب کے خطبوں میں اما بعد کا مضاف الیہ عموماً محذوف ہوتا ہے اور اما قائم مقام فعل شرط ہوتا ہے یعنی ”سمہما یکن شیء من الاشیاء بعد الحمد للہ والحمد للہ والتصلیۃ فہو کتابی ہذا“۔ یہ صراحت عائی ہے جو جائز ہے۔

بعد: ظروف زمانیہ میں سے ہے اگر اس کا مضاف الیہ مذکور ہو یا نسیا محذوف ہو تو دونوں صورتوں میں یہ معرب ہوتا ہے اور اگر اس کا مضاف الیہ محذوف منوی ہو تو یہ بنی علی اللہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ کلمہ بہت خفیف ہو کر رہ گیا ہے اس لئے اس کو نقل الحركات ضمہ پر بنی کیا گیا تاکہ ضمہ کی وجہ سے اس میں کچھ نقل آجائے پھر چونکہ ”اما“ معنی شرط کو معطیٰ ہے اس لئے بعد میں فاء جزائیہ لایا جاتا ہے لیکن جہاں صرف ”و بعد ہے“ وہاں بھی کبھی کبھی فاء جزائیہ لایا جاتا ہے حالانکہ وہاں فاء جزائیہ لانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ فاء وہم ”اما“ کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے یعنی مصنف کو وہم ہو گیا کہ آیا میں نے اما بعد لکھا ہے یا بعد لکھا لہذا اما بعد کا خیال غالب آیا اور پھر فاء جزائیہ کا ذکر کیا گیا۔ یہ وجہ عجیب اور انتہائی کمزور ہے کیونکہ اس طرح مجموعہ نسیان اگر مصنف ہو گا تو وہ آگے چل کر کیا لکھے گا جس کو سامنے لکھی ہوئی عبارت میں اس وقت وہم ہو گیا جبکہ عبارت قلم کی نوک پر تھی۔ درحقیقت و بعد کے بعد جو فاء جزائیہ کسی نے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد زمانیہ کے ساتھ معاملہ حرف شرط کا کیا گیا ہے جس طرح قرآن کریم میں ہے ”واذ لہم یبتدوا بہ فسیقولون ہذا الفک قدیمہ“ یہاں اذ ظرفیہ ہے جو معنی شرط کو معطیٰ ہے لہذا فاء لائی گئی یہی صورت و بعد کی بھی ہے۔

اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ سب سے پہلے اما بعد کے الفاظ کس نے استعمال کئے تو یہاں کئی اقوال ہیں مگر رائج یہ ہے کہ سب سے پہلے اس لفظ کو حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال فرمایا ہے۔ مفسرین نے کہا کہ ”واتبعنا الحکمۃ وفصل الخطاب“ میں یہ خطاب فاضل اما بعد کا کلمہ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال کیا تھا۔

پھر عام خطبوں میں نبی اکرم ﷺ نے بھی اس کو استعمال فرمایا اور تا حال استعمال ہوتا ہے لہذا یہ مستحب ہے کہ ہر خطیب اپنے خطبہ میں اس کو استعمال کرے۔

﴿اَمَّا بَعْدُ﴾ فَإِنَّ أَوَّلَ مَنَاسِكَ بِهٖ لَا يَسْتَحِبُّ إِلَّا بِالْأَيْحَاءِ لِمَا صَدَدَ مِنْ مِّشْكُوٰتِهِ ۖ وَالْإِعْتِصَامُ بِمَحْتَلِّ
اللَّهِ لَا يَنْتَهِي إِلَّا بِبَيِّنَاتٍ كَشَفِہٖ ۖ وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيحِ الَّذِي صَلَفَةُ الْإِمَامِ مُحَمَّدٍ السُّنَّةُ قَامِعُ الْبِدْعَةِ

أَبُو مُحَمَّدٍ الْمُحْسِنُ بْنُ مَسْعُودٍ الْفَرَّاءِ الْبُخَارِيُّ رَفَعَ اللَّهُ دَرَجَتَهُ أَجْمَعِ كِتَابَ صُفْوَى فِي بَابِهِ وَأَطْبَقَ
لِشَوَارِدِ الْأَحَادِيثِ وَأَوْبَدَهَا.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بعد ازاں جانا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنا اسی وقت معتبر ہو سکتا ہے کہ اس چیز کی کامل اتباع کی جائے جو آپ کے سینہ مبارک سے ظاہر ہوئی تھی ”یعنی آپ کے ارشادات و احکام“ اسی طرح خدا کی مضبوطی یعنی قرآن کریم پر اعتماد اور اس پر عمل جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کی تشریح و توضیح احادیث نبوی سے ہو (اور احادیث کی کتابوں میں) امام محی السنۃ (یعنی سنتوں کو زندہ کرنے والے) اور قاصع البدعہ (بدعت کو مٹانے والے) ابو محمد حسین الفراء البخاری رحمہ اللہ (اللہ ان کے درجات بلند کرے) نے جو کتاب مصانع تالیف فرمائی تھی وہ اپنے فن کی ایک جامع کتاب تھی جس میں امام موصوف نے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ منتشر و متفرق احادیث کو جمع فرمایا تھا۔

توضیح: یہاں سے صاحب مشکوٰۃ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے باوجود یکہ اعلیٰ درجہ کی قابل اعتماد حدیث کی کتاب مصانع موجود تھی پھر مشکوٰۃ المصابیح کی تالیف کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ممکن نہیں جب تک کہ آپ کی احادیث کا علم حاصل نہ کیا جائے اسی طرح قرآن کریم کے تفصیلی احکامات پر عمل کرنا بغیر احادیث کے ممکن نہیں ہے۔

ان دونوں اہم مقاصد کے حصول کے لئے حدیث کی ضرورت تھی اور حصول حدیث کے لئے ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی جس میں ہر قسم کی ضروری احادیث کو جمع کیا گیا ہو، اس طرح کی جامع کتاب امام حدیث، شیخ محی السنۃ کی کتاب مصانع تھی جو اپنے فن میں عمدہ ترین کتاب تھی۔

لا یستتب: یہ لفظ باب استفعال سے ہے جو بمعنی لا یستقیم اور لا یستمر کے ہے۔

الاقتفاء: تلاش کرنے اور ٹٹولنے کے معنی میں ہے، مراد اتباع اور پیروی ہے۔

مشکاتہ: مشکاة غیر نافذہ طاقیہ کو کہا جاتا ہے، آنحضرت ﷺ کے قلب منور کو روشن چراغ قرار دیا جو سینہ اطہر میں رکھا گیا ہے تو سینہ کی تشبیہ طاقیہ سے دنی جس کے اندر روشن دل موجود ہے، یہ تشبیہات قرآن کریم کی آیت: ”اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح“ سے ماخوذ ہیں۔ (سورۃ نور ۳۵)

الاعتصام: چنگل مار کر کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

حبیل اللہ: سے مراد قرآن کریم ہے۔

لا یتمم الا بہیمان کشفہ: بیان کی اضافت کشفہ کی طرف اضافت بیان یہ ہے یعنی ”ہیمان ہو کشفہ“ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے محملات کی تفصیل احادیث کے بغیر ممکن نہیں، قرآن کریم میں اصول و قواعد ہیں۔ احادیث نے اس کی وضاحت کی اگر احادیث کی تفصیلات کو قرآن سے الگ رکھا جائے تو قرآن معطل ہو کر رہ جائے گا کیونکہ احکامات کے فرائض و واجبات و سنن اور اس کے اوقات و کیفیات کی تفصیلات قرآن کریم میں کہاں ہیں ملحدین کی یہی کوشش ہے کہ

احادیث کو قرآن سے کاٹا جائے تاکہ دین اسلام اپنی جڑوں سے اکھڑ کر ختم ہو جائے۔

اضبط: اضبط، "اجمع کتاب" پر عطف ہے اور یہ بھی کان کی خبر ہے۔ اضبط مرتب کے معنی میں ہے یعنی یہ کتاب حفظ و ضبط کے سب سے زیادہ لائق تھی کیونکہ اس میں سند وغیرہ نہیں تھی اور احادیث میں نگرار بھی نہیں تھا۔

شوارہ: یہ شاردہ کی جمع ہے یعنی بھاگنے والا اونٹ اسی طرح او ابد ابدت کی جمع ہے بدکنے والا وحشی جانور ان دونوں لفظوں سے یہ بتایا گیا ہے کہ بعض احادیث جو کتب احادیث میں مختلف جگہوں میں مذکور ہیں وہ گویا طالب علم سے بھاگے ہوئے اونٹ کی طرح ہیں جو ہاتھ نہیں آ رہا ہے اور بعض احادیث کے معنی طالب علموں سے پوشیدہ رہتے ہیں ان کی تشبیہ ایسے وحشی جانوروں سے دیدی جو متوحش غیر مانوس ہیں۔ دونوں لفظوں میں تشبیہ دی ہے اور یہ استعارہ ہے اور او ابد شوارہ کے لئے عطف تفسیر ہے۔

ملا علی قاری عنہ نے لکھا ہے کہ احادیث کو بدکنے والے وحوش کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وحشی جانور موقع پاتے ہی بھاگ جاتے ہیں اسی طرح احادیث بھی ذرا سی غفلت سے ضبط و حافظہ سے نکل جاتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ "العلم صید والکتابۃ قید" یہاں یہ اعتراض ہے کہ احادیث کی تشبیہ غیر مانوس وحوش کے ساتھ کیوں دی ہے۔ اس لئے کہ تشبیہ میں تمام صفات اور تمام کیفیات کا لحاظ نہیں ہوتا ہے نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ مشہد سے مشہد ہمیشہ اعلیٰ و ارفع ہو بعض دفعہ مخصوص وضاحت کیلئے مخصوص پہلو کا لحاظ کر کے تشبیہ دی جاتی ہے حالانکہ مشہد بہ ادنیٰ ہوتا ہے جس طرح کہ "اللہ نور السموات والارض" آیت میں "کمشکاۃ فیہا مصباح" ہے۔

ترجمہ صفحہ ۹۰

وَلَمَّا سَأَلَكَ اللَّهُ عَنْهُ طَرِيقَ الْإِخْتِصَارِ وَحَذَفَ الْأَسَانِيدَ تَكَلَّمَ فِيهِ بَعْضُ النُّقَادِ وَإِنْ كَانَ ثِقَلُهُ وَانَّهُ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْإِسْنَادِ لَكِنْ لَيْسَ مَا فِيهِ أَعْلَامٌ كَالْأَغْفَالِ فَاسْتَحْزَرَ اللَّهُ تَعَالَى وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ فَأَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيثٍ مِنْهُ فِي مَقَرِّهِ فَأَعْلَنْتُ مَا أَغْفَلَهُ كَمَا رَوَاهُ الْأَكْبَمَةُ الْمُتَقِنُونَ وَالْفَقَاتُ الرَّاسِخُونَ مِثْلُ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيِّ وَأَبِي الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ وَأَبِي عَبْدِ اللَّهِ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ الْأَصْبَحِيِّ وَأَبِي عَبْدِ اللَّهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِدْرِيسَ الشَّافِعِيِّ وَأَبِي عَبْدِ اللَّهِ أَحْمَدَ بْنَ مُحَمَّدٍ بْنِ حَنْبَلٍ الشَّيْبَانِيَّ وَأَبِي عِيْنِي مُحَمَّدِ بْنِ عِيْنِي الرَّزْمَلِيَّ وَأَبِي دَاوُدَ سُلَيْمَانَ بْنَ الْأَشْعَثِ السَّجِسْتَانِيَّ وَأَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَحْمَدَ بْنَ شُعَيْبٍ النَّسَائِيَّ وَأَبِي عَبْدِ اللَّهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيدَ ابْنِ مَاجَةَ الْقَزْوِينِيَّ وَأَبِي مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الدَّارِمِيَّ وَأَبِي الْحَسَنِ عَلِيَّ بْنَ عُمَرَ الدَّارَقُطَنِيَّ وَأَبِي بَكْرٍ أَحْمَدَ بْنَ الْحُسَيْنِ الْبَيْهَقِيَّ وَأَبِي الْحَسَنِ زَيْنَ بْنَ مُعَاوِيَةَ الْعَبْدَرِيَّ وَغَيْرَهُمْ وَقَلِيلٌ مَا هُوَ وَإِنِّي إِذَا نَسَبْتُ الْحَدِيثَ إِلَيْهِمْ كَأَنِّي أَسْنَدْتُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ لَا كُنْهُمْ قَدْ فَرَّغُوا مِنْهُ وَأَخْتَوَا عَنَّهُ.

توضیح: اور جب مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نقل احادیث کے وقت اختصار کے طریقہ کو اپنایا اور اسناد کو حذف کر دیا تو اس پر بعض محدثین و ناقدین نے اعتراض کیا اگرچہ مصنف کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سند کے ساتھ نقل کیا ہو کیونکہ وہ نقل حدیث کے معاملے میں ثقہ اور معتد محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جو چیز بے نشان ہو وہ نشان والی چیز کی طرح نہیں ہو سکتی ہے اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی اور اس کی توفیق کا طلب گار ہوا میں نے بے نشان پر نشان لگایا اور میں نے ہر حدیث کو جس باب سے اس کا تعلق تھا اسی باب میں نقل کر دیا اور قائل اعتماد اور راسخ العلم علماء و محدثین نے جس طرح اس کو روایت کیا اسی طرح میں نے بھی کتاب کے حوالے کے ساتھ اس کو ذکر کیا مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دارقطنی، امام تہیقی، امام رزین، بن معاویہ عبدری رحمۃ اللہ علیہ ان ائمہ محدثین نے جس طرح اپنی کتابوں میں حدیث کو نقل کیا اسی طرح میں نے وہاں سے لے کر اپنی اس کتاب میں درج کر دیا ہے، ان ائمہ کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں (مثلاً ابن حبان اور ابن عبد البر) جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے کوئی حدیث ان ائمہ و محدثین کی طرف منسوب کر دی تو گویا میں نے اس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادی کیونکہ یہ ائمہ اپنی کتابوں میں سند ذکر کر کے اس کام سے فارغ ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی اس کام سے مستغنی کر دیا۔

توضیح: ولما سئلک: صاحب مصانع نے اپنی کتاب میں اختصار سے کام لیا تھا ایک تو آپ نے حدیث کی سند کو ذکر نہیں کیا تھا اور دوسرا انہوں نے کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا تھا کہ یہ حدیث فلاں کتاب میں ہے تیسرا انہوں نے ابتداء میں اس صحابی کا نام بھی نہیں لیا تھا جس سے حدیث لیکر بیان فرمائی تھی۔

یہ ایسی چیزیں تھیں کہ فن حدیث کے شعبہ میں انتہائی خطرناک تھیں کیونکہ ماہرین حدیث اور حفاظ حدیث کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اس سے اعتماد کی فضاء میں فائدہ اٹھانا مشکل تھا، خود صاحب مصانع گو سونی صد ثقہ اور قائل بھر و سہ تھے مگر دوسروں کا معاملہ تو اور تھا اور کسی حدیث کی صحت و عدم صحت کے لئے سند کا جو سلسلہ محدثین نے طے کیا تھا اس قاعدہ کا پورا ہونا ضروری تھا کیونکہ "الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء" ایک قانونی ضابطہ تھا جس کا پورا ہونا ضروری تھا اسی وجہ سے صاحب مشکوٰۃ کو موقع ملا کہ وہ مصانع میں ترمیم و اضافہ کر کے ایک نئی تصنیف منظر عام پر لائیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔

لکن لیس مافیہ اعلامہ کالاعمال: اعلام علم کی جمع ہے نشان کے معنی میں ہے ہمزہ کا فتح ہے علامت اور اثر بھی اس کا ترجمہ ہے اور اغفال بھی ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے جو غفل کی جمع ہے اور غفل اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کوئی علامت اثر یا نشان نہ ہو۔

اعلام سے صاحب مشکوٰۃ نے اپنی کتاب مشکاة مراد لی ہے اور اغفال سے مصانع مراد لی ہے کیونکہ مشکوٰۃ میں صحابی کے نام کا نشان لگ گیا، سند کی علامت لگ گئی جو مصانع میں نہیں تھی۔ یہاں عبارت کا تقاضہ یہ تھا کہ مصنف اس طرح عبارت

لاتے۔ ایسے مافیہ افعال کا اعلام۔ یعنی بے نشان مصابح اس درجے کی نہیں تھی جس درجے کی نشان والی مشکوٰۃ ہے لیکن قربان جائے ان صلحاء کے آداب پر کہ صاحب مصابح صاحب مشکوٰۃ کے استاذ بھی نہیں اور دونوں کے زمانے میں صدیوں کا فاصلہ بھی ہے مگر پھر بھی صاحب مشکوٰۃ قصور کی نسبت اپنی طرف کر رہے ہیں کہ جس کتاب میں نشان لگا ہے وہ اس درجہ کی نہیں جو بے نشان ہے اس میں کسر نفسی اور ادب کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ کیونکہ "الدین کله ادب"۔

وافی اذا نسبت الحديث اليهم: یہ عبارت درحقیقت ایک سوال مقدر کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ جس طرح صاحب مصابح نے سند ذکر نہیں کی تو صاحب مشکوٰۃ نے بھی سند کو ترک کر دیا ہے لہذا جو اعتراض محدثین نے مصابح پر کیا تھا وہ صاحب مشکوٰۃ پر بھی ابھی تک باقی ہے۔

اس عبارت سے صاحب مشکوٰۃ نے اسی کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن ائمہ محدثین کی کتابوں سے صاحب مشکوٰۃ نے احادیث لی ہیں اور حدیث کی نسبت اس کتاب کی طرف کی ہے تو گویا یہ حدیث سند کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ تک پہنچادی، اس لئے کہ ان محدثین اور ان کی کتابوں کے مصنفین نے بڑی جانفشانی اور بڑی محنت سے ان احادیث کی سندیں ذکر کی ہیں گویا جستجو، تحقیق و تدقیق اور بحث و تحقیص اور جرح و تعدیل کے تمام مراحل سے ان حضرات نے گزر کر احادیث جمع فرمادی ہیں لہذا ان کی طرف صرف نسبت کرنا اور ان کا حوالہ دینا ہی سند کے لئے کافی شافی ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیاق و سباق میں چونکہ سند کی بحث اس عبارت میں چل رہی ہے لہذا "منہ" میں مجرور کی ضمیر اور "عنه" کی ضمیر "اسناد" کی طرف لوٹی ہے۔

مترجم: ۱۲۰۹ھ - ۱۲۱۰ھ

وَمَرَدُّ الْكُتُبِ وَالْأَبْوَابِ كَمَا سَرَحْنَا وَاقْتَفَيْنَا أَثَرَهُ فِيهَا وَقَسَمْتُ كُلَّ بَابٍ غَالِبًا عَلَى فُضُولٍ
ثَلَاثَةٍ أَوْ لَهَا مَا أَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ أَوْ أَحَدُهُمَا وَاقْتَفَيْنَا فِيهَا وَإِنْ اشْتَرَكَ فِيهِ الْغَيْرُ لِعُلُوِّ
كَرَجِيَّتِهِمَا فِي الزَّوَايَةِ وَقَابِلِيَّتِهِمَا أَوْ زِدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الْأَمَّةِ الْمَذْكُورَيْنِ وَقَالِغَهَا مَا اشْتَمَلَ عَلَى
مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلَحَقَاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرْيطَةِ وَإِنْ كَانَ مَا نُورَأ عَنْ السَّلَفِ
وَالْخَلَفِ ثُمَّ إِنَّكَ إِنْ فَقَدْتَ حَدِيثًا فِي بَابٍ فَذَلِكَ عَنْ تَكْرِيرٍ أَسْقَطَهُ وَإِنْ وَجَدْتَ آخَرَ بَعْضُهُ
مَثْرُوكًا عَلَى إختصَارِهِ أَوْ مَضْمُونًا إِلَيْهِ تَمَامُهُ فَعَنْ ذَا عِيِ اهْتِمَامٍ أَثَرُهُ وَأَلْحَقَهُ وَإِنْ عَثَرْتَ عَلَى
إختِلَافٍ فِي الْفَضْلَيْنِ مِنْ ذِكْرِ غَيْرِ الشَّيْخَيْنِ فِي الْأَوَّلِ وَذَكَرَهُمَا فِي الثَّانِي فَاغْلَمْ أَلِي بَعْدَ تَتَبُّعِي
كِتَابِي الْجُمُعَ بَيْنَ الصَّحِيحَيْنِ لِلْحَمِيدِي وَجَامِعِ الْأُصُولِ اعْتَمَدْتُ عَلَى صَحِيحِي الشَّيْخَيْنِ
وَمَسْتَنَبِيَّهَا وَإِنْ رَأَيْتَ إختِلَافًا فِي نَفْسِ الْحَدِيثِ فَذَلِكَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْأَحَادِيثِ وَلَعَلِّي مَا
أَظْلَعْتُ عَلَى تِلْكَ الزَّوَايَةِ الَّتِي سَلَكَهَا الشَّيْخُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ.

توضیح: اور میں نے اس کتاب کی ترتیب وہی رکھی ہے جو صاحب مصابیح نے رکھی تھی اس سلسلے میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور میں نے عموماً طور پر ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے پہلی فصل میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جو شیخین یعنی بخاری و مسلم نے روایت کی ہیں یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کی ہیں اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے لیکن میں نے اس فصل میں صرف شیخین کے ذکر پر اکتفاء کیا کیونکہ شیخین کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے۔ اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو امام بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی نے روایت کیا ہے اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ کرام و تابعین کے ان اقوال و آثار کو بھی جمع کیا ہے جو باب کے لائق اور مناسب تھے لیکن آثار و خبر کو شامل کرتے ہوئے شرائط حدیث کو مدنظر رکھا ہے (پھر بھی یاد رکھیں) اگر کسی باب میں کوئی حدیث نہ پائی جائے تو سمجھا جائے کہ اسے میں نے تکرار کی وجہ سے نقل نہیں کیا اور اگر آپ کسی حدیث کو اس طرح پائیں کہ اس کا بعض حصہ اختصار کی وجہ سے چھوڑ کر حذف کر دیا گیا ہے یا بقیہ حدیث کا حصہ اس کے ساتھ ملایا گیا ہے تو یہ چھوڑنا اور ملانا خاص مقصد کے تحت ہوا ہے اور اگر دونوں فصلوں میں اختلاف نظر آئے یعنی غیر شیخین کی احادیث تو فصل اول میں لائی گئی ہوں اور شیخین کی حدیث کو فصل ثانی میں نقل کیا گیا ہو تو جان لینا چاہیے کہ یہ اختلاف غلط یا غفلت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ میں نے حمیدی کی کتاب جمع بین الصحیحین اور جامع الاصول میں بہت تلاش و تحقیق اور تتبع کے بعد ایسا کیا ہے اور اس سلسلے میں بخاری و مسلم اور دونوں کے اصل نسخوں اور اس کے متن پر اعتماد کیا ہے اور اگر نفس حدیث میں آپ کو اختلاف نظر آئے تو اس کی وجہ حدیث کی مختلف اسناد ہیں اور شاید کہ میں اس حدیث پر مطلع نہ ہو سکا جسے شیخ مصنف رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

توضیح: وسردت الکتب والابواب: مصنفین کا دستور ہے کہ اپنی تالیف میں تذکرہ مسائل کے لئے کتاب کا عنوان رکھتے ہیں جیسے کتاب الطہارہ پھر اس کے ضمن میں مختلف انواع کے مسائل جو اس عنوان کے مناسب ہوں ابواب کے تحت لاتے ہیں جیسے باب الوضوء، باب الخیض اسی طرح ابواب کے ضمن میں فصل کا ذکر کرتے ہیں اور تمام مسائل کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی السنۃ کی پیروی میں ایسا ہی کیا ہے البتہ مصابیح میں فصل اول اور فصل دوم کی ایک نئی اصطلاح تھی کہ اول میں بخاری و مسلم کی روایتیں ذکر کرتے ہیں اور فصل ثانی میں حسان کی احادیث ہوتی ہیں لیکن صاحب مشکوٰۃ نے اسی میں ایک تیسری فصل کا اضافہ کر دیا تاکہ احادیث مرفوعہ کے علاوہ اقوال صحابہ اور آثار بھی اس میں حسب موقع جمع ہو سکیں۔ بخاری و مسلم کی روایتوں کو اگرچہ دوسرے محدثین نے بھی ذکر کیا ہو مگر صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ میں نے ذکر کرنے میں صرف بخاری و مسلم کا نام لیا ہے کیونکہ ان کی شان ہی اور ہے۔

مع محافظۃ علی الشریطۃ: یعنی تیسری فصل میں مناسبت موضوع کے ساتھ سلف صالحین کے آثار بھی مرفوع احادیث کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں لیکن فصل اول اور ثانی میں جس طرح شرائط تیسری فصل میں بھی ان کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی صحابی راوی کا نام ذکر کرنا، کتاب اور مخرج کا حوالہ دینا اور صحت روایت کا خیال رکھنا۔

ثم انک ان فقدت حدیثاً: یعنی صاحب مصابیح نے مکرر احادیث کا ذکر کیا تھا، صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ

اگر کہیں ایسا نظر آجائے کہ مصانع میں ایک حدیث ہے اور مشکوٰۃ میں نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مصانع میں احادیث کا تکرار تھا اور مشکوٰۃ میں اس تکرار کو ختم کرنے کے لئے میں نے حدیث کو ترک کر دیا اور باب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی روایت کو درج کر دیا۔

وان وجدت آخر بعضہ متروکا؛ مصانع میں بعض احادیث میں اختصار تھا، صاحب مشکوٰۃ نے ان میں سے بعض کو تو اسی طرح مختصر چھوڑا اور بعض کو پورا کر دیا۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صاحب مصانع بعض دفعہ ایک طویل حدیث کے کچھ حصے باب کی مناسبت کی وجہ سے لیتے ہیں اور طویل حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ بھی اختصار کے پیش نظر یہی طریقہ اپناتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختصر حدیث کے کچھ حصے کے لئے اس طویل محذوف حدیث کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تو صاحب مشکوٰۃ اس کو ذکر کرتے ہیں، غرضیکہ ضرورت حدیث اور مناسبت مقام کی وجہ سے یہ حذف و اشبات اور یہ ترک و ذکر ہوتا رہتا ہے اسی کو "اترکہ والحققہ" سے تعبیر فرمایا۔

ملاحظہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اترکہ والحققہ" میں واو، او کے معنی میں ہے۔ یعنی داعی اور ضرورت کے پیش نظر کبھی ترک و حذف پر عمل ہوتا ہے اور کبھی ذکر کرنے اور الحاق پر عمل ہوتا ہے۔

وان عثرت علی اختلاف فی الفصلین: صاحب مصانع نے یہ طریقہ اپنایا ہے کہ فصل اول میں بخاری و مسلم کی روایات کو لاتے ہیں اور فصل ثانی میں ان احادیث کو جمع کرتے ہیں جو بخاری و مسلم کے علاوہ ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہیں لیکن صاحب مشکوٰۃ نے بعض مقامات میں ایسا کیا ہے کہ مصانع نے جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے آپ نے ان احادیث کو دیگر ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب سنن الوضوء کی فصل اول ص ۱۰۵ پر رواۃ مالک والنسائی و لابی داؤد نمحویہ آیا ہے اسی طرح کتاب فضائل القرآن ص ۱۸۵ پر حدیث انس میں رواۃ الترمذی ہے لیکن فصل اول میں ہے۔ اسی طرح صاحب مشکوٰۃ نے بعض جگہ فصل ثانی کی حدیث کو شیخین بخاری و مسلم کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب ما یقرأ بعد التکبیر ص ۸ پر سرہ بن جندب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت فصل ثانی میں مسلم کی طرف منسوب کی ہے آخر یہ تغیر و تبدل اور یہ اختلاف کیوں ہے؟

تو صاحب مشکوٰۃ نے اس رد و بدل اور اس فرق کے بارے میں فرمایا کہ یہ میری غلطی یا سہو کی بناء پر نہیں ہوا بلکہ میں نے کتاب الجمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول اور اسی طرح بخاری و مسلم کے اصل نسخوں کو اور ان کتابوں کے متون کو نہایت غور اور جستجو و تلاش اور گہری تحقیق سے دیکھا چنانچہ ان چار کتابوں میں جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے اور صاحب مصانع نے انہیں فصل اول میں شیخین کی طرف منسوب کیا ہے تو میں نے ان احادیث کو مشکوٰۃ میں شیخین کی طرف منسوب کرنے کی بجائے ان کے اصل راوی اور ناقل کی طرف منسوب کر دیا ہے جیسے باب سنن الوضوء میں کیا ہے۔

اور اسی طرح جن احادیث کو صاحب مصانع نے شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کر کے دوسری فصل میں نقل کیا

تھا اور مجھے وہ احادیث ان کتب مذکورہ اربعہ میں شیخین کی طرف منسوب مل گئیں تو میں نے ان کو شیخین کی طرف منسوب کر دیا۔ اور چونکہ مجھے اپنی تحقیق و جستجو پر اعتماد تھا پھر ان کتب اربعہ کی تائید بھی مل گئی اس لئے میں نے صاحب مصابیح کا یہ خیال کر کے خلاف کیا کہ ہو سکتا ہے صاحب مصابیح سے نقل حدیث کے وقت سب ہو گیا ہو۔

وان رأیت اختلافا فی نفس الحدیث: یعنی صاحب مصابیح نے ایک حدیث نقل کی اور وہی روایت جب صاحب مشکوٰۃ نے ذکر فرمائی تو ان دونوں کے الفاظ میں فرق نکلا ایک کے الفاظ اور ہیں اور دوسرے کے کچھ اور ہیں اس کے متعلق صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ فرق درحقیقت سندوں کے اختلاف کی بناء پر ہے یعنی صاحب مصابیح کو وہ روایت جس سند سے ملے انہوں نے ان الفاظ سے نقل کیا اور مجھے وہ روایت جس سند سے پہنچی میں نے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا اور شاید مجھے وہ روایت ملے گی جس کو شیخ نے اختیار فرمایا۔

وَقَلِيلًا مَّا نَجِدُ أَقْوَلَ مَا وَجَدْتُ هَذِهِ الرِّوَايَةَ فِي كُتُبِ الْأُصُولِ أَوْ وَجَدْتُ خِلَافَهَا فَإِذَا وَقَفْتُ عَلَيْهِ فَإِنْسَبِ الْقُصُورَ إِلَى لَيْقَلَّةِ الْبِدَايَةِ لَا إِلَى جَنَابِ السَّمِيعِ رَفَعَ اللَّهُ قَدْرَهُ فِي الدَّارِئِينَ حَاشَا لِلَّهِ مِنْ ذَلِكَ رَحِمَ اللَّهُ مَنْ إِذَا وَقَفَ عَلَى ذَلِكَ نَبَهْنَا عَلَيْهِ وَأَرْشَدَنَا طَرِيقَ الصَّوَابِ وَلَمْ أَلْ جُهْدًا فِي التَّنْقِيهِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِ الْوُسْعِ وَالطَّلَاقَةِ وَتَقَلُّتُ ذَلِكَ الْإِخْتِلَافَ كَمَا وَجَدْتُ وَمَا أَشَارَ إِلَيْهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مِنْ غَرِيبٍ أَوْ ضَعِيفٍ أَوْ غَرِيبٍ مَّا بَيَّنَّنْتُ وَجْهَهُ غَالِبًا وَمَا لَمْ يُشِرْ إِلَيْهِ بِمَا فِي الْأُصُولِ فَقَدْ قَفَيْتُهُ فِي تَرْكِهِ إِلَّا فِي مَوَاضِعٍ لِّغَرَضٍ وَرُبَّمَا تَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً وَذَلِكَ حَيْثُ لَمْ أَطْلُعْ عَلَى رَاوِيهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ فَإِنِ عَثَرْتُ عَلَيْهِ فَأَكْمَلْتُهُ بِهِ أَحْسَنَ اللَّهُ جَزَائِكَ وَتَقَبَّلْ الْكِتَابَ بِمَشْكُورَةِ الْمَصَابِيحِ وَأَسْأَلُ اللَّهَ التَّوْفِيقَ وَالْإِعَانَةَ وَالْهُدَايَةَ وَالصِّيَانَةَ وَتَبْسِيطَ مَا أَقْصَدُهُ وَأَنْ يَنْفَعَنِي فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَبِجَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ حَسْبِيَ اللَّهُ وَبِعَمَّ الْوَكِيلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ۔

تَرْجُمہ: اور بہت کم مقامات میں آپ کو یہ بات ملے گی جہاں میں نے کہہ دیا کہ یہ روایت کتب اصول میں میں نے نہیں پائی یا اس کے خلاف اس میں موجود ہے جب کسی ایسے اختلاف پر آپ مطلع ہو جائیں تو تصور کی نسبت میری کم علمی کی وجہ سے میری طرف کریں، نہ کہ حضرت شیخ کی طرف اللہ تعالیٰ دارین میں ان کا درجہ بلند کرے۔ اور ان کو اس غلطی اور تصور سے پاک اور محفوظ رکھے اور خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جسے وہ روایت معلوم ہو جائے اور وہ ہمیں اطلاع کر کے راہ حق بتا دے۔ میں نے اپنی تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور اپنی وسعت و طاقت کے مطابق پوری چھان بین کی اور یہ اختلاف میں نے جیسا پایا ویسا ہی نقل کر دیا اور جن احادیث پر شیخ رحمہ اللہ نے ضعیف یا غریب وغیرہ کا حکم لگایا ہے میں نے اس کا سبب عموماً بیان کر دیا ہے اور جن احادیث اور اصولی باتوں کی طرف شیخ نے اشارہ نہیں کیا تو میں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے مگر بعض

مقامات پر مجبوری کی بناء پر میں نے توضیح کر دی ہے۔ اور بسا اوقات آپ کو ایسے مقامات ملیں گے کہ وہاں حدیث کے بعد میں نے جگہ خالی چھوڑ کر حوالہ نہیں دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ باوجود تفتیش و تلاش کے میں مخرج کے نام سے واقف نہ ہو سکا۔ پس میں نے اس جگہ میں بیاض چھوڑ دیا ہے پس اگر آپ کو راوی کے نام کا علم ہو جائے تو اس خالی جگہ میں اس کا حوالہ دیدیں اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے گا۔ اور میں نے اس کتاب کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے، میں اللہ تعالیٰ سے اس کتاب کی تصنیف میں بھرپور توفیق، پوری مدد اور مکمل رہنمائی اور راہ راست پر چلنے کا طلب گار ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل، خطا و قصور سے حفاظت اور مشکلات کی آسانی کے لئے دعا کرتا ہوں اور یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ خداوند قدوس اس زندگی میں اور مرنے کے بعد مجھے بھی اور ہر مسلمان مرد و عورت کو اس کتاب سے نفع پہنچائے، اللہ میرے لئے کافی اور اچھا کارساز ہے کیونکہ ایک کام پر آنے کی قوت اور برائی سے بچنے کی ہمت قدرتوں اور حکمتوں کے مالک اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

توضیح: وقلیلًا ما تجد اقول ما وجدت هذه الرواية في كتب الاصول: سے مراد وہی بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ بعض مقامات میں فصل اول یا فصل ثانی کی روایات و احادیث نقل کر کے حدیث کے مأخذ و مخرج کا حوالہ دینے کے بجائے کہتے ہیں "ما وجدت هذه الرواية في كتب الاصول او وجدت خلافها" مجھے کتب اصول میں یہ روایت نہیں ملی یا اس کے برعکس ملی جو صاحب مصابیح نے نقل کیا ہے اس کے متعلق نہایت ادب کا لحاظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ میری تتبع و تلاش کا نقص ہے اس میں شیخ کا قصور نہیں حاشا وکلا! وہ اس قصور سے بری الذمہ ہیں۔ میں نے بڑی جانفشانی سے جستجو اور تلاش کی مگر جب نہیں ملی تو جس طرح اختلاف پایا اس کا اظہار کر کے اسی طرح نقل کر دیا اب اگر کسی شخص کو یہ روایت صحیح طور پر معلوم ہو جائے جو صاحب مصابیح نے نقل کی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہوئی تو وہ شخص میری زندگی میں مجھے مطلع کر دیں ورنہ بعد میں کتاب میں اضافہ کر دیں ان پر اللہ رحم کرے گا کمال ادب اور کمال دیانت کو دیکھئے کہ کئی صدیوں کے فاصلے کے باوجود کتنا احترام کرتے ہیں یہ دینی علوم کی برکت ہے۔

وما اشار اليه من غريب او ضعيف: یعنی صاحب مصابیح نے جہاں کسی حدیث کو ضعیف یا غریب یا منکر کہا ہے اور وجہ و سبب بیان نہیں کیا تو صاحب مشکوٰۃ اکثر مقامات میں اس کی وجہ بتا دیتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے منکر، شاذ، ضعیف یا غریب ہے لیکن بعض مقامات میں صاحب مصابیح نے خود سکوت اختیار کیا ہے نہ ضعیف کہا ہے نہ غریب کہا ہے۔ حالانکہ اصول کی کتابوں میں اس کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ ضعیف یا منقطع ہے یا مرسل ہے۔

تو صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی ایسے مواقع میں صاحب مصابیح کی پیروی کر کے سکوت اختیار کیا ہے البتہ بعض جگہوں میں مجبور ہو کر کچھ کہنا پڑا کیونکہ لوگوں نے حدیث کو مثلاً موضوع کہہ دیا یا باطل کہہ دیا تو میں نے لوگوں کے اس الزام کی تردید کی اور ترمذی وغیرہ کے حوالے سے حدیث کی نوعیت کا تعین کیا مثلاً "المرأ علیٰ خلیلہ فلینظر احد کھ من یخالی" (مشکوٰۃ ص ۲۷) بعض لوگ اس حدیث کو موضوع کہتے ہیں حالانکہ ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے تو صاحب مشکوٰۃ نے اس کی وضاحت کر دی ہے اگرچہ مصابیح نے سکوت اختیار کیا ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسنادہ صحیح۔

ورمما تجد مواضع مہملۃ: صاحب مشکوٰۃ نے بعض جگہ حوالہ کی جگہ خالی چھوڑی ہے یہ حوالہ نہ ملنے کی وجہ سے ہوا ہے اس لئے یہاں فرماتے ہیں کہ جس کسی کو حوالہ مل جائے تو وہ اس جگہ کو پر کر دے اس خالی جگہ کو بیاض کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مشکوٰۃ میں کئی مقامات پر بیاض ملیں گے چنانچہ ص ۲۲ پر بیاض ہے اسی طرح صفحہ ۳۶۸ پر بیاض ہے پھر ص ۷۰ پر ہے اسی طرح کئی اور جگہوں میں ہے اور وہاں محدثین نے حوالہ دے کر جگہ پر کرنے کی محنت کی ہے۔

وسمیت الکتاب بمشکوٰۃ المصابیح: مشکوٰۃ دیوار کے اس طاقیہ کو کہتے ہیں جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور مصابیح مصباح کی جمع ہے۔ چراغ کو کہتے ہیں المصابیح سے مراد شیخ محی السنۃ کی کتاب بھی ہو سکتی ہے اور احادیث الہی بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ کتاب اور حدیث دین پر چلنے والوں کے لئے بمنزلہ چراغ کے ہیں مشکوٰۃ المصابیح کے اس نام میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ چراغ جب کھلی جگہ میں رکھا ہو تو اس کی روشنی پھیل کر کمزور ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کو ایک طاقیہ میں رکھا جائے تو روشنی مجتمع ہو کر بہت تیز ہو جاتی ہے اسی طرح یہ کتاب یا احادیث رسول پہلے بھی نافع تھیں لیکن مشکوٰۃ المصابیح کے اندر آنے کے بعد اس کی آب و تاب اور چمک دمک دو چند ہوئی اور اس کی افادیت میں اس ترتیب خاص کی وجہ سے اضافہ ہو گیا۔

کسی نے سچ کہا:

لئن کان فی المشکاۃ یوضع مصباح

فلنک مشکاۃ وفيہا مصابیح

یہاں یہ اعتراض بے محل ہے کہ احادیث رسول اور قلب منور کی نورانیت تو چراغ سے بڑھ کر ہے پھر چراغ کو مشبہ بہ کیوں بنایا؟ جواب واضح ہے کہ مشبہ بہ کا قوی و اعلیٰ اور افضل ہونا ضروری نہیں بلکہ ادنیٰ و اظہر ہونا چاہیے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہ طاقیہ اور قندیل میں چراغ سے اس طرح دی ہے مثل نورہ کمشکاۃ فیہا مصباح المصابیح فی زجاۃ۔ کسی شاعر پر جب یہ اعتراض ہوا کہ تم نے بادشاہ کی سخاوت و شجاعت کی تشبیہ عمر و اور حاتم سے دے کر بادشاہ کی شان کو گھٹایا تو شاعر نے اس خیالی اعتراض کا جواب اس طرح دیا:

لا تنکروا ضربی لہ من دونہ

مثلاً شروذاً فی العذی والیاس

فاللہ قد ضرب الاقل لنورہ

مثلاً من المشکاۃ والنہراس

میں نے سخاوت اور شجاعت میں جو مثال ایک کتر چیز سے دی ہے اس پر نکیر و تنقید نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال ایک کتر چیز فائوس اور طاقیہ سے دی ہے۔

اللہم تقبل منی ہذہ البضاعۃ المزجاۃ فأوف لنا الکیل وتصدق بہ علینا

فوائد متفرقہ

خطبہ مشکوٰۃ اور اس سے پہلے حدیث پاک کے متعلق ابتدائی مباحث تفصیل کے ساتھ لکھ دیے گئے نیز ایک مدرس اور ایک محنتی طالب علم کے لئے حل کتاب اور درس و تدریس کی حد تک وہ تمام چیزیں میں نے ایک جگہ جمع کر دی ہیں جس کی ان حضرات کو ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے خود پر بوجھ ڈال کر ان حضرات کو کئی صفحات اور کئی اوراق کی ورق گردانی سے بچانے کی کوشش کی ہے اور وہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں جن کو ڈھونڈنے کے لئے بہت وقت اور بہت محنت اور ذہانت چاہیے اسی وجہ سے میں نے فنون کی ابتدائی بحث مباحث اور کتب فن کے شروع کے اشکالات و جوابات کا اچھا خاصہ ذخیرہ مثنوی طلباء کی کتاب مشکوٰۃ کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ طلباء و مدرسین بغیر کسی زحمت کے تیار لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھیں اور مزہ آنے پر بندۂ تاجیز کو بھی دعاؤں میں یاد فرمائیں۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لئے میں نے خطبہ کتاب سے فراغت کے بعد فوائد متفرقہ ضروریہ کا جمع کرنا ضروری سمجھا تو لیجئے چند باتیں حاضر خدمت ہیں:

قواعد ہمزہ "ابن"

خطبہ مشکوٰۃ میں ابن کا لفظ بار بار آیا ہے اور کتب حدیث میں بھی بار بار یہ لفظ آتا ہے عموماً اس کے قواعد سے طلباء اور بعض علماء ناواقف ہوتے ہیں تو لیجئے:

① لفظ ابن کا ہمزہ وصلی ہے اور ہمزہ وصلی کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ وسط کلام میں لکھنے میں باقی رہتا ہے مگر پڑھنے میں گر جاتا ہے۔
 ② قاعدہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ الف لکھنے میں باقی رہتا ہے لیکن ابن کے استعمال کی ایک خاص صورت ہے جہاں ہمزہ کو کتابت اور لکھنے سے بھی گرایا جاتا ہے استعمال کی وہ خاص صورت یہ ہے کہ ابن علمین متناسلین کے درمیان واقع ہو یعنی پہلا علم بیٹا ہو اور ابن کے بعد والا علم باپ ہو اور یہ ابن پہلے علم کی صفت بن رہا ہو اور دوسرے کی طرف مضاف ہو رہا ہو ایسی صورت میں ابن کا ہمزہ پڑھنے لکھنے سے گرایا جاتا ہے جیسے محمد بن اسماعیل محمد بیٹا ہے اسماعیل کا اور اسماعیل اس کا باپ ہے۔ تو متناسلین یعنی نسل بھی ایک ہے اور ابن ماقبل کے لئے صفت بھی بن رہا ہے اور مابعد کی طرف مضاف بھی ہے تو یہاں الف گرایا جائے گا، نہ پڑھنے میں آئے گا نہ لکھنے میں آئے گا خطبہ مشکوٰۃ میں سب نام اسی طرز پر آئے ہیں اور یہی قاعدہ وہاں پر جاری ہے۔

③ اگر لفظ "ابن" علمین متناسلین کے درمیان واقع ہو اور دیگر شرائط بھی پوری ہوں لیکن لفظ ابن سطر کے شروع میں آ رہا ہو پھر اس کا ہمزہ لکھا جائے گا، ابن کے اس قاعدہ میں ایک تخفیف یہ بھی ہوئی کہ اس سے پہلے علم سے توین حذف ہو جاتی ہے جیسے محمد بن اسماعیل میں محمد سے توین گر گئی ہے۔

④ اگر ابن علمین متناسلین کے درمیان واقع ہے لیکن پہلے علم کے لئے صفت نہیں بن رہا ہے بلکہ اس سے خبر واقع ہے تو پھر الف لکھنے میں برقرار رہے گا جیسے زید ابن عمرو زید عمرو کا بیٹا ہے۔

محمد بن یزید ابن ماجہ:

خطبہ مشکوٰۃ میں یہاں اس نام میں دو ابن واقع ہیں، پہلے ابن سے ہمزہ گرانا چاہیے کیونکہ یہ علمین متا سلین کے درمیان ہے مگر دوسرے ابن کے الف کو لکھنا چاہیے کیونکہ یہ علمین متا سلین کے درمیان نہیں ہے اس لئے کہ یزید ماجہ کا بیٹا نہیں بلکہ ایک قول کے مطابق دونوں ایک ہیں کہ ماجہ لقب ہے یزید کا اور ایک قول میں زوجہ ہے یزید کی یعنی محمد بن یزید و محمد بن ماجہ تو ماجہ محمد کی والدہ ہوں گی اور یزید کی زوجہ ہوں گی۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ کا لفظ لقب ہے یزید کا یہ محمد کا دادا نہیں ہے اور شرح اربعین میں لکھا ہے کہ ماجہ محمد کی والدہ کا نام تھا۔

حاصل یہ ہے کہ دوسرا ابن یزید کی صفت نہیں بلکہ محمد سے بدل ہے یعنی محمد بیٹا یزید کا یعنی بیٹا ماجہ کا اگر ماجہ یزید کی بیوی ہو تو پھر ابن ماجہ کا تعلق محمد سے ہوگا کہ محمد بیٹا یزید کا اور بیٹا ماجہ کا تو ماجہ محمد کی ماں ہوگی اس قسم کی ترکیب کئی دیگر ناموں میں بھی ہے جس سے بظاہر وہم ہوتا ہے کہ آخری علم قریب والے علم کے لئے باپ ہے حالانکہ وہ قریب والے علم کی بیوی اور اصل علم جو پہلے مذکور ہوتا ہے اسکی ماں ہوتی ہے۔ مثلاً

● عبد اللہ بن عمرو ابن ام مکتوم یہاں ام مکتوم کا تعلق عبد اللہ سے ہے عبد اللہ بیٹا عمرو کا بیٹا ام مکتوم کا۔

● عبد اللہ بن ابی ابن سلول، سلول عبد اللہ کی والدہ اور ابی کی بیوی ہے عبد اللہ بیٹا ابی کا بیٹا سلول کا۔

● عبد اللہ بن مالک ابن ٹحیثہ عبد اللہ کی ماں ہے اور مالک کی بیوی ہے۔

● محمد بن علی ابن الحنفیہ، حنفیہ محمد کی ماں ہے علی کی بیوی ہے۔

● اسماعیل بن ابراہیم ابن علیہ، علیہ ابراہیم کی بیوی اور اسماعیل کی والدہ ہے۔

● اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ، راہویہ ابراہیم کی کالقب ہے۔

غرض اوپر پانچ نام ایسے ہیں کہ ماں اور باپ دونوں کی طرف منسوب ہیں یعنی عبد اللہ، عمرو کا بیٹا اور اپنی ماں ام مکتوم کا بیٹا ہے۔ عبد اللہ اپنے باپ ابی اور ماں سلول کا بیٹا ہے۔ ان ناموں میں آخری نام اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ میں راہویہ اور ابراہیم ایک ہی چیز ہے اور یہی رائے بعض علماء کی ماجہ میں ہے کہ یہ یزید کا لقب ہے یعنی محمد بیٹا یزید کا اور یزید کا لقب ماجہ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ محمد بیٹا ماجہ کا کیونکہ ماجہ اور یزید ایک ہی چیز ہے محمد دونوں کا بیٹا ہے۔

الجمع بین الصحیحین للحمیدی

خطبہ مشکوٰۃ میں یہ لفظ آیا ہے "الجمع بین الصحیحین" شیخ حمیدی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے آپ کا نام حافظ ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر رحمۃ اللہ علیہ ہے اپنے دادا حمید کی طرف منسوب ہے، ابن حزم کے خاص شاگرد ہیں، ظاہری مذہب پر تھے، صاحب کرامات بزرگ تھے، صاحب تقویٰ تھے۔ علامہ حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے "الجمع بین الصحیحین" میں بخاری اور مسلم کی احادیث کو جمع کر دیا ہے بعض روایات کی تشریح بھی کی ہے اور بعض کی تکمیل و تنمیم بھی کی ہے مگر امتیاز رکھا ہے آپ قرن

خاص کے مشہور مصنفین میں سے تھے ۸۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ ایک امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد حمیدی ہیں وہ اور ہیں اور یہ دوسرے ہیں، آپ کا ایک شعر یہ ہے۔

لقاء الناس ليس يفيد شيئاً
سوى الهذيان من قيل وقال
فأقلل من لقاء الناس إلا
لاخذ العلم أو اصلاح حال

جامع الاصول:

خطبہ مشکوٰۃ میں اس کا تذکرہ بھی آیا ہے، یہ علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ کی مشہور و معروف کتاب ہے جس میں آپ نے صحاح ستہ کی احادیث کو جمع فرمایا ہے اور ابواب کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر رکھی ہے، آپ ابن اثیر جزری کے نام سے مشہور ہیں، آپ نے لغات الحدیث میں ایک نہایت عمدہ و نافع کتاب نہایہ ابن اثیر لکھی ہے، جامع الاصول دس سے زیادہ جلدوں میں ہے۔

محدث شہیر ابوالحسن رزین بن معاویہ:

شیخ رزین اندلس کے رہنے والے تھے قریش کے ایک بطن عبدالدار بن قصی کی طرف منسوب ہو کر عبدوری ہو گئے آپ حافظ الحدیث اور جلیل القدر محقق تھے، علم حدیث میں آپ نے ”تجريد الصحاح“ کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں آپ نے مؤطا مالک اور صحاح ستہ کو جمع کیا ہے، علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نے جامع الاصول کی تصنیف میں اسی کتاب پر اعتماد کیا ہے آپ کا انتقال مکہ مکرمہ میں ۵۳۵ھ میں ہوا۔ رزین کا نام راء کے ضم زاء کے فتح یا کے سکون کے ساتھ لہجین کی طرح پڑھا گیا ہے۔

الفراء البغوی:

خطبہ کتاب میں یہ لفظ آیا ہے، الفرائی، محی السنۃ کے والد کی صفت ہے جن کا نام مسعود ہے۔ فراء فرد سے ہے، فرد پوشین کو کہتے ہیں۔ شیخ مسعود شاید پوشین کی تجارت کرتے تھے یا اس کو زیادہ پہن کر استعمال کرتے تھے یا کوئی خاندانی نسبت ہے کسی نے یہ کام کیا ہوگا۔ لفظ فراء جب مسعود کی صفت ہوگی تو پھر مجرور پڑھا جائے گا۔ البغوی مرفوع پڑھا جائے گا کیونکہ یہ حسین کی صفت ہے اور وہ مرفوع ہے، تو یہ بھی مرفوع ہے علماء نے لکھا ہے کہ ناموں کے تسلسل میں جب آخر میں کوئی نسبت آتی ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ یہ نسبت پہلے نام کے ساتھ لگ کر اس کی صفت بنے گی۔ جیسے بغوی یعنی حسین بغوی پھر بغوی اصل میں ”یا بلخ“ کی طرف منسوب ہے یا ”بخشور“ کی طرف یہ مرد اور ہرات کے درمیان خراسان کے علاقے میں ایک گاؤں کا نام ہے اس نسبت میں بغوی بھی جائز ہے اور بخشوری بھی درست ہے یا پورے مرکب کی طرف نسبت کر دیا چاہو تو آخری جز

کاٹ کر پہلے جز کی طرف نسبت کرو جیسے بعلبک میں "بعلبکی" اور "بعلی" دونوں جائز ہے یہاں "بلغ" کی نسبت بغی آتی ہے مگر اس لفظ کے معنی زانیہ کے آتے ہیں اس لئے بلغ کی نسبت میں واد بڑھا کر بغوی کر دیا گیا اور اسماء مخدوفۃ الاعجاز میں اس طرح کرنا جائز ہے جیسے دم میں دسوی اب میں ابوی ہے اور اس میں اخوی آتا ہے۔

مذکورہ ائمہ کی سنہ وفات:

خطبہ مشکوٰۃ میں جن ائمہ حدیث کے نام آئے ہیں، تمہیم فائدہ کی غرض سے ان کی سنہ ولادت اور سنہ وفات کو لکھا جاتا ہے۔

- ① حسین بن مسعود بغوی ولادت ۴۳۵ھ وفات ۵۱۶ھ (مرو میں مدفون ہیں)
- ② محمد بن اسماعیل البخاری ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ (بخارا میں مدفون ہیں)
- ③ مسلم بن حجاج القشیری ولادت ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ (نیشاپور میں مدفون ہیں)
- ④ امام مالک بن انس ولادت ۹۵ھ وفات ۱۷۹ھ (مدینہ منورہ میں مدفون ہیں)
- ⑤ محمد بن ادریس الشافعی ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ (مصر میں مدفون ہیں)
- ⑥ احمد بن حنبل ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ (بغداد میں مدفون ہیں)
- ⑦ محمد بن عیسیٰ ترمذی ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ (ترمذ میں مدفون ہیں)
- ⑧ ابو داؤد سجستانی ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۱ھ (بصرہ میں مدفون ہیں)
- ⑨ احمد بن شعیب نسائی ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۳ھ (مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں)
- ⑩ محمد بن یزید ابن ماجہ ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ (قرطوبہ میں مدفون ہیں)
- ⑪ عبد اللہ بن عبد الرحمن داری ولادت ۱۷۲ھ وفات ۲۵۵ھ۔
- ⑫ علی بن عمر دارقطنی ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۵ھ
- ⑬ احمد بن حسین البہیقی ولادت ۳۸۳ھ وفات ۴۵۸ھ (نیشاپور میں مدفون ہیں)
- ⑭ رزین بن معاویہ ولادت معلوم نہیں وفات ۵۳۵ھ (مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں)

تنبیہ:

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سن وفات اور سن ولادت میں علماء تاریخ کے درمیان اختلاف آتا رہتا ہے۔ لہذا مندرجہ بالا تاریخوں میں اگر تفاوت نظر آیا تو اس کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔



اخلاص نیت والی حدیث

﴿۱﴾ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مِمَّا نَوَىٰ فَنَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهَاجَرَ تَهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَرَوُّهَا فَهَاجَرَ تَهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے، یعنی عمل کا شرعیت پر مرتب ہوتا ہے۔ اور ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی لہذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کی (ظاہراً) تو اس کی ہجرت (حقیقتاً) اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کے لئے ہوگی اور جس نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس حدیث کو عموماً باب کی مناسبت کے بغیر باب سے پہلے درج کیا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

علماء نے اس بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس حدیث کی طرف پڑھنے والوں کی توجہات مبذول کرانے کی غرض سے مناسبت کے بغیر ابتداء میں درج کیا جاتا ہے جیسا کہ دنیا والوں کا دستور ہے کہ وہ لوگوں کی توجہات کسی کام اور پیشہ کی طرف مبذول کرانے کے لئے عجیب و غریب مہیب شکل بنا کر پیش کرتے ہیں، تو لوگ اس کو دیکھ کر غور کرتے ہیں اور دلچسپی لیتے ہیں۔ اس حدیث شریف کو بھی الگ تھلگ لا کر طلبہ اور علماء کو متوجہ کراتا ہے کہ یہاں احادیث کا بحر ذخار ہے، اس میں غوطے لگا کر موتی حاصل کر لو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سلفاً و خلفاً مصنفین و محدثین نے اس حدیث شریف کو بے ربط و بے جوڑ ابتداء میں رکھا ہے تاکہ ہر پڑھنے والے کی پہلی نگاہ اصلاح احوال و افعال اور درستی نیت و اقوال کے اس روشن مینار پر پڑ جائے اور آگے کا سارا سفر صحت نیت اور خلوص افعال و اعمال کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ اس حدیث کی جلالت شان اور عظمت مقام کے متعلق علماء کرام اور ائمہ عظام، عظیم الشان رائے رکھتے ہیں۔

اس حدیث کی شان:

● عبد الرحمن بن مہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

من اراد ان يصنف كتاباً فليبتدأ بهذا الحديث

یعنی جو شخص بھی کوئی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر لازم ہے کہ اس حدیث سے کتاب کی ابتداء کرے۔

⑦ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ اور محققین ہر اچھے کام اور دینی امور میں اس حدیث کو ابتداء میں رکھنے کو پسند کرتے تھے۔

⑧ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نصف العلم کا درجہ دیا ہے، کیونکہ علم قلب سے تعلق رکھتا ہے یا زبان و جوارح و قالب سے تعلق رکھتا ہے اور حسن نیت کا تعلق قلب اور دل سے ہے تو یہ نصف العلم ہے۔

⑨ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ربع العلم فرمایا، کیونکہ دین اسلام کو چار اہم شعبوں پر یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

① اتقاء الشبهات ② زهد فی الدنیا ③ ترک ما لا یعدیہ ④ خلوص النیۃ۔

چنانچہ ایک چوتھائی شعبہ اس حدیث میں ہے جو خلوص نیت ہے۔

⑤ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ علماء نے اس حدیث کو ثلث العلم کہا ہے کیونکہ عمل کا تعلق قلب سے ہے یا جوارح سے ہے یا لسان سے ہے اور قلب سے جو عمل واجبہ ہے وہ حسن نیت اور خلوص نیت ہے جس پر یہ حدیث محیط ہے۔

شان و رود حدیث:

سنن سعید بن منصور اور معجم کبیر میں طبرانی نے اس حدیث کے شان و رود میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت کو پیغام نکاح دیا تھا اس نے نکاح کے لئے یہ شرط لگائی کہ اگر تم ہجرت کرو گے تو تمہارے ساتھ نکاح کروں گی۔ یہ عورت ام قیس کے نام سے مشہور تھی، جس کا نام ”قیلہ“ تھا اس شخص نے جب اس عورت سے نکاح کے لئے ہجرت کی تو لوگ اسے ”مہاجر ام قیس“ کہنے لگے۔

• علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابی کی شان کی حفاظت کی اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اس شخص کا نام کیا تھا اور یہ کون تھا؟

اب یہاں ایک اصولی اعتراض ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کو پیغام نکاح دیا۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے شرط لگائی کہ اگر اسلام قبول کرو گے تو نکاح ہو جائے گا انہوں نے اسلام قبول کیا اور نکاح ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں اسلام کو قبول کیا گیا اور وہاں ہجرت کا سارا ثواب ضائع ہو گیا حالانکہ دونوں جگہ نکاح کی غرض کا فرما تھی؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہجرت اور اسلام میں امتداد و عدم امتداد کا فرق ہے، ہجرت ایک آئی عمل ہے یعنی ایک حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اس میں امتداد نہیں اور اسلام ایک فعل ممتد اور ”امد“ امتدادی ہے کسی جگہ پر جا کر اس کی حد و سرحد ختم نہیں ہوتی، لہذا جب ایک شخص اپنی غرض کے لئے ہجرت کرتا ہے تو آخری مرحلہ میں وہ اپنا مطلوب پاتا ہے اور پھر ہجرت ختم ہو جاتی ہے تو آخری مرحلہ تک خود غرضی تھی اور آگے ہجرت نہیں تھی اس لئے وہ خراب رہ گئی، اس کے برعکس اسلام ایک امر ممتد اور عمل ممتد ہے اگر آج اس میں نیت کی خرابی تھی اور اسلام مقبول نہیں ہوا تو کل نیت صحیح ہو سکتی ہے اور اسلام درست ہو سکتا ہے اس لئے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کو ضائع نہیں کہا گیا۔

یہ حدیث غریب ہے:

اس حدیث کی سند میں غرابت ہے اور سعید بن منصور راوی کے بعد تمام واسطوں میں غرابت ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے یہ

قوی ہوگئی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ بخاری شریف میں بھی غریب احادیث موجود ہیں، غریب کوئی نامقبول نہیں ہے اس حدیث کو "حدیث المندوب" بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما یا حضور ﷺ نے منبر پر اس کو بیان کیا تھا۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما:

آپ مدنی قریشی ابو حفص الفاروق ہیں جو چھ نبوی میں چالیس آدمیوں کے بعد اسلام لائے۔ آپ کے ایمان کے بعد اسلام کو عزت ملتی رہی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے بعد خلیفہ المسلمین بنے۔ ۲۳ لاکھ چالیس ہزار مربع میل زمین پر دس سال تک عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ دنیا میں مفتوحہ علاقوں میں چار ہزار عام مساجد بنوائیں اور نو سو بڑی جامع مسجدیں بنوائیں، شام، مصر، دیار بکر اور فارس کو فتح کر کے ۲۰ ہجری میں ابو لؤلؤ نجوسی کے ہاتھ کیم محرم الحرام کو شہید ہوئے۔ (۵۳۷) احادیث روایت کیں، آپ کی انگوشی کی مہر میں یہ عبارت تھی "کلی بالموت واعظا"۔

انما کی تحقیق:

اہل لغت اور اصولیوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ واضح نے انما کو حصر کے لئے وضع کیا ہے اور اس سے حکم کی تاکید مقصود ہوتی ہے جیسے "انما علی رسولنا البلاغ المبین، انما الہکم الہ واحد" بہر حال انما سے مذکور کا اثبات ہوتا ہے اور غیر مذکور کی نفی ہوتی ہے۔ حصر کا معنی اس طرح ہوگا: "انما الاعمال تعتبر بالعبیۃ ولا تعتبر بغيرها" یا اس طرح ہوگا: "لیست الاعمال حاصلة الا بالعبیۃ"۔

الاعمال کی تحقیق:

"اعمال" عمل کی جمع ہے اس کے مقابلے میں النیات مذکور ہے اور جب جمع کا مقابلہ جمع سے ہو جائے تو تقسیم آحاد پر ہوتی ہے تو نتیجہ اس طرح نکلا کہ ہر ہر عمل نیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ عمل اور فعل میں تھوڑا سا فرق علماء نے بتایا ہے وہ یہ کہ عمل کا اطلاق صرف اختیاری کاموں پر ہوتا ہے غیر اختیاری کام کو عمل نہیں کہتے اور فعل عام ہے، اختیاری ہو یا غیر اختیاری ہو چنانچہ اعملوا صالحا آیا ہے، افعلوا صالحا نہیں آیا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عمل کے مفہوم میں دوام اور استمرار پڑا ہے اور فعل میں ایسا نہیں ہے۔

بالنیات میں ہاء کا متعلق کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ بہت سارے اعمال ایسے ہیں جو حتمی صورت نیت کے بغیر حاصل ہو جاتے ہیں اور جو اعمال غیر اختیاری ہیں مثلاً چھتہ وغیرہ سے گر جانا یہ سب بغیر نیت کے وجود میں آ جاتے ہیں۔ لہذا یہاں بالنیات کے لئے ایک ایسی عبارت مقدر نکالنی پڑے گی جس سے حدیث کا مفہوم واضح ہو جائے۔ نیز بالنیات میں جار مجرور کا متعلق بھی معلوم ہو جائے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ یا تو افعال عامہ میں سے کوئی فعل مقدر نکالا جائے یعنی "کون، ثبوت، حصول، وجود" ان چار افعال عامہ میں سے کوئی فعل مقدر نکالا جائے لیکن اس میں یہ نقصان ہے کہ افعال عامہ کا تعلق حسی افعال سے ہوتا ہے

لہذا ان میں سے کسی فعل کے مقدر ماننے سے یہ لازم آئے گا کہ اعمال کا حسی وجود بغیر نیت کے نہیں ہوتا، یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ افعال حسی کا وجود بغیر نیت کے ہو سکتا ہے۔

اب ضروری ہوا کہ یہاں کوئی فعل خاص مقدر مانا جائے، اب کونسا فعل خاص نکالا جائے؟ تو جمہور ائمہ نے اس کا متعلق حصہ یا تصحیح یا منوطۃ بالنیات مانا ہے یعنی کوئی عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں، ہر عمل کا دار و مدار نیت پر ہے، ائمہ احناف نے کاملۃ اور ثواب کا نفس مقدر مانا ہے۔ یعنی انما الاعمال بالنیات یعنی اگر نیت نہیں تو عمل پر ثواب مرحب نہیں ہوگا مگر نفس عمل کا وجود ہو جائے گا۔

ان دونوں مقدرات پر اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے اعتراضات ہیں، احناف ثواب کے مقدر ماننے کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ثواب کے مقدر ماننے سے سب کو فائدہ ہے لیکن اگر حصہ نکالیں گے تو یہ جمہور کے بھی خلاف ہے کیونکہ بہت سارے افعال ایسے ہیں جو ان کے ہاں بھی بغیر نیت کے تحقق ہو جاتے ہیں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر او معتبرۃ مقدر ماننا زیادہ واضح ہے تاکہ تمام عبادات کو آسانی سے شامل ہو جائے یعنی انما الاعمال معتبرۃ اور معتبر بالنیات اس میں تمام اعمال آگئے۔

① خواہ عبادات مقصودہ ہوں جیسے صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ یہاں انما الاعمال معتبر لصحتها النية یعنی ان عبادات فرضیہ کی محنت کے لئے نیت ضروری ہے بغیر نیت فرض عبادت صحیح نہیں۔

② یادہ اعمال عبادات فرضیہ کے لئے شرائط کے درجہ میں ہوں گی جیسے طہارت، ستر عورت وغیرہ تو یہاں الحصول ثوابہا مقدر مانا جائے گا جیسے انما الاعمال معتبر للحصول ثوابها النية، یعنی جب تک شرائط کے درجہ کے اعمال مثلاً غسل، وضو، تیمم، طہارت مکان و بدن اور طہارت لباس وغیرہ میں ثواب کی نیت نہ کرو گے تو ثواب نہیں ملے گا اگرچہ عمل صحیح ہوگا۔

③ یادہ اعمال امور مباح ہوں گے تو وہاں معتبر کے بعد تصیر و تنقلب مقدر مانا جائے گا جیسے:

انما الاعمال المباحة معتبر ای تصیر و تنقلب بالنية الحسنة حسنة وبالنية السيئة سيئات۔ بہر حال معتبر عام لفظ ہے، اس عموم کے پیش نظر موقع و محل کے مناسب فعل نکالا جائے گا تو عبادات مقصودہ وغیر مقصودہ اور مباح سب کو شامل ہو جائے گا بلکہ متر و کات جیسے خمر، زنا وغیرہ کے ترک کرنے کو بھی شامل ہو جائے گا کہ نیت حسنہ کے ساتھ چھوڑنے پر اجر و ثواب ملے گا، ابن دقیق العید نے اس کی تائید بھی کی ہے کہ متر و کات کے ترک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اعمال متعلقہ بالنیات کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

① معاصی:

معصیت میں نیت سے کوئی تغیر نہیں آتا، گناہ کا کام حسن نیت سے نیک کام نہیں بنتا جیسے حرام مال کے خرچ کرنے میں ثواب کی نیت کی، یا اس سے مسجد بنوائی، یا مدرسہ بنالیا، یا کسی اور نیک کام میں لگا دیا سب صورتوں میں کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا۔

● طاعات و عبادات مقصودہ:

یہ عبادات اصل صحت میں بھی نیت کی طرف محتاج ہیں اور مزید فضیلت میں بھی نیت کی طرف محتاج ہیں، اصل نیت میں تو اس لئے کہ عبادت ضائع نہ ہو۔ اور اکثراً فضیلت اور رفع درجات کے لئے اس میں اس طرح نیت کی جائے کہ کئی نیتیں ایک عمل میں شامل کر کے کئی ثواب حاصل کئے جائیں مثلاً نماز کے لئے مسجد میں آیا قبلہ رخ ہونے کی نیت بھی کی، احتکاف کی نیت بھی کی، انتظار صلوٰۃ کی نیت بھی کی، غریب کی مدد کی نیت بھی کی، وغیرہ وغیرہ تو ان سب نیتوں پر ثواب ملے گا۔

● مباح عمل:

مباح کام ایک پاکیزہ نیت کا احتمال رکھتا ہے جیسے عطر لگانا نیک نیتی کے ساتھ ایک مباح امر ہے مگر فحش و مہاہات اور تکبر کے طور پر ناجائز و گناہ ہے۔ ہاں اگر اقتداء سنت رسول اللہ ﷺ کی کرے تو ثواب بھی ہے ورنہ دیسے مباح عمل کے کرنے میں ثواب نہیں ملے گا یا مسجد کے احترام کی نیت کر لے تو اس مباح عمل سے بھی ثواب ملے گا بلکہ ایک عمل میں کئی نیک اعمال کی نیت کرے تو کئی ثواب ملیں گے۔

ان تمام احکامات کے بعد یہ سمجھ لیں کہ اختلاف کے ہاں وسائل اور وسائل میں نیت ضروری نہیں، ہاں مقاصد میں ضروری ہے مگر شوائع کے ہاں مقاصد اور وسائل اور وسائل دونوں میں نیت ضروری ہے، اس پر ایک اختلافی مسئلہ متفرع ہے جو آئندہ درس میں آ رہا ہے۔

بالتبعیات:

بالتبعیات: یہ مشد بھی صحیح ہے اور بغیر شد کے بھی صحیح ہے نیات جمع ہے نیتہ کی اور نیت لغت میں قصد کے معنی میں ہے اور اس کی اصطلاحی تعریف اس طرح ہے: توجہ القلب نحو الفعل ابتغاء لوجه الله۔ نیت کی تین قسمیں ہیں:

- تمییز العبادۃ من العادة. ● تمییز العبادۃ من العبادۃ. جیسے ظہر کی نیت ظہر کو عصر سے ممتاز کرتی ہے۔
- تمییز المعبود الحق من المعبود الباطل. مثلاً نماز صرف ایک معبود کے لئے ہے روزہ صرف ایک معبود کے لئے ہے غیر کے لئے نہیں۔

فقہاء کا اختلاف:

بالتبعیات میں جار مجرور کا جو متعلق مقدر نکالا گیا ہے وہیں سے فقہائے کرام کے درمیان وضو میں نیت کرنے نہ کرنے کا اختلافی مسئلہ شروع ہو گیا۔ جمہور نے چونکہ "تصحیح" کا لفظ مقدر مانتا ہے اس لئے وہ ہر عمل میں صحت کے لئے نیت کو شرط قرار دیتے ہیں لہذا ان کے ہاں وضو میں بھی نیت ضروری ہے کیونکہ وضو بھی اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

ائمہ احناف اور سفیان ثوری رحمہ اللہ وغیرہ فقہاء فرماتے ہیں کہ وضو کی صحت کے لئے نیت ضروری نہیں ہے، جمہور نے ائمہ الاعمال بالذہبات سے استدلال کیا ہے۔ احناف نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے مگر ثواب کا لفظ مقدر مان کر فرمایا کہ نفس وجود بغیر نیت کے صحیح ہے، ہاں نیت کرنے سے ثواب حاصل ہو جائے گا احناف نے شوافع پر اعتراض کیا ہے کہ اگر ہر عمل میں نیت شرط ہے تو تمہارے نزدیک غسل ثياب کپڑے وغیرہ دھونے میں نیت کی شرط کیوں نہیں ہے؟ شوافع نے جواب دیا ہے کہ غسل ثياب میں ازالہ نجاست حکمیہ نہیں بلکہ نجاست حقیقیہ ہے اور وضو میں ازالہ نجاست حکمیہ ہے، نیت نجاست حکمیہ کے ازالہ کی صورت میں ضروری ہے احناف فرماتے ہیں کہ یہ فرق آپ نے کہاں سے پیدا کیا حالانکہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے "وَالْاِزْلَاجُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا" فرما کر ہر چیز کے لئے بغیر نیت کے مطہر قرار دیا پھر آپ نے وضو کے لئے مطہر بالنیۃ اور کپڑوں کے لئے مطہر بغیر نیت کا فرق کہاں سے نکالا ہے۔

فشاء اختلاف:

فقہائے کرام کے درمیان یہاں فشاء اختلاف یہ ہے کہ جمہور نے وضو کو عبادت محضہ غیر مدرک بالمقتل قرار دیا ہے تو باقی عبادات محضہ کی طرح اس میں بھی نیت ضروری ہے احناف نے وضو کو عبادات محضہ کے لئے وسیلہ اور واسطہ مانتا ہے کہ وضو نماز کے لئے واسطہ اور وسیلہ ہے خود عبادت محضہ نہیں ہے۔ اب وضو کی عبادت محضہ سے بھی مشابہت ہے اور وسیلہ سے بھی مشابہت ہے کیونکہ عبادت بھی ہے اور دوسرے کے لئے طہارت بھی تو اس وجہ سے فقہاء میں اختلاف ہو گیا، جمہور نے اس کو عبادت سے مشابہ قرار دیا اور احناف نے اس کو طہارت سے مشابہ قرار دیا، عبادت محضہ میں سب کے نزدیک نیت ضروری ہے لیکن وضو کی حیثیت کے تعین میں اختلاف ہوا تو اس میں نیت کے حکم میں اختلاف پیدا ہو گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ وضو کس سے زیادہ مشابہ ہے؟ طہارت سے یا عبادت سے؟ تاکہ جس سے وہ زیادہ مشابہ ہو اسی سے اس کو ملایا جائے تو احناف فرماتے ہیں کہ قرآنی نصوص اور احادیث کی تصریحات یہ بتاتی ہیں کہ وضو کا تعلق طہارت سے ہے۔ قرآن میں وضو سے متعلق آیت اس طرح ہے "مَّا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ" (نمائکہ ۶) اس آیت میں وضو کو طہارت کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے اسی طرح "مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطَّهْوَرُ" حدیث نے وضو کو طہارت میں شامل کر دیا ہے۔ لہذا جس طرح "وَتَيَاسُكُ فَطَهْرٌ" میں کسی کے نزدیک غسل ثياب کے لئے نیت نہیں تو وضو میں بھی صحت وضو کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہاں ثواب الگ چیز ہے۔

اب یہاں ایک اعتراض ہے جو احناف کی طرف متوجہ ہے اور وہ یہ کہ تیمم میں احناف نے بھی نیت کو فرض قرار دیا ہے حالانکہ تیمم بھی وسائل میں سے ہے اور عبادات محضہ میں سے نہیں ہے؟ احناف جواب دیتے ہیں کہ تیمم میں دو وجہ سے احناف نے نیت کو فرض قرار دیا ہے: اول وجہ یہ ہے کہ تیمم کے مفہوم میں لغت کے اعتبار سے نیت کا معنی پڑا ہوا ہے۔ دوم یہ کہ معنی اصلاً ملوث ہے، جسم کو آلودہ کرتی ہے تو نیت کرنے سے طہارت آئے گی اور پانی تو اصلاً مطہر ہے۔ جب آپ نے ایک مطہر چیز استعمال کر لی تو طہارت حاصل ہو گئی، جو پانی کا طبعی اثر ہے، اس میں مزید نیت صرف مزید ثواب ہی کیلئے ہو سکتی ہے۔

بعد اللہ والہی اصل صورت حال یہ ہے کہ نزاری مسئلہ دراصل اجتہادی مسئلہ ہے جو قواعد سے مستنبط ہے۔ شوافع اور جمہور کا الگ اجتہاد ہے، اور احناف کا الگ اجتہاد ہے۔ مسئلہ اپنی جگہ پر ہے لیکن اس اختلافی مسئلہ کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس حدیث سے مستنبط ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ کو اس حدیث کی طرف منسوب کرتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے، ورنہ حدیث تو صرف حسن نیت اور صحیح نیت بیان کرنے کے لئے آئی ہے کہ اچھی نیت ہوگی تو عمل پر ثواب ملے گا، بری نیت ہوگی تو ثواب نہیں ملے گا، یہ باب اخلاص کے قبیل سے ہے جس کا بار بار قرآن کریم نے اعلان کیا ہے، اور احادیث مقدسہ میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔

اس مذکورہ حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قربانی کے لحاظ سے سب سے بڑا عمل ہجرت ہے۔ جب غلط نیت سے اتنی بڑی قربانی ضائع ہو سکتی ہے تو چھوٹے اعمال کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ آپ غور فرمائیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نیت کے بغیر تو وضو ممکن ہی نہیں ہے۔ جب آدمی گھر سے اٹھتا ہے، وضو بنا تا ہے پھر مسجد جاتا ہے، گرمی اور سردی میں محنت و مشقت اٹھا کر وضو کرتا ہے تو کیا یہ اتنا طویل عمل نیت کے بغیر ہو گیا حالانکہ نیت تو قلبی ارادے کا نام ہے جو کسی چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو وضو بغیر نیت کے ممکن نہیں۔ لہذا یہ بحث اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں بغیر ارادہ وضو اس وقت تحقق ہو سکتا ہے کہ آدمی کسی کام سے جا رہا ہو اور چانک کنوئیں میں گر کر زبردست ہو گیا، یا بارش میں سفر کر رہا تھا اور پورا جسم بجبگ گیا بلکہ دھل گیا تو یہاں یہ مسئلہ اٹھ سکتا ہے کہ نیت کے بغیر وضو یا غسل صحیح ہو یا صحیح نہیں ہوا، لیکن یہ صورت نادر ہے اور نادر کا معدوم ہوتا ہے۔

مقدر نکالنے پر جانیں سے اعتراض:

اس حدیث سے مذکورہ نزاری مسئلہ کا اس وجہ سے بھی تعلق نہیں ہے کہ مقدر نکالنے پر ہر جانب نے دوسرے پر اعتراضات کئے ہیں، شوافع نے جو "تصحیح مقدر نکالا ہے"، اس پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ صحیح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تمام شرائط موجود ہوں، تو صحت کا یہ حکم دنیوی اعمال پر تو لگ سکتے گا کہ شرائط کو دیکھ کر حکم لگادیں گے مگر اخروی اعمال کی صحت پر یہ حکم نہیں لگ سکتے گا، حالانکہ "انما الاعمال بالنیات" عام ہے، اس کو دنیوی اعمال تک خاص کرنا مناسب نہیں؟

دوسرا اعتراض شوافع پر یہ ہوتا ہے کہ صحت کا حکم اور عدم صحت کا حکم یہ نئی اصطلاح ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں یہ اصطلاح نہیں تھی تو حدیث کو اس پر حمل نہیں کیا جاسکتا۔

تیسرا اعتراض یہ کہ اگر شوافع سارے عملوں کے صحیح ہونے کے لئے نیت شرط قرار دیتے ہیں تو پھر اس حدیث پر وہ خود بھی عمل نہیں کر سکیں گے کیونکہ اخلاق و آداب، معاملات و مقربات، امانات و منکات اور خصوصیات وغیرہ ایسے احکام ہیں جس میں تمہارے ہاں بھی نیت شرط نہیں ہے۔

احناف نے "ثواب" کو مقدر مانا ہے اس پر بھی یہ چند وجوہ اعتراض ہے۔

اول اعتراض یہ ہے کہ ثواب کا تعلق صرف اعمال آخرت سے ہے۔ اعمال دنیا سے نہیں حالانکہ حدیث عام ہے دنیا و آخرت

دونوں سے متعلق ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ثواب کا مدار صحت عمل پر ہے اگر عمل صحیح ہے تو ثواب ملے گا ورنہ نہیں ملے گا تو آخر کار یہ مقدر بھی شوائع کے مقدر "صحت" کی طرف لوٹ کر آئے گا، تو بات وہیں پہنچی جہاں سے چلی تھی، معلوم ہوا کہ یہ حدیث حسن نیت اور قبح نیت سے متعلق ہے اور "تعتبر" مقدر نکال کر اس کو اپنے عموم پر رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

۱۰۹۰ ۱۰۹۱ ۱۰۹۲

زیر بحث حدیث کے جملے تین ہیں۔ ہر جملہ تفصیل چاہتا ہے۔ پہلا جملہ "انما الاعمال" ہے اس پر کلام ہو چکا ہے۔ دوسرا جملہ "وانما لكل امرء ما نوى" ہے۔ جس کے متعلق ابھی تفصیل آنے والی ہے اور تیسرا جملہ "فمن كانت هجرته الى الله الخ" ہے اس پر بھی کلام ہوگا، سر دست "وانما لكل امرء ما نوى" کی تحقیق ملاحظہ ہو:

لفظ "امرء" میں جو راء ہے یہ آخر حرف ہمزہ کے اعراب کے تابع ہے۔ اگر ہمزہ پر پیش ہو تو راء پر بھی پیش آئے گا۔ اگر ہمزہ پر زبر ہو تو راء پر بھی زبر آئے گا، اور اگر ہمزہ پر زیر آ جائے تو راء پر بھی زیر آئے گی۔ اس لحاظ سے یہ ایک عجیب کلمہ ہے جس میں بچ والے حرف پر بھی اعراب جاری ہوتا ہے۔ "ما نوى" میں "ما" موصولہ ہے اور نوى میں ضمیر منصوب مخدوف ہے۔ اصل عبارت یوں ہے "ما نواه" یعنی ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، یعنی بقدر نیت ثواب ملے گا، اب اگر ایک نیکی میں کئی نیتیں کرتا ہے تو کئی ثواب ملیں گے۔

دونوں جملوں میں ربط :

"انما الاعمال" اور "انما لكل امرء ما نوى" یہ دو جملے ہیں، اب ان کا آپس میں ربط اور جوڑ اور مابین کی مناسبت کیا ہے؟ تو اس میں کئی اقوال ہیں:

① علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جملہ ثانیہ جملہ اولیٰ کے لئے تاکید ہے، اس سے پہلے جملہ کی تحقیق دہا کید مقصود ہے کہ نیت کا معاملہ اتنا مہتمم بالشان ہے کہ ایک ہی مضمون کو بعنوان دیگر دو بارہ ذکر کیا۔ پہلے سے ثابت ہوا کہ نیت ہی عمل کے لئے علت باعید اور ابھارنے والی ہے اگر نیت صحیح ہے تو عمل مقبول ہے اور اگر نیت قاسد ہے تو عمل مردود ہے۔ پھر تاکید فرمایا کہ ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو اس کی نیت ہو "ان خیرا فخر وان شرّا فشر"۔

② یہ جملہ تاکید نہیں بلکہ تاسیس ہے۔ تاسیس اس کو کہتے ہیں کہ کوئی جملہ ماسبق جملہ کا معنی لے نہیں لوں گا بلکہ وہ نیا حکم لے کر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ تاسیس والی اولیٰ و افضل ہے تاکید سے۔

اب جملہ ثانیہ میں وہ نیا حکم کونسا اور کیا ہے؟ تو اس میں علماء کی کئی آراء ہیں اور کئی اقوال ہیں:

① پہلا قول یہ کہ جملہ اولیٰ اعمال کی حالت کے متعلق ہے کہ عمل جب نیت کے تابع ہو جاتا ہے تو اس پر اچھا حکم مرتب ہوتا ہے اور جملہ ثانیہ عامل کے احوال کے مطابق ہے کہ اس مزدور کو وہی کچھ ملے جو اس نے کی۔

نہیں اور جملہ اولیٰ میں بتایا تھا کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

اسلامی تاریخ کا پہلا دن ہجرت کے دن کو مقرر فرمایا کیونکہ اس میں سب بڑے قربانی اور یادگار تاریخ تھی۔
پھر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہجرت بجاگئے کا نام نہیں ہے، بلکہ پلٹ کر حملہ کرنے کا نام ہے اور مسلمانوں سے چھینی ہوئی زمین کو

دوبارہ حاصل کرنا ایک شرعی حکم ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے: **وَاخْرَجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ اخْرَجُوهُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ** یعنی جس سرزمین سے ان کفار نے تمہیں نکالا ہے، اس سے تم ان کفار کو نکالو۔ اس آیت نے مسلمانوں کی زمین کو کس قدر مقدس بنا دیا؟ کاش مسلمان حکمران اس بات کو سمجھ جائیں کہ دین کے لئے زمین کا حصول کتنا اہم ہے۔

فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ: اس جملہ پر ایک فنی اعتراض ہے وہ یہ کہ شرط اور جزا میں تقایر ہوتا ہے اتحاد نہیں ہوتا اور یہاں شرط اور جزا متحد ہیں۔ یعنی ہجرتہ الی اللہ ورسولہ اور ہجرتہ الی اللہ ورسولہ ایک ہی چیز ہے جیسے:

مَنْ اطَاعَ اطَاعَ۔ تو کلام کے مکمل ہونے کا خطرہ ہے۔

اس کا جواب علماء نے دیا ہے اول جواب یہ ہے کہ جملہ اولی شرط میں لفظ **حَدَّثَنَا** کو مقدر ماننا پڑے گا اور جزاء میں لفظ **عَقِبِي** مقدر ہوگا۔ یعنی **فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فِي الدُّنْيَا فَهِيَ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فِي الْآخِرَةِ** تو دونوں میں تقایر ہے۔

دوسرا جواب یہ کہ پہلے جملہ شرطیہ میں قصداً اور نیتاً کے الفاظ مخدوف ماننے ہوں گے اور جملہ جزائیہ میں فمورقاً و منفعة مقدر ہوگا تو اب کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔

دُنْيَا: یہ لفظ الف کے قعر کے ساتھ ہے اس پر غور نہیں ہے، یہ دنیا بدو دلو افرامصر سے بمعنی قریب کے ہے اور دنیا بھی آخرت سے قریب ہے یا ہر آدمی اس کے قریب ہے اور یا یہ لفظ سمع یسمع سے دلی بدلی دنا و دناءۃ سے ہے جو ذلیل اور کمینہ کے معنی میں ہے اس بے حقیقت دنیا کی حقیقت اور اس کی تعریف میں اختلاف ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے۔

① **الدُّنْيَا هُوَ اسْمٌ مُّجْمَعٌ هَذَا الْعَالَمُ الْمَتَدَاهِي. ② كَالْمَخْلُوقَاتِ مِنَ الْجَوَاهِرِ وَالْأَعْرَاضِ الْمَوْجُودَةِ. ③ هِيَ مَا عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْهَوَاءِ وَالْجَوِّ وَالْقَضَاءِ.**

کس عارف نے دنیا کے لئے کہا ہے:

دنیا تمہادعی کائی لست اعرف حالها
مدت الی ممیتها فقطعها وشمالها
منع الاله حرامها وانا اجتنبت حلالها
فراہمتها محتاجة فوہبت جملتها لها
یار ناپائیدار دوست دار
دوستی را نہ شاید میں غدار
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

اس حدیث پاک میں دنیا کے بعد "او امرأۃ یصیبھا" کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ دنیا کے ملبوم میں امرأۃ عورت پہلے سے داخل ہے تو اس کو الگ ذکر کرنے سے اس کے کائل و موثر تشذیب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ تخصیص بعد تعمیم ہے اس کے خطرات کو ظاہر کرنے اور اس پر متنبہ کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث کا شان و ردد چونکہ عورت کا معاملہ تھا اس لئے تعمیم کے بعد تخصیص میں اسی امر واقعی کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حدیث کے اول حصہ میں "الی اللہ ورسولہ" مکرر لایا گیا ہے جبکہ آخری حصہ میں "الی دنیا یصیبھا اور امرأۃ یتلو وجہا" کے الفاظ کو مکرر نہیں لایا گیا بلکہ ہم چودہ کر "طہجرتہ الی ماہاجر الیہ" کہا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جملے میں بطور استلزام اور حصول لذت کے لیے اللہ اور رسول کا نام مکرر لایا گیا ہے جیسے:

بِاللّٰهِ يَا ظَهِيَّاتِ الْقَاعِ قُلْنَ لَنَا
الْهَلَالِي مَعْنِي اَمْ لَيْلِي مِنَ الْمَشْرِ

اس شعر میں بھی لیلیٰ کا نام دوبارہ ذکر کرنا بطور استلزام ہے۔ اور دوسرے جملے میں دنیا کا ذکر تھا اور عورت کا ذکر تھا اس میں استلزام نہیں تھا تو ہم کر کے "الی ماہاجر الیہ" فرمادیا۔



کتاب الایمان

ایمان کے ابواب

تمام مباحث سے پہلے یہ بات ذہن میں آنی چاہیے کہ صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الایمان سے پہلے ”انما الاعمال بالنیات“ کی حدیث سے ابتداء کیوں فرمائی؟ اور پھر تمام اعمال و عبادات پر کتاب الایمان کو مقدم کیوں کیا؟ نیز کتاب الایمان میں سب سے پہلے حدیث جبرئیل کو ذکر کیا اس کا حدیث انما الاعمال بالنیات سے کیا تعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ کتاب الایمان کو مقدم کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ چونکہ اعمال و عبادات کی قبولیت و صحت ایمان پر موقوف ہے خواہ وہ اعمال عبادات کے قبل سے ہوں یا معاشرت و معاملات و اخلاقیات کے قبل سے ہوں خواہ اس کا تعلق شخصی اعمال سے ہو یا اجتماعی اعمال سے ہو، خواہ اس کا تعلق احوال غم سے ہو یا خوشی سے ہو، سب کی قبولیت کا دار و مدار ایمان پر ہے اس لئے کتاب الایمان کو تمام اعمال پر مقدم کیا۔

پھر حدیث جبرئیل کی تقدیم کی وجہ اور اس کی مناسبت حدیث انما الاعمال بالنیات سے کیا تھی تو اس کے متعلق علامہ طیبی، قاضی غیاض ماکھی، ملا علی قاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث جبرئیل چونکہ ہر قسم کی عبادات ظاہرہ و باطنہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ عقائد قلبیہ کی طرف لفظ ”الایمان“ سے اشارہ ہے اور اعضائے ظاہرہ سے متعلق امور کی طرف لفظ ”الاصلاح“ سے اشارہ ہے اور اخلاص و سرائر کی طرف لفظ ”الاحسان“ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ غرضیکہ یہ حدیث شریعت و طریقت اور حقیقت پر اجمالی طور پر مشتمل ہے اور سنن نبویہ اور آداب شرعیہ پر بطور اختصار حاوی اور محیط ہے اسی وجہ سے اس کو ”اھر السلسلہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس طرح کہ سورہ فاتحہ پورے قرآن کریم کے مضامین پر مشتمل ہے تو اس کو اھر القرآن کہا جاتا ہے۔ اب ربط اور ترتیب اس طرح بن گئی کہ حدیث انما الاعمال بمنزلہ ہمسہ اللہ ہے اور حدیث جبرئیل جامعیت اور ام السنۃ ہونے کی وجہ سے بمنزلہ سورہ فاتحہ ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ امام بغوی نے اپنی کتاب مصابیح کو ان دونوں حدیثوں سے شروع کیا تاکہ فی الجملہ قرآن کریم کا اتباع ہو پھر حدیث جبرئیل پورے دین کے لئے بمنزلہ خلاصہ اور نچوڑ ہے کہ ۲۳ سال میں جو شریعت آسمان سے نازل ہوئی تھی اس کا خلاصہ اور اجمال حدیث جبرائیل میں ہے یہی وجہ ہے کہ روایات میں تصریح ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں یہ سوالات کئے تھے۔ فتوح الملہم میں ہے کہ ممکن ہے کہ یہ سوال و جواب جیزہ الوداع کے بعد ہوئے ہوں۔

صاحب مشکوٰۃ نے عنوان "کتاب الایمان" رکھا ہے اور پھر اسلام کا ذکر بھی کیا اس سے ایمان و اسلام کے اتحاد کی طرف اشارہ کیا اور اگر دونوں میں اتحاد نہ ہو تو پھر ایمان کو اصل کی وجہ سے ذکر کیا اور ضمن میں اسلام بھی آ گیا۔ حدیث انما الاعمال کو کتاب الایمان سے مقدم لانے کی وجوہات اس حدیث کے شروع میں مفصل بیان کی گئی ہیں۔

کتاب، باب اور فصل کی تعریف

● کتاب ہو طائفة من المسائل اعتبارت مستقلة اشتملت انواعاً اولہا تشتمل۔

● الباب نوع من المسائل اشتمل علیہا الكتاب ولیست بفصل۔

● الفصل طائفة من المسائل تغیرت احکامہا بالنسبة الى ما قبلہا غیر مترجم بالکتاب والباب۔

کتاب بمعنی مکتوب و مجموع ہے کیونکہ الکتاب والکتبہ جمع اور مجموعے کے معنی میں ہے۔ تو کتاب الایمان کا ترجمہ یہ ہوگا۔
هذا مجموع ومکتوب فی الاحادیث الواردة فی الایمان۔

ایمان کی لغوی تحقیق:

ایمان امن سے ماخوذ ہے جو ضد خوف ہے۔ امن یا من مع یسمع سے لازمی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یعنی بے خوف ہونا۔ اور باب افعال سے آمن ایمانا متعدی ہوتا ہے یعنی بے خوف بنانا۔ متعدی ہونے کی صورت میں امن ایمانا ایک یا دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے امننت زیداً میں نے زید کو امن دیا اور امننت زیداً اعمروا میں نے زید اور عمرو دونوں کو امن دیا۔ متعدی ہونے کی صورت میں کبھی یہ متعدی بنفس ہوتا ہے جیسے "واعلمہم من خوف" اور کبھی متعدی بالصلۃ والحرف ہوتا ہے۔ پھر یہ صلد و قسم پر ہوتا ہے کبھی باور کبھی لام کے ساتھ آتا ہے۔ اگر صلہ میں باء آئے تو باء کا مدخل کبھی احکام میں سے ہوگا جیسے "امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون" ما انزل احکامات ہیں اور کبھی مدخل ذوات میں سے ہوگا۔ "کل امن بالله وملائکته وکتابہ ورسلہ" یہ سب ذوات ہیں۔ اور اگر امن متعدی بحرف الام ہو تو ایمان کبھی اذعان و یقین اور تصدیق کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے "لن تؤمنن لک حتی تری الله جہراً" یعنی ہم یقین نہیں کرتے ہیں۔ اذعان و تصدیق نہیں کر سکتے۔ "وما انت بمؤمن لعا ولو کفا صادقین" ای وما انت بمصدق لعا اور کبھی اطاعت و انقیاد کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے "انؤمنن لک واتبعک الارذلون"۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ایمان کا معنی صلہ کی تبدیلی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایمان کی شرعی اصطلاحی تعریفات

ایمان کی اصطلاحی تعریفات الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کل چھ ہیں۔ اگرچہ مفہوم اور مرجع سب کا ایک ہی ہے۔ تاہم کچھ فوائد تعدد تعریفات میں ہیں۔ اس لئے میں چھ تعریفات مکمل نقل کرتا ہوں۔ اگرچہ ایک بھی کافی ہے۔ لیکن انشاء اللہ نقل

کرنے میں برکت ہوگی۔

● علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے:

”الایمان هو التصديق عما علم محمى النبي صلى الله عليه وسلم به ضرورة تفصيلا فيما علم تفصيلا واجمالا فيما علم اجمالا“۔ (روح المعاني ج ۳ ص ۱۱۰)

یعنی ایمان اس کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کی تصدیق کرے جن کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی طور پر متحقق ہو۔ جو چیزیں تفصیل کے ساتھ ثابت اور معلوم ہوں اس کا تفصیلی طور پر اقرار و تصدیق کرے اور جو چیزیں اجمالی طور پر ثابت ہوں اس کا اجمالی اقرار کرے۔ مثلاً نماز کا حکم، اس کی رکعات کا حکم تفصیل کے ساتھ، بدیہی اور ضروری ہے۔ اس پر تفصیل سے ایمان لانا ضروری ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ، صوم، حج کا حکم تفصیل سے معلوم و معروف و ظاہر و بدیہی اور یقینی ہے تو اس پر تفصیل سے ایمان لانا فرض ہے۔ اسی طرح اجمالی طور پر عذاب قبر یقینی بدیہی ہے۔ اس پر اجمالی طور سے ایمان لازمی ہے۔ اور عذاب قبر کی تفصیلات کا علم اخبار آحاد سے ثابت ہے اور ضروری نہیں ہے۔

تصدیق سے مراد اکتیاد باطنی ہے۔ صرف زبانی نہیں۔ اسی لئے ہر قل کا اسلام معتبر نہ ہوا نیز تصدیق سے منطقی تصدیق مراد نہیں ہے۔

”ضرورۃً“ سے مراد یہ ہے کہ ہر خاص و عام کو معلوم ہو یا اس کا ثبوت یقینی ہو اور ضروریات دین میں سے ہو۔

● امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ”فیصلۃ التفرقة بین الایمان والزندقة“ میں ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے:

”التصديق بمجمیع ما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم والكفر تكذيب النبي صلی اللہ علیہ وسلم“

فی شیء مما جاء به۔

(اس تعریف میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایمان کے مقابل کفر کی تعریف بھی اس میں آگئی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ایمان کے لئے ضروری ہے کہ پورے اسلام کو آدمی تسلیم کرے لیکن کافر بننے کیلئے پورے اسلام کا انکار ضروری نہیں بلکہ کسی بھی ضروری حکم کے انکار سے آدمی اسلام سے نکل کر کافر ہو سکتا ہے۔)

● شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے: ”کتاب اللہ کا ظاہر اور باطن اقرار کرنا اور اس کے معانی کو قرآن و حدیث کے موافق استعمال کرنا“۔

● علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح تعریف کی ہے:

”تصديق النبي عما جاء به النبي بالايمان على النبي“۔

اس تعریف سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جو لوگ عقل کے زور اور عقلی دلائل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں وہ مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں اعتقاد علی النبی نہیں بلکہ اعتقاد اپنی عقل اور اپنی دلیل پر ہے۔

- شیخ عبدالقادر جیلانی، مرزا مظہر جان جاناں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایمان کی تعریف میں فرماتے ہیں:
- ”ایمان کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک اس کی حقیقت اور باطنی صورت ہے۔ ظاہری صورت تو یہ ہے کہ تصدیق بالجنان عمل بالارکان اقرار باللسان ہو، اور حقیقت ایمان یہ کہ مقتضائے طبع مقتضائے شرع کے تابع ہو جائے۔“
- امام محمد نے ایمان کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

”تصدیق الدی عما جاء به مع التبری عن جمیع ماسواة“۔

- اس تعریف میں بہت اچھا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ماسوائے اسلام تمام اقوامین کفریہ سے بیزاری کو بھی ایمان کا جز قرار دیا گیا ہے۔ ایمان کی ان تعریفات کے بعد ایمان کی چند اقسام بھی ملاحظہ فرمائیں۔
- ایمان مطبوع: یہ فرشتوں کا ایمان ہے گویا یہ مہر شدہ ایمان ہے اس میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور نہ تبدیلی آسکتی ہے۔
- ایمان معصوم: (یعنی محفوظ) یہ انبیائے کرام کا ایمان ہے۔
- ایمان مقبول: یہ عام مؤمنین کا ایمان ہوتا ہے۔
- ایمان موقوف: یہ اہل زلف و بطلان اور اہل بدعت کا ایمان ہے جو موقوف ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بدعت سے توبہ کرے اور ایمان کی طرف لوٹ کر آئے۔
- ایمان مردود: یہ منافقین کا ایمان ہوتا ہے جو ناقابل و مردود ہے۔

کفر کی حقیقت اور اقسام

کفر چونکہ ایمان کا مقابل اور ضد ہے اس لئے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ”وہ ضد ہا لتعدین الاشیاء“۔ چنانچہ کفر لغوی اعتبار سے ستر اور چھپانے کے معنی میں ہے۔ اور شریعت میں کفر کی تعریف و حقیقت کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف میں بیان فرمایا ہے:

”والکفر تکذیب الدی فی شیء مما جاء به“۔

ایک مختصر تعریف کفار کی یہ بھی ہے: ”الذین ستروا الحق عداۃ“۔ یعنی جنہوں نے عداوت کی وجہ سے حق کو چھپایا۔ یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ اسلام لانے کے لئے ضروری ہے کہ پورے اسلام کے سارے احکامات کا آدمی اقرار و تصدیق کرے لیکن کافر ہو جانے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی ایک حکم کا انکار کر دیا جائے۔ اس سے عوام الناس کے اس نظریے کی تردید ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ ایک دو حکموں کے انکار سے کچھ بھی نہیں ہوتا ہم تو کلمہ بھی پڑھتے ہیں نماز بھی پڑھتے ہیں۔ کافر تو وہ ہو گا جو پوری شریعت کے ایک ایک جز کا انکار کرے اور اسلام سے بھاگ جائے۔ یہاں کفر کی چند اقسام بھی علماء نے بیان کی ہیں:

① کفر انکار:

جو شخص دل و زبان سے شدت کے ساتھ اسلام کا انکار کرتا ہے یہ کفر انکار ہے اسی پر عام کفار ہیں۔

② کفر جھوٹ:

وہ یہ ہے کہ دل سے دین حق کو سچا سمجھتا ہے اس کی حقانیت کا قائل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے بلکہ انکار کرتا ہے۔ یعنی خوب جانتا ہے مگر ماننا نہیں جیسے کفر الیٹس، کفر یہود وغیرہ "وَمُحَمَّدُوا بِهَا وَاسْتَقْبَحُوا انْفُسَهُمْ ظُلُمًا وَعُلُوًّا" (ہل)

③ کفر عناد و معاندہ:

وہ یہ ہے کہ اسلام کو دل سے بھی سچا جانتا ہے اور زبان سے بھی اقرار کرتا ہے لیکن دین حق کے علاوہ ادیان باطلہ سے بیزار نہیں ہوتا ہے اور دین حق کی اطاعت نہیں کرتا ہے جیسے کفر ہرقل اور کفر ابوطالب کہ دونوں میں انقیاد ظاہری نہیں تھا۔

④ کفر نفاق:

یہ وہ ہے کہ دل میں تکذیب و انکار ہے صرف مصلحت و اغراض دنیویہ کے لئے زبان پر اقرار ہے۔ جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور ان کی پارٹی خواہ کوئی بھی ہو، نفاق کے اس شعبہ کے تحت دیگر بہت سارے اہل باطل، زندیق، زوافض، آغا خانی، قادیانی، بہائی، پرویزی اور ایک قسم کے کمیونسٹ بھی داخل ہیں کہ بوقت ضرورت کلمہ تو پڑھتے ہیں نماز بھی ادا کر لیتے ہیں مگر دوسری طرف دین کی ضروریات میں سے کسی امر ضروری کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے مختلف درجات ہیں بعض نفاق میں ہیں اور بعض واضح کفر میں جا پڑے ہیں۔

اعتراض نمبر ①:

ایمان کی تعریف میں تصدیق کا لفظ بار بار آیا ہے اب کئی قسم کے لوگوں میں تصدیق قلبی نص صریح سے ثابت ہے لیکن وہ پھر بھی کافر ہیں۔ جیسے یہود کے بارے میں آیت ہے: "يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمْ" اس کے باوجود وہ قطعی طور پر کافر ہیں۔ تو تعریف ایمان دخول غیر سے مانع نہ ہوئی اس میں کافر داخل ہو گئے۔

مندرجہ بالا تمام تعریفات کو اگر دیکھا جائے تو یہ اعتراض قطعاً متوجہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ پوری شریعت کی تصدیق اور چیز ہے اور حضور اکرم ﷺ کو نبی آخر الزمان کی حیثیت سے پہچانا اور چیز ہے ایک میں ماننا ہے دوسرے میں جاننا ہے دونوں میں بڑا فرق ہے لیکن شرح حضرات نے یہ اعتراض اٹھایا ہے اور پھر خود اس کا جواب بھی دیا ہے تو میں بھی اشارہ کرتا ہوں۔

تو اصل جواب یہ ہے کہ تصدیق سے مراد اختیاری تصدیق ہے اور یہود کی تصدیق غیر اختیاری اور اضطراری تھی۔ علامہ نقضانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اضطراری تصدیق درحقیقت تصدیق ہی نہیں بلکہ صرف تصور ہے ادھر حضرت شاہ انور

شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو تعریف کی ہے اس میں اعتماد علی النبی کے الفاظ ہیں کہ نبی کی نبوت پر اعتماد کرتے ہوئے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ صرف عقل اور دلائل کے زور سے یا غیر اختیاری جذبات و احساسات اور رجحانات و تصورات کی وجہ سے دل میں تصدیق کے بیٹھنے کا نام ایمان نہیں ہے۔ لہذا ایمان کی تعریف سے فرعون اور اس کی پارٹی اور یہود اور ان کی پارٹی نکل گئی۔

اعتراض نمبر ۲:

یہود سے متعلق جو اعتراض تھا مندرجہ بالا جواب سے اس کا جواب تو ہو گیا لیکن ہر قل اور ابوطالب سے متعلق تو ابھی وہ اعتراض باقی ہے کیونکہ ان دونوں نے دل سے تصدیق بھی کی اور زبان سے اقرار بھی کیا۔ چنانچہ ہر قل نے یہاں تک کہا صحیح بخاری کے یہ الفاظ ہیں۔

”لَوْ كُنْتُ عِنْدَكَ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ“۔ (بخاری ج ۳ ص ۳)

یعنی اگر میں اس نبی ﷺ کے پاس ہوتا تو میں آپ کے قدموں کو دھو لیتا اور خدمت کرتا۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری شرح بخاری میں یہ عبارت نقل فرمائی ہے:

”وَاللّٰهُ اِنِّى لَا اَعْلَمُ اَنَّهُ نَبِىٌّ مَّرْسَلٌ وَلَكِنِّىْ اَخَافُ الرَّوْمَ عَلَى نَفْسِىْ وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَا تَبِعْتَهُ“

(فتح الباری ج ۳ ص ۳)

اتنی زوردار تصدیق اور شاندار اختیار اقرار کے باوجود ہر قل کو کافر قرار دیا گیا۔

اور امام بخاری نے تو ان کا قصہ سنا کر آخر میں فیصلہ بھی سنایا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا۔

اور ابوطالب نے تو تصدیق و اقرار و اختیار کی حد کر دی۔ چنانچہ وہ اپنے اشعار و قصائد میں اعلان کرتے ہیں:

وَاللّٰهُ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ بِمَجْمَعِهِمْ حَتّٰى اَوْشَدَ فِى الْغَوَابِ كُفُوْدًا

خدا کی قسم! یہ لوگ اپنی جماعت لے کر اس وقت تک حملہ نہیں کر سکتے جب تک کہ میں قبر میں دفن نہ کیا جاؤں۔

وَكَعُوْثَيْيْ وَزَعَمْتَ اَنْكَ صَادِقٌ وَصَدَقْتَ فِىْهِ وَكُنْتَ لَمْ اَمِيْنًا

آپ نے مجھ دین کی دعوت دی اور آپ ﷺ نے سچے ہونے کا دعویٰ بھی کیا آپ ﷺ نے سچ کہا اور آپ اس میں امین بھی ہیں۔

وَعَرَفْتُ دِيْنَكَ لَا مَحَالَةَ اَنَّهُ مِنْ خَلْقِ اَذْيَانِ النَّبِيِّ دِيْنًا

میں نے یقیناً آپ کے دین کو پہچان لیا کہ تمام ادیان سے یہ بہترین ہے۔

لَوْلَا السَّلَامَةُ اَوْ حَدَاثُ مَسْئَلَةٍ لَوْجَدْتَنِيْ سَمْعًا بِذٰلِكَ مُبِيْنًا

اگر لوگوں کے طعن اور گالی کا خطرہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ مجھے اس دین میں کھل کر سخاوت کرنے والا پالیتے۔

قریش کے نبی ہاشم سے بایکات کے موقع پر ابوطالب نے ایک شاندار قصیدہ لامیہ پڑھا ہے۔ جس میں حضور ﷺ کی مدح

کی انتہا ہے۔ اسلام کے محاسن کا تذکرہ ہے اور پھر مکمل اور بھرپور حمایت کا اعلان ہے۔ یہ قصیدہ (۹۲) اشعار پر مشتمل ہے۔

اور البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۱ پر موجود ہے۔

یہاں میرے استشہاد اور مطلب کے لئے تو ایک دو شعر کافی تھے لیکن میں نے قارئین کے سامنے ان کے فائدے کے لئے اور حضور ﷺ سے اپنی محبت کے اظہار کے لئے اور مزید ارشعار سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ اشعار نقل کئے ہیں پڑھئے اور لطف اٹھائیے:

لَعْمَرِي لَقَدْ كَلَّفْتُ وَجْدًا بِأَمْتَدٍ وَآخَوْتِهِ ذَابَ الْمُحِبِّ الْمَوَاضِلُ

اپنی عمر کی قسم میں احمد بختی اور ان کے احباب کی وجہ سے دائمی اور مسلسل عاشق کی طرح محبت میں جلا کیا گیا ہوں۔

فَمَنْ يَمْلِكُ فِي النَّاسِ أَتَى مُؤَمِّلٍ إِذَا قَاسَهُ الْحُكْمُ عِنْدَ الْقَاضِلِ

جب خوبیوں اور فضیلتوں میں مقابلہ شروع ہو جائے تو لوگوں میں ان کی طرح امید کا خلافت کون ہو سکتا ہے؟

حَلِيمٌ رَشِيدٌ عَاجِلٌ غَيْرُ طَائِشٍ يُؤَالِي إِلَهًا لَيْسَ عَنْهُ بِغَائِلٍ

وہ حق پر قائم، انصاف پسند، بردبار اور سنجیدہ ہیں جو اپنے معبود کی عبادت اور تعلق سے کبھی غافل نہیں۔

كَوَيْدُ الْمَسَاعِي مَا جِدَّ وَابْنُ مَا جِدَّ لَهُ إِسْرُفٌ عَجَبٌ قَابِلٌ غَيْرُ تَاصِلٍ

ان کے کارنامے اچھے ہیں۔ وہ خود بزرگ اور بزرگوں کی اولاد ہیں ان کی بزرگی قدیمی اور سرورٹی ہے جو تعمیر پذیر نہیں۔

وَأَبْيَضُ يُسْتَشْفَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ يَحَالُ الْيَتَامَى عِصْمَةُ إِلَارَامِلِ

وہ ایسے خوبصورت ہیں کہ ان کے چہرہ انور کی برکت سے بادل سے بارش طلب کی جاتی ہے وہ یتیموں کے غمخوار بیواؤں کے محافظ ہیں۔

يَلُودُ بِهِ الْهَلَاكُ مِنْ آلِ هَاشِمٍ فَهُمْ عِنْدَهُ فِي رَحْمَةٍ وَقَوَاضِلِ

نوشتم کے تباہ حال لوگ ان کی پناہ لیتے ہیں پس وہ لوگ ان کی وجہ سے نعمتوں اور رحمتوں میں ہیں۔

كَذَّبَهُمْ وَبَدَّيْهِ اللَّهُ نَبِيَّيَ مُحَمَّدًا وَلَمَّا نَطَاعِنَ كُونَهُ وَنَكَاضِلِ

خاندان کعبہ کی قسم اٹھ جھوٹ کہتے ہو کہ ہم محمد ﷺ کو بے یار مددگار چھوڑ دیں گے جب تک کہ ہم نے ان کے دفاع میں نیزہ بازی

اور تیر اندازی نہ کریں۔

وَنُسْلِمُهُ حَتَّى نُصْرَعَ حَوْلَهُ وَنَذْهَلَ عَنِ ابْنَاتِنَا وَالْحَلَائِلِ

ہم ان کو اس وقت دشمن کے حوالے کریں گے جب ہم سب ان کے ارد گرد گت کر گر جائیں اور اپنی بیویوں اور بچوں کو بھول جائیں۔

وَأَيُّكَ رَبُّ الْعِبَادِ يَنْصُرُهُ وَأَظْهَرَ دِينَنَا حَقُّهُ غَيْرُ زَائِلِ

رب کائنات نے اپنی نصرت و مدد سے ان کی تائیدی کی ہے اور اس نے ایسا دین پیش کیا ہے جو ناقابل زوال ہے۔

قَوْلُهُ لَوْلَا أَنْ أَجِيبَ بِسَلَّةٍ تَجَرُّ عَلَى أَهْلِيَّائِنَا فِي التَّعَاوُلِ

بخدا اگر میری وجہ سے ہمارے بزرگوں پر ایسی بدنامی نہ آتی جس کے تذکرے مجالس میں ہونے لگے۔

لَكُنَّا نَبْتَغِيكَ عَلَى كُلِّ عَالٍ مِنَ الدُّنْيَا جَدًّا غَيْرَ قَوْلِ التَّعَاوُلِ

تو ہم ہر حالت میں زمانہ بھر تک مذاق سے نہیں بلکہ سچے دل سے ان کی متابعت کرتے۔

لَقَدْ عَلِمْنَا أَنَّ إِلَهَنَا لَا مُكَذِّبَ لَدَيْنَا وَلَا يَقْبَلُ يَقُولُ إِلَّا تَطَابُلُ

قریش کو خوب معلوم ہے کہ ہمارا لقب جگر ہمارے ہاں جھٹلایا نہیں جاتا اور نہ اللہ باطل کے باطل قول سے ان کا ارادہ کیا جاتا ہے۔

فَأَضْبَحَ فِيمَنَا آمَنُودٌ فِي أَرْوَمَةِ يُقَطِّرُ عَنْهَا سَوْرَةُ الْمُتَكَاوِلِ

پس احمد مجتبیٰ ہمارے ہاں ایسی عزت اور شرافت پر فائز ہیں جس کے سامنے بڑوں بڑوں کی عزتوں کی دیواریں پست ہیں۔

عَدْنُكَ بِتَقْصِيصِ جُودِهِ وَحَمِيَّتِهِ وَقَافَتِكَ عَنْهُ بِاللَّذَى وَالْكَلاِبِ

میں نے ان پر اپنی جان جھکا کر حفاظت و حمایت کا حق ادا کر دیا اور میں نے بچاؤ کا ہر سامان اور سبز سامنے رکھ کر ان کا دفاع کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایمان کی تعریف میں ہر قل اور ابو طالب داخل ہو گئے کہ دونوں نے دل سے تصدیق بھی کی اور زبان سے اقرار بھی کیا تو تعریف مانع نہیں دخول غیر سے۔

جنگلی، اس اعتراض کا پہلا جواب تو دہی ہے کہ ایمان کی تمام تعریفات کو غور سے دیکھنے کے بعد یہ اعتراض ہی نہیں ہوتا لیکن چونکہ شارحین نے کیا ہے لہذا اس کا جواب دے دیا گیا ہے کہ تصدیق قلبی اور اقرار لسانی کے ساتھ اطاعت و انقیاد لازم ہے۔ اور انقیاد ظاہری کی طرف مندرجہ بالا تعریفات میں اشارے بھی موجود ہیں۔ نیز شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے التزام شریعت کا عنوان اختیار کیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے عنوان سے اسی مفہوم کا تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایمان دار بننے کے لئے قول القلب ضروری ہے اور قول القلب سے مراد یہی شریعت اور اطاعت ہے۔

شیخ ابو طالب کی نے بھی التزام اطاعت کا عنوان اختیار کیا ہے۔ محقق ابن ہام نے استسلام قلبی اور انقیاد باطنی کا عنوان اختیار کیا ہے جب ایمان کی تعریفات اور تصدیق قلبی کی تشریحات میں التزام شریعت اور انقیاد ظاہری کا مفہوم پڑا ہے تو پھر ہر قل اور ابو طالب ایمان کی تعریف سے خارج ہو گئے کیونکہ ہر قل نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر روم کے لوگ ناراض نہ ہوتے اور ان کی مخالفت کا خطرہ نہ ہوتا تو میں دین اسلام کی اتباع اور اطاعت کرتا تو انہوں نے خوف ذہاب حکومت کی وجہ سے ایمان کی دولت عظمیٰ کو ترک کر دیا اس نے کہا:

”ابلاغ صاحبك انه لہی ولكن لا اترك ملكی“۔ (مسند بزاز)

اسی طرح ابوطالب نے واضح الفاظ میں تصدیق و اقرار لسانی کے ساتھ ساتھ دین حق کی اطاعت سے انکار کا بھی اعلان کیا ہے۔
 "لولا تعیرنی قریش یقولون انما حملہ علی ذالک الجزع لا قدرت بہا عینک۔"

(رواہ مسلم کتاب الایمان)

یعنی اگر قریش مجھے یہ عار نہ دیتے کہ آگ سے ڈر کر ایمان لایا تو میں دین حق قبول کر کے تیری آنکھوں کو شہنشاہ کر لیتا۔
 چنانچہ آخری اعلان ابوطالب کا یہی تھا کہ میں اپنی قوم کے مذہب پر دنیا سے اٹھ رہا ہوں اور یہ بھی کہا "اختار العار علی العار۔" لہذا عدم اطاعت کی وجہ سے وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف میں "والتبوی عن جمیع ماسواۃ" فرمایا ہے۔ اور اویان باطلہ سے تبری و بیزاری کا اعلان نہ ہر قل نے کیا تھا اور نہ ہی ابوطالب نے۔ بس زبان سے دین اسلام کو اچھا کہتے رہے مگر اپنے مذہب سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹے تو وہ کیسے اسلام میں آئے؟ اور ان پر کس طرح ایمان کی تعریف صادق آئے گی؟
 شیعہ رافضی ابوطالب کو بہت بڑا مسلمان مانتے ہیں اور ان کے نام پر اپنے امام بارگاہ ہوں کے نام رکھتے ہیں لیکن وہ کسی تصدیق قلبی یا عدم تصدیق یا اقرار لسانی یا عدم اقرار کی وجہ سے نہیں کہتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ابوطالب مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کا والد ہے اور مولیٰ علی کا والد کیسے غیر مسلم ہو سکتا ہے، یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ بعض انبیائے کرام کے آباء اجداد یا اولاد غیر مسلم چلے آئے ہیں تو حضرت علی کے حق میں کیسے محال ہو سکتا ہے۔

محدث کے فیض ۱۰۹۰-۱۰۹۱ھ

ایمان کی حقیقت میں مشہور مذاہب

ایمان شرعی کی دو جہتیں ہیں:

- ① جہت دنیوی جس سے جان و مال کی حفاظت اس وقت ہو جاتی ہے جب کوئی شخص زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے۔
 - ② جہت اخروی وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد عذاب اور خلود فی العار سے حفاظت ہو جاتی ہے۔
- جہت دنیوی کے لئے اتفاقاً صرف اقرار لسانی کافی ہے اور جہت اخروی میں کل سات مذاہب ہیں۔ دو مذہب اہل حق کے ہیں اور پانچ مذاہب اہل باطل کے ہیں۔

① معتزلہ کا مذہب:

اہل باطل میں سے پہلا مذہب معتزلہ کا ہے۔ ان کے نزدیک ایمان کی حقیقت اس طرح ہے:

"الایمان هو التصدیق بالحنان والاقراء باللسان والعمل بالارکان۔"

یعنی دل سے تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور اعمال اسلام اور ارکان اسلام پر عمل کرنا۔ اور ان کے نزدیک:

”ومن ارتكب الكبيرة فهو خارج عن الاسلام غير داخل في الكفر وعندهم منزلة بين المنزلتين في النار. كما في الايمان والكفر منزلة بين المنزلتين“۔

یعنی معتزلہ نے جو تعریف کی ہے یہ ان کے عقیدے کے موافق ہے کیونکہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہے لیکن کفر میں داخل نہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک دوزخ میں بھی دو درجات کے درمیان ایک درجہ ہے جس میں نہ خالص کافر ہوں گے اور نہ خالص مسلمان ہوں گے بلکہ یہی مرتکب کبیرہ ہوں گے۔

● خوارج کا مذہب:

اہل باطل میں سے دوسرا مذہب خوارج کا ہے ان کے ہاں ایمان کی حقیقت یہ ہے:

”الايمان هو التصديق بالجهنم والاقرار باللسان والعمل بالاركان ويخرج بالكبيرة من الاسلام ويدخل في الكفر فهو كافر“۔

یہ دونوں مذہب باطل ہیں کیونکہ صحابہ و تابعین اور سلف صالحین اور تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص کے دل میں مشغال ذرہ اور رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو وہ ”مخلد فی النار“ نہیں ہوگا۔ (یعنی ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا) اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شفاعت اہل کبار کے لئے ہے ”شفاعتي لاهل الكبائر“ حدیث ہے۔ اسی طرح یہ حدیث ”يخرج من النار من كان في قلبه مشغال ذرة من ايمان“۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے: ”وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بهنّما“۔ یہاں دونوں لڑنے والوں کو مسلمان کہا گیا۔ اسی طرح آیت: ”يا عبادي الذين اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً“۔ اسی طرح توبہ کرنے کی دیگر آیتیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث ”وان ذنبي وان سرق“ اس پر دال ہیں کہ مرتکب کبیرہ ناقص مؤمن ہے۔ مگر مخلد فی النار نہیں بلکہ سزا بھگتے کے بعد دوزخ سے نکلے گا تو یہ معتزلہ و خوارج کی بدعات و اہیات میں سے ہیں کہ معتزلہ نے مسلم سے مسلمان کا نام چھین لیا اور خوارج نے مسلمان کو ایمان و مؤمن کے پیارے لفظ سے نکال باہر کیا اور کافر بنا کر چھوڑ دیا۔

● جہیمہ کا مذہب:

”الايمان هو معرفة القلب فقط“۔ یعنی صرف قلبی معرفت کافی ہے اقرار لسانی اور عمل ارکانی کی کوئی حاجت و ضرورت نہیں ہے۔ یہ باطل مذہب جہیمہ کا ہے یہ جہم بن مغفان کی جماعت کے لوگ ہیں۔ یہ مذہب بالکل باطل ہے کیونکہ اہل کتاب کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ”يعرفونه كما يعرفون ابايعهم“ تو کیا یہ لوگ مسلمان ہو گئے؟ اسی طرح ہر قل کو معرفت قلبی حاصل تھی حالانکہ وہ کفر پر مرا ہے اسی طرح ابو طالب کا حال تم نے پڑھ لیا تو کیا وہ صرف حصول معرفت سے مسلمان ہو گئے؟

یہودنا بہود کے متعلق قرآن اعلان کرتا ہے:

”ولمآ جاءهم ما عرفوا كفروا به فلعنة الله على الكافرين“

اگر صرف معرفت قلبی ایمان کے لئے کافی تھی تو ان کو قرآن نے کافر کیوں کہا؟ اور کیا یہ مسلمان ہیں؟

● مرجعہ کا مذہب:

اہل باطل میں سے جو تھا مذہب مرجعہ کا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

”الایمان هو التصديق فقط ولا تضر مع الايمان معصية كما لا تنفع مع الكفر طاعة“

یعنی ایمان صرف تصدیق کا نام ہے تعریف اتنی ہی ہے اب آگے اس تعریف کی روشنی میں وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت اور نافرمانی نقصان نہیں دیتی جیسا کہ کفر کے ساتھ کوئی طاعت فائدہ نہیں دیتی۔

یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ دخول جنت کا وعدہ عمل صالح کے بغیر قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ہے اور بلکہ تصدیق قلبی امنوا کے ساتھ ”امنوا وعملوا الصلح“ کا لفظ ہر جگہ لگا ہوا ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگی اس مذہب کی نشی کرتی ہے۔ کیونکہ ان حضرات سے نماز وغیرہ اعمال ترک کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ دخول جنت کے لئے اعمال صالحہ کا ہونا ضروری ہے۔

● کرامیہ کا مذہب:

انکے نزدیک ایمان کی تعریف یہ ہے:

”الایمان اقرار باللسان فقط“

یہ تعریف بھی غلط ہے اور یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ قرآن نے منافقین کو بدترین کافر قرار دیا ہے حالانکہ وہ اقرار لسانی میں کمی نہیں کرتے تھے۔

”ومن الناس من يقول آمنا بالله وباليوم الآخر وما هم بمؤمنين“

اذا جاء لك المنافقون قالوا نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون“

اگر صرف اقرار لسانی کافی ہوتا تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کافر نہ کہتا۔

یہ لوگ محمد بن کرام کے پیروکار ہیں ان کا یہ شعر ہے:

الفقه فقه أبي حنيفة وحده والدين دين محمد بن كرام

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ لوگ عہد الست پر ہکم قالوا اہل کے اقرار کو ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

① مذہب احناف وغیرہم:

اہل باطل کے پانچ مذاہب کے بعد وہ مذہب اہل حق کے ہیں تو مسلسل منقہ کے لحاظ سے چھٹا مذہب اہل حق میں سے احناف اور جمہور متکلمین ابو منصور ماتریدی اور ابوالحسن اشعری وغیرہم کا ہے یہ کہتے ہیں کہ:

«الایمان هو التصدیق بالجنان فقط»۔

آگے اس تعریف کا نتیجہ اور ثمرہ ہے کہ:

والعمل بالارکان والاقرار باللسان شرطان لا شطران للإیمان۔

یہ ایمان کے لئے دو شرطیں ہیں مگر ایمان کیلئے شرط یا جزء یا رکن نہیں۔ اس مذہب کے مطابق ایمان تصدیق قلبی امر بسیط کا نام ہے۔

② مذہب شوافع وغیرہم:

اہل حق میں سے جمہور محدثین شوافع مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایمان کی تعریف اس طرح ہے:

الایمان هو التصدیق بالجنان والاقرار باللسان والعمل بالارکان۔

ان کے نزدیک ان تین اشیاء سے ایمان مرکب ہے بسیط نہیں ہے۔

یہ دونوں اہل حق کی جماعت اہل سنت والجماعہ میں سے ہیں ان کا آپس میں اختلاف حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور ظاہری ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل آرہی ہے بہر حال اہل حق کے درمیان اتنا اختلاف تو یقینی ہے کہ احناف اور جمہور متکلمین ایمان کو بسیط کہتے ہیں۔ اور شوافع و جمہور محدثین ایمان کو تین امور سے مرکب مانتے ہیں۔ امام بخاری نے ایمان کے مرکب ہونے پر بہت سے دلائل جمع کئے ہیں۔

حدیث ۸۰۹: یقیناً ۱۴۰۹ھ

ایمان بسیط ہے یا مرکب؟ طرفین کے دلائل

یہاں ایک اہم بات سمجھ لینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرات شوافع اور جمہور محدثین نے ایمان کی جو تعریف کی ہے یہ بعینہ وہی تعریف ہے جو معتزلہ اور خوارج نے کی ہے۔ لیکن یہ صرف لفظی مشابہت ہے ورنہ حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ معتزلہ اور خوارج ایمان کو اجزاء ثلاثہ سے ایسا مرکب مانتے ہیں کہ ایک جزء کے چھوٹ جانے سے ایمان ہی جاتا رہتا ہے۔ اور ان کے نزدیک تارک اعمال "مفلد فی النار" ہے، اسی طرح احناف اور متکلمین نے ایمان کی جو تعریف کی ہے وہ بعینہ وہی تعریف ہے جو مرجئہ نے کی ہے مگر یہاں بھی صرف لفظی مشابہت ہے ورنہ حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ احناف اور متکلمین اعمال کی ضرورت کو مانتے ہیں اور تارک اعمال کو فاسق گردانتے ہیں جبکہ مرجئہ کے نزدیک

کمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے بہر حال تعریف کے اشتراک کی وجہ سے محدثین اور شوافع کو معتزلہ کا ہمنوا سمجھنا ایسا ہی ظلم ہوگا جس طرح کہ تعریف ایمان کے اشتراک لفظی کی وجہ سے احناف کو مو مجنہ کا ہمنوا سمجھنا ظلم عظیم ہے۔

پھر امام صاحب کی طرف ارجاء کی نسبت کرنا بڑی بے جا بات ہے اور بڑی ہی گستاخی ہے۔ ایمان کی تعریف میں اشتراک لفظی کو بنیاد بنا کر اتنی بڑی جسارت کرنا بڑی نا انصافی ہے اگر معتزلہ اور خوارج کے ساتھ تعریف ایمان میں اشتراک لفظی حضرات شوافع و محدثین کو معتزلہ و خوارج نہیں بناتا تو احناف کو کیوں مر جتنہ بنا سکتا ہے؟

بہر حال ایمان کی تعریف جو احناف نے کی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان تصدیقی قلبی کا نام ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایمان بسیط ہے اور احناف ایمان کو بسیط مانتے ہیں اس پر ان کے ہاں جو دلائل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

احناف کے دلائل:

① ان الذین امنوا و عملوا الصالحات كانت لهم جنات الفردوس نزلاً۔ (الکہف ۱۰۰)

قرآن میں جا بجا ایمان پر عمل صالح کا عطف آیا ہے۔ اور عطف تغایر کو چاہتا ہے تو ایمان اور چیز ہے اعمال اور چیز ہے۔

”اولئک کتب فی قلوبہم الایمان“۔ (المجادلہ ۲۲)

”ولما یدخل الایمان فی قلوبکم“۔ (الحجرات ۱۰)

”قالوا امنا بافواہم ولم تؤمن قلوبہم“۔ (المائدہ ۴۱)

”ولکن لیطمئن قلبی“۔ (البقرہ ۲۶۰)

”الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالايمان“۔ (النحل ۱۰۶)

ان تمام آیتوں میں دل کو کمل ایمان قرار دیا گیا ہے اور ایمان کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے۔ دل کے اندر تو صرف عقیدہ جازمہ آ سکتا ہے اور وہ امر بسیط ہے وہاں ترکیب کا امکان نہیں۔

② من عمل صالحاً من ذکر او انہی و هو مؤمن فلنحییہنہ حیوة طیبہ۔ (النحل ۹۷)

اس آیت میں قبولِ عمل کے لئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا ہے تو ایمان شرط ہے اور عمل شرط ہے اور شرط و مشروط میں مغایرت ضروری ہے تو ایمان شرط کے درجہ میں اور چیز ہے اور عمل مشروط کے درجہ میں اور چیز ہے تو ایمان بسیط ہوا۔

③ ایمان ضد کفر ہے اور کفر کا محل قلب ہے تو ایمان کا محل بھی قلب ہوگا۔ وبضدھا تتبدلن الاشیاء۔ جب محل قلب ہو تو ایمان بسیط ہوا۔

④ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نے کلہ پڑھا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو مارا اور پھر

فرمایا کہ اس نے جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا دل میں ایمان نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **فہلا شققت من قلبہ**۔ معلوم ہوا کہ کلمہ ایمان دل سے تو بیٹھ ہے۔

- ① حدیث جبریل میں ما الایمان؟ کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے "ان تو من باللہ وملائکتہ" کا ذکر فرمایا جو کہ تصدیق قلبی ہے کیونکہ ایمان لا الہ الا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر کتابوں پر رسولوں پر سب تصدیق قلبی کے قبیل سے ہے۔
- ② جب حضور اکرم ﷺ کسی سے فرماتے: "أمنوا" تو وہ لوگ خود سمجھتے تھے کہ "أمنوا" سے مراد دل سے ماننا ہے تصدیق قلبی ذہن میں آنا تھا معلوم ہوا تصدیق قلبی ہی ایمان کا نام ہے اور دل کے اندر جو کچھ ہوگا وہ بیٹھ ہوگا مرکب نہیں ہو سکتا۔

شواہد کے دلائل:

جمہور محدثین اور شوافع حنابلہ اور مالکیہ نے ایمان کو تین اشیاء سے مرکب مانا ہے اس پر ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

- ③ **لیس الیران تولوا وجوہکم قبل المشرق والمغرب ولكن الیر من امن باللہ والیوم الآخر والملائکة والکتاب... الخ**

اس آیت میں بہت سارے ابواب البر کو ایمان کے ساتھ لگا دیا ہے جس سے ایمان کی ترکیب کا پتہ چلتا ہے۔

- ④ **الایمان بضع وسبعون شعبۃ فافضلها قول لا الہ الا اللہ وادناها امانة الاذی عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان**۔

اس حدیث میں بھی ایمان کے کئی شعبوں کا تذکرہ کیا گیا جس سے ایمان کی ترکیب کا مدعا ثابت ہوتا ہے۔

- ⑤ **بھی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الہ الا اللہ واقام الصلوۃ... الخ**

اس حدیث میں ایمان کو پانچ ارکان سے مرکب بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مرکب ہے بسیط نہیں کیونکہ احادیث شریفہ میں اچھے اعمال کو ایمان کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا گیا ہے گویا یہ سب کچھ ایک ہی چیز یعنی ایمان کے کئی اجزاء ہیں اور ایمان ان سے مرکب ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں اسی قسم کی کئی آیات اور احادیث سے بار بار استدلال فرمایا ہے۔

خلاصہ بحث:

مندرجہ بالا بحث مسطورہ اور دلائل مذکورہ کے بعد بطور خلاصہ یہ سمجھ لیں کہ اہل باطل کے پانچ مذاہب کے ساتھ اہل حق کا تعریف ایمان میں اور تفصیل و تحقیق میں اختلاف حقیقی اور معنوی ہے جس پر ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جس کے درمیان بڑا فاصلہ اور طویل بعد ہے۔ اور اہل حق کے درمیان جو ایمان کی تعریف میں اختلاف ہے یہ معنوی ہے حقیقی نہیں بلکہ لفظی ہے جس کا مرجع ایک ہے۔ چند وجوہات ملاحظہ ہوں۔

① بس اتنا سمجھ لیں کہ اہل حق کا اختلاف باعتبار ملاحظہ اور ماحول کے ہے ایک نے معتزلہ کو دیکھا ان کے تشدد اور تعدی اور خروج عن الحق کو دیکھا تو اعمال کو ایمان سے الگ کرنے کا حکم دیا جیسے احناف ہیں دوسروں نے مرجہ کو دیکھا جنہوں نے اعمال کے بارے میں حد سے تجاوز کر کے اعمال کے مقام کو گرا پا تو شوافع نے اعمال سے ایمان کو مرکب بنانے کا فیصلہ کیا۔

② اہل حق کے درمیان ایمان کی تعریف میں اختلاف ”جہات“ کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ شوافع اور محدثین نے ایمان کی جہت کامل مکمل اور اعلیٰ جانب کو دیکھا تو اعمال کو اس میں شامل کرو یا اور مرکب کہا۔ احناف و متکلمین نے ایمان کے جانب ادنیٰ اور آخری درجہ کو دیکھا تو ایمان کو اعمال سے الگ کہہ کر اس کے بسیط ہونے کا قول اختیار کیا یعنی ایمان کا وہ درجہ لیا جس کے بعد ایمان نہیں ہے۔

③ یایوں سمجھ لیجئے کہ جمہور محدثین و شوافع کے نزدیک ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم ماہیت ہیں۔ احناف و متکلمین کے ہاں ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم وجود ہیں اور معتزلہ و خوارج کے ہاں ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم ذات ہیں۔

④ یایوں سمجھ لیجئے کہ مثلاً نفس ایمان اور نفس تصدیق بمنزلہ ذات انسان ہے۔ اور اعمال بمنزلہ اطراف و اعضاء ہیں کہ اعضاء کے نقص سے نقص آتا ہے مگر ذات تو اپنی جگہ پر موجود ہے۔ یا شجرہ اور اغصان کی مثال لے لیجئے کہ درخت کی ایک ذات ہے اور دیگر شاخیں ہیں ذات اپنی جگہ پر قائم ہے شاخوں کی حیثیت الگ ہے۔

تو انسان اور درخت کے لئے اعضاء و اغصان اجزاء ہیں لیکن یہ اجزاء تحسینیہ تزیینیہ تخیلیہ ہیں تو کیسیہ نہیں۔

اہل حق کے درمیان اگر یہ نزاع لفظی نہ مانا جائے تو پھر ان اجزاء سے مرکب ایمان کے قائل محدثین و شوافع مرکب کبیرہ کو خوارج کی طرح کافر کیوں نہیں مانتے اور معتزلہ کی طرح اس کو خارج اسلام کیوں نہیں کہتے؟

اور اگر احناف و متکلمین کے نزدیک اعمال کا اعتبار نہیں صرف تصدیق قلبی بسیط کافی ہے تو پھر تارک اعمال کو یہ حضرات فاسق کیوں کہتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ نزاع باعتبار ملاحظہ باعتبار جہات باعتبار اجزاء تحسینیہ تخیلیہ تزیینیہ ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احناف و متکلمین کے اس نظریہ سے اعمال کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اعمال کو جزاء ایمان قرار دے کر تصدیق قلبی کی اہمیت بھی تو گھٹ جاتی ہے۔

پھر اعتراض یہ ہوا کہ احناف و متکلمین کے مذہب سے مرجہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے مذہب سے معتزلہ اور خوارج کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال یہ سب نزاع لفظی ہے دونوں فریق اعمال کی قدر کرتے ہیں احناف تو اعمال میں زیادہ آگے ہیں۔ پس دونوں فریق نے اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کی حد سے تجاوز کر دینے کے لئے بطور اصلاح و علاج الگ الگ قول اختیار کر کے رائے قائم کی ہے۔ حضرات شوافع و محدثین کے سامنے مرجہ کا منظر تھا اور حضرات متکلمین و احناف کے سامنے معتزلہ کا منظر تھا۔

ایمان میں زیادت و نقصان کی بحث

حضرات محدثین و شوافع اور معتزلہ و خوارج ایمان کی زیادت و نقصان کے قائل ہیں۔ اور ائمہ احناف و متکلمین کا اس میں اختلاف ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اختلاف دراصل اسی مابین اختلاف پر متفرع ہے جس میں یہ حضرات ایمان کے مرکب اور بسیط ہونے میں اختلاف کر چکے ہیں۔ پس جو لوگ ایمان کو بسیط مانتے ہیں ان کے ہاں امر بسیط میں زیادت و نقصان نہیں ہے۔ کیونکہ بسیط حقیقی "الذی ما لا جزء له اصلاً" کو کہتے ہیں اور بسیط عرفی "ما لا یو کب من الاجسام المختلفة" کا نام ہے تو اس میں زیادت و نقصان کا امکان نہیں ہے۔ اور جو لوگ ایمان کو مرکب من الاجزاء الثلاثة مانتے ہیں وہ زیادت و نقصان کے قائل ہیں لہذا یہ اختلاف بھی پہلے اختلاف کی طرح لفظی ہے اختلاف حقیقی نہیں ہے۔

اس کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ جن حضرات محدثین اور شوافع نے اعمال کو ایمان میں داخل مانا ہے انہیں یہی کہنا چاہیے تھا کہ:

"الایمان یزید و ینقص" کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ اعمال میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔

اور جن حضرات متکلمین اور احناف نے ایمان کو صرف تصدیق قلبی کا نام دیا ہے اور اعمال کو اس کے مفہوم میں داخل نہیں مانا ہے، انہیں یہی کہنا چاہیے تھا کہ "الایمان لا یزید ولا ینقص" کیونکہ تصدیق قلبی اعتقاد جازم کا نام ہے۔ اور یہ امر بسیط ہے اس سے آگے تصدیق کا کوئی درجہ ہی نہیں اس لئے اس میں کمی بیشی کا امکان ہی نہیں۔ مگر کسی کا اعتقاد جازم جزم کی حد سے نیچے آ گیا تو وہ ایمان نہیں کیونکہ جزم سے نیچے ظن ہے اور شریعت کی اصطلاح میں ظن کو ایمان نہیں کہا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوا جن حضرات نے اعمال کو ایمان کا جز مانا ہے ان کا فیصلہ یہی تھا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور جن حضرات نے اعمال کو ایمان سے الگ مانا ہے ان کا فیصلہ یہی تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے۔

محدثین و شوافع حضرات نے ایمان کی زیادت و نقصان پر قرآن عظیم کی کئی آیتوں سے استدلال کیا ہے جس میں زیادت کا لفظ آیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب بخاری میں اس قسم کے دلائل کا ابتدائے کتاب الایمان میں انبار لگا دیا ہے۔ چند دلائل ملاحظہ ہوں:

① لیزدادوا ایماناً مع ایمانہم۔ (فتح ۴)

② واذا تلیت علیہم آیاتہ زادہم ایماناً و علی ربہم یتوکلون۔ (انفال ۴)

③ لیزداد الذین آمنوا ایماناً ولا یرتاب الذین اتوا الکتاب۔ (مائدہ ۴)

④ فیما الذین آمنوا فزادہم ایماناً وہم یستبشرون۔ (بقرہ ۲۲۰)

۵ الذین قال لهم الناس ان الناس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم ايمانا وقالوا حسبنا الله ونعم الوكيل. (آل عمران ۱۷۳)

۱ انهم فتية آمنوا بربهم فزادهم هدى. (کہف ۱۷۳)

۲ قال ابن عمر رضي الله عنهما: تعلمنا الايمان ثم تعلمنا القرآن فزادنا ايمانا.

۳ وقال ابن مسعود رضي الله عنه: اللهم زدنا ايمانا وبقينا وفقها.

”محدثین کو احناف و متکلمین کا جواب“

● شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن نصوص میں ایمان کی زیادت و نقصان کا ذکر ہے اس سے مراد حلاوت ایمان میں زیادتی ہے نفس ایمان میں زیادتی مراد نہیں یہ دوا لگ لگ چیزیں ہیں یعنی اجزاء تحسینیہ، تزیینیہ تخیلیہ میں زیادتی مراد ہے۔

۱ ایک ایمان اجمالی ہے اور ایک ایمان تفصیلی ہے ایمان اجمالی زیادت و نقصان کو قبول نہیں کرتا اور تفصیلی ایمان زیادت و نقصان کو قبول کر لیتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا:

”الایمان المجمل لا یزید ولا ینقص واما المفصل فهو یزید“۔

● یہ زیادت اور نقصان مؤمن بہ کی وجہ سے ہے کہ وحی کے ذریعہ سے جتنا مؤمن بہ بڑھتا رہتا ہے اس پر ایمان بھی بڑھتا ہے۔ دوا آیتوں پر ایمان لانے کے بعد دس آیتوں پر مزید ایمان لایا تو اس مؤمن بہ کی وجہ سے ایمان بڑھتا رہتا ہے۔

● نزول وحی کے زمانے میں تو ”یزید و ینقص“ ہو سکتا تھا لیکن وحی بند ہونے کے بعد اب تو ”لا یزید ولا ینقص“ ہی ہے۔

۵ مشہور قول امام مالک رحمہ اللہ کا اور ایک اور قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے کہ ”الایمان یزید ولا ینقص“ یعنی نصوص آیات و احادیث سے زیادت کا پتہ تو چلتا ہے لہذا زیادت ہے لیکن نقص و نقصان کا پتہ نہیں چلتا لہذا نقصان نہیں ہے۔

● یہ زیادتی اور کمی نور ایمانی کے اعتبار سے ہے اصل ایمان کے اعتبار سے نہیں گویا اجزاء نورانیہ میں نقص اور انبساط آتا رہتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمان و اسلام میں نسبت کی بحث

اسلام کی تعریف جب ہو جائے گی تو اس کی نسبت ایمان کے ساتھ اسانی سے سمجھ میں آجائے گی لہذا پہلے اسلام کی تعریف ملاحظہ ہو۔

① الاسلام عبارة عن التسليم والاستسلام بالأذعان والانقياد۔

② ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

الإيمان اعتقاد والاسلام انقياد والاحسان استشهاد۔

③ میر سید سند فرماتے ہیں:

الاسلام هو الخضوع والانقياد لما أخبر به النبي صلى الله عليه وسلم۔

④ علامہ رحمہ اللہ نے تفسیر کشاف میں فرمایا:

ان كل ما يكون الاقرار باللسان من غير مواطاة بالقلب فهو الاسلام وما واطا فيه القلب اللسان فهو ايمان۔

یعنی جہاں زبانی اقرار موافقت دل کے بغیر ہو وہ اسلام ہے۔ اور جہاں دل اور زبان دونوں موافق ہوں وہ ایمان ہے۔

⑤ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ شریعت نے ایمان و اسلام کو بطور مترادف بھی استعمال کیا ہے اور بطور تباہین و تضاد بھی استعمال کیا ہے۔ اور بطور تدخل بھی استعمال کیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

ترادف کی مثالیں

● فأخبر جناب من كان فوجها من المؤمنين فما وجدنا فوجها غير بهت من المسلمين۔ (ظاریات: ۴۸)

علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ وہاں ایک ہی گھرانہ تھا جو حضرت لوط علیہ السلام کا تھا اسی کو مؤمن اور مسلم فرمایا تو ترادف ثابت ہوا۔

● وقال موسى يا قوم ان كنتم امنتهم بالله فعلية توكلوا ان كنتم مسلمين۔ (يونس: ۸۴)

یہاں ایک ہی قوم کو مؤمن اور مسلم کہا گیا تو ترادف ثابت ہوا۔

تباہین و تضاد کی مثالیں:

● قالت الاعراب ائمانا قل له تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل الايمان في قلوبكم۔

(حجرات: ۱۴)

اس آیت میں دیہاتیوں سے تصدیق تلبی اور اذعان و طمأنینہ کی نفی کی جو "ائمان" اور "له تؤمنوا" کے مفہوم میں تھی۔ اور استسلام ظاہر باللسان والجوارح کو ثابت کیا جس سے تقایر تباہین اور تضاد واضح ہو گیا۔

① اس آیت میں اس تقایر و تضاد کی تائید مست احمد کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے کہ

"الاسلام علانية والايمان في القلب"۔

② حدیث جبرئیل رضی اللہ عنہ سے بھی ایمان و اسلام کے تباہین و تقایر کا پتہ چلتا ہے کیونکہ وہاں جب ایمان کے متعلق سوال

ہو تو آپ ﷺ نے "ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله" سے جواب دیا جو سب کے سب تصدیق قلبی کے تحت آتے ہیں۔ جو اذعان ہے اور جب اسلام کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ان تشهد ان لا اله الا الله وتقیم الصلوٰۃ الخ" یعنی جواب میں سب کی سب تسلیم والی چیزیں آگئیں کہ یہ کرو، یہ کرو، یہ کرو، معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام میں فرق ہے تب ہی الگ سوال اور جواب آیا جس میں تسلیم قوی اور تسلیم فعلی دونوں کا ذکر آگیا۔

❶ وفي حديث سعد بن عبد الله انه صلى الله عليه وسلم اعطى رجلا اعطاء ولم يعط الاخر فقال سعد يا رسول الله تركت فلانا لم تعطه وهو مؤمن فقال او مسلم؟ اس سے تباین و تغایر واضح ہو جاتا ہے۔

❷ علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے تمیز خاص محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے ایک فرق درس بخاری میں بیان فرمایا جو درحقیقت حضرت شاہ صاحب کی تحقیق تھی جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کی مسافت ایک ہے صرف مبداء اور منتہی کا فرق ہے۔ اسلام ظاہر سے شروع ہوتا ہے اور رجب بس کر باطن میں پہنچتا ہے۔ اور ایمان کامل باطن سے شروع ہو کر پھوٹ پھوٹ کر ظاہر پر آ جاتا ہے۔ اگر ایمان قوی ہے تو فوراً ظاہری اعضاء پر اس کا اثر نمودار ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا سفر اندر سے شروع ہو کر باہر آتا ہے اور اسلام کا سفر باہر سے شروع ہو کر اندر کی طرف جاتا ہے۔

❸ الايمان والاسلام اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا كالمسكين والفقير اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا۔

ایمان اور اسلام میں تداخل

بعض احادیث سے ایمان و اسلام میں تداخل ثابت ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ سے کسی نے سوال کیا:

ای الاعمال افضل؟ فقال: الاسلام فقال: ای الاسلام افضل؟ فقال: الايمان۔

(التعلیق الصبیح)

تداخل کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام سے مراد تسلیم بالقلب اور عمل بالارکان دونوں لئے جائیں اور ایمان سے فقط تسلیم بالقلب مراد لیا جائے۔

مذکورہ روایت میں اسلام کے جواب میں ایمان آیا یعنی تسلیم بالقلب، اور اسلام خود تسلیم قلبی اور عمل بالارکان کا نام ہے۔ تو ایمان کو اسلام میں داخل کر لیا گیا جو تداخل ہے۔ اسلام عام ہو گیا اور ایمان خاص ہو گیا۔

ایمان میں استثناء کا حکم

ایمان میں استثناء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کہے: انا مومن ان شاء اللہ۔ یہ کہنا جائز ہے یا نہیں اس میں کئی اقوال ہیں۔
 ① حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اکثر علماء کوفہ اور ابن مسعود رحمہ اللہ کے شاگرد کہتے ہیں کہ "انا مومن ان شاء اللہ" کہنا جائز ہے۔ بعض احناف کی بھی یہی رائے ہے۔

② اہل تحقیق کے نزدیک انا مومن کے ساتھ ان شاء اللہ نہیں لگانا چاہیے۔ یہی مذہب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

③ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف اعتبارات کا لحاظ کر کے انا مومن انشاء اللہ کا حکم معلوم کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص انا مومن ان شاء اللہ فی الحال کے اعتبار سے کہتا ہے تو یہ نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ اس شخص کو حالاً اپنے ایمان میں تردید ہے۔ اور اگر مستقبل کے متعلق کہتا ہے کہ انشاء اللہ میں مومن ہوں گا یا تبرک کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ تاہم اس سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ بعض صورتیں خطرناک ہیں۔

محل ایمان:

شوافع کے ہاں ایمان کا محل قلب ہے کیونکہ نصوص میں ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی گئی ہے جیسے "و قلبہ مطمئن بالایمان" امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے کہ محل ایمان دماغ ہے۔ صاحب ہدایہ نے اشارہ کیا ہے کہ محل ایمان قلب ہے تو دماغ کی بات اور امام صاحب کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ ہاں قلبی روشنی کے لئے دماغ بمنزلہ بلب ہے۔



الفصل الاول

حدیث جبرائیل

﴿۲﴾ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الْقِيَابِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرَى عَلَيْهِ أَكْثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَسَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فُؤَادِهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ قَالَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتَقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتُحِجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقْتَ فَجِئْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرُهُ وَشَرُّهُ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا قَالَ أَنْ تَلِدَ الْأُمَّةُ رُبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْخِفَافَةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُلْبُلِيَّانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِي يَا عُمَرُ! أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ أَبُو هُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلَافٍ وَفِيهِ وَإِذَا رَأَيْتَ الْخِفَافَةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوكَ الْأَرْضِ فِي غَيْبٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ. الْآيَةُ. (متفق عليه)

مترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم ایک دن جناب رسول اللہ ﷺ کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی اندر آیا جس کا لباس نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ چمکدار تھے۔ اس پر نہ تو سفر کی کوئی علامت نظر آ رہی تھی اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا، وہ حضور اکرم ﷺ کے قریب آ کر بیٹھا اور آپ ﷺ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا لئے اور (بطور ادب) اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے۔ پھر اس نے عرض کیا اے محمد! مجھے اسلام کی حقیقت بتاد دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ تم کو اسی دو کہ اللہ کے سوا کوئی قائل پرستش نہیں۔ اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، پھر پابندی سے نماز پڑھا کرو، زکوٰۃ ادا کیا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو اور زاد راہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج

بھی کرو۔“ اس شخص نے جواب سن کر کہا ”آپ نے صحیح فرمایا“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ یہ آدمی ایک طرف تو سوال کر رہا ہے اور پھر جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر وہ شخص بولا ”اے محمد! ایمان کی حقیقت بیان فرمائیے۔“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو دل سے تسلیم کرو اور یقین کرو کہ برا بھلا سب کچھ اللہ کی طرف سے اللہ کے فیصلے کے مطابق ہے۔ اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا۔ پھر پوچھا احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ (شہودی درجہ) استحضار ممکن نہ ہو تو اتحاد حیاں کرو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ قیامت کے بارے میں مجھے کچھ بتائیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اس بارے میں جواب دینے کا علم سوال کرنے والے کے علم سے زیادہ نہیں“۔ وہ شخص بولا کہ پھر قیامت کی نشانیاں بتا دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جب لونڈی اپنے آقا یا مالک کو جنے گی۔ اور برہنہ پا، برہنہ جسم، مفلس و فقیر اور بکریاں چرانے والوں کو عالیشان عمارت میں فخر و غرور کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھو۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) پھر وہ آدمی چلا گیا۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ عمر! سائل کو جانتے ہو کون تھا؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں فرمایا: یہ جبرئیل تھے جو تم لوگوں کو دین سکھانے آئے تھے۔ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس روایت کو کچھ الفاظ کے فرق کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی روایت کے آخری الفاظ اس طرح ہیں کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، بہرے اور گونگے لوگوں کو زمین پر ٹکرائی کرتے ہوئے دیکھو اور قیامت کے وقت کی تعین تو ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنْزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔** (لقمان ۳۴)

توضیح: یہ ایک جامع حدیث ہے اور شریعت مطہرہ کے تمام شعبوں پر محیط ہے چونکہ ان بنیادی باتوں کے سوالات حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے کئے تھے۔ اس لئے اس کو حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔ جب سوال کرنے والے جبرئیل ہوں اور جواب دینے والے خاتم النبیین ﷺ ہوں تو پھر اس حدیث کے بنیادی مضامین کی شان خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

فاضل عیاض مالکی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ یہ حدیث تمام عبادات ظاہری اور باطنی اور ایسے احکامات پر مشتمل ہے جو ایمان، اعمال، جوارح اور اخلاص سرائے سے متعلق ہیں۔ یہاں تک کہ شریعت کے تمام علوم اس کی طرف راجع ہیں اور سب اس سے پھوٹ پھوٹ کر پھیلتے ہیں۔ اور اسی جامعیت کی وجہ سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ”یصلح ان یقال لہ اہم السئلۃ“ یعنی جس طرح سورۃ فاتحہ قرآن کے لئے ام القرآن ہے یہ حدیث تمام احادیث کے لئے ”ام السنۃ“ ہے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مصابیح اور شرح السنۃ کی ابتداء اسی حدیث شریف سے کی ہے۔ اس حدیث سے متعلق گزشتہ مباحث میں بھی چند باتیں لکھی گئی ہیں۔ وہاں ملاحظہ کریں۔

بیٹھا۔۔۔ یہ لفظ مفرد ہے اور ظرفیت کے لئے آتا ہے اور جملہ اسمیہ اور فعلیہ دونوں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ اذ اور بیٹھا دونوں ظرف زمان بمعنی مفاہات آتے ہیں۔ اور یہی مفاہات کا معنی اس ظرف کا عامل بنا ہے۔ حدیث کا معنی یہ ہوا۔

وقت حضورؐ فی مجلس النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجأنا طلوع هذا الرجل.

ترجمہ کرنے میں "بیٹھا" کا ترجمہ اس طرح ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں یا اسی درمیان اور اسی دوران۔

ذات یومہ: لفظ ذات بڑھایا گیا ہے یہ اس وہم کو دور کرنے کے لئے ہے کہ یہاں مجازاً مطلق زمان مراد نہیں بلکہ دن ہی مراد ہے۔ نیز لفظ ذات کلام کی تفسیر کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ بعض نے اس کو محکم یعنی زائد بھی کہا ہے۔

نحن عدد رسول اللہ: ایک روایت میں "فی آخر عمرة" کا لفظ آیا ہے۔ بعض نے حجۃ الوداع کے بعد دس بھری میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اس آمد کا وقت بتایا ہے۔ گو یا حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام احکام کے نازل ہونے کے بعد اسورین کی تثبیت تقریر اور مضبوطی کے لئے آئے اور اجمالی خاکہ ایک ہی مجلس میں پیش کیا۔

بخاری کی روایت میں ہے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما ہارزا للناس" ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک نمایاں جگہ پر تشریف فرما تھے کیونکہ صحابہ نے آپ کی اجازت سے آپ ﷺ کے بیٹھنے کے لئے ایک چبوترہ بنایا تھا تا کہ امتیاز آجائے۔ اسی روایت سے قرطبی نے علماء اساتذہ اور مدرسین کے لئے نمایاں جگہ بنانے پر استدلال کیا ہے۔ بشرطیکہ ضرورت ہو، اس حدیث کا شان درود یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم نے سوال پر پابندی لگائی تھی جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا "سلونی فہا ہوا ان یسألوا فہاء جبرئیل" یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا مجھ سے سوال پوچھو تو صحابہ سوال کرنے سے گھبرا گئے تب جبرائیل علیہ السلام آئے اور سوال کئے۔

اذ طلع علینا رجل: دخل کی بجائے طلع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آنے والا ایک شخص اچانک آیا تھا اور اچانک آمد کے لئے طلع زیادہ مناسب تھا کیونکہ طلوع الشیء دفعتاً ہوتا ہے۔

یا لفظ طلع کمال ظہور، کمال عظمت اور علو مرتبت کے لئے اختیار کیا جیسے طلع البدو علینا یا طلع الشمس کے الفاظ عظمت کے لئے بولے جاتے ہیں۔

تیسری وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ یہ شخص چونکہ جبرائیل امین تھے اور فرشتے نورانی مخلوق ہیں اس نور اور روشنی کے لئے طلع کا لفظ زیادہ مناسب تھا۔ "رجل" میں توین تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی ایک شان والا آدمی نمودار ہوا، فرشتہ ہمیشہ جب کسی کی شکل اپناتا ہے تو مردوں کی شکل میں آتا ہے۔ عورت کی شکل میں نہیں آیا کرتا۔

شدید بیاض الشیاب: یہاں اضافت لفظیہ تخفیف کے لئے ہے۔ اور مضاف الیہ میں الف لام عوض مضاف الیہ ہے۔ یعنی شدید بیاض ثوبہ اور اگر شدید مضاف پر توین لی جائے تو بیاض اس کا قائل بن جائے گا۔ یعنی شدید بیاض ثوبہ۔

سفید لباس اختیار کرنے سے اشارہ کیا کہ سب سے عمدہ لباس سفید ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں بھی ہے آنحضرت ﷺ نے

فرمایا: "البسوا ثياب البيض فانها اطهر واطيب و كفنوا فيها موتاكم" اور سفید لباس اختیار کرنے سے توجش دور ہو جاتا ہے اس لئے اس کو اختیار کیا، اس جملے کی تشریح آنے والے شدید سواداشر کے جملہ میں بھی چلے گی۔

ان دونوں جملوں کے ملانے سے علم دین کے طلباء کے لئے چند مفید آداب حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حصول علم کے لئے پہلا ادب تو یہ ہے کہ طالب علم صاف ستھرا ہو خواہ پرانا کپڑا ہو مگر صاف ہو ثقافت ہو دوسرا ادب یہ کہ علم دین کے حصول کا زمانہ جوانی کا ہے کہ اس میں ہر مشقت برداشت کرنا بھی آسان ہوتا ہے۔ اور ذہن اور حافظہ اور دیگر توئی بھی تروتازہ ہوتے ہیں۔

ولا یعرفہ منا احد: یہاں یہ سوال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی بھی انکو نہیں جانتا تھا ممکن ہے پورے مجمع میں کوئی جاننے والا ہو۔ جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گمان کے مطابق سب کی طرف یہ نسبت کی یا یہ کہ حاضرین مجلس کے قول اور تصریح کے مطابق یہ فرمایا کیونکہ یہ قول ابن حجر عثمان بن غیاث کی روایت میں ہے۔
فنظر القوم بعضهم الى بعض فقالوا ما نعرفه۔

حتی جلس الی الدہی: اس روایت میں کچھ اجمال ہے۔ مسند امام اعظم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو روایت منقول ہے وہ اس طرح ہے۔

عن ابن مسعود الی ان قال السلام علیک یا رسول اللہ فقال وعلیک السلام فقال یا رسول اللہ اذن فقال اذن قال فدا حتی جلس..... الخ۔

جلوس اور قعود مترادف الفاظ ہیں اور بیٹھنے کے معنی میں ہیں۔

فأسند رکبتہما الی رکبتہ: سوال یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے میں بے ادبی کا احتمال ہے ایسا کیوں کیا؟ اسکے چند جوابات ہیں۔

① طلب علم میں اپنی شدید حاجت و احتیاج ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا۔

② حضور ﷺ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے ایسا کیا۔

③ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسا کیا۔

④ اپنی بہت وحیثیت چھپانے کے لیے ایسا کیا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

ووضع کفیه علی فخذیه: کفہ کی ضمیر تو اس آنے والے سائل جبرائیل امین کی طرف لوٹتی ہے یہ طالب علم کے باادب بیٹھنے کا انداز ہے کہ دوڑا نو ہو کر قعدہ کی شکل میں بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ دے گویا ہر معلم کو ادب کا درس دیا۔

فخذیه: اس میں ضمیر اگر سائل کی طرف راجع ہے تو اس میں کمالِ ادب کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے لیکن امام بغوی علامہ طبری اسماعیل تیمی وغیرہ علماء کے نزدیک یہ ضمیر نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے کہ اس سائل نے اپنے دونوں ہاتھ نبی اکرم ﷺ کی رانوں پر رکھ دیئے۔ ان علماء کی اس رائے کی تائید نسائی کی روایت سے ہوتی ہے کیونکہ کہ اس میں تصریح ہے۔ ثم وضع یدیه علی رکبتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس تصریح کے بعد

اس میں بحث نہیں کرنا چاہئے کہ ضمیر کس طرف لوٹتی ہے؟

البتہ یہاں پھر وہی سوال اٹھے گا کہ یہ صورت کیا ہے الہی کی نہیں ہے؟ اس کے وہی جوابات ہیں جو اوپر کے جملے میں دیئے گئے ہیں۔ کہ اس سے وہ اپنا بدوہن ظاہر کرنا چاہتے تھے تاکہ ملک اور فرشتہ ہونا پوشیدہ رہے، یا توجہ مبذول کرنا چاہتے تھے۔ ماعلیٰ قاری رحمہ اللہ نے اس کو مجاز پر حمل کیا ہے کہ اس سے مراد کمال قرب ہے لیکن مجاز لینے کی کیا ضرورت ہے؟ حقیقت موجود ہے، جبرائیل امین کی آمد و گفتگو اور سوال و جواب پر علامہ ابن حجر رحمہ اللہ، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور دیگر شارحین نے جو کلام کیا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا صحیح نظر ابہام، انخفاء حال اور لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے درط حیرت اور التباس میں ڈالنا تھا۔ کبھی آپ تہذیب یافتہ لوگوں کا طرز اختیار کر کے یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ نو وارد انتہائی درجہ کے مہذب، باوقار اور آداب تعلیم سے واقف ہیں۔ اور کبھی ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے آداب مجلس سے ناواقف ہونے دیہاتی اور بدوی ہونے کا خیال آتا ہے۔

کبھی اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر مہذب انداز میں بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی ناواقف دیہاتیوں کی طرح گھٹنوں سے گھٹنا ٹیک کر حضور ﷺ کی رانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کبھی یا رسول اللہ کہہ کر تہذیب کا رنگ اختیار کرتے ہیں اور کبھی یا محمد کہہ کے گنوار پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی سلام کر کے مجلس میں آنے کی اجازت مانگتے ہیں اور کبھی گردنوں کو پھلانگ کر دیہاتیوں کی طرح آگے بڑھتے ہیں کبھی عمدہ و عمیق سوال کرتے ہیں تو جواب ملنے پر خود تصویب کر کے واقفیت اور ناواقفیت کے تضاد کو جمع کرتے ہیں۔ بدن اور لباس پر آثار سفر ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے مقیم معلوم ہوتے ہیں۔ اور کسی کا ان کو نہ پہچانا مسافر ہونے کی دلیل ہے۔ عجیب یہ ہے کہ جبرائیل امین نے تعویہ اور انخفاء کے تمام طور طریق اپنا کر لوگوں کو قابل غور میں ڈال دیا یہاں تک کہ خود نبی کریم ﷺ نے آخر وقت تک نہ پہچانا اور جانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ جبرائیل تھے۔

۱۱۲ ذی قعدہ ۹۹ھ

وقال یا محمد: سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس طرح خطاب کر کے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کرنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے "لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً"۔ اس کے باوجود جبرائیل امین نے یا محمد سے آپ کو کیوں پکارا ہے؟ نیز قرآنی ممانعت کے ساتھ ساتھ اس طرح خطاب کرنے میں بے ادبی کا پہلو بھی ہے۔

پہلے جبرائیل علیہ السلام: یہ ہے کہ اس خطاب اور اس ممانعت کے مکلف اور پابند انسان ہیں فرشتے نہیں، یہ اچھا جواب ہے کیونکہ کئی دیگر مقامات میں جبرائیل امین نے آپ ﷺ کو اسی نام سے پکارا ہے۔

کے منبر علیہ السلام: یہ ہے کہ لفظ محمد سے وضعی معنی یعنی ستودہ صفات "حمیدہ خصال والے" مراد لئے گئے ہیں، علمی معنی مراد نہیں ہے۔

یہ ہے کہ جبرائیل امین اپنے آپ کو چھپا رہے تھے اسکے لئے اس طرح کا پکارنا ضروری تھا۔ بہر حال

جب شارحین حدیث نے اس میں بے ادبی کا احتمال نکالا ہے تو اب ”یا محمد“ کہہ کر پکارنا حرام ہے۔

ایک بریلوی عالم نے مشکوٰۃ کی شرح لکھی ہے اس مقام پر وہ لکھتے ہیں ”اب حضور کو ”یا محمد“ کہہ کر پکارنا حرام ہے۔“

اخیر میں عن الإِسْلَام: یہاں پر امر استدعاء کے معنی میں ہے۔ استعاء اور حکم کے معنی میں نہیں ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام فرشتوں سے افضل ہیں۔

”الاسلام هو الانقياد الظاهر بشرط الانقياد الباطن“ الاسلام میں الف لام حقیقت شرعیہ کے لئے ہے۔ اور ایک روایت میں شرائع الاسلام کے الفاظ بھی ہیں۔ اسی لئے اس کا جواب ارکان خمسہ سے دیا گیا ہے۔ صرف تعریف نہیں بتائی۔

یہاں پر سوال یہ ہے کہ مسلم، کتاب حمیدی، جامع اصول، ریاض الصالحین اور مشکوٰۃ میں اسلام سے متعلق سوال و جواب مقدم لایا گیا ہے اور بخاری اور مصابیح میں ایمان کا سوال و جواب مقدم لایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مقام کا تقاضا یہ تھا کہ اسلام مقدم ہو کیونکہ جبرائیل علیہ السلام نے سیکھنے اور تعلیم کے لئے سوال کیا حضور ﷺ نے ظاہری طور پر جواب دیا کیونکہ آپ حکمت تدریجیہ کے اصول پر جواب دیا کرتے تھے۔ اس لئے آپ ﷺ ہم کو مقدم کر کے ذکر فرماتے تھے۔ لہذا یہاں ظاہری القیاد سے تدریجاً ترقی کر کے آپ ﷺ نے ایمان کا ذکر فرمایا پھر اس سے ترقی کر کے احسان کا تذکرہ فرمایا جو اخلاص کا مقام ہے گویا یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ایک صورت تھی، ورنہ ایمان تو اساس اسلام اور اساس دین ہے وہ سب سے مقدم ہے۔

بہر حال صاحب مشکوٰۃ نے صاحب مصابیح پر عملاً اعتراض کیا کہ ایسا ہونا چاہئے تھا کہ پہلے سوال و جواب اسلام سے ہو، یا جواب یہ ہے کہ یہ تقدیم تاخیر بعض رواۃ کی طرف سے تصرف ہے جو ہوتا رہتا ہے، اور مختلف اسلوب اختیار کرتے رہنا محدثین کی عام عادت ہے اور جہاں ایمان مقدم ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دین کے لئے اساس اور بنیاد ہے اس کے بغیر کسی عمل کا اعتبار نہیں ہے۔

ان تشهد: یہاں ”أن“ مصدر یہ ہے جس نے تشهد کو شہادۃ مصدر بنا دیا۔ ”ان لا اله الا الله“ میں أن مخففہ من الثقیلۃ ہے۔ جو ”انه“ کے معنی میں ہے اور ضمیر شان ہے اور ”لا اله الا الله“ کلمۃ التوحید ہے۔ ”والتوحید فی اللغة“ ”وحدانية الشيء“ واصطلاحاً ”اثبات ذات الله بالوحدانية“ کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی مشابہت سے پاک ہے۔ عقیدۃ تولا و عملا و عرفا و عبودا و داما۔

توحید سے متعلق امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں للتوحید لبان وقشران کالجوز۔۔۔۔ الخ یعنی توحید کے لئے دو چھلکے ہیں۔ اور دو مغز ہیں جس طرح بادام میں ہوتا ہے۔ اقرار باللسان توحید کے لئے اوپر کا چھلکا ہے اور اعتقاد بالہجران دوسرا چھلکا ہے جس طرح بادام کی گٹھلی پر ایک چھلکا ہوتا ہے پھر خود گٹھلی دوسرا چھلکا ہے پھر لب ہے۔ توحید کا لب یہ ہے کہ انسان کائنات کی تمام اشیاء کو ایک اللہ کی تخلیق مانے اور یہ جانے کہ سب کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہے جو سب کا فاعل محض

ہے۔ اور پھر تمام اسباب کو ان کے مسببات کے ساتھ جزا ہونا ماننے، اسکے کے بعد لب اللب ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی نظر کائنات میں صرف ایک اللہ پر ہی ہو، دیگر کوئی چیز اسکو نظر نہ آئے۔ اور اسی واحد لا شریک ذات کے مراقبہ میں مستغرق ہو جائے تو قشر اور قشر القشر اور لب اور لب اللب یہ چار چیزیں توحید میں ہیں۔

محمد رسول اللہ: اس جملے سے نبوت اور رسالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور شہادت کے مفہوم میں "محمد رسول اللہ" کا مفہوم خود پڑا ہوا ہے کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم نہیں تو کبھی اس کو ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی صرف شہادت کے لفظ پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ان استطعت الیہ سبیلاً: امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں استطاعت مال کا نام ہے، لہذا، معذور بیمار پر بھی حج فرض ہے جبکہ وہ مالدار ہو وہ اپنے نائب کو پیسہ دے کر حج کرائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک "استطاعة بالبدن" ہے کہ آدمی صحت مند اور تندرست ہو تو اس پر حج فرض ہے پیدل جائے گا راستے میں کمائے گا کھائے گا اور آگے بڑھتا جائے گا۔ احناف کے ہاں زاحور احلة کا حاصل ہونا استطاعت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بعض روایات میں حج کا ذکر نہیں ہے، بعض میں روزے کا ذکر نہیں ہے حج کا ہے، بعض ترتیب میں آگے پیچھے ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ راویوں کے تصرفات میں سے ہے کہ کسی نے کسی کو ذکر کیا کسی نے کسی کو ذکر کیا۔ کسی کو ایک طرح یا د تھا اور کسی کو کسی اور طرح یا د تھا اسی میں تقدیم تاخیر بھی ہو گئی۔

قال صدقت فجبنا لہ: یعنی صحابہ کو اس پر تعجب ہوا۔

① یہ شخص سائل بن کر اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے اور پھر تصدیق کر کے اپنے عالم ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔

② صحابہ کرام کے تعجب کی دوسری وجہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ صحابہ جانتے تھے کہ علم کا منبع اور سرچشمہ حضور ﷺ کی ذات بابرکت ہے آنحضرت ﷺ سے بغیر کوئی بھی ان علوم کو نہیں جانتا، یہ سائل کبھی بھی حضور ﷺ سے ملے نہیں تو یہ کیسے تصدیق کرتے ہیں کیونکہ تصدیق کیلئے سابق علم کا ہونا ضروری ہے۔

قال فاخبرنی عن الایمان: یہاں پر بھی امر استدعا کے معنی میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ سوال مؤمن بہ اور متعلقات ایمان سے ہے، حقیقت ایمان اور تعریف سے نہیں اس لئے آپ ﷺ نے جواب میں ان امور مؤمن بہ کا ذکر کیا اور نہ حقیقی ایمان تو تصدیق قلبی ہے۔ اب یہاں اشکال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے "اخبرنی عن الایمان" کے جواب میں "ان تؤمن" فرمایا۔ تو یہ تو تعریف الشیء بنفسہ ہوئی، جواب یہ ہے کہ سوال میں ایمان شرعی کا ذکر ہے۔ اور جواب میں ایمان لغوی کا ذکر ہے تو حد اور محد دو الگ الگ ہیں۔ نیز ایمان جب جواب میں آیا تو اس کے صلہ میں ہا آیا اور ایمان اس صلہ کی وجہ سے "تعترف" کے معنی میں ہوا۔ یعنی سائل نے پوچھا ایمان شرعی کیا ہے؟ جواب دیا گیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ، ملائکہ۔۔۔ الخ کے اقرار کا نام ایمان ہے۔

وملائکتہ: یہ اصل میں مألکة من الالوكة سے بمعنی الرسلہ ہے پھر ہمزہ پر لام کو مقدم کیا تو ملئکة ہو گیا پھر

ہمزہ کا فتح لام کو دیا اور ہمزہ حذف کر دیا گیا تو "ملک" رہ گیا جس کی جمع ملائکہ ہے۔ امام بیہقی کی تصریح کے مطابق فرشتوں سے متعلق یہ عقیدہ اور ایمان رکھنا چاہئے:

● یہ عقیدہ ہو کہ انکا وجود ہے۔ یہ اللہ کی عظیم مخلوق ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے عظیم مرتبہ سے نوازا ہے اور انہیں عالم بالا و عالم سفلی کے بڑے کاموں پر مامور کیا ہے۔

③ یہ عقیدہ ہو کہ لا یعصون اللہ ما امرہم ویفعلون ما یؤمرون۔

④ یہ عقیدہ ہو کہ بعض فرشتے انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے سفراء ہیں بعض دوسرے کاموں میں ہیں۔ فرشتوں کے بارے میں پیغمبری اور سرسید پیر و کار نے بڑی زیادتی کی ہے کہ جو نظر نہیں آتا اس کا انکار کرو، اس لیے وہ فرشتوں اور جنات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے جسم میں بہت ساری چیزیں ہیں مثلاً لوہا ہے، شوگر ہے، چونا وغیرہ ہے جو نظر نہیں آتا مگر کوئی انکار نہیں کرتا۔ ماچس کی تیلی میں آگ کہاں نظر آتی ہے دودھ میں مکھن کہاں نظر آتا ہے۔ مگر کوئی انکار نہیں کرتا تو صرف فرشتوں کا انکار کیوں کیا جاتا ہے؟

اگر یہ کوئی شرعی ضابطہ ہے کہ جو نظر نہ آئے اسکا انکار کر دو تو پھر اللہ تعالیٰ تو نظر نہیں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے اکثر پیر و کار دہریہ بن جاتے ہیں۔ فرشتوں کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہاں چار فرشتے مشہور ہیں۔ فرشتوں پر اجمال اور تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ہے۔ یہاں ملائکہ کو رسولوں پر مقدم کر کے ذکر کیا یہ تقدیم فضیلت کے اعتبار سے نہیں بلکہ تقدیم ذکر کی ہے نہ کہ رتبہ۔ ویسے بھی فرشتے وجود کے اعتبار سے مقدم ہیں تو پہلے ذکر کیا۔

و کتبہ: تمام صحائف اور کتب مراد ہیں۔ اس پر ایمان یہ ہے کہ اللہ کا کلام ہے قدیم ہے مجرد از حروف و صوت ہے۔

یہ کتابیں انبیاء کرام علیہم السلام پر بواسطہ فرشتہ یا براہ راست اتری ہیں اور قرآن کریم سب سے افضل ہے جو عربی میں محمد عربی ﷺ پر اترا ہے۔ قرآن کے آنے کے بعد ساقی تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں قرآن کریم ان کے لئے ناسخ ہے۔

کل آسمانی صحائف ایک سوتائے جاتے ہیں۔ اور چار مشہور کتابیں ہیں یہ کتب اور صحائف کل ایک سو چار ہوتے ہیں۔ پچاس صحائف حضرت شیث علیہ السلام پر نازل ہوئے۔ تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر اترے۔ اور دس حضرت آدم علیہ السلام کی طرف بھیجے گئے۔ اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے۔ اور باقی چار مشہور کتابیں مشہور زبانوں میں مشہور نبیوں پر اتریں۔ ان حروف سے سب کی طرف اشارہ ہے۔ "تعمہ" یعنی تورات عبرانی زبان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ تاء سے تورات عین سے عبرانی اور میم سے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔

"فعمہ" یعنی فرقان مجید عربی زبان میں محمد ﷺ پر نازل ہوا۔

"اسنع" یعنی انجیل سریانی زبان میں عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔

"زید" یعنی زبور یونانی زبان میں داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اجمال یا تفصیل کے ساتھ ان تمام کتب و صحائف پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ورسلہ: رسولوں پر اجماعاً و تصدیقاً ایمان لانا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کیلئے نبیوں کو بھیجا ہے خالق اور مخلوق کے درمیان پیغام رسانی پر مامور تھے۔ انکو مقررے دیئے گئے تھے وہ کہاں سے قبل الہیہ پاک اور معصوم تھے۔ اور جن لغزشوں کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے ہم کو ان کا تذکرہ موضوع بحث بنا کر نہیں کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ خالق ہے وہ اگر معمولی لغزش پر سخت سرزنش کرے تو کر سکتا ہے۔

انبیاء کرام ایک معتبر روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، جن میں تین سو تیرہ رسول تھے، ”کم و بیش“ کا کلمہ لگا کر تعداد انبیاء کرام کا تذکرہ کرنا چاہئے تاکہ کلام میں احتیاط ہو جائے۔

نبی اور رسول کا فرق اور اصطلاحی تعریف ابتدائے کتب میں ہو چکی ہے۔

اليوم الآخر: سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہ دنیا کا آخری دن ہے۔ نیز اس دن کے بعد رات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی، تو وہ آخری دن ہوا، آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ایک دن یہ کارخانہ عالم ختم ہو جائے گا انسان کا جسم روح کے ساتھ جوڑ کر میدان محشر تک حساب کیلئے لایا جائے گا پھر جنت یا دوزخ ٹھکانہ بنے گا۔

و تو من بالقدح و الخمر و الشر: اس جملے سے ان لوگوں پر رد ہو گیا جو تقدیر کو مانتے ہی نہیں یا مانتے ہیں لیکن شر کا خالق ”اہرمن“ اور خیر کا خالق ”یزدان“ کو مانتے ہیں جیسا کہ مجوس کا یہ عقیدہ ہے، مومن کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ خالق خیر و شر ایک اللہ ہے۔ خلق تو کمال ہے، ہاں اکتساب شر جو انسان کرتا ہے وہ عیب ہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ جو تفصیلات خارج میں آتی ہیں۔ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے، اس خاکے کے مطابق تمام تفصیلات رونما ہوتی ہیں، اس مسئلے کی تفصیل باب الایمان بالقدر میں ان شاء اللہ آجائے گی۔

یہاں ”تو من“ کو لوٹا کر اعادہ بعد عہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب کلام طویل ہو جاتا ہے تو عامل کو لوٹا کر کلام شروع کیا جاتا ہے تاکہ بھولا ہوا سبق یاد آجائے۔ جیسا شاعر نے اعادہ بعد عہد کیلئے ”انی“ کو لوٹا یا ہے۔

قد علم الحق العلمون انہی اذا قلت اما بعد انی خطیبہا

قال فاخبرنی عن الاحسان: بغیر صلہ جب لفظ احسان آجائے تو اس کا مفہوم اخلاص ہوتا ہے یعنی اخلاص کے معنی میں ہے۔ اور اگر صلہ کے ساتھ آجائے تو پھر یہ اچھائی اور انعام کے معنی میں آتا ہے۔ احسن الیہ ای انعم علیہ لغوی طور پر احسان، اچھائی کے معنی میں ہے، اور انکی اصطلاحی تعریف وہی ہے جو حدیث شریف میں ہے۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں احسان کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ جملہ اولیٰ سے مشاہدہ حق کا بیان مقصود ہے جس کا یہ مطلب یہ ہے کہ عبادت کے وقت عابد پر ایسی کیفیت طاری ہونی چاہئے گویا کہ واقعی مشاہدہ حق ہو رہا ہے اور عبادت میں ذوق و شوق، عظمت و حیاء اور اکمل درجہ کی استغراقی کیفیت ہونی چاہیے اور اگرچہ دنیا میں فی الحقیقت ذات حق کا مشاہدہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

پھر جملہ ثانیہ میں مراقبہ حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ تم دنیا میں مشاہدہ تو نہیں کر سکتے ہو مگر کم از کم یہ تو دھیان رہے

کہ ذات حق تجھے دیکھ رہی ہے گویا پہلے جملے میں مقام شہود کا ذکر ہے اور دوسرے جملے میں مقام غیوبت کا ذکر ہے۔ دونوں سے مراد اخلاص پیدا کرنا ہے۔ عابد کی دو حالتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ارفع و اعلیٰ حالت مشاہدہ کی کیفیت ہے جو مقام مشاہدہ ہے اور ادنیٰ حالت مقام مراقبہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت اور طریقت کا فرق اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب علم کی کشش اور دلائل کا دور ہو تو یہ شریعت ہے۔ اور جب طمانینت آجائے تو یہ طریقت ہے یا اس طرح سمجھایا ہے کہ جب احکام اسلام پر مختلف چلتا رہے تو یہ شریعت ہے اور جب طبعیت بن جائے تو یہ طریقت ہے، احسان اسی طریقت کے درجے کا نام ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فضل الباری جلد دوم میں فرماتے ہیں: ”اصل چیز تو ایمان ہے اور وہ جذر قلب میں ہوتا ہے اور جب وہ ترقی کرتا ہے تو جو ارح یعنی ظاہری اعضاء پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ پھر اس ایمان پر جو شخص انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کے مطابق مزاولت (ہفتگی) کرتا ہے تو اس باقاعدگی اور مزاولت سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اسکو احسان کہا جاتا ہے۔ انبیاء کرام اس فن کے بڑے بڑے اساتذہ ہیں۔ گویا اسلام ترقی کر کے ایمان بنتا ہے۔ اور ایمان ترقی کر کے احسان بنتا ہے۔ شریعت جو ایمان و اسلام کا مجموعہ ہے اس کی باقاعدہ مشق سے احسان حاصل ہوتا ہے یہی طریقت ہے۔

بعض گمنام بریلوی صوفیوں نے یہاں احسان کا مقام بتاتے ہوئے حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ”ان لہ تکن تورا“ یعنی اگر تمہارا وجود ختم ہو جائے اور تم اس کو فنا کر دو اور خود مٹ جاؤ تب اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکو گے تیرا اپنا وجود ہی اس روایت میں بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ ترجمہ غلط ہے اور یہ مطلب لینا حدیث میں تحریف ہے۔ اپنے آپ کو فنا کرنا اپنی جگہ پر ایک اہم عمل ہے اور صحیح ہے لیکن حدیث کا مصداق یہ نہیں ہے۔ یہ مطلب غلط اس لئے ہے کہ اگر ”تورا“ جزا ہے ان لہ تکن کیلئے تو جواب شرط کی وجہ سے تورا کا الف باقی نہیں رہنا چاہئے تھا بلکہ گر جانا چاہئے تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ”ان لہ تکن“ کے لئے ”تورا“ جزا ہو جائے تو ”فانہ یوالث“ کا کیا بنے گا؟ وہ جملہ تو مہمل رہ جائے گا حالانکہ وہ جزا ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ بعض روایات میں ان لہ تکن نہیں ہے۔ بلکہ ان لہ تورا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا ہے۔ خواہ کوئی اپنے آپ کو فنا کرے یا نہ کرے۔ لہذا یہ شرح اور یہ توجیہ اور یہ مطلب حدیث کی عبارت اور معنی دونوں کے منافی ہے۔ بعض روایات میں یہاں بھی حضرت جبرائیل نے صدقت کا جملہ کہا ہے۔ مگر شاید راویوں نے اختصار کے پیش نظر یا بھول کر چھوڑ دیا۔

۱۳: یقیناً ۱۳۰۹ھ

قال فاخبرونی عن الساعة: یہ سوال نفس وقوع قیامت کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ وقوع قیامت تو قطعی اور یقینی ہے بلکہ یہ سوال تعین وقت کیلئے تھا اور ایک روایت میں ”ہتھی الساعة“ یعنی قیامت کب آئے گی کے الفاظ آئے ہیں جو اس بات کی تائید ہے کہ سوال تعین وقت سے متعلق تھا۔

الساعة: زمانے کے اس جز غیر معین کا نام ہے جس کے (۲۴) جزاء سے دن رات بن جاتے ہیں۔ یہاں ساتھ ساتھ اطلاق قیامت پر ہوا ہے۔ قیامت کے تین مراحل ہیں:

قیامت کبریٰ یہ وہ ہے جب کارخانہ عالم اپنی کل کائنات کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔

دوسرا مرحلہ قیامت وسطیٰ کا ہے یہ وہ ہے کہ ایک قرن ختم ہو جائے مثلاً قرن صحابہ یا قرن تابعین یا تبع تابعین۔

تیسرا مرحلہ قیامت صغریٰ ہے اور وہ ہر آدمی کی ذاتی اور شخصی موت ہے یعنی "من مات فقد قاصت قیامتہ"۔ قیامت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی اور اہم عقائد میں سے ہے جن قوموں سے یہ عقیدہ نکل گیا وہ قومیں بریک فیل گاڑی کی طرح تباہ ہو گئیں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کا عقیدہ آخرت اپنے بڑوں اور بزرگوں کے متعلق غلط خیالات و نظریات کی وجہ سے خراب ہو گیا کہ ان بزرگوں نے ہم کو بخشوا یا ہے اس پر وہ لوگ تباہ ہو گئے پھر آنا خانیوں، رافضیوں اور پھر بریلویوں کے عقائد آخرت کے بارے میں جتنے کمزور ہو گئے اتنے ہی وہ اعمال سے دور جا گرے۔ کیونکہ آخرت کی جواب دہی کا عقیدہ دنیاوی زندگی کو کنٹرول کرتا ہے ورنہ ہر آدمی یہ کہے گا کہ:

بایر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ما المسؤول عنها باعلم من السائل: یعنی قیامت کے بارے میں قیامت تک جس سے بھی سوال کیا جائے گا وہ سائل سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوگا۔ بلکہ عدم علم میں دونوں برابر ہوں گے۔ باعلم میں باء تاکید لینی کے لئے ہے۔

نبی کریم ﷺ نے "لا احدى" یا "لا اعلم" نہیں فرمایا بلکہ ایک طویل جملہ اختیار فرمایا اسکی وجہ یہ ہے کہ "لا اعلم" اور "الست اعلم" سے زیادہ سے زیادہ اپنی ذات سے علم قیامت کی لٹی ہوتی لیکن اس طویل جملے سے آپ نے ایک ضابطہ بتا دیا ہے کہ قیامت کے بارے میں کوئی بھی سائل جب بھی سوال کرے گا تو عدم علم میں دونوں یعنی سائل و مسئول برابر ہوں گے عدم علم کی مساوات صرف قیامت کے بارے میں ہے باقی احکامات میں نہیں ہے۔

سوال:

اہل بدعت اس جملے میں معنوی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت سے متعلق جتنا علم تجھے ہے اتنا ہی مجھے ہے کوئی زیادہ نہیں یہ مفہوم چند وجوہ سے غلط ہے:

① حضور ﷺ کو اب تک یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ جبرائیل ہیں۔

② اگر دونوں کو قیامت کا علم تھا تو پھر امارات سے جواب کیوں دیا گیر۔

③ قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے بالکل واضح ہے کہ قیامت کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر یہاں یہ کھینچا جانی صریح غلطی ہے غیب بمعنی ملکہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے جزئیات کا علم اگر کسی کو ہوا تب بھی کلیات کا علم کسی کو نہیں ہے۔

سوال: جبرائیل امین نے یہ سوال کیوں کیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔

جواب: جبرائیل نے آکر یہ سوال اس لئے کیا تاکہ آئندہ کوئی شخص قیامت سے متعلق سوال نہ کرے گویا اس سوال

و جواب سے سامعین اور امت کے تمام افراد کو قیامت سے متعلق سوالات سے منع کر دیا۔

سَوَال: بعض صوفیاء کو بعض مغیبات کا علم کیسے ہوتا ہے؟ کیا ان کے مکاشفات کو علم غیب کہا جاسکتا ہے؟

جواب: غیب کے کچھ مہادی اور اصول ہیں اور کچھ لواحقات ہیں۔ مہادی اور اصول مفاتیح الغیب کو تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا نہ ملک مقرب اور نہ نبی مرسل۔ لواحقات کو اللہ تعالیٰ کبھی مجبوتین پر ظاہر فرما دیتا ہے لیکن یہ پھر غیب نہیں رہتے ہیں۔ کیونکہ علم غیب وہ ہوتا ہے جو حواس خمسہ ظاہرہ کے توسط کے بغیر حاصل ہو جائے۔ کسی کے بتانے یا القاء و الہام کے ذریعے سے یا مکاشفہ کے ذریعے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب کی تعریف سے خارج ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے غیب کی تعریف اس طرح کی ہے:

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ الْمَرَادُ بِهِ الْخَفِيُّ الَّذِي لَا يَدْرُكُهُ الْحَسُّ وَلَا يَقْتَضِيهِ بَدَاهَةُ الْعَقْلِ۔

(مبطل ص ۱۱ ج ۱ ص ۱۸)

یعنی علم غیب وہ ہوتا ہے جو حواس خمسہ کے ادراک سے بالاتر ہو کر کسی کو حاصل ہو جائے۔ جس پر عقل کی دسترس نہ ہو لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ الہام، مکاشفات وغیرہ سے حاصل شدہ علوم یا تو اسباب کے ذریعے سے ہیں یا غیر یقینی ظنیات ہیں جو علم غیب سے خارج ہیں۔

نوادر حمیدی میں ہے کہ یہی گفتگو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے درمیان بھی ہوئی تھی لیکن وہاں سوال کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور جواب دینے والے حضرت جبرائیل تھے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ سوال حضرت جبرائیل اور جواب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

سورۃ النور ۹۰-۱۲۷

علامات قیامت

قال فاختبرني عن اماراتها: بفتح الهمزة جمع اماراة اي علامة وفي رواية عن اشراطها وفي رواية ساخبرك وسأحدثك عن اشراطها۔

قیامت کی علامات دو قسم کی ہیں۔ علامات صغریٰ اور علامات کبریٰ، علامات صغریٰ ظہور مہدی تک ہیں۔ اور خود ظہور مہدی اور خروج دجال و نزول عیسیٰ و خروج یا جوج ماجوج تا قیام قیامت سب علامات کبریٰ ہیں۔ اس حدیث میں ظہور مہدی سے پہلے واقع ہونے والی علامات صغریٰ مراد ہیں۔

قال ان تلد الامة ربعها: یعنی لونڈی اپنے مولیٰ کو جنے گی۔

یہاں سب سے پہلے یہ امر تشریح طلب ہے کہ لفظ "ربعها" میں تائے تانیث کیوں لائے ہیں حالانکہ یہاں لفظ رب بمعنی آقا و مولیٰ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تانیث اس لئے ذکر کی تاکہ رب العباد کے لفظ کے ساتھ لفظی اشتراک بھی نہ آئے۔ اگرچہ خصوصی اضافت کے ساتھ رب کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے۔

اس جملے کے سمجھنے کے لئے علماء نے کئی انداز سے اس کی تشریح و توضیح فرمائی ہے۔

اول:

یہ کہ نافرمانی بڑھ جائے گی یہاں تک کہ اولاد ماں باپ کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسا کہ سردار اپنی لونڈی سے کرتا ہے کہ وہ سردار سے گالی دیتا ہے، مارتا ہے یا خدمت میں رکھتا ہے۔ یہی سلوک اولاد بھی کرے گی۔ لڑکی کا ذکر اس لئے کہ یہ اطاعت گزار ہوتی ہے جب پردہ نشین لڑکی کا یہ حال ہوگا تو لڑکوں کا کیا حال ہوگا گو یا زمانہ کے انقلاب و انعکاس کی طرف اشارہ ہے۔ غلام آقا بن جائے گا تربیت حاصل کرنے والا مربی بن جائے گا۔ اس صورت میں دہشت کا لفظ مجازاً والدین کے لئے استعمال کیا گیا۔

دوم:

یہ ہے کہ بیٹی ماں پر نافرمانی کی کثرت کی وجہ سے ایسا حکم چلائے گی جس طرح سردار فی اپنی لونڈی پر چلاتی ہے۔

سوم:

یہ کہ اس سے اشارہ ہے کہ قرب قیامت میں شرفاء اور باعزت مقام والے لوگ ذلیل ہو جائیں گے اور ذلیل قسم کے لوگ عزت کے مقام پر آجائیں گے جس طرح ماں کا مقام عزت کا ہے پھر بیٹی آقا بن جائے گی تو معاملہ الٹ جائے گا۔

چہارم:

یہ کہ اس میں کثرت فتوحات اسلامیہ کی طرف اشارہ ہے کہ غلام اور آقا زیادہ ہو جائیں گے لونڈیوں کی کثرت ہو جائے گی تو لوگ فساد احوال کی وجہ سے لونڈیوں کو بیچنا شروع کر دیں گے اسی خرید و فروخت میں ایسا بھی ہو جائے گا کہ ماں اپنے بیٹے کے ہاتھ میں فروخت ہو جائے گی۔ تو اب بیٹا آقا ہے جس کو اس لونڈی ماں نے جنم دیا ہے تو لونڈی نے آقا کو جنم لیا۔

پنجم:

یہ کہ لونڈیوں کی اولاد میں سے بادشاہ بن جائیں گے تو یہ مائیں اس بادشاہ بیٹے کی رعیت میں آجائیں گی تو لونڈی نے آقا کو جنم دیا۔ حافظ ابن حجر علامہ خطابی ملا علی قاری علامہ سندھی اور مولانا اور لیس کاندھلوی رحمہ اللہ سب نے مندرجہ بالا توجیہات میں سے کوئی نہ کوئی توجیہ کی ہے۔

وان تری الحفاة العراة: یہ بھی انقلاب احوال کی طرف اشارہ ہے کہ:

کیسے کیسے دیے دیے ہو گئے دیے دیے کیسے کیسے ہو گئے؟

یتطاولون فی البنیان: یعنی عالیشان عمارتوں اور محلات میں ایک دوسرے پر فخر اور تکبر کرنے لگ جائیں گے۔ گویا بکریوں کے چرواہے جو اعجز خلقی اللہ واضعہم ہوتے ہیں میں انقلاب اور تغیر آجائے گا کہ وہ تکبر کرنے لگ جائیں گے۔ صرف اونٹوں والے ہی نہیں جو طبعاً متکبر ہوتے ہیں بلکہ بکریوں والے بھی متکبر ہو جائیں گے جو طبعاً متواضع ہوتے ہیں۔

الحفافة: جمع حافی شگے پاؤں پھرنے والے۔ "العراة" جمع "عاری" شگے بدن والے۔ "العائلة": حائل کی جمع ہے مفلس آدمی۔ "رعام": جمع راع بمعنی چرواہا۔ "الشاء": جمع شاة بکریاں۔ "الصم": احم کی جمع ہے بمعنی بہرا۔ البکم: بکم کی جمع ہے بمعنی گونگا یعنی حق کے سننے کہنے سے بہرے اور گونگے ہو گئے "یتطاولون" یعنی فخر و تکبر کریں گئے محلات بنانے میں مقابلہ کریں گے۔

قلبثت ملیا: ملاء پر ہونے کو کہتے ہیں ہاں ملیا زمانہ طویلہ کے معنی میں ہے۔ اب یہاں یہ اشکال آتا ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں اس ملیا کا تعین موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین دن کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے پہچانا کہ یہ کون تھا؟

ادھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ اس مجلس میں آنحضرت ﷺ نے بتا دیا کہ یہ جبرائیل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ ان دونوں روایتوں میں تعارض نظر آرہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سائل کی تلاش میں کئی صحابہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی چلے گئے۔ اور پھر وہ اپنے گھر گئے اور جب تین دن کے بعد حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اس سائل کون تھا؟ اور آپ کے چلے جانے کے بعد مجلس کے سامنے حضور ﷺ نے حقیقت حال بیان فرمادی کہ یہ جبرائیل تھے لہذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

قلت الله ورسوله اعلم: اعلم کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اللہ اور اس کے رسول کو تو اعلم بتا رہے ہیں اور اپنے آپ کو صرف عالم بتا رہے ہیں بلکہ یہاں اعلم کا لفظ اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ اصل فعل کے معنی میں آیا ہے جیسے "الصيف احر من الشتاء" کہ یہاں "احر" نفس حرارت کے معنی میں آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ موسم گرم ماسم سرما سے زیادہ گرم ہے حالانکہ جائزوں کا موسم گرم ہوتا ہی نہیں۔ صحابہ کرام نے ہمیشہ ادب کا لحاظ کر کے "الله ورسوله اعلم" کا جملہ استعمال کیا ہے۔

فانه جبرئيل: اسی اذا فوضتم العلم الى الله ورسوله فانه جبرئيل۔ اس عبارت میں فاجزائیہ کے آنے کی وجہ معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ کا علم کل اور اصلی ہے۔ اللہ کے بتانے سے رسول کو علم ہو جاتا ہے تو ادب کا تقاضا یہی ہے کہ "الله ورسوله اعلم" کہے اور صحابہ کرام نے ہمیشہ اس ادب کا خیال رکھا ہے۔

يعلمكم دينكم: یہاں دین اسلام ایمان و احسان اور دیگر علوم خود آنحضرت ﷺ نے بتا دیے لیکن چونکہ جبرائیل امین سائل تھے اور اچھا سوال نصف العلم ہوتا ہے اس وجہ سے مجازاً ان کی طرف "يعلمكم" کی نسبت کی گئی۔

اور چونکہ دین اسلام کے اول مخاطبین صحابہ کرام ہی تھے اس لئے "دينكم" فرمایا ورنہ یہ دین تو قیامت تک کے لوگوں کے لئے ہے۔ جبرائیل امین کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ کو پتہ چلا کہ یہ جبرائیل امین تھے چنانچہ دارقطنی کی تفصیلی روایت میں مذکور عبارت کے بعد یہ ہے:

"فخذوه عنه والذي نفسي بيده ما اشتبه على منذ اتاني قبل مرئي هذه وما عرفته حتى ولي".

اس روایت سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ورنہ اتنی طویل گفتگو میں آنحضرت ﷺ نے ان کو نہیں پہچانا اور جب اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تو پہچان لینا بس جب وحی کا کشن جڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے ورنہ نہیں سعدی بابا رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

کے پرسید ازاں گم کرد فرزند کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش ہوئے پیراہن شیدی چرا در چاہ کنعانش ندیدی
بکفت احوال ما برق جہاں است دے پیدا دو گہر دم نہاں است
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم
شیخ سعدی رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا:۔

علم غیبے کس نمی داند ہر پروردگار ہر کہ گوید ماہدغم تو ازو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتی تازہ گفتی جبرئیل جبرئیلش ہم نہ گفتی تا نہ گفتی کردگار
فی خمس: ائی علمہ تعین الساعۃ فی ضمن خمس لا یعلمہن الا اللہ۔

یہاں سوال یہ ہے کہ مغیبات صرف یہ پانچ تو نہیں ہیں نہ اس میں بند ہیں پھر صرف ان کا ذکر کیوں ہوا؟
جواب یہ ہے کہ یہ سائل کے سوال کے جواب میں چند مغیبات کا ذکر ہے حصر مقصود نہیں ہے۔

اب ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کلی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کسی نبی یا فرشتہ کو کلی علم نہیں دیا گیا اور علم جزئی شریعات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو وافر مقدار میں دیا تھا اور علم جزئی تکوینیات سے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو اتنا دیا تھا کہ تمام انبیاء کا علم اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ بنسبت دریا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلی علم کے مقابلہ میں کل اہل اللہ کا علم ایک قطرہ بنسبت دریا ہے۔

ثم قرأ ان الله عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما في الارحام وما تدرى نفس نفس ماذا
تکسب غدا وما تدرى نفس ہای ارض تموت ان الله علیہم خبیر۔ (نہمان)

منصور بادشاہ نے خواب میں موت کا فرشتہ دیکھا تو اس سے پوچھا کہ میری عمر کتنی باقی ہے موت کب آئے گی فرشتہ نے پانچ انگلیوں سے اشارہ کر دیا منصور پریشان ہو گیا کسی نے تعبیر دی کہ عمر میں پانچ دن باقی ہیں کسی نے کہا پانچ ماہ کا اشارہ ہے کسی نے پانچ سال کا کہا حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے جب پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ اشارہ ہے کہ وقت موت پانچ مغیبات میں سے ہے اللہ ہی کے پاس اس کا علم ہے۔

فوائد حدیث جبرائیل برائے طلباء دین:

① لباس میں سفید تر اور پاکیزہ صاف لباس پہننا چاہیے۔

۱ حضرت جبرائیل کے شدت سوادِ شعر سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم دین کے حصول کا اعلیٰ زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے پھر استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہئے۔

۲ طالب علم اپنے استاذ اور مربی کے بالکل قریب بیٹھا کرے یعنی ادب کے ساتھ سامنے قریب ہو کر بیٹھے۔

۳ مفید باتوں کا سوال کرنا چاہئے کیونکہ اچھا سوال نصف علم ہے۔

۴ اپنی لاعلمی پر شرم محسوس نہ کرے بلکہ جو بات معلوم نہیں تو صاف کہہ دیا کرے کہ مجھے معلوم نہیں۔

۵ طالب علم حصول علم کے زمانے میں لوگوں کے ساتھ تعلقات نہ بڑھائے بلکہ گنہگار اپنے مقصد میں لگا رہے گویا کوئی اس کو جانتا ہی نہیں جس طرح یہاں جبرائیل امین نے اپنے آپ کو چھپا کر گنہگار رکھا۔

۶ طالب علم کو چاہیے کہ ایسے علوم اور وسائل کا اہتمام کرے جو عقائد و اعمال سے متعلق ہوں جن کا دنیا و آخرت میں فائدہ واضح ہو۔

۷ حصول مقصد اور حصول علم کے بعد فوراً اپنے مقصود اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائے بیکار مدرس میں نہ پڑا رہے۔

۱۶ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

﴿۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةٌ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَإِقَامُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَالحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ (متفق علیہ)

تیسرے جگہ: نبی اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے ایک اس عقیدے کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (حاجت روا اور مشکل کشا عبادت اور بندگی کے لائق) نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، دوسرے نماز قائم کرنا، تیسرے زکوٰۃ ادا کرنا، چوتھے حج کرنا، پانچویں رمضان کے روزے رکھنا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: حضرت ابن عمر کا نام عبد اللہ ہے، مکہ میں اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے، بعثت نبوی سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور بالاتفاق جنگ خندق میں شریک ہوئے، جنگ بدر و احد میں ان کی عمر ۱۵ سال سے کم تھی، اس لئے جنگ میں شریک نہیں ہو سکے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی طرف دنیا لپک کر آئی اور وہ اس کی طرف مائل نہ ہوا ہو سوائے عمر اور ابن عمر کے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ علم میں کامل، تقویٰ میں اعلیٰ مقام پر فائز، صاحب احتیاط اور صاحب فکر اور قبیح سنت صحابی تھے۔ حجاج بن یوسف کی سازش سے ایام حج میں شہید کر دیے گئے، ۳۷ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں دنیا سے چلے گئے۔

بنی الاسلام علی خمس: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کی تشبیہ ارکان کے دوام و استمرار میں ایک خیمہ و

مکان سے دی ہے، جس میں ایک اصل عمود و ستون ہوتا ہے اور باقی اطناب و اودا تہوتے ہیں، اصل عمود پر خیمہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے قطب پر باقی ارکان گھومتے ہیں، وہ قطب اور مرکزی ستون کلمہ شہادت ہے اور باقی ارکان اطناب و اودا تہوتے ہیں۔ اگر خیمہ کے اطناب و اودا تہوتے سے کنارے کا کوئی ستون گر جاتا ہے تو اس طرف میں نقص تو آ جاتا ہے لیکن خیمہ کھڑا رہتا ہے اور اگر کناروں کے سارے ستون گر جائے مگر بیچ کا عمود اعظم باقی ہو تو نام کا خیمہ پھر بھی باقی ہوگا، اگرچہ اس سے کام نہیں لیا جاسکتا، نہ وہ سایہ کے قائل ہوگا اور نہ گرمی سردی سے بچاؤ کی صلاحیت رکھے گا لیکن اگر خیمہ کا عمود اعظم اور مرکزی قطب کا ستون گر گیا جس پر خیمہ کے قیام کا مدار ہے تو اب نام کا خیمہ بھی باقی نہیں رہے گا اگرچہ کناروں کے چاروں ستون موجود ہوں مگر وہ خیمہ کو گرنے سے نہیں بچا سکیں گے اور یہ خیمہ زمین بوس ہو جائے گا، بعینہ یہی تشبیہ اور یہی صورت حال اسلام کی عالیشان عمارت کی ہے، جس میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج چار ستون ہیں جو کناروں میں واقع ہیں اور کلمہ شہادت بیچ کا عمود اعظم ہے، اگر باقی ارکان میں نقص آتا ہے تو اس عمارت میں تو نقص آ جائے گا مگر عمارت باقی رہتی ہے لیکن اگر کلمہ شہادت کے رکن میں نقص آ گیا اور اس کا وجود قائم نہ رہا یا قائم ہونے کے بعد ختم ہو گیا تو اب اسلام کی عمارت باقی نہیں رہ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جنارے میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی ملاقات مشہور شاعر فرزدق سے ہوئی تو آپ نے ان سے پوچھا:

مَا أَعْدَدْتَ لِمِثْلِ هَذَا الْمَقَامِ، فَقَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مِنْذُ كَذَا سَنَةٍ فَقَالَ هَذَا الْعَمُودُ
فَأَيْنَ الْأُطْنَابُ؟

تو اس حدیث میں پانچ مشہور اصول دین اور مشہور ارکان کا ذکر کیا گیا ہے جو فرضیات عینیہ ہیں، اس کے علاوہ باقی تمام اعمال اس کے ضمن میں ہیں کیونکہ شہادت سے مراد تسلیم مجملع ما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس میں اسلام کے تمام احکام آ گئے، خلاصہ یہ ہے کہ مشہور ارکان کا ذکر کیا، باقی کی نفی مراد نہیں یعنی فرضیات عینیہ کا ذکر کیا، فرضیات کفائیہ وغیرہ کی نفی مقصود نہیں۔

سَبْعُونَ: فقہاء کرام نے قبول اسلام کے لئے صرف شہادتین کو کافی سمجھا ہے حالانکہ بناء اسلام پانچ اشیاء پر ہے؟

جَوَابُ: اس کا جواب واضح ہے کہ شہادتین کے ضمن میں پورا اسلام اپنے تمام محاسن کے ساتھ ملحوظ اور مراد ہے۔

سَبْعُونَ: یہ ہے کہ اس روایت سے اسلام کا صرف پانچ چیزوں پر معنی ہونا معلوم ہوتا ہے اور اگلی روایت میں بضع و سبعون شعبۃ فرمایا ہے تو تطبیق کیا ہے؟

جَوَابُ: اس کا جواب بھی گزر گیا ہے کہ پانچ تو مشہور و معروف ارکان ہیں اور ان معروف اور غیر معروف سب کو ملا کر ستر سے کچھ اوپر بنائے جاتے ہیں۔

شہادۃ: اعراب کے اعتبار سے یہ کلمہ مجرور بھی ہے کہ یہ بدل ہے خمس سے اور وہ مجرور ہے اور منصوب بھی ہے اعنی فعل مخذوف کی وجہ سے "ای اعنی شہادۃ... الخ" اور یہ کلمہ مرفوع بھی ہے کہ یہ مبتداء مخذوف کی خبر ہے یعنی "احداھما شہادۃ... الخ"۔

شہادتین کو عام طور پر ایک خصلت شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں تلازم ہے کبھی کبھی الگ بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ حج کے ساتھ استطاعت کا ذکر بوجہ شہرت نہیں کیا، اقام الصلوٰۃ میں نفس نماز مقصود نہیں بلکہ تمام آداب و فرائض و محاسن کے ساتھ اس کا قیام مقصود ہے، ایفاء الزکاۃ میں استمرار کی طرف اشارہ ہے حج کا درجہ موخر ہے کیونکہ حج سات یا آٹھ یا نو ہجری کو فرض ہوا ہے اور روزہ تین ہجری میں فرض ہوا مگر ترتیب کا لحاظ راوی نے نہیں رکھا، یہ تصرف روادا میں سے ہے، اس حدیث سے مرجعہ پر صریح رو ہے جو اعمال کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ارکان خمسہ میں ترتیب:

- ① عبادات دو قسم پر ہیں یا قلب سے متعلق ہوں گی یا غیر قلب سے متعلق ہوں گی، اول کی مثال شہادتین ہے جو تصدیق قلبی کا نام ہے، غیر قلب سے جو متعلق ہیں وہ پھر دو قسم پر ہیں، ایک وہ ہیں جن کا تعلق کرنے سے ہے، دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق کسی فعل کے چھوڑنے سے ہے، یہ دوسری قسم روزہ ہے جس میں کھانا پینا اور جماع ترک کیا جاتا ہے، اول قسم عبادت پھر تین قسم پر ہے، یا صرف بدن سے متعلق ہوگی وہ نماز ہے، یا صرف مال سے متعلق ہوگی، وہ زکوٰۃ ہے، یا مشترک ہوگی وہ حج ہے۔
- ② یا ترتیب کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی صفات ہیں، صفات جمالہ اور صفات جلالہ جلالہ تو صلوٰۃ کا تعلق صفات جلالہ سے ہے کہ بندہ معبود کے سامنے کمال عبودیت اور کمال عاجزی سے پیش ہو کر آتا ہے اور ذوالجلال کے سامنے زمین پر ناک رگڑتا ہے۔ زکوٰۃ بھی صفات جلالہ سے ہے کیونکہ انسان مسک ہے "و افہ لحب الخیر لشدید" اس حالت میں مال خرچ کرنا اور رضائے خدا میں زکوٰۃ دینا عظمت جلال کی جلالت کی نشانی ہے۔
- روزہ اور حج مظہر جمال ہیں اول میں عاشق اپنے محبوب کے لئے بھوکا رہتا ہے اور دوسرے میں عاشق محبوب کے لئے گھر بار بیوی بچوں کو چھوڑ کر محبوب کے مکان کی طرف جاتا ہے وہاں پہنچ کر طواف کرتا ہے۔
- کبھی دوڑتا ہے کبھی درود یوار کو بوسہ دیتا ہے۔

امر علی الدیار دیار لیلی اقبل ذا الجدار وذا الجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی ولكن حب من سكن الدیارا
ومن عادتی حب الدیار لاهلہا وللناس فیما یعشقون مذاہب

- ③ یا ارکان خمسہ کی ترتیب میں یوں کہیں کہ ارکان خمسہ میں سے پہلے شہادتین ہے یہ قولی عبادت ہے اور زبانی طور پر محبوب کا تذکرہ ہے عاشق کا سب سے پہلا کام یہی ہوتا ہے لطم و نثر کے سارے داؤ پیچ اسی زبانی تذکروں کے گرد گھومتے پھرتے ہیں۔ دوسرا کام محبوب کی انتہائی تعظیم ہوتی ہے یہی صلوٰۃ اور نماز ہے جو مجموعہ تعظیم الہی ہے۔ عاشق کا تیسرا کام محبوب کے لئے مال لٹانا ہوتا ہے زکوٰۃ اسی کا نام ہے۔ عاشق کا چوتھا کام محبوب کے لئے بھوکا رہنا ہے روزہ اسی کا نام ہے۔ عاشق کا

پانچواں کام محبوب کے لئے اپنا گھر بار چھوڑنا ہوتا ہے اور محبوب کے گھر اور اس کے کھنڈرات میں جا کر گھومنا ہوتا ہے۔ حج اسی کو کہا جاتا ہے اس لئے فرمایا بنی الاسلام علی خمس... الخ۔

۱۴۰۹ھ

ایمان کی شاخیں

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَذْكَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الظَّرِيقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ﴾ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ تو "لا الہ الا اللہ" کا اقرار ہے اور سب سے کم تر شعبہ کسی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا ہے اور حیاء ایمان کی اہم شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: ہریرہ: ہریرہ کی تصغیر ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام و نسب میں بہت اختلاف ہے، اصل نام میں تقریباً تیس اقوال ہیں مشہور یہ ہے کہ آپ کا نام جاہلیت میں عبدالشمس یا عبد عمرو تھا۔ اسلام لانے کے بعد ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمان تھا، احمد و حاکم نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں صحیح تر تحقیق یہ ہے کہ ان کا نام اسلام میں عبدالرحمان بن صخر تھا، آپ کا تعلق دوں قبیلہ سے تھا، آپ کی کنیت اتقی غالب آگئی کہ گویا آپ کا اور کوئی نام ہی نہ تھا، ۷ ہجری جنگ خیبر کے موقع پر آپ اسلام لائے تھے، پھر آپ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ چٹ گئے، ملازمہ و مواظبہ کیا، علم دین سیکھنے کے شوقین تھے، بھوکے پیٹ رہتے تھے، حضور اکرم ﷺ جہاں جاتے آپ ساتھ رہتے، اس ساتھ رہنے اور آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے تمام صحابہ میں سب سے زیادہ تیز فہم نظر کے مالک تھے، امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آٹھ سو سے زیادہ صحابہ و تابعین نے آپ سے علم حاصل کیا ہے۔

ابو ہریرہ کنیت پڑنے کی وجہ خود ابو ہریرہ کی روایت سے ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے، فرمایا کہ میں نے ایک دن آستین میں ہلی اٹھا رکھی تھی کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ یہ ہلی ہے یعنی "ہریرہ" آپ نے فرمایا: فانت ابو ہریرہ۔ بس یہ کہنا تھا کہ اصل نام غالب ہو گیا اور کنیت غالب آگئی، آپ کی کل مرویات ۵۳۶۳ ہیں ۵۹ھ کو مدینہ منورہ میں ۸۷ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

الایمان: ای ثمرات الایمان وفروعه لان الایمان هو التصديق البسيط۔

بضع: وبضعة دونوں روایتیں ہیں، مونث کے لئے بضعة تائید کے ساتھ اور مذکر کے لئے بضع ہوتا ہے، پھر تین سے نو تک عدد میں زیادہ تر استعمال ہوا، بضع کا مادہ جتنا الٹ پلٹ کر بکے رکھو گے سب میں ٹکڑا اور قطعہ کا مفہوم ہوگا مثلاً بضع، عبض، ضبع، ضبعة غضب سب قطعہ کے معنی پر ہے۔

سُئِلَ: یہاں ایک واضح اشکال ہے کہ اس حدیث میں "ہضع وسبعون" کا ذکر ہے، بخاری شریف میں "ستون" کا ذکر ہے، ایک روایت میں صرف "ستون" ہے، ایک اور میں "اربع وستون" کا ذکر ہے، سب میں تضاد ہے اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ عدد اقل عدد اکثر کی نفی نہیں کرتا ہے بلکہ ساکت رہتا ہے جس میں تعارض نہیں آتا ہے۔
ثانی: یہ ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ من جانب اللہ تمام شعبے مکمل نہ تھے، تو پہلے ساٹھ کا ذکر تھا، پھر بذریعہ وحی ستر کا حکم آ گیا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ راجح "ہضع وسبعون" والی روایت ہے کیونکہ یہ کثرت سے آئی ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ بعض شعبوں میں تداخل کر کے کم کا ذکر کیا جاتا ہے اور جب تداخل نہ کیا جائے تو زیادہ کا ذکر ہو جاتا ہے۔ ویسے ان اعداد کو اگر تکثیر پر حمل کیا جائے تو پھر تحدید کا مسئلہ ہی نہیں رہتا ہے تو پھر تعارض ہی نہیں، تکثیر کے لئے عدد کا آنا معروف ہے۔

شعبۃ: لغت میں شاخ اور غصن الشجر کو کہتے ہیں یہاں فصلت محمودہ فصلت حمیدہ مراد ہے۔

فافضلها: فالتفریعیہ تفصیلیہ ہے یا جزائیہ ہے یعنی اذا کان الایمان ذا شعب فافضلها..... الخ۔
وادداها: اگر ادنیٰ ذو سے قرب کے معنی میں ہے تو مطلب یہ ہوگا "اقربها منزلة" یعنی قرب و تقرب کے حصول میں قرب تر۔ **اماطة الاذی:** ہے، ایک روایت میں "ارفعها" بھی ہے جو ذو بمعنی تقرب کی تائید ہے اور اگر ادنیٰ دنائت سے لیا جائے تو پھر کم تر اور تغیر کے معنی میں ہوگا۔ یعنی کم تر شعبہ "اماطة الاذی" ہے سیاق سابق سے یہ زیادہ مناسب ہے۔
اماطة: باب افعال کا مصدر ہے، ہٹانے کے معنی میں ہے "الاذی" تکلیف دہ اور گندی چیز جیسے پتھر کاٹنے، مٹا دینا وغیرہ۔
تو اس حدیث میں شعبہ اولیٰ عبادات قولیہ سے متعلق ہے، شعبہ ثانیہ طاعات فعلیہ سے متعلق ہے یا پہلا شعبہ معاملہ مع الحق سے وابستہ ہے اور شعبہ ثانیہ معاملہ مع الخلق سے وابستہ ہے۔

والحیاء شعبۃ من الایمان: سوال یہ ہے کہ حیاء خود ایمان کے شعبوں میں داخل ہے پھر اس کو الگ کیوں ذکر کیا گیا؟
اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے اور یہ حیاء کی شان بڑھانے کے لئے ہے یہی وجہ ہے کہ شعبہ میں توین تعظیم کے لئے ہے یعنی حیاء ایمان کے شعبوں میں سے ایک عظیم الشان اور اہم شعبہ ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاء تمام شعبہ ایمان پر حاوی ہے اور تمام شعبوں کے لئے سبب اور داعی ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے انسان خصائل حمیدہ حاصل کر سکتا ہے اور اس پر قائم رہ سکتا ہے اس لئے اس کو الگ ذکر کیا گیا۔

حیاء کی تعریف اور قسمیں:

حیاء کی بڑی دو قسمیں ہیں: ایک حیاء ایمانی دوسری حیاء طبعی، یہاں حدیث میں حیاء سے حیاء ایمانی شرعی مراد ہے جس کی ایک تعریف اس طرح ہے: "هو خلق يمنع الشخص من الفعل القبیح بسبب الایمان"۔

یعنی حیاء اس ملکہ اور خلق کا نام ہے جو آدمی کو ایمان کی وجہ سے قبیح فعل سے منع کرتی ہے۔ جیسے نگاہ ہونا، لوگوں کے سامنے فحش

حرکات کرنا، زنا کرنا، وغیرہ وغیرہ، ان چیزوں سے یہ ایمانی حیا منع کرتی ہے۔

حیا ایمانی کی دوسری تعریف جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نظارہ کر کے اپنی تصصیرات اور کوتاہیوں کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی حیا ہے۔

حیا ایمانی کی تیسری تعریف اس طرح کی گئی ہے "ان لا یزالک مولاک حیث مہاک" اس تعریف کے پیش نظر حیا بعینہ احسان کا مقام ہے، اس لئے یہ حدیث، حدیث جبرائیل کے لئے بمنزلہ اجمال ہے، حدیث جبرائیل میں تین چیزوں کا بیان تھا: ایمان، اسلام اور احسان، اس حدیث میں "فأفضلها" سے ایمان کی طرف اشارہ ہے اور "ادناها" میں اسلام کی طرف اشارہ ہے اور "والحیاء" میں احسان کی طرف اشارہ ہے۔

حیا طبعی کی تعریف اس طرح ہے "هو تغیر وانکسار یعتری المؤمن من خوف ما یلاہ علیہ" مطلب یہ ہے کہ قابل ملامت کام کے خوف سے جب کسی شخص کے اعضاء اور بدن پر انقباض طاری ہو جاتا ہے۔ یہی حیا طبعی ہے۔ ان دونوں تعریفوں کے فرق اور اس تشریح سے علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ حیا تو غیر مسلموں میں بھی ہوتی ہے تو کیا ان میں ایمان کا شعبہ آگیا؟

جواب واضح ہے کہ حدیث میں ایمانی حیا کو ایمان کا شعبہ کہا گیا ہے، طبعی حیا حدیث کا مصداق نہیں۔

دوسرا جواب علی حد فتح یفتح ہے یعنی فتح یفتح باب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں حرف حلقی ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں حرف حلقی آجائے وہاں فتح یفتح کا باب ہوگا اسی طرح ایمان کے لئے حیا ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جہاں حیا ہو وہاں ایمان ہوگا۔ حیا کی چند اقسام بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

۱ حیا جنایت:

جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی حیا تھی کہ سر جھکائے جنت میں بھاگ رہے ہیں، اللہ نے فرمایا کیوں بھاگتے ہو؟ فرمایا: "حیا منک یا اللہ"۔

۲ حیا حشمت:

جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذی سے متعلق مسئلہ حشمت و حجاب کی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پوچھا بلکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ وغیرہ کے واسطے سے سوال کیا۔

۳ حیا اجلال:

کہ جلال کی وجہ سے حیا آئی جیسا کہ "تسر بل اسم الفیل یجنأ حیہ حیا من اللہ لا جلالہ" شعب ایمان پر کئی علماء نے کئی تصنیفات لکھی ہیں۔

مومن اور مسلم کا مفہوم

﴿ہ﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ قَالَ إِنْ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ أَيُّ الْمُسْلِمِينَ خَيْرٌ؟ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذا) سے مسلمان محفوظ رہیں اور اصل مہاجر وہ ہے جو اللہ کی شیع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے، یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کی روایت میں ارشاد ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ کے ضرر سے مسلمان محفوظ رہیں۔

توضیح: عمرو: داؤد کے ساتھ پڑھا جاتا ہے تاکہ عمر اور عمرو میں فرق آجائے، عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قریشی ہیں، اپنے والد صاحب سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، باپ سے گیارہ بارہ یا تیرہ سال چھوٹے تھے، کثیر العلم اور کثیر العبادۃ صحابی تھے، کثرت سے رونے کی وجہ سے آخری عمر میں بینائی چلی گئی حدیث کے کاتب تھے۔ مکہ یا طائف اور یامصر میں ۵۶ ہجری میں انتقال کر گئے تھے رحمہ اللہ رحمة واسعة۔

المسلم: اس سے کامل مسلمان مراد لیا جاتا ہے تاکہ یہ اعتراض نہ آئے کہ جس کے ہاتھ و زبان سے عام مسلمان محفوظ نہ ہوئے تو کیا وہ شخص مسلمان نہیں رہے گا؟ تو عام شارحین کامل مسلمان مراد لیتے ہیں لیکن اس تقدیر نکالنے سے شارع علیہ السلام کی غرض فوت ہو جاتی ہے، اس لئے کامل کے ساتھ ترجمہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ حصر ادعائی ہے کہ مسلمان تو بس وہی ہے جس کے ہاتھ و زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

یہاں مبتدا اور خبر دونوں معروف ہیں اس کا فائدہ بھی یہی حصر ہے نیز عربی محاورہ بھی ہے کہ "الناس العرب، المال الابل" یہ سب حصر ادعائی کے قبیل سے ہیں یعنی افضل المال الابل، افضل الناس العرب تو الف الام جنسی درج کے لئے ہے، شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ علمی تحقیق اور قیودات کی تدقیق و تحقیق کی حد تک تو یہ قید لگانا درست ہے لیکن یہ تاویل اس لئے مناسب نہیں کہ اس سے کلام میں زور باقی نہیں رہتا اور مقصود شارع فوت ہو جاتا ہے، اس قسم کی تمام احادیث کا یہی مطلب لینا چاہیے۔

یعنی مسلم تو وہی ہے جس میں سلامتی ہو مہاجر تو وہی ہے جس میں ہجرت عن المعاصی ہو، مجاہد تو وہی ہے جس میں جہد فی العمل ہو، وہ کیا مسلمان جس میں سلامتی کا مادہ نہیں، وہ کیا مہاجر جس میں ہجرت کا مادہ نہیں اور ہجرت کی صفت نہیں، وہ کیا مجاہد جس

میں جہد عمل اور مشقت عبادت نہیں۔ ۱۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: یہاں یہ اعتراض ہے کہ سلامتی کی صفت اگر کسی غیر مسلم میں آجائے یا مسلم میں صرف سلامتی ہو، باقی ارکان نہ ہوں تو کیا وہ بھی کامل مسلم ہو جائے گا؟

جواب: یہ باب فتح یفتح کے قبیل سے ہے کہ اس کے لئے حرف حلقی کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں حرف حلقی آجائے وہاں فتح یفتح کا باب ہوگا، اسی طرح مسلم کے لئے سلامتی ضروری ہے لیکن اگر یہ صفت غیر مسلم میں آجائے تو ضروری نہیں کہ مسلمان کہلائے، مسلمان کے لئے یہ اوصاف ضروری ہیں۔

المسلمون: یہاں ایک اشکال ہے کہ ایذا رسانی سے حفاظت کو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا گیا حالانکہ ناجائز ایذا رسانی تو کسی کافر بلکہ جانور کی بھی منع ہے جس طرح کہ احادیث و قرآن میں اس کی تصریح ہے تو یہاں المسلمون کو کیوں خاص کیا گیا ہے۔

جواب: چونکہ مسلمانوں کی ایذا رسانی سے بچنے کی اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے، یہ قید احترازی نہیں بلکہ قید اتفاقی ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے ورنہ ناحق طور پر ایذا کسی مردوزن، مسلم وغیر مسلم بلکہ جانور کی بھی جائز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں المسلمون کی جگہ من سلم الناس من لسانہ ویدۃ کے الفاظ آئے ہیں اور المؤمن من امنۃ الناس علی دماءہم و اموالہم کے الفاظ مذکور ہیں۔ ۲۔

اس کے بعد یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدود اللہ کی تنفیذ اور اجراء، تعزیرات، ضرب اطفال، جہاد فی سبیل اللہ یہ سب امور اصلاح کے لئے ہیں، یہ عرفان ایذا نہیں یا شرعاً مستثنیٰ ہیں اور "المسلمون" کہہ کر جہاد کو الگ کر دیا گیا ہے کیونکہ جہاد کفار سے ہوتا ہے، بہر حال حدیث میں بلا و جہاد اور بلا غرض صحیح ناحق طور پر ایذا رسانی سے منع کیا گیا ہے صحیح وجہ اور معقول سبب سے سزا دینا منع نہیں ہے۔

من لسانہ: ایذا لسانی میں سب و شتم، لعن طعن، غیبت، چغلیخوری، بہتان وغیرہ سب داخل ہیں، زبان کو "ید" پر مقدم کیا اس لئے کہ زبان کی ایذا، زندوں، مردوں، حاضرین، غائبین، اگلوں، پچھنوں اور ابرار و فجار سب کو عام ہے یا اس لئے مقدم کیا کہ زبان کی کاٹ بڑی سخت ہوتی ہے تو اس کی ایذا عام بھی ہے اور تام بھی ہے کسی نے عربی میں کہا ہے۔ ۳۔

جراحات اللسان لها التیام ولا يلتام ما جرح اللسان ۴۔

کسی نے فارسی میں کہا۔ ۵۔

جراحت نیزہ را گرد بدارد و لے جرحے زباں را نیست دارو
من لسانہ: کا لفظ اختیار کیا "من قولہ" نہیں فرمایا کیونکہ بعض اوقات خود زبان کی کیفیت فعلی سے ایذا دی جاتی ہے،

مثلاً زبان نکال کر مذاق و استہزاء کیا جاتا ہے تو "لسانہ" اس کو بھی شامل ہے۔

ویدئہ: ہاتھ کی ایذا اور سانی میں ضرب، قتل، ہدم، دھکا دینا اور کسی کے خلاف ناجائز تحریر لکھ دینا یا ہاتھ سے اشارہ کر کے ایذا پہنچانا سب داخل ہیں۔

ہاتھ بول کر کنایہ سب اعضاء سے کیا گیا ہے کیونکہ ہاتھ ہی سے تمام افعال کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے بطور خاص ہاتھ کا ذکر ہوا ہے، ہاتھ سے مراد ظاہری ہاتھ بھی ہے اور اس سے معنوی ہاتھ یعنی کسی چیز پر قبضہ جمانا اور ناجائز طور پر دہانا بھی داخل ہے۔ لہذا والمہاجر: ایک ہجرت ظاہری ہوتی ہے جو ترک وطن لاجل الدین ہوتی ہے اس ہجرت سے متعلق پہلے بھی بحث ہوئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کسی مقام پر تفصیل آئے گی، دوسری ہجرت باطنی ہوتی ہے یعنی "ترک ما تدعو الیہ الدفوس الامارة" یا "ترک ما ملہی اللہ عنہ" یہ دوسرا اطلاق لغوی مفہوم کی روشنی میں ہوتا ہے جس میں مہاجر کے مبداء اشتقاق کے حوالہ سے بات ہوئی ہے۔

مثلاً مذکورہ حدیث میں یہی مفہوم ہے کہ ایک شخص گھر یا رجسٹرڈ کروطن و اعزہ سے الگ ہو جاتا ہے، لحد لحد مشقتیں اٹھاتا ہے، یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ یہ شخص دور جا کر اپنے رب کی اطاعت کرے اور گناہوں سے اجتناب کرے، اب اگر ایک مہاجر گناہ کو ترک نہیں کرتا ہے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو مہاجر کہا جائے۔

ای المسلمین خیر: یعنی مسلمانوں میں سب سے بہتر مسلمان کون ہوتا ہے۔

سوال: یہاں ایک مشہور اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ احادیث میں "ای المسلمین خیر" کی طرح "ای الاسلام احب" یا "ای الاعمال الفضل" وغیرہ مختلف سوالات، آنحضرت ﷺ سے کئے گئے ہیں اور سب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ ان سب کا جواب بظاہر ایک ہی آنا چاہئے اس لئے کہ سب سے افضل تو ایک ہی عمل ہو سکتا ہے لیکن احادیث میں جوابات مختلف آرہے ہیں؟

چنانچہ یہاں مذکورہ حدیث میں "من سلم المسلمون من لسانہ" آیا ہے، بعض روایات میں "ای الاسلام خیر" کے جواب میں "تطعم الطعام وتقرأ السلام" آیا ہے، بعض روایات میں "ای الاعمال الفضل" کے جواب میں "الصلوة لوقعتها" آیا ہے اور اسی سوال کے جواب میں بعض جگہ "الایمان باللہ" آیا ہے اور بعض جگہ "الجهاد فی سبیل اللہ" آیا ہے اور بعض میں "ہر الوالدین" آیا ہے، اس قسم کے اور سوالات و جوابات احادیث میں مذکور ہیں، جب سوال ایک ہی ہے مقصود بھی ایک ہے کہ افضل کون سا عمل ہے تو جوابات کیوں مختلف آئے ہیں؟

جوابات:

● سائلین کے احوال کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے جس میں جو کمی محسوس کی گئی اسی کی ترغیب میں جواب دیا گیا، یا جس میں جو استعداد دیکھی اسی کے موافق دیا۔

● زمانے کے احوال کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے، حج کے زمانہ میں حج کی ترغیب کے لئے اس کو سب سے افضل کہا، جہاد کے زمانے میں جہاد کو سب سے افضل کہا، نمازوں کے اوقات کے وقت نماز کی ترغیب دے دی گئی، کسی اور قربانی و ایثار کے وقت اس کی ترغیب کو افضل کہہ دیا گیا۔

● امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ افضل ایک نوع ہے جس کے تحت ایک فرد نہیں بلکہ کئی افراد ہیں اب جن جن اشیاء پر فضیلت کا حکم لگایا گیا ہے وہ سب اسی نوع کے تحت داخل ہیں یہ افراد ایک دوسرے کے معارض نہیں بلکہ معاون و موافق ہیں۔
● علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فضیلت کے اعتبارات مختلف ہیں مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں "ارحم امۃ" کے اعتبار سے حضرت عمر "اشدھم فی امر اللہ" کے اعتبار سے افضل ہیں، حضرت عثمان "اصد قہم حیا" کے اعتبار سے افضل ہیں اور حضرت علی "اقصاھم" کے لحاظ سے افضل ہیں تو کوئی تضاد و تعارض نہیں، جہات فضیلت مختلف ہیں۔

۱۹ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ

حضور اکرم ﷺ سے محبت کے درجات

﴿۶﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری و مسلم)
توضیح: انس بن مالک بن نضر الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ، دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو نبی اکرم ﷺ کے پاس اس وقت لے آئیں جب کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی والدہ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تھا، ام سلیم رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے فرمایا "خوید ملک ادع اللہ لہ" آنحضرت ﷺ نے مال و اولاد کی برکت کی دعا اس طرح فرمائی: "اللہم بارک فی مالہ وولدہ واطل عمرہ واغفر ذنبہ" اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ خود فرماتے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے ۹۸ بچے دفن کئے ہیں پھل کا یہ عالم تھا کہ سال میں دو دفعہ فصل آتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم حدیث و فقہ کے لئے بطور معلم بصرہ بھیجا تھا، فرمایا کہ اب طول عمر سے اکتا گیا ہوں اور آنحضرت ﷺ کی آخری دعا مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ دس سال تک بطور خاص حضور اکرم ﷺ کے خادم رہے اور سو سال سے کچھ زیادہ عمر پا کر بصرہ میں ۹۳ھ میں انتقال کر گئے۔

احب الیہ من والدة: احب محبوب کے معنی میں ہے۔ والدہ: عاقل کے نزدیک اہل و مال بلکہ اپنے نفس سے بھی والد اور ولد معزز ہوتے ہیں چنانچہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے مگر ان کو بچاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث انس میں "نفس" کا لفظ نہیں اور دوسری روایات میں ہے اس میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب والد کا لفظ آگیا تو والد تو نفس سے زیادہ عزیز ہے لہذا نفس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حدیث میں "والد" کو "ولد" پر مقدم کیا ہے کیونکہ والد وجود کے اعتبار سے مقدم بھی ہے اور معظم بھی ہے۔ اور اگر ولد مقدم ہو جیسے صحیح مسلم کی روایت میں ہے تو پھر شفقت کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے، والد سے مراد من لہ الولد ہے جو ماں کو بھی شامل ہے لہذا والد سے مراد والد اور والدہ دونوں ہیں، یہ سب بطور تشبیل ہے، مراد عام اعزہ اصول و فروع نفس اور مال ہے اس کے بعد "والناس اجمعین" میں تعیم بعد تخصیص ہے جس میں تمام انسان آگئے۔

اقسام محبت:

ابن بطال رحمہ اللہ نے محبت کو تین انواع پر تقسیم کیا ہے:

● محبت اجلال و عظمت جیسے والدین سے محبت ہوتی ہے۔

● محبت شفقت جیسے اولاد کی محبت ہے۔

● محبت لذت جیسے میاں بیوی کی محبت ہوتی ہے اس حدیث میں ان تینوں قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"والد" سے پہلی قسم، ولد سے دوسری قسم اور والناس اجمعین سے تیسری قسم کی طرف اشارہ ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ محبت یا بڑے سے ہوتی ہے یا چھوٹے سے اور یا مساوی سے ہوتی ہے۔ حدیث میں والدہ سے بڑے، والدہ سے چھوٹے، والناس اجمعین سے مساوی کی طرف اشارہ ہے تینوں قسم محبت آگئی۔

یہاں یہ مشہور اشکال ہے کہ اس حدیث میں محبت رسول کو ایمان کے لئے معیار بنایا گیا ہے جب کہ طبعی محبت والدین اور اولاد کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے تو پھر کون مومن رہے گا، نیز محبت غیر اختیاری چیز ہے اس کو ایمان کا معیار کیسے بنایا گیا؟
جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ محبت کی تین قسمیں ہیں:

اول: محبت طبعی ہے جیسے اولاد والدین وغیرہ سے محبت ہوتی ہے، یہ غیر اختیاری ہوتی ہے۔ یہ قسم خارج عن الہمٹ ہے کیونکہ "لا یكلف الله نفسا الا وسعها" ہے، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں طبعی محبت مراد نہیں۔

دوم: محبت عقلی ہے وہ یہ کہ ایک کام خواہش کے خلاف ہے طبیعت اس سے انکار کرتی ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ اس میں فائدہ ہے تو یہ فیض اس کام کو کرتا ہے یا اس چیز کو استعمال کرتا ہے اگرچہ مزاج اور خواہش کے خلاف ہے مثلاً مریض ہے وہ کڑوی دوا کو طبعاً کمرہ سمجھتا ہے نہار منہ کر لے گا پانی سوہان روح سمجھتا ہے مگر عقلاً بیماری کے پیش نظر اس کو اچھا سمجھتا ہے

کیونکہ اس میں شفاء ہے بالکل اسی طرح یہاں یہ محبت ہے کہ مثلاً حضور ﷺ کا حکم آ جائے کہ یہ کام کرو اور والدین و اولاد کا حکم آ جائے کہ یہ کام نہ کرو تو اگرچہ طبعی میلان والدین کی طرف ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا حکم مان لو کیونکہ اس میں اخروی فائدہ ہے مثال کے طور پر حضور اکرم ﷺ کسی کو اپنے والدین کے قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں اولاد کے قتل کا حکم دیتے ہیں کیونکہ وہ کفار ہیں یا کفار سے جہاد کا حکم دیتے ہیں تو طبعاً یہ کام بھاری ہے مگر عقل کہتی ہے کہ فلاح دارین اسی میں ہے اس پر عمل کرنا ہے تو وہ شخص اس پر عمل کرتا ہے یہ عقلی تقاضا ہے، حدیث میں ہم سے جس محبت کا مطالبہ ہے وہ یہی محبت عقلی ہے نہ کہ محبت طبعی جو غیر اختیاری بھی ہے۔

سوم: محبت ایمانی شرعی ہے یہ بھی یہاں مطلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ "ایثار جمیع اغراض المحبوب علی اغراض غیرہ حتی القریب والنفس و هذا المحب هو النashi عن الایمان والجلال والتوقیر والرحمة"۔

بعض شارحین نے "ایو من" میں "لا کمال کے لئے لیا ہے کہ کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ آپ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ:

لانت احب الی من کل شیء الا من نفسی قال علیہ السلام لا حتی اکون احب الیک من نفسک فقال عمر فانک الان احب الی من نفسی فقال علیہ السلام الان یا عمر۔

اس واقعہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طبعی محبت کا تقاضا کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کیسے ہو سکتی ہے تب آنحضرت ﷺ نے توجہ کا پر توڑا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طبعی محبت کا اقرار کیا تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اب ایمان کامل ہو گیا۔

حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا ذوق ہے کہ اس حدیث میں محبت سے مراد وہ محبت ہے جس کی ابتداء عقلی ہو اور انتہاء طبعی ہو کیونکہ صحابہ کرام نے اسی طبعی محبت کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔

① مثلاً حضور اکرم ﷺ کا جب وصال ہوا تو صدقہ کو صحابہ برداشت نہ کر سکے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو وقتی طور پر وفات کا انکار ہی کر دیا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ غم کی وجہ سے کسی کے سلام سننے یا جواب دینے کے قابل نہ رہے، کچھ صحابہ تو مدینہ منورہ کو چھوڑ کر شام وغیرہ چلے گئے کہ بغیر محبوب کے مدینہ میں رہنا مشکل ہے اور عام صحابہ پر روشن دنیا تاریک ہو گئی۔ اسی حالت میں جب عبداللہ بن زید بن عبد ربہ صاحب اذان کو ان کے بیٹے نے آنحضرت ﷺ کی وفات کی اطلاع دے دی اس وقت وہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس طرح دعا مانگی، اے اللہ تیری اس کائنات میں ان آنکھوں سے حضور اکرم ﷺ کو دیکھنا تھا جب حضور ﷺ نہ ہوں تو مجھے ان آنکھوں کی ضرورت نہیں اے مولا! میری نگاہوں کو جھین لے چنانچہ دعاء ختم ہوتے ہی وہ نابینا ہو گئے یہ طبعی محبت تھی۔

① جنگ احد میں جب کفار نے حضور اکرم ﷺ پر ہجوم کر کے حملہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو اس وقت میرا دفاع کرے اور وہ میرے ساتھ جنت میں رہے، اس اعلان پر انصار میں سے کچے بعد دیگرے سات صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر شہادت کا جام نوش کیا اور آنحضرت ﷺ پر کوئی آج نہ آنے دی یہ طبعی محبت تھی۔

● اسی غزوہ احد میں جب عارضی شکست ہوئی اور مدینہ منورہ میں یہ وحشت ناک خبر پھیل گئی کہ حضور ﷺ شہید کر دیئے گئے تو مدینہ منورہ سے عورتیں بے اختیار احد کے میدان کی طرف دوڑ پڑیں اسی میں ایک خاتون کلثوم بنت رافع رضی اللہ عنہا تھیں، راستہ میں کسی نے بتا دیا کہ جنگ احد میں تیرا شوہر شہید ہو گیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ شوہر کی بات چھوڑ دیجئے بتاؤ کہ نبی اکرم ﷺ کس حالت میں ہیں پھر کسی نے کہا کہ تیرا باپ بھی شہید ہو گیا، اس نے پھر وہی جواب دیا پھر کسی نے کہا کہ تیرا بھائی بھی شہید ہو گیا ہے وہ مسلسل یہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے بتاؤ حضور اکرم ﷺ کیسے ہیں؟ جب احد پہنچ کر اس نے حضور ﷺ کو صحیح سالم دیکھ لیا تو فرمانے لگی ”کل مصیبة بعدک یا رسول اللہ جلیل“ یعنی جب آپ خیریت سے ہیں تو باقی ساری مصیبتیں چھوٹی چھوٹی اور بچہ ہیں، یہ طبعی محبت تھی۔

● مدینہ منورہ کے ایک منافق نے حضور ﷺ کی گستاخی میں کچھ زبان درازی کی جس کا پتہ حضور اکرم ﷺ کو چلا تو آپ ﷺ نے اس کے بیٹے کے سامنے تذکرہ فرمایا بیٹے نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے قتل کرنے کی اجازت مانگی حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی، تاہم اس صحابی نے جا کر اپنے منافق باپ سے کہا کہ یہ کہہ دو کہ حضور اکرم ﷺ معزز اور بزرگ ہیں اور تم ذلیل ہو ورنہ قتل کر دوں گا اس نے کہہ دیا کہ حضور معزز ہیں اور میں ذلیل ہوں، تب بیٹے نے اسے چھوڑ دیا یہ طبعی محبت تھی۔

● علماء کرام نے کئی جگہ اس واقعہ کو لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک دفعہ سیٹگی لگوا کر خون نکلوا دیا اور پھر ایک صحابی کو دیا کہ جا کر اسے کسی پوشیدہ مقام میں گرا دو اس نے جا کر سوچا کہ نبی اکرم ﷺ کے جسم مبارک کا یہ مقدس خون میں زمین پر کیسے گرا دوں چنانچہ انہوں نے وہ خون پی لیا اور آکر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ”الطیبة اخطی مکانہ“ میں نے اسے پوشیدہ مقام پر ڈال دیا، یہ سب طبعی محبت کے آثار تھے۔

● حضرت غیب رضی اللہ عنہ کو جب کفار قتل کرنے کے لئے میدان میں لے آئے اور سولی پر چڑھا دیا تو ابوسفیان نے کہا کہ کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمد ﷺ ہمارے پاس ہوں ہم ان کی گردن تلوار سے اڑا دیں اور تم اپنے گھر میں ہو؟ اس کے جواب میں حضرت غیب رضی اللہ عنہ نے محبت کا اس طرح عظیم اظہار فرمایا۔ ”خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد عربی ﷺ کو اپنی جگہ میں کاٹنا بھی چھے اور میں آزاد ہو کر گھر میں رہوں“ یہ طبعی محبت تھی جس کا مظاہرہ صحابہ کرام نے کیا اور امت کو یہ تعلیم دی کہ محبت کی ابتداء اگرچہ عقل اور شرعی ہو لیکن اس کی انتہاء طبعی ہونی چاہیے۔

اسباب محبت: جمال کمال، ثنواں:

محبت کے تین بڑے اسباب ہیں:

① پہلا سبب: جمال ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ جمال عطا کیا تھا آپ کا جمال شامل سے ظاہر اور واضح ہے ابوعلی سینا ایک بڑے فلسفی اور بڑے حکیم گزرے ہیں انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ”حسن“ تناسب اعضاء اور اعتدال اعضاء کا نام ہے اور شامل سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ معتدل الاعضاء تھے لہذا آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک نبی اکرم ﷺ کی طرح کوئی حسین پیدا نہیں ہوا ہے، خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”انا ملیح واخی یوسف صبیح“ کسی نے کہا ہے: ۔

حسن یوسف دم عیسیٰ یہ بیضاء داری
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
واحسن منك لم تر قط عینی
خلقت مہراً من کل عیب
فاق النبیین فی خلقی وفي خلقی
منزہ عن شریک فی حماسہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لنا شمس وللآفاق شمس
فشمس الناس تطلع بعد فجر
و شمسی خیر من شمس السماء
وشمسی تطلع بعد العشاء

پھر فرمایا۔

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ

یعنی اگر زلیخا کی سہیلیاں آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیتیں تو انہیوں کے بجائے دلوں کو کاٹ لیتیں۔

یا صاحب الجمال ویا سید البشر
لا ممکن العناء کہا کان حقہ
لن یخلق الرحمن مثل محمد
منظہر چہ توان کردیاں و صف بجاش
من وجهک المذہب لقد نور القمر
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
اہدا وعلمی انه لم یخلق
شد خالق کونین ثنا خوان محمد ﷺ

② محبت کا دوسرا سبب: کمال ہے آپ کے کمالات کا احصاء تو ممکن نہیں مگر ختم نبوت کا جو کمال ہے یہ ایسا کمال ہے جس کے اثرات سے اولین اور آخرین سب ہی ایک وقت مستفیض ہو رہے ہیں۔

وکل ای من رسل الکرام بہ فانه ما اتصلت من نوره بہم
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں ترے کمال کسی میں نہیں مگر رو چار

ختم نبوت اس اعتبار سے کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اولیاء اللہ اور اولاد آدم کو جو دنیا تھا وہ دے دیا پھر آنحضرت ﷺ پر کمالات کی تکمیل فرمادی گویا اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ جتنے کمالات تھے وہ سب ہم نے اپنے نبی کو عنایت کیے روحانیت کی تکمیل آپ پر کر دی، اب کسی اور نبی کے آنے کی گنجائش نہیں کیونکہ روحانیت اور مادیات جتنا حضور اکرم ﷺ کو دیا اب اس کے بعد کسی کو کچھ دینے کی گنجائش نہیں گویا انعامات اور کرامات کی تکمیل آپ ﷺ پر فرمادی۔

مضت الدھور وما اتین بمثلہ ولقد اتی فعجز عن نظر ائہ
لا یمکن الفداء کما کان حقہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
نفسی الفداء لمن اخلاقہ شہدت ہانہ خیر مولود من البشر
آفاقہا گردیدہ ایم مہر و بتان درزیدہ ایم
بسیار خواہاں دیدہ ایم لیکن تو چیزے دیگرے

③ محبت کا تیسرا سبب: نوال ہے نوال عطیہ اور جو دو سخاوت کو کہتے ہیں۔ آپ پر جو کی انتہاء ہو چکی تھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت تیز ہوا کی طرح ہوتی تھی آپ نے یہ تعلیم دی کہ "ولا تمخض من ذی العرش اقلالا" ایک دیہاتی کو آپ نے وادی بھر کر بکریاں دے دیں کبھی آپ کی زبان پر عطیہ کی موجودگی میں "لا" کا کلمہ نہیں آیا۔

ما قال "لا" قط الا فی شہدہ لولا التشہد لکان لائہ نعم
نفسی الفداء لغير انت ساکنہ فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم

میدان حنین میں آپ نے اپنے صحابہ کے علاوہ غیر مسلموں کو ہزاروں اونٹ دے کر عالم انسانیت کو حیرت میں ڈال دیا، نو مسلموں کے ایک ایک آدمی کو سو سو اونٹ دے کر فیاضی اور سخاوت کا ریکارڈ قائم فرمایا۔

جب آنحضرت ﷺ میں جمال بدر جہاں تھا کمال بدر جہاں کمال تھا۔ نوال بدر جہاں تھا تو آپ سے محبت رکھنا آپ کا ذاتی حق ہے، اس لئے شرعی طور پر آپ سے محبت رکھنے کو اس حدیث میں جو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے یہ آپ کا ذاتی استحقاق ہے جو ہر مسلمان پر لازم ہے۔

ایمان کی لذت کا حصول

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ وَمَنْ يُكْرَهُ أَنْ يَغُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ مِنْهُ كَمَا يُكْرَهُ أَنْ يُنْفَى فِي النَّارِ (مشفق غلوی)۔

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے حقیقی ایمان کی لذت سے لطف اندوز ہوگا۔ ① اول یہ کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی محبت دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ ہو۔ ② دوسرے یہ کہ کسی بندہ سے اس کی محبت محض اللہ (کی خوشنودی) کے لئے ہو۔ ③ تیسرے یہ کہ جب اسے اللہ نے کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان و اسلام کی روشنی سے نواز دیا تو اب وہ اسلام سے پھر جانے کو اتنا ہی برا جانے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: ثلاث: ثلاث مبتدا ہے اور حسن کن فیہ: پورا جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے، اب سوال یہ ہے کہ ثلاث کمرہ ہے یہ کس طرح مبتدا واقع ہوا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ کمرہ محضہ نہیں بلکہ کمرہ مخصصہ ہے یہ خود صفت ہے اور موصوف خصال حمود ہے، یعنی "خصال ثلاث" تو اب اعتراض نہیں ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ثلاث کی تین تعظیم کے لئے ہے یعنی تین بڑی چیزیں ہیں۔ ۱۔

وجد: ادراک کے معنی میں ہے بمعنی "ذائق" بھی ہے اور "صاڈف" بھی اس کا معنی ہے۔ ۲۔

حلاوة الايمان: اس حلاوت ایمانی کے دو مطلب ہیں۔ ۳۔

① ای استلذاذ الطاعات وایثار الطاعات علی جمیع الشهوات وتحمل المشقات فی مرضاة اللہ ورسولہ والرضا بالقضاء فی جمیع المحالات۔ ۴۔

② حلاوت ایمانی سے مراد اللہ از قلبی ہے جس کو دوسری روایات میں بشارت قلبی کہا گیا ہے جس کے سامنے دنیوی لذائذ بچ نظر آجائیں اور صرف طاعات میں اصلی حلاوت و لذت محسوس ہوتی ہو اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہر مسلمان میں ہے مگر عند المعارضہ ظاہر ہوتی ہے۔ جب فی اللہ کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کثرت عطایا سے اس میں اضافہ نہ ہو اور مصائب و شدائد کے وقت اس میں کمی نہ آئے۔

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ بتا دیا کہ ایمان کی اصل حلاوت وہی آدمی چکھ سکتا ہے جس کا دل روحانی صفات سے منور ہو اور وہ روحانی اعتبار سے بالکل تندرست ہو اگر کوئی شخص روحانی طور پر بیمار ہو یعنی اس کا دل روحانی صفات سے عاری ہو تو وہ

فحش ایمان کی حلاوت بالکل محسوس نہیں کر سکتا ہے اس کی مثال ایک تندرست اور بیمار شخص کی طرح ہے اگر کوئی آدمی تندرست اور صحت مند ہے تو وہ شہد کی حلاوت کو اس طرح پاسکتا ہے جس طرح کہ شہد کی حقیقت ہے لیکن اگر کوئی شخص صغراء کا مریض ہے تو وہ شہد کو چمک کر اعلان کرے گا کہ یہ کڑوا ہے حالانکہ شہد کڑوا نہیں ہوتا بلکہ یہ قصور اس شخص کی بیماری کا ہے کہ صغراء کی وجہ سے اس کو ایک لذیذ ترین چیز کڑوی لگتی ہے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص روحانی امراض میں مبتلا ہے تو وہ اسلام کی حقیقی لذت کو بھی محسوس نہیں کر سکتا ہے، وہ الٹا اس لذیذ ترین نعمت کو کڑوا قرار دینے کی کوشش کرے گا لیکن اگر روحانی اعتبار سے یہ شخص تندرست ہے تو وہ ایمان کی اعلیٰ ترین لذت کو محسوس کرے گا اس کا اعتراف کرے گا اور اعلان کرے گا کہ ہاں یہ لذیذ ترین نعمت ہے روحانی تندرست کے لئے۔

اس حدیث میں حلاوت ایمان کی چاشنی محسوس ہونے کے لئے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے: اول یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب ہو، دوم یہ کہ اگر کسی مخلوق سے محبت ہو تو وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہو، سوم یہ کہ مسلمان ہونے کے بعد کفر سے اتنی نفرت ہو جتنی آگ میں ڈالے جانے سے ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جس نے ایمانی لذت محسوس کی تو شریعت پر چلنا آسان ہو گا ورنہ بڑی تکلیف محسوس کر کے بھاگے گا۔

من کان: یہاں تقدیری عبارت ماننا ضروری ہے یعنی احداھا محبة من کان الله ورسوله احب الخ احب سے محبت اختیاری شرعی مراد ہے۔

ہما سواہما: یہ سواہما عام ہے ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول ہوں، مال میں سے ہو یا جاہ و منصب میں سے ہو یا شہوات میں سے ہو۔

سبحان: اشکال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہاں اللہ تعالیٰ کا نام اور اپنا نام شنیہ کے ساتھ ایک ضمیر میں جمع فرمایا ہے یعنی "ہما سواہما" اسی طرح خطبہ کناح میں بھی دونوں کو ایک ضمیر "ہما" میں جمع فرمایا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے خود ایک خطیب کو ان الفاظ پر ڈانٹا تھا جنہوں نے یہ الفاظ کہے تھے "من یطع الله ورسوله فقد رشد ومن یعصیہما فقد غوی" فقال ﷺ یس الخ خطیب انت قم اب اس کا جواب کیا ہوگا؟

جواب: شارحین حدیث اس سوال کے کئی جواب دیتے ہیں۔
 پہلا جواب: یہ کہ یہ اعتراض حضور اکرم ﷺ کی طرف متوجہ نہیں ہے کیونکہ بھی ایک چیز امت کے لئے منع ہوتی ہے حضور اکرم ﷺ کے لئے منع نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً "ہما" کی ضمیر میں اگر آنحضرت ﷺ نے دونوں ناموں کو اکٹھا فرمایا ہے تو آپ سے تو شرک، تنوید اور برابری کا وہم نہیں ہو سکتا لیکن دوسروں میں یہ احتمال ہے کہ وہ اتحاد ضمیر کی وجہ سے اشتراک اور مساوات کا گمان کرے اس لئے منع کیا۔

یہ ہے کہ اطاعت میں دونوں کو جمع کرنا تو صحیح ہے کیونکہ ایک کی اطاعت ناقص ہے رہ گیا معصیت کا معاملہ تو اس میں ایک کی معصیت بھی تباہ کن ہے اور خطیب نے دونوں کی معصیت کو تباہی و گمراہی کے لئے ضروری بنا دیا۔ یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے بغیر اجازت خطبہ کے لئے کھڑا ہونا اور خطبہ دینا کس قدر بے ادبی کی بات ہے شاید اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے سرزنش فرمائی یہ وجہ کسی کتاب میں نہیں ملی ممکن ہے صحیح ہو ورنہ بعدہ معافی کا خواستگار ہے۔

وَلَا يَحِبُّهَا مَحَبَّةُ مَنْ أَحَبَّ عَبْدًا حُرًّا كَانُ أَوْ عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَحِبُّهُ إِي لَا يَحِبُّهُ لَغَرَضٍ وَعَرَضٍ وَعَوَضٍ وَلَا يَشُوبُ مَحَبَّتَهُ حَظٌّ دُنْيَوِي وَلَا أَمْرٌ بَشَرِي بَلْ مَحَبَّتُهُ تَكُونُ خَالِصَةً لِلَّهِ تَعَالَى۔

محبت رکھے پاک لینے دینے کے منہ میں خاک
وَلَا يَحِبُّهَا كَرَاهَةً مَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ: عود کے دو معنی لئے جاسکتے ہیں اول یہ کہ ایک آدمی اسلام پر پیدا ہوا اور اسی پر پھلا پھولا اب یہ شخص کفر کی طرف لوٹنے کو برا مانتا ہے تو یہ عود صبر و رست کے معنی میں ہے گویا اس کا معنی ابتداء کسی چیز کی طرف رجوع اور لوٹنے کا ہوا۔

عود کا دوسرا معنی حالت اولیٰ کی طرف لوٹنے کا ہے یہ ان لوگوں کے سامنے مناسب ہوگا جو پہلے کفر پر تھے پھر مسلمان ہو گئے اب دوبارہ حالت اولیٰ حالت کفر کی طرف لوٹنے کو برا مانتے ہیں۔

اس حدیث میں ایمان کی حلاوت کا جو بیان ہوا ہے اس پر یہ بحث ہوتی ہے کہ آیا یہ حلاوت حسی ہے کہ آدمی منہ میں محسوس کرے یا یہ معنوی حلاوت اور مٹھاس ہے؟ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حسی مٹھاس کا قول بھی کیا ہے۔

جس پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے سخت تعجب کا اظہار کیا ہے کہ حسی مٹھاس کیسے ہو سکتی ہے، مگر صوفیاء کرام کی اکثریت بھی اس کے قائل ہے کہ حسی ظاہری مٹھاس ہو سکتی ہے، بہر حال صفائی باطن کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو اصحاب کمال اس تشریح کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں، عام علماء نے معنوی حلاوت مراد لیا ہے۔

اس حدیث میں تین صفات کا بیان ہے اول دو صفات تو مطلق و تہذیب بالقبول و الفضائل کے قبیل سے ہیں اور تیسری صفت مطلق من الرذائل کے قبیل سے ہے گویا اس میں اشارہ ہو گیا کہ کفر سے براءت کا اعلان بھی ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ایمان کا لطف کب حاصل ہوتا ہے

﴿۸﴾ وَعَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ طَلْعَةِ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَسُولًا (رواہ مشکوٰۃ)

تفسیر مجاہد: حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اپنا پروردگار، اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا رسول خوشی سے مان لیا تو سمجھ لو کہ اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ (مسلم)

توضیح: حضرت عباس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں دو سال ان سے عمر میں بڑے ہیں کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ میں سے کون بڑا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ بڑے ہیں البتہ میں "اسن" ہوں یعنی عمر میں زیادہ ہوں، یہ ان کی ذکاوت تھی، قدیم الاسلام تھے مگر اسلام کو چھپاتے تھے، فتح مکہ سے کچھ قبل ہجرت کر کے اظہار کیا، بدر میں مجبور کر کے لڑائی کے لئے لائے گئے تھے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ان کے قتل سے منع فرمایا تھا۔ ۱۔
ان کی والدہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے بیت اللہ کو غلاف پہنانے کا طریقہ رائج کیا، ان کی گم شدگی پر نذر رمانی تھی کہ غلاف پہناؤں گی۔ ۲۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی عمر ۸۸ سال تھی ۳۲ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

ذائقہ: ای وجدوا صاب و نال یعنی حلاوت ایمانی پانی، ابن حجر رحمہ اللہ نے معنوی حلاوت کے بجائے حسی حلاوت کا قول کیا ہے جس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ نے عجیب تر قرار دیا ہے۔ ۳۔

"راضی" یعنی اسلام کے لئے سینہ کھل گیا اور دل مطمئن ہو گیا ظاہر آؤر باطناً انقیاد حاصل ہو گیا۔ ۴۔

"ہالانکہ دہا" اللہ کی ربوبیت پر راضی اس طرح کہ نہ شکایت نہ حکایت، ہر حالت پر اور زمانے کی ہر نگرانی پر راضی، اسلام پر راضی اس طرح کہ تمام احکامات کو بلا چوں چرا بجالائے، رسول اللہ پر راضی اس طرح کہ طبعی طور پر رسول اللہ سے محبت کی وجہ سے آپ کی سنت اور آپ کے طریقے پسند ہوں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر رضا ہو۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: ۵۔

ای ان یکون صابراً علی ہلاتہ شاکراً علی نعمائہ راضیاً بقدرہ وقضائہ ومنعہ واعطائہ وان یعمل بمجمیع شرائع الاسلام بامتنان الاوامر واجتناب الزواجر وان یتبع الحبیب حق متابعتہ فی سئلہ وآدابہ و اخلاقہ ومعاشرہ۔ ۶۔

اس حدیث کا مضمون بھی اس سے پہلی والی حدیث کی طرح ہے کہ شہد کی لذت حسی و معنوی وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کا ذائقہ درست ہو، صفاوی امراض سے اس کا ذائقہ زبان ماؤف اور خراب نہ ہوا ہو، اسی طرح ایمان کی لذت بھی وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اسلامی عقائد اور صحیح صفات اسلامیہ سے متصف ہو، وہ اسلام و ایمان اور نبی آخر الزمان پر اسی طرح عقیدہ رکھتا ہو جس کا اس کو رب تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے۔

اسلام ہی مدار نجات ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اس امت میں سے جو شخص خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، میری نبوت کی خبر پائے اور پھر میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائے بغیر مر جائے وہ دوزخی ہے۔ (مسلم)

توضیح: "والذی نفس محمد بیدہ" یہ قسم ہے آنحضرت ﷺ نے تعلیم امت کے لئے قسمیں کھائی ہیں، جس سے امت کو یہ تعلیم ملی کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے تھے، خدائی کے مالک نہیں تھے بلکہ آپ کی جان اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں تھی، دوسرا یہ بتانا مقصود تھا کہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھانا چاہیے، تیسرا یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر ضرورت تاکید کلام کے لئے قسم اٹھائی جاسکتی ہے حرام نہیں ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے کبھی نہ جھوٹی قسم کھائی ہے اور نہ سچی قسم کھائی ہے یہ ان کی امتیازی شان ہے۔

نفس محمد: سے روح محمد ﷺ ذات محمد ﷺ و حالات و حرکات و سکنات محمد ﷺ مراد ہیں۔

"بیدہ": یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ کی نعمت و رحمت کے ہاتھوں میں ہے، لفظ "ید" تشابہات میں سے ہے، تشابہات کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنی معلوم ہیں لیکن مراد کا علم نہیں جیسے ید، وجہ، ساق، جلوس، محی، استواء وغیرہ اس میں سلف صالحین کا مسلک یہ ہے کہ ایمان لانے کے لئے یہی ظاہری الفاظ ہیں، اس کے معنی باطین بشارت ہیں، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، جس طرح امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الاستواء معلومہ والکیفیہ مجهولہ والسؤال عنہا بدعة" امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ید" کی تاویل قدرت سے کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں تحریف کے مترادف ہے، اس لئے جو الفاظ آئے ہیں اس پر ایمان لا کر باطین بشارت کہہ کر اللہ کے سپرد کرنا چاہیے، یہ سلف صالحین کا مسلک رہا ہے، متاخرین نے فتن و بدع کے ظہور کے پیش نظر کچھ مناسب تاویلیں کی ہیں، ایمان و عقیدہ کی حفاظت کی غرض سے زمانہ کے احوال کے تغیر کی وجہ سے اس کی بھی گنجائش ہے مگر یہ صرف تاویلات ہیں یقین مطلب نہیں ہے۔

"احد": خواہ موجود ہو اس کلام کے وقت یا آئندہ آنے والا ہو۔

"من هذه الامة" امت کی دو قسمیں ہیں ایک امت اجابت ہے یعنی جنہوں نے اسلام قبول کر کے کلمہ توحید کا اقرار کیا ہے، دوسرے وہ ہیں جنہوں نے توحید کا اقرار نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ہے وہ امت دعوت ہے مسلمانوں کے علاوہ تمام انسان امت دعوت ہیں۔

حدیث میں تین قسم کے لوگ آگے ایک وہ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا سنا مگر ایمان نہیں لائے یہ آگ والے ہیں دوسرے وہ کہ جنہوں نے سنا اور ایمان بھی لائے یہ جنت والے ہیں، تیسرے وہ کہ جنہوں نے نہ سنا نہ ایمان لائے یہ مسکوت عنہم کے درجہ میں ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے یہود و نصاریٰ کا ذکر یہاں بطور خاص اس لئے کیا گیا کہ وہ صاحب کتاب اور اہل کتاب تھے۔ جب اصحاب کتاب کی نجات آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں تو جن کے پاس کچھ بھی نہیں جیسے، ہندو، سکھ، دہریہ، ملحد، بے دین تو ان کی نجات بغیر ایمان کے کس طرح ہوسکتی ہے۔ اس حدیث میں "لا یسمع" میں لا بمعنی لیس ہے اور "احد" اس کا اسم ہے اور "یسمع من هذه الامة" "احد" کی صفت ہے اور "یہودی ولا نصرانی" "احد" سے بدل واقع ہے اور لیس کی خبر محذوف ہے، عبارت اس طرح ہے لیس احد یسمع من هذه الامة یہودی ولا نصرانی الخ کاٹنا من اصحاب شنی الا کان من اصحاب النار۔

دوہرا اجر پانے والے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِحَبِيبِهِ وَآمَنَ بِعَمَلِهِ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَذَى حَتَّىٰ اللَّهُ وَحَقَّىٰ مَوْلَاهُ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطْلُهَا فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَكَرَّ وَجْهَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ۔ (مشفق علیہ)۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کو دو اجر ملیں گے: ① اس اہل کتاب نے عیسائی شخص کو جو پہلے اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا پھر محمد ﷺ پر ایمان لایا، ② اس غلام کو جو اللہ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے حق کو بھی ادا کرتا رہے، ③ اس شخص کو جس کی کوئی باندی تھی اور وہ اس سے صحبت کرتا رہا پھر اس کو اچھا ہنرمند بنایا پھر اس کو خوب اچھی طرح تعلیم دی، اور پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تو یہ بھی دو ہرے اجر کا حق دار ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں، مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کیا پھر حبشہ کو ہجرت کی پھر اہل سفینہ کے ساتھ اس وقت مدینہ منورہ تشریف لائے جب مکہ کو حضور اکرم ﷺ غزوہ خیبر میں جا چکے تھے،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو بصرہ کا گورنر مقرر فرمایا، آپ نے اسواذ فتح کیا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک وہیں رہے پھر کوفہ منتقل ہوئے اور وہاں کے والی رہے، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہر رہوئے تو آپ مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہاں پر ۵۲ھ میں انتقال کر گئے۔

دوہرے اجر والے اہل کتاب کون ہیں:

ثلاثة مبتدأ ہے لہم اجر ان اس کی خبر ہے "رجل من اهل الكتاب ای احدہم رجل من اهل الكتاب"۔

شارحین حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ اہل کتاب سے مراد صرف عیسائی ہیں یا عیسائی اور یہودی دونوں ہیں صاحب ازہار حافظ توریشی رحمہ اللہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد صرف نصرانی عیسائی اہل کتاب ہیں ان کی تقبی دلیل کتب حدیث کی وہ روایات ہیں جن میں تصریح ہے الذی امن بعیسی ثم ادرك زمان نبیہا محمد فامن بہ اور بخاری میں ہے واذا امن بعیسی ثم امن بی فله اجران۔ (بخاری ج ۱ ص ۴۰۰)۔

ان حضرات کی عقلی دلیل یہ ہے کہ یہود نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا تو وہ کافر ہو گئے اور ان کا ایمان اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام پر بھی ختم ہو گیا تو اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو دوہرا اجر کیسے ملے گا جب کہ "امن بدنیہ موجود نہیں ہے۔ لہذا اس سے یہودی مراد نہیں ہو سکتے بلکہ وہ عیسائی بھی ان "اجورین" سے محروم ہیں جو تثلیث کے قائل تھے اور اپنے نبی پر جھوٹ باندھتے تھے لہذا اس حدیث کو عموم پر حمل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس سے عیسائیوں کے وہ بقایا لوگ مراد ہیں جو سابقہ دین عیسوی پر صحیح طور پر قائم تھے اور پھر حضور اکرم ﷺ پر ایمان لائے اسی کو امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے اور کئی روایات سے اس کی تائید کی ہے اور حضرت عیاض بن حمار جاشعی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے ایک خطبہ میں یوں سنا:

"ان الله عز وجل اطلع على عباده فمقتهم عربهم وعجمهم الا بقايا من اهل الكتاب"۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ اور علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہاں مطلق اہل کتاب مراد ہیں خواہ یہودی ہوں یا نصرانی ہوں اور یہ واضح ہے۔

ما علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت "الذین اتینا ہم الكتاب من قبلہ ہم بہ یومنون اولئک یوتون اجرہم مرتین بما صبروا" اور مذکورہ حدیث کو یہود و نصاریٰ تک عام کرنے میں ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے کچھ یہودی یا دوسرے لوگ جو یہودی بن چکے تھے اور ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دعوت نہیں پہنچی تھی تو وہ یہودی اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے کسی کا انکار بھی نہیں کیا تھا وہ مومن تھے انہوں نے جب ہمارے نبی ﷺ کو پایا اور ایمان قبول کر لیا جیسے یمن کے کچھ یہودی تھے وہ لوگ مذکورہ مسطور ثواب پائیں گے جبکہ وہ

اہل کتاب یہودی ہیں، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کتاب سے مراد انجیل و تورات اور اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں جیسا کہ عام نصوص سے یہی متبادر ہوتا ہے اور مذکورہ آیت بھی یہی بتاتی ہے کیونکہ یہ عبد اللہ بن سلام اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہما کے متعلق اتری ہے جن میں سے پہلے یہودیت سے مسلمان ہوئے تھے اور دوسرے عیسائیت سے مسلمان ہوئے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہود مدینہ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانا تھا اس کا جواب ملا علی قاری علیہ السلام یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ تو یہ استغفر اللہ کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کریں، نیز یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ آیا دین عیسیٰ دین موسیٰ کے لئے ناسخ بھی تھا یا نہیں اگر ناسخ نہیں تھا تو جن یہود نے اپنے نبی کو مانتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کو قبول فرمایا تو وہ اس آیت وحدیث کے دوبرے اجر کے مصداق ہوں گے، اس طرح جن عیسائیوں نے کسی اور نبی کا کفر نہیں کیا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتے ہوئے دین اسلام اور حضور اکرم ﷺ کو قبول کیا وہ بھی دوبرے اجر کے مستحق ہوں گے۔

ورجل کانت عندہ امة یطأھا؛ وطنی کی قید اس لئے لگا دی ہے کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ رجل نے تو اس سے وطنی کا فائدہ اٹھایا پھر دوبرا اجر کیسے ملے گا؟ تو فرمایا کہ چونکہ وطنی بھی کرے تب بھی دوبرا اجر ملیں گے اور بغیر وطنی تو ضرور ملیں گے یا یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ اتفاقی ہے کہ ایسا ہوتا ہے عادت یہی ہے کہ وطنی ہوتی ہے۔ (کنز الدقائق ۲)

فله اجران: اس شخص کو ایک اجر تو لونڈی کی تعلیم و تربیت اور ادب سکھانے پر ملا اور دوسرا اجر اس کے آزاد کرنے اور نکاح کر کے گھر کی ملکہ بنانے پر ملا، بعض نے کہا ہے کہ تعلیم و ادب تو اس کا حق تھا، یہاں دواجر اس طرح ہیں کہ آزاد کرنے پر ایک اجر ملا اور پھر نکاح کر کے بیوی بنانے پر دوسرا اجر ملا، "فله اجران" میں تاکید کے ساتھ نئی تصریح فرمادی کہ اس شخص کو بھی دواجر ملیں گے، اس تصریح کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جو دو شخص تھے ان کے دوبرے ثواب کا معاملہ تو واضح تھا کہ ایک نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے سابق مرکز ایمان کے بعد نئے مرکز ایمان کو قبول کیا اور دوسرے نے حق اللہ ادا کر کے بھرتی مولیٰ کو بطریق احسن ادا کیا ان دونوں اشخاص کے بڑے کارنامے اور واضح فیصلے تھے لیکن یہ تیسرا شخص تو جو کچھ کر رہا تھا اس میں اس کے اپنے منافع بھی تھے اس لئے یہاں اس تاکید اور وضاحت کی ضرورت پڑی کہ اس کو بھی دواجر ملیں گے اس میں شبہ نہیں ہے۔

سوال: یہاں ایک مشہور اعتراض ہے کہ ان اشخاص کو جو یہ دواجر دیئے گئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دو عمل کئے، اب جو شخص بھی دو عمل کرے گا دواجر پائے گا اس میں ان کی کیا خصوصیت رہی؟ نیز دواجر کیا چیز ہے ایک عمل پر تو دس نیکیاں پھر سات سو تک ملتی ہیں اس سے بھی زیادہ کا امکان ہے۔

پہلا جواب: تو یہ ہے کہ یہ دواجر اصل ثواب سے زائد ہیں اصل ثواب کا قاعدہ تو مقرر ہے کہ دس سے سات سو تک

ہے یہ دواجر اس پر مستزاد ہیں۔

کہ ان تین اشخاص کا ہر عمل دو ہرے ثواب کا باعث ہے یعنی نماز ایک پڑھی وہ دو کے قائم مقام ہوگی تو عام لوگوں کی ایک نماز اگر دس کے قائم مقام ہے تو ان کی بیس کے قائم مقام ہے۔ عام لوگوں کا ایک روزہ دس کے برابر ہے تو ان اشخاص کا ایک روزہ بیس کے برابر ہے اور ہر عمل میں یہی قاعدہ ہے تو یہ بڑی فضیلت ہے۔

بعض نے یہ دیا ہے کہ یہ ہر ثواب صرف ان افعال پر ملے گا جن اعمالی میں عمل بالغدین ہوتا ہو کہ ایک عمل کے ساتھ دوسرا مزاحم ہو رہا ہو اس تضاد و تراحم و ٹکراؤ کی صورت میں جب یہ آدمی دونوں پر عمل کرے گا تو دوسرا ثواب ملے گا مثلاً سابق نبی کے ساتھ ساتھ لاحق نبی اور اس کی شریعت کے ماننے میں بڑی دشواری ہوتی ہے، اسی طرح غلام میں، ایک آقا کا حکم ایک طرز پر ہے کہ مثلاً نماز پڑھو اور دوسرا کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، اب ان دونوں کاموں کا نبھانا کتنا مشکل ہوگا، اسی طرح لونڈی میں، ایک باہر کی خادمہ کو لاکرائینی بیوی کی جگہ بٹھا، سابقہ بیوی سے اور لوگوں کے لعن طعن سے طرح طرح کی مزاحمت ہوگی یہ سب تراحم و تضاد والے اعمال جب کریں گے تو ان کو دوا جزئیں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان تین اشخاص کو اپنے مخصوص افعال کے ساتھ خاص کر بطور تمیز کیا گیا ہے۔

دین کے غلبہ تک کفار سے جنگ کا حکم

﴿۱۱﴾ وَعَنِ ابْنِ مَحْمُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُخَيِّمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بَحْثِي الْإِسْلَامَ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ مَشَقَّقٌ عَلَيْهِ إِلَّا أَنْ مُسْلِمًا لَمْ يَذْكُرْ إِلَّا بَحْثِي الْإِسْلَامَ۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے کہ میں کفار سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی کوئی تدبیر نہ کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، نیز نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں پس جب وہ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچالیا ہاں جو باز پرس اسلامی ضابطہ کے تحت ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی اس کے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، مسلم کی روایت میں "الا بحتی الاسلام" کے الفاظ نہیں ہیں۔

توضیح: "امرت" یہ مجبور کا صیغہ لایا گیا ہے کیونکہ اس کا فاعل متعین تھا کہ "اللہ" ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو حکم دینے والا اللہ ہی ہوتا ہے جس طرح صحابہ کہتے ہیں "امروا" تو وہاں فاعل نبی اکرم ﷺ متعین ہوتے ہیں تو "امرت" کا مطلب یہ ہوا "امرتی اللہ بان اقاتل الناس"۔

سوال: یہاں یہ سوال ہے کہ اسلام میں جزیہ کا حکم بھی ہے جس سے کافر ذمی بن کر زندہ رہ سکتا ہے، اسی طرح معاہدہ بھی بغیر مال کے رو سکتا ہے، کفار سے صلح بھی جائز ہے حالانکہ اس حدیث میں مطلق لڑنے کا حکم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر سے لڑے بغیر کوئی اور صورت نہیں۔

جوابات:

اس سوال کے کئی جوابات ہیں:

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ الناس میں الف لام عہد خارجی کے لئے ہے اور اس سے مراد جزیرہ عرب کے مشرکین ہیں جن کے لئے "اما السیف والا سلام" اس کی تائید ناسی کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں امرت ان اقاتل المشرکین۔

سوال: اس سے ملتا جلتا ہے کہ الناس سے مراد اہل عرب ہیں ذمی اور معاہدہ خود نکل گئے کیونکہ یہ عام حکم ہے اور ہر عام مخصوص البعض ہوتا ہے تو لڑنے والوں سے لڑیں گے، ذمی اور معاہدان سے مستثنیٰ ہیں۔ (کنز العمال ص ۷۷)

جواب: اس حدیث کی غایت میں تاویل کرنے سے دیا گیا ہے یعنی "حتى يستسلموا او يستقلموا" کہ یا اسلام حقیقہ لے آئیں یا اسلام کے سامنے جھک جائیں اور اسلام کی صورت میں ذمی اور معاہدہ داخل ہیں کیونکہ اب اس نے اطاعت کی ہے یعنی جہاد سے مراد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اسلام یا استسلام، کافر کفر پر رہتے ہوئے جب اسلامی حکومت قبول کرتا ہے تو اعلاء کلمۃ اللہ محقق ہو گیا۔

سوال: یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس حدیث میں شہادتین کا ذکر موجود ہے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے لیکن یہاں نہ صوم کا ذکر ہے نہ حج کا یہ کیوں؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اختصار من الرادی ہے۔

سوال: یہ ہے کہ اب تک روزہ اور حج کا حکم نہیں آیا تھا۔

جواب: یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام ارکان کو بیان کرنا نہیں تھا بلکہ بظاہر مقصود تھا کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اور نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کرے یہ ان کے مسلمان ہونے کی علامت ہے اب ان سے تعرض کرنا نہیں ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہاں شہادتین کے اقرار کا ذکر ہے اور جو شخص نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جمیع ما جاء به النبی ﷺ کا اقرار کرتا ہے اس میں ساری شریعت آگئی۔

تاریک صلوٰۃ کا حکم:

اس حدیث میں چونکہ حفظ جان کے لئے کلمہ شہادت کے بعد نماز کا ذکر آیا ہے اس لئے شارحین نے تاریک صلوٰۃ کے حکم سے متعلق ایک بحث چھیڑ دی ہے، اس کو آپ اس طرح سمجھ لیں کہ تاریک صلوٰۃ کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ لوگ ہیں جو نماز

چھوڑنے کو حلال سمجھتے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کے قریب نہیں جاتے ہیں، یہ لوگ اتفاقاً کافر مرتد اور واجب القتل ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو سستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے ہیں مگر اس کی فریضت کو مانتے ہیں چھوڑنے کو ناجائز سمجھتے ہیں اس قسم کے لوگوں میں فقہاء کرام کا اختلاف ہوا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نصوص قرآنی اور تصریحات حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ قصد اس محمد امارک صلوٰۃ نے کفر کا ارتکاب کیا اس لئے احمد بن حنبل، عبد اللہ بن مبارک اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مسلک ہے کہ بلا عذر عدا فرض نماز چھوڑنے والا کافر ہے، اس کو قتل کیا جائے گا اور یہ قتل مرتد کا قتل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر نہیں مگر اس جرم کی سزا قتل ہے اور یہ قتل مرتد کا نہیں بلکہ فاسق فاجر کا قتل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کافر نہیں اور اس کی سزا قتل نہیں بلکہ حاکم وقت اس کو جیل میں ڈال دے اور جب تک توبہ نہیں کرتا ہے ہر نماز کے وقت میں اس کو کوڑے مارے جائیں یہاں تک کہ یا وہ توبہ کرے اور یا جیل ہی میں مر جائے، سلطان باحو رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے، بابا سعدی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو قرض نہ دو جو شخص خدا کا قرض ادا نہیں کرتا وہ حیران قرض کیا ادا کرے گا۔

بہر حال اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انجام کے اعتبار سے تارک صلوٰۃ کے بارے میں امت کے فقہاء نے مارنے کا حکم دیا ہے خواہ فوراً ہو یا جیل کی صورت میں تاخیر سے ہو، خواہ کفر ہو، خواہ سزا ہو، اس سے نماز کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، جن حضرات نے تارک صلوٰۃ کو کافر مرتد قرار دیا ہے ان کے دلائل وہ آیات و احادیث ہیں جن میں تارک صلوٰۃ کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے اور وہ بہت سی احادیث ہیں، مگر جو حضرات تارک صلوٰۃ کے کافر ہو جانے کے قائل نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں تاویل کی جائے گی کہ اس شخص نے کافروں والا کام کیا اس سے لڑا جائے مارا نہ جائے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مرتد ہو گیا اس کو قتل کر دو کیونکہ مرتکب کبیرہ کے بارے میں امت کا فیصلہ ہے کہ وہ خارج از اسلام نہیں تو پھر تارک صلوٰۃ کو مرتد کیسے کہیں گے پھر ان احادیث کو تشدید تکلیف اور تہدید پر حمل کریں گے کیونکہ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ کبھی امت میں تارک صلوٰۃ کو قتل نہیں کیا تھا۔

الابحی الاسلام: یعنی اس شخص کا خون قصاص حدود و ارتداد میں محفوظ نہیں ہوگا بلکہ قصاصاً قتل ہوگا۔ نیز اگر شادی شدہ ہے مسلمان ہے اور زنا کیا تو رجم کیا جائے گا یا مسلمان تھا پھر مرتد ہو گیا تو قتل کیا جائے گا کیونکہ یہ اسلام ہی کا حق ہے، اسلام نے کہا ہے کہ ایسا کرو اور وہ صرف تین کام ہیں۔ جس میں نماز شامل نہیں۔ ۱۔

وحسبہم علی اللہ: یعنی ظاہر نفع کیا باطناً معاملہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے ہم باطن کے فیصلوں کے مکلف نہیں ہیں۔

مطلب حدیث:

اس حدیث مبارک کا حاصل یہ ہے کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے لوگوں سے قتال اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ لوگ تین کام نہ کر لیں: ① شہادتین کا اقرار ② اقامت صلوٰۃ ③ زکوٰۃ ادا کرنا، جو لوگ یہ تین کام کر لیں گے اور سچے مسلمان بن جائیں گے تو ان کی جان محفوظ ہو جائے گی اب ہمارے لئے ان کے مال و جان سے تعرض کرنا جائز نہیں ہوگا البتہ مسلمان ہو جانے کے بعد اگر کسی موقع پر اسلام ہی کا تعارض ہو تو وہ مارے جانے سے معصوم نہ رہے گا ظاہر حکم لگے گا باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

ترتیب احکام:

نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں مبعوث ہوئے تو حید و تبلیغ کا کام شروع ہوا، تلاوت قرآن کا دور شروع ہوا ابھی تک عام فرائض و احکام نہیں آئے تھے پھر نماز مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی پھر ہجرت ہوئی پھر زکوٰۃ فرض ہوئی، پھر روزوں کا حکم مدینہ میں ۲ھ سے پہلے آیا، پھر چھ یا سات یا نو ہجری کو حج فرض ہوا، پھر دوسرے احکام آئے ہجرت کے متصل مدینہ منورہ میں جہاد کی مشروریت کا حکم آیا، دفاع کی اجازت کے بعد اقدام کا حکم آیا مسجد الحرام کے قریب نہ لانے کے بعد وہاں بھی لڑنے کا حکم آگیا، اشہر حرم میں جنگ پر پابندی کو بھی اٹھا لیا گیا اور آخر میں بتایا قیام قیامت مطلق جہاد کا حکم آیا تو آنحضرت ﷺ نے یہ عالمی اعلان فرمایا امرت ان اقاتل الناس الخ اب یہی حکم باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا۔ تفصیلات کے لئے مشکوٰۃ جلد ثانی کتاب الجہاد کا انتظار کیجئے۔

عجیب مناظرہ:

تارک صلوٰۃ کی تکفیر و عدم تکفیر میں امام شافعی رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایک دلچسپ بحث ہوئی وہ اس طرح کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ سے تارک صلوٰۃ کے بارے میں جب پوچھا تو امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کافر ہے امام شافعی رحمہ اللہ نے سوال کیا کہ پھر وہ کس طرح مسلمان ہوگا آپ نے فرمایا کہ کلمہ پڑھ لے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کلمہ تو وہ پہلے سے پڑھتا ہے نماز نہیں پڑھتا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھ لے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب وہ کافر ہے تو بغیر ایمان کے نماز کیسے پڑھ لے؟ اس پر امام احمد رحمہ اللہ خاموش ہو گئے۔

۱۲۳: سورہ ۱۰۹

محفوظ مسلمان کون ہوتا ہے؟

۱۲۶ ﴿وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا فَذَلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللَّهِ وَذِمَّةُ رَسُولِهِ فَلَا تُخْفَرُ وَاللَّهُ فِي ذِمَّتِهِ﴾ (رواه البخاری)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبیحوں کو کھائے وہ مسلمان ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے عہد و امان میں ہے۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی مت کرو۔ (بخاری)

توضیح: ”من صلی صلوٰۃ“: یعنی جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، یہ عمل ایک مسلمان موحد ہی کر سکتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتا ہو، جب نبوت کا اقرار ہو گیا تو نبی اکرم ﷺ کی لائی ہوئی پوری شریعت کا اعتراف بھی ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ اس شخص کی نماز اس کے ایمان کے لئے علامت بنائی گئی۔ یہاں شہادتین کا تذکرہ نہیں کیا گیا کیونکہ شہادتین حقیقتاً یا حکماً نماز کے ضمن میں خود ہی آگئے نبی اکرم ﷺ نے اس مسلمان کی تین علامتیں بیان فرمائی: ① ہماری جیسی نماز پڑھے ② ہمارے قبلہ کا استقبال کرے ③ ہمارا ذبیحہ کھائے۔ ل۔

سوال: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسلمان کے تعارف میں جن تین چیزوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، ان میں اتنی مرکزیت کہاں تھی؟ نماز ایک عمل ہے، بہت اوجھا عمل ہے، مگر ایمان و اسلام کے بعد کا عمل ہے، اسی طرح قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی کوئی اتنا مرکزی عمل نہیں ہے اور ہمارا ذبیحہ کھانا تو کوئی عبادت بھی نہیں پھر ان چیزوں کو اسلام میں اتنا اہم مقام کیوں دیا گیا کہ مسلمان کا تعارف اس پر موقوف کر دیا گیا۔

جواب: اس اشکال کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ یہاں حدیث میں جس شخص کا ذکر ہے اور جس کے مومن و مسلم ہونے کا تعارف کیا گیا ہے یہ وہ شخص ہے جو ابھی اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اپنا سابق دین چھوڑ کر اسلام میں آنا چاہتا ہے، اسی وجہ سے حدیث میں ایسے شخص کے مابہ الامتیاز اعمال کا ذکر کیا گیا، یعنی نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اہل کتاب اور اہل اسلام کے درمیان مابہ الامتیاز ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے والے اعمال اگر تھے، تو وہ یہی تین اعمال تھے، کیونکہ ایمان تصدیقی قلبی کے درجہ میں ہو یا اقرار لسانی بھی ساتھ ہو، اس میں غیر مسلم کو نمایاں کرنے کے اتنے مواقع نہیں تھے جتنے ان مذکورہ تین اعمال میں تھے کیونکہ یہ اسلامی شعائر اور ممتاز اعمال ہیں۔ دیکھیے نماز اسلامی شعائر میں سب سے کھلا امتیازی عمل ہے، اسی طرح قبلہ کا معاملہ ہے جس کے بارے میں یہود و نصاریٰ انتہائی حساس ہیں اور ان کے نزدیک حقانیت کے لئے قبلہ ہی کو معیاری مقام حاصل ہے، یہ تو عبادات کے حوالہ سے امتیازی نشان تھے۔

آگے ذبیحہ کا معاملہ بھی ایک امتیازی معاملہ ہے، یہود و نصاریٰ اپنے ماسوا کسی کا ذبیحہ نہیں کھاتے اور ذبیحہ کو وہ لوگ معاشرتی لحاظ سے امتیاز اور جدائی کا بڑا احد فاصل سمجھتے ہیں تو اس حدیث میں بتایا گیا کہ جو شخص اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے پھر وہ عبادات کے حوالہ سے ہماری طرح امتیازی نماز پڑھتا ہے اور قبلہ کا رخ کرتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے تو اب یہ شخص عبادات کے بعد عادات میں بھی غیر مسلموں سے ممتاز ہو گیا لہذا اب یہ تمام صفات کے ساتھ مسلمان شمار کیا جائے گا۔ ل۔

واستقبل قبلتہ: یہاں سوال یہ ہے کہ پہلے جملہ صلی صلوٰۃ تہا میں یہ جملہ داخل تھا، کیونکہ ہماری نماز ہمارے ہی قبلہ کی طرف ہوتی ہے پھر اس جملے کا لانا بظاہر زیادہ معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہاں اس کو ایمان کا معیار بنایا گیا ہے؟
 یہ ہے کہ نماز کی نسبت قبلہ کا معاملہ زیادہ اعراف و اشہر تھا، کیونکہ بہت سارے مسلمان نماز پڑھتے بھی نہیں اور جانتے بھی نہیں لیکن قبلہ کو جانتے مانتے اور پہچانتے ہیں، اس لئے نماز کے بعد قبلہ کا ذکر ضروری تھا۔
 لیکن قبلہ میں تو نمایاں امتیاز ہے، ہر مذہب کا الگ قبلہ ہے، یہود کا بیت المقدس میں گنبد مخمر ہے اور نصاریٰ کا بیت المقدس میں جانب شرقی ہے اور مسلمانوں کا مکہ مکرمہ میں بیت اللہ ہے، اس لئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔

قُلْ اَللّٰهُ اَحَدٌ: یعنی جس میں یہ تین صفات ہوں وہی مسلم ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں ہے اللہ کے عہد و پیمان میں ہے نہ اس کا قائل جائز ہے نہ مل و آبرو کی بے حرمتی جائز ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی عہد شکنی سے بچو۔
 اخفاء: بدعہدی کو کہتے ہیں عہد توڑنا خیانت کرنا اور مال و جان سے تعرض کرنا مراد ہے کہ اس سے احتراز کرو، اللہ تعالیٰ کی عہد شکنی رسول کی عہد شکنی تھی، اسی لئے ایک کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

تِلْكَ اٰیَاتُ الْكِتَابِ: قادیانی کہتے ہیں کہ یہ تین کام ہم بھی کرتے ہیں، پھر ہم مسلمان ہوئے تو ہمیں کافر کیوں کہا جاتا ہے؟
 ان تین کاموں کے اپنانے کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ شخص ضروریات دین میں سے کسی امر ضروری کا انکار نہ کرے، کیونکہ ایمان و اعمال وہی معتبر ہیں جن کے منافی کوئی بنیادی عمل ایسا نہ ہو جو ان سب اعمال کے ضبط کا ذریعہ بنے، قادیانی نئی نبوت کو کھڑا کرتے ہیں تو ان کا ایمان شریعت پر کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

اس حدیث میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ نے زکوٰۃ صوم اور حج کا ذکر نہیں کیا؟
 یہ ہے کہ اس وقت تک یہ احکام فرض نہیں ہوئے تھے۔

یہ کہ نبی اکرم ﷺ کو تمام ارکان کا بیان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ مسلمان کے تعارف کی حد تک جتنا مقصود تھا اس کو بیان کیا۔

جنت میں لے جانے والے اعمال

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَمَّا أَغْرَابُ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ كُلُّي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمَلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَالَ تَعْبُدُ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُحِبُّهُ الطَّلَاقَ الْمَكْنُونَةَ وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ الْمَقْرُوضَةَ وَتَصُومُ رَمَضَانَ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا أَرِيدُ عَلَى هَذَا شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلِيَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ سَرَّكَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هَذَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ یہ سن کر دیہاتی نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نہ تو اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، جب وہ دیہاتی چلا گیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھنے کی سعادت اور مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: دخلت الجنة: یعنی دخول اولی سے داخل ہو جاؤں جس میں کسی قسم کی سزا و عذاب نہ ہو۔

تعبد اللہ: یہ خبر بمعنی امر ہے "ای اعبد اللہ" یا "ان" مصدر یہ مقدر ہے ای ان تعبد اللہ۔

سوال: سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص کو توحید اپنانے کا حکم نہیں دیا شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا جو کہ دخول جنت اور صحت عمل کے لئے ضروری ہے۔

پہنچاؤ: عبادت سے مراد توحید و شہادتین ہے، اس صورت میں یہ شخص ابھی تک مسلمان نہیں ہوا ہو گا تو اس کو حکم دیا کہ توحید اپناؤ۔

ترجمہ: یہ ہے کہ یہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اس نے پوچھا تھا "ماذا فرض اللہ علی" یعنی مجھ پر اللہ کے کیا فرائض ہیں؟ اس صورت میں توحید اور بیزارى شرک کا ذکر بطور تبرک و شرف اور بطور تاکید ہوا ہے۔

ولا تشرك به شئاً: یعنی شرک جلی اور شرک خفی سے بچو توحید اور عبادت کو اپناؤ، اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبادت سے مراد توحید کا کلمہ ہے اور توحید کے ضمن میں رسالت بھی آگئی، اس روایت میں حج کا ذکر نہیں شاید اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا ہو گا یا آنحضرت ﷺ کو اتنے ہی ارکان کا بیان مقصود تھا، یا کسی راوی نے اختصار کیا ہے۔ "والذی نفسی

بیدہ" معلوم ہوا بغیر ضرورت قسم کھانا جائز ہے "لا ازید ولا انقص مدہ" اس جملہ کے کئی مطلب ہیں۔

① میں اس تعلیم کی تبلیغ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں کمی بیشی نہیں کروں گا چونکہ یہ شخص قوم کا بڑا تھا تو پہنچانا اس کی ذمہ داری تھی۔ ② لا ازید فی السؤال ولا انقص فی العمل۔ ③ لا ازید شئاً من تلقاء نفسی ولا انقص کذا لک من نفسی۔ ④ یہ کام بطور محاورہ تھا کہ جب آدمی مثلاً کوئی چیز خریدتا ہے تو کہتا ہے قیمت میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہوگی، یہاں اصل مقصود کی کرنا ہے زیادتی کا لفظ تبعاً محاورہ میں آگیا اسی طرح حدیث میں "لا ازید" کا لفظ تبعاً آگیا ہے مقصود "لا انقص" ہے ورنہ عبادت میں تو زیادت مطلوب ہے۔ ⑤ حق بات یہ ہے کہ یہ عبارت اور یہ جواب "کمال اطاعت" سے کنایہ ہے۔

”من سرہ“ یعنی جن کو یہ بات اچھی لگتی ہو کہ وہ کسی جنتی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھے آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ اس شخص کا انجام محمود ہے اور یہ مامون العاقبہ ہے اور یہ بغیر سزا کے دخول اولیٰ کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ اس دیہاتی کا نام سعد بن الاحزم تھا۔ (کنز العمال ج ۱)

ایمان پر استقامت

﴿۱﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ التَّمِيمِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا بَعْدَكَ وَفِي رِوَايَةٍ غَيْرُكَ قَالَ قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمَّ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبد اللہ التمیمیؒ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اسلام کی کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھ کو کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا زبان و دل سے اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں، اور پھر اس اقرار و اعتراف پر ڈٹ کر قائم رہو۔ (مسلم)

توضیح: حضرت سفیانؒ کی کنیت ابو عمر ہے۔ یہ شخص صحابی ہیں، حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے گورنر مقرر تھے، توثیق سے ان کا تعلق ہے اور طائف کے باشندہ ہیں، ان سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں۔

”فی الاسلام“: یعنی تکمیل اسلام سے متعلق ایک جامع قول ارشاد فرمائیں، اس جملہ میں توابع اسلام سب کے سب آگئے گویا پوری شریعت کی بات ہو گئی۔ ”آمنت باللہ“: یعنی ان تمام چیزوں پر ایمان لایا ہوں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس میں بھی پوری شریعت آگئی۔ ”ثم استقم“: یہ لفظ قرآن کریم کی آیت ”ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا“ سے ماخوذ ہے یعنی اوامر کے امتثال پر اور نواہی سے اجتناب پر ڈٹ کر قائم رہو، یہ حدیث جو امع کلم میں سے ہے، جو اصول اسلام توحید اور ارکان اسلام یعنی طاعات پر مشتمل ہے توحید کی طرف اشارہ ”آمنت باللہ“ سے ہوا اور باقی طاعات کی طرف اشارہ ”ثم استقم“ سے ہوا کیونکہ استقامت اس کا نام ہے کہ ہر مامور کا امتثال ہو اور ہر منظور سے اجتناب ہو اگر ذرا بھی اوامر و نواہی میں فرق آگیا تو ”اعوجاج“ میڑھا پن آ جائے گا جو استقامت کے منافی ہے۔ اس طرح اس حدیث میں اعمال قلب، اعمال بدن، ایمان، اسلام اور احسان سب آ گئے۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام نے کہا ہے ”الاستقامۃ خیر من الف کرامۃ“ پس اگر کوئی شخص مامور کو چھوڑتا ہے تو استقامت جاتی ہے یا منہی عنہ کا ارتکاب کرتا ہے تو استقامت نہیں رہتی ہے، یہ پل صراط کی طرح باریک تیز دھار نوک دار تلوار پر سفر ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”شعبۃ من ہود و اخوانہا“ کیونکہ ان سورتوں میں ”استقم کما امرت“ کا حکم تھا۔

استقامت کا مفہوم:

- ① امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں صحیح راستہ پر استقامت اتنی مشکل ہے جتنا کہ عالم آخرت پر پل صراط پر استقامت مشکل ہوگی، اس دنیا میں استقامت کا ہر پل بال سے زیادہ باریک اور نکوار سے زیادہ تیز ہے۔ لہ
- ② حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب استقامت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "ان لا تشرك بالله شيئا" یعنی استقامت خالص توحید کا نام ہے۔
- ③ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا "تستقيم على الامر والهي ولا تروغ وروغان الغالب" یعنی حق و باطل کے وقت حق پر مضبوط ڈٹ جاؤ اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر قلابازیاں نہ کھاؤ۔
- ④ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے استقامت کے متعلق فرمایا "اخصلوا العبل لله" یعنی خالص رضائے الہی کے لئے ہر کام کرنا استقامت ہے۔
- ⑤ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اداموا الفرائض كلها" یعنی تمام فرائض پر دوام و استمرار کے ساتھ قائم رہنا استقامت ہے۔

۱۲۲: ۱۲۱

فرائض اسلام

۱۰۹۰ عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدٍ اللَّهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرِ الرُّأْسِ نَسَمُ كَوَيْ صَوْتِهِ وَلَا نَفَقَةَ مَا يَقُولُ حَتَّى كُنَّا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَرَادًا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَحْمُسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيْكَ غَيْرُ هُنَّ فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطْلُوعَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَصِيَامَ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيْكَ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطْلُوعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الزَّكَاةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيْكَ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطْلُوعَ قَالَ فَأَذْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا أُرِيدُ عَلَى هَذَا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْلَحَ الرَّجُلُ إِنْ صَدَقَ. (متفق عليه)

ترجمہ: اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ محمد سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت و قدس میں حاضر ہوا جس کے سر کے بال پر اگندہ و پریشان تھے ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سن رہے تھے لیکن (فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آپ ﷺ سے کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب پہنچے

گیا تو اچانک ہم نے سنا کہ وہ اسلام کے فرائض کے بارے میں سوالات کر رہا ہے رسول اللہ ﷺ نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ رات دن کی پانچ نمازیں فرض ہیں (یہ سن کر) اس شخص نے کہا کیا ان نمازوں کے سوا مجھ پر کچھ اور نمازیں بھی فرض ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل نمازیں تمہیں پڑھنے کا اختیار ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں اس شخص نے کہا کیا ان روزوں کے سوا کچھ اور روزے مجھ پر فرض ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل روزے کا تمہیں اختیار ہے، روای کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس نے عرض کیا کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی صدقہ فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل صدقہ کا تمہیں اختیار ہے، اس کے بعد وہ شخص یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ خدا کی قسم میں نتو اس پر کچھ زیادتی کروں گا اور نہ اس میں کچھ کمی کروں گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو نجات پا گیا ہے اور کامیاب ہو گیا ہے۔

توضیح: حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو محمد ہے، آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے ہیں، بدر میں آپ کو ایک اور ساتھی کے ہمراہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر کے لئے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا تھا۔ احد کے دن حضور اکرم ﷺ کی دفاع میں حیر کھا کھا کر ہاتھ شل ہو گیا تھا، نیزہ اور تیر کے ۷۵ زخم آپ رضی اللہ عنہ کے جسم پر لگے تھے، حضور اکرم ﷺ نے آپ کو اسی میدان میں یہ اعزاز دیا "اوجب طلحۃ" یعنی طلحہ نے اپنے لئے جنت واجب کرا دی، واقعہ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ۳۶ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں شہید کر دیئے گئے۔

"جاء رجل:" کہتے ہیں یہ ضام بن ثعلبہ تھے جو سعد بن ابی وقاص کی طرف سے وفد و جرگہ بن کر آئے تھے، اس حدیث میں "رجل" مبہم آیا ہے، کوئی تعین نہیں کہ یہ کون تھا، اس سے پہلے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اعرابی کا لفظ آیا ہے سوال اور مضمون سوال ملتا جلتا ہے، تو آیا یہ ایک ہی شخص تھا، ایک ہی واقعہ تھا یا الگ الگ، واقعہ اور الگ الگ شخص تھے؟

علامہ طبری، حافظ تورپشتی اور قاضی عیاض رحمہم اللہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ دونوں واقعات ایک ہی شخص کے ہیں اور مسائل بھی ایک ہی ہے جن کا نام ضام بن ثعلبہ ہے، یہ حضرات اپنی تائید میں قرآن اور بعض احادیث کے اشارات اور امام مسلم کے طرز بیان کو پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف امام قرطبی امام نووی اور شاہ انور شاہ کاشمیری رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں، دونوں حدیثوں کا طرز بیان بھی مختلف ہے، دونوں جگہ سوالات کا انداز بھی مختلف ہے اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے بشارت کے کلمات میں بھی فرق ہے، لہذا اس حدیث میں واقعہ ضام بن ثعلبہ کا ہے اور گزشتہ حدیث میں واقعہ سعد بن اہزم کا تھا۔

"من اهل نجد:" نجد بلند زمین کو کہا جاتا ہے، اس کا مقابل تہامہ ہے جو شیب زمین میں واقع ہے، آج کل حجاز پر اہل نجد کی حکومت ہے، ریاض اور اس کے اطراف کے علاقے نجد میں آتے ہیں۔

"فانثر الرااس:" یہاں مضاف محذوف ہے یعنی "معتشر شعر الرااس" پر آگندہ بال، یا بطور مبالغہ فرمایا کہ بال اتنے پر آگندہ تھے گویا سری پر آگندہ تھا۔

”دوی“: یہ دوی التحل کی طرح ہے، جھنکنا ہٹ مراد ہے، علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوی سے مراد ایسے کلمات ہیں جن کی آواز تو سنی جاسکتی ہو، مگر مفہوم سمجھ میں نہ آتا ہو، جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے۔ ۱۔

اس شخص کے بالوں اور لباس کی حیثیت سے تو یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک طویل سفر کر کے آیا تھا اور سوال کے دوران گنگناہٹ کی آواز سے معلوم ہوا کہ ان پر آنحضرت ﷺ کا وہ قدرتی رعب پڑ رہا تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا۔

”فاذا هویت بال“ اذا مفاعا تیه، تعجب کے لئے لایا گیا ہے کہ ایسے ضعیف پر آگندہ حال اور ایسے بدوی دیہاتی سے، اسلام کے متعلق سوال کرنا باعث تعجب اور غیر متوقع تھا۔ ۲۔

عن الاسلام: ای عن فرائضه التي فرضت على من وحد الله وصدق رسوله لا عن حقيقة الاسلام۔

یعنی اسلام کے ان فرائض کے متعلق سوال کر رہا تھا جو رسول کے ماننے والے ہر موجد پر فرض ہوتے ہیں، اسلام کی حقیقت اور تعریف کے بارے میں سوال نہیں تھا، اسی وجہ سے جواب میں فرائض و ارکان کا ذکر آیا ہے شہادتین کا ذکر نہیں ہے۔ یہ شخص چونکہ پہلے سے مسلمان تھا اس لئے شہادتین کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، بخاری شریف کی روایت سے اس کی تائید ملتی ہے وہاں یہ الفاظ ہیں ”فاخبرني ماذا فرض الله على من الصلوات“۔ ۳۔

سوال یہ ہے کہ فرائض اسلام میں یہاں حج کا ذکر کیوں نہیں آیا؟

جواب: ممکن ہے اس وقت حج فرض نہیں ہوا ہو کیونکہ حج چھ یا آٹھ یا نو ہجری کو مختلف احوال کے مطابق فرض ہوا تھا۔

کذا سنن جلال: یہ کہ یہ آدمی ممکن ہے کہ قابل حج نہیں تھا، غریب آدمی تھا تو آنحضرت ﷺ نے حج کا ذکر چھوڑ دیا۔

تیسرے جلال: یہ کہ ممکن ہے کسی راوی نے نسیا کر دیا یا بطور اختصار اس کا ذکر نہیں کیا ہو، حالانکہ بخاری میں روایت کے یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ۴۔

”فاخبره النبي بشرائع الاسلام“: یعنی حضور اکرم ﷺ نے اس شخص کو اسلام کے تمام شرائع کی خبر دے دی تھی۔

”خمس صلوات“: یعنی پانچ نمازیں قائم کرنی ہیں ”اقامة خمس صلوات“ او ”خذ خمس صلوات“۔

یہ سوال: اس روایت میں وتر کا ذکر نہیں ہے بلکہ پانچ فرائض کے علاوہ سب کو نوافل کہا گیا ہے جب کہ وتر کا وجود بھی ہے اور وجوب بھی ہے۔

جواب: ایک جواب یہ کہ اس وقت وتر کا وجوب نہیں ہوا تھا، عیدین کا وجوب بھی نہیں ہوا تھا۔ دوسرا جواب یہ کہ یہاں فرائض کا سلسلہ اور بیان تھا، وتر کا سلسلہ فرائض کا نہیں بلکہ واجب کا ہے یا وتر عشاء کی نماز کے تابع ہے تو الگ ذکر نہیں کیا، باقی عیدین تو صلوٰۃ سنو یہ یعنی سالانہ نماز تھی یہاں صلوٰۃ یومیہ کا ذکر چل رہا ہے۔ ۵۔

شروع نوافل کا حکم:

”الا ان تطوع“ اس جملہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ تیرے ذمہ فرض نمازیں تو صرف پانچ ہیں، ہاں اگر نوافل ادا کرنا چاہو تو ادا کر سکتے ہو، یہ مطلب واضح ہے مگر یہ اس وقت ہے جبکہ استثناء منقطع ہو الا سمعی لکن ہو۔

لیکن اگر استثناء متصل ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ تیرے ذمہ صلوات، خمسہ کے سوا کوئی نماز واجب نہیں، ہاں اگر نوافل شروع کر دو گے تو اس کے بعد وہ واجب ہو جائیں گے جن کا کھل کرنا ضروری ہوگا، بدلیل قولہ تعالیٰ ”لا تبطلوا اعمالکم“ نیز صحابہ کرام کا نقلی حج پر اجماع ہے کہ شروع فی الحج کے بعد اس کا اتمام واجب ہے ان دلائل کے بعد ابن حجر رحمہ اللہ کے اس اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی کہ نوافل میں شروع کے بعد اس کے اتمام کو لازم کہنا بلا دلیل ہے نص قرآنی اور اجماع صحابہ بڑی دلیل ہے۔

خود شوافع حضرات بھی نقلی حج اور نقلی عمرہ کے شروع کرنے کے بعد اتمام کو واجب سمجھتے ہیں اور اس مسئلہ میں امت کا اتفاق ہے، احناف پر یہ اشکال ضرور آتا ہے کہ جب نص قرآنی اور احادیث سے اتمام ثابت ہے تو پھر نوافل کے اس اتمام کو فرض کیوں نہیں کہتے ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ”لا تبطلوا اعمالکم“ اپنی دالالت میں قطعی نہیں اگرچہ ثبوت میں قطعی ہے تو اس سے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔

”لا ازید ولا انقص“ ... ای لا ازید فی التبايع ولا انقص او لا ازید فی السؤال ولا انقص فی العمل او لا ازید من تلقاء نفسی ولا انقص کذلک او الکلام علی محاورۃ العرب والعجم او اراد الرجل کمال الاطاعة کما مر تشریح الحدیث فی حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

”افلح الرجل“: الف لام جنس کے لئے ہے مراد ہر وہ شخص ہے جو اس طرح عزم بالجزم کر کے پابندی کرے۔ فلاح کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی ہے وہ یہ کہ زندگی، بھی ملے اور زندگی کے تمام اسباب بھی ملیں۔ دوسری اخروی ہے وہ یہ کہ نجات تام حاصل ہو جائے ”افلح“ کا کلمہ تمام بھلائیوں کے لئے جامع کلمہ ہے، بعض نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے ”ہانہ بقاء ہلا فناء وغنا ہلا فقر وعز ہلا ذل وعلہ ہلا جہل“۔

”ان صدق“: پہلی حدیث اور اس میں الفاظ کا تقادس ہے، وہاں یقین کے جملے غیر مشروط تھے، یہاں ”ان صدق“ کے ساتھ مشروط کیا ہے تو اگر واقعات دو ہیں، آدمی الگ الگ ہیں جس طرح سوال سے بھی پتہ چلتا ہے اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے جزم کے ساتھ کہا ہے تو پھر تو کوئی اشکال نہیں معاملہ صاف ہے، لیکن اگر ایک ہی واقعہ ہے، ایک ہی آدمی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ پہلی حدیث میں جزم کے ساتھ اور اس حدیث میں شک کے ساتھ حکم کیوں آیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جزم اور یقین کے ساتھ حکم اس وقت سنایا گیا ہے جب کہ یہ شخص موجود نہیں تھا اور جس وقت موجود تھا

تو شک ڈال دیا تاکہ آدمی غرور و تکبر اور سستی میں نہ پڑ جائے۔ یا پھر بھی کہہ سکتے ہو کہ لوگوں کے احوال کے تغیر سے وحی کے ذریعہ سے نیا نیا حکم آتا رہتا تھا، کبھی یقین کی حالت تھی، کبھی شک کی ہو گئی۔ لے

۲۵: ۱۲۰۹

حدیث وفد عبدالقیس

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا أَتَوْا النَّبِيَّ ﷺ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْقَوْمِ أَوْ مِنَ الْوَفْدِ قَالُوا رَبِيعَةُ قَالَ مَرْعَبًا بِالْقَوْمِ. أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَوَاتِمَا وَلَا تَدَامِي قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْكَ لَا تَسْتَطِيعُ أَنْ تَأْتِيَنَّكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَهَيْئَتَنَا وَهَيْئَتِكَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارٍ مُطَهَّرٍ فَمُرْنَا بِأَمْرٍ فَضَّلَ نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَ نَا وَتَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوهُ عَنِ الْأَكْثَرِيَّةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَتَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَحَدُّهُ قَالَ أَتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحَدُّهُ قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَإِقَامُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَأَنْ تُحْفَظُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمْسِ وَتَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ عَنِ الْخُنْثِيمِ وَالنُّثَاءِ وَالنَّكْبَرِ وَالْمُرْقَبِ وَقَالَ احْفَظُوا هُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِ مَنْ وَرَاءَكُمْ. (مشفق علیہ وتلفظہ للبخاری) لے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب وفد عبدالقیس نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں مدینہ پہنچا تو نبی اکرم ﷺ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں یا یوں پوچھا کہ یہ کس قبیلہ کا وفد ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ قبیلہ ربیعہ کے افراد ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا خوش آمدید۔ (اور چونکہ تم لوگ خوئی سے مسلمان ہو کر آئے اس لئے) نہ دنیا میں تمہارے لئے رسوائی ہے اور نہ آخرت کی شرمندگی ہے۔ اہل وفد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! چونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار منفرک (مشہور جنگجو) قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں جلد جلد نہیں آ سکتے ہیں صرف ان مہینوں میں آ سکتے ہیں جن میں لڑنا حرام ہے۔ لہذا آپ حق و باطل کے درمیان واضح اور دو ٹوک انداز سے فرق کرنے والے ایسے احکام ہمیں عطا فرما دیجئے جن پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو بھی ہم اس سے آگاہ کر دیں جن کو واسطے پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اس پر عمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہو جائیں اسی کے ساتھ انہوں نے ان برتنوں کے بابت بھی پوچھا (جن میں نیبہ بتائی جاتی تھی کہ کون سے استعمال میں لائے جاسکتے ہیں اور کون سے نہیں) آپ ﷺ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع کیا۔ اول اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا اللہ پر ایمان لانا اس حقیقت کی شہادت دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود حاجت روا اور مشکل کشا نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پابندی سے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا، ان چار باتوں کے علاوہ بعد میں آپ ﷺ نے

مال نسبت میں سے پانچویں حصے کے دینے کا حکم بھی فرمایا، اور ان چار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا ① لاکھ کئے ہوئے برتنوں سے ② کدو کی تونہوں سے ③ درخت کی کھوکھلی جڑوں سے بنائے ہوئے برتنوں سے ④ اور رال کئے ہوئے برتنوں سے پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان باتوں کو اچھی طرح یاد کر لو اور جن مسلمانوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہوں ان کو بھی ان باتوں سے آگاہ کر دو۔

(بخاری و مسلم، الفاء بخاری کے ہیں)

توضیح: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں ہجرت سے تین سال قبل مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے فتاہت حکمت اور تفسیر قرآن کی دعا مانگی تھی اس لئے گفتگو میں افصح الناس تھے، علم میں اعلم الناس تھے اور شکل میں اجمل الناس تھے، بے قد کے مالک تھے، جب پیدل چلتے تو سواری پر معلوم ہوتے تھے، دو دفعہ جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں ان کو عمر رسیدہ صحابہ کرام پر مقدم رکھتے تھے اور ان سے مشورہ لیتے تھے، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ۱۷ سال کی عمر میں ۶۸ھ میں انتقال کر گئے، طائف میں جامع مسجد ابن عباس کے مکتبہ ابن عباس میں مدفون ہیں۔

”ان وفد عبدالقیس“: وفد وفد کی جمع ہے جیسے ركب راکب کی جمع ہے، وفد اس جرمہ کا نام ہے جو کسی قوم کی طرف سے اشراف پر مشتمل جماعت ہو اور کسی امیر و حاکم کے پاس اپنی حاجت کے سلسلہ میں جائے۔

عبدالقیس ان کے بڑے دادا کا نام تھا یا وفد کے لیڈر کا نام تھا، یہ وفد چالیس افراد پر مشتمل تھا اور قبیلہ ربیعہ بنی نزار سے ان کا تعلق تھا جو قبیلہ مضر کے مقابل تھے۔

وفد عبدالقیس کب مدینہ آیا تھا:

عبدالقیس بحرین کا ایک بڑا قبیلہ تھا، یہ وفد مدینہ منورہ کب آیا تھا؟ اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کب حاضری دی تھی؟ اکثر علماء اور شارحین حدیث کے قول کے مطابق یہ وفد ۸ھ میں آیا تھا اور یہ لوگ برضا اور رغبت خود مسلمان ہو کر آئے تھے، امام تاریخ علامہ واقفی اور قاضی عیاض رحمہما اللہ اسی قول کی طرف گئے ہیں۔ امام مغازی ابن اسحاق اور ابن کثیر وغیرہ اہل تاریخ کے نزدیک یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا۔ ابن اثیر اور تاریخ فیہی والے نے اس وفد کی آمد کو ۱۰ھ میں بتایا ہے۔

تحقیق کے بعد یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ وفد دو دفعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تھا ایک مرتبہ ۵ھ میں اور دوسری دفعہ ۹ھ میں حاضر خدمت ہوا تھا۔

وفد عبدالقیس کی آمد کا سبب:

بحرین کے لوگ تاجر پیشہ تھے، ان میں سے ایک تاجر منذر بن حیان بغرض تجارت مدینہ منورہ آیا تھا آنحضرت ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی نبی اکرم ﷺ نے دلچسپی سے اہل بحرین کے شرفاء کے حالات ان سے معلوم کئے اور خصوصیت سے ایک صاحب منذر بن عائد کے حالات دریافت کیے۔ آنحضرت ﷺ نے منذر بن حیان کو اسلام کی دعوت دی، وہ مسلمان ہو گئے اور کچھ ضروری چیزیں اسلام کی سیکھ کر واپس وطن جانے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے بحرین کے سرداروں کے نام خط لکھ کر ان کے حوالہ کر دیا منذر بن حیان یہ خط لے کر بحرین پہنچا اور منذر بن عائد مقلب بائج عبدالقیس کے ہاتھ میں دے دیا۔ منذر بن حیان ابج عبدالقیس کا داماد تھا ان کی بیوی ابج کی بیٹی تھی وہ منذر بن حیان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتی تھی اور حیران ہو جاتی تھی اس نے اپنے باپ ابج کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ میرا شوہر جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے وہ عجیب عجیب عبادات میں مشغول رہتے ہیں۔ ابج نے جب آنحضرت ﷺ کا خط کھول کر پڑھا اور بیٹی سے اسلام کے بارے میں سنا تو وہ مسلمان ہو گیا پھر انہوں نے مجمع میں یہ خط پڑھ کر سنایا لوگ مسلمان ہو گئے اور پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اس واقعہ یہ وفد تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ۱۔

مدینہ پہنچ کر سب نے دوز دوڑ کر آنحضرت ﷺ کو سلام کیا، دست بوسی کی لیکن ابج نے پہلے ساتھیوں کا سامان محفوظ کیا، پھر اونٹ باندھ دیئے، پھر نئے کپڑے پہن کر نہایت وقار سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری دی، دست مبارک کو بوسہ دیا، شکل و شباہت اچھی نہیں تھی، آنحضرت ﷺ نے تعجب سے جب دیکھا تو ابج کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ انسان کی یہ کھال تو مشکیزہ کی مانند ہے، اصل انسان تو یہ نہیں ہے درحقیقت "الانسان باصغریہ" یعنی دو چھوٹے اعضاء کی وجہ سے انسان انسان ہے اور وہ دل اور زبان ہیں۔ ابج سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں "دائمی اور بردباری" ابج نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ خصلتیں پیدائشی ہیں یا میں نے کسب سے حاصل کی ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تجھ میں یہ پیدائشی ہیں اس پر وہ خوش ہوئے اور پھر کہا: "الحمد لله الذی جعلنی علی خلیقتین یحبہما اللہ ورسولہ"۔

چونکہ منذر بن عائد کے چہرے پر زخم کا نشان تھا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ابج کا لقب دیا، چنانچہ نووی فرماتے ہیں کہ منذر بن عائد کو ابج کا لقب حضور اکرم ﷺ نے دیا تھا پھر وہ ابج عبدالقیس سے مشہور ہوا۔

من القوم اومن الوفد: اس کلام میں راوی کو شک ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "من القوم" فرمایا تھا یا "من الوفد" فرمایا تھا، یہ صحابہ کرام کا نہایت احتیاط اور ان کی اعلیٰ ذہانت اور امانت اور حضور اکرم ﷺ سے محبت تھی کہ تلفظ میں تغیر کو گوارا نہیں کرتے تھے، لفظ "او" کے بعد "قال" پڑھا جاتا ہے حضور اکرم ﷺ کا ان لوگوں سے یہ سوال یا تو تعارف کے لئے تھا یا طلب استیفاء کی غرض سے تھا، یہ آپ کی عام عادت تھی جس میں محبت ہی محبت تھی۔ ۲۔

منجانبہ: یعنی ہم ان واضح اور دونوں احکامات کو واپس جا کر اپنی قوم کے سامنے بیان کریں گے، اس سے اشاعت دین کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور تبلیغ کی ذمہ داری کا احساس بھی معلوم ہوتا ہے مگر پہلے سیکھ کر تیار ہونے اور پھر جانے کے اصول کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، تفصیل سے سیکھو پھر جاؤ۔

و لدخل بہ الجنة: منجانبہ و لدخل دونوں فعل مجزوم بھی ہیں کیونکہ یہ "مولانا" امر کے جواب میں آئے ہیں اور دونوں جملہ متانفہ کی صورت میں مرفوع بھی ہیں، دخول جنت سے مراد یہ کہ ہم رضائے الہی کا خاص مقام چاہتے ہیں جو جنت ہے کیونکہ جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کے مجموعے کا نام ہے۔

اب یہ اعتراض نہیں آئے گا کہ عمل تو دخول جنت کا موثر ذریعہ نہیں، موثر علت تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، عمل تو صرف وسیلہ ہے تاہم نفس جنت کا سوال بھی جائز ہے کیونکہ وہ بھی مامور بہ حکم ہے مگر اعلیٰ خلوص کی بات ہی اور ہے۔

وسالوۃ عن الاشربة: اشربہ جمع شرب بمعنی مشروب ہے اور جواب سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گویا فرمایا کہ تم تو مشروب کا پوچھتے ہو میں تو ان مشروبات کے برتنوں کو بھی جائز نہیں سمجھتا، جن میں کبھی شراب رکھنے بنانے اور پینے کا عمل ہوا تھا، کیونکہ یہ برتن مذکرات ہیں، ان سے روکنا بھی تاکیدِ حکم ہے تاکہ شراب سے بھی مکمل اجتناب و نفرت ہو جائے، جب اس کی نفرت صحابہ کے دلوں میں بیٹھ گئی، تب برتن رکھنے کی اجازت بھی مل گئی، بہر حال اشربہ بخذف مضاف ہے اسی عن ظروف الاشربة کیونکہ یہ لوگ مسلمان تھے حرمت شراب کے پہلے سے قائل تھے۔

فامرہم ہاربع:

سوال: یہاں ایک مشہور سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ اجمال میں چار چیزوں کا وعدہ کیا گیا کہ "فامرہم ہاربع" مگر تفصیل میں پانچ اشیاء کا ذکر آ گیا ہے یعنی ایمان، نماز، زکوٰۃ، صوم، اعطاء خمس یہ پانچ چیزیں ہیں اور اگر تفصیل و اجمال ایک ہے تو پھر صرف ایمان کا ذکر ہو گیا اور اسی کے فروعات کا ذکر آ گیا اور چار چیزوں کا وعدہ پورا نہ ہوا۔

جواب:

اس کے کئی جوابات ہیں اور شارحین نے چھوٹی چھوٹی وجوہات کو بھی سمجھ کر کئی جوابات بنا دیئے ہیں میں دو تین باتیں بیان کروں گا۔

① اول جواب: یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے چار چیزوں کا وعدہ فرمایا تھا اور "اقامہ الصلوٰۃ لیتماء الزکوٰۃ صوم رمضان وان تعطوا من الخمس" تک چاروں کو بیان فرمایا۔ رہ گیا شہادتین کا ذکر تو وہ توطیہ و تمہید اور تبرک کے طور پر تھا کیونکہ یہ لوگ پہلے سے مسلمان تھے، ان کے لئے شہادتین کا ذکر صرف بطور تبرک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی تائید بخاری کی روایت سے ہوتی ہے جہاں شہادتین کا ذکر ہی نہیں، چنانچہ بخاری ج ۲ ص ۹۱۲ پر یہ حدیث اس طرح ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ اربع واربع ① اقيموا الصلوة ② واتوا الزکوة ③ وصوم رمضان ④ واعطوا خمس ما غنم الخ۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شہادتین کا تذکرہ چار چیزوں کے وعدے میں نہیں ہے، جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں بطور تبرک تو طیبہ و تمہید ذکر کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں آنحضرت ﷺ نے گنتی کے وقت شہادتین پر انگلی بند فرمادی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گنتی میں امر اول تھا، مگر علماء نے لکھا ہے کہ یہ توحید کی طرف اشارہ تھا گنتی کی طرف نہیں تھا، کیونکہ اس کے بعد آپ نے دوسری انگلی کو نہ بند کیا نہ اشارہ کیا، اگر گنتی ہوتی تو سب میں انگلی بند فرمادیتے۔

⑤ دوسرا جواب: یہ ہے کہ شہادت کو امر اول شمار کرو نماز زکوة روزہ یہ چار ہو گئے۔ اور خمس کا جو ذکر آیا ہے اس کا عطف "امرهم" پر ہے عبارت اس طرح ہے "امرهم بأربع وامرهم ان تعطوا من المغنم الخمس" تو خمس کا ذکر گنتی کے اندر نہیں بلکہ دند کے ماسورات میں سے ہے کہ یہ کرو، یہ کرو اور خمس ادا کرو۔ یہ دو جواب سب سے عمدہ اور قابل اعتماد ہیں۔

⑥ تیسرا جواب: یہ بھی دیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چار چیزوں کی گنتی فرمائی تھی مگر کسی راوی نے اختصار کر کے سب کو چھوڑ دیا اور ایمان کے اجمال و تفصیل کو ذکر کر دیا یہ عجیب جواب ہے۔

⑦ چوتھا جواب: یہ ہے کہ شہادتین سے لے کر خمس تک چار چیزوں کا آنحضرت ﷺ نے ذکر فرمادیا اور مال غنیمت اور خمس کا ذکر بطور اضافہ اس وقت کی مناسبت سے ان کے لئے اس لئے کیا کہ یہ لوگ قبیلہ معفر سے جہاد کے میدان میں برسر پیکار تھے ان کو اس حکم کی ضرورت تھی۔

اس حدیث میں حج کا حکم مذکور نہیں کیونکہ حج ۹ھ میں فرض ہوا تھا اور وفد عبدالقیس ایک دفعہ ۹ھ ہجری سے پہلے آیا تھا۔
ونہاھم عن أربع: یعنی آنحضرت ﷺ نے ان کو چار قسم کے ایسے برتنوں سے منع فرمایا جس میں وہ لوگ شراب بناتے تھے۔ جن کے مسامات بند ہوتے تھے اور اس میں بہت جلدی شراب بنتی تھی اور جلدی سکر آتا تھا تو ابتداء میں اس میں نبیذ بنانے کو بھی منع فرمایا کہ کہیں دوبارہ شراب بنانا شروع نہ ہو جائے یہ کل چار برتن تھے۔ ۱۔

⑧ الحنتمہ: حنتمہ اور مکامی کا سبز ٹھیلیا یا روغنی مرتبان اور روغنی گھڑا ہوتا تھا۔ ۲۔

⑨ الدبہام: یہ ایک قسم کا کدو ہے جو خشک ہوتا ہے اور اس کے اندر سے کرید کر خم کو پھینک دیا جاتا ہے یہ اندر سے بہترین برتن ہے اوپر سے پکڑنے کے لئے ایسی گردن ہے گویا پکڑنے ہی کے اندازے پر تخلیق ہوئی ہے اس کو تو نبی بھی کہتے ہیں اب بھی قبائل اور کوہستانی علاقوں میں لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ۳۔

⑩ النقیور: یہ بھی ایک برتن ہے لوگ کھجور کے درخت کا تنہ اندر سے تراش کر کھوکھلا بنایا کرتے تھے اور پھر اس میں شراب بناتے اور رکھتے تھے۔ ۴۔

⑤ المزفت: یہ وہ برتن ہے جس پر وہ لوگ سیاہ تار کول مل لیا کرتے تھے، یعنی روغن زفت یا روغن قار جو کشتیوں پر ملا جاتا تھا اور جاہلیت میں شراب کے ان برتنوں پر مسامات بند کرنے کی غرض سے مل لیا کرتے تھے، یہ بھی روغن برتن ہے ابتداء میں حرمت شراب کے وقت ان برتنوں کی بھی ممانعت تھی پھر اجازت مل گئی جیسے مشکوٰۃ زیارۃ التیور میں یہ روایت ہے "و نهیتکم عن النبیذ الا فی سقاء فاشربوا فی الاسقیة کلھا ولا تشربوا مسکرا"۔

(مشکوٰۃ ص ۱۵۲)۔

ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے اور یہی دلیل ہے باب الاشریہ مشکوٰۃ ص ۳۷۰ میں بھی اسی قسم کی روایات ہیں امام مالک رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہما کے ہاں ان برتنوں کا استعمال اب بھی ناجائز ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول اور فتویٰ کو لیتے ہیں کہ انہوں نے منع فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت بعد میں ختم ہو گئی تھی لہذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں تاویل کی جائے گی کہ شاید ان کو نسخ کا علم نہ ہوا ہو۔

واحفظوہن: اس سے معلوم ہوا کہ پہلے سیکھو پھر جا کر سکھاؤ، پہلے تبلیغ کی تیاری کرو پھر جا کر تبلیغ کرو، خوب یاد کرو تا کہ بیان کرنے میں غلطی نہ آئے۔

۲۶ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ

اسلام کے احکامات

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَحَوْلَهُ عَصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ يَأْبَعُونَ عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تُزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ وَلَا تَأْتُوا بِمُهْنَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَهُوَ كَفَّارٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَمَنْ سَعَى اللَّهُ عَلَيْهِ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبِأَيِّعَنَاءُ عَلَى ذَلِكَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی اس جماعت کو جو آپ کے ارد گرد بیٹھی ہوئی تھی فرمایا مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، اپنے بچوں کو قتل نہ کرو گے، جان بوجھ کر کسی پر بہتان تراشی نہ کرو گے اور شریعت کے مطابق تمہیں جو احکام دوں گا اس کی نافرمانی نہیں کرو گے، پس تم میں سے جو شخص اس عہد و اقرار کو پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو شخص (شرک کے سوا) ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے اور پھر دنیا میں اس کو اس کی سزا بھی مل جائے (جیسے حد وغیرہ جاری ہو) تو یہ سزا اس کے

اس گناہ کے لئے کفارہ ہو جائے گی۔ اور کسی شخص نے ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا (اور دنیا میں سزا نہ ملی) تو اب وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہے چاہے تو وہ ازراہ کرم آخرت میں بھی اسے معاف کر دے اور چاہے تو آخرت میں اسے سزا دے دے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے ان سب شرطوں پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔

توضیح: عبادۃ: جہاں بھی آئے گا تو فعالہ عجالہ کے وزن پر آئے گا مگر امام بخاری کے شیخ محمد بن عبادہ واسطی میں ایسا نہیں ہوگا، وہاں یحییٰ مفتوح ہے، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو الولید انصاری ہے، یہ نقباء میں سے ہیں فقہ اولیٰ ثانیہ اور ثالثہ تینوں میں شریک رہے، اسی طرح بدر اور دیگر تمام غزوات میں بھی شریک ہوئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا قاضی بنایا تھا، یہ حمص میں رہے پھر فلسطین چلے گئے اور رملہ یا بیت المقدس میں ۳۴ھ میں انتقال کر گئے ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ لہ

”عصابۃ“: فعالہ کے وزن میں احاطہ کا معنی پڑا ہے جیسے عمامۃ حمالۃ، جعابۃ حبالۃ، عصابۃ عصب سے ماخوذ ہے اور عصب شدت اور مضبوطی کے معنی میں ہے، چنانچہ سر پر مضبوط پٹی باندھنے کو عصابہ کہتے ہیں۔ دس سے چالیس افراد کی جماعت کو عصابہ کہتے ہیں، یہ بھی ایک دوسرے کے لئے مضبوطی کا سبب ہوتے ہیں، کبھی چالیس سے زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے جیسے اصحاب بدر پر عصابۃ کا اطلاق ہوا ہے وہ ۳۱۳ تھے۔ لہ

بیعت کی بحث:

ہایعونی مباہلۃ سے ماخوذ ہے یہ بیعت بھی مشابہ بیع ہے جس طرح بیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی ہے اسی طرح بیعت بھی ایک عہد و عقد اور قول و قرار ہے جس کا مفہوم ”نبیل الاجرو والشواب بالطاعة والا نقياد“ ہے گویا اپنی جان و مال کسی کے حوالے کرنا کہ یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے ہیں اس کی مرضی میں استعمال کرنا یہ بیعت ہے بیعت کی مشہور چار قسمیں ہیں: لہ

① بیعت اسلام ② بیعت جہاد ③ بیعت خلافت ④ بیعت طریقت۔

صحابہ کرام نے بیعت اسلام اس وقت کیا جب انہوں نے اسلام قبول کیا پھر صلح حدیبیہ کے موقع پر عام بیعت جہاد کیا پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔

بیعت طریقت اس بیعت کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کامل شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ترک معاصی اور التزام طاعات کا عہد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کی رہنمائی میں اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے تابع بناؤں گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں جس بیعت کا ذکر آیا ہے یہ کون سی بیعت تھی؟ تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بیعت بیعت طریقت تھی کیونکہ بیعت اسلام تو صحابہ پہلے کر چکے تھے ایک مسلمان سے بیعت اسلام لینے کی کیا ضرورت ہے۔

اسی طرح یہ بیعت جہاد بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ جہاد کا کوئی مضمون اس حدیث میں مذکور نہیں ہے، اسی طرح یہ بیعت خلافت بھی نہیں تھی کیونکہ یہاں نبوت کا دور ہے خلافت کا دور ابھی نہیں آیا تھا، کیونکہ نبی کے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت بعد میں ہوئی اب واضح طور پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ بیعت ترک معاصی اور التزام اطاعت کے لئے تھی اور یہی بیعت طریقت ہوتی ہے گو اس وقت اس کا نام نہیں تھا اور نہ اس کی شہرت تھی تاہم وقتاً فوقتاً آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے صفاء باطن کے لئے اور التزام شریعت کے لئے اس قسم کی بیعت لی ہے۔ لہذا جس بیعت کو بعد میں مشائخ نے بیعت طریقت کا نام دیا ہے اس کا یہ عنوان اور نام نہ کسی آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں دوسرے عنوان کے حوالہ سے اس کا کام ہوا ہے اور وہ تجدید اعمال کا عہد اور التزام شریعت کا وعدہ تھا جو اس حدیث میں واضح طور پر مذکور ہے لہذا بیعت طریقت کو بدعت کہنا انتہائی بے انصافی اور ظلم ہے۔

اسی طرح حدیث جبرائیل میں درجہ احسان اسی سلوک اور بیعت طریقت کا نام ہے اگرچہ الگ الگ عنوان ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب علم و دلائل کی کشمکش ہو تو یہ شریعت ہے اور جب قلبی طمانیت ہو تو یہ طریقت ہے یا یوں کہیں کہ جب آدمی احکام اسلام پر تکلف کر کے چلتا ہے تو یہ شریعت ہے اور جب مزاج بن جائے تو یہ طریقت ہے یا یوں سمجھیں کہ دین اسلام کا ابتدائی سفر شریعت ہے اور خوب مہارت کے بعد انتہاء طریقت ہے جس طرح ایک ڈرائیور پہلے سیکھتا ہے اور پھر ہاتھ کی صفائی کے لئے شارع عام پر آتا ہے تاکہ خوب مہارت حاصل کرے۔

بہر حال اصل بیعت و طریقت سنت سے ثابت ہے مگر اس میں زیادہ تر ٹھگ لوگ داخل ہو گئے۔ جنہوں نے اس طریقہ کو بدنام کیا ورنہ اہل اللہ کے ہاتھ پر بیعت اور شریعت کی محنت تو کبریت احمر ہے:۔

نہیں ملتے یہ موتی بادشاہوں کے خزینوں میں

نیز بیعت نساء اور اس کے اصلاحی پہلوؤں کو خود قرآن مجید کی سورت ہمتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اس طرح بیعت طریقت کی ایک اصل قرآن سے ثابت ہوئی پھر سلف صالحین میں یہ مبارک عمل متواتر چلا آیا ہے تو انکار بیکار ہے۔

ان لا تشرکوا: شرک سے مراد شرک اصغریا یا کاری ہے یا یہ تجدید بیعت ہے اور آئندہ کے لئے شرک سے بچنے کی ہدایت ہے ورنہ مسلمان تو پہلے سے توحید پر ہوتا ہے۔

عرب میں قتل اولاد کا فلسفہ:

ولا تقتلوا اولادکم: چونکہ عرب میں قتل اولاد کا رواج تھا اس لئے خصوصیت سے یہ بیعت لی گئی۔ عرب میں دو قسم کے لوگ دو مختلف کمزوریوں کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو فی الحال مفلس و فقیر تھے یہ اولاد کا بوجھ اٹھانے سے عاجز تھے، اس لئے اولاد کو قتل کرتے تھے قرآن کریم نے ان کو کہا ہے "ولا تقتلوا اولادکم من اصلاق" دوسرے وہ لوگ تھے جو فی الحال تو خوشحال تھے لیکن ان کو خطرہ تھا کہ آئندہ اولاد بڑھنے سے ہم فقیر ہو جائیں گے

تو وہ اولاد کو قتل کرتے تھے ان کے لئے قرآن کریم نے یہ اعلان کیا "وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" کہ تمہیں آئندہ کا خوف فقر و امن گیر نہیں ہونا چاہیے پھر دونوں قسم کے لوگوں کو قتل دی گئی۔ اول قسم کو فرمایا "مَنْ نَزَقَكُمْ وَاِيَاهُمْ" کہ ہم تمہیں بھی اور آئندہ تمہاری اولاد کو بھی رزق دیں گے اور دوسری قسم کو فرمایا "مَنْ نَزَقَهُمْ وَاِيَاكُمْ" کہ ہم ان کو بھی دیں گے اور تمہیں بھی دیں گے۔ یہ اسلوب کلام فصاحت و بلاغت سے بھر ہوا ہے ذرا غور تو کرو۔

عرب میں خاص کر بچیوں کے قتل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لڑکی بڑی ہو جائے گی تو دوسرے مرد کے ساتھ کیسے جائے گی وہ اس سے جنسی استفادہ کیونکر کرے گا، یہ جاہلیت کی بے جا حسیت تھی جس کی وجہ سے وہ بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، اسلام نے خواتین پر احسان عظیم کیا اور اس رسم کو حرام قرار دے کر مردوں اور عورتوں کو دوزخ سے بچالیا۔ آج کل اسکول و کالج میں بچوں اور بچیوں کو داخل کرا کر ان کے مستقبل کو دینی اور اخلاقی اعتبار سے تباہ کرنا بھی درحقیقت زندہ درگور کرنا ہے پیٹ کی خاطر ان کی آخرت تباہ کرنا کون سی تعلیم و عقلمندی ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا صد حیف کہ فرعون کو کالج کی نہ سوچھی
ولا تاتوا بہتان: بہتان بہت سے مہبوت اور متحیر کرنے کے معنی میں ہے، یہ وہ جھوٹ ہے جو سننے والے کو حیرت
میں ڈال دیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد "قذف" ہے۔

بین ایدیکم وارجلکم: ہاتھ اور پاؤں کا ذکر اس لئے کیا کہ بڑے بڑے کام انہی سے رونما ہوتے ہیں "تسمیۃ
الشیئ باہم جزئہ" مراد انسان کی ذات اور نفس انسان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آئنے سائے کسی
پر بہتان نہ لگاؤ کیونکہ یہ سخت تر ہوتا ہے اور باعث فساد ہوتا ہے۔

ولا تعصوا فی معروف: معروف کا ذکر یہاں تعیم بعد تخصیص ہے کہ خاص خاص چیزوں کے بعد عام معروف کا ذکر کیا۔
معروف و منکر وہ ہے جس کا حسن اور قبح شریعت سے معلوم ہو۔ معروف میں تمام مامورات و منہیات شرعیہ آگئے تو اس میں
رسالت پر ایمان بھی آگیا تو ساری شریعت کی اطاعت بھی آگئی، یہاں معروف کی قید اتفاقی ہے کیونکہ کسی نبی کا کوئی فعل غیر
معروف نہیں ہوا کرتا مراد یہ کہ لا تعصوا فی شئی من الاشیاء۔

فمن وفی: وفی تخفیفاً و تشدیداً دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے کہ "وفی" یہ ہے کہ کوئی کام پورا
پورا اور مکمل کیا جائے لہذا یہ ثواب اس شخص کو ملے گا جو تمام حقوق و عہد و مکمل کرے۔

فموجب بہ: یعنی اس مرتکب گناہ پر حد شرعی قائم کر دی گئی۔ فہو کفارۃ لہ: ایک نسخہ میں فہو طہور لہ آیا ہے یہ حکم
شرک کے علاوہ دیگر معاصی کے لئے ہے۔

حدود کفارات ہیں یا زاجرات؟

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ آیا حدود مکفرات و مطہرات ہیں یا زاجرات ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ حد قائم ہونے کے بعد سزا یافتہ شخص آخرت کے عذاب سے بھی پاک ہو گیا یا یہ صرف دنیوی جزا تھا اور آخرت میں پھر سزا ہوگی۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تینوں کے نزدیک حدود مطہرات ہیں کہ دنیا میں حد قائم ہونے سے یہ شخص آخرت کی سزا سے پاک ہو گیا۔ ائمہ احناف کے نزدیک حدود زاجرات ہیں دنیاوی سزا حد ہے تاکہ معاشرہ میں نظم و امن قائم ہو اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حکم توڑنے کی سزا الگ ہوگی، ہاں جن حدود سے توبہ ملتی ہو جائے اور سزا یافتہ شخص سچے دل سے توبہ کرے تو پھر یہ حدود مطہرات نہیں گئے، بغیر توبہ صرف زاجرات ہیں۔

دلائل:

جمہور کی دلیل زیر بحث حضرت عبادہ بن صامیہ کی روایت ہے جس میں ”فہو كفارة“ کے الفاظ آئے ہیں کہ حدود کفارات ہیں۔

① ائمہ احناف کی پہلی دلیل سورہ مائدہ آیت محاربہ ۳۴ ہے ”ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ اب اگر حد مطہر و سائر مکفر ہے تو قطعاً طریق کو آخرت کا یہ عذاب عظیم کیوں ہے؟ معلوم ہوا یہ زاجر ہے ہاں اگر سچی توبہ سے یہ حد ملتی ہو تو پھر زاجر کے ساتھ مطہر بھی ہے۔

② اسی سورہ مائدہ میں آیت نمبر ۳۸ آیت سرقہ کے نام سے مشہور ہے:

”وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً مِّمَّا كَسَبَا لِكُلٍّ مِّنْهُمُ الْعَذَابُ وَعَالِلُهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ“۔

اس آیت میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بتایا اور پھر ”فَمَنْ تَابَ“ سے توبہ کا ذکر کیا گیا اگر صرف حد سائر و مکفر ہے تو پھر توبہ کے تذکرے کا کیا مطلب ہے۔ معلوم ہوا حد زاجر ہے ہاں اگر ملتی یا توبہ ہو تو پھر سائر اور مطہر ہے۔

③ سورہ نور کی حد قذف والی آیت نمبر ۴ میں ہے:

”فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا“۔

اس آیت میں حد قذف لگنے کے بعد بھی اس شخص کو فاسق کہا گیا ہے اور اس کو مردود الشہادت قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کی توبہ کا ذکر ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ سے کیا گیا اگر حد سائر و مکفر و مطہر ہے تو حد لگنے کے بعد وہ مردود الشہادت کیوں ہے؟ فاسق کیوں ہے؟ اور پھر اس کی توبہ کا ذکر اور اس کی ترغیب کیوں ہے؟ معلوم ہوا حدود زاجر ہیں سائر

نہیں۔ یہاں "الا الذین" کا استثناء "فاسفلون" سے ہے کیونکہ وہ قریب ہے اور قریب سے استثناء جب ممکن ہو تو وہی متعین ہے۔

نیز یہ استثناء حد قذف سے ممکن بھی نہیں کیونکہ قاضی کے پاس جب گواہ وغیرہ سے ثبوت حد ہو جائے تو وہ حد تو بہ کرنے سے ساقط نہیں ہوتی، جب حد ساقط نہیں ہوتی ہے تو پھر استثناء لغو ہو جائے گا اور حاشا وکلا کہ اللہ کا کلام لغو ہو جائے۔

احناف نے ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے جن میں حد لگنے کے بعد حضور ﷺ نے سزایافتہ شخص سے فرمایا کہ استغفار کرو معافی مانگو بعد اللعیا والعی وبعد القض وقضیضہا انصاف یہ ہے کہ حدود نہ مطلقاً سائر ہیں اور نہ مطلقاً زواجر ہیں بلکہ اقرار اور توبہ اور عدم اقرار و عدم توبہ کا فرق ہے جس نے جل جل کر اور رو کر اقرار کیا اور توبہ کی تو حدود سوا تر ہیں ورنہ زواجر ہیں تو طرفین کا اختلاف لفظی بن کر ختم ہو گیا۔ مذکورہ حدیث بھی آیات کی وجہ سے مقید ہوگی اور توبہ کی شرط ملحوظ ہوگی۔

احناف کی طرف سے جہور کو الزامی جواب یہ ہے کہ مرتد کی سزا دنیا میں موت ہے تو کیا سزا پانے کے بعد یہ مرتد پاک ہو گیا آخرت میں اس کو عذاب نہیں ہوگا؟

فسرۃ اللہ علیہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ وہ بھی اس گناہ کا تذکرہ لوگوں کے سامنے نہ کرے بلکہ خفیہ طور پر توبہ کرے پس قاعدہ یہ ہے کہ خلوت کی معصیت کی توبہ خلوت میں ہے اور جلوت کی جلوت میں ہے۔ لے

۱۲: ۱۰۹، ۱۱۰

عورتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کا فرمان

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي أَحْضَى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُطْصَلِ فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنْ أُرِيكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَا رَسُولُ اللَّهِ قَالَ تَكْمُزْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَةَ مَا زَأَيْتُ مِنْ نَائِصَاتٍ عَقِلَ وَدِينٍ أَفْهَبَ لِلْبَّيْتِ الرَّجُلِ الْحَارِ بِهٍ مِنْ إِحْدَاكُنَّ قُلْنَ وَمَا نُفْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ نَصِيبِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَلَيْكَ مِنْ نُفْصَانِ عَقْلِهَا قَالَ أَلَيْسَ إِذَا حَاصَتْ لَهَا تُصَلَّى وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَلَيْكَ مِنْ نُفْصَانِ دِينِهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۱

ترجمہ: اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ عید الفطر یا بقر عید کی نماز کے لئے عید گاہ تشریف لائے تو عورتوں کی ایک جماعت کے پاس سے بھی گزرے (جو نماز کے لئے الگ ایک گوشہ میں جمع تھیں) ان کو مخاطب کر

کے آپ ﷺ نے فرمایا اسے عورتوں کی جماعت اتم صدقہ و خیرات کرو کیونکہ میں نے تم میں سے اکثر کو دوزخ میں دیکھا ہے (یہ سن کر) عورتوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس کا سبب کیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کی نافرمانی و ناشکری کرتی رہتی ہو اور میں نے عقل و دین میں کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بیوقوف بنائے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ سن کر ان عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی آدمی گواہی کے برابر نہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کی عقل کا نقصان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کے دین کا نقصان ہے۔

توضیح: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام سعد بن مالک ہے۔ مگر کنیت سے مشہور ہوئے ہیں۔ قبیلہ خدرہ کی طرف منسوب ہیں جو انصار کا ایک قبیلہ ہے، یہ کثیر الروایت صحابہ میں سے ہیں ۶۲ھ میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئے ہیں، آپ کی عمر ۸۳ سال تھی۔

فی اضعی: ای فی عید الاضحیٰ تو مضاف محذوف مقدر ہے "اوفطر" راوی کو شک ہے۔
المصلی: عید گاہ کے معنی میں ہے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ عید گاہ آج تک موجود ہے، معلوم ہوا ان کے زمانے تک تھا، اب تو کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، عید کی نماز کے لئے نکلنا سنت متوارثہ ہے۔ بلا ضرورت مسجد میں عید کی نماز پڑھانا سنت متوارثہ سترہ کے خلاف ہے۔ ہاں آج کل لوگ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک جگہ جمع ہونا محال ہے نیز تحالف عقائد اتنا ہے کہ اجتماع ممکن نہیں۔

مر علی النساء: مر کا صیغہ متعدی بالباء وعلی ہوتا ہے، ممکن ہے آپ ﷺ وعظ کے لئے وہاں گئے ہوں یا یہ کہ جب گذر رہی ہو، پھر وعظ بھی فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت عورتیں بھی نماز کے لئے مسجدوں میں جاتی تھیں تو زمانہ خیر القرون کا تھا۔ ان کا نزول ہو رہا تھا، مدینہ منورہ کی پاک سرزمین تھی، صحابہ کرام کی پاک باز جماعت تھی اور نبی اکرم ﷺ کا مقدس وجود۔ اود تھا، تو عورتوں کو کئی پابندیوں کے ساتھ مسجد میں آنے کی اجازت تھی۔

پھر احوال کی۔ ابی سے ان پر پابندیوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا پھر مکمل ممانعت کر دی گئی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے واضح ہے۔ آئندہ اس مسئلہ کی تفصیل آئے گی۔

اریت کن: اگر رویت سے رویت قلبی مراد ہے تو پھر یہ قلبی رویت یا صلوٰۃ کسوف میں ہوئی ہوگی، یا بطور وحی ہوئی ہوگی یا کشف و انکشاف کی صورت میں ہوئی ہوگی اور اگر رویت بصری ہے تو پھر معراج کی رات آپ کو جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی تھی۔ وہ مراد ہوگی "اری" بمعنی "اعلم"۔ تین مفعول چاہتا ہے۔ مفعول اول "اریت کن" میں نائب فاعل کی ہے، مفعول ثانی "کن" اور "اکثر اهل العار" مفعول ثالث ہے۔

تصدقن: چونکہ صدقہ کفارہ سینات بنا ہے کیونکہ حدیث میں ہے الصدقة ترد البلاء اور الصدقة تطفي غضب الربہ اور اتقوا النار ولو بشق تمرة اور کل امرء فی ظل صدقته اس لئے آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا اور پہلے سے عورتوں کو آگ سے بچنے کا علاج بتلادیا تاکہ عورتیں مایوس و پریشان نہ ہوں پھر عورتوں کا دوزخ میں زیادہ ہونا دنیا کی محبت کی وجہ سے تھا تو صدقہ کرنے سے حب دنیا اور بخل و کنجوسی کی خصلت ختم ہو جائے گی۔

اکثر اهل النار: یعنی میں نے دیکھا کہ دوزخ میں عورتیں زیادہ تھیں وہ عورتیں مراد ہیں جو مریچی تھیں۔
 یسأل: یہاں پر یہ اشکال ہے کہ جنت میں ہر جنسی کو دو عورتیں ملیں گی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جنت میں زیادہ ہوں گی اور یہاں دوزخ میں زیادہ بتلائی گئی ہیں ان دونوں باتوں میں واضح تعارض ہے۔
 پہنچا جائیے: یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور ان کی پیدائش لڑکوں کی نسبت اتنی کثرت سے ہے کہ جنت میں دو دو ملنے کے باوجود دوزخ میں زیادہ ہوں گی۔

نہیں مل سکیں: یہ ہے کہ ابتداء میں دوزخ میں زیادہ ہوں گی پھر سزا بھگتے کے بعد جب جنت میں جائیں گی تو دوزخ میں کم رہ جائیں گی۔
 نہیں مل سکیں: یہ ہے کہ یہاں جو اکثر اهل النار فرمایا تو یہ مردوں کے مقابلے میں نہیں کہا بلکہ فی نفسہ جو تعداد تھی وہ کثیر تھی اس کو کثیر کہا گیا یعنی اتنی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

فقلن وبہ: یعنی کس وجہ سے اور کس سبب سے ہم دوزخ میں زیادہ ہوں گی؟
 قال تکثرون اللعن: لعنت اگر اللہ کی طرف سے کسی پر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا ابعاد اللہ تعالیٰ العبد من رحمته اور اگر بندے کی طرف سے ہو تو الدعاء بابعاد العبد من رحمة اللہ کے معنی میں ہوگی۔
 اب اگر کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ یا خبر دیتا ہے کہ یہ شخص ملعون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اللہ نے نکال دیا ہے یہ دعویٰ علم غیب ہے جو بڑا جرم ہے اور یا وہ شخص بدعا دیتا ہے کہ اللہ اس شخص کو اپنی رحمت سے باہر فرما دے تو یہ بہت بڑا بخل اور بہت بڑی حسد ہے جو ناجائز ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تعین کے ساتھ کسی پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے جب تک کہ کفر پر موت واقع ہونے کا تعین نہ ہو جیسے گزشتہ لوگوں میں ابو جہل و فرعون وغیرہ ہیں اور آنے والوں میں ابلیس ہے۔

پھر لعنت کی بڑی دو قسمیں ہیں۔ ایک لعنت "خروج عن رحمة اللہ العامة" ہے یہ لعنت کفار کے ساتھ خاص ہے دوسری لعنت خروج عن رحمة اللہ الخاصہ ہے یہ فساق فجار مسلمانوں کے لئے بھی اجمالا بغیر تفصیل و تعین جائز ہے جیسے لعن اللہ الواشعة والمستوشمة۔ اور لعن اللہ السارق وغیرہ جائز ہے کہ لعن وصف کے تذکرہ کے ساتھ

ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے فساد پر لعنت کرے تو اس میں اجمال ہے تعین نہیں ہے یہ جائز ہے۔

پھر یہاں تکثیر اللعن فرمایا کیونکہ تھوڑی لعن تو عورتوں کی عادت بن چکی ہے وہ ان کے مزاج کا حصہ ہے تو اس میں کچھ نرمی کی گئی ہے جیسے غیبت کے بارے میں بعض ائمہ نے کہا ہے کہ یہ کبیرہ کے بجائے صغیرہ ہے ورنہ پوری امت اور خاص کر خواص امت فاسق بن جائیں گے۔

وتکفرون العشیر: عشیر سے مراد شوہر ہے یعنی پوری زندگی شوہر کے احسانات سے مالا مال رہتی ہے لیکن ذرا سی بات پر سب کو فراموش کر دیتی ہے اور کہتی ہے ”ہمارا بیت منک خیر اقط“ نگرہ تحت الٹی کے ساتھ کلی طور پر ہر چیز کی نفی کرتی ہے۔ لے

من ناقصات عقل: یعنی باوجود اس نقص اور کمزوری عقل کے تعجب ہے کہ ایک تجربہ کار ہوشیار عقل مند جہانگیرہ شخص کو کس طرح برباد کر کے رکھ دیتی ہے، یہ کچھ بھی نہ کہے ان کو دیکھنے سے بھی دوسرا برباد ہو جاتا ہے کسی نے سچ کہا: لے

بصر عن ذا اللب حتی لا حراك به وهن اضعف خلق الله اذ كانا مع
شاہوں کے تاج چھینے راجوں کے راج چھینے گردن کشوں کی گردن بچا دکھا کے چھوڑا
اکبر دے نہ تھے کسی ظالم کی نوج سے لیکن قتل ہو گئے عورت کی سوج سے

العقل هو قوة غريزة يدرك بها البعالي ويمنعه عن القبائح وهو نور الله في القلب واللب هو العقل الخالص عن شوب الهوى۔ لے

بیِّنَات: یہاں عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل کہا گیا ہے جب کہ بعض عورتیں مردوں کی نسبت بہت تیز ہوتی ہیں حکومت کرتی ہیں۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی زمانے ایک ہی تعلیم ایک ہی علاقے ایک ہی خاندان کے مردوں اور عورتوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو عورت ہر استعداد میں مرد کی آدمی ہوتی ہے خواہ عقل میں ہو خواہ دیکھنے میں ہو یا سننے بولنے چلنے دوڑنے میں ہو ہر قوت میں آدمی ہوتی ہے اور اگر آپ مرد کسی دیہات و جنگل سے اٹھا کر لاؤ گے اور عورت کسی ماڈرن شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ سے لاؤ گے تو ظاہر ہے فرق ہوگا کہ عورت، ہوشیار، عیار، مکار اور دغا ہوگی۔

پھر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حیض کی بیماری قدرتی طور پر غیر اختیاری طریقے سے عورت کے ساتھ لگی ہوئی ہے تو اس کو دین کا نقصان کیوں بتایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو دین کا حصہ ہی اتنا دیا ہے اب یہ عورت کا قصور نہیں ہے نہ اس کو قصور وار ٹھہرایا جا رہا ہے بلکہ اس کی تخلیق اور تخلیقی حصہ کی نشاندہی کی گئی ہے جو امر واقعی تھا وہ بتلایا گیا۔

پھر دیکھیں کہ اسی حدیث میں نقصان عقل کا پتہ چل گیا کہ عورتوں نے کلام میں ترتیب نبوی کو تبدیل کر دیا حضور ﷺ نے

توضیح: یہ حدیث قدسی ہے اور حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نسبت اللہ کی طرف کر کے یوں کہیں کہ "قال اللہ" اللہ نے یہ فرمایا حدیث قدسی کے معنی اور مضمون آسانی ہوتے ہیں ہاں الفاظ نبی اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور قرآن کے معانی و الفاظ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہوتے ہیں جو وحی متلو کہلاتی ہے اور عام احادیث میں معنی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور الفاظ حضور اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں ہوتی ہے۔ اس تشریح سے قرآن کریم اور حدیث قدسی اور عام احادیث میں فرق واضح ہو گیا۔

کنہی ابن آدم: اس جملہ میں ابن آدم پر پہلا رد ہے کہ خود تو دوسرے سے پیدا ہے۔ خود دیکھو کہ کن کن احوال سے پلٹ پلٹ کر آئے ہو اور کن کن حالات سے گزرے ہو۔ اب مجھے جھٹلاتے ہو۔

یہاں حشر و نشر کے انکار کو تکذیب قرار دیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حشر و نشر اور قیامت کو دلائل کے ساتھ بار بار بیان فرمایا ہے بندہ جب کہتا ہے کہ حشر و نشر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلاتا ہے کہ جو قرآن میں اللہ نے کہا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہ صریح تکذیب ہے اس پر حدیث کا یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ "فلقوله من یحیدنی: اعادہ ایجاد بعد عدم مسبو بالوجود کو کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ مجھے وہ زندہ نہیں کرے گا۔ یعنی یا زندہ نہیں کر سکتا ہے یا زندہ نہیں کرے گا یا اس طرح جسم کے ساتھ زندہ نہیں کرے گا یہ تمام صورتیں کفر کی ہیں۔

ولیس اول الخلق بأھون: یہ ایک عام فہم مثال ہے اور اول الخلق میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ یعنی الخلق الاول یعنی پہلی بار پیدا کرنا۔ "بأھون" اسم تفضیل نہیں بلکہ اصل فعل کے معنی میں ہے بمعنی "ھلین" ہیں جیسے الصیف احر من الشتام میں فعل اصل معنی میں مستعمل ہے یعنی میری قدرت میں دونوں آسان ہیں۔ اول اور ثانی کا کوئی فرق نہیں، اھون کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور اس حدیث میں بھی ہے یہ کلام بندوں کے اعتبار سے ہے کہ تمہارے نزدیک ایجاد مالہ یوجد کے طور پر اول پیدا کرنا ثانی اعادہ سے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اول پیدا کرنے میں تو کوئی مثال سابق اور کوئی نمونہ نہیں ہوتا ہے کوئی اصل نہیں ہوتا بلکہ محض انشاء اور ایجاد عالم یوجد ہوتا ہے اور دوبارہ اعادہ کرنے میں سابق مثال اور نمونہ و اصل موجود ہوتا ہے اس کو دوبارہ بنانے میں تو تم بھی کہتے ہو کہ یہ آسان ہے کیونکہ:

ع

نقاش نقشہ ثانی بہتر کشد ز اول

جب تمہارے نزدیک عام عادت کے تحت ایک چیز کا اعادہ آسان ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ کیا مشکل ہے۔
واما شتمہ ایامی: الشتم هو توصیف الشئی بما فیہ من نقص وازدراء۔ یعنی کسی کی طرف کسی ناقص اور حقیر چیز کی نسبت کرنا شتم اور گالی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت اس لئے گالی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف ضمنی طور پر احتیاج و محتاجی کی نسبت ہے۔ کیونکہ تولد و تاسل کی طرف محتاج وہ ہوتا ہے جو استہزاء نوع و نسل اور احراز المال وغیرہ کی طرف محتاج ہو اور یہ نسبت اللہ تعالیٰ کی شان میں گالی اور گستاخی ہے۔ ۱۔

جنتہ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ مثلاً ایک انسان ہے اس نے سانپ یا بچھو جنم دیا تو باوجود یہ کہ دونوں حادث اور دونوں زوال پذیر ہیں لیکن خلاف جنس چیز کے جنم دینے سے وہ انسان کتنا عار اور کتنی شرم محسوس کرے گا تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کرنا کتنا بڑا عیب ہوگا جب کہ دونوں کے درمیان کوئی مماثلت بھی نہیں کوئی جنسیت بھی نہیں اس سے زیادہ تحقیر کیا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے زیادہ بد گوئی اور شتم کیا ہوگا؟ یہی نقصان یہود نے کیا اور کہا "عزیر ابن اللہ" اور نصاریٰ نے کہا "عیسیٰ ابن اللہ" اور مشرکین عرب نے کہا "الملائکہ بنات اللہ" پھر ایک عیب یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ اولاد قائم مقام ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے لئے فنا اور زوال کا عقیدہ بھی آگیا۔
اللہ علوا کبیرا۔

زمانے کو برا مت کہو

﴿٢٠﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى يُؤْذِي ابْنَ آدَمَ يَسْبُ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الْأَمْرُ أَقْلِبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ٥

نتیجہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے وہ اس طرح کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ کچھ نہیں وہ تو میں ہی ہوں سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں اور شب و روز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔

توضیح: قاعدہ کے مطابق یہ حدیث "سنہ" کے لفظ سے ذکر کرنی چاہیے تھی کیونکہ پہلے بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے مگر یہاں نام کی تصریح اس لئے کر دی کہ سابق حدیث کے آخر میں "وفی رواية عن ابن عباس" کے الفاظ تھے جس سے وہم ہو سکتا تھا کہ عند کی ضمیر ابن عباس کی طرف لوٹتی ہو، اس لئے احتیاط کے طور پر "وعن ابی ہریرۃ" کی تصریح کر دی سبحان اللہ محدثین کے یہاں کیا ہی احتیاط تھی۔

یو ذہنی ابن آدم: قولاً وفعلاً کسی ناپسندیدہ مکر وہ امر کو کسی شخص تک پہنچانے کا نام ایذا ہے خواہ اس غیر میں اثر کرے یا نہ کرے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا دینے سے مراد ایسا کام کرنا ہے جس سے اللہ اور رسول ﷺ ناراض ہو جائیں۔ دوسرا مطلب یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ انسانی افعال وغیرہ اشیاء کے تاثر اور افعال سے پاک ہے لہذا یہاں ایذا کا معاملہ مراد ہے کہ ایذا ارسائی کا معاملہ کرتا ہے کیونکہ حقیقی ایذا کوئی اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ۷

یسب الدهر: یعنی نزول مصائب کے وقت زمانہ کو برا کہتا ہے اس کا خیال ہے کہ سب کچھ زمانہ کر رہا ہے یعنی زمانہ دیتا ہے، منع کرتا ہے، نافع ہے اور ضار ہے جیسے اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ تھا وہ کہتے تھے "یا خبیثہ لہ، یا بوسل الدهر فعل کذا و کذا، تبا لہ وحسرة علیہ"۔

وإذا الدهر: یعنی زمانہ کو موثر سمجھ کر گالی دیتے ہیں اور حقیقت میں متصرف میں ہوں تو گالی میری طرف لوٹے گی کیونکہ زمانہ میں جو انقلاب آتا ہے اس کا فاعل میں ہوں تو بالواسطہ یہ گالی مجھ کو دی گئی۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دھر کی طرف خیر و شر خوشی اور غم کی جو نسبت کی جاتی ہے اللہ فرماتے ہیں کہ اس خیر و شر کا فاعل میں ہوں، پس جس کو تم فاعل خیال کرتے ہو جب اس کو گالی دیتے ہو گو یا تم مجھے گالی دیتے ہو۔ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں مضاف مخدوف ہے یعنی انا مقلب الدهر والمتصرف فیہ۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ عبارت اس طرح ہے انا المدهرای مقلبه۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مسئلہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ انسان جب کسی کو عصا سے یا کسی اور چیز سے مارتا ہے تو اصل میں لاٹھی یا آدمی مارنے والا نہیں بلکہ آدمی اور لاٹھی کے علاوہ ایک غیر مرنی طاقت ہے سارا کام اسی کا ہے یعنی حقیقت میں ضرب کا اثر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے تصرف میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا صبر و تحمل

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَحَدٌ أَصْبَرَ عَلَى أَذَى يَسْمَعُهُ مِنَ الذُّلِّ يَنْوِي عَوْنَهُ لَوْ لَدَتْهُ يَغَايِبُهُمْ وَيَزُرُّ قُلُوبَهُمْ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تکلیف دہ کلمات سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر تحمل کرنے والا کوئی نہیں لوگ اس کے لئے بیٹا جو بیز کرتے ہیں اور وہ اس پر بھی ان کو عافیت بخشا ہے اور روزی پہنچاتا ہے۔

توضیح: صبر کی تعریف اس طرح ہے: "الصبر هو حبس النفس عما تشتهيہ" یعنی چاہت والی چیزوں سے اپنے نفس کو روک رکھنے کا نام صبر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مفہوم میں تو صبر کی نسبت اللہ کی طرف جائز نہیں ہے پھر یہاں صبر کا اطلاق اللہ پر کیسے ہوا ہے؟ اس کا جواب شارحین حدیث نے یہ دیا ہے کہ صبر کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے تو اس سے مراد تاخر العذاب عن المستحق ہوتی ہے۔

گویا یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر غایت اور انجام و نتیجہ کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے رحمت، حیاء وغیرہ الفاظ ہیں۔ یہ مبادی کے اعتبار سے اللہ پر نہیں بولے جاتے ہیں بلکہ منتہی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔

اذی: اسم فاعل کے معنی میں ہے ای الموذی، یا ایزد ارسانی کا معاملہ کرتے ہیں "اللہ تعالیٰ کے سننے اور سماعت سے مراد

ماہرین بشانہ ہے انسان بواسطہ جارحہ مخصوصہ سنتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ بغیر واسطہ اور بغیر آلہ سنا ہے۔ اس حدیث میں مخلوق باخلاق اللہ کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ قادر بھی ہے سنا بھی ہے پھر بھی صبر کرتا ہے تو تم لوگ بھی صبر کی عادت ڈالو حالانکہ تم قادر علی الاطلاق بھی نہیں ہو۔

صبر کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں:

صبر علی الطاعة: کہ حالات جیسے بھی ہوں ہمیں عبادت میں لگے رہنا چاہیے۔

صبر علی المصیبة: کہ ہر حال میں گناہ سے بچنے کا جذبہ دل میں ہو اور گناہ سے رک کر صبر کرتا رہے۔

صبر علی المصیبة: یہ آخری قسم جو ہے اس کو عوام اور خواص صبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صبر کی تین قسمیں ہیں جس کا بیان اوپر ہو گیا۔

۱۲۰۹

توحید کی اہمیت

﴿۲۲﴾ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كُنْتُ رِذْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى جَنَابٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ إِلَّا مَوْخِرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ تَذُنُّنِي مَا حَقَّ لِلَّهِ عَلَى عِبَادِهِ؟ وَمَا حَقَّ الْعِبَادُ عَلَى اللَّهِ فَلَمْ يَلَمْ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّ حَقَّ اللَّهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَحَقَّ الْعِبَادُ عَلَى اللَّهِ أَنْ لَا يَعْذِيبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا أُكَلِّمُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تَكَلِّمْهُمْ فَيَشْكِلُوا. (متفق عليه)

ترجمہ: اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر کے دوران سواری کے گدھے پر میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا میرے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کباؤں کا پچھلا حصہ حائل تھا آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا معاذ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے اور اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا اسے عذاب نہ دے (یہ سن کر) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ خوشخبری لوگوں کو سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ کیونکہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ عقبہ ثالثہ اخیرہ میں ستر نفوس قدسیہ کے ساتھ بیعت میں شریک تھے۔ تمام غزوات میں حضور اکرم ﷺ کے شانہ بشانہ شریک رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن کا قاضی و گورنر مقرر فرما کر بھیجا تھا آپ ﷺ نے ان کو اچھی اچھی دہستیں فرمائیں اور چند قدم آپ کی سواری کے

ساتھ پیدل چل کر روانہ فرمایا، آپ کا تعلق انصار کے خزانج قبیلے سے تھا لہذا انصاری خزر جی ہیں۔ آپ طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

الردف والردیف: الـبع الذی یرکب خلف الراكب شہسوار کے پیچھے بیٹھنے والے کو ردیف کہتے ہیں، یہ لفظ گھوڑے گدھے وغیرہ کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے، جس طرح اونٹ پر دو سواروں کو زیادہ تر زمیل کہتے ہیں، کبھی اونٹ سوار کو بھی ردیف کہتے ہیں۔

علی حمار: حضور اکرم ﷺ نے بطور تواضع و انکساری کبھی کبھی گدھے کی سواری کی ہے جس سے گدھے کی قسمت جاگ اٹھی کہ اس کا پسینہ ناپاک نہ رہا اور جھوٹے میں بھی نجاست نہ رہی۔

یہاں ایک اہم بات سمجھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس گدھے سے چھوٹے چھوٹے گدھے مراد نہیں جو ہمارے ہاں ہوتے ہیں جن پر سواری کرنا عموماً معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ یہاں گدھے سے عرب کا وہ بڑا گدھا مراد ہے جو قریباً فخر کے برابر ہوتا ہے جس طرح بڑے سفید گدھے ہوتے ہیں ان پر سوار ہونا کوئی عیب کی بات نہیں تھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضور اکرم ﷺ کا ایک ساتھ سوار ہونا بھی بتاتا ہے کہ یہ بڑا گدھا تھا۔

موخرة الرجل: رجل کجاوہ کو کہتے ہیں، موقوفہ الرجل کجاوہ کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے سوار آدمی تکیہ اور ٹیک لگاتا ہے یہ سوار کے پیچھے ہوتی ہے دوا دیوں کے بیچ میں آگے سوار کے لئے الگ اور آخری سوار کے لئے الگ لکڑی ہوتی ہے یا صرف آگے والے سوار کیلئے ہوتی ہے۔ موقوفہ الرجل کا اطلاق دونوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ موقوفہ الرجل چار طرح پڑھا جاتا ہے: ① باب افعال سے اسم فاعل کے وزن پر۔ ② باب تفعیل سے بھی اسم فاعل کے وزن پر آتا ہے۔ ③ باب تفعیل سے اسم مفعول کے وزن پر بھی آتا ہے۔ ④ آخر الرجل بھی آتا ہے اول اور آخری لغت فصیح تر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس تعین اور تمیز اور اس ہیئت و کیفیت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وضاحت سے قرب بیان کرنا ہے اور پوری کیفیت بیان کرنے سے یہ بتانا ہوتا ہے کہ صحابی جو حدیث بیان کر رہا ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس نے نہایت تیقظ اور ہوشیاری و بیداری سے یہ حدیث حضور اکرم ﷺ سے خود سنی ہے۔ حدیث کے الفاظ تو کیا اس کی کیفیات و صیغات تک اس کے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔

حق العبد علی اللہ کی بحث:

یا معاذ حل۔ تندی ما حق اللہ: بندوں پر اللہ تعالیٰ کے حق کے بارے میں تو کوئی کلام اور کوئی شبہ نہیں ہاں دوسرے جملہ میں کلام ہے جہاں حق العبد علی اللہ کے الفاظ آئے ہیں پس اتنی بات سمجھ لینا چاہیے کہ حق باطل کے مقابلے میں بھی آتا ہے حق ثابت اور واجب کے معنی میں بھی ہے لازم کے معنی میں بھی ہے اور لائق اور جدیر کے معنی میں بھی آتا ہے

اب معتزلہ نے حق العباد علی اللہ میں حق بمعنی واجب اور لازم لیا ہے تو ان کے نزدیک بھروسہ کا حق بطور عدل اللہ تعالیٰ پر واجب اور لازم ہوتا ہے ہدایہ میں جو یہ لکھا ہے کہ حق فلاں کہنا صحیح نہیں کیونکہ کسی بندے کا وجوبی حق اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں ہے تو وہاں یہی معتزلہ والا حق مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ لوگ لازم اور واجب قرار دیتے ہیں اس کی نفی ہدایہ نے کی ہے بہر حال مذکورہ حدیث ظاہری طور پر معتزلہ کی دلیل ہے اہل السنۃ والجماعہ حدیث کی نئی توجیہات کرتے ہیں۔

● اول توجیہ یہ ہے کہ حق کے کئی معنی ہیں پس حق اللہ علی العباد میں واجب اور لازم کے معنی اور حق العباد علی اللہ میں لائق اور جدیر کے معنی لئے جائیں گے۔

● خطاب نے کہا ہے کہ یہاں حق العباد علی اللہ صرف پہلے جملہ کے متبادلہ میں مشابہہ ہے، یہی رائے شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کی بھی ہے۔

● یہ حق اللہ تعالیٰ نے رحمۃً حفظہ احساناً و اکراماً اپنے اوپر خود لیا ہے گویا خود ایک عباد اپنے اوپر لیا ہے تو پہلے جملہ میں حق وجوبی لزومی ہے اور دوسرے جملہ میں حق تفضلی احسانی لیا جائے گا۔

ان یہود و نصاریٰ اس میں عبادات اور توحید دونوں کا ذکر آگیا اور بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا حق مکمل عبادات اور کامل و خالص توحید کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا ہے۔

ان لا یشرکوا بہ فی الافعال والاعمال والاقوال والاحکام: اس میں رسالت بھی آگئی اور تمام اعمال بھی آگئے تو اللہ تعالیٰ کے حسن سلوک اور وعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اس سوعد کو عذاب نہ دے کیونکہ اگر توحید کے ساتھ اعمال صالحہ کی پابندی کی ہے تو عدم دخول بار کا وعدہ ہے اور اگر اعمال صالحہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو وعدہ خلود فی النار کا وعدہ ہے کہ دائماً عذاب نہ دے گا۔

سوال: یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے خوشخبری دینے کی آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی تو حضور ﷺ نے منع فرمایا اگر سارے اعمال ملحوظ تھے تو پھر روکنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: یہ ہے کہ لوگ "لا یشرکوا" کو بغیر قیودات کے سمجھ کر اعمال کو چھوڑ دیں گے چونکہ نو مسلم ہیں اور اجمال کو لے لیں گے، قیودات سے واقف نہیں ہوں گے، اس لئے اس ابتدائی دور کے پیش نظر لوگوں کو بشارت سنانے سے منع کیا لیکن اعمال کی تفصیل سمجھنے کے بعد جب اعمال راسخ ہو گئے اور اعمال چھوڑنے کا خطرہ ختم ہو گیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس علمی امانت کو امت کے سپرد کر کے بیان فرمایا یا یہ کہ ابتداء میں ممانعت تھی پھر جب "ہلملغوا علی" فرمایا تو عوام کو بتانے کی عام اجازت ہو گئی۔

سوال: اسی سے ملتا جلتا ایک اور سوال ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ممانعت کے باوجود یہ روایت آخر میں کیوں بیان کی؟

جواب: یہ ہے کہ یہ ممانعت اسلام کے ابتدائی دور کے لئے تھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آخر وقت میں بتا دیا۔

کَلَامُ اللَّهِ جَوَابُ، یہ ہے کہ یہ ممانعت ایک مخصوص جماعت کیلئے تھی عام نہ تھی بعد میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عوام کے لئے بیان کیا۔

بَيْنَهُمَا جَوَابُ، یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بوقت انتقال بتا دیا تاکہ کتمان علم کی وعید سے بچ جائیں جس طرح آنے والی روایت میں ہے تو آنحضرت ﷺ کی طرف سے معاذ رضی اللہ عنہ کو بشارت کے غشی رکھنے کا حکم وقتی اور عارضی تھا دائمی اور ابدی نہیں تھا۔

فَيَتَكَلَّوْا: نبی کے جواب میں واقع ہونے کی وجہ سے ان ناصہ مقدر ہے اس لئے منصوب ہے اسی ان یتکلموا، اتکال بھروسہ اور اعتماد و تکیہ کے معنی میں ہے یعنی لوگ صرف کلمہ توحید کے اجمال پر جم جائیں گے اعمال میں ست ہو جائیں گے یہاں جس طرح آنحضرت ﷺ نے بتانے سے منع فرمایا کہ بتانے میں خطرہ ہے اسی کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سختی سے منع فرمایا کہ لوگ اجمال پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں گے معلوم ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فعل درست تھا۔

دوزخ سے رہائی کا سبب توحید ہے

﴿۲۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَمُعَاذَ بْنَ جَعْفَرٍ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ فَلَا قَوْلَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللَّهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوا قَالَ إِذَا يَتَكَلَّمُوا فَأُخْبِرُوا بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأْمِنًا (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

تَرْجُمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پیچھے سواری پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے معاذ! انہوں نے کہا یا رسول اللہ حاضر ہوں اور خدمت کے لئے تیار ہوں آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ اور خدمت کے لئے تیار ہوں پھر آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا اے معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ اور خدمت کے لئے تیار ہوں آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ اسی طرح حضرت معاذ کو مخاطب فرمانے کے بعد فرمایا اللہ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حاجت روا مشکل کشا نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے یہ (سن کر) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں اس خوشخبری سے لوگوں کو آگاہ کر دوں۔ تاکہ وہ اس بشارت کو سن کر خوش ہو جائیں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آخر کار معاذ نے اس خوف سے کہ

حدیث چھپانے کا گناہ نہ ہو اپنی وفات کے وقت اس حدیث کو بیان کر دیا تھا۔ (یہ روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے خود بھی مروی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کی ہے)۔

توضیح: لبیک! یعنی میں بار بار سننے کے لئے حاضر ہوں، ۱۔

وسعدیہ! یعنی میں بار بار خدمت و اطاعت کے لئے موجود ہوں دونوں میں تکرار ہے، حضور اکرم ﷺ نے اہتمام شان کی غرض سے تین مرتبہ یہ کلمہ دہرایا تا کہ آئندہ آنے والی بات نہایت اہتمام کے ساتھ سن لیں توجہ تمام ہو اور کلام کا اہتمام ہو۔ ۲۔
صدقاً من قلبہ: سوال یہ ہے کہ اس قید کو کیوں بڑھایا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تا کہ منافق لوگ اس حدیث سے خارج ہو جائیں، کیونکہ صدقاً من قلبہ میں استقامت و استدامت دونوں مراد ہیں اور وہ منافقین میں نہیں ہیں۔ ۳۔
الا حرمہ اللہ علی النار۔

بیان: یہاں ایک اہم سوال ہے کہ ایک شخص مثلاً اقرار شہادتین کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو کیا وہ بھی حرامہ علی النار ہوگا حالانکہ دوسری روایت سے عصاة مومنین کا جہنم میں جانا اور شفاعت یا سزا بھگتنے کے بعد واپس آنا ثابت ہے تو بظاہر ان دو قسم کی روایات میں تعارض و تضاد ہے نیز مذکورہ حدیث کے پیش نظر تو اعمال کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے حالانکہ اعمال کا ایک مقام ہے۔ الغرض جن روایات میں صرف کلمہ توحید پر دخول جنت کی ضمانت دی گئی ہے اور حرمت دوزخ کا فیصلہ سنایا گیا ہے وہ روایات اعمال صالحہ کو ضروری قرار دینے والی روایات سے متعارض و متضاد ہیں۔
جواب: اس اعتراض کے چند جوابات شارحین حدیث دیتے ہیں اور کتاب الایمان کی کئی احادیث پر اس قسم کے اعتراض کے بھی جوابات ہیں ملاحظہ ہوں۔

● اگر کسی شخص نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا یا گناہ کیا مگر سچے دل سے توبہ کی اور معاف ہو گیا تو یہ شخص اولاً جنت میں داخل ہوگا اور ابتدائی سے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی تو ”حرمہ اللہ علی النار“ اس پر صادق ہے۔ لیکن اگر اس شخص نے گناہ کیا تو توبہ بھی نہ کی تھی سے گناہ زیادہ بھی ہیں اور کوئی گناہ معاف بھی نہ ہوا تو ایسا شخص انتہاء دوزخ پر حرام ہے یعنی ”حرمہ اللہ علی النار“ اس کے حق میں سزا بھگتنے کے بعد ہے کہ اس کے لئے دائمی دوزخ نہیں ہے۔

① یا مطلب یہ ہے کہ کلمہ شہادت اپنے تمام تقاضوں اور حقوق کے ساتھ پڑھا یعنی اتثال ادا کر لیا اور اجتناب نواہی کیا اس کے لئے حرمہ اللہ علی النار ہے یعنی کلمہ تو مفتاح جنت ہے مگر اس کے لئے دندائے ضروری ہیں کہا قال وہب بن مہنہ رضی اللہ عنہ۔

● تیسرا جواب یہ ہے کہ اس کلمہ شہادت سے اس شخص کا کلمہ مراد ہے جس نے کلمہ پڑھا لیکن اعمال کا موقع نہیں ملا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۲۔

● یا تھویرہ الخلود مراد ہے کہ ہمیشہ آگ میں رہنا اس کے لئے حرام ہے۔

بیچہ بچہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایک سفید کپڑا اڑھے ہوئے سو رہے تھے (اس وقت تو میں واپس چلا آیا) پھر دوبارہ آپ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ نیند سے بیدار ہو چکے تھے آپ نے (مجھ کو دیکھ کر) فرمایا جس شخص نے صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہا اور اسی عقیدہ پر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، میں نے عرض کیا کہ اگرچہ اس نے زنا کا کام کیا ہو اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو، میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا ہاں اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو۔ میں نے پھر عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو (وہ جنت میں داخل ہوگا) اگرچہ ابوذر کو ناگوار گزرے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب بھی ابوذر یہ حدیث بیان کرتے تو (بطور فخر) اس آخری فقرہ کو خواہ ابوذر کو کتنا ہی ناگوار گزرے "ضرور نقل کرتے تھے" کیونکہ یہ محبوب کے محبوب منہ سے نکلے ہوئے الفاظ تھے)

توضیح: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے تھے مکہ مکرمہ میں پانچویں خوش قسمت تھے جو اسلام میں داخل ہوئے، متقی و پرہیزگار زاہد تھے، ان کے مسلک میں کھانے کے بعد دوسرے وقت کے لئے کھانا رکھنا یا مال جمع کرنا جائز نہ تھا اور جب کسی کو مال جمع کرتے دیکھتے تو لانگھی سے مارتے تھے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے خاندان کی طرف واپس چلے گئے اور وہاں اسلام کی دعوت دیتے رہے، چار ہجری میں غزوہ خندق کے موقع پر مدینہ منورہ تشریف لائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابوذر تم اکیلے جا کر مرو گے یہ تقویٰ کے دور کے آدمی تھے اور لوگ فتویٰ کے دور کے آگئے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو مدینہ سے "ربذہ" چلے جانے کا حکم دیا یہ چلے گئے اور وہاں پر ۳۲ھ میں فوت ہو گئے حضرت بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنازہ پڑھایا۔

و علیہ ثوب ابیض: اس کیفیت کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مجھے بات خوب یاد ہے بلکہ کیفیات اور ہیئت و حالات تک معلوم ہیں میں بیداری میں اعتماد سے بات کہتا ہوں کوئی شک و شبہ نہ کرے، نیز یہ بھی بتانا ہے کہ محبوب کے خدو خال اور ان کے خصوصی احوال بیان کرنے سے لذت محسوس ہوتی ہے۔

وذكرك للبشتاق خیر شراب وکل شراب حونه کسراب

اعد ذکر نعبان لنافان ذکرة هوالمسک ما کورته یتضوع

قہر ہو یا مہر ہو یا کچھ بھی ہو ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

دخل الجنة: اس روایت پر ایک شبہ تو وہی ہے جو سابقہ روایت پر تھا کہ صرف کلمہ شہادت سے کیسے جنتی ہو گیا اعمال کہاں گئے؟ جو جوابات وہاں دیئے گئے ہیں یہاں بھی وہی جوابات ہیں کہ دخول اولاً یا ثانیاً ہے یا کلمہ اپنے تقاضوں کے ساتھ ہے یا دوزخ میں دخول ابدی دائمی نہیں ہے یا فیعلہ معجون مرکب پر ہوتا ہے مفرد کلمہ پر نہیں یا اس شخص کا کلمہ مراد ہے جس کو عمل کا

موقع نہیں ملا اور مرگیا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں دوسرا شبہ اور سوال یہ ہے کہ شہادت میں صرف "لا الہ الا اللہ" کا ذکر ہوا ہے "محمد رسول اللہ" کا ذکر نہیں ہوا۔

یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ بطور علم اور عنوان ذکر کیا گیا ہے، مراد مکمل شہادتیں اور پورا کلمہ ہے جیسے پوری سورت فاتحہ کو الحمد شریف کے نام سے یاد کرتے ہیں اور "اخلاص" پوری قل ہو اللہ احد کے لئے بولا جاتا ہے۔

یہ ہے کہ یہ کلمہ ایسا مشہور ہے کہ لا الہ الا اللہ کے ذکر سے خود بخود پورا کلمہ ذہن میں آتا ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ کے بغیر اس دور میں یہ کلمہ نافع نہیں ہے۔

ثم اتیتہ: یعنی کچھ دیر بعد میں پھر آیا تو آنحضرت ﷺ منہ سے اٹھ چکے تھے۔

قلت وان زنی وان سرق: یہاں ہمزہ استفہام مخدوف ہے یعنی "ادخل الجنة وان زنی وان سرق؟" حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے سوال میں نہایت جامعیت ہے کیونکہ "وان زنی" سے تمام حقوق اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور "وان سرق" میں سارے حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوتاہی کرنے والا بھی کیا جنت میں جائے گا؟

آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ ایمان اور تصدیق قلبی کی وجہ سے وہ بالآخر جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اعمال صالحہ میں کوتاہی کی ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا تین بار سوال کرنا استعجاب اور مزید تاکید اور زیادہ وضاحت حاصل کرنے کے لئے تھا اور حضور اکرم ﷺ کا جواب انکار کے طور پر تھا کہ اس کو کیوں اتنا بڑا باعث تعجب سمجھتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کی رحمت میں بغل کرتے ہو؟ حالانکہ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے تم خوش ہو یا ناخوش معاملہ ایسا ہی ہے۔ زنا اور سرقت اسلام میں بڑے گناہ شمار ہوتے ہیں اس کا حکم جب معلوم ہو گیا تو چھوٹے گناہ ہوں گا حکم خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

وكان ابوذر: یعنی ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بطور لذت یا کلام رسول کی کمال حفاظت کی وجہ سے "وان ربحم انف ابی ذر" کے کلمات کو ضرور ادا فرماتے، محبوب کے ادا کردہ کلمات سے لطف اٹھاتے اور اپنے لئے فخر سمجھتے جیسے کہا گیا ہے: بدم حفتی و خر سدم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زبید لب لعل و شکر خارا

علی ربحم انف ابی ذر: اور "وان ربحم انف ابی ذر" عرب کے ہاں عربی زبان کا محاورہ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کی مجبوری تنگی ناخوشی اور ذلت ظاہر کرنا ہو کیونکہ ربحم مٹی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ ناک خاک آلود ہو جائے اور مٹی میں رگڑا کھائے، ناخوشی سے کنایہ ہے، ویسے یہ پورا محاورہ عربی میں ناپسند کرنے اور ناخوش ہونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حدیث میں معتزلہ اور خوارج پر نہایت تاکید کے ساتھ رد آتا ہے جو مرتکب کبیرہ کو خارج از اسلام کہتے ہیں۔

مدار نجات کیا ہے؟

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَخَدَعَ لَا قَرِيبَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَأَنَّ عِيسَى عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ وَابْنُ أَمَّتِهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْفَا هَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ وَالْكَافِرُ حَتَّى أَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ عَلَى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حاجت روا مشکل کشا نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندی حضرت مریم کے بیٹے ہیں اور اس کا (معجزاتی) کلمہ ہے جس کو اس نے مریم کی جانب ڈالا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی روح ہیں اور یہ کہ جنت اور دوزخ حق (واقعی چیزیں) ہیں تو (اس اقرار کے بعد) اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: وان محمدًا عبده: اسی عبدہ الاجل ورسولہ الاکمل وان عیسیٰ عبد اللہ ورسولہ: یہاں یہ شبہ اور اشکال ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کرنے اور آپ کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی جبکہ سب انبیاء کرام عبدیت اور رسالت میں شریک ہیں اور اہل ایمان سب کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خیالات رکھنے والی دو قومیں جزیرہ عرب میں آباد تھیں، ایک یہود تھے دوسرے نصاریٰ تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دونوں قومیں اپنے خیالات میں افراط و تفریط میں مبتلا تھیں۔ ایک طرف یہود نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا بلکہ یہودنا یہود نے آپ ﷺ پر یہودہ الزامات لگائے اور آپ کی والدہ صدیقہ پر بہتان باندھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور انجیل کو جھٹلایا۔ دوسری طرف نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اتنا غلو کیا کہ انہوں نے آپ کو اللہ، ابن اللہ یا ثالث ثلاثہ کہہ دیا آنحضرت ﷺ چونکہ تمام انبیاء کرام کے مصدق بن کر آئے تھے سب کی حیثیت بتانے والے بن کر آئے تھے اور یہ شریعت اور یہ امت چونکہ وسط اور معتدل تھی اس لئے افراط و تفریط سے پاک ایک پاکیزہ نظریہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جزیرہ عرب کے یہود و نصاریٰ کے سامنے رکھا۔

انہی خصوصی احوال اور خاص ضرورت کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر خصوصیت کے ساتھ آیا تاکہ ان سے متعلق صحیح صورت حال سے عوام و خواص کو آگاہ کیا جائے اور دونوں جانب کی افراط و تفریط کو باطل کیا جائے تاکہ یہ لوگ جنت کے مستحق

ہیں جائیں، چنانچہ "عبداللہ" کے الفاظ سے نصاریٰ پر رد ہو گیا کہ وہ اللہ کے بندے تھے نہ کہ اللہ کے ساتھ شریک تھے نہ اس کے بیٹے تھے "و رسولہ" سے یہود پر رد کیا جو ان کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ ۱۔

وابن امتہ: اس سے بھی دونوں فرق پر رد مبلغ کیا کیونکہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ ابن اللہ تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابن اللہ نہیں "ابن امۃ اللہ" تھے اور یہود پر یہ رد ہو گیا کہ حضرت مریم اللہ تعالیٰ کی خاص بندی ولیہ تھیں، امتہ کی اضافت تشریفہ سے اس طرف اشارہ ہو گیا پھر امتہ کی اضافت سے نصاریٰ پر رد کیا جو کہتے ہیں کہ مریم اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے فرمایا بیوی نہیں، خاص بندی تھی۔ ۲۔

امتہ: کی اضافت تشریفہ سے یہود پر اس طرح رد کیا کہ مریم اللہ تعالیٰ کی مقبول اور برگزیدہ پاکیزہ بندی تھیں انکی طرف زنا کی نسبت یہودیوں کی خباثت و خساست ہے، یہود پر یہ رد بھی کیا جو کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ الہیاذ باللہ فلاں شخص کی ناجائز اولاد تھے فرمایا وہ حضرت مریم کے بیٹے تھے ان کا باپ نہیں تھا اگر باپ ہوتا تو ماں کی طرف کیوں منسوب ہوتے۔ ۳۔

وکلمتہ: یعنی کلمہ کن سے بلا باپ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا یہ کلمہ سے مراد محنتہ اللہ ہے کہ وہ لوگوں پر اللہ کی طرف سے حجت و دلیل تھے کہ اللہ نے ان کو بغیر باپ اپنی قدرت سے پیدا کیا یا اپنی والدہ کی برأت اور اپنی نبوت و رسالت پر یحییٰ میں دلیل بن کر کہا: "انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً" چنانچہ کلمتہ اللہ کہلائے۔ ۴۔

حکایت:

حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظات میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میرے ساتھ ایک پادری کا مناظرہ قرار پایا موضوع اہنیۃ مسیح تھا جب مناظرہ کی تاریخ آگئی تو حضرت شیخ الہند کو پتہ چلا وہ مناظرہ میں حاضر ہوئے اور خیال کیا کہ یہ پادری کہہ مشق تجربہ کار ہے کہیں نو جوان اشرف علی کو شکست نہ دے اس لئے خود آئے اور مناظرے کے لئے خود پیش ہوئے، عیسائی پادری نے اپنے بیان میں کہا کہ دیکھو مسلمانوں! تمہارا قرآن حضرت مسیح کو "کلمۃ" کہتا ہے تو اب تم بتاؤ مسیح کلمہ تھے یا نہ تھے، پادری کا خیال تھا کہ مسلمان کہیں گے کہ بے شک قرآن نے ان کو کلمہ کہا ہے وہ کلمہ تھے تو میں کہوں گا کہ بس کلمتہ اللہ اور ابن اللہ ایک ہی چیز ہے۔

حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بے شک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ تھے اور قرآن نے ان کو کلمہ کہا ہے لیکن کلمہ تین قسم پر ہے: اسم، فعل، حرف اب تم بتاؤ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان تین قسم میں سے کس قسم میں داخل تھے؟ اب پادری ہکا بکارہ گیا اور حیران ہو کر ایسا بھگا کہ مڑ کر پیچھے نہ دیکھ۔ ۵۔

الی مریم: مریم عابدہ کے معنی میں ہے، قرآن عظیم میں تیس بار اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ حضرت مریم کا نام ذکر کیا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ یہ اشارہ بھی دینا چاہتا ہے کہ مریم اللہ کی بیوی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی شخص مجلسوں اور عوام الناس کے سامنے اپنی بیوی کا نام نہیں لیتا ہے پھر اس کے ساتھ ابن مریم کا کلمہ لگا کر بتا دیا کہ میرا نہیں مریم کا بیٹا ہے۔

روح ای نور روح منہ او هو روح منہ او کان له معجزة یحییٰ به الاموات: یادہ لغت جبرائیل سے پیدا ہوئے اور جبرائیل کا نام ”روح الامین“ ہے اس لئے ان کو روح فرمایا، بہر حال یہاں روح سے ماہیہ الحیوة حیوانی روح مراد نہیں ہے۔ نیز یہاں من تبیض کے لئے نہیں ہے جس سے جزیت ثابت ہو جائے بلکہ من ابتدائیہ ہے معنی یہ ہے ”روح مخلوق من امر اللہ ای ہامر اللہ“۔

حکایت:

علامہ طبری رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تشریح میں ایک بڑے نصرانی عالم کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے ایک قاری صاحب سے قرآن کریم کی آیت ”و کلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ“ کو پڑھتے ہوئے سنا تو کہنے لگا کہ عیسائی بھی تو اس سے زائد کچھ نہیں کہتے بس یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے ہیں، یعنی اللہ کا ایک جز ہیں اور نبی ہیں اس عیسائی عالم نے ”منہ“ میں من تبیض کے لئے لیا اس پر دین اسلام کے عالم علی بن حسین بن واقد رحمہ اللہ نے اس کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی: ”و سطر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعاً منہ“ (جاثیہ آیت ۱۳) اور پھر فرمایا کہ اگر من تبیض کے لئے ہے تو پھر زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کو اللہ تعالیٰ کا جز تسلیم کر دینا کہ وہ عیسائی مسلمان ہو گیا۔

والجنة والدار حق: یعنی جنت و دوزخ کے جو احوال قرآن و حدیث میں مذکور ہیں وہ سب حق ہیں جنت کا وجود بھی ثابت ہے دوزخ کا وجود بھی ہے اور اس میں جزا و سزا کے سارے واقعات بھی حق ہیں اس سے ایسے فلاسفہ و نادانہ اور ملحدین و دھریوں پر رد مقصود ہے جو کہتے ہیں جنت ہند کچھ نہیں باغ شاخ ہے دوزخ شوز کچھ نہیں دھپکا شباک ہے مرزا غالب الحاد کے انداز سے کہتا ہے: سب ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ادخلہ اللہ علی ما کان من العمل: یعنی خواہ وہ عمل اچھا ہو یا برا ہو قلیل ہو یا کثیر ہو جیسا بھی عمل ہو اس اچھے عقیدہ کے بعد وہ آدمی جنت میں جائے گا۔ اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے کہ انہما و ما لایہ شخص دخول جنت کا مستحق ہے اس میں بھی معتزلہ اور خوارج پر واضح رد و تردید ہے جو مرتکب کبیرہ کو خارج از اسلام مانتے ہیں۔

قبول اسلام سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿۲۶﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ أَسْتَظْ بِمِيثَاقِكَ

فَلَا تَبَايَعُكَ فَبَسَطَ يَمِينَهُ فَقَبَضْتُ يَدِي فَقَالَ مَا لَكَ يَا عُمَرُ وَقُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ يَا عُمَرُ أَنَّ الْإِسْلَامَ بَيْنَهُمَا مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ عَلَيْهِمَا مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ بَيْنَهُمَا مَا كَانَ قَبْلَهُ (رواه مسلم)

وَالْحَدِيثَانِ الْمَرْوِيَّانِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَنَا أَغْلَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الْيَهُودِ وَالْأَخَرُ الْكُفْرُ يَا رِذَائِي سَلِّدْ كُفْرَهُمَا فِي بَابِي الرِّيَاءَ وَالْكِبْرَ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى.

توضیح: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اپنا دایا ہاتھ آگے بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت اسلام کروں، آپ ﷺ نے اپنا دایا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا، آپ ﷺ نے (حیرت سے) فرمایا عمرو یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ میں کوئی شرط لگانا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا شرط لگانا چاہتے ہو کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا (میں چاہتا ہوں کہ) میرے تمام گناہوں کو معاف کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو قبول اسلام سے قبل کئے گئے ہوں اور ہجرت ان تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں اور حج ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں۔ (مسلم شریف)

اور وہ دونوں حدیثیں جو ابواب ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہیں اور پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: أَنَا أَغْلَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الْيَهُودِ وَالْأَخَرُ الْكُفْرُ يَا رِذَائِي... الخ ہم ان دونوں حدیثوں کو باب ریا اور باب کبر میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

توضیح: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں ہجرت سے پانچ سال پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور تمام جنگوں میں شریک ہوئے جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے معاملہ حکیم میں شامل تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مصر آپ کے ہاتھوں میں فتح ہوا اور آپ فاتح مصر کے نام سے مشہور ہوئے اور آخر وقت تک آپ مصر کے حاکم و گورنر رہے ۴۴ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

ابسط مبینک: آپ اپنا دایا ہاتھ آگے پھیلا دیجئے تاکہ میں اس پر آپ سے بیعت کروں معلوم ہوا زبانی بیعت کی نسبت ہاتھ میں ہاتھ دینا اصل اور افضل ہے، عورتوں کی بیعت میں کبھی آنحضرت ﷺ نے ہاتھ نہیں دیا وہاں صرف زبانی بیعت اصل ہے، یہ بیعت اسلام کی تھی اور ہر پیر و مرشد کو چاہیے کہ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو بوقت بیعت ہاتھ نہ لگائیں۔

فلا یا یحک: میں تین پر نصب اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ اول احتمال اس طرح ہے کہ ”فلا کلمہ“ زائد ہو اور اس کے بعد لام کلمہ بمعنی لام ”کی“ تعلیلیہ ہو جو مناسب فعل ہوتا ہے یعنی ”کی ابا یحک“ تو عین منصوب ہے۔

دوسرا احتمال یہ کہ لام زائد ہو اس صورت میں عین پر ضمہ آئے گا اور فاقترع یہ ہوگی یعنی ابسط یمیدک فلا یا یحک۔ لہٰذا ان اشعار ط: معلوم ہوا کہ بیعت سے پہلے شرط لگانی جائز بھی ہے اور مناسب بھی ہے تاکہ خوب تسلی ہو۔

قال تشترط ماذا؟ ما ذا کا کلمہ چونکہ استفہام ہے اسلئے یہ صدارت کلام کو چاہتا ہے یہاں صدارت نہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں ما ذا کلام کی ابتداء میں محذوف ہے اور مذکورہ ما ذا آخر میں اس کی تفسیر ہے یعنی ما ذا تشترط ما ذا۔ یاوں سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ نے بطور انکار و تعجب استفہام کے ساتھ یہ پوچھا تشترط؟ یعنی اسلام میں شرط لگاتے ہو؟ پھر پوچھا ما ذا یعنی کیا شرط لگاتے ہو تو یہ ما ذا الگ کلمہ ہے جو الگ سوال کے ساتھ آیا ہے جو صدارت پر واقع ہے پھر مجموعہ کلام اس طرح بن گیا تشترط ما ذا، ہمزہ استفہام کو حذف کیا گیا۔

یغفرلی: معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا معروف کی ضمیر لفظ اللہ کی طرف لوثی ہے۔

اما علمت یا عمرو: یعنی تم عقل مند ہو یا ر اور جہانگیر نے سچھدا را دی ہو کیا تم پر یہ بات پوشیدہ ہے جو کسی عقل مند پر پوشیدہ نہیں رہتی چاہئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی عقل کا حوالہ دیا اور نہ عمرو و ظالم و مذکورہ مسئلہ سے قبل ایمان سے کیا واقف ہو سکتے تھے۔

الاسلام یمدھ ما کان قبلہ: علماء نے یہاں اسلام سے مراد حربی کا اسلام لیا ہے کیونکہ ذی کا حکم اس طرح نہیں ہے۔

والہجرة: یعنی میری زندگی میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت اور فتح مکہ کے بعد دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا یعنی اسلام ہجرت اور حج تینوں ماسبق تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں ہجرت کی بحث گزر چکی ہے۔

سابقہ گناہ مٹنے کا ضابطہ اور علماء کی آراء

اسلام:

جمہور علماء کے نزدیک جب کوئی غیر مسلم حربی یعنی غیر ذمی اسلام قبول کرتا ہے تو اسلام اس کے صفائے گناہ اور کبائر سب کو مٹا دیتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد مظالم اور غیر مظالم سب گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔

۱۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱ ۲۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱ ۳۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱

۴۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱ ۵۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱ ۶۔ المرقاۃ: ۱۸۷/۱

ہجرت اور حج:

البتہ ہجرت اور حج میں اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی صغائر و کبائر کو منادیتے ہیں یا نہیں جس کا ذکر یہاں حدیث میں اسلام کے ساتھ ہوا ہے تو حافظ تورپشٹی رحمہ اللہ اور متقدمین شارحین کا خیال ہے کہ ہادم صرف اسلام ہے اور حج و ہجرت سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں مطلقاً اور کبائر اس وقت معاف ہوں گے جب کہ اس کے ساتھ توبہ ملحق ہو جائے بشرطیکہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور اگر وہ کبائر حقوق العباد سے متعلق ہوں تو صاحب حق سے معاف کرائے بغیر صرف توبہ سے وہ بھی معاف نہیں ہوں گے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہجرت و حج سے کبائر معاف نہیں ہوتے ہیں۔ حافظ تورپشٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصوص قرآن سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ﴿ان تعذبوا کبائر ماتہون عنہ نکفر عنکم سیدئاتکم﴾ کی نص متیدہ سے صغائر کی معافی معلوم ہوتی ہے لہذا نصوص مطلقہ کو نصوص متیدہ پر حمل کر کے صغائر و کبائر کی قید کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ۱۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ کی تحقیق:

علامہ طیبی اور علامہ قسطلانی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ اسلام کی طرح حج اور ہجرت سے بھی تمام صغائر و کبائر معاف ہو جاتے ہیں اور جو حکم ہادم ہونے میں اسلام کا ہے وہی حج و ہجرت کا بھی ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں علماء متقدمین پر رد کرنا نہیں چاہتا ان کی رائے اور تحقیق اپنی جگہ پر صحیح ہے اور عام قواعد کے مطابق ہے لیکن میں نفس حدیث کو دیکھ کر اس کے سیاق و سباق اور اسلوب کلام اور بلاغت و فصاحت کے اصولوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ اسلام کے لئے جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ خصوصیت حج و ہجرت کے لئے بھی حاصل ہے کیونکہ نفس حدیث میں چند قرآن ایسے ہیں جس سے واضح طور پر اسلام ہجرت اور حج کی خصوصیت یکساں طور پر معلوم ہوتی ہیں مثلاً۔

① حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بیعت اسلام سے پہلے اپنے تمام گناہوں کی مغفرت کی شرط لگائی تھی آنحضرت ﷺ نے اسلام کے علاوہ ہجرت و حج کو بھی ان کے اطمینان کے لئے ذکر کیا کہ تم تو اسلام کی بات کرتے ہو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مغفرت کی یہ خصوصیت تو اسلام کے علاوہ حج اور ہجرت میں بھی ہے۔

② حضور اکرم ﷺ نے جس طرح اسلام کی تشبیہ گناہوں کے مٹانے میں مکان و پہاڑ توڑنے والے ہادم آلے سے دی ہے بعینہ یہی تشبیہ حج اور ہجرت کو بھی دی ہے کہ ہدم ذنوب میں حج اور ہجرت بھی اسلام کی طرح عام اور مطلق ہے۔

● اسلام حج اور ہجرت کو یہاں معطف کے ذریعہ سے ذکر کیا گیا ہے اور معطوف معطوف علیہ میں کمال مناسبت ضروری ہے یہاں مناسبت قویہ کی شکل مساوات فی الحکم میں ظاہر ہوگی کہ جو حکم اسلام کا ہے وہی اس کے معطوفات حج اور ہجرت کا ہے لہذا جس طرح اسلام صغائر کبار سب کے لئے حادہ ہے حج و ہجرت بھی اسی طرح ہے۔

● صیغہ کا ہر بار مستقلاً تکرار کے ساتھ آنا خود اس بات کی دلیل بھی ہے اور تاکید بھی ہے کہ جو کام اسلام کا ہے وہی کام مستقل طور پر ہجرت اور حج کا بھی ہے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ کی یہ تحقیق بہت عمدہ ہے اور جس آیت کو علامہ تورپشتی رحمہ اللہ نے بطور استدلال پیش کیا ہے اس سے معتزلہ نے بھی استدلال کیا ہے لیکن آیت کی اپنی صحیح اور واضح تفسیر بھی ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر عثمانی میں نقل فرمائی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

ویسے جو لوگ حج کی مشقتیں برداشت کر کے کئی ماہ وہاں گزارتے ہیں کیا وہ گناہوں سے توبہ نہیں کرتے ہوں گے اور حقوق العباد کا انتظام نہیں کرتے ہوں گے؟ اسی طرح ہجرت جیسی بڑی قربانی کیا توبہ سے خالی ہوگی؟ جب توبہ عقلاً و عرفاً ملتی ہے تو پھر مغفرت میں کیا شک ہے۔



کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اس کو بند رکھو میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! کیا ہم اپنی زبان سے جو کلمہ نکالتے ہیں اس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، معاذ! تیری ماں تجھے گم کر دے اچھی طرح جان لو کہ لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل دوزخ میں گرانے والی اسی زبان کی بری باتیں ہی تو ہوں گی۔ (احمد رضا رحمہ اللہ)

توضیح: بعمل: توبین تعظیم کے لئے ہے ای بعمل عظیمہ یہ یعنی المجدۃ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول جنت اعمال صالحہ کی وجہ سے ہوگا حالانکہ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ داخلہ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت سے ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سبب کی طرف اسناد مجازی ہے تو ترتیب اس طرح ہے اخبار التبی ﷺ سبب ہے عمل کا اور عمل سبب ہے فضل الہی اور رحمت الہی کا اور فضل الہی سبب ہے دخول جنت کا تو مجازاً عمل کی طرف دخول کی نسبت درست ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ نفس داخلہ تو فضل خداوندی سے ہوگا مگر تقسیم درجات اور تفاوت درجات اعمال صالحہ کے تفاوت سے ہوگا۔

وہا عدنی من النار: معلوم ہوا اس دخول سے مراد دخول اولیٰ ہے۔

لقد سالت عن امر عظیمہ: شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لغات میں لکھا ہے کہ اس جملہ کے دو مفہوم و مطلب ہیں اول یہ کہ تیرا سوال ایک عظیم الشان سوال ہے (کیونکہ دخول جنت اور نجات عن النار کے سبب کا سوال ہے) اور چونکہ اس کا تعلق امور غیبیہ سے ہے لہذا اس کا جواب اسی کے لئے آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کرے (اور وہ انبیاء کرام ہوتے ہیں)۔

دوسرا مفہوم و مطلب یہ کہ تیرا یہ سوال ایک مہتمم بالشان فعل کے بارے میں ہے کیونکہ ایسے افعال نفس پر بہت شاق و گراں ہوتے ہیں مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کرے اس کے لئے اس پر عمل آسان ہے۔

تعبد اللہ: یہ میثد یا امر کے معنی میں اعہد اللہ ہے اور یا مبتدا مقدر کی خبر سے ای ہوا تعبد اللہ اس جملہ میں توحید کا ذکر ہوا اور بعد کے جملوں میں اعمال صالحہ کا ذکر آگیا کیونکہ توحید کے بغیر کوئی عبادت قبول ہی نہیں۔

الا احلت علی ابواب الخیر: ملا علی قاری رحمہ اللہ اور شیخ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نوافل ہیں کیونکہ اعمال باقلہ سے فرائض میں مضبوطی اور استحکام آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نوافل کو فرائض کا باب اور دروازہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ نوافل کے ترک کرنے سے فرائض میں عدم استحکام اور کمزوری آتی ہے جیسا کہ تفسیر کبیر اور علامہ طبری رحمہ اللہ وغیرہ علماء نے لکھا ہے کہ نوافل و مستحبات اور سنن کے چھوڑنے سے ہر مرحلہ میں ترتیب کے ساتھ اوپر والا عمل بطور مزا اچھینا جاتا ہے جیسا کہا گیا ہے۔

من ترک الادب عوقب بحرمان النوافل ومن عوقب بحرمان النوافل عوقب بحرمان السنن

ومن عوقب بحرمان الفرائض ومن عوقب بحرمان الفرائض يوشك ان يعاقب بحرمان المعرفة۔

"الا ادلك" کے جواب دینے میں آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ خود جواب ارشاد فرما دیا اس میں اشارہ ہے کہ یہ مسئلہ اتنا اہم اور مہتمم بالشان ہے کہ سامع کے جواب کا انتظار ضروری نہیں ہے۔ لے

الصوم جنة: جنة جیم کا ضمہ ہے اور نون مشدوہ ہے جیم اور ڈبل نون کے مادے میں ستر کا معنی پڑا ہوا ہے جیسے جنت، جنین، جن، جنان، جنون، جنة، سب میں ستر اور ڈھانپنے کا معنی موجود ہے روزے کی حالت میں چونکہ انسان بھوکا رہتا ہے اور بھوک و پیاس سے انسان کی رگوں میں خون کا دوڑنا بند ہو جاتا ہے اور شیطان اسی خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے اس لئے روزے کی وجہ سے وہ انسان پر تصرف نہیں کر سکتا ہے کیونکہ روزہ قاطع شہوات ہے تو انسان آگ سے بچ جاتا ہے لہذا روزہ ڈھال ہے آگ سے بھی اور شیطانی تصرفات سے بھی بشرطیکہ انسان خود اس ڈھال کو پھاڑ نہ دے اور اس کا پھاڑنا منافی صوم امور کا ارتکاب کرنا ہے۔ لے

والصدقة تطعم المخطیئة: خطا یا خطیئة گناہ کے معنی میں ہے، بعض نے اس سے صغیرہ گناہ مراد لیا ہے یہاں تطعمی کے لفظ میں آگ بجھانے کا مفہوم پڑا ہے تو گناہ کی تشبیہ آگ سے دی ہے اور صدقہ کی تشبیہ پانی سے دی گئی ہے پھر اسی آگ کی مناسبت سے اطفاء بجھانے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس میں استعارات ہیں۔ تو روزہ گناہوں کی آگ کے لئے ڈھال بن گیا مگر گناہوں کی حرارت کا پھر بھی امکان تھا تو اس جملہ میں گناہوں کی حرارت بجھانے کے لئے صدقہ کا ذکر کیا صدقہ سے گناہوں کی حرارت بجھ جاتی ہے۔ لے

وصلوة الرجل: یہ عبارت مبتداء ہے اور کنالک خبر مخذوف ہے "ای تطعم المخطیئة۔" لے

فی جوف الليل: رات کے بیچ میں کیونکہ اس میں کمال اخلاص بھی ہوتا ہے اور یہ عمل نفس پر شاق بھی ہوتا ہے۔ لے

رأس الامر: حافظ توریشکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رأس الامر سے مراد شہادتین و اسلام دونوں ہیں اور جواب میں اسلام ہی بتا دیا ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رأس الامر سے مراد اصل اور جڑ ہے اور جواب میں جو اسلام آیا ہے اس سے مراد شہادتین ہے۔ لے

وعمودہ: ما يعتمد عليه الشی بنیاد اور ستون مراد ہے اور نماز دین کا ستون ہے۔

وذروة سنامه الجهاد: ذروة کسرہ سے زیادہ مشہور ہے ویسے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور فتح سے بھی آیا ہے ذروة کی جمع ذری ہے جو اعلیٰ اور بلند چوٹی کے معنی میں آتا ہے درحقیقت ہر چیز کے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ حصہ پر یہ لفظ بولا

جاتا ہے خواہ مکان ہو، قتل و جہال ہو، جسم ہو یا سنام ہو یہاں اسلام کو ایک قوی الجیڈ اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے پھر اونٹ کے لوازمات میں سے اس کا کوہان ہے پھر کوہان کا ایک بلند و بالا حصہ ہوتا ہے جو رفعت و عظمت کا ضامن ہوتا ہے اور اونٹ وغیرہ مذکر کی شان کی نشانی ہوتا ہے۔ اسلام میں جہاد کے مقام کو اسی حیثیت سے ظاہر فرمایا گیا ہے۔ ۱۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اشارۃ الی صعوبة الجہاد و علو امرہ و تفوقہ علی سائر الاعمال" یعنی خروہ کے لفظ سے اشارہ ہے کہ جہاد ایک مشکل عمل ہے اور ایک عالی شان حکم ہے جو تمام اعمال پر فوقیت رکھتا ہے۔ ۲۔ سننام: کوہان کو کہتے ہیں اس کی جمع اسنمۃ آتی ہے۔

یہاں روزہ صدقہ اور جوف اللیل میں قرآن پڑھنے کو نجات کے اعمال سے بیان کیا گیا ہے تو اس کی ترتیب اور ربط اس طرح ہے کہ توحید کے بغیر تو کوئی عمل معتبر نہیں اس لئے اس کا ذکر کیا پھر احکام اسلام نماز روزہ زکوٰۃ اور حج یہ فرائض اس توحید کے لوازمات میں سے تھے اس کا ذکر کیا پھر اس کے بعد چند اضافی نوافل کا ذکر ابواب الخیر کے نام سے آیا پھر اس کے بعد عذاب الہی سے بچانے والی تین چیزوں کا ذکر کیا مگر الگ الگ خاصیت کے ساتھ کہ روزہ دفع شہوات اور کسر شہوات کے ذریعہ سے عذاب الہی کو روکتا ہے اور صدقہ غضب الہی کی آگ سے بچاتا ہے اور عذاب الہی کو دفع کرتا ہے اور قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کا مدلل کلام ہے وہ قوت دلیل سے عذاب الہی کو انسان سے دفع کرتا ہے۔

اس پوری روایت کے مختلف جملوں پر نظر ڈالتے ہوئے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک عجیب انداز سے دین اسلام کا تصور پیش کیا گیا ہے یعنی جس طرح جسم کے لئے سراہم ہوتا ہے اسی طرح ایمان اور عقیدہ توحید و رسالت دین کے لئے بمنزلہ سر ہے اگر توحید و رسالت نہ ہو تو یہ جسم بغیر سر کے کارآمد نہیں رہے گا پھر اس جسمانی وجود کو کارآمد بنانے کے لئے ستونوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ورنہ عمارت اسلام اصلی حالت میں باقی نہیں رہے گی لہذا یہاں ان ستونوں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کا تذکرہ آگیا پھر اس جسمانی عمارت کو باعظمت اور شان و شوکت بنانے اور اس کی شوکت کو بڑھانے کے لئے اور پوری عمارت کی حفاظت کے لئے جہاد کی ضرورت ہے یہ وہ ضرورت ہے جس پر دین کی عظمت و شوکت اور ترقی و وسعت کا مدار ہے اگر جہاد کو اسلام کی بنیادی ضروریات میں شمار نہ کیا جائے تو دین ایک بے شکوہ اور بے اثر ڈھانچہ بن کر رہ جائے گا اس لئے آخر میں فرمایا و قد وقا سنامہ الجہاد۔

(جہاد کی تعریف و اقسام فضائل و احکام انشاء اللہ کتاب الجہاد میں آئیں گے)

اونٹ ایک ایسا جانور ہے جس میں مشقت برداشت کرنے کا بڑا سامان ہے وہ ریگستان کا جہاز ہے، طاقتور ہے، کئی ہفتوں تک بغیر کھائے پئے گزارہ کرتا ہے اور اپنی کوہان کی چربی سے حیات کو باقی رکھتا ہے، اسی لئے اس سخت جان جانور کے ساتھ جہاد کو تشبیہ دی ہے کہ جہاد بھی اسلام کے لئے ایک مضبوط حصار اور مضبوط قلعہ ہے۔

ملاک ذلک: "ملاک الشی قوامہ ای ما تقوم بہ تلک العبادات"۔ ملاک کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے بغض و عداوت رکھے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے خرچ بند کرے تو یقیناً اس نے ایمان کو کامل کیا۔ ابو داؤد اور ترمذی نے اس روایت کو معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے کسی قدر تقدیم و تاخیر کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں، پس یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کیا۔

توضیح: من احب الله امی من احب شيئا لله و ابغض شيئا لله واعطى شيئا لله و منع شيئا لله: نبی اکرم ﷺ نے یہاں تکمیل ایمان کی چار چیزیں بطور علامت بیان فرمائی ہیں۔ ان چار چیزوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ یہ چاروں چیزیں لذائذ نفس کے قبیل سے ہیں اس لئے اس میں اخلاص پیدا کرنا بڑا ہی مشکل ہے جب کوئی شخص لذائذ نفس میں اخلاص پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسری چیزوں میں بدرجہ اولیٰ مخلص ہوگا اور یہی کمال ایمان ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ ان چار خصلتوں کو اس لئے خاص کیا کہ یہ تمام کیفیات قلبیہ سے متعلق ہیں جب قلب سدھر گیا تو پورا نظام سدھر گیا گویا یہ کہا گیا کہ اعمال قلبی اور اعمال ظاہری کا درست ہونا کمال ایمان ہے ظاہر ہے کہ جب کسی انسان کے احساسات و جذبات، حرکات و سکنات اس کے خیالات و تصورات اس کے ایمانی و سلبی رجحانات اور اس کے جوڑ اور توڑ کے تعلقات خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے تابع ہو جائیں تو اس کا ایمان بکمال درجے میں مکمل ہو جائے گا۔

سب سے افضل عمل کیا ہے

﴿۲۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْخُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبَغْضُ فِي اللَّهِ.

(ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (باطنی) اعمال میں سب سے افضل مرحبہ اس عمل کا ہے کہ اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت ہو اور اللہ ہی کے لئے کسی سے بغض و عداوت رکھی جائے۔ (ابو داؤد)

توضیح: ان اعمال کو اس لئے سب سے افضل قرار دیا کہ یہ اعمال قلبیہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اس لئے ریاکاری سے محفوظ ہیں کیفیت قلبی ہونے کی وجہ سے دکھاوے کا امکان نہیں۔

سچا مومن کون اور جہاد کا مفہوم کیا ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَبَدَنِهِ

وَالْمُؤْمِنُ مَنْ آمَنَهُ النَّاسُ عَلَى جَمَاعِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ۔ (ابو داؤد)

الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَبَدَنِهِ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ آمَنَهُ النَّاسُ عَلَى جَمَاعِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ۔ (ابو داؤد)

توضیح: حضرت ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (کامل اور سچا) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی ایذا سے مسلمان محفوظ رہیں اور (پکا و صادق) مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو امن میں سمجھیں۔ یہ روایت ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں فضائل رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔

توضیح: اس حدیث کے پہلے حصہ پر کلام حدیث نمبر ۴ میں ہوا ہے وہاں دیکھ لیا جائے یہاں مختصر عرض ہے کہ حدیث میں حصر ادعائی ہے کہ مسلمان تو وہی ہے کہ جس کے ہاتھ و زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں اور مومن تو وہی ہے جس کو لوگ اپنی جان و مال پر امن و مامون سمجھیں۔

یہاں مسلم اور مومن کے لغوی معنی سے مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے کہ ہر ایک کا مبداء اشتقاق ملحوظ رہنا چاہئے اب اگر کوئی کہتا ہے کہ میں مسلم ہوں اور اس میں سلامتی نہ ہو اور وہ متصف بالسلامۃ نہ ہو تو یہ ایسا ہے جیسا کہ وہ اپنے کو کریم بھی کہتا ہے اور اس میں کرم سخاوت نہیں ہے، اسی طرح مومن امن سے مشتق ہے تو مومن میں اگر امن نہ ہو تو یہ ایسا ہے کہ اپنے آپ کو کریم کہتا ہے اور کرم نہیں ہے تو چاہئے کہ مسلم اور مومن اپنے مبداء اشتقاق سے اپنے آپ کو متصف کرے ورنہ ایمان و اسلام کا دعویٰ باطل ہو جائے گا و المجاہد من جاهد نفسه فی طاعة اللہ۔ جہاد کی لغوی تعریف اور پھر شرعی تعریف علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری اور ملاحی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات میں کی ہے۔

چنانچہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الجہاد بکسر الجیم هو المشقة لغة وشرعاً بذل الجهد فی قتال الکفار۔

ملاحی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الجہاد بکسر الجیم وهو المشقة لغة وشرعاً بذل المجهود فی قتال الکفار۔

ان دونوں تعریفات میں قتال الکفار جہاد کی تعریف میں داخل ہے اصلی اور حقیقی شرعی تعریف یہی ہے اور مطلق جہاد اسی پر بولا جاتا ہے۔ کنز العمال کتاب الایمان میں حدیث ہے قیل ما الجہاد قال ان تقاتل الکفار اذا لقیہم۔ اب اصطلاحی اور شرعی مفہوم اور تعارف و تعریف یہی ہے اس کو چھوڑ کر جہاد کی لغوی تعریف کی طرف جانا مناسب نہیں۔ لغوی تعریفات سے اسلامی احکامات کو نہیں پہچانا جاتا بلکہ مدار اصطلاحی تعریف پر ہے۔ اب یہاں اس حدیث میں لفظ مسلم اور لفظ مومن اور لفظ مہاجر سب کا مبداء اشتقاق لغوی مفہوم کے اعتبار سے ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ کا ہے کا مسلم جس میں سلامتی نہیں، وہ کا ہے کا مومن جس میں لغوی مفہوم مبداء امن نہیں، وہ کا ہے کا مہاجر جس میں مبداء ترک عن الخطیاء نہیں، وہ کا ہے کا مجاہد جس میں جہاد کا مبداء اشتقاق جہد نفس فی طاعة اللہ نہیں۔ اب اگر سلامتی مسلمان کی تعریف

اصطلاحی نہیں اور امن مومن کی شرعی تعریف نہیں اور ہجران الخطایا مہاجر کی شرعی تعریف نہیں تو جہاد نفس بھی جہاد اولیٰ مجاہد کی اصطلاحی شرعی تعریف نہیں۔

افسوس اس پر ہے کہ ہر جگہ شرعی تعریف ہوتی ہے اور اس کو جامع مانع بنانے کے لئے سب حضرات کوشش کرتے ہیں فاعل کی تعریف مفعول کی تعریف استثنیٰ اور تنازع فعلان کی تعریف مبتدأ اور خبر وغیرہ کی تعریف کو تو جامع مانع بنایا جاتا ہے مگر جہاد کی تعریف کی زحمت نہیں کی جاتی ہے اور نہ اس کو جامع مانع بنانے کی فکر ہوتی ہے بس لفظ جہاد جہاں آگیا دنیا کی ساری چیزیں اس میں داخل ہو گئیں ہر نیکی اس کا مصداق بن گئی اور ہر بھلائی جہاد میں داخل ہو گئی اور اسی اثر وہام معانی میں جہاد گم ہو کر رہ گیا اور خارج میں اس کا مفہوم آنے سے پہلے اس کو دبا دیا گیا اور قرآن کی آیت کا خیال نہیں آیا کہ "و فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیماً" وہاں بیٹھنے والوں کو مجاہد نہیں کہا گیا حالانکہ وہ تمام نیکیاں کرنے والے تھے ان کے عمل نفس اور مجاہدہ نفس کو جہاد اکبر نہیں کہا گیا بلکہ اعلیٰ فضیلت ان حضرات کو دی گئی جو میدان جہاد میں نکل گئے تھے انہیں کو مجاہد کہا گیا اور پیچھے بیٹھ کر نیکی کرنے والے کو قاعد کہا گیا مجھے کسی پر اعتراض کرنا نہیں۔ میں تمام شراحین کی قدر کرتا ہوں اور انہیں سے خوشہ چیں ہوں اور ان کو قلبی طور پر واجب الاحترام سمجھتا ہوں لیکن میں نہایت ادب سے ان سے دیگر احکام کی طرح جہاد کی شرعی اصطلاحی تعریف بھی چاہتا ہوں جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کی جس سے تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں میں تفصیل میں نہیں جاسکتا یہ مسئلہ انشاء اللہ کتاب الجہاد میں تفصیل سے آجائے گا۔ یہاں صرف یہ عرض ہے کہ "و المجاہد من جاهد نفسه" یہ صرف لغوی مفہوم کی روشنی میں مبتدأ اشتقاق کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اگر مجاہد ہو اور وقتی جہاد کے بڑے کام کرنے کا دعویٰ ہے تو اس نفس کو کیوں قابو نہیں کرتے ہو؟ کافر دشمن کو تو مار دیا لیکن نفس کی خواہش کے سامنے شکست کھا گئے یہ تو ایسا ہے کہ "صلت علی الاسد و بلیت من النمل" کہ شیر پر حملہ کر دیا اور بکری کو دیکھ کر پیشاب نکل گیا۔

حضرت مولانا رشید احمد کنگڑی رحمۃ اللہ علیہ نے کوکب الدری میں اس جملے کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔

ولا یخفی ما بین المجاہدین من الالتام والاتصال فان مجاہدة الکفار لا تخلو عن مجاہدة النفس ولا تتصور دونها ومجاہدة النفس اذا کملت لا تکاد الرجل لا یجاہد الکفار بلسانہ او بسانہ۔ (کوکب الدری ص ۴۰)۔

یعنی جہاد نفس اور جہاد کفار دونوں میں جو اتصال اور توافق ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہ رہے کیونکہ کفار سے جہاد کے ضمن میں نفس کا جہاد بھی پڑا ہے بلکہ نفس کے جہاد کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، اور ادھر نفس کا مجاہدہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو آدمی تلوار یا زبان سے کفار کے ساتھ جہاد کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس تصریح کے بعد یہ زور لگانا کہ نفس کا جہاد اصلی جہاد ہے وہ جہاد اکبر ہے وہ قریبی دشمن ہے پہلے اس سے لڑو اس سے قتال کرو، تو اس سے ایک عام آدمی اپنے اصل مقصد سے دور نکل جاتا ہے اگر

کفار کے مقابلے کے بجائے جہاد کا کسی اور چیز پر لغوی اطلاق ہوا ہے یا فس کے خطرات سے بچنے کے لئے کوئی تنبیہ آگئی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اصل شرعی جہاد ہی کو غائب کر دو۔

والہذا جہاد: ہجرت کے متعلق پہلی حدیث میں کلام مزرچکا ہے۔ الخطایا خطیئة چھوٹے گناہ اور الذنوب بڑے گناہ مراد ہیں بعض اہل لغت نے یہ ترتیب رکھی ہے ① سینات ② خطایا ③ ذنوب ④ معاصی۔ اسی ترتیب سے چھوٹے اور پھر بڑے گناہ ہیں خطایا میں عمد نہیں ذنوب میں عمد ہے۔

دیانت اور ایفائے عہد کی اہمیت

﴿۳۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قُلْنَا خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ. (رواه الترمذی فی شُعَبِ الْإِيمَانِ)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے شاذ و نادر کوئی خطبہ ایسا دیا ہو گا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی نہیں اور جس میں وفا ہے عہد نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔

توضیح: ● شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لمعات اور اشعة اللمعات میں فرمایا ہے کہ اگر اس حدیث میں امانت سے مراد وہ امانتیں ہیں جو لوگوں کے آپس میں اموال اور مجالس و کلام کی رازداری اور حفاظت سے متعلق ہیں اور عہد سے مراد بھی لوگوں کے آپس کے وعدے اور معاہدے ہیں تو پھر بطور تغلیظ و تشدید ایمان میں نفی کمال ایمان کی ہے کہ وہ شخص کامل مسلمان نہیں جو لوگوں کی امانتوں میں خیانت کرتا ہو۔

● اور اگر امانت سے مراد تکالیف شرعیہ ہیں جس کی طرف آیت "أَنَا عَرْضُهَا الْإِيمَانُ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ" میں اشارہ کیا گیا ہے اور عہد سے مراد عالم ارواح کا وعدہ "السَّيِّئُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ" ہے تو پھر ایمان کی نفی میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ وہ تو پورا دین ہے تو اس قسم کی امانت اور عہد اگر کسی شخص میں نہیں ہے تو اس میں ایمان ہی نہیں ہے تو اصل ایمان کی نفی ہے۔

● بعض علماء نے امانت سے مراد فرائض، دین، اور حدود اللہ لیا ہے۔

● علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ امانت سے مراد ایمان و ہدایت کا ایک ختم اور استعداد ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیر دیا گیا ہے جس کی طرف حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت اشارہ کرتی ہے وہ فرماتے ہیں "الْإِيمَانُ نَزَلَتْ مِنَ السَّمَاءِ عَلَى جُلْدِ قُلُوبِ الرِّجَالِ" الخ "فرمایا پھر قرآن کریم اترا تو وہ استعداد زیادہ آجا گر ہوئی اس روایت کے اعتبار سے امانت وہ خلقی اور طبعی استعداد ہے جس کو فطرت کہا گیا ہے اس کی تفصیل مزرچکی ہے۔

● ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ عام خیانت اور بدعہدی کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر اسی بدعہدی اور

خیانت میں ترقی کرتے کرتے کفر تک پہنچ جائیں تو ممکن ہے کہ اسی قسم کے لوگ اس حدیث میں مراد ہوں تو پھر یہ حکم باعتبار مبالغہ الیہ ہو جائے گا کہ جس میں آخر کار دیانت اور ایقانے عہد نہ رہے بلکہ وہ درجہ کفر تک پہنچ جائے تو نہ اس کا ایمان ہے نہ اس کا دین ہے، امانت مع اللہ یہ ہے کہ اس کے اوامر اور توہی کا پورا خیال رکھا جائے اور امانت مع الخلق یہ ہے کہ معاملات میں ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا لحاظ رکھنا کامل ایمان ہے۔
اب یہاں ایک اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے گزرا ہے کہ ایمان اور دین ایک ہیں پھر ایمان اور دین کو الگ الگ معنی کے ساتھ کیوں پیش کیا گیا جس سے تباہی کا پتہ چلتا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ایمان اور دین و اسلام میں ایک رائے کے مطابق تباہی ہے تو یہاں تباہی کے طور پر بیان کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے ایمان اور دین متحد ہیں یہاں دونوں کا ذکر کرنا معنوی تکرار ہے جو تاکید کے لئے ہے لفظی تکرار نہیں ہے۔

الفصل الثالث

ابدی نجات کی ضمانت

﴿۳۲﴾ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ النَّارَ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے (سچے دل سے) اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ (اپنے فضل و کرم سے) اس پر دوزخ کی آگ (ابتداء یا انتہاء) حرام کر دے گا۔ (حدیث کی تشریح پہلے ہو چکی ہے)

توحید کی اہمیت

﴿۳۳﴾ وَعَنْ عُمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اس اعتقاد پر وفات پائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی (بھی حاجت روا مشکل کشا) معبود نہیں تو وہ شخص جنتی ہو گیا۔

توضیح: وہو یعلم: علم سے مراد علم یقینی اور عقد جازم ہے، صرف معرفت نہیں اور عقد جازم انقیاد و تسلیم کو مستلزم ہے عقد

جائز اور اس عقیدہ کے رکھنے کے بعد اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس شخص کو زبانی اقرار کا وقت نہیں ملا یا وقت تو ملا مگر فوراً زبان سے اقرار نہ کیا یا زبانی اقرار پر قادر نہیں ہوا اور یا اقرار کے واجب ہونے کا اس کو علم نہیں تھا یا کسی نے اقرار کا ان سے مطالبہ نہیں کیا اور یہ شخص پہلے مر گیا ان تمام صورتوں میں یہ شخص جنتی ہے اور یہی عقیدہ کافی ہے وھو یعلمہ کا مفہوم یہی ہے۔ لہذا لا الہ الا اللہ: اس جملہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا جملہ مستلزم ہے خواہ کوئی اس کو ذکر کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ لا الہ الا اللہ شہادتین کے لئے بطور علم ہے تو ایمان ہالہ رسالۃ بھی اس میں آگیا جیسا کہ پہلے تحقیق گزر چکی ہے۔

دخل الجنة: دخول اولی یا ثانوی ہو یہ تمام مباحث گزر چکی ہیں۔

جنت اور دوزخ کو واجب کرنے والی باتیں

﴿۳۴﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَانِ مُوجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا الْمُوجِبَتَانِ قَالَ مَن مَاتَ يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَن مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو باتیں (جنت و دوزخ کو) واجب کرنے والی ہیں ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! (جنت و دوزخ کو) واجب کرنے والی وہ دو باتیں کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا پہلی بات تو یہ کہ جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا تھا تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور (دوسری بات یہ کہ جس کی وفات اس حال میں ہوئی کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ کیا تھا تو وہ جنت جائے گا۔ (مسلم)

توضیح: ثلثان: یہ صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے یعنی خصلتان ثلثان۔

موجبتان: محاورہ ہے: "اوجب الرجل اذا عمل ما يجب به الجنة او النار ويقال للحسنة موجبة وللسيئة موجبة" اب واجب کرنے والا اور وجوب اہل سنت والجماعت کے ہاں اللہ تعالیٰ کے اپنے وعدہ اور احسان و اکرام کے طور پر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ خود یہ عمل واجب کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ پر بدلہ دینا واجب اور لازم ہوتا ہے۔ لہذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جس شخص نے شرک جلی کا ارتکاب کیا اور اسی پر مرنا تو دوزخ اس کے لئے واجب ہے اور جس شخص نے شرک نہیں کیا اور تو حید اسلام کے عقیدہ پر مرنا تو اس کے لئے جنت واجب ہے ہاں اگر گناہوں کا ارتکاب کیا اور سزا کا استحقاق ہو کر دوزخ میں چلا گیا تو ہمیشہ وہاں نہیں رہے گا پھر نکل کر جنت میں جائے گا تو جنت کا دخول ہوگا خواہ اولی ہو خواہ ثانوی ہو۔

۳۴ و احادیث ۱۳۰۹ جعفی کے بعد:

جنت کی بشارت

﴿۳۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُودًا حَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَمَعَنَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَامَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ أَظْهَرْنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا وَحَشِينَا أَنْ تُفْتَطَعَ دُونَنَا وَفَرَعْنَا فَعُنْتُ فَكُنْتُ
 أَوَّلَ مَنْ فَرَعَ فَجَرَجْتُ أَبْتَعِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّ أَتَيْتُ حَائِطًا لِكُنْصَارٍ لِبَنِي النَّجَّارِ فَنُذْتُ بِهِ
 هَلْ أَجْزَلُهُ بَابًا فَلَمْ أَجِدْ فَإِذَا رِبْعٌ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ يَمْنَانٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبْعُ الْجَدُولُ قَالَ
 فَأَحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ مَا هَذَا
 قُلْتُ كُنْتُ بَيْنَ أَظْهَرْنَا فَأَبْطَأْتُ عَلَيْنَا فَحَشِينَا أَنْ تُفْتَطَعَ دُونَنَا فَفَرَعْنَا فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ
 فَرَعَ فَأَتَيْتُ هَذَا الْحَائِطَ فَأَحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الْغُلَبُ وَمَوْلَاءُ النَّاسِ وَرَأَيْ فَقَالَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ
 وَأَعْطَانِي تَعْلِيهِ فَقَالَ الْغُلَبُ يَتَعَلَّقُ مَا تَلْبَسُ مِنْ لَبِيكِ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
 مُسْتَشْفِقًا بِهَا قَلْبُهُ فَهَرَزَهُ بِالْحِجَّةِ فَكَانَ أَوَّلَ مَنْ لَبِيكِ عُمَرُ فَقَالَ مَا هَاتَانِ الثَّغْلَانِ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ
 فَقُلْتُ هَاتَانِ تَعْلَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَعْنِي بَيْنَا مِنْ لَبِيكِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَشْفِقًا بِهَا
 قَلْبُهُ بَكْرَتُهُ بِالْحِجَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَنِيٍّ فَخَرَزْتُ لِاسْتِغْنِي فَقَالَ إِرْجِعْ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ فَجَعَلْتُ إِلَى
 رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَجْهَشْتُ بِالْحِجَّةِ وَرَكِبْتِي عُمَرُ وَإِذَا هُوَ عَلَى آتَرِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا لَكَ
 يَا أَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَبِيكِ عُمَرُ فَأَخْبَرْتُهُ بِالَّذِي بَعَثْتَنِي بِهِ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَنِيٍّ فَخَرَزْتُ
 لِاسْتِغْنِي فَقَالَ إِرْجِعْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا عُمَرُ مَا تَحْتَلِكُ عَلَى مَا فَعَلْتُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَابِي
 أَنْتَ وَأَتَمُّ أَبْعَفْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ بِتَعْلِيكِ مَنْ لَبِي يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَشْفِقًا بِهَا قَلْبُهُ بَكْرَتُهُ
 بِالْحِجَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يَشْكَلَ النَّاسُ عَلَيْنَا فَخَلَّوْهُمْ يَتَعَلَّقُونَ فَقَالَ رَسُولُ
 اللَّهِ ﷺ قُولَهُمْ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم چند صحابہ رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھے تھے اور ہمارے
 ساتھ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے کہ رسول اللہ ﷺ اچانک ہمارے درمیان سے اٹھے اور کہیں باہر تشریف لے گئے جب
 آپ ﷺ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو ہمیں سخت تشویش ہوئی کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں کسی دشمن کی جانب سے
 آپ ﷺ کو کوئی ایذا نہ پہنچ جائے ہم گھبرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے چونکہ سب سے پہلا شخص میں تھا جو گھبرا اٹھا اس لئے میں
 رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں باہر نکلا اور ڈھونڈتا ہوا قبیلہ بنی نہار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا۔ (اس خیال سے کہ
 شاید آپ ﷺ اس باغ کے اندر ہوں) میں نے اندر جانے کے لئے چاروں طرف دروازہ تلاش کیا۔ مگر دروازہ نظر نہیں آیا
 اچانک ایک مائی نظر آئی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر جا رہی تھی لہذا میں سٹ سٹ کر اس مائی میں داخل ہوا اور اس کے ذریعہ
 رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچ گیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہ تم؟ میں نے کہا جی ہاں یا رسول اللہ!

آپ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے پھر آپ ﷺ غصے اور چل دیئے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور واپس نہیں ہوئے تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں آپ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہو جائیں اور سب سے پہلے گھبراہٹ مجھ پر طاری ہوئی چنانچہ آپ کو ذکرِ حمزہ تا ہوا اس باغ تک آ نکلا (یہاں دروازہ نظر نہیں آیا) تو لومڑی کی طرح سلا کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا باقی ماندہ لوگ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی دونوں جوتیاں نکال کر مجھے دے دیں، اور فرمایا اے ابو ہریرہ! جاؤ اور ان جوتیوں کو ساتھ لے جاؤ (تاکہ لوگ جان لیں کہ تم میرے پاس آئے ہو) اور باغ کے باہر جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد سے یہ گواہی دیتا ہوا تمہیں ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دے دو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس پیغام کو لے کر میں باہر نکلا تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا ابو ہریرہ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا یہ جوتیاں رسول اللہ ﷺ کی ہیں آپ ﷺ نے مجھے یہ جوتیاں (نشانی کے طور پر) دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوا ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دے دو یہ سنتے ہی عمر رضی اللہ عنہ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل نیچے گر پڑا اور پھر انہوں نے کہا ابو ہریرہ! جاؤ واپس چلے جاؤ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ابوہر عمر رضی اللہ عنہ کا خوف مجھ پر سوار ہی تھا کہ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے اپنے سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا ابو ہریرہ کیا ہو گیا؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کا پیغام لے کر باہر نکلا تو سب سے پہلے میری ملاقات عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے آپ ﷺ کا پیغام ان تک پہنچایا انہوں نے اس کو سنتے ہی میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل زمین پر آ پڑا اور پھر اس نے کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا) عمر! تم نے ایسا کیوں کیا انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان کیا واقعی آپ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جوتیاں دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ۔

لا الہ الا اللہ کہتا ہوا ملے اس کو یہ جنت کی بشارت دے دیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”ہاں“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہاں تک مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر لیں (اور عمل کرنا نہ چھوڑ دیں) اس لئے آپ ان کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لگا رہے دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر تمہارا یہی مشورہ ہے تو پھر لوگوں کو عمل میں لگا رہے دو۔ (مسلم) توضیح: کذا قعوداً: ای قاعدین فی نھر تمین سے دس تک کی جماعت پر نفر کا اطلاق ہوتا ہے پھر مطلقاً قوم اور جماعت پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

بین اظہرنا: اس کلمہ میں یا تو لفظ بین بمعنی زائد ہے ای ”من اظہرنا“ اور یا لفظ اظہر زائد ہے تاکہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے ”ای من بیننا“ اظہر ظہر کی جمع ہے پشت کے معنی میں ہے لوگ جب بیٹھے ہیں تو پشتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

وخشیدا ان یقطع دونما: خشیت خوف مع اتعظیم کو کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ "خشیتہ للہ" کہہ سکتے ہیں اور "ہمت للہ" نہیں کہہ سکتے ہیں، یقطع: ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے معنی میں ہے۔ دونما: کالفظ یہاں متجاوز اور بعیداً کے معنی میں ہے "دون" کالفظ درے درے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "احون" کم تر کے لئے بھی بولا جاتا ہے "ای خشیدا ان یصاب بمکروہ من عدو او غیرہ متجاوزاً عننا وبعیداً منا"۔

وفزعنا: سوال یہ ہے کہ خشیدا پہلے آیا ہے اس کے بعد فزعنا کی کیا ضرورت تھی جب کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے تو علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دو مترادفین کا ایک دوسرے پر عطف ہے اور اس سے گھبراہٹ کا تسلسل بتانا مقصود ہے۔ ملاحظہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خشیت اور فزع میں فرق ہے کہ خشیت تو دل کا خوف ہے جس کا اثر ابھی ظاہری جسم پر ظاہر نہ ہوا ہو لیکن فزع اس اضطراب کا نام ہے جس میں آدمی اس طرح بے چین ہو کہ جسم کے ظاہر پر اس کا اثر ظاہر ہو جائے جیسے یہاں بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہونا اور تلاش میں پھیلنا ظاہر ہوا، ملاحظہ قاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں تاکید کے بجائے تائیس ہے اور تائیس تاکید سے بہتر ہے۔

حائطاً: جس باغ کے ارد گرد چار دیواری ہوتی ہے اسے حائط کہتے ہیں گویا محاط بالحدود ان ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو غالب گمان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دھر ہوں گے۔ اشعة اللمعات میں لکھا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی محبت نے محبوب کی خوشبو سونگھ لی تو وہاں گئے۔

فقدت بہ: دار، پد اور ارد گرد گھومنے کے معنی میں ہے۔ هل اجد ہلہا ای قائلانی نفسی هل اجد... الخ ج۔ فلفہ اجد: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو انتہائی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے دروازے کا علم ہی نہ ہو سکا ورنہ دروازہ تو ہو گا یا فلفہ اجد یعنی کھلا دروازہ نہ مل سکا، جو تھے وہ سب بند تھے۔

فاذا رجع: رجع نہر صفر یعنی چھوٹا سا نالہ پانی کا جو باہر کے کنوئیں سے دیوار کے چوٹ میں ہوتا ہوا اندر کو جا رہا تھا اسی راستہ سے میں اندر داخل ہوا رجع کی تفسیر کسی راوی نے جدول سے کی ہے دونوں ایک ہی چیز ہے۔ من ہنکو خار جہ: یہ جملہ تین طرح پڑھا جاتا ہے اول احتمال یہ کہ بحر موصوف اور خار جہ صفت ہے یعنی یہ نالہ ایک ایسے کنوئیں سے اندر کو آ رہا تھا کہ وہ کنواں باہر تھا یہ توجہ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ مناسب اور واضح ہے۔ دوسرا احتمال یہ کہ بحر مضاف ہو اور خار جہ مضاف الیہ ہو اور خار جہ آدمی کا نام ہو یعنی خار جہ صاحب کے کنوئیں سے یہ نالہ آ رہا تھا۔ تیسرا احتمال یہ کہ بحر توین کے ساتھ ہو اور خار جہ مرفوع ہو اور "ہ" ضمیر جدار کی طرف لوثی ہو یعنی من ہنکو خار جہ یعنی ایک کنواں جو باہر تھا بہر حال اول احتمال مشہور ہے۔

ورد کہی عمرو: یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرا بیٹا نہیں چھوڑا بلکہ ایسا تعاقب کیا گویا وہ میرے کندھوں پر سوار آرہے ہوں مراد متصل مسلسل آتا ہے۔

بیوقوفان: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی بشارت کے مقابلے میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مار کر کیوں گرایا؟ شیعہ روافض بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پوری امت بڑے چھوٹے بے بس تھے اور ان کی مداخلت برابر دین میں جاری تھی لوگ تقیہ کرتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی تقیہ کیا اور خلافت چھوڑ دی۔

جنگل اے: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ اس بشارت کا اعلان تو واجب نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ چونکہ رحمۃ اللعالمین تھے تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس پریشانی کا علاج بالصد کیا کہ یہ پریشان ہوئے ہیں اب ان کو جنت کی بشارت دینی چاہیے اور چونکہ اس خالی بارغ میں آنحضرت ﷺ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس طرح ہوا گویا آپ ﷺ عالم استغراق میں تھے تو یہ بشارت سادی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کیفیت میں نہیں تھے بلکہ آپ پر جمال کے بجائے جلال کی صفت غالب تھی اس لئے انہوں نے سوچا تھا کہ شاید اس سے لوگ سستی میں پڑ کر نماز چھوڑ دیں گے اس مصلحت دینی اور اس امر شرعی کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بشارت کو کچھ مدت کے لئے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کی روایت میں خود نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی بشارت سنانے سے روکا تھا تو امتثال امر نبی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مار کر داپس کر دیا اور یہ مارنا لوجہ اللہ تھا اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مواخذہ نہیں کیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے تحت ان کے فیصلے کو برقرار رکھا اور بشارت کو مخفی رکھا۔

علامہ طبری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سختی سے لڑنا یا کہ حضور اکرم ﷺ سے مشورہ کریں گے کہ اس بشارت کا ظاہر کرنا اگر ضروری نہ ہو تو مصلحت کے تحت اس کو مؤخر کر لیا جائے تاکہ لوگ سست نہ ہوں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے لئے معلم اور شیخ و استاذ کی حیثیت رکھتے تھے کسی مصلحت کے تحت شاگرد کا مارا جانا جائز نہیں تھا۔

بہر حال حضور اکرم ﷺ نے مواخذہ نہیں کیا اور آج ملحد و بدین اٹھ کر اعتراض کرتے ہیں یہ محض فساد اور نفیض صحابہ کی ایک نشانی ہے۔

جنت کی کنجی

﴿۳۶﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَقَاتِيحُ الْجَنَّةِ سَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ.

(رواہ احمد)

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ الْجَنَّةَ حَرًّا﴾ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جنت کی سنجیاں (حاصل کرتا) ہے۔

توضیح: علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مبتداء اور خبر میں مطابقت نہیں ہے کہ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ... الخ خبر ہے جو مفرد ہے اور مفاتیح الجنۃ جمع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کے ساتھ معاملہ اسم جنس کا کیا گیا لہذا اس کا اطلاق قلیل و کثیر پر درست ہوا تو مطابقت ہو گئی یا شہادت کے ہر ہر جز کو مفاد قرار دیا لہذا مفاد جمع کہنا درست ہوا اور مطابقت ہو گئی عبارت اس طرح ہو جائے گی مفاتیح الجنۃ شہادات ان لا الہ الا اللہ۔ تو کلمہ توحید کی خاصیت یہی ہے کہ یہ جنت کی کنجی ہے بشرطیکہ کوئی اور خارجی عمل رکاوٹ نہ بن جائے کیونکہ حکم معجون مرکب پر ہوتا ہے یا یہ کہ کلمہ اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ مراد ہے یا یہ کہ دخول آؤ لی یا ثانوی مراد ہے یا یہ کہ کلمہ توحید کے بعد عمل کا موقع ہی نہ ملا تو صرف کلمہ سے جنت میں جائے گا۔ ل۔

کلمہ توحید نجات کا ذریعہ ہے

﴿۲۷﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ إِنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم حِينَ تَوَلَّى حَزْرًا عَلَيْهِ حَتَّى كَادَ بَعْضُهُمْ يُوسِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَكُنْتُ مِنْهُمْ فَبَيَّنَّا أَنَا جَالِسٌ مَرَّ عَلَى عُمَرَ وَسَلَّمَ فَلَمْ أَشْعُرْ بِهِ فَاشْتَكَى عُمَرُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ أَقْبَلَا حَتَّى سَلَّمَا عَلَيَّ جَمِيعًا فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ مَا تَحْتَلِكُ عَلَى أَنْ لَا تُرَدَّ عَلَى أَحَدٍ عَمْرٍ سَلَامَةً فَلَمْ أَفْعَلْ فَقَالَ عُمَرُ بَلْ وَاللَّهِ لَقَدْ فَعَلْتَ قَالَ قُلْتُ وَاللَّهِ مَا شَعَرْتُ أَنَّكَ مَرَزْتَ وَلَا سَلَمْتُ قَالَ أَبُو بَكْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَفَعَكَ عَنْ ذَلِكَ أَمْرٌ فَقُلْتُ أَجَلْ قَالَ مَا هُوَ قُلْتُ تَوَلَّى اللَّهُ تَعَالَى نَبِيَّهُ صلی اللہ علیہ وسلم قَبْلَ أَنْ نُسْأَلَهُ عَنْ نَجَاةٍ هَذَا الْأَمْرُ قَالَ أَبُو بَكْرٍ قَدْ سَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ فَقُمْتُ إِلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ يَا أَبَا بَكْرٍ أَنْتَ وَأَخِي أَهْلُ بَيْتِنَا قَالَ أَبُو بَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا نَجَاةٌ هَذَا الْأَمْرُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَبِلَ بِمِلَى الْكَلِمَةِ الَّتِي عَرَضْتُ عَلَى عَمِّي فَرَدَّهَا فَبَيَّنَ لَهُ نَجَاةً. (رواہ أحمد)

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ الْجَنَّةَ حَرًّا﴾ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت پر رنج و حزن کا اتنا غلبہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں شک و شبہ میں گرفتار نہ ہو جائیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں میں ایک میں بھی تھا چنانچہ میں (غم کی حالت میں) بیٹھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے اور مجھ کو سلام کیا (غم کی وجہ سے) مجھے پتہ نہیں چلا (کہ وہ کب میرے پاس سے گزرے گا)

کب سلام کیا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کی شکایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے اور دونوں حضرات نے مجھے سلام کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا تم نے اپنے بھائی عمر کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوا (یعنی مجھے اس کا علم نہیں کہ عمر نے آکر مجھے سلام کیا ہوا اور میں نے جواب نہ دیا ہو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں خدا کی قسم ایسا ہی ہوا ہے (کہ تم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا بخدا مجھے قطعاً اس کا احساس نہیں کہ آپ میرے پاس آئے تھے اور نہ ہی آپ نے سلام کیا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا عثمان سچ کہتے ہیں (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ) کسی خاص وجہ نے تمہیں اس سے باز رکھا (کہ نہ تو عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کی تمہیں خبر ہوئی اور نہ تم ان کے سلام کا جواب دے سکے) میں نے کہا ہاں ہو سکتا ہے انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا (سرکارِ دو عالم ﷺ کی وفات ہی کیا کم صبر آزمائی کد اب یہ تم کھائے جاتا ہے کہ) نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہم آپ سے یہ دریافت نہ کر سکے کہ اس معاملہ (یعنی عبادت میں دوسروں کا پیدا ہونا شیطان کا ہیکل یا دوزخ کی آگ) سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (تم غم نہ کھاؤ) میں اس بارے میں حضور ﷺ سے پہلے ہی پوچھ چکا ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (بے اختیار) کھڑا ہو گیا اور بولا آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں واقعی آپ ہی (آنحضور ﷺ) سے کمال قرب رکھنے اور حصولِ علم کے غلبہ شوق کی وجہ سے) اس بارے میں سوال کرنے کے لئے لائق تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! اس معاملے میں نجات کی کیا صورت ہوگی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے (غلوں دل کے ساتھ) ہم سے وہ کلمہ توحید قبول کر لیا جسے میں نے چچا ابوطالب کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا تھا تو وہ کلمہ اس شخص کی نجات کا ضامن ہوگا۔ (امرو)

توضیح: آنحضرت ﷺ کا سانچہ ارتحال بہت شدید تھا اس صدمے سے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑھ چلے اور حواس باختہ ہو گئے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور عالی امت صحابی نے تو موت کا ایک وقت تک انکار ہی کیا اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عزم و ہمت کا پھاڑ بن کر سہارا نہ دیتے تو نہ معلوم کیا کچھ ہوتا اسی صدمہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی متاثر ہوئے تھے جو ارتحالِ رسول ﷺ کا نقشہ اس طرح پیش کر رہے ہیں۔

کَلَّا بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ: اِی ہاں یقع فی نفسہ الانطباء هذا الدین وانطفاء الشریعة الغرام بموتہ یعنی دین کے مٹنے کے وسوسوں میں آنے لگے اور شریعت کی روشنی کی انتہاء کا خیال آیا۔ بعض تو بیٹھ ہی گئے اور بعض نے موت کا انکار کیا صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قائم اور قائم رہے۔

فہیئاً: یعنی اسی اثناء اسی دوران "علمہ اشعر بہ اِی ضرورۃ او بسلامہ او بہما وهو الاظہر" یعنی مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا یا ان کے سلام کا شعور و احساس نہ ہو سکا، یادوں کا احساس نہ ہوا، یہی

مطلب زیادہ واضح ہے کہ نہ گزرنے کا پتہ چلا اور نہ سلام کا علم ہوا، خود مدہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ ۱۔
 فاشتی عمر الی ابی بکر: اس بات کی شکایت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے کی کہ اتنا طویل عرصہ بھی نہیں گزرا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ سلام کا جواب بھی نہیں دے رہے اس شکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خلیفہ بننے سے پہلے ہی اپنا بڑا سمجھ رہے تھے اور ممکن ہے کہ اس وقت خلیفہ بنے ہوں۔ یہی بات زیادہ واضح ہے۔

ما فعلت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے پوچھا تو آپ نے صاف انکار کیا کہ مجھے کسی نے سلام نہیں کیا ہے یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال کے مطابق سچ فرمایا کیونکہ وہ مدہوشی کے عالم میں تھے۔ ۲۔
 فقال عمر بنی: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا حقیقت حال پر مبنی ہے۔ ولا سلمت: یہ تاکید ہے مروت کے لئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شکایت کا جواب ہے کہ قسم بخدا مجھے آپ کے گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوا اور نہ سلام کا احساس ہوا ہے۔ ۳۔
 قد شغلت: یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف التفات ہے۔ امر: میں توین تعظیم کے لئے ہے یعنی کسی بڑے عظیم الشان کام نے آپ کو سلام کلام سے مشغول رکھا تھا، اس میں اشارہ ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ اس معاملے میں حق بجانب ہیں۔ ۴۔

فقلت اجل: یعنی ایسا ہی ہوا کہ ایک بڑی فکر اور بڑے تصور نے مجھے مدہوش رکھا۔ ۵۔

قال ما هو: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بتاؤ وہ بڑی فکر کیا ہے؟ ۱۔

عن نجات هذا الامر: یعنی مجھے فکر یہ تھی کہ کاش میں آنحضرت ﷺ سے پوچھتا کہ اس دین اسلام میں نجات کا مدار کس چیز پر ہے؟ تو اس حدیث میں الامر سے مراد دین اسلام ہے تو جواب میں یہ بات آگئی کہ دین اسلام میں نجات کا دار و مدار کلمہ شہادت اور کلمہ توحید پر ہے کہ آخرت میں نجات اسی کی برکت سے ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان وساوس اور ان مہلکات و شہوات اور مرغوبات اور اغوائے شیطانی سے آدمی کس طرح نجات پاسکتا ہے کہ کامیاب ہو کر جنت چلا جائے۔ تو اس کا جواب بھی وہی ہے کہ کلمہ توحید کے تکرار و استمرار اور اس پر عقد جازم رکھنے سے انسان ان تمام اوبام و خیالات فاسدہ سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے اور کامیاب ہو کر جنت پاسکتا ہے۔ اب اس حدیث پر یہ اشکال نہیں ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو خود وہ حدیث نقل فرماتے ہیں جس میں ہے من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة جب آپ خود یہ حدیث بیان فرما رہے ہیں تو پھر نجات سے متعلق اتنی پریشانی کا کیا مطلب ہوا؟ تو جواب یہی ہے کہ ان وساوس شیطانی سے چھٹکارا پانے کی پریشانی لاحق تھی اس کی تفصیل محمد بن جبیر رحمہ اللہ کی حدیث میں ہے جس کی تخریج علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جمع الجوامع میں کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ۲۔

۱۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۲۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۳۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۴۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸

۵۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۶۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۷۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸ ۸۔ المرقاۃ ۱/۲۰۸

”یا لیتنی سألت رسول الله ما ينجينا من هذا الحديث الذي يلقي الشيطان في انفسنا“۔

اور اشعة اللمعات میں جو لکھا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ

”دوست ندارم کہ بزبان آرم آن را“۔

یعنی وہ ایسے وساوس و خیالات ہیں کہ میں اس کو زبان پر لانا نہیں چاہتا ہوں۔ اس پر صدیق اکبر ؓ نے فرمایا کہ ”قد سألته“ کہ میں نے یہ سوال آنحضرت ؐ سے خود کیا تھا۔

انت احق بها: حضرت عثمان ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں آپ اس سوال کرنے کے سب سے زیادہ حق دار تھے، یا آپ اس خصلت کے زیادہ حق دار ہیں، یا آپ اس نجات کے زیادہ حق دار ہیں۔ ۱
من قبل منی: یعنی کلمہ توحید کو دل کی خوشی اور رغبت سے قبول کرے اور دل میں نفاق نہ رکھے جس کو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا۔

فهي له نجات: اسی ابتداء و انتہاء یعنی حضور اکرم ؐ نے فرمایا کہ جو کلمہ توحید میں اپنے چچا ابوطالب پر پیش کر چکا تھا جس کو اس نے رد کر دیا تھا اگر وہ قبول کر لیتا تو باوجود ستر سالہ گناہوں اور شرکیات کے وہ معاف ہو جاتا تو ایک مسلمان جس کے دل و دماغ اور رگ و ریشہ میں کلمہ توحید ہو سکتا ہے اگر وہ صدق دل سے پڑھتا ہے تو وہ بطریق اولیٰ نجات یافتہ بن جائے گا۔

اس طرز بیان میں حضور اکرم ؐ نے نہایت بلیغ انداز سے کلمہ توحید کی شان اور اہمیت واضح فرمادی ہے اگر آپ صرف یہ فرمادیتے کہ اس سے نجات کا ذریعہ کلمہ توحید ہے تو یہ اہمیت واضح نہ ہوتی۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابوطالب کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا شیعہ راہنہی کہتے ہیں کہ مولاعلیٰ کے والد تو سب سے بڑے ایمان والے تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مولاعلیٰ کا والد ایمان پر نہ ہو؟

اللہ کے بندے اس کو نہیں سوچتے کہ انبیاء کرام میں سے بڑے بڑے نبیوں کے آباء و اجداد جب ایمان پر نہیں آئے تو حضرت علی ؓ میں کیا اشکال ہے۔ ۲

حضرت عثمان ؓ کا کچھ تذکرہ:

حضرت عثمان ؓ ابتداء اسلام میں حضرت ابوبکر ؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے تھے حبشہ کی طرف دومرتبہ ہجرت کی بدر میں بوجہ معذوری حاضر نہ ہو سکے مگر بدری قرار پائے صلح حدیبیہ میں ان کا بدلہ لینے کے لئے بیعت رضوان ہوئی آنحضرت ؐ نے اپنا مبارک ہاتھ عثمان ؓ کا ہاتھ قرار دے کر بیعت فرمادی ان کو ذوالنورین اس لئے کہتے ہیں کہ آنحضرت ؐ کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں آپ کا رنگ سفید تھا قد درمیانہ تھا یکم محرم ۲۴ھ میں خلیفہ ثالث بنے اور بارہ سال تک خلافت کی، اسود تمیمی مصری نے آپ کو شہید کیا،

اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ قبر نمایاں ہے۔

رضی اللہ عنہ وعن جمیع الصحابة

پوری دنیا میں اسلام کے غلبے کی پیشگوئی

﴿۳۸﴾ وَعَنِ الْمَلَأَةِ دَاثَةٍ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتٌ مَدَنٍ وَلَا وَهٍ إِلَّا أَذْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ وَخَلَّ ذَلِيلٌ إِمَّا يُعِزُّهُمْ اللَّهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَقِيدُونَهَا قُلْتُ فَيَكُونُ الْيَهُودُ كُلُّهُ يَهُودًا (رواه أحمد)

اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ زمین کے اوپر کوئی گھر خواہ وہ مٹی کا ہو یا خیمہ کا، ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی رسوائی کے ساتھ داخل نہ کرے۔ (پس جو لوگ خوشی سے اسلام قبول کریں گے) ان کو اللہ تعالیٰ معزز بنا کر اس کلمہ کا اہل قرار دے گا۔ (اور جو لوگ بخوشی قبول نہ کریں) ان کو اللہ تعالیٰ ذلیل کر کے رکھ دے گا تو وہ لوگ اس کلمہ کے مطیع و فرماں بردار ہونے پر مجبور ہوں گے (بایں طور کہ وہ جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست میں رہ سکیں گے) میں نے یہ سن کر کہا پھر تو چاروں طرف اللہ ہی کا دین ہوگا۔ (احمد)

توضیح: بیت مدد: یہ مدد کی جمع ہے اینٹ اور پتھر مراد ہیں۔

وہو: پشم کو کہتے ہیں خیمے مراد ہیں۔ "بیت مدد" یہ شہری آبادی کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں لوگ سہکے مکانات میں رہتے ہیں اور "وہو" سے صحرائی اور دیہاتی آبادی کی طرف اشارہ ہے جہاں زیادہ تر خیمے بطور گھر استعمال ہوتے ہیں۔ اور الارض، سے مراد جزیرہ عرب اور اس کے ارد گرد علاقے ہیں یعنی پورے عرب میں صرف ایک دین یعنی اسلام کا دور دورہ ہوگا۔ اب یہ اعتراض نہیں آئے گا کہ چین کے دور دراز علاقوں تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی اور غلبہ نہیں آیا کیونکہ جواب واضح ہے کہ یہ شہر اور دیہات اور یہ خیام و محلات صرف جزیرہ عرب کے ہیں جہاں تک مکمل اسلام پھیل جائے گا اور یہ پوچھن کوئی پوری ہوگئی یا "الارض" سے مراد دنیا کی عام زمین ہے اس کی تفصیل ابھی آ رہی ہے۔

بعز عزیز: ای الکلمۃ متلبس بعز شخص عزیز، یعنی جو لوگ اطاعت و خوشی سے اسلام قبول کر لیں گے اور مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کریں گے تو عزت سے رہیں گے۔ وذل ذلیل: یعنی جو مقابلہ کرے گا تو یہ کلمہ وہاں بھی داخل ہو جائے گا مگر مقابلہ کرنے والے اس ذلیل شخص کی ذلت کے ساتھ جس کو اللہ تعالیٰ خوار کر دے گا اور وہ قید و بند اور جزیہ و غلامی کی ذلتوں کے بعد گردن جھکا لے گا۔

فیدینون لہا ای بطیعون لہا: یعنی سب لوگ اس کلمہ توحید کے سامنے مطیع و فرمانبردار بن جائیں گے اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ حربی شخص کا اسلام تلوار کے زور اور اس کے خوف سے صحیح ہے۔ ۱۔

قلت فیكون الدين كله لله: سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں آپ کے سامنے نہیں کہا، اسی لئے آنحضرت ﷺ کی طرف سے جواب نہیں آیا یا آپ نے اسی مجلس میں کہہ دیا مگر حضور اکرم ﷺ نے جواب دینے کو ضروری نہیں سمجھا۔

سوال: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے غلبہ اسلام کی پیشگوئی فرمائی ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ پیشگوئی پوری ہوگئی ہے یا پورا ہونا باقی ہے؟

جواب: پہلا جواب تو گزر گیا ہے کہ غلبہ اسلام کی یہ پیشگوئی جزیرہ عرب کے لئے تھی اور وہاں پر یہ غلبہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں حاصل ہو گیا تھا پوری دنیا پر غلبہ مراد نہیں۔

دوسرا جواب یہ کہ پوری دنیا پر غلبہ مراد ہے اور یہ غلبہ عمومی طور پر خلفاء راشدین کے دور میں آچکا تھا اسلام غالب دین کے طور پر مشرق و مغرب میں پھیل چکا تھا قیصر و کسریٰ کا تصور ختم ہو چکا تھا اور دین کا بول بالا تھا حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کافر نہیں رہے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین غالب ہوگا اور یہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت سے اقتباس ہے:

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ غلبہ دلائل اور قوت استدلال کے اعتبار سے ہے اور اس طریقے پر تو اسلام روز اول سے آج تک غالب ہی چلا آ رہا ہے دلائل کی دنیا میں کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے یہ جواب بہت اچھا ہے لیکن اسی کے آسرہ پر بیٹھ کر غلبہ اسلام کے لئے عملی میدان میں نہ اترنا جہاد کو ترک کرنا اور اسلامی سیاسی قوت و خلافت کے حصول سے پیچھے رہنا قرآن و حدیث کے واضح نصوص کی خلاف ورزی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ کو پس پشت ڈالنا ہے لہذا معطل ہو کر بیٹھنا جائز نہیں۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ غلبہ مکمل طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں حاصل ہوگا اس وقت تو جزیرہ کا نظام بھی بحکم شریعت محمدی موقوف ہو جائے گا پھر یا اسلام ہوگا یا کافر کی موت ہوگی۔ ۲۔

کلمہ توحید کے ساتھ نیک اعمال کی ضرورت

﴿۲۹﴾ وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيلَ لَهُ أَلَيْسَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَمُفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَالَ بَلَى وَلَكِنْ لَيْسَ مُفْتَاحُ الْإِلَهَةِ أَشْهَادُ قُلُوبٍ جُفَّتْ بِمُفْتَاحِ لَهْ أَشْهَادُ قُلُوبٍ لَمْ تُفْتَحْ لَكَ وَالْأَلَمُ يُفْتَحُ لَكَ۔

(رواة البخاری فی ترمذی و تہذیب)

ترجمہ: حضرت وحب بن منہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ کیا لا الہ الا اللہ جنت کی کنجی نہیں ہے؟ وحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کیوں نہیں لیکن کوئی کنجی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں پس اگر تم ایسی کنجی لے کر آؤ گے جس میں دندانے موجود ہوں تو تمہارے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے ورنہ نہیں کھولے جائیں گے۔

توضیح: وحب بن منہ تابعی ہیں فارسی النسل ہیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایتیں کرتے ہیں یہ ایک دفعہ وعظ فرما رہے تھے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ ایس لا الہ الا اللہ مفتاح الجنۃ تو آپ نے یہ جواب دیا کہ کنجی کے لئے دندان بھی تو ہوتے ہیں جب چابی کام کرتی ہے اور دندانے اعمال صالحہ اور ارکان اسلام ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۱۴ھ میں ہوا۔

لیس مفتاح: یعنی خواہ لوہے کی ہو یا لکڑی کی ہو الا ولہ اسندان: اسنان دانت کو کہتے ہیں اور چابی کے دندانوں سے اسلام کے بقیہ چار ارکان یعنی نماز زکوٰۃ روزہ اور حج بیت اللہ مراد ہیں تو یہ نیک اعمال جب ہوں گے تب جنت کے دروازے کھلیں گے۔

فتح لك: خواہ دخول اولی کے ساتھ ہو یا سزا بھگتنے کے بعد دخول ہو یہ قید احترازی بہت ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے بارے میں جو عقیدہ معتزلہ اور خوارج کا ہے کہ سب لوگ اسلام سے بوجہ گناہ خارج ہو گئے ان پر رد ہو جائے ایسے ہی طبقات اور ایسے ہی افراد پر اس حدیث میں کلمہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا یفتح: میں بھی دخول اولی یا ثانوی مراد ہے۔

ایک نیکی کا ثواب سات سو تک بڑھ سکتا ہے

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِينَ مِائَةً ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِعِشْرِينَ حَسَنَةً لِّلَّهِ. (متفق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص (اچھی نیت و اخلاص سے) اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے۔ پھر وہ جو نیکی کرے گا اس کے لئے دس گنا زیادہ لکھی جاتی ہیں سات سو گنا تک اور جو برائی وہ کرتا ہے وہ اس کی مانند اور برابر لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (بخاری مسلم)

توضیح: اذا احسن احدكم اسلامه: حسن اسلام سے مراد باطنی طور پر اخلاص اور عقد جازم ہے جو تصدیق قلبی مع الاعمال ہے یعنی ظاہر و باطن احسن ہو باطن بھی اچھا ہو ظاہر بھی اچھا ہو۔

الی سبعینۃ ضعف: یعنی اخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے سات سو گنا تک ثواب میں اضافہ ہوگا اخلاص اور نیت کے تفاوت سے ثواب میں تفاوت آئے گا۔

علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دس گنا تک ثواب تو یقینی ہے اور اضافہ سات سو گنا تک ہے اب اس سے آگے مزید ثواب نہیں ملے گا مگر علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے کا ثواب بھی ملے گا اور اضافہ بھی ہوگا۔ چاہے کروڑوں کی تعداد تک نوبت پہنچ جائے یہاں رات سو کے عدد تک پہنچنے کا ذکر صرف کثرت کی بنیاد پر ہے نہ کہ حد بندی کی بنیاد پر اور آیت: **وَاللّٰهُ يَضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ** بتا رہی ہے کہ یہ اضافہ لاحدود ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ جہاں شریعت نے تعین نہیں کیا وہاں آدمی از خود تعین نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ انچاس کروڑ ملے گا بلکہ یہ کہے کہ کروڑوں بھی مل سکتا ہے۔

ایمان کی علامت

﴿۱﴾ **وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا الْإِيمَانُ قَالَ إِذَا سَرَّكَ حَسَنَتُكَ وَنَسَاكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَمَا الْإِيمَانُ قَالَ إِذَا حَالَكَ فِي نَفْسِكَ شَيْءٌ قَدْ عُدَّ**

(رواؤا أحمد)

مِنْ جَمْعِهِمْ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایمان (کی سلامتی کی علامت) کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب تیری نیکی تجھ کو خوش کر دے اور تیری برائی تجھے غمگین کر دے تو سمجھ لو کہ تم کہے مؤمن ہو۔ پھر اس شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! گناہ (کی علامت) کیا ہے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ جب کوئی (کام) تمہارے دل میں کھٹک کر تردد پیدا کرے تو سمجھ لو کہ وہ گناہ ہے لہذا اس کو چھوڑ دو۔ (امرو)

توضیح: ما الایمان؟: سائل نے حقیقت ایمان کے بارے میں سوال نہیں کیا ہے بلکہ ایمان کی علامات اور آثار کا پوچھا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں علامات اور آثار کا ذکر فرمایا ہے۔

اذا سررتك حسنتك: یعنی جب تک دل میں یہ کیفیت ہے کہ نیکی کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے اور برائی پر غم محسوس ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ تم مؤمن ہو اور اگر نیکی یا برائی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ ایمان کا پارہ بچھ گیا۔

اذا حالک: یعنی دل میں کھٹکے کہ یہ کام گناہ کا ہے تو اسے چھوڑ دے یہ روایت اسی طرح ہے جیسے "الحلال بین والمحرّم بین وبینہما متشابہات" یا جیسے **دع ما یوریک الی ما لا یریک** اور **استغفرت لنفسک الخ**۔ یہ حکم اور یہ فیصلہ اور یہ معیار و کوئی ان قلوب کیلئے ہے جو صاف اور روشن ہوں، جن کی باطنی صفائی مکمل ہو چکی ہو تو وہ اس میں فرق کر سکیں گے عوام الناس کے دلوں کا فیصلہ مراد نہیں ہے۔

بیشمار احادیث

ایمان و اسلام کا تعارف

﴿۲﴾ **وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْسَةَ قَالَ أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ مَعَكَ عَلَى هَذَا**

لے المرفقات ۱/۱۱۳ لے المرفقات ۱/۱۱۳ لے المرفقات ۱/۱۱۳ لے المرفقات ۱/۱۱۳ لے المرفقات ۱/۱۱۳

الْأَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَعَبْدٌ قُلْتُ مَا الْإِسْلَامُ قَالَ طَيْبُ الْكَلَامِ وَطَاعَةُ الطَّعَامِ قُلْتُ مَا الْإِيمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَالسَّخَاةُ قَالَ قُلْتُ أَيْ الْإِسْلَامُ أَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ قَالَ قُلْتُ أَيْ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ قَالَ خُلِّيَ حَسَنٌ قَالَ قُلْتُ أَيْ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ قَالَ طَوْلُ الْعُنُوتِ قَالَ قُلْتُ أَيْ الْهَجْرَةِ أَفْضَلُ قَالَ أَنْ عَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ قَالَ قُلْتُ أَيْ الْجِهَادِ أَفْضَلُ قَالَ مَنْ عَقِرَ جَوَادُهُ وَأَهْرَبَ دَمُهُ قَالَ قُلْتُ أَيْ الشَّاعَاتِ أَفْضَلُ قَالَ جَوُفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ (رواه أحمد)

ترجمہ: عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! (دعوت اسلام کے آغاز میں) اس دین اسلام پر آپ کے ساتھ کون ہیں؟ فرمایا ایک آزاد (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور ایک غلام (بلال رضی اللہ عنہ) میں نے عرض کیا اسلام کی علامت کیا ہے فرمایا یا کیزہ کلامی اور مساکین کو کھانا کھانا، میں نے عرض کیا ایمان کی باتیں کیا ہیں؟ فرمایا مبر اور سخاوت، میں نے کہا کون سا مسلمان بہتر ہے؟ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے مسلمان محفوظ رہیں، میں نے کہا ایمان میں بہتر چیز کیا ہے فرمایا اچھے اخلاق، میں نے کہا نماز میں کون سی چیز بہتر ہے؟ فرمایا دیر تک کھڑے رہنا، میں نے کہا کون سی ہجرت بہتر ہے؟ فرمایا کہ تم اس چیز کو چھوڑ دو جس سے تمہارا پروردگار ناخوش ہوتا ہو۔ میں نے کہا جہاد میں افضل کون ہے؟ فرمایا وہ شخص افضل ہے جس کا گھوڑا مارا جائے اور وہ خود بھی شہید ہو جائے میں نے کہا سب سے افضل کون سا وقت ہے آپ نے فرمایا نصف شب کا آخری حصہ۔ (احمد)

توضیح: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ جو تھے مسلمان ہیں ابتداء میں اسلام قبول کر کے اپنی قوم بنی سلیم میں جا کر رہے اور سات ہجری میں جنگ خیبر کے موقع پر ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے آپ شامی ہیں آپ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب سنو کہ میں نے ہجرت کر لی تو پھر تم بھی آ جانا آپ کی کنیت ابو نعیم سلسلی ہے۔
اتحاد: یعنی طلب علم کے لئے میں نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا آیا۔

من معك على هذا الامر: امر سے مراد دین ہے یعنی آپ جس دین پر ہیں اس میں کون لوگ آپ کا ساتھ دے رہے ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابی اس بات کو معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس دین کو قبول کرنے والے لوگ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں کہیں کوئی مخصوص طبقہ تو نہیں جو اس دین کو قبول کرتا ہو اور دوسرے لوگ مخالف ہوں یہ صورت اس وقت ہوا کرتی ہے جب کوئی تحریک کسی خاص گروہ کے خاص مقاصد کے لئے شروع کی جاتی ہے دعوت الہیہ میں یہ چیز نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ پوری امت کے لئے اور ان کے فوائد کے لئے عام ہوتی ہے۔

قال حر و عبد: ای کل حر و عبد مامور بالموافقة یعنی یہاں کوئی خاص طبقہ نہیں بلکہ ہر کہتر و بہتر اور ہر غلام و شریف کو موافقت کی کھلی دعوت ہے، جیسے کہا گیا ہے۔

در فیض محمد دا ہے آئے جس کا جی چاہے نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
 مریضان گناہ کو دو خبر فیض محمد کی بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے
 اس جملہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ میری موافقت میں ایک آزاد ہے جو ابو بکر رضی اللہ عنہ ہے اور ایک غلام ہے جو بلال رضی اللہ عنہ ہے
 اس مفہوم کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ”ومعہ یومئذ ابو بکر وبلال“ کے الفاظ ہیں۔
 اب سوال یہ ہے کہ اس وقت تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو خواتین میں سے تھیں اس لئے ان کا ذکر نہیں آیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے۔
 جواب یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو خواتین میں سے تھیں اس لئے ان کا ذکر نہیں آیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے۔
 قلت ما الاسلام؟ ای شعبہ او کمالہ او علامتہ: تو حقیقت اسلام اور مابیت اسلام کا سوال نہیں بلکہ
 علامت اسلام کا سوال تھا، قال طیب الکلام واطعام الطعام اس جملہ میں جزء اول سے غذائے روحانی اور
 جزء ثانی سے غذائے جسمانی مراد ہے ان دونوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو حقوق اللہ کا اہتمام بطریق اولیٰ ہوا ہے ان
 دونوں جملوں سے جمیع محامد اور خصال حسنہ مقصود ہیں مگر ان دو کی تخصیص فرمادی کیونکہ اول میں تو تواضع ہے اور ثانی میں
 سخاوت و اکرام کا ذکر ہے اور یہ دونوں صفات مخلوق خدا کی خدمت کے لئے اصل ہیں۔
 قلت ما الایمان؟ اس جملہ سے بھی علامت ایمان، ثمرۃ ایمان اور نتیجہ ایمان کا سوال پوچھا گیا ہے مابیت ایمان کا
 سوال نہیں ہے۔

قال الصبر: ای الصبر علی الطاعة والصبر علی المصیبة والصبر عن المعصية صبر کی ان
 تینوں قسموں سے متعلق تفصیلات اور توضیحات حدیث نمبر ۳۰ میں گزر چکی ہیں۔
 السباحة: حسن بھری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سباحۃ سے مراد قرآن کی ادائیگی ہے بعض نے کہا ہے کہ ہر معدوم کے نہ ملنے
 پر صبر کرنا تو صبر ہے اور ہر موجود پر سخاوت کرنے کا نام سباحہ ہے۔ تو ایک ترک فعل ہوا اور ایک وجود فعل ہوا تو گویا ایمان دو
 قسم کے افعال کا نام ہوا ایک سلبی افعال اور دوسرے وجودی اعمال دونوں سے مل کر کامل ایمان بنتا ہے اور اسی مجموعہ کی
 طرف خلق حسن سے اشارہ کیا گیا ہے۔

ای الاسلام افضل؟: یہاں سوال اشخاص کے بارے میں ہے یعنی ای اہل الاسلام افضل یا ای ذو
 الاسلام افضل تو جواب میں ”من سلم المسلمون“ کہنا درست ہوا اور حمل درست نہیں ہے یا من سلمہ سے
 پہلے لفظ اسلام کو مخدوف مانا جائے ”ای اسلام من“ تو سوال وجواب مطابق ہو جائے گا۔
 من سلم المسلمون: اس جملہ سے پہلے طیب الکلام اور اطعام الطعام کا ذکر تھا جس میں تعلیمہ
 بالفضائل کا ذکر تھا اور اس جملہ میں تعلیمہ عن الرذائل کا ذکر ہے طیب الکلام کے جملہ کو حقوق العباد کی اہمیت
 کی وجہ سے مقدم کیا ورنہ طبعاً و عرفاً تخلیہ کا مقام محلیہ سے مقدم ہوتا ہے کہ پہلے گندگی ہٹاؤ پھر زیب و زینت کر کے عطر لگاؤ۔

ای ایمان افضل: یہاں بھی سوال اشخاص کے بارے میں ہے ای اہل الایمان افضل یا ای اخلاق الایمان یا ای خصال الایمان یا ای شعب الایمان افضل۔

آنحضرت ﷺ نے لفظ "ای" کے ساتھ کئے گئے سوالات کے جواب میں مختلف جوابات دیئے ہیں یا تو مسائل کی حالت کا تقاضا تھا یا زمانے کا تقاضا تھا یا مقام و مکان کا تقاضا تھا یا افضل ایک کلی ہے جس کی بہت انواع ہیں تو جس افضل کا ذکر ہوا وہ اسی کلی کی نوع میں سے ایک نوع ہے آپس میں تضاد نہیں پہلے اس پر کلام ہو چکا ہے۔ اس میں وضاحت اور تفصیل ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔

خلق حسن کی تعریف:

قال خلقی حسن: بلند و بالا خصلتوں اور اعلیٰ سیرت کے لئے جامع ترین صفت حسن اخلاق کی صفت ہے، کئی حدیثوں میں ایمان اور حسن اخلاق کو ایک ساتھ جوڑا گیا ہے، چنانچہ ابوداؤد شریف میں ایک حدیث ہے:

"اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا۔"

قرآن کریم کا ارشاد ہے "وانک لعلی خلق عظیم" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ تو آپ نے فرمایا "کان خلقه القرآن" یعنی اوامر و نواہی کا پورا پورا لحاظ رکھنا اخلاق حسنہ ہے، قرآن کریم نے جس چیز کو اچھا کہا نبی اکرم ﷺ اس کو طبعاً اچھا سمجھتے تھے اور قرآن نے جس کام کو برا کہا نبی اکرم ﷺ طبعاً اس کو ناپسند فرماتے تھے "کان خلقه القرآن" کا یہی مطلب ہے۔ بعض محققین کا قول ہے کہ:

الخلق الحسن هو بسط المعیاء وبذل الندی وکف الاذی وان لا یخاصم لمعرفۃ اللہ تعالیٰ ولذا قیل الصوفی لا یخاصم ولا یخاصم۔

الندی: عطیہ و سخاوت کو کہتے ہیں اور المعیاء چہرہ کو کہا جاتا ہے۔

بعض نے حسن خلق کی اس طرح تعریف کی ہے "ارضاء الخالق والمخلوق فی السراء والضراء۔"

بعض نے کہا کہ حسن خلق یہ ہے کہ تزکیہ نفس عن الرذائل ہو جائے اور تخلیہ نفس بالقواضل ہو جائے، رذائل کے دس اصول ہیں:

- ① زائد طعام ② فضول کلام ③ غضب ④ حسد ⑤ بغل ⑥ حب المال ⑦ حب الجاہ ⑧ تکبر ⑨ خود پسندی ⑩ ریاکاری۔

اسی طرح قواضل کے بھی دس اصول ہیں: ① توبہ ② خوف خدا ③ زہد و تقویٰ ④ صبر ⑤ شکر ⑥ اخلاص ⑦ توکل ⑧ محبت ⑨ رضا بالقضاء ⑩ ذکر الموت۔

قلت ای الصلوٰۃ افضل یعنی ای رکن الصلوٰۃ افضل قال طول القنوت علامہ انباری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قنوت چار معنوں میں آتا ہے: ① الصلوٰۃ ② طویل القیام ③ الطاعة ④ السکوت۔

بعض نے قرأت یا خشوع مراد لیا ہے، احناف کے نزدیک طول القنوت سے طول قیام مراد ہے اور یہ ان کے ہاں سجود سے افضل ہے۔ شوافع کے ہاں سجدہ قیام سے افضل ہے۔ اسی پر طول قیام اور کثرت سجود کی افضلیت کا اختلاف متفرع ہے۔

قلت ای الهجرة افضل: ہجرت پر کلام مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث میں ہو چکا ہے۔ ہجرت کی کئی اقسام ہیں:

① من دار الکفر الی دار الامن جیسے مکہ سے حبشہ کی ہجرت تھی۔

② من دار الکفر الی دار الاسلام جیسے مکہ سے مدینہ کی ہجرت تھی۔

③ من دار الفسق الی دار التقوی جیسے افغانستان میں طالبان کی اسلامی خلافت کی طرف ہجرت۔

④ هجرة القبائل لتعلم المسائل جیسے آج کل دینی مدارس کے طلبہ کرتے ہیں۔ اور حضور ﷺ کے زمانے میں اور بعد میں مدینہ کی طرف علم سیکھنے کے لئے جو لوگ آتے تھے وہ اسی قسم کی ہجرت تھی۔

⑤ هجرة من هجر الخطايا والذنوب یہ آخری نوع عام تر ہے۔

فای الجهاد افضل: یعنی ای خوی الجہاد افضل یا ای اہل الجہاد افضل؟ اس تقدیر سے کلام کے سوال و جواب میں مطابقت آجائے گی اور من عقر جوادہ صحیح ہو جائے گا۔

اس قسم کے جہاد کو سب سے افضل اس لئے قرار دیا گیا کہ مجاہد نے اس میں مال و جان دونوں کو قربان کر دیا اور مال غنیمت وغیرہ میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا گویا ثواب خالص رہ گیا ہے۔

جو پاس تھا وہ سب لٹائی دیا حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہی کیا جہاد سے متعلق کلام انشاء اللہ کتاب الجہاد میں ہوگا۔

عقر: فعل مجہول ہے ذمی ہو کر مارا جانا۔ ”جوادہ“: عمدہ گھوڑا۔

أهريق: یہ لفظ تین ابواب سے آتا ہے ① هراق یہریق هراقة یعنی اراق یہریق۔ ② أهريق یہریق أهراقاً۔

③ أهراق یہریق أهراقة بمعنی خون بہانا۔

ای الساعات: یعنی حصول ثواب کے لئے سب سے اچھا وقت کونسا ہے۔

قال جوف الليل: کیونکہ یہ ابعد عن الریاء ہے اور اقوم قیلاً ہے عمدہ کے تمام فضلات اس وقت تحلیل ہو جاتے ہیں تو تصورات خالص ہو جاتے ہیں اور سحری کا وقت نسبتاً پرسکون بھی ہو جاتا ہے۔

حسن حدیث: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے متعلق خلق حسن کے تحت لکھا ہے: هذا حدیث حسن رواه الحسن عن ابی الحسن عن جد الحسن ان احسن الخلق الخلق الحسن۔

ایمان و اسلام پر مرنے والا جنتی ہے

﴿۳﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ لَبَّى اللَّهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَيُصِلِ الْخَمْسَ وَيَصُومَ رَمَضَانَ غُفِرَ لَهُ قُلْتُ أَفَلَا أَبْشِرُهُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ دَعَهُمْ يَعْمَلُوا

(رواہ احمد)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی طرف اس حال میں کوچ کیا کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہرا رکھا تھا پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا اور رمضان کے روزے رکھتا تھا تو وہ بخش دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں لوگوں کو خوشخبری سنا دوں؟ آپ نے فرمایا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور عمل میں لگا رہنے دو۔ (ام)

توضیح: لا یشرک بہ شیئاً: یعنی شرک جلی اور شرک خفی دونوں سے محفوظ رہتا ہے۔

ویصوم رمضان: یعنی پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور روزے رکھتا ہے یہ جنتی ہے۔ زکوٰۃ اور حج کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر بطور مثال چند اعمال کا بیان کرنا تھا سب کا نہیں تھا یا اس لئے کہ اب تک حج کا حکم نہیں آیا تھا اور شاید زکوٰۃ کا بھی نہیں آیا ہو گا یا اس لئے دونوں کو ذکر نہیں کیا کہ مخاطبین میں مالی اعتبار سے دونوں کی ادائیگی کی قدرت نہیں تھی۔

غفر لہ: یعنی اس رمضان سے آئندہ رمضان تک مثلاً تمام صفائے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور اگر سچے دل سے توبہ کی تو کبائر بھی معاف ہو جائیں گے یا اللہ تعالیٰ اگر معافی دے دے تو تمام صفائے گناہ ہو جائیں گے یا صفائے معاف ہو جائیں گے تو کبائر کمزور پڑ جائیں گے۔

دعہم یعملوا: یعملوا مجزوم ہے کیونکہ امر کے جواب میں مضارع مجزوم ہوتا ہے۔ یعنی ان کو چھوڑ دو کہ عمل میں خوب محنت کریں عبادات میں اضافہ کریں اور حدیث کی اس اجمالی بشارت پر بھروسہ کر کے گناہ میں نہ پڑ جائیں۔ یہ عوام کا طریقہ اور عادت ہوتی ہے ورنہ خواص کو بشارت سنانے کے بعد چھوڑ دو تو وہ عبادت میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں اگرچہ جنت و دوزخ کا تصور اور خیال اٹھ جائے وہ پھر بھی زہد و تقویٰ میں رہیں گے جیسے فرمایا گیا "رحم اللہ صہیباً لو لم یخلف اللہ لہ یحصہ" یعنی اگر خدا کے عذاب کا خوف نہ بھی ہو تو وہ پھر بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرے گا۔

دیکھئے اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس اجمالی بشارت کو سنانے سے منع کر دیا ہے تو اگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو منع کیا تو کیا اعتراض ہے انہوں نے تو حضور اکرم ﷺ کے حکم کو نافذ کیا۔

افضل ایمان کونسا ہے؟

﴿۴﴾ وَعَنْهُ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ أَفْضَلِ الْإِيمَانِ قَالَ أَنْ تُحِبَّ لِلَّهِ وَتُبْغِضَ لِلَّهِ وَتُعْبَدَ لِسَاتِكَ فِي ذِكْرِ اللَّهِ قَالَ وَمَاذَا يَأْزِمُؤَلَّهِ قَالَ وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ. (رواه ابن ماجه)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ ایمان کی اعلیٰ ترین باتیں کیا ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی سے تمہاری محبت بھی اللہ کے لئے ہو اور بغض و عداوت بھی اللہ ہی کے لئے ہو اور تم اپنی زبان کو (خلوس دل سے) اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کے علاوہ اور کیا ہیں آپ نے فرمایا دوسروں کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو۔

(اجر)

توضیح: افضل الایمان: اس سے مراد افضل ایمانیات ہیں یعنی مقتضیات، ایمان میں سب سے افضل کوئی چیز ہے آپ نے جواب میں حب فی اللہ، بغض فی اللہ اور کثرت ذکر اللہ کو بتایا اس پر کلام ہو چکا ہے۔
قال وماذا: یعنی اس کے علاوہ اور کیا باتیں ہیں میں اور کیا کیا کروں؟

قال ان تحب للناس: یعنی جو چیز اپنی ذات کے لئے پسند ہے وہ سارے لوگوں کے لئے پسند کرو۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ آدمی کو اپنا مرغوب پسند تر ہوتا ہے تو یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ جو چیز مرغوب ہے وہ دوسروں کو دے دو۔ گاڑی دیدو، گھر دیدو، ہر من پسند چیز دیدو، یہ کیسے ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے نفس کے لئے جو چیز اچھی لگتی ہے اس کی نظیر اس کا ضل اور اس کی مانند چیز دوسروں کے لئے پسند کرو دل میں تینارکھو کہ کاش میرے پاس جو علم ہے مال ہے جاہ ہے حلال ہے اس کی مانند فلاں کے پاس بھی ہو۔
ان تحب امی مثل ما تحب: یہ بڑی خیر خواہی ہے اور حقوق خدا کے لئے سہولت اور بڑی رہنمائی ہے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو آپس میں ایسا ہی بنادے۔ آمین

الحمد للہ آج ۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ میں بندہ عاجز مشکوٰۃ شریف کی کتاب الایمان کی ۱۳۳ احادیث کی توضیحات و تشریحات سے فارغ ہوا۔ مولائے کریم میری مدد فرما جو لکھا اسے قبول فرما اور قلم کی ہر لغزش سے محفوظ فرما۔ (آمین)

تحفہ لا الہ الا اللہ

کتاب الایمان اور کلمہ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذکی
کیفی عنہ کا کلام آخر میں آجائے:

جہان فکر و نظر لا الہ الا اللہ	متاع اہل خبر لا الہ الا اللہ
یہ ذکر حق کی متاع عزیز کیا شے ہے	نہیں کسی کو خبر لا الہ الا اللہ
زبے نصیب یہ دولت اگر مجھے مل جائے	ہو لب پہ شام و سحر لا الہ الا اللہ
نجوم و شمس و قمر بھی فریب دے نہ سکے	خلیل کی ہے نظر لا الہ الا اللہ
کہیں بھی بحر معاصی میں غرق ہو جاتے	نہ ہوتا ساتھ اگر لا الہ الا اللہ
ہر ایک ذرہ ہے مصروف یاد حق کی	وہ برگ ہو کہ شجر لا الہ الا اللہ



باب الكبائر وعلامات النفاق

گناہ کبیرہ اور نفاق کا بیان

اس باب میں مولف رحمۃ اللہ علیہ دو موضوعات سے متعلق احادیث پیش فرمائیں گے، ایک موضوع کبار گناہوں کے متعلق ہے اور دوسرے نفاق کی علامات کے متعلق، لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ گناہوں کی تقسیم کس طرح ہے کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف کیا ہے اور علماء کے اقوال کیا ہیں۔

صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم:

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ "کل شیء نہیں اللہ عنہ فهو کبیرۃ" استاذ ابواسحاق اسفرائینی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں "کل شیء نہیں اللہ عنہ فهو کبیرۃ" نیز قیاس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخالفت کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے پیش نظر گناہ کبیرہ ہونا چاہیے۔

اس لئے یہ محققین حضرات کبیرہ اور صغیرہ کی طرف گناہ کی تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک سارے گناہ کبیرہ ہیں لیکن جمہور امت سلفاً خلفاً کے نزدیک گناہ میں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم جاری ہے۔ بدلیل قول اللہ تعالیٰ "ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ الا یہ۔ ای کبائر الذنوب۔ نکفر عنکم سیئاتکم ای تغفر لکم صغائرکم۔ کما فی البیضاوی۔ اس قرآنی آیت کے علاوہ احادیث الباب کی کئی احادیث بھی اس پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کی تقسیم صغیرہ و کبیرہ کی طرف ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب البسیط میں لکھا ہے کہ کبیرہ گناہ اور صغیرہ میں فرق نہ کرنا یا اس فرق کا انکار کرنا، نادانی اور نا سمجھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب یہ ہے کہ انہی سے یہ قول بھی منقول ہے:

"کل ذنب حتم اللہ علیہ بالنار او العذاب او اللعنة او الغضب فهو کبیرۃ والا فهو صغیرۃ۔"

ان کے قیاس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی دو نسبتیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی نسبت ہے، اس نسبت کی وجہ سے اگرچہ سب گناہ کبیرہ ہیں لیکن گناہوں کی دوسری نسبت ان کے آپس میں ہے، اس میں بعض گناہ بعض دوسرے گناہوں سے بڑے یا چھوٹے ہوتے ہیں، اسی اعتبار سے جمہور کے ہاں گناہوں کی تقسیم کبیرہ اور صغیرہ کی طرف ضروری ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف:

پھر جمہور کے ہاں آپس میں کبار اور صغائر کی تعریف میں بڑا اختلاف ہے اور مختلف اقوال ہیں۔

اول:

یہ کہ جو گناہ نماز روزہ حج وغیرہ حسنت سے معاف نہیں ہوتے وہ کبائر ہیں، اور جو گناہ اعمال حسنہ سے معاف ہو جاتے ہیں وہ صغیرہ ہیں۔

دوم:

بعض محققین ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی روشنی میں کبیرہ ہر اس گناہ کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کا حتمی وعدہ کیا ہو یا عذاب یا لعنت اور یا غضب کا قطعی حکم دیا ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ صغیرہ ہے۔

سوم:

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

”الاقرب ان الكبيرة كل ذنب كتب الشارع عليه حدا او صرح بالوعيد فيه والا فصغيرة“۔

چہارم:

بعض حنفیہ نے فرمایا کہ ہر وہ گناہ جس کے لئے شریعت نے ”فاحشة“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس پر منصوصی طور سے دنیوی یا اخروی عتوبت کو مقرر کیا ہے وہ کبیرہ ہے ورنہ صغیرہ ہے۔

پنجم:

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہر گناہ اپنے مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے اور اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے۔

ششم:

ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو گناہ دوسرے گناہوں کے لئے وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ صغیرہ ہے جیسے ”الغطر الى الاجنبية واللمس“ جو ذریعہ بنا ہے یہ جب تک ذرائع کے درجہ میں ہیں تو صغیرہ ہیں۔ اور جو گناہ مقصود بالذات ہو جیسے زنا تو وہ کبیرہ ہے، اس تعریف کو حضرت قاسم بن نووی رحمہ اللہ نے پسند فرمایا۔ اور شیخ الحدید محمود حسن رحمہ اللہ نے سورۃ نساء آیت نمبر ۳۱ کی تفسیر میں کبیرہ اور صغیرہ پر جو مفصل محقق مدقق کلام کیا ہے وہ بھی اسی تعریف کے قریب قریب ہے۔

ہفتم:

علامہ قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی رجال و افراد کے احوال کے پیش نظر گناہ کی حالت کبیرہ یا صغیرہ کی ہو جاتی ہے ایک گناہ ایک فرد کے لئے کبیرہ ہے تو دوسرے کے لئے صغیرہ ہے مثلاً غیر عالم کے لئے ایک گناہ صغیرہ سمجھا جاتا ہے مگر وہی

گناہ عالم کے لئے کبیرہ تصور کیا جاتا ہے، ایک گناہ مقبول بندہ بارگاہ الہی کے لئے کبیرہ شمار کیا جاتا ہے، مگر غیر مقبول بندہ کے لئے وہی گناہ صغیرہ سمجھا جاتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے "حسنات الابرار سیئات المقربین" اور کہا گیا ہے: لـ

لَا يَخْفِزُ الرَّجُلُ الْكِبِيرُ دَقِيقَةً فِي الشَّهْوِ فِدَّهَا لِلْوَضِيعِ مَعَايِزُ
فَكَبَائِرُ الرَّجُلِ الصَّغِيرِ صَغَائِرُ وَصَغَائِرُ الرَّجُلِ الْكِبِيرِ كَبَائِرُ

ترجمہ: بڑا آدمی کسی چھوٹے گناہ کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ ان کی بھول کو بھی کتر آدمی اپنے لئے عذر اور جواز بنا دے گا۔ پس چھوٹے آدمی کے کبار بھی صغائر سمجھے جاتے ہیں مگر مقتدا اور بڑے آدمی کے صغائر کو بھی کبار سمجھا جاتا ہے۔

ہشتم:

بعض نے کہا ہے کہ حالات اور مکان کے اعتبار سے گناہ میں فرق آ جاتا ہے، مثلاً بیت اللہ کے اندر اور زمین حرم میں دل کا دوسرہ بھی بڑا گناہ ہے، مگر حرم سے باہر کچھ نہیں یا ایک گناہ مسجد کے اندر کیا گیا تو وہ کبیرہ ہے لیکن وہی گناہ مسجد سے باہر صغیرہ بن جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ بات سمجھ لیں کہ کبار کی تعداد جو احادیث میں وارد ہے یہ کوئی حتمی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے احوال کے مطابق کبھی کم اور کبھی زیادہ کو بیان کی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ عدد ستر تک جا پہنچتا ہے، مظاہر حق والے نے کبار کی تعداد ۸۴ لکھی ہے اور مظاہر حق نے سب کو ذکر بھی کیا ہے بعض احادیث میں سات کا ذکر آتا ہے۔

وعلامات النفاق: یہ تخصیص بعد تعمیم ہے کیونکہ کبار میں علامات نفاق بھی داخل ہیں نفاق: اظہار خلاف ما ابطن کا نام ہے تفصیل آ رہی ہے۔ لـ

الفصل الاول

سب سے بڑے گناہ

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ قَالَ أَنْ تَدْعُوَ لِلْوَيْدَا وَهُوَ خَلْقَكَ قَالَ ثُمَّ أَيْ قَالَ أَنْ تَقْبَلَ وَلَدَكَ حَشِيَّةً أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ قَالَ ثُمَّ أَيْ قَالَ أَنْ تُزَانِي حَلِیْمَةَ جَارِكَ فَالْكَوَلُ اللَّهُ تَصْدِيقُهَا وَاللَّيْنُ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقُولُونَ الْفَسْ أَيْ حَرَمَ اللَّهِ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يُؤْنُونَ الْآيَةَ. (متفق علیہ) لـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے تم کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ پھر اس شخص نے پوچھا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس خیال سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ پھر اس نے پوچھا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تم اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرو۔ (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) سرکار ﷺ کے اسی ارشاد کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (جس کا ترجمہ یہ ہے) کوئی بندگان خاص ہیں جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہیں ٹھہراتے اور جس جاندار کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں (اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کے وبال میں پڑ جائے گا)۔

(بخاری و مسلم رحمہم اللہ)

توضیح: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو عبد الرحمن ہے، قدیم الاسلام ہیں، بعض نے کہا چھٹے مسلمان ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لگے رہے، یہاں تک کہ لوگ ان کو گھر کا آدمی سمجھنے لگے، وضو جائے نماز مسواک کی خدمت آپ کے ذمہ تھی، حضور ﷺ کے رازدان بھی تھے، حبشہ کی ہجرت کی، پھر بدر میں شریک ہوئے اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے، حضور ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

”رضیت لامتی ما رضی لہا ابن ام عبد و منضت لہا ما منضت لہا ابن ام عبد“۔

آپ ﷺ چلے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور سیرت میں آنحضرت ﷺ کے مشابہ تھے، کوفہ کے قاضی اور معلم مقرر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ سے فرمایا کہ میں نے اپنے آپ پر تمہیں ترجیح دے دی کہ ابن مسعود تمہیں دے دیا، پھر فرمایا: ”کُنْتُ يَفِّ مِلِّي عَلَمًا“۔ یعنی علم کا بھرا ہوا کرہ ہے علم کا کھنسلہ ہے، ۳۲ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے آپ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

ای ذنب اکبر: ”الذنب ما يذم به الأتي“ ذنب کی چار قسمیں ہیں:

- ① ایک قسم وہ ہے جو کہ بغیر توبہ و ایمان معاف نہ ہو وہ کفر ہے۔
 - ② دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت کی امید استغفار اور حسنات کے ذریعہ سے کی جاتی ہے وہ صفائے ہیں۔
 - ③ اور تیسری قسم وہ ہیں جو اللہ کی مشیت کے تحت ہو جو توبہ اور بغیر توبہ دونوں صورتوں میں معاف ہو سکتے ہیں وہ حقوق اللہ ہیں۔
 - ④ اور چوتھی قسم وہ گناہ ہیں جو بدلہ دینے یا معاف کرانے کے بغیر معاف نہیں ہوتے ہیں وہ حقوق العباد ہیں۔ ۱۔
- نکۃ: ”ای مثلاً ونظیراً فی الدعاء والعبادة“ کفر کی اقسام میں شرک کو خاص کر بیان فرمایا، اس لئے کہ ”ان الشرک لظلم عظیم“ میں شرک کو عظیم ظلم کہا گیا ہے۔ ۲۔

وہو خلقك: میں شرک کی مزید شاعت و قباحت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تم نہ تھے اس نے وجود بخشا جب بولے لگے تو شرک کیا، یہ جملہ حالیہ ہے۔ ۱۔

ثم ای: یہاں ای کا لفظ استفہام کے لئے ہے ای "اى الشیء اکبر من الذنب بعد الکفر"، یہاں یہ تم تراخی زمانہ یا تراخی رتبہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تراخی فی الاخبار کے لئے ہے۔ ۲۔

تقتل ولدك: شرک کے بعد نفس مسلم کا قتل سب سے بڑا گناہ ہے، پھر چھوٹے معصوم کو قتل کرنا دوسرا گناہ ہے پھر قتل بھی بدترین انداز سے کہ زندہ درگور کر دیا یہ تیسرا جرم ہے۔ پھر خوف رزق سے قتل کرنا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کیوں کھائے؟ اور اللہ تعالیٰ کو رازق نہ سمجھنا یہ چوتھا جرم ہے، صلہ رحمی کو نظر انداز کر کے قتل کرنا یہ پانچواں گناہ ہے، اس لئے اس کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا۔

زمانہ جاہلیت میں دو قسم کے عرب اولاد کو قتل کیا کرتے تھے، ایک تو وہ لوگ تھے جو فی الحال غریب و مفلس تھے ان کو اولاد کے پالنے کھلانے کا تم تھا قرآن کریم نے عجیب بلاغت سے ان کو سمجھایا: "ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاہم"۔ اولاد کے کھلانے کو مؤخر کیا کیونکہ ان لوگوں کو فی الحال اپنے کھانے کی پریشانی تھی پہلے اسی وہم کو قرآن نے دور کر دیا، دوسرے وہ لوگ اولاد کو مارتے تھے جو فی الحال تو مالدار تھے مگر آئندہ فقیر بننے کا خوف تھا ان کے لئے فرمایا۔ "ولا تقتلوا اولادکم خشية املاق"۔ نحن نرزقهم وایاہم۔ یہاں اولاد کے کھلانے کو مقدم کیا کہ تم کو ان کا زیادہ خوف ہے تو ہم ان کو بھی دیں گے اور تم کو بھی فی الحال دے رہے ہیں، یہ قرآن عظیم کی عظیم بلاغت اور عجیب اسلوب بیان ہے۔ ۳۔

ان يطعم معك: یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے بلکہ یا تو یہ قید اتفاقی ہے کہ وہ لوگ اسی کی وجہ سے اولاد کو مارتے تھے۔ یا یہ مزید شاعت و قباحت ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ تیرے پیالہ میں تیرے گوشہ جگر نے ہاتھ ڈال کر ایک لقمہ اٹھایا اس پر اس کو قتل کر دیا، شرم کرو ذوب مرو۔ ۴۔

وان تزانی حلیلة جارک: تزانی اور تزنی دو لغت ہیں زنا کے معنی میں ہیں حلیلہ بیوی کو کہتے ہیں تزانی میں بھی مفاعلہ کا معنی پڑا ہے اور زنا طرفین ہی سے ہوتا ہے اور حلیلہ یا حلال سے ہے یا حلال سے ہے اور بیوی شوہر کے لئے حلال بھی ہوتی ہے اور اس میں حلول بھی ہوتا ہے۔

اس گناہ کو اکبر الکبائر میں سے اس لئے شمار کیا ہے کہ ایک تو اس میں زنا ہے دوسرا اس جگہ میں ہے جو اسی کی پناہ و پڑوس میں ہے تو اس میں ایک تو ابطال حق جو آگیا، دوسرا اس میں خیانت آگئی، تیسرا اس سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ پڑوسی اگر خائن اور چور بن جائے تو اس سے بچاؤ بہت مشکل ہے، پھر ہر آدمی اپنے گھر کا چوکیدار بن جائے گا اور کسی کام کے لئے باہر نہیں جاسکے گا۔ ۵۔

اب سوال یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ہاں کبار کی تعداد (۷۰) ستر ہے، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی تعداد سات سو ہے، ابوطالب مکی کے ہاں سترہ ہے، مذکورہ حدیث میں تین کا ذکر ہے، بعض میں چار کا ذکر آیا ہے اور کسی روایت میں سات کا ذکر آیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مخاطب کی احتیاج کے تحت کبار کا ذکر فرمایا ہے، احصاء اور پوری گنتی مقصود نہ تھی، نہ محمد ید کا آپ نے ارادہ کیا ہے، نیز عدد میں تعارض نہیں ہوتا، یہاں ہر گناہ کے ساتھ جو قید لگی ہوئی ہے یہ مزید تفسیر اور تشنیع و شاعت کے لئے ہے جیسا کہ اس کی تشریح ہو گئی ہے۔

۲۸ ذوالحجہ ۱۲۰۹ھ

چار بڑے گناہ

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْكِبَائِرُ أَلَا تُشْرِكُ بِاللَّهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِينِ الْغَمُوسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِي رِوَايَةِ أَنَسٍ وَشَهَادَةُ الزُّوْدِ بِذَلِكَ الْيَمِينِ الْغَمُوسُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کو مار ڈالنا اور جھوٹی قسم کھانا بڑے گناہ ہیں (بخاری و مسلم) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جھوٹی قسم کھانا، کے بجائے ”جھوٹی گواہی دینا“ کے الفاظ ہیں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: الاشرک باللہ: یہاں شرک سے مراد مطلقاً کفر ہے لیکن شرک کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ عرب لوگ کفر کے درجہ شرک اور شعبہ شرک میں مبتلا تھے۔ مشرک اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہوتا ہے اللہ کی قدرتوں کا بھی انکار نہیں کرتا ہے مگر وہ ذات یا صفات یا عبادات میں دوسروں کو حصہ دار بناتا ہے۔ اور کافر یا تو اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتا ہے یا ضروریات دین میں سے کسی اہم ضرورت کا انکار کرتا ہے، شرک اور کفر اور مشرک و کافر میں یہی فرق ہے۔ شرک کی دو قسمیں ہیں: شرک اکبر جو اوپر بیان ہوا، دوسرا شرک اصغر: ریاکاری دکھاوے اور تصنع و سبغ فی العبادۃ کا نام ہے جو مخلوق کو دکھانے کے لئے کی جائے۔

وعقوق الوالدین: ”العق هو الشق والعاق يقطع حقوق ابويه“ ایذا رسانی کا ہر قول و عمل عقوق والدین میں داخل ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، ہاں والدین کے خلاف شرع حکم کا ماننا جائز نہیں ہے کیونکہ ”الطاعة لمخلوق في معصية الخالق“ والدین سے مراد مؤمن والدین ہیں اور پھر اس میں اجداد و جدات سب داخل ہیں۔

عقوق والدین کو اشرک باللہ کے ساتھ جڑو یا جس سے اشرار ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے وجود کا حقیقی خالق و مالک ہے،

اس کے بعد مجازی طور پر والدین اپنے بیٹے کے وجود کے لئے ظاہری سبب ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کو جوڑ کر ذکر فرمایا: "وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔"

والیمین الغموس: غموس غمس سے غوطہ کھانے کے معنی میں ہے چونکہ یمین غموس کے لئے کوئی کفارہ نہیں ہوتا تو بس دوزخ کی آگ میں غوطہ ہی کھائے گا، یہی اس کی سزا ہے۔ یمین غموس اس قسم کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص زمانہ ماضی کے کسی فعل یا واقعہ پر دانستہ طور پر جھوٹی قسم کھائے، یہ قسم اس لئے کبیرہ گناہ ہے کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا نام بطور ضمانت استعمال کیا اور اس میں جھوٹ کہہ دیا۔

ایک یمین منعقدہ ہے جس میں کفارہ دینا پڑتا ہے، وہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک شخص مستقبل میں کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کی قسم کھاتا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تیسری قسم یمین لغو ہے وہ زبان پر چڑھے ہوئے ان کلمات کا نام ہے جن سے قسم کا ارادہ نہیں کیا جاتا ہے بس تکیہ کلام ہوتا ہے جیسے عربی میں لا واللہ وغیرہ کلمات ہوتے ہیں، اردو میں کہتے ہیں: "قسم سے کہہ رہا ہوں"، "قسم ہے خدا کی" وغیرہ وغیرہ، ان کلمات کا ارتکاب بھی مناسب نہیں ہے تاہم اس قسم میں باقاعدہ گرفت نہیں ہے۔

قسم کھانے کی اسلام میں اجازت ہے لیکن اس کی حفاظت کا بھی اسلام حکم دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی توہین نہ ہو، امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے زندقہ میں کبھی نہ سچی قسم کھائی ہے نہ جھوٹی۔ باب الایمان میں تمام قسموں کی تفصیل مذکور ہے۔ وشہادۃ الزور: جھوٹی شہادت یہ ہے کہ جس سے کسی کا حق باطل کیا جائے یا مال دبا دیا جائے یہ بھی کبائر میں سے ایک کبیرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر جان کر جھوٹ بولتا ہے اور وہ بھی ناحق مال دبانے کے لئے۔

سات مہلکات سے بچو

﴿۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ قَالَ أَلَيْسَ لَكَ بِاللَّهِ وَالشَّجَرِ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الزَّيْتِ وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالنَّوْثَى يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْعَافِلَاتِ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (لوگو!) سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، پوچھا گیا یا رسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا: ① کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ② ناپاؤ کرنا

۱۴) اس جان کو مار ڈالنا جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا ۱۵) سود کھانا ۱۶) قیم کا مال کھانا۔ ۱۷) جہاد کے میدان میں دشمن کو پیٹھ دکھانا ۱۸) پاکدامن، ایمان والی اور بے خبر عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔ (بخاری و مسلم)

شرک کی تعریف:

توضیح: قال الشریک باللہ: شرک ایک گناہ و ناجرم ہے جو عقل و دانش کے حوالہ سے فطرت انسانی پر ایک بدنما داغ ہے اور جناب باری تعالیٰ کی ذات و صفات کی عظمت میں بڑی کوتاہی اور بڑا ظلم ہے، جس میں غیر شعوری طور پر ایک شخص گویا یہ تصور قائم کرتا ہے کہ میرا فلاں کام فلاں بزرگ کرے گا، اس کے کرنے میں نہ دیر ہے نہ اندھیر ہے اور اللہ تعالیٰ یہ کام یا نہیں کرتا ہے یا نہیں کر سکتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں عظیم تنقیص و توہین اور ظلم عظیم ہے کیونکہ جس پروردگار کے ہاتھ میں ذرہ ذرہ کا تصرف اور اختیار کلی اور قدرت کاملہ موجود ہے اس کو غیر شعوری طور پر کمزور بلکہ مفلوج جان کر مشرک اوروں کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے، مشرک یہ عقیدہ رکھے یا نہ رکھے لیکن اس کے فعل اور طرز عمل کا نتیجہ یہی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جس گناہ پر ناراض ہوتا ہے وہ شرک کا گناہ ہے فرمایا: "ان الشریک لظلم عظیم"۔ ۱

اور "ان اللہ لا یغفر ان یشریک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء"۔ ۲

اور فرمایا: "ومن یشریک باللہ فکانما خر من السماء"۔ ۳

خلاصہ یہ کہ شرک انسانی فطرت سے سعادت کا قائم اور استعداد جز سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے شرک سے ایک انسان اپنے خالق پر سب سے بڑا افتراء باندھتا ہے اور اپنی تخلیق اور فطری استعداد کے خلاف بغاوت کرتا ہے اس لئے حدیث پاک میں اس کو بڑے بڑے مہلکات میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ شرک کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں شرک اسے کہتے ہیں کہ جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور میں ثابت کرنا شرک ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو بھی عالم الغیب کہا جائے یا کسی دوسرے کو بھی کائنات میں متصرف اور قادر مانے، یا مصائب اور مشکلات کے وقت غائبانہ طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پیر و فقیر کو مدد کے لئے پکارے یا عبادات مالیہ اور عبادات قولیہ اور عبادات بدنہ میں سے کسی عبادت کو غیر اللہ کے لئے کرے یہ سب شرک کی صورتیں ہیں۔ جس کو آج کل کے مشرک لوگ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:

بندہ قادر کا بھی قادر بھی ہے عبد القادر سزا بطن بھی ہے ظاہر بھی ہے عبد القادر

ذی تصرف بھی ہے ماذون بھی ہے مختار بھی ہے کار عالم کا مدبر بھی ہے عبد القادر

ایک موحّد کو شرک سے بیزاری کے لئے سلطان باحو کے یہ اشعار یاد رکھنے چاہئیں:

یقین دائم دریں عالم کہ لامعبود الا هو ولا مقصود فی الکلونین ولا موجود الا هو
چوں تیغ لا بدست آری بیا تنہا چہ غم داری مجواز غیر حق یاری لا فتاح الا هو

جادو کی تعریف و اقسام:

والسحر ① "کل ما لطف مأخذہ ودق فہو سحر" ② "اخراج الباطل فی صورة الحق" ③ "ما یفعل الانسان من الحیل"

سحر و جادو کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند خوارق عادت چیزوں کا ذکر ہو جائے چنانچہ خوارق عادت چیزیں کل سات ہیں:

① اول "ارہاصات" ہیں: یہ ایسے خارق عادت افعال ہوتے ہیں جو کسی نبی کی نبوت سے پہلے بطور تمہید اور نبی کی آمد سے پہلے آمد آمد کے اعلان کے لئے پیش آتے ہیں جیسے نبوت سے پہلے پتھروں اور درختوں کا حضور اکرم ﷺ کو سلام کرنا بادل کا سایہ کرنا پیدائش کے وقت عالم انسان پر انقلابی واقعات کا پیش آنا سب "ارہاصات" پر تھے۔

② دوم "معجزات" ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی نبی کی دعوت نبوت کے اثبات اور اس کی تصدیق کے لئے اور مخالفین کو عاجز کرنے کے لئے مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہو جاتے ہیں جیسے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر قمر اور چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا اور اٹلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹنا وغیرہ وغیرہ سارے معجزات ہیں۔

③ سوم "کرامات" ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو توحیح سنت اور صاحب ایمان شخص کے ہاتھ پر اس کے اعزاز و اکرام کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں، پیغمبر کو اپنے معجزہ کا علم بھی ہوتا ہے اور قصد بھی ہوتا ہے مگر ولی کے لئے یہ ضروری نہیں۔

④ چہارم "معونات" ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی مسلمان کی مدد و اعانت کے لئے ظاہر ہوں جیسے حالت مجبوری و محضہ میں کسی کے سامنے کھانا آنا یا پانی پر چلنا یا ہوا میں اڑنا وغیرہ وغیرہ سب اعانت و مدد کی صورتیں ہیں۔

⑤ پنجم "استدراج" ہے: یہ ایسے خارق عادت امور کو کہتے ہیں جو کسی کافر کے ہاتھ یا فاسق فاجر کے ہاتھوں اس کے مقصود کے مطابق ظاہر ہو جائیں جیسے دجال کے احوال میں عجیب تصرفات کا ذکر ہے۔ یا اسود عیسیٰ جھوٹے مدعی نبوت کے ہاتھوں سے عجائب کا ظاہر ہونا یہ سب استدراج ہے۔

⑥ ششم "اھالت" ہے: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی کافر کے ہاتھوں ظاہر ہوں لیکن اس کے مطلوب و مقصود کے خلاف ظاہر ہوں جیسے میلہ کذاب نے کسی کانے کی چشم کی آنکھ پر ہاتھ پھیرا تا کہ یہ آنکھ درست ہو جائے تو اس شخص کی صحیح آنکھ بھی اندھی ہو گئی یا باغ میں وضو کا بچا ہوا پانی پھینکا تا کہ برکت آجائے تو باغ کے سارے درخت سوکھ گئے۔ یا کلی کر کے کنوئیں میں پانی پھینکا تو جو کچھ کنوئیں میں تھا وہ بھی خشک ہو گیا یا ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے دماغ نے کام چھوڑ دیا وغیرہ وغیرہ۔

● ہفتم ”سحر اور جادو“ ہے۔ مگر اس کی حقیقت میں اختلاف ہے معتزلہ کے ہاں سحر کی کوئی حیثیت نہیں ہے یہ صرف وہم اور خیال و تصور ہے اور اس کے اثرات بھی اسی وہم کا ایک حصہ ہے، مگر جمہور اہل سنت کے ہاں سحر ایک نفس الامری حقیقت کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان پر مخصوص کیفیات و اثرات طاری کئے جاسکتے ہیں۔

سحر و ساحر کا حکم:

سحر و ساحر کے حکم میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ و احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً ساحر کافر ہے واجب القتل ہے اور جادو کا سیکھنا سکھانا بھی کفر ہے، حرام ہے۔

میرے استاذ حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ نے اس موقع میں ایک جامع کلام ارشاد فرمایا تھا، کہ جو سحر ضروریات دین کے انکار پر مبنی ہو وہ کفر ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں اور جس میں کلمات شرکیہ ہوں وہ شرک ہے اور اگر سحر منافی اعمال صالحہ ہو تو گناہ کبیرہ ہے۔ اور اگر کوئی غلط عمل اس میں نہ ہو بلکہ اصلاح اور غرض صحیح کے لئے ہو مثلاً اصلاح بین الزوجین وغیرہ وغیرہ کے لئے ہو تو یہ جادو مباح ہے (گویا یہ جادو مسلمان ہو گیا مگر دنیا میں ایسا صالح جادو کہاں ہے؟)

التولیٰ یوہ الزحف: یعنی میدان جہاد سے بھاگنا یہ کبیرہ گناہ ہے، اول عزیمت ہے کہ مجاہد میدان سے بالکل نہ بھاگے کیونکہ اس موت میں زندگی پڑی ہوئی ہے جب یہ عقیدہ ہو کہ موت میں حیات ہے تو کون بھاگے گا؟

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے شہید کا جو خون ہے وہ خون کی زکوٰۃ ہے دوم رخصت ہے کہ دوسے زیادہ کافروں سے بوقت مقابلہ بھاگنا جائز ہے دوسے کم سے بھاگنا یا دوسے بھاگنا کبیرہ ہے۔ وقذف المحصنات: قذف گول پتھر اٹھا کر کسی کے سر پر دے مارنا یہ قذف ہے پھر غیفہ پاک دامن عورت پر تہمت باندھنے کے لئے استعمال ہونے لگا، یعنی پاک دامن، مسلمان اور آزاد شریف عورت پر تہمت لگانا کبیرہ میں سے ہے اگر عورت کافرہ ہے تو اس پر تہمت لگانا کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے یہ کل سات مہلکات اور تباہ کن گناہ ہیں جن سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

وہ بدترین گناہ جن کے ارتکاب سے ایمان جاتا ہے

﴿وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُزْنِي الزَّانِي حَتَّى يُزْنِيَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حَتَّى يَسْرِقَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حَتَّى يَشْرَبَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهَبُ نَهْبَةً يَزْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فَوْقَ أَبْصَارِهِمْ حَتَّى يَنْتَهَبَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغْلُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَغْلَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِذَا كُفَّ إِذَا كُفَّ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَا يَقْتُلُ حَتَّى يَقْتُلَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ عِكْرَمَةُ قُلْتُ

لَا يَنْبَغِي عَيْنًا يَنْفَعُ الْإِيمَانُ مِنْهُ قَالَ هَكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ أَخْرَجَهَا فَإِنْ تَابَ عَادَ إِلَيْهِ هَكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ لَا يَكُونُ هَذَا مُؤْمِنًا تَامًا وَلَا يَكُونُ لَهُ نُورُ الْإِيمَانِ. (هَذَا قَوْلُ الْبُخَارِيِّ) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِزنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا اور چھینا چھینی کرنے والا جبکہ لوگ اس کو (کھلم کھلا) چھینا چھینی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں (لیکن خوف و درہشت کے مارے بے بس ہو جاتے ہیں اور چیخ و پکار کے علاوہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا پس تم (ان گناہوں سے بچو)۔ (بخاری و مسلم)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ قتل کرنے والا جب ناحق قتل کرتا ہے۔ اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے (یہ حدیث سن کر)۔ چنا کہ اس سے ایمان علیحدہ کس طرح کر لیا جاتا ہے تو انہوں نے کہا اس طرح (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان انگلیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اس کے بعد انہوں نے فرمایا اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آ جاتا ہے۔ اور (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی انگلیوں کو پھر ایک دوسرے میں داخل کر لیا نیز ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ (یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص (ارتکاب معصیت کے وقت) مؤمن کامل نہیں رہتا اور اس سے ایمان کا نور نکل جاتا ہے۔

(بخاری)

توضیح: لایذنی الزانی الخ: یہ مسئلہ پہلے کتاب الایمان میں گزر چکا ہے کہ معتزلہ و خوارج کے ہاں مرتکب کبیرہ خارج عن الاسلام مغلطہ فی النار ہے پھر معتزلہ کے ہاں داخل فی الکفر نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں منزلة بین المنزلتین ہے کہ نہ مسلمان ہے کیونکہ اسلام سے نکل گیا ہے نہ کافر ہے کیونکہ اس میں داخل نہیں ہے ان کے ہاں دوزخ میں بھی اسی طرح منزلة بین المنزلتین، کا مقام ہوگا۔ خوارج نے تو داخل فی الکفر بھی مان لیا، اہل سنت والجماعہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، یہ حدیث معتزلہ اور خوارج کی دلیل ہے اور بظاہر یہ حدیث دیگر نصوص قرآنیہ اور فرامین نبویہ سے متعارض ہے مثلاً: ۱۔

① "ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما حون ذلك لمن يشاء" اگر شرک کے علاوہ کہاں کفر ہوتے تو ان کی مغفرت کی گنجائش کہاں ہوتی۔ معلوم ہوا مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں ہے۔

② "وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما" یہاں آپس میں لڑنے والوں کو مؤمن کے نام سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ لڑنے کبیرہ گناہ ہے۔ ۲۔

۱۰ حد و اللہ اور قصاص کی جتنی آیتیں ہیں ان میں مرتکب کبیرہ کے لئے ایک سزا مقرر ہے اگر وہ خارج اسلام ہوتا تو مرتد کی سزا اس پر نافذ ہوتی معلوم ہوا مرتکب کبیرہ خارج اسلام نہیں۔

۱۱ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث "وان زنی وان سرق" جیسی احادیث سے بھی جمہور نے استدلال کیا ہے تو یہ جمہور کے مستدلانہ بھی ہیں اور زیر بحث حدیث سے معارض بھی ہیں اس لئے اس حدیث کی توجیہ اور تاویل اور اس کو صحیح محمل پر حمل کرنا ضروری ہے تاکہ تمام نصوص میں توافق اور تطابق آجائے وہ مطلب تو خود حدیث میں مذکور ہیں دیگر یہ ہیں۔

۱۲ توجیہ اول یہ کہ یہاں زانی کے ایمان کی جو نفی آئی ہے یہ کمال ایمان کی نفی ہے اصل ایمان کی نفی نہیں ہے۔ لہ۔
 ۱۳ علامہ تورہشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام لفظوں میں خبر ہے مگر معنوی طور پر انشاء ہے یعنی زانی اگر مؤمن ہے تو وہ زنا نہ کرے اس توجیہ کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں "لا یزنی" جزم اور لا ینھی کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ بھی یہی توجیہ کرتے ہیں مگر اس پر یہ اعتراض ہے کہ حین ظرف اس توجیہ کا انکار کرتا ہے کیونکہ زنا کی نفی مطلقاً ہے حین یزنی کے ساتھ مقید کرنے کا کیا فائدہ؟

۱۴ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں ایمان کے ایک اہم شعبہ حیاء کی نفی ہے کہ جو یہ قبیح فعل کرتا ہے وہ مؤمن نہیں یعنی باحیاء نہیں رہتا ہے ایمان کا اہم شعبہ حیاء اس سے چلا جاتا ہے۔ لہ۔

۱۵ توجیہ چہارم یہ کہ یہاں نور ایمانی کی نفی مراد ہے امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی توجیہ کی ہے کہ نور ایمانی باقی نہیں رہتا۔
 ۱۶ توجیہ پنجم یہ کہ اس سے ایمان شہودی کی نفی مراد ہے کہ اگر یہ شخص اللہ کو حاضر ناظر مانتا تو اس حضوری کی حالت میں کبھی یہ حرکت نہ کرتا۔ جبکہ چھوٹے بچے کی موجودگی میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا ہے۔

۱۷ توجیہ ششم یہ کہ یہ حکم زجر و توبیخ اور تغلیظ و تشدید پر محمول ہے کہ اس قبیح حرکت کا مرتکب مؤمن نہیں رہا بلکہ فاسق فاجر بن گیا۔ لہ۔

یعتصب: انتحاب کسی کا مال زبردستی چھیننا "نہبۃ" لوٹے ہوئے مال کو کہتے ہیں۔ یرفع الناس الیہا ابصارہم: یعنی اس کی جرأت پر تعجب کریں گے اس کے ظلم سے ڈرتے ہوئے صرف اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے اور کچھ کر نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ڈاک ڈالنے والے سے ڈرتے ہیں۔ لہ۔

ولا یغل: غلول مال غنیمت میں خیانت کو کہتے ہیں پھر مطلق خیانت پر اسکا اطلاق ہوا ہے اور بدعہدی پر بولا جانے لگا ہے۔ ۵۔

فایا کم ایا کم: تاکید کے لئے ہے یا تخذیر ہے کہ بچو بچاؤ ”بچو بچاؤ“، اس حدیث میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا ذکر آگیا ہے یعنی حالت ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ شخص ان حقوق میں حدود اللہ سے ذرہ برابر تجاوز نہ کرے۔

۱۳۰۹ھ ۱۳۰۹ھ

منافق کی علامتیں

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ زَادَ مُسْلِمًا وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ لَمْ يَثْقُقْهَا إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أُتْمِنَ خَانَ﴾

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا! منافق کی تین علامتیں ہیں۔ اس کے بعد مسلم نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا ”اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے“ اس کے بعد بخاری و مسلم دونوں متفق ہیں۔ (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

توضیح: آیتہ المنافق ثلاث: آیت کی جمع آیات ہے، علامت اور نشانی کے معنی میں ہے، یہ علامت یا حسی ہوگی یا معنوی ہوگی یعنی محسوسات اور معقولات دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے، حسی اور محسوسات کی مثال جیسے آیتہ الطريق، ”سنگ میل“ اور معنوی و معقولات کی مثال جیسے آیتہ اللہ وہ شخص جو دین کی حفاظت کی نشانی ہو یا جیسے معجزہ کو آیتہ اللہ اور اللہ کے اور کسی حکم کو آیتہ اللہ کہا جاتا ہے، یہ سب معقولات کی مثالیں ہیں۔

نفاق کی تعریف یہ ہے کہ ”اظہار خلاف ما ابطن“ یعنی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہے یہ دوغلی پالیسی ہے اسی کو نفاق کہتے ہیں۔ یہاں ایک فی اشکال ہے کہ ”آیتہ“ مفرد ہے اور یہ مبتدأ ہے اور ”ثلاث“ خبر ہے جو جمع ہے، تو مبتدأ اور خبر میں مطابقت نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیتہ کے ساتھ جنس کا معاملہ کیا گیا ہے تو اب مطابقت ہوگئی کیونکہ جنس قلیل و کثیر پر بولی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ یہاں تین علامات میں سے ہر علامت الگ الگ نفاق کی علامت ہے۔ اور ایک روایت میں ”علامات المنافق ثلاث“ کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیتہ سے مفرد کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ جمع کا معاملہ کیا گیا ہے۔

سوال: شبہ یہ ہے کہ اس حدیث میں منافق کی علامات کا تین میں صر ہے جب کہ بعد والی روایت میں چار کا ذکر ہے تو صر کیسے صحیح ہوگا؟

جواب: یہاں صر مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر کرنے کے اعتبار سے بھی تین اور کبھی چار کا ذکر آگیا ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ اعداد میں ایک عدد کا دوسرے سے تعارض نہیں ہوتا ہے کیونکہ عدد اکثر عدد اقل کا منافی نہیں ہے عدد اقل اکثر کے ضمن میں ہی ہوتا ہے۔ تیسرا جواب یہ کہ وحی کے ذریعہ سے اضافہ ہو گیا۔ تو پہلے تین کا ذکر آیا پھر چار کا آگیا۔

سوال: یہاں ایک مشہور اشکال ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے کلمہ شہادت پر قائم ہے مگر اس میں یہ تین علامات بھی ہیں تو کیا وہ منافق ہو کر "فی الدلوک الاسفل من النار" میں رہے گا پھر تو مسلمان ختم ہو جائیں گے یا بہت کم رہ جائیں گے؟

جواب: اس سوال کا:

- ۱ پہلا جواب یہ ہے کہ ان تین خصلتوں پر جب طبیعت مطبوع ہو جائے اور یک وقت ایک ساتھ یہ تینوں ایک دل میں جمع ہو جائیں تو یہ ایمان کے منافی ہے اس پر حدیث میں لفظ "اذا" دلالت کر رہا ہے جو استمرار کے لئے ہے یعنی جب بھی بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے وغیرہ وغیرہ گویا یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے تو یہ منافق ہے۔
- ۲ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کلام میں تشبیہ ہے یعنی یہ خصلتیں اگر کسی مسلمان میں آئیں تو منافق حقیقی کی طرح ہوگا۔
- ۳ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ شخص پوری شریعت کے اعتبار سے تو منافق نہیں ہے ہاں جس کے ساتھ معاملہ جھوٹ کا ہوا ہے یا معاملہ بد عہدی کا ہوا ہے یا خیانت کا معاملہ ہوا ہے تو اسی کے لئے یہ منافق ہے۔
- ۴ جو شخص ان خصلتوں کو جائز سمجھتا ہے اور پھر اپنا تا ہے تو وہ حقیقی منافق ہے۔

۵ مقاتل بن حنفیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس حدیث نے میری معیشت اور زندگی برباد کر دی کیونکہ جب بھی کوئی کام کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ ان خصلتوں میں نہ پڑ جاؤں حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے اور کہنے لگے کہ مجھے بھی یہی ہو تو میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا وہ دونوں ہنسے لگے اور کہا کہ ہم کو بھی یہی کچھ ہوا تو ہم نے حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا تو حضور اکرم ﷺ مسکرائے اور پھر فرمایا کہ تم کو ان خصلتوں سے کیا سروکار ہے میرا یہ کہنا کہ "اذا حدثت کذب" تو یہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق ہے "واللہ یشہد ان المنافقین لکاذبون" اور "اذا وعد اخلف" اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے "فاعقبہم نفاقاً فی قلوبہم الی یوم یلقوہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ وما کانوا یکذبون"۔ اے اور میرا یہ کہنا کہ "اذا اؤتمن خان" تو یہ اس آیت کی وجہ سے ہے۔ "انا عرضنا الامانة علی السہوات والارض والجبال فابین ان یحملہا واشفقن منها وحملہا الانسان"۔ اے اے انسان! انتم ہر آم منہن۔ اے

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں "المنافق" میں جو الف لام ہے وہ عہدی ہے اور یہ علامات اور نشانیاں منافقین حقیقی کی ہیں نہ منافقین عملی کی یعنی حقیقی اور اعتقادی منافق ان خصلتوں سے پہچانا جاتا ہے پھر شبہ ہوتا ہے کہ آنے والی روایت میں اسی کو منافق خالص کہا گیا ہے جس میں یہ صفات ہوں تو جواب یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں حقیقی منافق کی علامات یہی تھیں اور بعد میں نفاق فی العقیدہ نہیں رہا کیونکہ اس کا معلوم کرنا مشکل ہے تو صرف نفاق عملی رہ گیا لہذا

حضور ﷺ کے زمانہ میں یہ خصلتیں منافق حقیقی ہی کے لئے بیان ہوئیں اذّا حدث کذب یہ مفت سب سے زیادہ صحیح ہے اور دیگر قبائح کے لئے اصل ہے۔ اسی لئے اس کو مقدم رکھا ہے۔

منافق بنانے والی چار باتیں

﴿۶﴾ وَعَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرْبَعٌ مِنْ كُنْ فِيهِ كَانَ مُتَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ الْإِثْقَابِ حَتَّى يَذْعَبَهَا إِذَا أَكْتُمِينَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (مسئلق علیہ)۔

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پورا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے گی (تو سمجھ لو) کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہو گئی تا وقتیکہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ (اور وہ چار باتیں یہ ہیں) ① جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ③ جب قول و قرار کرے تو اس کے خلاف کرے۔ ④ جب جھگڑے تو گالیاں کہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: واذا عاهد غدر: یعنی جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے دھوکہ دیتا ہے غداری کرتا ہے وعدہ خلافی نفاق کی علامات میں سے ایک علامت ہے قرآن کریم نے وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے "أوفوا بالعقود" اور فرمایا "ان العهد کان مسئلوا" "وکان صادق الوعد وکانا رسولا نبیاً" اسی طرح احادیث میں وعدہ پورا کرنے کا حکم ہے اور وعدہ پورا نہ کرنے کو منافق کی نشانی بتایا ہے۔

خلاف وعدہ کام کرنے پر جو وعید آئی ہے یہ اس وقت ہے جب کہ ایک آدمی وعدہ کرتے کرتے دل میں پکا ارادہ رکھتا ہے کہ وعدہ پورا نہیں کروں گا لیکن اگر دل میں پکا ارادہ ہے کہ وعدہ پورا کروں گا لیکن پھر کوئی عذر پیش آیا اور مجبوری آگئی تو یہ وعید اس شخص کے لئے نہیں ہے۔

منافق کی مثال

﴿۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَوَلَّى إِلَى هَذِهِ مَرَّةً وَإِلَى هَذِهِ مَرَّةً (رواہ مسللق)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے۔ جو دو یوزروں کے درمیان (ماری ماری) پھرتی ہے کہ (اپنے نر کی تلاش میں) کبھی اس طرف بائیں ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرف۔ (مسلم)

توضیح: کالشیۃ العاثرۃ: عائرہ جفتی چاہنے والی اونٹنی کو کہا جاتا ہے یہ اس کی صفت ہے پھر بکری کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے اس میں دیوٹی کی طرف اشارہ ہے کہ منافق کبھی مسلمانوں اور کبھی کفار کے پاس آتا جاتا ہے تذبذب اور تردد میں پڑا ہوا ہے شہوت کا قیدی ہے رجولیت سے عاری ہے یہ شخص اس بکری کی طرح ہے جو شہوت پوری کرنے کے لئے کبھی اس ریوڑ اور کبھی اس ریوڑ میں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی رہتی ہے یہاں تمثیل ہے یعنی تشبیہ مرکب بالمرکب ہے کہ ایک طرف منافق کا ایک پس منظر ہے اور دوسری طرف جفتی چاہنے والی بکری کا ایک پس منظر اور ہیئت ہے دونوں ہیئتوں کو ایک دوسرے سے تشبیہ دی گئی ہے جو تمثیل ہے جیسے: ۱۔

کأن مشار النقع فوق رؤسنا واسیافنا لیل مہاوی کواکبه
تحریک اسلام کی ابتداء:

یہاں یہ بات بھی سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی تحریک ہو اس کی ابتداء میں دو قسم کے لوگ میدان میں ہوتے ہیں ایک اس تحریک کے لانے والے اور اس کو پیش کر کے پھیلانے والے اور کامیاب بنانے والے لوگ ہوتے ہیں وہ جان کی بازی لگاتے ہیں اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس نئی تحریک کو قطعاً برداشت نہیں کرتے ہیں وہ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں مگر اس تحریک کو آگے بڑھنے نہیں دیتے ہیں یہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف میں واضح حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں کسی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتے ہیں، اس تحریک میں ایک تیسرا فریق اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب کچھ امید اس تحریک کی کامیابی کی پیدا ہو جاتی ہے یہ فریق خالص مفاد پرست ہوتا ہے اور ہر وقت دیکھتا رہتا ہے کہ کون لوگ غالب آتے ہیں اگر تحریک کے لانے والے کامیاب نظر آنے لگتے ہیں تو یہ مفاد پرست ٹولہ ان کے پاس جاتا ہے اور ساتھ دینے کا اعلان کرتا ہے اور اگر تحریک میں کچھ ناکامی نظر آنے لگتی ہے تو یہ ٹولہ اس تحریک کے مخالفین کے پاس دوڑ کر جاتا ہے اور وفاداری کا اعلان کرتا ہے اسی مفاد پرست ٹولہ کو منافقین کے نام سے اسلام نے یاد کیا ہے۔

جب اسلام مکہ مکرمہ میں ظاہر ہوا تو وہاں یہ ٹولہ نہیں تھا کیونکہ وہاں دونوں طرف سے قربانی کی ضرورت تھی اور یہ مفاد پرست لوگ قربانی والے نہیں تھے جب مدینہ منورہ میں اسلام پھیلنے لگا اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب اسلام غالب آسکتا ہے تو مدینہ منورہ میں منافقین کا یہ ٹولہ پیدا ہو گیا اور اپنے مفادات کے تحت کبھی مسلمانوں کے پاس اور کبھی کافروں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتا رہا حدیث پاک میں اس طبقہ کی تشبیہ جفتی چاہنے والی بکری سے دی گئی ہے جس سے ان کی مٹی عی پلید ہو گئی یہ طبقہ ابتداء اسلام سے لے کر آج تک مسلسل چلا آ رہا ہے اور اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے بعد اسلام میں ان کی پارٹی کی طرح کے منافقین شیعوہ و انصاف و غیریہ ہیں۔

الفصل الثانی

نو واضح احکام سے متعلق یہود کا سوال

﴿۸﴾ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَالٍ قَالَ قَالَ يَهُودِيٌّ لِصَاحِبِهِ اِفْهَبْ بِنَا اِلَى هَذَا النَّبِيِّ فَقَالَ لَهُ صَاحِبُهُ لَا تَقُلْ نَبِيٌّ اِنَّهُ لَوْ سَمِعَكَ لَكَانَ لَهُ اَرْبَعُ اَعْيُنٍ فَاتَّيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَسَأَلَاهُ عَنْ تِسْعِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تُكْفِرُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تَشْرِكُوا وَلَا تَزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوا فِي مِلَّةِ مَنْ دُونِ سُلْطَانٍ يَفْقَهُهُ وَلَا تَسْعَرُوا وَلَا تَأْكُلُوا الرِّبَا وَلَا تَقْلِبُوا عُصَّةً وَلَا تُولُوا لِلْفِرَارِ يَوْمَ الرِّجْفِ وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً الْيَهُودُ أَنْ لَا تَعْتَدُوا فِي الشَّذِّ قَالَ فَقَبِلَا يَدَيْهِ وَرَجَلَيْهِ وَقَالَا نَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ قَالَ فَمَا يَمْنَعُكُمْ أَنْ تَتَّبِعُونِي قَالَا إِنَّ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامَ دَعَا رَبَّهُ أَنْ لَا يَزَالَ مِنْ لُزْنَتِهِ نَبِيٌّ وَإِنَّا نَخَافُ أَنْ تَبْعَثَنَا الْيَهُودَ

(رواہ الترمذی و ابوداؤد والنسائی)

ترجمہ: حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک یہودی نے اپنے ایک (یہودی) ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی ﷺ کے پاس چلیں! اس کے ساتھی نے کہا! انہیں نبی نہ کہو کیونکہ اگر انہوں نے سن لیا (کہ یہودی بھی مجھے نبی کہتے ہیں) تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوشی سے پھولے نہیں سائیں گے) بہر حال وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ سے ”۹“ واضح احکام کے بارے میں سوال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ① کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ ② چوری نہ کرو ③ زنا نہ کرو ④ جس جان کو مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو ⑤ کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لئے (اس پر غلط الزام عائد کر کے) حاکم کے پاس مت لے جاؤ۔ ⑥ جادو نہ کرو ⑦ سود نہ کھاؤ ⑧ پاک دامن عورت پر (زنا کی) تہمت نہ لگاؤ ⑨ میدان جنگ میں دشمن کو پیچ نہ دکھاؤ۔ اور اسے یہود بول! تمہارے لئے خاص طور پر واجب ہے کہ یوم شنبہ کے معاملہ میں (حکم الہی) سے تجاوز نہ کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) دونوں یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ چوم لئے اور بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ واقعی نبی ہیں نبی پاک نے فرمایا! جب تمہیں میری رسالت پر یقین ہے تو میری اتباع سے تم کو کونسا امر مانع ہے؟ انہوں نے کہا! حقیقت یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کرے لہذا ہم ڈرتے ہیں کہ اگر آپ کی پیروی کریں تو یہودی ہمیں مار ڈالیں گے۔ (ترمذی و ابوداؤد و نسائی)

توضیح: لکن لہ اربع اعین: چار آنکھیں کنایہ ہے شدت فرح اور خوشی کی انتہاء سے کیونکہ خوشی میں آنکھیں اتنی کھل جاتی ہیں کہ ہر آنکھ میں دو کوئے بن جاتے ہیں تو دو آنکھیں بڑی ہو کر گویا چار بن جاتی ہیں اس سے یہودیوں کے

بغض و عناد کا اندازہ ہوتا ہے کہ نجی مجلس میں چھپ کر اقرار کرتے ہیں مگر ضد میں آکر سب بھول جاتے ہیں۔ ۱۔

عن تسع آیات بیدنات: ان آیات بینات سے کیا مراد ہے اس میں علماء کی دو آراء ہیں، مگر پہلے یہ سمجھ لو کہ قرآن کریم نے دو مقامات پر تسع آیات کا ذکر کیا ہے سورۃ نمل آیت ۱۲ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس طرح ذکر آیا ہے "وَادْخُلْ يَدْلَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ فِي تِسْعِ آيَاتِ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ" اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں آیت ۱۰۱ میں اس طرح ذکر آیا ہے "وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ آيَاتِ بَيِّنَاتٍ" اب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حافظ ابن کثیر رحمہما کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم میں آیات بینات سے مراد معجزات ہیں یعنی وہ نو مشہور معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے تھے۔ جو یہ ہیں عصا، ید بیضاء، دم، طوفان، جراد، قمل، صفادع، نقص ثمرات اور سنن یعنی قحط خشک سالی، علامہ مظہری کا خیال ہے کہ سورت نمل میں تو معجزات مراد ہیں مگر سورۃ بنی اسرائیل میں احکامات مراد ہیں۔ ۲۔

علامہ طبری رحمہ اللہ اور تورپشتی رحمہما کی رائے یہ ہے کہ آیات تسع سے احکامات مراد ہیں سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اور نمل میں بھی ان کی دلیل یہ مذکورہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے احکامات کا ذکر فرمایا ہے اب قرآنی آیات سے اس حدیث کی طرف آئیں تو یہاں بھی سالکین نے جو آیات تسع کا سوال کیا ہے تو علامہ طبری رحمہ اللہ وغیرہ علماء کی رائے یہ ہے کہ اس سے احکامات مراد ہیں اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ حدیث میں دونوں احتمال ہیں کہ سوال احکامات سے بھی ہوا اور معجزات سے بھی ہو، اب اگر سوال معجزات سے ہوا ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے تو آنحضرت ﷺ نے پہلے معجزات بیان فرمائے ہوں گے، اس کے بعد احکامات بیان فرمائے، راوی نے معجزات کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ قرآن کریم میں موجود و محفوظ تھے اور احکامات کا ذکر کر دیا اور اگر آیات بینات سے مراد بقول بعض علماء احکامات ہی ہیں اور ترمذی کی جلد ثانی کتاب التفسیر ص ۱۳۶ کی حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہاں یہ لفظ ہے فسلأه عن قول الله تعالى ولقد اتينا موسى تسع آيات بينات۔ ۳۔

معلوم ہوا سوال بھی احکامات سے تھا معجزات سے نہیں تھا تو پھر بات صاف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان احکامات کا جواب دیا ہے جو تمام شرائع میں مشترک تھے۔

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ سوال احکامات کا تھا تو نو احکامات کا جواب دینا تھا آنحضرت ﷺ نے نو کے جواب میں دس احکامات کیوں بیان فرمائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت ان لوگوں نے ان نو احکامات کا سوال کیا تھا جو مشہور اور تمام مل و مذاہب میں مشہور تھے اور ایک حکم جو یہود کے ساتھ خاص تھا اس کو دل میں چھپا رکھا تھا تا کہ آنحضرت ﷺ کا امتحان لے لیں آنحضرت ﷺ نے جب اس کا بھی جواب دیا تب انہوں نے ہاتھ پاؤں چومے اور نبوت کا اعتراف کیا اقرار کیا مگر مانے نہیں۔ ۴۔

انک نہی: اس میں اقرار و اعتراف ہے لیکن اس میں ایک فریب بھی ہے وہ یہ کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اُمِّیّتین کے نبی تھے یعنی صرف عرب کے لئے نبی تھے سب جہاں کے لئے نہیں تھے تو "انک نہی ای الی العرب خاصۃ" یہ دھوکہ تھا اسی طرح یہود نے دوسرا دھوکہ دینے کی یہ کوشش کی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ نبی ہمیشہ انہی کی اولاد میں سے ہو، اور آپ ان میں سے نہیں ہیں اگر ہم اتباع کریں گے تو مارے جائیں گے یہ بھی انہوں نے جھوٹ بولا داؤد علیہ السلام نے کبھی ایسا نہیں کہا اور یہ بھی جھوٹ بولا کہ اتباع کریں گے تو مارے جائیں گے دین اسلام تو امن لاتا ہے امن چاہتا ہے امن پھیلاتا ہے فتنہ و فساد تو دین کے مخالفین کا شیوہ ہے بہر حال سچے نبی کے انکار کے باوجود بھی یہود قتل سے نہ بچ سکے بلکہ جنگ خیر اور جنگ قریظہ میں مارے گئے۔ اس حدیث کو باب الکبائر والنفاق میں اس مناسبت سے ذکر کیا ہے کہ دونوں یہودیوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا اور دل میں نفاق چھپائے رکھا۔ ل

[illegible]

تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں

(٩٠) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثٌ مَنْ أَصْلَحَ الْإِيمَانُ الْكَفُّ عَنْكَ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَا تُكْفِرُهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجُهُ مِنَ الْإِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِهَادُ مَا ضَمَدَ بَعَثَنِي اللَّهُ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ الدُّجَالُ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرٌ جَائِرٌ وَلَا عُدْلٌ عَادِلٌ وَالْإِيمَانُ بِالْأَقْدَارِ (رواه أبو داود)

نیز جگر مراد: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین باتیں ایمان کی جڑیں: ① جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اس سے جنگ و خلافت ختم کر دو اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس پر اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ لگاؤ ② جب سے کہ اللہ پاک نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے جہاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ اس امت کے آخر میں ایک شخص آ کر دجال سے جنگ کرے گا۔ کسی عادل (بادشاہ) کے عدل یا کسی ظالم کے ظلم کا بہانہ لے کر جہاد ختم نہیں کیا جاسکتا ③ اور اللہ پر ایمان لاؤ۔ (ابوداؤد)

توضیح: ثلاث من اصل الایمان: اصل سے اصول دین مراد ہیں لیکن تین میں انحصار مقصود نہیں بلکہ یہ تین ان میں سے بعض ہیں اسی لئے سن تعریضیہ لایا گیا ہے یا فروغ پر عمل کرنے کے لئے یہ تین اصول ہیں لا تکفیر کا بھڑبھڑا یہ جملہ الکف عن الخلق تفسیر و توضیح ہے یعنی کلمہ گو مسلمان کو بوجہ گناہ اسلام سے خارج کر کے کافر مت کہو اس سے زبان روک لو اور نہ اس کو اسلام سے خارج مانو، پہلے جملہ میں خوارج پر واضح رد ہے اور جملہ ثانیہ میں معتزلہ کی واضح تردید ہے کیونکہ اول فرقہ مرتکب کبیرہ کو کافر کہتا ہے اور داخل فی الکفر مانتا ہے اور دوسرا فرقہ معتزلہ اس کو خارج از اسلام مانتا ہے اگرچہ وہ اس کو داخل فی الکفر نہیں کہتا ہے۔ س

یہاں شبہ یہ ہے کہ ایک شخص مثلاً ضروریات اسلام کا انکار کرتا ہے اور ساتھ ہی کلمہ گو بھی ہے تو کیا اس کی تکفیر نہیں ہوگی؟

جواب: یہ ہے کہ یہاں حدیث میں لا تخرجہ من الاسلام بعمل میں عمل سے مراد وہ گناہ ہیں جو کفر یا امارات کفر کے علاوہ ہیں اگر کوئی شخص کفر کرتا ہے یا ضروریات دین کا انکار کرتا ہے یا امارات کفر اپناتا ہے مثلاً زنا پہنتا ہے یا مصحف شریف کی توہین کرتا ہے اسے گندگی میں پھینکتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے اس کی تکفیر ہوگی اگرچہ سو بار کلمہ پڑھے، ہاں بے گناہ مسلمان کو کافر کہنا بہت بڑا جرم ہے۔

والجہاد ماض: یہ دوسری اصل ہے اس سے پہلے وثانیہا محذوف نکالنا بہتر ہوگا۔ مطلب یہ کہ جہاد کا فریضہ کوئی شخص موقوف یا منسوخ نہیں کر سکتا ہے بلکہ یہ فریضہ جاری رہے گا شاربین حدیث نے لکھا ہے کہ بعض منافقین نے کہا کہ بھائی، کچھ صبر کرو یہ نبی جب مرجائے گا تو اس کے بعد ہم اپنے پرانے مذہب کی طرف واپس چلے جائیں گے آنحضرت ﷺ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جہاد جاری رہے گا اگر یہ منافقین اسلام کو چھوڑیں گے تو جہاد کی تلوار موجود رہے گی جو انہیں کاٹ کر رکھے گی علامہ طبری رحمہ اللہ کی عربی عبارت اس طرح ہے:

الجهاد ماض "فيه رد على المنافقين وبعض الكفرة لانهم زعموا ان دولة الاسلام تنقرض بعد ايام قلائل كانه قيل الجهاد ماض اى اعلام دولته منشورة واوليائه منصوره واعدائه مقهوره الى يوم الدين"۔

اس حدیث کو علامات النفاق میں لانے کی مناسبت بھی یہی ہے کہ منافقین نے اعتراض کیا تھا "والجہاد ماض" کا مطلب یہ ہوا کہ خروج دجال تک جہاد جاری رہے گا اس سے لڑ کر مسلمان غالب آجائیں گے پھر یا جوج ماجوج آئیں گے ان سے مقابلہ ممکن نہ ہوگا اس کے بعد پھر کوئی کافر نہیں رہے گا تو جہاد نہیں ہوگا اور پھر اس کے بعد تو سب کافر ہوں گے جن پر قیامت قائم ہوگی تو جہاد کیسے ہوگا لہذا جہاد قرب قیامت تک جاری رہے گا۔

پھر علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جہاد جاری رہنے سے اس کا عقیدہ باقی رہنا اور اس کے حکم کا باقی رہنا اور اس کی مشروعیت کا باقی رہنا مراد ہے کیونکہ ہر وقت ہر گھڑی تو میدان جنگ گرم نہیں رہتا ہے اگرچہ ہر مسلمان ملک پر واجب ہے کہ وہ سال میں دو دفعہ کفار سے جنگ کرے اور یہ ادنیٰ درجہ ہے فرض کفایہ سے بھی مراد یہ ہے کہ دنیا کے کسی کو نے میں جہاد کا وجود عملاً باقی رہنا چاہیے اگر پوری دنیا نے جہاد ترک کر دیا تو مجموعی طور پر لوگ گناہ گار ہو جائیں گے، کیونکہ الجہاد ماض اٹل حکم ہے۔

مد بعثنی اللہ: اس جملہ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جب سے میرے رب نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اس وقت سے جہاد جاری ہوا ہے دوسرا مفہوم یہ کہ جب سے میرے رب نے مجھے مکہ سے مدینہ کی طرف بھیجا ہے اس وقت سے جہاد کا حکم آگیا ہے یہاں تک کہ اس امت کا آخری شخص دجال سے آکر جنگ لڑے اس آخری شخص سے مراد (عیسیٰ علیہ السلام) ہیں اور حضرت

چہارم یہ کہ حیاء ایمانی چلی جاتی ہے۔ پنجم یہ کہ یہ تخلیط و تشدید کے طور پر فرمایا۔ ششم یہ کہ وقتی طور پر ایمان ہٹ گیا اچھی اس قہاحت سے فارغ ہو کر ایمان واپس آجائے گا اگر کتاب کبیرہ کے وقت بھی یہ شخص ایمان کے سائے تلے ہے ہاں علماء نے لکھا ہے کہ اگر اسی وقت یہ آدمی مر گیا تو ایمان کے بغیر مر کر چلا گیا کیونکہ ایمان تو سائبان بنا تھا اندر سے چلا گیا تھا اور واپس آنے کا موقع نہیں ملا۔ (اعاذنا اللہ منہ)

الفصل الثالث

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دس باتوں کی وصیت

(۱۱) عَنْ مُعَاذٍ قَالَ أَوْصَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَلِمَاتٍ قَالَ لَا تُكْثِرُكَ يَاللَّهُ شَيْئًا وَلَا قُتِلْتَ وَخُرِفَتْ وَلَا تَعْقُرْ وَالذِّئْبُ وَإِنْ أَمَرَكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ وَلَا تَتْرُكْ صَلَاةَ مَكْتُوبَةٍ مُتَعَتِدًا فَإِنْ تَرَكَ صَلَاةَ مَكْتُوبَةٍ مُتَعَتِدًا فَقَدْ بَرَأْتَ مِنْهُ ذِمَّةُ اللَّهِ وَلَا تُكْثِرْ بَيْنَ عَمْرَأَ فَإِنَّهُ رَأْسُ كُلِّ فَاجِسَةٍ وَإِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ فَإِنَّكَ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطِ اللَّهِ وَإِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الرَّحْطِ وَإِنْ هَلَكَ النَّاسُ وَإِذَا أَصَابَ النَّاسُ مَوْتُ وَأَنْتَ فِيهِمْ فَأُثْبِتْ وَأَنْفِقْ عَلَى عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ أَذْنًا وَأَخْفِهُمْ فِي اللَّهِ. (رواه أحمد)

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی چنانچہ فرمایا ① اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہیں جان سے مار ڈالا جائے اور جلا دیا جائے۔ ② اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اگرچہ وہ تمہیں اپنے اہل اور مال چھوڑنے کا حکم دیں۔ ③ جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جو شخص عداۃ نماز چھوڑ دیتا ہے اللہ اس سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ④ شراب مت پیو کیونکہ شراب تمام برائیوں کی بڑ ہے۔ ⑤ اللہ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ کا غصہ اتر آتا ہے۔ ⑥ جہاد میں دشمنوں کو ہرگز پیچھے نہ دکھلاؤ اگرچہ تمہارے ساتھ کے تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ ⑦ جب لوگوں میں موت (وباء کی صورت میں) پھیل جائے اور تم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو (یعنی ان کے درمیان سے بھاگو مت)۔ ⑧ اپنے اہل و عیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔ ⑨ تادیباً اپناؤ نذا ان سے نہ بھاؤ۔ ⑩ اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انہیں ڈراتے رہو (یعنی اہل و عیال میں سے کسی کو سزا یا تادیباً کچھ ناراضی نہ ضروری ہو تو اس سے پہلو تہی نہ کرو اور ان کو اچھی اچھی باتوں کی نصیحت و تلقین کرتے رہا کرو اور دین کے احکام و مسائل کی تعلیم دیا کرو اور ان کو بری باتوں سے بچانے کی کوشش کرو)۔ (نہد)

توضیح: اوصانی: تاکید کی حکم اور اہم بیان کو وصیت کہتے ہیں جیسے قریب الموت شخص پس ماندہ گان کو اہم اہم اور ضروری باتوں کا تذکرہ کی وصیت کرتا ہے۔

وان قتلت و حرق: سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اکراہ کی صورت میں کفر و شرک کا زبانی اور ظاہری طور پر ارتکاب جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ جان بچ جائے لیکن یہاں حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت اکراہ میں بھی اجازت نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام فرضی طور پر ہے یعنی شرک نہ کرو فرض کر لو اگر تم جلائے بھی جاؤ یا قتل کے لئے پیش بھی کئے جاؤ مگر شرک سے بچو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک عزیمت ہے اور ایک رخصت ہے رخصت تو یہی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے کہ دل سے مؤمن ہے صرف زبان سے اکراہی صورت میں کلمہ کفر کہتا ہے تو جان بچانے کے لئے رخصت ہے اجازت ہے، اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے صحابی کو عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے کہ جان دیدو مگر شرک کا ارتکاب نہ کرو تو عزیمت پر عمل شان صحابی کے شایان شان تھا۔

ولا تعفن والدین: عقوق والدین میں یہ تفصیل ہے کہ اگر والدین کا حکم امر شرعی کے کرنے سے متعلق ہے تو اس میں والدین کی اطاعت فرض ہے اور اگر کسی امر منکر کے کرنے سے والدین کا حکم متعلق ہے تو ان کی اطاعت نہ کرنا فرض ہے اور اگر کسی مباح امر سے متعلق ہو تو اطاعت کر سکتا ہے بشرطیکہ اطاعت سے فتنہ انگیزی کا خطرہ نہ ہو۔

ہرأت منہ ذمۃ اللہ: اہی امن اللہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قصد نماز چھوڑنے والے سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے یعنی اب یہ آدمی محفوظ الدم نہیں رہا بلکہ محدور الدم ہو گیا۔ اس میں پھر فقہاء کرام کی رائیں مختلف ہو گئیں۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عمدہ نماز چھوڑنے والا مرتد نہیں ہے البتہ واجب القتل ہے اور یہ سزا اس کے اس عمل کا رد عمل ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو قتل کر دیا جائے گا اور یہ ارتداد کی ایک شکل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو جیل میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ یا توبہ کرے یا جیل میں مرے، بعض اہل اللہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی کو مسلمانوں کے قبرستان میں نہ دفنایا جائے، بابا سندی نے کہا ہے کہ بے نمازی کو قرض مت دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کا قرض ادا نہیں کرتا ہے وہ تمہارا کیا حق ادا کرے گا۔

فانہ راس کل فاحشۃ: کیونکہ شراب پینے سے عقل زائل ہوتی ہے اور جب عقل گئی تو پھر ہر گناہ کا راستہ کھل گیا۔

”اذا فاتک الحیاء فافعل ما شئت“ یعنی اب فاحشہ غیر فاحشہ میں تیز ختم ہو گئی جو چاہو کرو۔

واذا اصاب الناس موت:

یعنی جہاں طاعون وغیرہ وبائی مرض ہو وہاں جانا شرعاً جائز نہیں اور وہاں سے بھاگنا بھی جائز نہیں یہ ایسا ہی ناجائز ہے جیسا کہ دشمن سے میدان جنگ میں بھاگنا ناجائز ہے۔

وانفق علی عیالک من طولک: طول طاقت اور قدرت اور وسعت کے معنی میں ہے یعنی واجب نفقات تو ذمہ پر ہیں زائد نفقات سے بھی اہل و عیال پر خرچ کیا کرو مگر اپنی وسعت کے مطابق ہو۔

عصا ک ادباً: یعنی تادیب و تہذیب کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت عصا کندھے پر ہو اور اس سے بیوی بچوں کی اصلاح جاری رکھو مگر یہ ماریپیٹ ادب کے طور پر ہونہ کہ عذاب و تعذیب کے طور پر خلاصہ یہ کہ ان کی تادیب اور حسن تعلیم کے لئے زجر و تنبیخ اور مار پیٹ کرتے رہنا چاہیے۔ ۱۔

اب یا کفر ہے یا ایمان

﴿۱۲﴾ وَعَنْ حَذِيفَةَ قَالَ إِنَّمَا الْيَقَاقَى كَانَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَمَّا الْيَوْمَ فَأَلَيَّمَا هُوَ الْكُفْرَ وَالْإِيمَانَ. (رواہ البخاری) ۱۔

ترجمہ: اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نفاق کا حکم آنحضرت ﷺ کے عہد پر ختم ہو گیا لہذا اب دو ہی صورتیں ہوں گی یا کفر ہوگا یا ایمان۔ (بخاری)

توضیح: فاما الیوم: حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں چند مصلحتوں کی وجہ سے منافقین کو مسلمانوں کے حکم میں رکھا جاتا تھا اور ان کی تمام سازشوں کو برداشت کیا جاتا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اب وہ معاملہ نہیں رہا اب فرض کرو اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص منافق ہے تو اس پر ارتداد کا حکم جاری ہوگا اور اسلامی حکومت اس کو سزائے موت دے گی۔ ۱۔



بَابُ فِي الْوَسْوَسةِ

یہ باب دوسرے کے بیان میں ہے

دوسرے لغت میں نرم آواز اور زیورات کی جھنکار کو کہتے ہیں شاعر کہتا ہے:۔

ضَوْءُ الْحَبِيبِ وَوَسْوَاسُ الْحَلِيقِ وَمَا يَفْوُحُ مِنْ عَرْقٍ كَالْعَنْبَرِ الْعَبِي
تذہیب: چہرہ کی چمک اور زیورات کی جھنکار اور اسکے پسینے کی عسبرین خوشبو کا کیا کہنا۔

وسواس اور وسواس بھی دوسرے کے معنی میں ہیں پھر وسواس دوسرے ڈالنے والے شیطان کو بولا گیا زیندا عدلی کے طرز پر یعنی مباح کے طور پر شیطان کو وسواس کہا گیا۔ کیونکہ شریعت نے ہر بری نسبت شیطان کی طرف کی ہے تاکہ اس خطرناک دشمن کی نفرت و عداوت دلوں میں بیٹھ جائے اور ہر خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اگرچہ خالق خیر و شر اللہ ہی ہے۔ بہر حال خیالات فاسدہ اور وہ افکار دیدہ جو شیطان کی مداخلت سے انسان کو کفر یا معصیت تک لے جائیں ان کا نام دوسرے ہے۔

دوسری تعریف اس طرح ہے، جو قلبی خطرات رذائل کی طرف بلاتے ہوں وہ دوسرے ہیں اور جو قلبی خطرات فضائل کی طرف داعی ہوں وہ الہام ہیں غیر معصوم ہستی کا الہام حجت نہیں ہے ہاں اگر شریعت کے موافق ہو تو باعث تسلی ہے۔ لہٰذا اس سے ملتی جلتی ایک تعبیر اس طرح بھی ہے کہ جو خطرات شر کے ہوں وہ دوسرے ہیں اور قلب پر آنے والے جو خطرات خیر کے ہوں وہ الہام ہیں دوسرے کی پانچ اقسام ہیں جس کو کسی شاعر نے اس نظم میں پیش کیا ہے:

مراتب القصد خمس هاجس ذكرها فحاطر فحديث النفس فاستمعا

يليه هم فعزم كلها رفعت سوى الاخير فقيه الاخذ قد وقعا

① "ہاجس" جو خطرات دل پر ایک بار وارد ہو جائیں اور پھر رفع ہو جائیں یہ ہاجس ہیں۔

② "حاطر" جو خیال دل میں بار بار آتا جاتا ہے اور قرار نہیں پکڑتا وہ حاطر کہلاتا ہے۔

③ اگر ان خطرات کا استقرار دل میں آگیا مگر اتنا ضعیف ہے کہ فعل کے کرنے اور نہ کرنے میں کسی جانب ترجیح نہیں ہوئی

تو یہ "حديث النفس" کہلاتا ہے۔

④ اگر خیالات کا استقرار دل میں اتنا مضبوط اور قوی ہو جائے کہ موجب فعل ہو، مگر جانب فعل مرجوح رہے تو یہ "هم" کا

درجہ ہے۔

۵ اور اگر ”ہم“ کا درجہ دل میں اتنا قوی ہو جائے کہ جانب فعل رائج ہو کر موجب فعل ہو جائے یعنی صرف موقع کا انتظار ہے تو یہ ”عزم“ ہے۔ ۱۔

اول تین قسموں پر نہ ثواب ہے نہ عقاب ہے بالکل معاف ہیں کیونکہ یہ غیر اختیاری ہیں، ”ہم“ کے درجہ میں جو دوسرہ ہے یہ سب اور کارِ شر میں معاف ہے، یہ اس امت کا اعزاز ہے اور کارِ خیر اور ثواب میں دس کے بجائے ایک۔ نکی ملے گی۔ اور عزم میں اگر گناہ کا عزم ہے تو عذاب کا مستحق ہوگا اور اگر حسد اور نیکی کا عزم ہے تو من جاء بالمحسنة فله عشر امثالها حسب وعدہ دس گنا ثواب ملے گا پھر عزائم قلبیہ اگر اتنے عقائد ہیں تو اس پر ثواب ہے اور برے عقائد ہیں تو ان پر عذاب ہے اس میں اتفاق ہے۔

اور اگر یہی عزائم قلبیہ اخلاقیات کے قبیل سے ہوں تو اچھے اخلاق و صفات پر ثواب ملے گا اور برے پر عذاب ہوگا اس پر بھی اتفاق ہے اچھے اخلاق صبر، شکر، فکر آخرت، تواضع وغیرہ ہیں۔ برے اخلاق تکبر، عجب، کینہ و حسد وغیرہ ہیں اور اگر یہی عزائم قلبیہ اعمال جوارج سے متعلق ہیں تو اس میں اختلاف ہے بعض نے عزم کے درجہ میں مواخذہ کا قول کیا ہے اور بعض نے عدم مواخذہ کا قول کیا ہے رائج یہ ہے کہ مواخذہ ہوگا۔ ۲۔ واللہ اعلم

الفصل الاول

دوسروں کی معافی

﴿۱﴾ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ اللَّهُ تَعَالَى تَجَاوَزَ عَنِّي أَمَّتِي مَا وَسَّوَسْتُ بِهِ صُدُورَهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهِ أَوْ تَتَكَلَّمْ - (متفق عليه) ۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان دوسروں کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک کہ وہ ان دوسروں پر عمل نہ کریں اور ان کو زبان پر نہ لائیں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: ماوسوست بہ صدورہا: صدورہا مرفوع ہے جو دوسرے کا فاعل ہے اور یہی رائج ہے، یا منصوب ہے ظرفیت کی بنیاد پر اور فاعل محذوف ہے ای ماوسوست الشیاطین بہ فی صدورہا۔ ”ہا“ ضمیر امت کی طرف لوٹی ہے اور امت سے مراد امت اجابت ہے امت دعوت یعنی کفار مراد نہیں ہیں۔ ۴۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں عزم کے علاوہ دوسرہ مراد ہے عزم پر مواخذہ دیگر نصوص کی وجہ سے ہے مثلاً والاثم ما حاک فی نفسک وتردد اور یا حدیث فالقاتل والمقتول فی النار قبیل الخ اس

حدیث میں مقتول بھی مجرم ظہر ا کیونکہ وہ حریص تھا اپنے بھائی کے قتل پر جو درجہ عزم ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث سے بظاہر عزم کا درجہ بھی معاف ہے مگر دیگر نصوص کی وجہ سے عزم مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ لے

مالہ تعیل بہ: اگر وہ کام فعل سے تعلق رکھتا ہو تو جب تک فعل کا ارتکاب نہیں کیا معاف ہے۔ لے

او تتکلم: ای لمحہ تکلم یعنی اگر وہ کام قول سے تعلق رکھتا ہو تو جب تک کلام نہیں کیا صرف دوسرہ ہی ہے تو یہ معاف ہے۔ معلوم ہوا کہ جو اقوال و افعال اعمال جو ارجح کے علاوہ قلبی عقائد وغیرہ سے متعلق ہوں وہ ہر وقت گناہ ہی ہیں۔ لے

دوسرہ آنا دلیل ایمان ہے

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ تَائِسٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلُوهُ إِنَّا نَجِدُ فِي أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا نَآئِمْ يَتَكَلَّمُ بِهِ قَالَ أَوْقَدْ وَجَدْتُمُوهُ قَالُوا نَعَمْ قَالَ ذَلِكَ صِرَاحُ الْإِيمَانِ.

(رواہ مسلم) ۷

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے چند صحابی بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (دوسے) پاتے ہیں جس کا زبان پر لانا بھی ہم برا سمجھتے ہیں، سرکارِ دو عالم ﷺ نے پوچھا کیا تم واقعی ایسا پاتے ہو (کہ جب کوئی ایسا دوسرہ تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے تو خود تمہارا دل اس کو ناپسند کرتا ہے اور اس کا زبان پر لانا بھی تم برا سمجھتے ہو؟) صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں۔ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ کھلا ہوا ایمان ہے۔

(مسلم)

توضیح: مایتعاظم: یعنی اس کا تصور اور اس کو زبان پر لانا ہی ہم بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں جیسے کوئی کہے "من خلق اللہ" - کیف ہو؟ این ہو؟ تعظم باب تفاعل سے مبالغہ کے لئے آیا ہے "ای نستعظم غایۃ الاستعظام" - قاعدہ یہ ہے کہ باب مفاعله جب مغالبہ یعنی جانتین کے لئے مستعمل نہ بھی ہوتا ہے تو یہاں مبالغہ کے لئے ہوا۔ ۷

او قد وجدتموہ: یہ مقدر پر عطف ہے "ای او قد حصلتموہ و قد وجدتموہ"۔ لے

ذالک صریح الایمان: دوسرہ آنا صریح ایمان نہیں ہے بلکہ دوسرہ کو اتار ڈالنا اور اتارنا برا سمجھنا یہ صریح ایمان ہے یعنی زبان پر نہیں لاسکتا ہے تو دل میں کتنا متفر ہوگا، اس جملہ میں آنحضرت ﷺ نے امت کو تسلی دی ہے اور گویا دوسروں کا علاج ہے کہ دوسرہ آئے یا جائے کچھ بھی ہو تمہارے ایمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تم کوئی پروا نہ کرو کیونکہ خالی گھر میں جو ویران پڑا ہو کوئی نہیں جانتا یا بے پھل درخت کو چتر نہیں مارا جاتا بلکہ جس درخت پر پھل ہوتا ہے وہاں پتھر مارا جاتا ہے جہاں پھل ہوگا اور جہاں کچھ ہو تو وہاں چورا آئے گا۔ ۷

شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ مانگو

﴿۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَيُّهَا الشَّيْطَانُ أَحَدَ كُمْ فَيَقُولُ مَنْ خَلَقَ كَذَا مَنْ خَلَقَ كَذَا حَتَّى يَقُولَ مَنْ خَلَقَ رَبَّنَا فَإِذَا بَلَغَا وَلَيْسَتْ عِزُّ بِاللَّهِ وَلَيْسَتْ عِزُّهُ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا۔ اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ تا آنکہ پھر وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار اس نے پیدا کیا؟ تب نوبت یہاں تک آجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور اس سلسلہ کو ختم کر دے۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: فاذا بلغه: اس میں فاعل ضمیر مرفوع ہے جو احد کھد کی طرف راجع ہے اور ”ہ“ ضمیر مفعول بہ کی ہے ای اذا بلغ احد کھد هذا القول یا ضمیر مرفوع شیطان کی طرف راجع ہے یعنی جب شیطان ورغلا تے ورغلا تے یہاں تک پہنچ جائے تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو شیطان مردود ہے۔ ۱

علامہ خطابی رحمہ اللہ: علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انوعائے شیطانی اور اس کے وسوسوں کا سلسلہ غیر متناہی ہے اگر ان کو مہلت دے دی تو معاملہ ختم نہ ہوگا بلکہ خطرناک بنا چلا جائے گا لہذا استعاذہ کر کے معاملہ ختم کرے کیونکہ تعوذ سے وہ بھڑکتا ہے یعنی اعوذ باللہ اور معوذتین کو پڑھ کر یہ تصور قائم کرے کہ بڑے بادشاہ کی پناہ میں آیا ہوں وہ شیطان سے میری حفاظت کرے گا اس سے وسوسہ ختم ہو جائے گا۔ ۲

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ: نے تعوذات کے لئے دس وظائف کا تعین فرمایا ہے۔ ① تعوذ باللہ ② قرأت معوذتین ③ آیۃ الکرسی ④ قرأت سورۃ بقرہ ⑤ امن الرسول پڑھنا ⑥ حم المؤمن والیہ المصیر تک پڑھنا ⑦ کثرت ذکر اللہ ⑧ کثرت سے لا الہ الا اللہ کا پڑھنا ⑨ دوامت وضو ⑩ اہنیات پر غلط نظر سے اپنی نگاہیں محفوظ رکھنے سے وسوسوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

وسوسوں کو دفع کرنے کا وظیفہ

﴿۴﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتَّى يَقَالَ هَذَا خَلَقَ اللَّهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللَّهُ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ ہمیشہ (اپنے دل میں مخلوقات وغیرہ

۱۔ أخرجه البخاری ۴/۱۳۹، ومسلم ۱/۶۸، المعرفات ۱/۲۲۲

۲۔ الکشاف ۱/۲۱۸، والمعرفات ۱/۲۲۲، أخرجه البخاری ۴/۱۳۹، ومسلم ۱/۶۸

کے بارے میں) خیالات پکاتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا (یعنی دماغ میں دوسرے آئے گا) کہ اس تمام مخلوق کو خدا نے پیدا کیا ہے (تو) خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس شخص کے دل و دماغ میں اس قسم کا کوئی خیال اور دوسرے پیدا ہو تو وہ یہ کہے کہ میں خدا تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: يتساءلون: یعنی انسان آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں یا مراد یہ کہ انسان شیطان سے معاملہ کرتا ہے مگر یہ احتمال بعید ہے کہ انسان اور شیطان کے درمیان یہ مکالمہ ہوتا ہو۔ احتمال یہ کہ انسان اپنے نفس سے سوال کرتا رہتا ہے یقال هذا خلق الله الخلق هذا مبتداء ہے خبر مخدوف ہے جو معروف یا مشہور ہے یعنی هذا القول مشہور و مسلم و هو ان الله خلق الخلق فما تقول في الله فان الله شئ وكل شئ مخلوق فمن خلق الله؟ (طیبی) فليقل امدت بالله ورسله یعنی یہ سوال و جواب اور یہ خیال کفر کا ہے اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ فوراً کہہ دے امدت بالله ورسله تاکہ اس سے اس کے ایمان کی تجدید ہو جائے، دوسرے دفع کرنے کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ ہر نماز کے بعد سات مرتبہ یہ آیت پڑھ کر دم کرے تو دوسرے نہیں آئے گا۔ وہ آیت یہ ہے: لا

وَقُلْ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَٰمَزَاتِ الشَّيْطٰنِ۔ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

ہر انسان کے ساتھ جن اور فرشتہ مقرر ہے

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوْا وَاَيُّكَ يَا رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ وَاَيُّاىَّ وَلَكِنَّ اللّٰهَ اَعَالَيْهِ عَلِيْمٌ فَاسْلَمُوْا فَلَا يَأْمُرُ بِالْاِثْمِ وَالْعَظَمِ (رواۃ مسلم)﴾

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک ہزار جنوں (شیطان) میں سے اور ایک ہزار فرشتوں میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی، لیکن خدا نے مجھ کو اس (جن مومل) سے مقابلہ کرنے میں مدد دے رکھی ہے اس لئے میں اس کے مکر و فریب اور اس کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہوں (بلکہ یہاں تک کہ) وہ بھی مجھے بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: وكل به قرينه: یہ مجہول کا صیغہ ہے قرین ہزار کو کہتے ہیں جو پیدائش کے وقت سے انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے تاکہ اس کو مسخر کر کے اپنا تابع بنائے جس وقت انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے ایک شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے فرشتہ تو ہوا مملہم الخیر اور شیطان ہوا وسواس الشر۔

اعانی علیہ: یعنی اس کے مقابلہ میں میری مدد اور نصرت اللہ نے کی ہے۔ ۱۔

فاسلم: اسلم کا یہ لفظ میم کے فتح کے ساتھ ماضی کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے اور میم کے ضمہ کے ساتھ متکلم کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے اب سوال یہ ہے کہ اسلم اگر ماضی کا صیغہ ہے تو پھر شیطان کیسے مسلمان ہو گیا؟ تو اسی اعتراض کی وجہ سے علماء کا اس لفظ کے مفہوم میں اختلاف ہو گیا۔ علامہ خطاب رحمۃ اللہ علیہ اس کو متکلم ہی کے معنی میں لیتے ہیں یعنی میں اس کے شر سے محفوظ ہوا ہوں اور بعض دوسرے علماء اسلم ماضی کے صیغے کو راجح قرار دیتے ہیں اور اسلام لانے کا مطلب یہ کہ وہ منقاد و مطیع و فرمانبردار ہو گیا یہی رائے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی ہے اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے علاوہ تو جہات کو تحریف قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسلم بمعنی استسلم و انقاد ہے فلا یا امرنی الا بخیر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ ۲۔

شیطان انسان کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے

﴿وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّهْرِ﴾

(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! انسان کے اندر شیطان اس طرح دوڑتا پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: بھری بھری الدھر: خون رگوں میں جہاں جہاں جاری ہوتا ہے اسی کو بھری الدم کہہ دیا ہے یہ کلام یا تو تشبیہ ہے تو مجاز پر محمول ہوگا اور بھری مصدر مہمی ہوگا یعنی شیطان وہاں تک و سوسے ڈالتا رہتا ہے جہاں تک خون جاتا ہے اور یا یہ کلام حقیقت پر مبنی ہے کہ شیطان خود اندر گھس کر خون کے ساتھ دوڑتا ہے جہاں خون جاتا ہے وہاں شیطان جاتا ہے پھر کلام اس طرح ہوگا بھری من الانسان کجریان الدھر او بھری فی مجاری الدھر تو خود اندر جا کر دوسرے ڈالتا ہے یہ اس خبیث کو اللہ تعالیٰ نے ایک قوت و سلطنت اور انسانوں پر قابو پانے کا اختیار دیا ہے جو آزمائش ہے۔ ۳۔

شیطان بچوں کی پیدائش کے وقت کچھ کے لگاتا ہے

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ نَبِيٍّ آتَاهُ مَوْلُودٌ إِلَّا يَمْشِيهِ الشَّيْطَانُ حِينَ يُولَدُ فَيَسْتَمْلِئُ صَارِخًا مِنْ مَشِيئَةِ الشَّيْطَانِ عَمَّا مَزِيئَهُ وَآلِهَتُهُ﴾

(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! نبی آدمی کے یہاں جو بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ اٹھتا ہے لیکن ابن مریم (حضرت عیسیٰ) اور ان کی ماں کو شیطان نے نہیں چھوا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: يستعمل صارخا: شیطان اگر ظاہری طور پر بچہ کو چھوتا ہے تو اس بچہ کے گٹنے سے اور ٹھونگ مارنے سے بچہ چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر مس ظاہری نہیں بلکہ باطنی ہے تو چونکہ بچہ معصوم اور پاک طینت ہوتا ہے شیطان کے وساوس سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کو غیر مانوس جان کر چیخ اٹھتا ہے استعمال نومولود بچے کے چیخنے کو کہتے ہیں۔

غیر مریم وابتنہا: حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے یہ دعا مانگی تھی "انی اعین ہا بک وذرینہا من الشیطان الرجیم" اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی تو محفوظ ہو گئے باقی متکلم عادتہ محاورہ کلام سے خود خارج ہوتا ہے ورنہ حضور اکرم ﷺ بھی اس مس سے محفوظ تھے یہ جزئی فضیلت ہے جس سے کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔

(۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَبَاخُ الْمُؤَلُودِ حِلْنٌ يَقْعُ نَزْعُهُ مِنَ الشَّيْطَانِ

(مفلق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ولادت کے وقت بچہ اس لئے چلاتا ہے کہ شیطان اس کو بچہ کے گاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

گھرانہ تباہ کرنا شیطان کا پسندیدہ عمل ہے

(۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَاتِمًا يَفْتِنُونَ النَّاسَ فَأَذْنَاهُمْ مِنْهُ مَنُوءَةٌ أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَحِيى أَخَذَهُمْ فَيَقُولُ فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا فَيَقُولُ مَا صَنَعْتَ شَيْئًا قَالَ ثُمَّ يَحِيى أَخَذَهُمْ فَيَقُولُ مَا تَرَكْتُهُ حَتَّى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ قَالَ فَيَذْنِيهِمْ مِنْهُ وَيَقُولُ نَعَمْ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ أَرَأَاهُ قَالَ فَيَلْتَزِمُهُ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابلیس اپنا تخت حکومت پانی (یعنی سمندر) پر رکھتا ہے۔ پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کریں۔ ابلیس کی فوجوں میں اس کا سب سے مقرب وہ ہے جو سب سے بڑا فتنہ انداز ہو، ان میں سے ایک ابلیس آکر کہتا ہے میں نے فلاں فلاں فتنے پیدا کئے ہیں۔ ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے! تو نے کچھ نہیں کیا آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے (ایک بندہ کو گمراہ کرنا شروع کیا اور) اس وقت تک اس شخص کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ابلیس (یہ سن کر) اس کو اپنے قریب بٹھالیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے اچھا کام کیا (حدیث کے ایک راوی) اعش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے بجائے فیلذنیہ فیلتزمہ (میں ابلیس اس کو لگے لگاتا ہے) کے الفاظ نقل کئے تھے۔ (مسلم)

توضیح: یضع عرشہ علی الماء: بعض حضرات نے ابلیس کے تخت پانی پر رکھنے کی پوری صورت کو مجاز پر حمل کیا ہے کہ یہاں تسلط و قدرت مراد ہے مگر یہ راجح نہیں دوسرے شارحین نے اس کلام کو حقیقت پر حمل کیا ہے۔ کہ ابلیس سمندر پر تخت بچھاتا ہے اس پر بیٹھتا ہے اپنی اولاد کو کارروائی پر روانہ کرتا ہے گویا یہ خبیث اپنی حیثیت کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر پیش کرتا ہے اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ ص ۸۷ پر ہے۔ اس میں جب ابن صیاد سے آپ ﷺ نے پوچھا: لے

”ماذا ترى قال ارى عرشاً على الماء فقال ترى عرش ابليس على البحر“۔ (مشکوٰۃ ص ۸۷)
فرقت بینہ و بین امرأته: اس سے ابلیس زیادہ خوش اس لئے ہوتا ہے کہ تنازع بین زمین ایسا متعدی عمل ہے جس سے طرفین میں وسیع تنازعات اور فسادات پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ ایک فساد نہیں بلکہ کئی فسادات کا پیش خیمہ ہے جس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور آج کل این جی اوز کا بنیادی مقصد بھی یہی ابلیس کا پسندیدہ عمل ہے جو گھرانہ کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ لے

نعم انت: یعنی ابلیس کہتا ہے کہ ہاں کام تو تم نے کیا اس صورت میں یہ حرف ایجاب ہاں کے معنی میں ہے یا یہ افحال مدح میں سے ہے یعنی نعم الولد انت تم کتنا اچھا بچہ ہو؟ کیا ہی اچھے ہو؟ اور پھر اس کو سینہ سے لگاتا ہے۔ لے

جزیرہ عرب سے شیطان مایوس ہو گیا

﴿۱۰﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ آيَسَ مِنْ أَنْ يَغْبِطَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلَكِنْ فِي "تَحْرِيشِ بَيْنَهُمْ"۔ (رواۃ مسلم)

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرہ عرب میں مصلین (یعنی مسلمان) اس کی پرستش کریں۔ لیکن ان کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ (مسلم)

توضیح: المصلون: یعنی نماز پڑھنے والے اس سے مراد مسلمان ہیں تو مسلمان کی اہم عبادت اور اسلام کے اہم جزء نماز کا ذکر کیا اور یہ اشارہ کیا کہ مسلمان وہ ہے جو نماز پڑھتا ہے۔ شیطان کی عبادت سے مراد شرک اور عبادۃ الاصنام ہے۔ ۵

سوال: شبہ یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد جزیرہ عرب میں ۷۵ فی صد لوگ اسلام سے پھر گئے تھے کسی نے زکوٰۃ کا انکار کیا کسی نے میلہ کذاب یا اسود غسی یا طلحہ یا سجاح کی جھوٹی نبوتوں کا سانھ دیا اور فتنہ ارتداد عام ہو گیا تو پھر یہ کیسے فرمایا کہ شیطان مایوس ہو گیا ہے کہ پھر سے جزیرہ عرب میں اس کی عبادت شروع ہو جائے۔

پہلا جگہ لکھیے اس کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ مایوسی بت پرستی کی عبادت سے ہے کہ جزیرہ میں پھر بتوں کی عبادت شروع ہو جائے اور یہ عمل آج تک نہیں ہوا کہ کسی نے وہاں بت کھڑے کئے ہوں اس وقت قنبر ارتداد کے دور میں بھی کسی نے کفر و شرک کی اس قسم کو نہیں اپنایا تھا۔

دوسرا جگہ لکھیے یہ ہے کہ جزیرہ عرب میں انقلاب اسلام کے بعد انقلاب کفر سے مایوس ہو گیا ہے کہ اب یہاں دور جاہلیت اور کفر کا انقلاب نہیں آسکتا اگرچہ گناہ و فساد ہوں گے جزیرہ کی قید اس لئے لگادی کہ اس وقت اسلام صرف وہاں پر تھا۔

فی جزیرۃ العرب: "جزیرہ" زمین کے اس خشک حصہ کا نام ہے جس کو چاروں طرف سے پانی نے گھیر رکھا ہو چونکہ عرب کے تین اطراف پانی ہے اس لئے اس کو حکم اکثری کے اعتبار سے جزیرہ کہہ دیا گیا ہے کیونکہ عرب کے شمال میں ملک شام واقع ہے جو پانی سے خالی ہے ہاں اکثر جوانب پر پانی کا احاطہ ہے مثلاً بحر ہند، بحر قلزم اور جلد و فرات نے اس ملک کا احاطہ کیا ہوا ہے حدود اربعہ اس طرح ہیں عرب کی مشرقی جانب میں خلیج فارس اور بحر عمان واقع ہے مغربی جانب میں بحیرہ قلزم اور نہر سویز واقع ہے جنوب میں بحر ہند واقع ہے اور شمال میں ملک شام ہے۔

جزیرہ عرب پانچ حصوں پر مشتمل ہے: ① تہامہ ② نجد ③ حجاز ④ عروص ⑤ یمن، جزیرہ عرب جب بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق لمبائی میں عدن سے عراق تک ہوتا ہے اور چوڑائی میں جدہ سے شام تک ہوتا ہے۔

لکن فی التحریش: یعنی آپس میں لڑانے اور قنبر فساد ڈالنے سے شیطان مایوس نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں سرگرم رہے گا چنانچہ واقعہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر جنگوں میں یہی اغوائے شیطانی کا فرما ہے آج کل یہود و نصاریٰ کی شکل میں ابلیس جزیرہ میں آچکا ہے۔ "تحریش" دھوکہ فریب اور ابھارنے کو کہتے ہیں۔

پہلے ۳ شرم آخر ۱۰۱۰ھ

الفصل الثانی

وسوسہ سے پریشان نہ ہو

﴿۱۱﴾ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ إِنِّي أُحَدِّثُ نَفْسِي بِالْقَسَىٰ وَلَٰكِنِّي أَكُونُ حَمِيَّةً أَحِبُّ إِلَىٰ مَنْ أَنْ أَتَكَلَّمُ بِهِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي رَدَّ أَمْرَهُ إِلَىٰ الْوَسْوَاسَةِ (رواہ ابوداؤد) ۵

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر عرض

۱/ المرقاۃ ۱/۲۵۰ ۲/ المرقاۃ ۱/۲۵۰ ۳/ الکشاف ۱/۲۲۵ والمرقاۃ ۱/۲۵۰

۴/ المرقاۃ ۱/۲۵۰ ۵/ أخرجه ابو داؤد ۲/۲۲۲

کیا۔ (یارسول اللہ) میں اپنے اندر ایسا (برا) خیال پاتا ہوں کہ زبان سے اس کے اظہار کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا اللہ کا شکر ادا کرو جس نے اس خیال کو دوسرے کی حد تک رکھا۔ (ابوداؤد)

توضیح: احديث نفسی بالشیعی: "ای فی شان اللہ ووجودہ وصفاته" یہ حاجس غیر اختیاری ہے۔ حتمہ یعنی جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے پسند ہے لیکن اس دوسرے کا تصور کرنا گوارا نہیں اس میں ہوا جس سے شدید نفرت کا اظہار ہے جو ایمان کی پختگی کی علامت ہے۔

رد امروہ: ضمیر مجرور کا مرجع شیطان ہے تو مطلب یہ ہوا کہ الحمد للہ شیطان کا معاملہ اب صرف دوسرے کے اندر منحصر ہو کر رہ گیا پہلے تو وہ کفر میں مبتلا کرتا تھا اب ایمان کی مقاومت و مزاحمت سے صرف دوسرے ڈال سکتا ہے جو معاف ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کر سکتا ہے یعنی ہم و عزم کا معاملہ نہیں رہا بلکہ صرف قلبی خطرات رہے مع الاستقباح والکراہیۃ و ذاک صریح الایمان۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ امروہ کی ضمیر مجرور اس آنے والے آدمی کو راجع ہے یعنی الحمد للہ کہ اس رجل کا معاملہ دوسرے تک محدود ہو کر رہ گیا اور دوسرے معاف ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان کے وساوس اور اس کی تاثیر کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور یہ تغیر دوسرے شخص کی وجہ سے ہوتا ہے بڑا دوسرے یہ ہے کہ کفر کا القاء کرے جب اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور دوسرے زدہ شخص قوت ایمانی کے ساتھ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ تو شیطانی دوسرے اب عام فساد کی طرف لوٹ آتا ہے اور تہذیب منزل کو خراب کرتا ہے سیاست مدنیہ کو خراب کرتا ہے اگر وہ شخص اس حملہ سے بھی بچ جاتا ہے تو پھر خواطر کی صورت میں شیطان تاثیر ڈالتا رہتا ہے دل میں خیال آتا رہتا ہے اور یہ معاف ہے نفوس قدسیہ پر تو یہ اثر بھی نہیں ڈال سکتا ہے۔

اپنے اندر نیکی کی تحریک پر اللہ کا شکر ادا کرو

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَكُنَّةً بِابْنِ آدَمَ وَلِلْمَلِكِ لَكُنَّةً فَأَمَّا لَكُنَّةُ الشَّيْطَانِ فَيَا بَعْدُ بِالْكَذِبِ وَتَكْذِيبُ الْحَقِّ وَأَمَّا لَكُنَّةُ الْمَلِكِ فَيَا بَعْدُ بِالْخَيْرِ وَتَضْيِيقُ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذَلِكَ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللَّهِ فَلْيَحْمَدِ اللَّهَ وَمَنْ وَجَدَ الْآخِرَى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ثُمَّ قَرَأَ: الشَّيْطَانُ يَعِدُ كُفْرَ الْفَقْرِ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ

(رواہ الزیلعی وقال هذا حديثنا عن علي بن أبي طالب)

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پر ایک تصرف تو شیطان کا ہوا کرتا ہے۔ اور ایک تصرف فرشتہ کا۔ شیطان کا تصرف تو یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے

اور فرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا جو شخص (نیکی پر ابھارنے کی) یہ کیفیت اپنے اندر پائے تو اس کو بکھٹنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے (ہدایت) ہے۔ اس پر اس کو اللہ کا شکر بجالانا چاہیے۔ اور جو شخص دوسری کیفیت (یعنی شیطان کی دوسرا انداز) اپنے اندر پائے۔ تو اس کو چاہیے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ قرآنی آیت پڑھی (جس کا ترجمہ ہے) شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور گناہ کے لئے اکساتا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

توضیح: لمة: بالفتح من اللہ ماہ نزول خفیف کو کہتے ہیں اس سے مراد درجہ خاطر کا دوسرہ ہے جو غیر مستقرہ ہوتا ہے پھر یہ الہام اور یہ لہ اگر فرشتوں کی طرف سے ہو تو اس کو الہام کہتے ہیں اور شیطان کی طرف سے ہو تو دوسرہ ہے۔ لہ باہن آدمہ: یعنی اس جنس کے ساتھ مرد انسان ہے علماء نے لکھا ہے کہ الہام اور دوسرہ میں فرق حرام کھانے والے لوگ نہیں کر سکتے ہیں۔

فایعاد بالشیر: شر سے کفر و شرک اور دیگر معاصی مراد ہیں وعدہ اور ایعاد سے متعلق فراء غوی فرماتے ہیں کہ لفظ "وعدہ" خیر اور شر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "وعدتہ خیرا" "وعدتہ شرا" ہاں اگر مفعول بہ مذکور نہ ہو جیسے "وعدتہ" تو اس صورت میں وعدہ کا لفظ صرف خیر کے لئے بولا جاتا ہے۔

اور "ایعاد" اور "وعید" شر کے لئے استعمال ہوتے ہیں البتہ شاذ و نادر کہیں ایعاد خیر کے لئے بھی بولا جاتا ہے وعدہ ظانی کی جتنی وعیدیں ہیں یہ اس صورت میں ہیں کہ وعدہ کرنے والا وعدہ کرتے وقت مخالفت کا ارادہ رکھتا ہو۔

فلیحمد اللہ: یعنی اللہ کی نعمت اور اس قوت و کمال ایمان پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ فلیتعوذ یعنی بطور علاج اعوذ باللہ پڑھے۔

مطلب:

فرشتہ کے ابھارنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیکی کا جذبہ اس کی اہمیت اور اس پر انعام و اکرام کا شعور دل میں ڈالتا ہے کہ اللہ کے دین میں کامیابی ہے اور احکام الہی پر چلنے میں آخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے اگر کامیابی چاہتے ہو تو نیکی کے راستے پر آ جاؤ اور شیطان کے شر پر ابھارنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کو تاریک کر کے دکھاتا ہے عقائد میں شک ڈالتا ہے برائی کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے وہ انسان کو ذرا تارہتا ہے کہ نیکی کے راستے پر چلو گے تو ہمیشہ پریشانیوں اٹھاؤ گے گویا وہ کہتا ہے:

باہر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اہل تصوف علماء فرماتے ہیں کہ دل کے اندر دنی حصر میں چھوٹے چھوٹے سوراخ اور گوشت کے خانے بنے ہوئے ہیں یہی جگہیں خیر و شر کے پھینکنے کی جگہیں ہیں اس پر جو مخلوق قابض ہوئی پورا دل اور جسم اس کا ہے اس پر یا شیطان غالب آتا ہے یا فرشتہ کبھی یہ اور کبھی وہ اسی لئے قلب کے احوال بدلنے رہتے ہیں۔

شیطانی وسوسوں سے بچنے کے تین طریقے

﴿١٣﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتَّى يُقَالَ هَذَا خَلَقَ اللَّهُ الْخَلْقَ فَتَنَ اللَّهُ فَإِذَا قَالُوا ذَلِكَ فَقُولُوا إِنَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَهُ يَلَدٌ وَلَهُ يُولَدُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ثُمَّ لِيَسْتَفْلِحْ عَنْ بَسَارِهِ فَلَا تَأْكُلُوا لَيْسَ تَعْبُدُوا بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ.

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَتُسَنَّدُ كُنْ حَدِيثُ عَمْرِو بْنِ الْأَخْوَصِ فِي بَابِ عَظْمَةِ يَوْمِ النُّجُورِ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى) ۱

سُئِلَ عَنْهُ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ لوگ (پہلے تو مخلوقات وغیرہ کے بارے میں) پوچھا یا بھی کریں گے۔ اور پھر آخر میں یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ ساری مخلوقات کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو خود اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہ سوال اٹھایا جائے تو تم کہو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے۔ اور کوئی اس کا ہمسر (یعنی جوڑ) نہیں ہے۔ پھر اپنی یا انیس طرف تین بار متکا رو اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو (ابو داؤد) اور (صاحب مشکوٰۃ کہتے ہیں) کہ مردین احوں کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم اس کو ”خطبہ یوم النحر“ کے باب میں نقل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ (کیونکہ وہ روایت اسی باب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے)۔

توضیح: فقلوا اللہ الصمد: چونکہ یہ دوسرے توحید کے منافی تھا تو تنزیہ و تقدیس کے لئے اور تحمید و توحید کے لئے حکم ہوا کہ سورت اخلاص پڑھو۔ ۷

ثم لیستقل: یہ نصر ینصر سے ہے پھونک کے ساتھ خفیف تھوک شامل کر کے پھینکنے کو کہتے ہیں یہ شیطان سے اظہار نفرت کے لئے ہے اس کو قبیح اور مکروہ جاننے کے لئے ہوتا ہے جس سے وہ بھاگ جاتا ہے ویسے دل بائیں جانب ہے اور شیطان کا حملہ بھی بائیں جانب دل پر ہوتا ہے جبکہ فرشتہ دائیں جانب ہوتا ہے بہر حال توحید کا اعلان و اقرار شیطان سے نفرت کا عملی اظہار، اور عود کا وظیفہ، یہ تین چیزیں رساوس سے بچنے کے لئے علاج ہیں۔ ۷

الفصل الثالث

شیطانی وسوسوں سے چوکنٹا رہو

(١٤) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمَّا بَلَغَ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتَّى يَقُولُوا هَذَا اللَّهُ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِنْ أُمِّتَكَ لَا يَزَالُونَ يَقُولُونَ مَا كُنَّا مَا كُنَّا حَتَّى يَقُولُوا هَذَا اللَّهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ ۝

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ آپس میں پوچھا پاچھی کرتے رہیں گے (یعنی شیطانی دوسوں کی صورت میں ان کے اندر اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہیں گے) کہ جب ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا (تو) خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا؟ (بخاری اور مسلم کی روایت یوں ہے: انس رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کی امت کے لوگ (اگر شیطان کی دوسرے اندازی سے چونکا رہے تو) پہلے یوں کہیں گے کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ کیسے ہوا؟ (یعنی مخلوقات کے بارے میں تحقیق و تجسس کریں گے) اور پھر آخر میں یوں کہیں گے کہ تمام چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا؟

توضیح: یقولون ما کذا ما کذا: یہ الفاظ کثرت سوال سے کنایہ ہے یعنی کائنات کی چیزوں کے بارے میں سوال و تحقیق کرتے کرتے پھر اللہ کے بارے میں سوال کریں گے کہ جب سب چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟

شیطان بتدریج یہ سوال دلوں میں بطور دوسرہ ڈالتا ہے کہ جب اور چیزوں کا خالق ہے تو اللہ کے لئے بھی خالق ہونا چاہیے؟ یہ دوسرہ چونکہ کفر کی طرف لے جانے والا تھا اس لئے فرمایا کہ استغاذہ کرو اور آئندہ تصورات و خیالات اور اس قسم کے دساؤں کا سلسلہ بند کر دو تو جو دوسری طرف ہٹا لو کیونکہ بندہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خالق میں سوچے بلکہ اس کو چاہیے کہ مخلوق میں سوچا کرے، دساؤں سے بچنے کے لئے ذکر اللہ عمدہ تر نسخہ ہے۔

نماز کے دوران شیطان کی خلل اندازی

﴿۱﴾ وَعَنْ عُمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلَاتِي وَبَيْنَ قِرَاءَتِي يُلْتَبِسُهَا عَلَيَّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ذَا الشَّيْطَانِ يُقَالُ لَهُ خُزْبٌ فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللَّهِ مِنْهُ وَانْفُلْ عَلَى يَسَارِكَ فَلَا تَأْتِ فَتَعَلَّتْ ذَلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللَّهُ عَنِّي۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اور میری نماز میری قرأت کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے اور ان چیزوں میں شہدۃ الہیہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کو ”خزب“ کہا جاتا ہے۔ پس جب تمہیں اس کا احساس ہو (کہ شیطان دساؤں و شبہات میں جتا کرے گا) تو تم اس (شیطان مردود) سے خدا کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین دفعہ تھکا کر دو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق) میں نے اس طرح کیا تو خدا تعالیٰ نے مجھے اس کے دساؤں و شبہات سے محفوظ رکھا۔ (رواہ مسلم)

توضیح: بین و بین و بین: مراد یہ ہے کہ مجھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے اس کے دساؤں کی وجہ سے میں نماز شروع بھی نہیں کر سکتا ہوں یہ توجیہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی تشریح کے مطابق ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں تین دفعہ تھوکنے کا حکم

حدیث میں ہے اور مسلسل تین بار تھوکانا نماز میں جائز نہیں لہذا اس حدیث کا تعلق اس دوسرے سے ہے جو نماز شروع کرنے سے پہلے ہوتا ہو۔

وبین قرأتی: ایک مطلب یہ کہ قرأت شروع کرنے سے روکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ قرأت شروع کرنے کے بعد دل میں تشویش اور خلجان پیدا کرتا ہے تو قرأت میں گڑبڑ آ جاتی ہے اس تشویش و تشکیک کے پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں کہ جس کو شیطان استعمال کرتا ہے۔ اول یہ کہ وقت قرأت میں ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ آگے قرأت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تردد پیدا کر کے یہ کہتا ہے کہ جو پڑھا ہے وہ غلط ہے اب یہ شخص سوچتا ہے کہ میں نے جو پڑھا ہے وہ صحیح تھا یا غلط تھا۔

خنزب: لغت میں خنزب جری علی الشر کے معنی میں ہے کسرۃ خاورزا کے ساتھ "خُزْزُوب" ہے اور دونوں کا فترہ بھی ہے "خُزْزُوب"۔

سوال: شبہ یہ ہے کہ حالت نماز و قرأت میں تھکانے اور تعوذ کا کیسے حکم ہوا جب کہ یہ منافی صلوٰۃ ہے؟

پہلا جواب: یہ حکم اس شخص کا ہے جس نے ابھی نماز شروع نہیں کی ہے۔

دوسرا جواب: یہ کہ یہ حکم اس وقت تھا جب نماز میں باتیں کرنا جائز تھیں پھر یہ منسوخ و موقوف ہو گیا۔

تیسرا جواب: یہ کہ یہ حکم اس نمازی کو ہے جو نماز سے فارغ ہو چکا ہے کہ شیطان تم سے جس طرح کھیل چکا ہے وہ ظاہر ہے اب آئندہ کی حفاظت کرو اور دوسری نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔

دوسرے کا خیال نہ کرو نماز پڑھو

﴿۱۶﴾ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ فَقَالَ إِنِّي أَهْمُ فِي صَلَاتِي فَيَكْبُرُ ذَلِكَ عَنِّي فَقَالَ لَهُ امْضِ فِي صَلَاتِكَ فَإِنَّهُ لَن يَذْهَبَ ذَلِكَ عَنْكَ حَتَّى تَنْصَرِفَ وَأَنْتَ تَقُولُ مَا أَهَمُّكَ صَلَاتِي (رواۃ مالک)

ترجمہ: اور حضرت قاسم بن محمد سے ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے (یعنی کبھی تو یہ شک ہوتا ہے کہ میری نماز درست ادا نہیں ہوئی کبھی یہ وہم ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھنے سے رو گئی ہے) اس کی وجہ سے مجھے گرانی ہوتی ہے؟ انہوں نے فرمایا (تم اس طرح کے خیال پر دھیان نہ دو اور) اپنی نماز پوری کر داس لئے کہ وہ (شیطان) تم سے جب ہی دور ہوگا کہ تم اپنی نماز پوری کر لو اور کہو کہ ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی۔ (مالک)

توضیح: انی اہم فی صلوٰۃ: اس سے مراد نماز میں وہم ہے کہ آیا ایک رکعت ہوئی یا دو ہو کیں نماز کم ہوئی یا زیادہ ہو گئی۔

فیکثر ذالک علی: ایک نسخہ میں کبیر بھی ہے اول نسخہ اور تلفظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ صورت کثرت آتی ہے۔ دوسرے کا

مطلب یہ کہ مجھ پر یہ کیفیت بڑی گراں گزرتی ہے اور بہت بھاری محسوس ہوتی ہے۔ لہذا
 فقال امض فی صلوٰتک: یہ اسلوب حکیم کے طور پر جواب ہے کہ تم اپنی نماز کو جاری رکھو یہ دس اوہام اس وقت
 تک ختم نہیں ہوں گے جب تک تم نماز سے فارغ ہو کر شیطان سے یہ خطاب نہ کرو گے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ میری نماز نہیں
 ہوئی تو سمجھتے رہو، ٹھیک ہے میری نماز نہیں ہوئی مگر میں دوبارہ پڑھوں گا بھی نہیں اس عزم سے دوسرے دور ہوں گے۔ لہذا
 خلاصہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کی نمازوں میں یہی فرق ہے کہ ان کی نمازوں میں دوسرے
 نہیں آتے اور ہماری نمازوں میں دوسرے آتے ہیں اس سے آپ رضی اللہ عنہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مسلمان کا
 عمل زندہ و تابندہ اور قانونی ہے جس کو خراب کرنے کے لئے ابلیس دوسرے ڈالتا ہے اور یہودیوں کا عمل کسی کام کا نہیں
 تو اس میں دوسرے ڈال کر شیطان کیا خرابی لائے گا عقلاء کہتے ہیں کہ جس درخت میں پھل لگے ہوں لوگ اسی پر پتھر
 مارتے ہیں خالی درخت کو عقلمند پتھر نہیں مارا کرتے شیطان بھی خالی اور ویران گلیوں میں محنت ضائع نہیں کرتا بلکہ
 جہاں ایمان ہے وہاں اس کا حملہ ہوتا ہے۔

قاسم بن محمد رحمہ اللہ: سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے ہیں آپ جلیل القدر تابعی ہیں ۱۰۱ھ میں
 ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی آپ مدینہ منورہ کے مشہور سات فقہاء میں سے تھے ان فقہاء سبعہ کے نام یہ ہیں شعر
 ملاحظہ ہو۔

الا کل من لا یقتدی بأجمۃ فقسمتہ ضیضی من الحقی خارجه
 لخذ ہم عبید اللہ عروۃ قاسم سعید ابی بکر سلیمان خارجه



باب الایمان بالقدر

تقدیر کا بیان

تقدیر کا مفہوم:

”القدر“: اہل متحرک بھی ہے اور ساکن بھی ہے یہ کسی چیز کا اندازہ کرنے اور کسی چیز میں تنگی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ”انا کل شئی خلقناہ بقدر“ یہ اسی اندازے اور تقدیر کی طرف اشارہ ہے تو لغت میں تقدیر اندازہ کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں تقدیر سے متعلق علماء کی تعبیرات مختلف ہیں چنانچہ شرح فقہ اکبر میں ہے۔ ۱۔

① ”القدر تعین کل مخلوق بمرتبته التي توجد من حسن وقبح ونفع وضرر“۔

(شرح فقہ اکبر ص ۱۰)

”یعنی تقدیر ہر مخلوق کی ہر حیثیت و صفت کے تعین کا نام ہے خواہ وہ نفع یا ضرر کی صفت ہو یا حسن اور قباح کی ہو“۔

② کچھ دیگر علماء نے اس طرح کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش عالم سے پہلے جن چیزوں کا اندازہ فرمایا ہے اور لوح محفوظ میں ان کو مقرر کیا ہے اسی کے مطابق اس کا تفصیلی وجود ظاہر ہوگا یہی تقدیر ہے، اس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے کسی چیز کا اندازہ نہ ہوا ہو اور تقدیر کی نکلت نہ ہوئی ہو اور تفصیل میں وہ چیز آجائے پس جو چیزیں اس کائنات میں تفصیلاً جاری ہیں وہ پہلے سے تقدیر میں عند اللہ معین و مقرر ہیں آپ یوں سمجھیں کہ مثلاً زید کے تفصیلی حالات پیدائش سے لے کر وفات تک اللہ تعالیٰ کے علم میں آ گئے، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا، اب زید کے پیدا ہونے کے بعد اس کی تمام حرکات و سکنات اسی اجمالی لکھت کے مطابق ہوں گی، لیکن تقدیر نے اس کو مجبور نہیں کیا بلکہ اسے اختیار دیا ہے اس آزادانہ اختیار کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا اور اللہ کے علم میں آ گیا اسی کے مطابق اس کے تفصیلی حالات ظاہر ہوں گے۔

③ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یہ تعریف کی ہے ”هو ما يقدره الله من القضاء“۔ ۲۔

تقدیر پر ایمان کا مطلب:

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے اور وہ اس طرح کہ بندہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے خواہ وہ عمل خیر کا ہو یا شر کا ہو، اور یہ سب کچھ بندوں کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اب جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے ارادے سے ہو رہا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کفر سے ناراض ہوتا ہے اس لئے کفر و معصیت کے لئے سزا کا وعدہ کیا ہے اور ایمان و طاعت پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ (مرقاۃ) ۳۔

منفرت جعفر صادق علیہ السلام کا مقولہ ہے ”لا جبر ولا قدر ولكن الامر بين الامرین“۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: **لَمَّا يَوْمَ مَن بَقْدَرُهُ مَن خَيْرُ وَشَرُّ فَقَدَا كَفَرًا**۔

تقدیر کیا چیز ہے؟

تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر اللہ نے کسی مقرب فرشتہ یا کسی مقرب رسول کو بھی مطلع نہیں کیا ہے لہذا اس میں عقلی بحث و تجسس جائز نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ایک گروہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے تحت جنت کے لئے بنادیا اور دوسرے گروہ کو اپنے عدل کے تحت دوزخ کے لئے بنادیا دونوں کو اختیار دیا کسی کو مجبور نہیں کیا، ایک شخص نے حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ سے تقدیر جاننے کے لئے پوچھا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔

”طریق مظلّم فلا تسلکھ“ ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ جاؤ اس نے پھر سوال کیا آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”بھر عمیق فلا تلجھ“ ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو، اس شخص نے پھر سوال کیا آپ نے فرمایا: لا

”سو اللہ قد خفی علیک فلا تفشھ“ اللہ تعالیٰ کا ایک خفی راز ہے اس کو فاش کرنے کی کوشش نہ کرو کسی نے سچ کہا ہے۔

کیفۃ المرأ لیس المرأ یدوکھا فکیف کیفیۃ الجبار فی القدر

”کیفیتِ عورت: ایک انسان کی کیفیت کو دوسرا انسان نہیں پاسکتا تو قدیم بادشاہ قہار و جبار کے رازوں کو انسان کیسے پاسکے گا؟“
اس موضوع سے متعلق دو شعر ملاحظہ ہو۔

ہزار کلئے باریک تر ز مواین جااست نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

نہ ہر جائے مرکب توں تاخشن کہ جاہا سپر باید انداختن

منکرین تقدیر کا فتنہ کب سے شروع ہوا؟

دور صحابہ میں کسی نے تقدیر کا انکار نہیں کیا اور نہ کسی کو اس میں تردد ہوا، صحابہ کرام کے بالکل آخری دور میں بعض لوگوں نے اس مسئلہ میں بحثیں شروع کیں، بصرہ میں ایک شخص معبد جہنی تھا اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کو مستقبل کے امور کا علم اس کے ظہور سے پہلے نہیں ہوتا ہے جب کوئی عمل ظاہر ہو جاتا ہے تب اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے اس کی تعبیر ان کے ہاں یہ تھی ”الامر ائف ای مستأئف“ یعنی پہلے سے کوئی نظام لکھت یا لوح محفوظ وغیرہ نہیں ہے جو ہو جاتا ہے اسی سے تقدیر بنتی ہے اس شخص کا رد خود صحابہ کرام میں سے عبد اللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا، یہ عنوان چونکہ غلط بلکہ گمراہ کن تھا اس لئے اس پر تردید آنے کے بعد اس عنوان سے یہ مسئلہ آگے نہ چل سکا، ہاں معتزلہ نے اس کو ایک اور رنگ دیا اور اس کو آگے چلایا اور وہ عنوان یہ تھا کہ آیا بندوں میں اپنے افعال کے اختیار کرنے کی قدرت ہے یا نہیں یعنی بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں چنانچہ ”خلق افعال العباد“ کے عنوان سے انکار تقدیر کا مسئلہ خفاء بنو عباس کے دور میں بہت آگے بڑھ گیا اور

اس کے اصول و فروع پر بہت جھگڑے ہوئے، اسی میں سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور معتزلہ حکام کا وہ بڑا مشہور محرکہ بھی ہے جو کئی سالوں تک آزمائش کا میدان بنا رہا، معبد جہنمی کا استاذ سوسن یہودی تھا جس نے تقدیر کا یہ جھگڑا کھڑا کیا، پھر معبد جہنمی اور اس کے بعد عیلام نامی شخص نے اس عقیدہ کو عراق اور حجاز میں پھیلا دیا۔ عمرو بن عبد نے جب اس مسئلہ کو اچھا لا تو حجاج بن یوسف نے اس کو قتل کیا۔

تقدیر و قضاء میں کیا فرق ہے؟؟

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قضاء و قدر کے معنی مشترک ہیں ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا ہے اور کبھی کبھی مختلف معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں وہ اس طرح کہ قدر تو اللہ تعالیٰ کا وہ ازلی اجمالی فیصلہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں متعین ہوتا ہے اور قضاء اس کا خارجی تفصیلی خاکہ ہوتا ہے یا اس کی خارجی تکمیل ہوتی ہے جیسے "فقضاءھن سبع سموات" یہ سات آسمان اپنے وجود کے اعتبار سے اسی اجمالی تقدیر کے لئے خارجی تفصیلی خاکے ہیں اور بعض مرتبہ قضاء سے مراد علم اجمالی ازلی ہوتا ہے اور قدر سے مراد خارج میں اس کا تفصیلی وجود ہوتا ہے۔

بعض عارفین نے اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ جیسے ایک مصور انجینئر کے ذہن میں ایک خاکہ ہوتا ہے پھر وہ خارج میں اس کا ایک نقشہ بناتا ہے بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ایک صورت معبودہ ہے اس کو قدر کہتے ہیں اسی کے مطابق خارج میں ایک صورت آتی ہے وہ قضاء ہے اس قضاء کے تابع ہو کر بندہ کا قدر کے مطابق عمل کرنا کسب کہلاتا ہے۔ مثال اس طرح ہے کہ ایک مصور انجینئر اپنی صورت ذہنیہ کے مطابق کاغذ پینل سے ایک خاکہ بناتا ہے تلخیز اس خاکہ میں خطوط کا لحاظ کرتے ہوئے رنگ بھرتا ہے تو صورت ذہنیہ قدر ہے خارج میں اس کا خاکہ قضاء ہے اور خاکہ میں رعایت کے ساتھ رنگ بھرتا عہد کا کسب ہے تو جس طرح یہ رنگ بھرتا صورت ذہنیہ کے عین مطابق ہے اسی طرح بندہ کا کسب تقدیر الہی کے عین مطابق ہے اور بندہ تقدیر کے خلاف نہیں کر سکتا، خلاصہ یہ کہ مکان بنانے سے پہلے جو خاکہ ذہن میں آتا ہے یہ بمنزلہ قدر ہے اور اسی نقشہ کے مطابق جو مکان تیار ہو کر موجود فی الخارج ہوا یہ قضاء ہے۔ تاہم اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ قضاء و قدر میں ترادف ہے دونوں ایک ہی ہیں۔

مسئلہ تقدیر میں مختلف مذاہب

تقدیر کے مسئلہ میں کل تین مذاہب ہیں ایک اہل حق کا اور دواہل باطل کے ہیں، اہل حق اہل السنۃ والجماعہ ہیں اور اہل باطل جبریہ اور معتزلہ ہیں تفصیل اس طرح ہے:

۱ جبریہ کا مذہب:

تقدیر کے متعلق جبریہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض جماد کی طرح ہے اس کے افعال کا اعتبار نہیں اور

تقدیر کے سامنے یہ بے بس اور بے حس پتھر ہے یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں تقدیر کا ذکر ہے جیسے
وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔

جیسا کہ آئی ہے کیونکہ جب انسان مجبور محض ہے اور اس کو اپنے فعل کا کچھ بھی اختیار نہیں بلکہ جو کچھ کیا وہ اللہ نے کیا تو پھر انسان کو جزا اور سزا کے محکمہ میں محسوس کر لانا کہاں کا انصاف ہے تو جس مذہب اور عقیدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت لازم آتی ہے اس کے باطل ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

جبریہ کے مذہب کے باطل ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ہر عقلمند شخص اپنے وجدان سے اس بات کو سمجھتا ہے کہ افعال اختیاری اور غیر اختیاری میں فرق ہے مثلاً وجدان یہ فیصلہ کرتی ہے کہ حرکت ارتعاش یعنی ہاتھ کا شل ہو کر حرکت کرنا غیر اختیاری ہے اور حرکت بطش یعنی قصد کر کے حرکت کرنا اختیاری ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان اپنے افعال میں ایک حد تک با اختیار ہے اور ایک حد سے آگے بے اختیار ہے جبریہ کا انسان کو بالکل مجبور و معذور اور بے بس و بے حس کہنا منکرات بھی ہے اور حماقت بھی ہے اگر یہ اس طرح مجبور تھا تو اس کو افعال کرنے نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم کیوں دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کے شخص سے فرمایا کہ یا ابوہریرہ! اٹھاؤ اور کھڑے رہو اس نے پاؤں اٹھایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا دوسرا پاؤں بھی اٹھاؤ اور کھڑے رہو، اس نے: یا رسول اللہ! میں اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بس انسان اتنا با اختیار ہے اور اتنا بے اختیار ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ جس حد تک انسان با اختیار ہو سکتا ہے اسی حد تک یہ مکلف اور جوابدہ ہے اور جہاں سے آگے نہیں جا سکتا ہے وہاں کا جوابدہ نہیں۔

نیز اختیار اور بے اختیار کا فیصلہ تو ایک بے عقل کتا بھی کرتا ہے دیکھو جب کوئی انسان اس کو پتھر مارتا ہے تو وہ پتھر کو چھوڑ کر مارنے والے انسان کے پیچھے دوڑتا بھونکتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پتھر بے جان کا کیا قصور ہے اصل قصور تو اس با اختیار انسان کا ہے جو اپنے فعل سے پتھر مارتا ہے۔

اختیار کس طرح ہے؟

جب یہ معلوم ہوا کہ عقل سلیم اور وجدان صحیح کا اہل فیصلہ ہے اور دنیا کا یہ مشاہدہ ہے کہ بعض افعال اختیاری بھی ہیں تو وہ اختیار کس طرح ہے حالانکہ ”وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ آیت بتا رہی ہے کہ انسان کا ارادہ نہیں ہے سب کچھ مشیت الہی کے تحت چل رہا ہے۔

جیسا کہ آئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو توجیہ الارادہ کا اختیار دیا گیا ہے یعنی جب وہ ارادہ کرتا ہے اور توجہ کرتا ہے تو مشیت الہی سے اس کی موافقت آتی ہے اس توجہ اور اس ارادہ میں یہ انسان با اختیار ہے اور یہی اس کے لئے قدرت متوہمہ ہے اور اسی قدرت متوہمہ پر مواخذہ ہوتا ہے یعنی یہ انسان جب کوئی فعل کرنا یا نہ کرنا چاہتا ہے اور قدم اٹھاتا ہے تو

کوئی رکاوٹ نہیں انسان حرکت ارادی کرتا ہے اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق آتی ہے تو اس میں یہ مختار ہے مجبور نہیں ہے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہے ہاں جو کچھ کرتا ہے اس کی نکست پہلے سے ہے کیونکہ اللہ کا علم ازلی ہے اس نے اس شخص کے اس باختیار فعل کو پہلے معلوم کیا اور پھر لکھا اب جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے وہ اسی نکست کے مطابق ہے اس کی ایک مثال یہ سمجھ لیں کہ ایک ڈاکٹر نے کسی مریض سے کہہ دیا کہ فلاں چیز کھاؤ گے تو مر جاؤ گے اس شخص نے وہ چیز کھالی اور مر گیا تو ڈاکٹر نے علامات اجمالیہ وجود یہ سے بتایا تھا کہ مرد گے اب جو مر گیا تو ڈاکٹر کے قول سے تو نہیں مرانہ ڈاکٹر کے لکھنے سے مرالکہ وہ تو اپنے اس فعل سے مرابہ جس سے ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔

بعینہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم میں جو اجمال ہے جس کا نام تقدیر ہے وہ پہلے سے موجود ہے خارج میں پایا جانے والا فعل بندہ کا اپنا فعل ہے یہ بے شک تقدیر کے موافق ہے لیکن یہ شخص تقدیر کے ہاتھوں مجبور نہیں بلکہ تقدیر کی نکست سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے احوال کو آزاد ماحول میں دیکھ کر پھر لکھ دیا۔ چنانچہ اب جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔

اس کی دوسری مثال اس طرح ہے کہ مثلاً ایک ریلوے ٹائم ٹیبل ہے جس میں لکھا ہے کہ فلاں گاڑی فلاں ٹائم فلاں جگہ سے چلے گی فلاں ڈرامیور ہوگا فلاں جگہ اتنی دیر کے گی فلاں اسٹیشن پر فلاں وقت پہنچے گی اتنا ایجنٹ لکھائے گی وغیرہ وغیرہ اس طرح پورے دن اور پورے سفر کا ٹائم ٹیبل تیار ہو کر سامنے آ گیا اور مرتب ہو کر موجود ہوا تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ٹھیک اسی ٹائم ٹیبل کے مطابق انڈس ہدایات پر چلتی ہے لیکن یہ ٹائم ٹیبل اس گاڑی کو نہیں چلاتا بلکہ ڈرامیور یا گاڑی کا سسٹم ہے جس سے وہ چلتی ہے بالکل اسی طرح لوح محفوظ ہے جس پر انسان کی تقدیر لکھی ہوئی ہے وہ انسان کی زندگی کا ٹائم ٹیبل ہے (جس کا نام قدر و تقدیر ہے) جس کے مطابق انسان کی زندگی کی یہ گاڑی اس کے اپنے کسب و اختیار سے سفر کر رہی ہے فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ محیط ہے تو انسانی گاڑی اس علم و تقدیر سے مخالف نہیں ہو سکتی اور ریل گاڑی کے پروگرام میں مخالف و غیر آسکتا ہے کبھی آہستہ کبھی کیسا کبھی کیسا۔

ان تشریحات و توضیحات کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جبر یہ کا مذہب باطل محض ہے اور انہوں نے جس آیت سے استدلال کیا ہے اہل سنت و الجماعہ فرماتے ہیں کہ اس میں انسان کے لئے مستقل اختیار کی نفی ہے جیسا کہ معتزلہ انسان کے لئے مستقل اختیار کے قائل ہیں اس آیت میں اس ضعیف غیر مستقل محدود اختیار کی نفی نہیں ہوتی ہے جو دیگر نصوص اور عقل سلیم اور وجدان صحیح سے انسان کو حاصل ہے۔

۲ معتزلہ قدر یہ کا مذہب:

ان کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے کسی تقدیر کا پابند نہیں بلکہ اپنے افعال کا انسان خود خالق ہے پہلے سے کوئی نکست نہیں ورنہ مواخذہ محال ہو جائے گا۔

یہ مذہب بھی صریح المہطلان ہے اور جبر یہ کی طرح یہ لوگ بھی اہل باطل ہیں ان کا یہ مذہب جبر یہ کی ضد ہے ان کے مذہب

کے باطل ہونے پر بہت نصوص موجود ہیں چند آیات ملاحظہ ہوں۔

① "وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ"۔ لے (تکوین)

اس سے واضح معلوم ہوا کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں ہے۔

② "إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ"۔ لے

اس سے تقدیر کا ثبوت ہوتا ہے۔

③ "قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ"۔ لے

اس سے بھی تقدیر کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

پہلا کجگوشیہ: اہل حق نے معتزلہ کو کئی جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب یہ کہ تمہارا عقیدہ صریح نصوص کے خلاف ہے۔

دوسرا کجگوشیہ: یہ کہ تمہارے عقیدے کے پیش نظر انسانی تخلیقات اللہ تعالیٰ کی تخلیقات سے زیادہ ہو جائیں گی اور یہ باطل ہے لہذا تمہارا عقیدہ باطل ہے کیونکہ طاعات سے معصیات زیادہ ہیں تو انسانی تخلیقات زیادہ ہو جائیں گی۔

تیسرا کجگوشیہ: یہ کہ تمہارے عقیدہ سے لازم آتا ہے کہ کچھ معاصی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر موجود ہو رہے ہیں جو موجب عجز یا نقص ہے حالانکہ معاصی طاعات پر غالب ہیں تو اکثری افعال اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر آگئے اور یہ عقیدہ غلط ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ معتزلہ اس بات سے بچنا چاہتے ہیں کہ "شہر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے تو عجیب بات یہ ہے کہ گناہ کی طرف نسبت سے بچنے کی کوشش میں صریح شرک میں پڑ گئے اور کہا کہ خالق خود انسان ہے یہ لوگ اس مثال کے مصداق بن گئے۔

"فَرَمَ مِنَ الْمَطَرِ وَوَقَفَ تَحْتَ الْمِيزَابِ" ہم الزامی جواب میں کہتے ہیں کہ ابلیس شر اور شرارت کا پتلا ہے اس کو کس نے پیدا کیا؟ کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کا کوئی اور خالق ہے جس نے اس کو پیدا کیا؟ تو تخلیق شرک کمال ہے جیسا کہ تخلیق خیر کمال ہے ہاں کسب شر مذموم ہے۔

تاہم عموماً شر کی نسبت شیطان کی طرف کی جاتی ہے یا نفس کی طرف نسبت ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی نہ ہو جائے۔

دلچسپ مکالمہ:

عبدالجبار ہمدانی معتزلی، ابواسحاق اسفرائینی کی مجلس میں آکھڑے ہوئے اور کہا "سبحان من تنزه عن الفحشاء" یعنی

گناہ کی نسبت اللہ کے حق میں لٹھا ہے اس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ استاذ اسفرائی نے فرمایا "سبحان من لا یجری فی ملکہ الا ما یشاء"۔ ہمدانی نے کہا "ایشاء رہنا ان یعصی" استاذ نے کہا "ایعصی رہنا قسرا"۔ فہمت، ہمدانی کا مطلب یہ تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کی نافرمانی کی جائے تو استاذ اسفرائی نے جواب میں فرمایا کہ کیا یہ اللہ کی نافرمانی جبری طور پر ہوتی ہے؟ اس پر ہمدانی لا جواب ہو گئے۔

قرآن کریم کی کئی آیات سے تقدیر کا ثبوت ملتا ہے جس سے واضح طور پر معتزلہ کا مذہب باطل ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اَنَا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ لَّهِمْ حَوَالِ اللَّهِ مَا يَشَاءُ وَيُشِيتُ وَعَدَّةُ أَمْرِ الْكِتَابِ

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزَّيْرِ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌّ

ان واضح آیات اور احادیث کی تصریحات کے بعد معتزلہ کا تقدیر سے انکار محض خرافات اور عقل کا نقہ ان ہے۔

”شر“ کی تخلیق میں حکمت:

تمام عقلاء و حکماء اس پر متفق ہیں کہ دنیوی بادشاہ میں دو صفات کا موجود ہونا ضروری ہے ایک صفت لطف و کرم اور دوسری صفت قہر و جلال، اول اس لئے کہ انہوں پر رحم کرے الطاف و مہربانیاں کرے اگر یہ صفت نہیں تو ایسے بخل اور کنجوس کو کون بادشاہ بنائے گا اور اس کی بادشاہت کو کون تسلیم کرے گا ایسا شخص اگر بادشاہ بن بھی گیا تو یہ نقص اور عیب جلد ہی اس سے بادشاہت چھین لے گا۔ دوم صفت قہر بھی ضروری ہے تاکہ لوگ بے جا تعدی و تجاوز اور بے جا عزت نہ کریں کسی نے کہا ہے:

لطف سجن دم بدم قہر سجن گاہ گاہ یہ بھی سجن واہ واہ وہ بھی سجن واہ واہ

اللہ تبارک و تعالیٰ بادشاہ علی الاطلاق ہے اس کے لطف و کرم کی صفت کے مظہر فرشتے ہیں اور قہر و غضب کا مظہر شیطان ہے اسی طرح انسانوں میں ابرار صفت لطف و کرم کے مظہر ہیں اور فجار صفت قہر کے مظہر ہیں یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ دونوں صفات کا ظہور ہو سکے، اسی طرح ایک ایسی جگہ بھی ہونی چاہیے جہاں صفت لطف و کرم اور جمال کا ظہور ہو اور وہ جگہ جنت ہے۔ ایسے ہی ایک ایسی جگہ بھی ہونی چاہیے جہاں صفت قہر و غضب کا ظہور ہو اور وہ جگہ دوزخ ہے۔ تو جنت اور دوزخ کا وجود، ابرار و اشرار کا وجود، خیر اور شر کا وجود، شہنشاہ مطلق کے لئے ضروری ہے تاکہ دنیا کی گاڑی آزمائش کے میدان میں خیر اور شر کی دو پٹریوں پر رواں دواں رہے اور حق و باطل کا مقابلہ گرم ہو کیونکہ

سقیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار ابو لہی

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ایک ہے تخلیق اور دوسرا ہے کسب، تخلیق شرمحمد ہے اور کسب شرمذموم ہے دونوں کے جداگانہ احکام ہیں مگر دونوں کی تخلیق تو کمال ہے مجموعہ عالم کی ترتیب میں حسن تب ہی آتا ہے جب اس میں خیر و شر کے دونوں رنگ موجود ہوں۔

گہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے
بہر حال بادشاہ علی الاطلاق رب تعالیٰ کی ہنوں مختلفہ اور صفات متنوعہ کا تقاضا تھا کہ خیر بھی ہو اور شر بھی ہو اور بھی ہوں اور
اشرار بھی ہوں جنت بھی ہو اور دوزخ بھی ہو اور ہر ایک کے لئے افراد بھی ہوں۔

در کار خانہ عشق از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد گر بو لہب نہ باشد

تنبیہ:

تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تقدیر معلق ہے اور دوسری تقدیر مبرم ہے تقدیر معلق میں تغیر آتا ہے مگر تقدیر مبرم میں کبھی فرق
اور تغیر نہیں آتا، ان دونوں کو اجل معلق اور اجل مبرم بھی کہتے ہیں۔

اجل معلق کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں ایک فیصلہ لکھ دیا ہو مگر اس کے ساتھ کچھ شرائط بھی رکھ دیں مثلاً یہ لکھا کہ
فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال ہوگی لیکن اگر اس نے والدین کی خدمت کی یا متقی پرہیزگار رہا تو اس کی عمر اسی سال ہو جائے گی
قسم دوم اجل مبرم ہے یہ اللہ تعالیٰ کا وہ اہل فیصلہ ہے جس میں جو کچھ مقرر اور متعین ہے اس میں کبھی بھی تغیر ممکن نہیں جو فیصلہ
تقدیر مبرم میں ہو چکا ہے وہی ہو کر رہے گا۔

۱۰۱۰ھ

الفصل الاول

کائنات کی تخلیق سے پہلے تقدیر لکھی گئی

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَتَبَ اللَّهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِمِائَتِ سِتِّينَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے آسمان اور
زمین کو پیدا کرنے سے پہلے مائت و ستین ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے اور فرمایا" (اس وقت) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔
(مسلم)

توضیح: "کتب اللہ" یہ کلمت کسی دیوان خاص میں تھی ورنہ تقدیر تو اللہ تعالیٰ کے علم ازلٰی ابدی اجمالی کا نام ہے جو
وقت کا پابند نہیں نیز اس کلمت سے پہلے اللہ تعالیٰ کا علم آئندہ حالات پر محیط تھا وہ علام الغیوب ہے اس نے تفصیلی حالات
کے دیکھنے کے بعد یہ اجمالی خاکہ لکھا۔

پھر اس کتاب کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے لکھا بلکہ قلم کو لکھنے کا حکم دیا بعض نے "کتب" کا مطلب یہ لیا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے تقدیر مقرر فرمادی عربی لفظ میں کتب بمعنی تعین وقرر آتا ہے۔ ۱۔
 "مخمسین الف سنة" سوال یہ ہے کہ بعض روایات میں چالیس ہزار سال کا ذکر ہے جو بظاہر اس حدیث سے متعارض ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق مختلف امور کے اعتبار سے ہے بعض امور کو پچاس ہزار سال اور بعض کو چالیس ہزار سال پہلے لکھا گیا ہے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت زمین و آسمان نہیں تھے زمانہ نہیں تھا تو پچاس ہزار سال کا تعین کیسے ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام تخمینہ کے طور پر ہے ایک اندازہ ہے کہ اگر زمانہ ہوتا تو اتنا وقت ہو سکتا تھا۔ ۲۔
 "وكان عرشه على السماء" علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عرش پانی پر رکھا ہوا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے درمیان حائل نہیں تھا اس سے اللہ کی ایک قدرت بتلانا مقصود ہے کہ اوپر عرش ہے نیچے پانی ہے اور پانی کے نیچے ہوا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر قائم ہے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں دنیا کا پانی مراد نہیں بلکہ عرش کے نیچے کا دریا مراد ہے جس سے بارش برسی ہے۔ ۳۔
 بعض کتابوں اور حواشی میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک موتی بنایا پھر بیت کی نگاہ اس پر ڈال دی وہ پانی ہو گیا اب نیچے صرف پانی تھا اور اوپر عرش تھا "وكان عرشه على السماء" کا منظر تھا پھر اللہ تعالیٰ نے غضب کی نگاہ سے اس پانی کو دیکھا تو پانی ابل کر خشک ہو گیا نیچے کچھ تھمت رہ گئی اور اوپر ایک دھواں اٹھا اسی دھوئیں سے بعد میں آسمان بنایا گیا ارشاد ہے "ثم استوى الى السماء وهي دخان" ۴۔ پھر نیچے اس تھمت سے زمین پھیلا دی گئی ارشاد عالی ہے "والارض بعد ذلك دحاها" ۵۔

ہر چیز تقدیر کے تحت ہے

﴿٢٦﴾ وَعَنِ ابْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجُوزُ وَالْكُنْثَى - (رواهُ مُسْلِمٌ)

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے یہاں تک کہ دانائی اور نادانی (مسلم)

توضیح: اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ ہوشیاری اور کمزوری کی جو صفات ہیں یہ بھی تقدیر کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں بلکہ قضاء و قدر انسان کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے صرف جنت و دوزخ تک تقدیر محدود نہیں بلکہ دنیا و آخرت کے تمام فیصلے اور تمام معاملات اسی قضا و قدر کے تحت ہیں۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ یہاں حدیث میں "عجز" کے مقابل "کیس" کا لفظ آیا ہے حالانکہ قاعدہ کے مطابق عجز کا

مقابل ”قدرت“ ہے اور ”کیس“ کا مقابل ”بلادۃ“ ہے تو یہاں ایسا کیوں ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں فنِ بلاغت کے اصول کے تحت احد الضدین میں سے ایک کو ذکر کیا ہے اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑا گیا ہے تو یہاں صنعت احتیاط سے کام لیا گیا ہے کہ العجز کو ذکر کر کے قدرت کو چھوڑا گیا اور الکیس کو ذکر کر کے بلادت کو چھوڑ دیا گیا ہے مراد احاطہ اور استغراق ہے عبارت اس طرح ہے العجز والقدرة او الکیس والبلادة من قدرة الله۔

یعنی ضعف و قدرت و کثرت و کمات سب اللہ کے ہاں مقدر ہیں اور اسی کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں حافظ تور بشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ العجز سے مراد عاجز و کمزور اور ضعیف ہے۔ اور الکیس سے مراد عقلمند آدمی ہے یعنی جو کوئی کمزور فی العقل والرائے ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے تقدیر کے تحت پیدا کیا اور جو الکیس اور چالاک و ہوشیار مکار ہے اس کو بھی تقدیر کے تحت پیدا کیا گیا ہے کسی کمزور یا طاقت ور میں اپنی کوئی طاقت نہیں سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

تقدیر میں دونوں کی بحث

(۳۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اخْتَجَّ آدَمُ وَ مُوسَى عِنْدَ رَبِّهِمَا فَخَجَّ آدَمُ مُوسَى قَالَ مُوسَى أَنْتَ الَّذِي خَلَقَكَ اللَّهُ بِيَدَيْهِ وَتَفَخَّ فِينَا مِنْ رُوحِهِ وَأَشْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتُهُ وَأَسْكَنَكَ فِي جَنَّتِهِ ثُمَّ أَهْبَطَكَ النَّاسَ بِخَطِيئَتِكَ إِلَى الْأَرْضِ قَالَ آدَمُ أَنْتَ مُوسَى الَّذِي اصْطَفَاكَ اللَّهُ بِرِسَالَتِهِ وَبِكَلَامِهِ وَأَعْطَاكَ الْأَنْوَاعَ فِيهَا بَيْنَيَا كُلِّ شَيْءٍ وَفَرَّقَكَ بَيْنَنَا فَبِكُمْ وَجَدْتَ اللَّهُ كَتَبَ التَّوْرَةَ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ قَالَ مُوسَى: يَا رَبِّ بَعِثْ عَلَيْنَا قَوْمًا قَالَ آدَمُ: فَهَلْ وَجَدْتَ فِيهَا وَعَظِيَ آدَمُ رَبَّهُ فَعَوَّى قَالَ نَعَمْ قَالَ أَفَتَلَوْنِي عَلَى أَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيَّ أَنْ أَعْمَلَهُ قَبْلَ أَنْ يُخْلَقَ يَا رَبِّ بَعِثْ سَنَةً قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَخَجَّ آدَمُ مُوسَى۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (عالم ارواح میں) آدم و موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ کیا اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ وہی آدم علیہ السلام ہیں جن کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا آپ میں اپنی روح پھونکی تھی۔ فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا اور اپنی جنت میں آپ کو رکھا تھا اور پھر آپ نے اپنی خطا سے لوگوں کو زمین پر اترا دیا۔ (یعنی اگر آپ خطا نہ کرتے تو یہاں زمین پر نہ اتارے جاتے اور آپ کی اولاد اس دنیا میں نہ پہنچتی بلکہ جنت میں رہتی) آدم علیہ السلام نے کہا تم وہی موسیٰ علیہ السلام تو ہو جن کو خدا نے اپنے منصب رسالت سے نواز کر برگزیدہ کیا اور ہم کلامی کے شرف سے محروم فرمایا تھا۔ اور تم کو وہ تختیاں دی تھیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا

اور پھر تم کو سرگوشی کے لئے قریب کرنے کی عزت بخشی تھی۔ پس کیا تم جانتے ہو خدا نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے تورات کو لکھ لیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے کہا چالیس سال پہلے آدم علیہ السلام نے پوچھا کیا تم نے تورات میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نہیں پائے وعصى آدم ربه فغوى (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہنک گیا)۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں آدم علیہ السلام نے کہا پھر تم مجھ کو میرے اس عمل پر کیوں ملامت کرتے ہو جس کو خدا نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے لکھ دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔

توضیح: احتجاج آدم و موسیٰ: یعنی دونوں کا مناظرہ ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بحث و مباحثہ اور یہ مناظرہ ان دو نبیوں کا کہاں ہوا تو ایک احتمال یہ ہے کہ یہ مناظرہ عالم ارواح میں تجلیات رب میں ہوا حدیث میں "عند ربہما" لفظ موجود ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مکالمہ لیلۃ الاسری میں ہوا۔

"بیدہ" اور "من روحہ" میں اضافت تشریفیہ ہے۔ لہ

فہج آدم موسیٰ: یعنی آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر اس مناظرہ میں غالب آگئے۔ لہ

"فبکم": یعنی میری پیدائش سے کتنے سال قبل اللہ تعالیٰ نے تورات لکھنے کا حکم دیا تھا؟ لہ

جواب: یہاں شبہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ کے سامنے تقدیر کا حوالہ دے کر دیا اس سے معاصی کا دروازہ کھل جائے گا کیونکہ ہر مجرم تقدیر کا حوالہ دے کر کہے گا چلو جو گناہ میں نے کیا ہے تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا میرا اس میں کیا قصور ہے؟

جواب: اس سوال کا حقیقت پر مبنی جواب تو یہ ہے کہ تقدیر مصائب کے آنے کے بعد تسلی اور اطمینان اور سکون کے لئے ہوتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے درد اور مصائب کا اظہار فرمایا کہ دیکھو آپ نے لغزش کھائی سارا عالم آلام و مصائب میں مبتلا ہو گیا حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہی ہوا لیکن کیا کریں تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا اب ان مصائب پر صبر ہی کرنا چاہیے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عمل پر اعتراض نہیں کیا صرف اظہار ہمدردی اور اظہار مصیبت کیا، مگر ظاہری نظر میں جب دیکھتے اور سنتے ہیں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اعتراض ہے تو اس کا جواب تین مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ پہلا مقدمہ:

یہ کہ یہ سوال عالم ارواح میں ہوا ہے عالم اسباب میں نہیں۔

دوسرا مقدمہ:

یہ کہ بظاہر یہ اعتراض قبولیت تو یہ کے بعد ہوا ہے۔

تیسرا مقدمہ:

یہ کہ مجرم کو ملامت کرنا عالم اسباب میں ہوتا ہے تاکہ خود مجرم تو یہ کر کے باز آجائے اور دوسرے لوگ عبرت پکڑیں۔

جب یہ تین مقدمات تیار ہو گئے تو اب جواب سنو، عالم ارواح میں قبولیت توبہ کے بعد مجرم کے باز آنے کے امکان کے بغیر یا کسی کے فائدے اور حصول عبرت کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام بظاہر محض الزام تھا جس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے بھی احتجاج بالتحقیر کر کے جواب دیا کہ میرا کیا قصور تھا تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا گویا آپ نے اشارہ کر دیا کہ عالم ارواح میں قبول توبہ کے بعد غرض اصلاح کے بغیر سابقہ معصیت پر ملامت کرنے والے کا یہی جواب ہو سکتا ہے۔

عصی آدم اور غوی آدم کے جو الفاظ ہیں یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک مقرب بندے کے لئے حسنات الابوار سیئات المقربین کے اصول کے تحت معمولی لغزش پر شدید تکریم کے طور پر استعمال فرمائے ہیں کوئی انسان اس سے دھوکہ نہ کھائے اور خود اس طرح تبصرے ان نفوس قدسیہ کے خلاف شروع نہ کرے۔

تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا تُكَلَّفَةُ ثُمَّ يَكُونُ عَاقِبَةُ مِثْلُ ذَلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلُ ذَلِكَ ثُمَّ يَنْفُخُ اللَّهُ إِلَيْهِ مَلَكًا بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهُ وَأَجَلَهُ وَرِزْقَهُ وَشَقِيحٌ أَوْ سَعِيدٌ ثُمَّ يَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ فَوَالَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنْ أَحَدُكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيِّنَتُهُ وَبَيِّنَتُهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدَّ خُلُهَا وَإِنْ أَحَدُكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيِّنَتُهُ وَبَيِّنَتُهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدَّ خُلُهَا﴾ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صادق و مصدوق سرکارِ دو عالم ﷺ نے ہم سے فرمایا تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا نطفہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع رہتا ہے پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا بن جاتا ہے، پھر خداوند تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتے کو چار باتوں کے لکھنے کے لئے بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی موت (کا وقت)، اس کے رزق (کی مقدار) اور اس کا بد بخت و نیک ہونا (خدا کے حکم سے) اس کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم میں سے ایک آدمی جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں کے سے اعمال کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور تم میں سے ایک آدمی دوزخیوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا سامنے آتا ہے اور

وہ جنتیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

توضیح: حدثنا رسول اللہ: یہاں حدثنا کا وہ مبارک لفظ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے استعمال کیا ہے جو لاکھوں اولیاء اللہ اور محدثین عظام نے حرز جان بنایا ہے پھر لطف یہ کہ محدث آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ اسی طرح واقعہ جہاں کی حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس مبارک لفظ کو ”حدیثی تمہید الداری“ فرما کر استعمال فرمایا ہے یہ محدثین کرام اور شیوخ الحدیث کے لئے بڑا اعزاز ہے۔

وهو الصادق المصدوق: بعض دفعہ ایک آدمی سچا ہوتا ہے مگر لوگ اسے سچا نہیں سمجھتے ہیں تو فرمایا کہ آنحضرت ﷺ سچے بھی ہیں اور دنیا والے آپ کو سچا سمجھتے بھی ہیں چنانچہ کفار قریش آپ کو صادق الامین کہا کرتے تھے اور مکہ سے ہجرت کے آخری دن تک اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے تھے دشمنی اور زبانی عداوت اپنی جگہ پر تھی مگر قلب و دماغ کے اعتبار سے کفار آپ کو سب سے زیادہ سچا سمجھتے تھے یہ جملہ معترضہ ہے حالیہ نہیں ہے کیونکہ حال تو ایک حالت کے ساتھ وابستہ رہتا ہے یہاں صدق تمام شعبوں کو عام ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ الصادق کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے تمام افعال میں سچے تھے یہاں تک کہ قبل نبوت بھی آپ سچے تھے اور المصدوق کا مطلب یہ کہ آنے والے تمام واقعات اور وحی کی تمام تفصیلات میں آپ سچے تھے یہاں پر یہ سوال ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی دیگر حدیثوں اور روایات میں یہ جملہ نہیں ہے تو یہاں اس کو کیوں ذکر کیا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں چونکہ امور باطنیہ پر کلام تھا اور اشیاء مستورہ سے متعلق گفتگو تھی کسی کے لئے مشاہدہ ممکن نہ تھا نیز بعض اطباء نے اس کلام کو اپنے قواعد کے خلاف جانا ہے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شک کی گنجائش نہیں تمہارے قواعد کچھ بھی ہوں مگر یہ صادق و مصدوق کا کلام ہے۔ حقیقت وہی ہے جو صادق و مصدوق نے فرمایا ہے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فلما احسن موقعه هذا“۔

یجمع فی بطن امہ: حافظ توربشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے کہ نطفہ چالیس روز تک بچہ کی ماں کے تمام جسم میں حتیٰ کہ ہر ہر بال اور ہر ہر ناخن کے تحت گردش کرتا ہے اور اس کے بعد خون کی شکل میں رحم میں جا کر قرار پکڑتا ہے اسی حقیقت کو اس روایت میں یجمع فی بطن امہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

فیعمل: اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے یہ تھا کہ یہ آدمی اپنے کسب و اختیار سے یہ فعل کرے گا جس کی وجہ سے مستحق جنت یا دوزخ بنے گا اس کے بعد لوح محفوظ میں بطور تقدیر لکھا گیا، فرشتے حکم مادر میں بچے سے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں وہ اسی تقدیر کے مطابق لوح محفوظ سے لے کر لکھتے ہیں۔ فیعمل سے یہ اشارہ کر دیا گیا کہ بندے کا کسب و دخول جنت اور دخول دوزخ کے لئے ضروری سبب ہے صرف تقدیر کی لکھت پر دخول نہیں تو انسان نہ مجبور ہو نہ مختار ہوا۔

یہاں شبہ یہ ہے کہ بعض روایات میں پانچ کلمات کا ذکر ہے یہاں چار کا ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختصار راوی کی وجہ سے ہے کسی نے چار اور کسی نے پانچ کا ذکر کیا ہے۔

باقی بچہ کی پیدائش اور تخلیق کی یہ مرحلہ وار ترتیب اور یہ تدریجی عمل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ کو بھی ہر عمل تدریج کے ساتھ کرنا چاہئے نیز اس میں یہ حکمت ہے کہ تدریجی عمل سے بچہ کی ماں پر ایک دم بوجھ نہیں آئے گا۔ ل۔

فی سببی علیہ الكتاب: معلوم ہوا اعمال امارات و علامات اور اسباب ہیں اصل فیصلہ تقدیر الہی کی وجہ سے ہوتا ہے تو آخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ل۔

فیدخلھا: اس حدیث میں سالک کے لئے تنبیہ ہے کہ ہر وقت خوف ورجاء میں رہے عجب و تکبر اور برے اعمال سے اجتناب کرے اصل اعتبار خاتمہ کا ہے۔ ل۔

خاتمہ کا اعتبار ہے

﴿وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلًا أَهْلُ النَّارِ وَآلَهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلًا أَهْلُ الْجَنَّةِ وَآلَهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنَّوْآتِيهِجِ﴾ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا بندہ دو چیزوں کے سے کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ جنتی ہوتا ہے۔ اور جنتیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ دوزخی ہوتا ہے کیونکہ نجات و عذاب کا دار و مدار خاتمہ کے عمل پر ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہر آدمی اپنے کسب و اختیار سے یہ فعل کرے گا تو اگرچہ ظاہر میں وہ اہل جنت سے نظر آ رہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق وہ دوزخی تھا اور آخر میں اس نے اہل دوزخ کا عمل اپنے کسب و اختیار سے کیا تو اہل دوزخ سے ہوا اسی طرح معاملہ دوسرے رخ کا بھی ہوا، تو دار و مدار اعمال کے خاتمہ پر ہے تو عالم غیب میں کسی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوزخی یا جنتی ہے یہ مطلب نہیں کہ کسی مسلمان کو خاتمہ کے اعتبار سے مسلمان کہنا چھوڑ دو، جب وہ پابند شریعت ہے تو معاملہ مسلم کا ہوگا ہاں عالم غیب کی بات الگ ہے وہاں کا فیصلہ کسی کافر مسلم کے لئے ابھی سے نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ دار و مدار خاتمہ پر ہے حدیث نے طاعات کی کثرت کی تعلیم دے دی ہے اور عجب و تکبر سے روک دیا ہے نیز ظاہری اعمال کی وجہ سے کسی پر اہل جنت یا اہل نار کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے ظاہری اعمال صرف علامات ہیں اصل فیصلہ وہی ہے جو تقدیر کر چکی ہے۔ ہ۔

کسی پر یقینی حکم نہیں لگانا چاہیے

﴿وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَعَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ طَوِّبِي لِهَذَا عُصْفُورٌ مِنْ عَصَافِيرِ الْجَنَّةِ لَمْ يَعْمَلِ الشُّوءَ وَلَمْ يُذِرْ كُهُ فَقَالَ أَوْ غَيْرُ ذَلِكَ يَا عَائِشَةُ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ أَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِي أَصْلَابِ آبَائِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ أَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِي أَصْلَابِ آبَائِهِمْ﴾ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ پر سرکارِ دو عالم ﷺ کو بلایا گیا میں نے کہا یا رسول اللہ اس بچہ کو خوشخبری ہو یہ تو جنت کی چیزوں میں سے ایک چیز یا ہے۔ جس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ برائی کی حد تک پہنچا آنحضرت ﷺ نے فرمایا، عائشہ کیا اس کے سوا اور کچھ ہوگا؟ یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم و یقین نہ کرو (کیونکہ) خدا نے جنت کے لئے مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور دوزخ کے لئے بھی مستحق پیدا کیا ہے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔ (مسلم شریف)

توضیح: عصفور من عصافیر الجنة: یہ تشبیہ نہیں کیونکہ جنت میں مشبہ بہ کے لئے عصافیر چیزوں کا وجود نہیں ہے اسی طرح یہ کوئی استعارہ وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہ کلام ایک دعویٰ ادعا پر مبنی ہے کہ پہلے دعویٰ کیا گیا کہ جنت میں چیزیاں ہیں اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے دی گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال تھا کہ یہ جنتی ہے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ بلغی ہے اور جنت میں عصافیر کا ہونا "ولحم طیر مما یشعہون" سے ثابت ہے۔

فقال او غیر ذلک: ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشہور روایت کے مطابق یہ عبارت "واو" کے فقرہ "را" کے ضمہ اور "کاف" کے کسرہ کے ساتھ ہے گویا واو حالیہ ہے اصل عبارت اس طرح ہے "اتعتقدین ما قلت والحق غیر ذلک" اور وہ یہ کہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بچہ اہل جنت میں سے ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ ﷺ پر اطفال کے بارے میں کوئی وحی نہیں آئی تھی بعد میں وحی آئی کہ اطفال جنت میں ہوں گے یا نبی اکرم ﷺ نے یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تعظیم دے دی کہ بغیر کسی قطعی علم کے قطعی حکم اور قطعی فیصلہ مناسب نہیں کیونکہ بچہ والدین کے تابع ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ باپ کا خاتمہ بالخیر نہ ہو بلکہ کچھ اور ہو۔

علامہ طبری رحمہ اللہ نے "او غیر ذلک" میں واو کو "او" کے معنی میں بھی لیا ہے یعنی "الواقع هذا او غیر ذلک" ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ واو اہل کے معنی میں ہو۔

اصلاب آبائهم: یعنی اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں پہلے سے یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ دوزخی ہیں یا جنتی ہیں اصلاب آباء کے

وقت سے معلوم تھا اور اسی طرح لوح محفوظ میں بھی لکھا گیا لیکن یہ سب کچھ ان اشخاص کے تفصیلی اعمال کو تفصیلاً دیکھ کر لکھا گیا ہے بالآخر وہ لوگ اپنے کسب و اختیار سے اور اپنے افعال و اعمال کی وجہ سے اپنے مقام پر جائیں گے۔ ل

۶ محرم ۱۴۱۰ھ

جنت و دوزخ میں ہر ایک کا ٹھکانہ لکھا گیا ہے

(۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا وَنَدَعِ الْعَمَلَ قَالَ اْعْمَلُوا فِكُلُّ مُبْتَدِرٍ لِمَا خُلِقَ لَهُ أَتَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُسَبِّحُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَأَتَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُسَبِّحُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى أَلَا يَتَذَكَّرُ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کی جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت و دوزخ میں لکھ دی ہے (یعنی یہ معین ہو گیا کہ کون لوگ جنتی اور کون لوگ دوزخی ہیں) صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کر بیٹھیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں آپ نے فرمایا تم عمل کرو اس لئے کہ جو شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس پر اسے آسانی اور توفیق دی جاتی ہے لہذا جو شخص نیک بخشتی کامل ہوتا ہے خدا اس کو نیک بخشتی کے اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ اور جو شخص بد بخشتی کامل ہوتا ہے اس کو بد بخشتی کے اعمال کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) جس نے خدا کی راہ میں دیا، پرہیز گاری کی اور اچھی بات (دین اسلام) کو سچ مانا اس کے لئے ہم آسانی کی جگہ (جنت) آسان کر دیں گے لیکن جس نے بخل کیا اور خواہشات نفسانی اور دنیاوی چمک دک میں پھنس کر آخرت کی نعمتوں سے بے پرواہی کی، نیز عمدہ بات (دین اسلام) کو جھٹلایا تو اس کے لئے ہم مشکل جگہ (دوزخ کی راہ) آسان کر دیں گے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: کتب مقعدہ من النار: یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازل میں لکھا کہ اس شخص کا اپنے کسب و اختیار کے ساتھ خاتمہ کفر ہو گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم لکھ دیا یا اپنے کسب و اختیار سے خاتمہ ایمان پر ہو گا تو ٹھکانہ جنت لکھ دیا۔ ل

قال اعملوا: علامہ طبری رحمہ اللہ کے قول کے مطابق صحابہ کرام کے سوال کا فشاء یہ تھا کہ انہوں نے خیال کیا کہ جب ہر شخص کا ٹھکانہ پہلے سے جنت یا دوزخ ہے تو اعمال کی کیا ضرورت رہی اس لئے انہوں نے ترک عمل کی اجازت مانگی آنحضرت ﷺ نے جواب میں عمل کی ترغیب دی اور اہمیت بتائی کہ عمل اور عبادت و معبودیت حق الوہیت ہے تو عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ عمل میں مشغول رہو اور اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ خیال نہ کرو، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے ایک ٹھکانہ لکھا ہے لیکن تمہارے اعمال اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے ظاہری اسباب ہیں اور ہر شخص کو اس کے ٹھکانے کے

مطابق اعمال کی توفیق دی جاتی ہے تو اعمال علت نہیں مگر علامت ضرور ہیں کہ یہ شخص کس قسم کے ٹھکانہ کی تیاری میں لگا ہوا ہے تو ہر ایک کے عمل سے اس کے انتہاء سفر کا پتہ چلے گا۔ "ان خیرا الخیر وان شر افسر" تو تقدیر قتل اعمال کا ذریعہ نہیں بلکہ تیزی اعمال کا سبب ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ یہاں اصل میں دو چیزیں ہیں ایک تقدیر الہی ہے جو امر باطنی ہے اور یہی چیز موثر حقیقی ہے اور دخول جہنم یا جنت کا ذریعہ ہے دوسرا امر ظاہری ہے جو بندہ کے اعمال ہیں جو تقدیر پر مرتب ہونے کے لئے امارت ظاہریہ اور علامات ظاہریہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور خود فی نفسہ علت نہیں ہیں صحابہ نے چاہا کہ اس امر ظاہری یعنی اعمال کو چھوڑ کر امر باطنی یعنی تقدیر پر اکتفا کریں آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ صحیح نہیں بلکہ اس امر ظاہری کو اختیار کرو کیونکہ اس سے امر باطنی کے لئے آسانی پیدا کی جاتی ہے اور اس کو امر باطنی پر بطور دلیل اور قرینہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

بدکاری کے مراتب

﴿۸۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَقَّهُ مِنَ الزِّنَا أَذْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ فَرِنَا الْعَيْنُ النَّظَرُ وَزَنَا اللِّسَانُ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَفْتَعِي وَالْفَرْجُ يُصْطَبِي ذَلِكَ وَيُكْذِبُهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ نَصِيْبُهُ مِنَ الزِّنَا مُدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ أَلْعَيْنَانِ زَنَا هُمَا النَّظَرُ وَالْأُذُنَانِ زَنَا هُمَا الْإِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زَنَا هُمَا الْكَلَمُ وَالْيَدُ زَنَا هُمَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زَنَا هُمَا الْخَطَا وَالْقَلْبُ يَهْوِي وَيَتَمَنَّى وَيُصْطَبِي ذَلِكَ الْفَرْجُ وَيُكْذِبُهُ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا نے انسان کی تقدیر میں جتنا حصہ زنا کا لکھ دیا ہے وہ ضرور اس کے عمل میں آئے گا، آنکھوں کا زنا (تو نا محرم کی طرف) دیکھنا ہے اور زبان کا زنا (نا محرم عورت سے شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے۔ اور لیس آرزو و خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس آرزو کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ آدمی کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے وہ اس کو ضرور عمل میں لائے گا آنکھوں کا زنا (نا محرم کی طرف) دیکھنا ہے کانوں کا زنا (نا محرم عورت سے) شہوت انگیز باتیں سننا ہے۔ اور زبان کا زنا (نا محرم عورت سے شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا (نا محرم عورت کو برے ارادہ سے) چھونا ہے پاؤں کا زنا (بدکاری کی طرف) جانا ہے اور دل خواہش و آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

توضیح: ان اذلہ کتب الخ: حافظ توریشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "کتب" ثبت کے معنی میں ہے فرض اور واجب کے معنی میں نہیں ہے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم میں ایسے حواس پیدا کئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ لذت زنا محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد وہ فرج کے ذریعہ سے اس کی تکمیل کرتا ہے اب اگر اس نے عمل زنا کیا تو حواس کے ان لذائذ

کے بارے میں یہ فرج کی طرف سے تقدیر ہوئی اور اگر زنا کا اصلاً ارتکاب نہ کیا تو حواس کے بارے میں یہ فرج کی طرف سے تکذیب ہوئی "والفرج یصدق ذلک ویکذبہ" کا یہی مطلب ہے۔ ۱۔

بعض حضرات نے "کتب" کو "قد" کے معنی میں لیا ہے "ای قدر فی الازل ان یجری علی ابن آدم الزنا" اس تقدیر ازلی سے وہ انسان اپنے کسب و اختیار سے اس قسم زنا کا ارتکاب کرے گا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زنا کے کئی مراتب ہیں جو زنا دون زنا ہے ایک حَقُّ العین ہے ایک حَقُّ اللسان ہے ایک حَقُّ القلب ہے ایک زنا حَقُّ الاذن ہے، ان سب کے آخر میں زنا کا آخری اور علی درجہ ہے جس کو زنا بالفرج کہا جاتا ہے اس آخری درجہ میں جو مبتلا ہو تو یہ الفرج یصدقہ کا مصداق ہے اور جو اس آخری درجہ میں مبتلا ہونے سے بچ گیا تو یہ الفرج ینکذبہ کا مصداق ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آخری درجہ کے عملی زنا سے پہلے وسائل اور ذرائع و اسباب ہیں جو صغائر میں داخل ہیں تاہم اگر آخری درجہ متحقق ہو گیا تو وسائل کے تمام درجات کبار میں شمار ہوں گے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چور مسجد میں چوری کے لئے گیا مگر پھر اپنا ارادہ بدل کر توبہ کی تو سابقہ درجات کے تمام وسائل معاف ہوں گے اور اگر چوری کر لی تو سابقہ تمام اسباب بھی اس کے ساتھ چوری میں شمار ہوں گے اس حدیث سے قرآن عظیم کی آیت "الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللہ" کی تفسیر مفسرین نے کی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ کی سب سے اچھی تفسیر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔

المنطق: اجنبیات سے دل لگا کر شہوت انگیز باتیں کرنا مراد ہے۔ ۲۔
یہ حدیث مسلمانوں کو آنکھ کان زبان "ک ہاتھ اور دل کے زنا سے باز رکھنے کی تعلیم دے رہی ہے حالانکہ لوگ ان چیزوں کو زنا میں شمار نہیں کرتے بلکہ صرف عملی زنا کو جرم سمجھتے ہیں۔

نوشتہ تقدیر واقعات کے ظہور سے پہلے ہے

﴿وَعَنْ عَمْرٍو بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْذِبُونَ فِيهِ أَشَيْعٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَقْضَىٰ فِيهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ أَوْ قَدْ يَسْتَقْبِلُونَ بِهِ عَاقِبَاتُهُمْ بِهِ نَبِيَّهُمْ وَتَبَيَّنَتْ الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لَا بَلْ شَيْعٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَقْضَىٰ فِيهِمْ وَتَضَيُّعٌ ذَلِكُ فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (رواه مسلم) ۳۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دو شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں یہ بتائیے کہ آج (دنیا میں) لوگ عمل کرتے ہیں اور اعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کیا یہ وہی شئی

ہے جس کا حکم ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے یا یہ عمل ان احکام کے موافق ہے جو آئندہ ہونے والے ہیں جن کو ان کا نبی لایا ہے اور جن پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں یہ وہی شے ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے اور اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ ونفس وما سواها لما لہما فجوراً و تقواہا۔ (مسلم)

توضیح: ارأیت: یہ کلمہ اخبرنی کے معنی میں ہے۔ لے۔ یکدھون: کدح اس محنت و مشقت کو کہتے ہیں جس سے جسم میں نشان پڑ جائے۔

من قدر سبقی: اس جملہ میں کلمہ من آیا ہے اس میں دو احتمال ہیں اول احتمال یہ کہ یہ بیان کے لئے ہے اس صورت میں قضاء اور قدر دونوں ہم معنی ہوں گے اور یہی معنی رائج بھی ہے۔ یا یہ، من، تعلیل ہوگا "ای قضی علیہم القضاء لاجل قدر سبقی اوفیما یستقبلون بہ" یستقبلون کا صیغہ مشکوٰۃ شریف میں معروف پڑھا گیا ہے ہاں مسلم میں مجہول پڑھا گیا ہے۔

مما اتاہم بہ نبیہم: ای من الاحکام الشرعیۃ التکلیفیۃ وثبتت الحجۃ علیہم من الشارع ان دو اشخاص کے سوال کے دو مشقوں میں سے حضور اکرم ﷺ نے اول مشق کو اختیار کر کے جواب ارشاد فرمایا کہ جو کچھ رونما ہو کر آئندہ آ رہا ہے وہ سابقہ قضاء و قدر کے تحت آ رہا ہے، اس پر بطور دلیل آپ ﷺ نے یہ آیت پیش فرمائی "فما لہما فجوراً و تقواہا" اس میں الہما ماضی کا صیغہ ہے جس سے قضاء و قدر کی ساریت کی طرف اشارہ ہے۔

اس روایت کی ابتدائی عبارت میں ترکیب کو سمجھنے کے لئے تقدیر عبارت اس طرح: وکی اخبرنی ای ما یعمل الیوم یجہدون فیہ اشئی یعنی اھو شئی قضی الخ تو ہو مبتدا ہے اور شئی اس کی خبر ہے، حدیث پاک کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ پوچھنے والوں نے یہ پوچھا کہ پہلے سے کچھ لکھت یا تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے یا معاملہ نیا ہے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں پہلے سے لکھت ہے پھر آپ ﷺ نے آیت سے استدلال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں پہلے سے سب کچھ مقدر ہو چکا ہے اور ماضی کا صیغہ اس پر دلیل ہے۔

تقدیر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي رَجُلٌ شَابْتُ وَأَنَا أَخَافُ عَلَى نَفْسِي الْعَنَتَ وَلَا أَجِدُ مَا أَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ كَأَنَّهُ يَسْتَأْذِنُهُ فِي الْإِخْتِصَاءِ قَالَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ جَفَّ الْقَلَمُ بِنَا أَلَيْتَ لَاقٍ فَأَخْتِصِ عَلَى ذَلِكَ أَوْ كُذِّ. (رواہ البیہقی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جوان مرد

ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ بدکاری کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کروں۔ گویا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے اندر سے قوت مردی ختم کر دینے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا میں نے دوبارہ یہی کہا تو آپ ﷺ پھر خاموش رہے۔ میں نے پھر عرض کیا اس مرتبہ بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں نے پھر اسی طرح عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہ جو کچھ ہوتا ہے (اسے تمہارے مقدر میں لکھ کر) قلم خشک ہو چکا ہے۔ لہذا تمہیں اختیار ہے کہ قوت مردی ختم کر دیا نہ کرو۔ (بخاری)

توضیح: العنت: گناہ اور فجور و زنا کے معنی میں ہے۔

ولا اجد ما اتزوج اس سے مراد فقہ واجب ہے "کالہ یستأذنه فی الاختصاص" یہ بیچ میں راوی کا کلام ہے۔

الاختصاص: خصیتین نکالنے کے معنی میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بار بار سوال کے باوجود حضور اکرم ﷺ کا جواب نہ دینا اظہارِ کراہت کے لئے اور قباحۃ عمل کی وجہ سے تھا مگر آخر میں اسلوب حکیم کے طور پر فرمایا۔

جف القلم عما انت لاقی: علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جف القلم کنایہ ہے کہ مقدرات کی کتابت سے قلم فارغ ہو کر خشک ہو گیا ہے اب وہی چیز تفصیل میں آئے گی جو پہلے سے تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اس لئے تمہارا اختصاء (خصی بنتا) بیکار اور لالہ یعنی ہے۔

اختص علی ذلک او ذہ: اس کلام میں اختصاء کی اجازت نہیں بلکہ زجر و توبخ اور ملامت و ناراضگی ہے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہو گا تو جو چاہو کرو "او ذہ" میں او تسویہ اور برابری کے لئے ہے کہ تقدیر کے سامنے دونوں برابر ہیں آنحضرت ﷺ کا سکوت بھی ناراضگی پر دلالت کرتا ہے۔

انسان ہر وقت خطرہ میں ہے

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلُّهَا بَيْنَ إصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصْرِفُهُ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَللَّهُمَّ مَصْرِفِ الْقُلُوبَ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام انسانوں کے دل خدا کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں کہ جیسے ایک انسان کا دل ہے اور وہ (اپنی انگلیوں سے) جس طرح چاہتا ہے قلوب کو گردش میں لاتا ہے اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (دعا کے طور پر یہ) فرمایا اے دلوں کو گردش میں لانے والے خدا ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ (مسلم)

توضیح: کلہا کی ضمیر قلوب کی طرف راجع ہے اس حدیث میں تقیم ہے کہ الانبیاء اولیاء صلحاء اور ابراہیم اثر ارب کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔

بہین اصبعین: تشابہات دو قسم پر ہیں ایک معلوم المعنی غیر معلوم المراد ہیں جیسے ید، وجہ، اصبع، دوم غیر معلوم المعنی و المراد ہیں جیسے حروف مقطعات جو سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں۔

دونوں قسموں میں متقدمین کا مذہب یہ ہے کہ ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے معنی و مطالب مفوض الی اللہ ہیں یعنی "اللہ اعلم بمراۃ بذلک" امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے "الاستواء معلوم و الکيفية مجهولة و السؤال عنها بدعة" امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ "ید کی تاویل قدرت سے کرنا صفات میں تحریف ہے متاخرین اہل سنت نے مناسب تاویلات کی ہیں کیونکہ لوگ شلوک و شبہات کا شکار ہو گئے شیطانی وساوس عام ہو گئے تو عوام الناس کا ایمان بچانے کی غرض سے متاخرین نے مناسب تاویلیں کی ہیں تو یہاں مناسب تاویل قبضہ اور قدرت ہے کہ سب کچھ اللہ کے قبضہ و قدرت میں ہیں جس طرح مکمل قابو میں کرنے کے لئے کوئی چیز دو انگلیوں میں پکڑ کر آسانی سے گھمائی جاسکتی ہے اسی طرح یہاں ہے۔

کقلب واحد: یعنی جس طرح ایک دل کا کسی طرف مائل کر کے گھماتا آسان ہے اسی طرح یہ بھی آسان ہے کہ سب کے دلوں کو دو انگلیوں میں رکھ دے یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے متعدد قلوب اور قلب واحد میں انقلاب لانا یکساں اور برابر ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حفاظت کے لئے وظیفہ بتایا ہے کہ اس کو پڑھا کریں۔

۱۳۱۰ھ

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُلْتَبِجُ الْبَيْهَمَةُ بِبَيْهَمَةٍ يَجْعَاءُ قُلٌ تُحْشُونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءِ ثُمَّ يَقُولُ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہر کار دو عالم ﷺ نے فرمایا جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے (یعنی اس حق کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے) پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں جس طرح ایک چوپایہ جانور پورا چوپایہ بچہ دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی کمی پاتے ہو پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (ترجمہ) یہ اللہ تعالیٰ کی اس بنائی کے موافق ہے جس پر اللہ نے آدمیوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی خلقت میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا یہ دین مستحکم ہے۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: یوں دلی الفطرۃ: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ "الفطرۃ" سے یہاں حدیث میں کیا مراد ہے امام احمد بن حنبل حافظ ابن عبد البر اور ابن قیم رحمہ اللہ کے نزدیک "فطرت" سے مراد دین اسلام ہے ان حضرات کا ایک استدلال تو قرآن کریم کی آیت سے ہے کہ "فطرۃ اللہ الّٰہی فطر الناس علیہا" میں بالاجماع فطرت سے مراد دین اسلام ہے اور اسی کو خلت الدین القیمہ سے تعبیر کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ فطرت اور دین قیم ایک ہی چیز ہے۔

جواب: اس توجیہ پر دو اعتراض ہیں اول یہ کہ اگر فطرت سے مراد اسلام ہے اور ہر بچہ مسلمان ہے تو پھر میدان جہاد میں جنگ کے دوران پکڑا جانے والا بچہ غلام کیوں بنایا جاتا ہے اور کافر کے بچے کی نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھائی جاتی؟ اور اس کو خیر الایوبین کے تابع کیوں کہا جاتا ہے جبکہ یہ ہر حال میں فطرت اور تخلیق کے اعتبار سے مسلمان ہے؟ نیز حضرت خضر علیہ السلام نے کیوں اس معصوم بچے کو قتل کیا؟

دوسرا اعتراض: یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں "فابواہ یہودانہ" آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس فطرت سلیمہ کو ماں باپ بدل کر یہودی نصرانی مجوسی بناتے ہیں حالانکہ اسی جگہ جس آیت کو استشاد میں پیش کیا گیا ہے اس میں "لا تبدیل لخلق اللہ" کا جملہ ہے کہ فطرت اسلام میں تغیر نہیں آتا ہے تو آیت اور حدیث میں تعارض آ گیا۔ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے اپنے موقف کیلئے ایک حدیث قدسی سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ "انی خلقت عبادی حنفاء کلہم فاجتا لہم الشیاطین عن دینہم" کہ میں نے تمام انسانوں کو خالص دین پر پیدا کیا تھا مگر شیطان نے ان کو ان کے دین سے ورغلا کر گمراہ کیا معلوم ہوا فطرت سے دین مراد ہے۔

نیز حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سورہ روم میں اس آیت کے ذیل میں فطرت سے دین اسلام مراد لیا ہے "والفطرۃ الاسلام"۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ حضرات کے یہ سب دلائل اپنی جگہ لیکن مذکورہ بالا کئی شقوں پر مشتمل دو اعتراضات نے ان حضرات کی اس توجیہ (کہ فطرت سے مراد اسلام ہے) کو مشکل میں ڈال دیا ہے اس لئے حافظ تورنیشی علامہ طبری اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور دیگر علماء کرام نے فرمایا کہ حدیث میں فطرت سے مراد قبول حق کی استعداد اور صلاحیت و قابلیت و لیاقت ہے کہ اگر وہ بچہ اس استعداد کے ساتھ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے تو اس میں اس کی صلاحیت ہے اور وہ بالکل اس کے لئے تیار ہے ہاں اگر وہ بچہ غلط ماحول میں پڑ کر اس استعداد کو خراب کرتا ہے اور اس سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ ارد گرد کے ماحول کا قصور ہے مگر پھر بھی استعداد قبول حق باقی رہتا ہے دیکھو فرعون جب غلط ماحول سے الگ ہوا تو اس نے قبول حق کا اقرار کیا یہی وہ فطری نعرہ تھا جو اس استعداد کے وجود کا نتیجہ تھا اگرچہ اس اقرار نے اس کو فائدہ نہیں پہنچایا کیونکہ فائدہ کا وقت

گزر چکا تھا۔ اسی کو فرمایا "لا تبدیل لخلق اللہ" کہ اس استعداد کو غلط استعمال کر کے مہر جباریت تو لگ جاتی ہے مگر استعداد پھر بھی موجود رہتی ہے ہاں مہر جباریت کے لگنے سے استعداد سے فائدہ اٹھانا ختم ہو جاتا ہے اور اس سے فائدہ ممکن نہیں رہتا ہے اصل استعداد کا موجود رہنا تو الگ چیز ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے کہ فطرت جو تخلیق کے معنی میں ہے اس سے مراد یہی استعداد قبول حق ہے۔ لہ

جواب: یہاں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچہ کو مارا تھا اس کے متعلق روایات میں آیا ہے "طبع یومہ طبع کافر" اگر استعداد باقی تھی تو کیسے اس کو مطبوع علی الکفر کہا گیا؟ یہ عالم غیب کے اعتبار سے فرمایا ہے اگرچہ عالم شہادت کے اعتبار سے اس میں استعداد تھی مگر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق انجام کے اعتبار سے اس کو کافر ہونا تھا اور اسی کا تذکرہ "طبع یومہ طبع کافر" میں ہوا ہے۔ مثال:

اس تخلیقی جبلت اور فطری استعداد کی مثال حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح دی ہے کہ مثلاً صفت رجولیت تمام افراد رجال میں ہوتی ہے مگر اس سے وہ افراد مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں جو رہبانیت اختیار کر کے اس صفت مردانگی کو ضائع کر دیتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں یہ صفت نہیں تھی، بعینہ اسی طرح استعداد قبول حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام افراد انسانی میں رکھا ہے لیکن ان کے والدین کا اسکویہودی نصرانی بنانا ایک ایسی آفت ہے جس سے اس کی استعداد کا مصرف تبدیل ہو گیا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص اس استعداد سے محروم تھا۔

البتہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنے قدرت کاملہ کے ظہور کے لئے کسی بچہ کو اول واصلہ میں استعداد سے محروم و مسلوب کر دیتا ہے جس طرح خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو مارا گویا وہ اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ ہے۔

کما تنتج: یہ نتائج سے ہے بچہ جنم لینا پیدا کرنا، "البہیمۃ" جانور اور حیوان کو کہا جاتا ہے۔ "جمعا" اس سے مراد تمام الخلق اور سلیم الاعضاء حیوان ہے جس کا کوئی عضو کٹا ہوا نہ ہو۔ "المجذعۃ" یہ اس حیوان کو کہتے ہیں جس کے کان کٹے ہوں ناک کٹی ہو ناقص الخلق ہو۔ کان کے کٹنے سے یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ یہ کافر لوگ حق کے سننے سے ایسے محروم ہیں گویا کان ہی کٹے ہوئے ہیں سماع حق کا آگہی نہیں، یعنی جس طرح ایک جانور سے اسی کی طرح صحیح سالم بچہ پیدا ہوتا ہے کوئی کان کٹا نہیں ہوتا اسی طرح فطرت اسلام صحیح و در سالم ہوتی ہے مگر لوگ اپنے کسب و اختیار سے اس فطرت کو برباد کرتے ہیں جس طرح بت پرست لوگ جانوروں کے بھی کان وغیرہ کاٹ کر یا چیر پھاڑ کر خراب کرتے ہیں۔ لہ

"ای یولد علی الفطرة ولادۃ مثل نتاج البہیمۃ ویغیر انہ تغیرا مثل تغیر ہم البہیمۃ"۔

سوجانا اللہ کے شایان شان نہیں

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَامَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنُتَمِي لَهُ أَنْ يَنَامَ يَخْفُضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ يَرْفَعُ الْيَوْمَ عَمَلَ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَحَمَلَ النَّهَارَ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ حِجَابَهُ النُّورُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَخْرَجَتْ سُبْحَاتُ وَجْهِهِ مَا أَلْفَى الْيَوْمَ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ
(رواهُ مُسْلِمٌ)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ نے خطاب دیا اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ خدائے تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور سونا اس کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچا دیئے جاتے ہیں اور اس کا حجاب نور ہے جسے اگر وہ اٹھا دے تو اس کی ذات پاک کا نور مخلوقات کی تاحد نگاہ تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دے۔ (مسلم شریف)

توضیح: قام فینا: یہ وعظ اور بیان سے کنایہ ہے ای قام خطیباً منذ کثر العالَمِ "بہم خمس کلمات" ای متلبساً بخمس اوقائلاً بخمس کلمات "لاینام" مراد کمال اور ضعف ہے نوم میں یہ کمال ہوتا ہے۔ "ولا یلغی لہ" اس لئے کہ وہ حاجت روا مشکل کشا ہے خالق و مالک ہے اگر وہ سوجائے تو ڈھائی بجے رات کو کسی مصیبت زدہ کی فریاد کون سنے گا؟

امن یجیب المضطر الآية "ینخفض القسط" خفض جھکانے اور گرا بنے گھٹانے کے معنی میں ہے اور قسط سے مراد حصہ اور رزق ہے اور یرفعہ سے رزق کا بڑھانا مراد ہے۔ "یرفع الیہ عمل اللیل" رفع اعمال سے مراد قبولیت اعمال ہے استمرار کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ تمام اعمال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے مستحضر ہیں اس میں دن رات کے نامہ اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حجابہ العود: حجاب سے مراد مانع ہے کوئی حسی مادی حجاب مراد نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے محیط نہیں بلکہ یہ حجاب نوری ہے جو مخلوق کے لئے خالق کی رویت اور دیکھنے سے مانع ہے جیسا حسی حجاب مانع ہوتا ہے امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حجاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفت جلال ہے اور اس کا وہ نور اور عظمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی رویت کے لئے مانع بن رہی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے انوارات کا ایک پر تو سورج پر پڑا ہے کوئی دیکھ تو لے کہ اس کی شعاعوں میں کیا زور ہے "سبحات وجہہ" جمع سبتہ ہے جیسے غرات جمع غرۃ ہے اس سے تجلیات الہی مراد ہیں یا مخصوص صفات ہیں جو انوار الہی اور تجلیات ربانی پر مشتمل ہیں "بصورۃ" ای نظریۃ ما یلیق بشانہ تو نظر عالم پر محیط ہے لہذا پورا عالم جل کر خاکستر ہو جائے گا ذات اقدس کے انوارات کے یہ حجاب ستر ہزار ہیں اس کو جب فرشتے دیکھتے ہیں تو شیخ و جلیل میں لگ جاتے ہیں۔ لہ

اس حدیث میں دن اور رات کے جن اعمال کا ذکر کیا گیا قرآن کریم نے اسے "الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ" سے بیان کیا ہے بعض نے القلم سے میزان مراد لیا اور میزان سے مراد رزق ہے۔

اللہ کے جود کے خزانے بھرے ہوئے ہیں

۱۰۱۰ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَدُ اللَّهِ مَلَأَى لَا تَغِيضُهَا نَفَقَةٌ سَحَابُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مِمَّا خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَغِيضْ مَا فِي يَدَيْهِ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ وَبِيَدِهِ الْبِزْآنُ يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يَمْلِكُ اللَّهُ مَلَأَى وَقَالَ ابْنُ تَمِيْمٍ مَلَأَ سَحَابُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۝

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ (یعنی اس کا خزانہ) بھرا ہوا ہے۔ دن اور رات ہر وقت خرچ کرنا بھی اس میں کمی پیدا نہیں کرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہ جب سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور جبکہ اس کا عرش (بھی) پانی پر تھا۔ کتنا خرچ کیا ہے۔ لیکن (اتنا زیادہ) خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اس کا خزانہ) اس میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں ترار ہے۔ جسے وہ بلند و پست کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی روایت ہے "خدا کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے" اور ابنِ نمیر کی روایت میں ہے۔ خدا کا ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ اور ہمیشہ دینے والا ہے۔ رات اور دن (خرچ ہونے کے باوجود) اس میں کوئی چیز کمی نہیں کرتی۔

توضیح: ید اللہ: ای مایلیق بشانہ۔ ملائی: ای من الخزائن ۛ یعنی خزانوں سے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں قرآن میں ہے "وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم"۔ (سورۃ حجر) لا تغیضہا ای لا تنقصہا سحاب اللیل یعنی پانی کی طرح طبعاً یہ سخاوت چمکتی ہے یہ کثرت سخاوت سے کنایہ ہے کیونکہ سحاب صحراؤں اور بیابانوں میں برسنے والی بارش کو کہتے ہیں "حما" ضمیر ید اللہ کی طرف راجع ہے جس سے مراد خزانہ اللہ ہیں جو لفظ ۛ کن فیکون ہے اللیل والنہار دونوں منصوب ہیں اور ظرف واقع ہیں روایت کے آخر میں یمین اللہ بھی مسلم کی روایت میں ہے یمین اللہ ادا کہا گیا ہے اور آخر میں لا یغیضہا ہے تو شمی فاعل ہے اور اللیل والنہار اس سے بدل واقع ہے۔ ۛ "ملائی" مملوۃ کے معنی میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی سخاوت بارش کی طرح دائم الصب ہے مسلسل اور موسلا دھار بارش کی طرح زمان اور مکان کو عام ہے۔ ارایتہ سے اس کی عملی صورت بتائی گئی ہے۔

مشرکین کی اولاد کہاں ہوں گی؟

﴿۱۵﴾ وَعَنْهُ قَالَ سَوَّلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذُرَارِي الْمُشْرِكِينَ قَالَ لِلَّهِ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے بارہ میں پوچھا گیا (کہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں) تو آپ ﷺ نے فرمایا خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر وہ زندہ رہے تو کیا عمل کرتے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: اللہ اعلم بما کانوا عاملین: یعنی اللہ ہی کو معلوم ہے تم کو کیا معلوم اور تمہارا کیا سوال؟ یہ جملہ اولاد مشرکین کی صحیح حقیقت نہ بتانے کا ایک انداز ہے اور اس سے لاعلمی کا اظہار ہے۔

چکناچٹ: شبہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اولادِ مشرکین سے متعلق کوئی حتمی بات کیوں ظاہر نہ فرمائی؟

ترجمہ: اول یہ کہ اب تک حضور اکرم کو سن جانبِ اللہ کوئی واضح حکم نہیں ملا تھا۔

ترجمہ: یہ کہ آپ ﷺ کو معلوم تو تھا مگر اظہار میں توقف کیا کہ اب تک اجازت نہیں تھی اس مسئلہ میں نصوص کے اختلاف کی وجہ سے فقہاء اسلام میں بھی اختلاف آیا ہے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اولادِ مشرکین جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا ہو ان کے متعلق ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ جنتی ہیں اور حضور اکرم ﷺ کو وحیِ جدیدہ سے اس کا علم ہو گیا۔

۲۔ داخل جنت ہیں مگر مستحق نہیں بلکہ جنتیوں کے خدا کی حیثیت سے اور ان کے تابع کی حیثیت سے ہوں گے۔

۳۔ نہ جنت میں نہ دوزخ میں بلکہ اعراف میں ہوں گے۔

۴۔ والدین کے تابع ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔

۵۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر فقہاء کے ہاں رائج یہ ہے کہ اولادِ مشرکین میں توقف کیا جائے۔

الفصل الثانی

اللہ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟

﴿۱۶﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِیَةِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمُ فَقَالَ لَهُ أَكْتُبْ قَالَ مَا أَكْتُبُ قَالَ أَكْتُبِ الْقَدَرَ فَكُتِبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ.

(رواہ الترمذی وقال هذا عینہما تحریرہما (سلاک)۔

تفسیر: حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ خدا نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس (قلم) کو لکھنے کا حکم دیا قلم نے کہا (الیہ العالمین) کیا لکھوں؟ بارگاہِ الوہیت سے جواب ملا تقدیر لکھو! لہذا اس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو (اب تک) ہو چکی ہیں۔ اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہے۔

توضیح: ان اول ما خلق اللہ القلم: اس روایت میں قلم کی تخلیق کا ذکر ہے کہ سب سے پہلے قلم پیدا کیا گیا ہے دوسری روایات میں "اول ما خلق اللہ نوری" بھی ہے اور "اول ما خلق اللہ العقل" بھی ہے تو روایات میں تعارض آگیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اولیت اضافی ہے نور کے لئے اولیت حقیقی ہے باقی کے لئے اضافی ہے یعنی نور کے بعد سب سے پہلے قلم پیدا کیا گیا اور پھر سب سے اول عقل پیدا کی گئی تو اولیت کی نسبت اس اعتبار سے صحیح ہوگی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اپنی اپنی نوع کے اعتبار سے اولیت کا حکم لگایا گیا ہے تو انوارات کی قسموں میں سب سے پہلے نور محمد ﷺ کو پیدا کیا گیا اور انوار کی انوار میں سب سے پہلے قلم تقدیر پیدا کیا گیا ہے اور عقلیات کے آلات میں سب سے پہلے عقل پیدا کی گئی ہے۔

اكتب: اللہ تعالیٰ نے کائنات کو جس ترتیب سے پیدا فرمایا مثلاً آسمان ہے، زمین ہے، عرش ہے، کرسی، باطنی نظام چلانے کیلئے فرشتے ہیں ان تمام چیزوں کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھنا مناسب تھا تو قلم کو حکم دیا کہ لکھ دو قلم نے لکھ دیا یہی قضاء و قدر ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ اس لکھت کی طرف محتاج نہ تھے مگر یہ ایک نظام ہے جس کا ہونا بہت ہی مناسب ہے۔ ل۔

فكتب ما كان وما هو كائن: یہاں سوال یہ ہے کہ قلم تقدیر نے ازل میں کیا لکھا حالانکہ اس سے پہلے تو زمانہ ہی نہیں تھا لہذا "ما كان" کے الفاظ کا استعمال کرنا درست نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ ماضی سے مراد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کا زمانہ ہے یعنی آنحضرت ﷺ فرما رہے ہیں کہ جو کچھ آج سے پہلے ہوا وہ بھی قلم نے لکھ لیا ہے۔ ل۔

۹ محرم ۱۴۱۰ھ

انسان کی ابتداء آفرینش کا قصہ

(۱۷) وَعَنْ مُسْلِمٍ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هَذِهِ الْآيَةِ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الْآيَةَ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِبِصْمِيْنِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةَ فَقَالَ خَلَقْتُ هَؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ

الْجَنَّةِ يَعْمَلُونَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَدِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ كُدْرِيَةً فَقَالَ خَلَقْتُ هَذَا لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ
النَّارِ يَعْمَلُونَ فَقَالَ رَجُلٌ قَدِيمٌ الْعَمَلِ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ إِذَا خَلَقَ
الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ
الْجَنَّةَ وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ
النَّارِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ النَّارَ (رواه مالك والترمذي وأبو داود)

ترجمہ: حضرت مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس آیت (وَإِذَا اخذ ربك من بني آدم من ظهورهم ذرياتهم وأشهدهم على أنفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيمة انا كنا عن هذا غافلون) (پ ۹ ع ۱۱) (ترجمہ): ”اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (سب کچھ سمجھ عطا کر کے) ان سے ان ہی کے متعلق اتر آ لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے محض بے خبر تھے“ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب اس آیت کے بارے میں سرکارِ دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا تو میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر ان کی پٹینہ پر داہنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کیلئے اور جنتیوں کے سے اعمال کرنے کے لئے جوہ کر دیے ہیں۔ پھر اپنا ہاتھ آدم کی پشت پر پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو دوزخ کے لئے اور دوزخیوں کے سے کام کرنے کیلئے جوہ کر دیے ہیں۔ پھر اپنا ہاتھ کسی بندہ کے پیدا کیا ہے یہ سن کر ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں کے سے عمل صادر کرتا ہے یہاں تک کہ اس (بندہ) کی وفات جنتیوں جیسے اعمال پر ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کی بناء پر اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے سے اعمال صادر کرتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخیوں جیسے اعمال پر مرم جاتا ہے لہذا اسے ان اعمال کی بناء پر دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔ (موطائک، ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: وَاِذَا اخذ ربك من مقام میں کئی مباحث ہیں۔

بحث اول:

ذریعہ آدم علیہ السلام کو ان کی پشت سے کہاں نکالا گیا؟

① بعض نے کہا کہ عالم ارواح میں نکالا گیا۔ ② بعض نے کہا کہ دنیا میں آنے کے بعد نکالا۔

③ بعض نے کہا کہ عرفات کے پاس نعمان پہاڑ پر یہ واقعہ ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت اس پر دلالت بھی کرتی ہے۔

بحث دوم:

پشت آدم سے یہ اولاد کیسے نکالی گئی؟

امام عبدالباق شمرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں شکاف کر کے نکالا بعض نے کہا کہ جسم کے بالوں کے مسامات سے نکالا بعض نے کہا کہ ہر ایک کو اپنے باپ کی پیٹھ سے نکال کر یہ مکالمہ ہوا۔ لہٰذا یہاں ایک مشہور اشکال ہے کہ قرآن کی آیت میں من ظہور ہم کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اولاد اپنے اپنے آباء کی پیٹھوں سے نکالی گئی ہے اور مذکورہ حدیث میں ثم مسح ظہورہ ببیضہ میں تصریح ہے کہ اولاد کا استخراج پشت آدم سے ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ استخراج اولاد کے دو مرحلے ہیں ایک پشت آدم سے نکلنے کا مرحلہ ہے اور دوسرا ظہور بنی آدم سے نکلنے کا مرحلہ ہے۔ حدیث میں پشت آدم سے نکلنے کے مرحلے کا ذکر ہے اور آیت میں ظہور بنی آدم سے نکلنے کے مراحل کا ذکر ہے تو آیت و حدیث میں کوئی تعارض نہیں ایک میں بلا واسطہ اخراج ہے اور دوسری میں بالواسطہ اخراج کا ذکر ہے۔ لہٰذا بحث سوم:

”واشهدہم علی انفسہم“ سے متعلق ہے کہ اس اشہاد سے کیا مراد ہے؟ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تمام معاملہ کو ایک تمثیل پر محمول کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مالک ربوبیت قائم کئے اور ادھر عقول میں ایک مادہ پیدا کیا جو اقرار تو حید اور ربوبیت کے ماننے پر انسان کو آمادہ کرے تو انسان نے قالوا بلی کہہ دیا قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تمام صوفیاء کرام، محدثین عظام اور اہل حق کے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ اشہاد حقیقتہ فی الواقع ہوا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام بندوں کو پشت آدم سے نکال کر سب سے کلام کر کے تو لا یہ اقرار لیا ہے اور سب نے اقرار کر کے وعدہ کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ”فکلہم قبلہ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے گنگو اور کلام کیا یہ روایت ان حضرات کی دلیل ہے اور یہی مسئلہ حق پر ہے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تمثیل اس روایت میں نہیں چل سکتی ہے۔ لہٰذا جوابیہ:

اب شہ یہ ہے کہ ہم کو یہ قول و قرار یاد کیوں نہیں؟

جوابیہ: تم یاد رکھتے جیسے ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ”کانہ الان فی اذنی“۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں وہاں کے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو بھی جانتا ہوں کہ کون کون تھے عبد اللہ ستیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے عہد الست کی شاگردی یاد ہے۔ چلو اگر تم بھول بھی گئے تو کوئی تعجب نہیں بڑے بڑے انقلاب آئے ہیں انسان پہلے نطفہ تھا پھر علقہ پھر مضغ پھر عظام اور پھر لحم و عظم میں تبدیل ہوا پھر وجود میں آیا تو کیا آپ کے بھولنے سے اس تفصیل کی حقیقت ختم ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں ایسے ہی آپ کے بھولنے کی وجہ سے عہد الست کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ چلو تم بتاؤ کہ تم جو خط لکھنا

جانتے ہو قرآن پڑھنا جانتے ہو تو ضرور بغیر ابتدا کہیں سے ہوئی ہوگی اب تم ہمیں بتاؤ وہ ابتدائی حروف اور کلمات کیا تھے کس کو یاد ہے حالانکہ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔

آخر میں یہ سن لو کہ نبی آخر زمان صادق و مصدوق نے بتایا تو کیا آنحضرت ﷺ پر اعتماد اپنے اوپر اعتماد سے کم ہے؟ اب اگر کوئی کہے کہ ہم نے جواب کیسے دیا؟ تو ہم کہیں گے زبان سے دیا کیا محال ہے اگر کوئی کہے پھر اقرار کے بعد انکار کیوں کرتے ہیں ہم کہیں گے کہ یہی تو مصیبت ہے اسی کا تو طعن مل رہا ہے تاہم مجبور تو نہیں کہ انکار کی طاقت نہیں بلکہ باختیار ہے کوئی ماننا ہے کوئی نہیں ماننا۔

مسح ہیدہ: اس سے پہلے مسح بیہمینہ فرمایا کیونکہ وہاں مومن تھے تو اعزازی طور پر بیمن کا ذکر کیا گیا اور یہاں ہیدہ فرمایا کیونکہ یہ کافر ہیں ان کے لئے بیمن کا اعزازی لفظ مناسب نہیں تھا اور شمال کا تصور نہ تھا تو ہیدہ فرمایا۔
استعملہ: یعنی اہل جنت کے عمل میں لگادیا یعنی توفیق دے دی۔

تقدیر کے دو مکتوب

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ أَتَدُونُ مَا هَذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا أَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِي فِي يَدِهِ الْيَمْنَى هَذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ فِيهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْهِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا يُنْقَضُ مِنْهُمْ أَهْدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِي فِي شِمَالِهِ هَذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ فِيهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْهِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا يُنْقَضُ مِنْهُمْ أَهْدًا فَقَالَ أَصْحَابُهُ فَبَيْعِمُ الْعَمَلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّحُوا وَقَارِبُوا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَعْيَ عَمَلٍ وَإِنْ صَاحِبُ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَعْيَ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرِغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ باہر تشریف لائے آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں آپ نے (صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں! ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں کیا معلوم آپ ہی بتادیجئے (کہ یہ کیا کتابیں ہیں) آپ ﷺ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو داہنے ہاتھ میں تھی کہ یہ خدا کی جانب سے ہے جس میں اہل جنت، ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہوئے ہیں پھر آخر میں حج بندی کر دی گئی ہے لہذا اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا یہ خدا کی جانب سے ایک ایسی کتاب

ہے جس پر اہل دوزخ ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی ہے لہذا اب نہ تو اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی (یہ سن کر) صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر یہ چیز پہلے ہی سے طے ہو چکی ہے (کہ جنت و دوزخ کا مدار نوشتہ تقدیر پر ہے تو) پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (دین و شریعت کے مطابق اپنے اعمال کو) اچھی طرح مضبوط کرو اور (حق تعالیٰ کا) تقرب حاصل کرو اس لئے کہ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ (زندگی میں) اس نے کیسے ہی (نیک یا بد) عمل کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے خواہ اس کے اعمال جیسے بھی رہے ہوں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کتابوں کو رکھ دیا یعنی پیچھے ڈال دیا اور فرمایا تمہارا پروردگار بندوں کے بارے میں یہ پہلے سے طے کر چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت دوزخی ہے۔ (ترمذی)

توضیح: وفی یدیدہ کتابان: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ دو کتابیں حسی تھیں یا تمثیل اور تصویر کے طور پر بنانا مقصود تھا اہل تاویل علماء نے کہا کہ یہ کوئی محسوس اور مشاہد اور مخصوص کتابیں نہیں بلکہ ایک مثال اور ایک تصویر بیان کرنا مقصود تھا وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو ان کتابوں سے متعلق کامل یقین اور قطعی علم تھا جو مشاہدہ حسیہ سے بھی زیادہ قوی تھا تو آپ ﷺ نے ان غیر حسی کتابوں کو حسی بنا کر پیش فرمایا لیکن جمہور محدثین، حضرات علماء و اہل اللہ و اہل باطن سب کہتے ہیں کہ یہ دونوں حسی کتابیں تھیں جن کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ علامہ توریشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس ہستی کو تسلسل کے ساتھ حوی آ رہی ہو اگر عالم غیب سے اس کو دو حسی کتابیں لا کر دے دی گئیں تو اس میں کیا استبعاد اور کیا استعجاب ہے؟ اور چونکہ یہ عالم غیب کی کتابیں تھیں لہذا اس کی ضخامت پر اعتراض نہ کیا جائے ایک کتاب میں اہل جنت کے نام لکھے گئے تھے، دوسری میں اہل نار کے نام تھے دور دور یدید میں یہ بات سمجھنا اور آسان ہو گئی ہے بڑی بڑی تفصیل سٹ کر ایک معمولی سے آلے میں سما جاتی ہیں اور انگلی کے ایک اشارے سے نظروں کے سامنے آ جاتی ہیں۔

ثم اجمل علی آخرہم: اس کا مطلب یہ ہے کہ تفصیلی فہرست کے بعد آخر میں اس کی مجموعی تعداد لکھی ہوئی تھی جسے میزان اور میزانہ کہتے ہیں۔

فقال سدحوا وقاربوا: حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مکمل عمل کرو، وزن قریب قریب چلو۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم عباد اور بندے ہو تم کو سوال کرنے کا حق نہیں بلکہ سیدھا سیدھا ٹھیک ٹھیک عمل کرو اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھو۔

ثم قال یدیدہ: قال کے صلہ میں مختلف حروف کے آنے سے اس کا معنی تبدیل ہوتا رہتا ہے قال عنہ ای روی عنہ، قال فیہ ای عاب علیہ، قال براسہ ای قال نعم و آجاب، قال بیدہ ای اشار بیدہ یہاں اسی اشارہ کے معنی میں آیا ہے قال بثوبہ ای رفعہ، قال برجلہ ای مشی قالت عینہ ای او مأت کہا قیل:

وقالت له العيان سمعًا وطاعةً وَحَدَّثَنَا كَالِدُ لَهَا يَشْقَبُ لَ
قَبْذَهُمَا: اس پھینکنے میں کوئی توہین کی صورت نہیں نکلتی بلکہ عالم غیب کی کتابیں تھیں جو نبی ہاتھ چھوڑ دیئے کتابیں بھی
غائب ہو گئیں۔ عالم غیب کے لفظ کو یوں سمجھیں کہ عوالم تین ہیں ایک عالم مشاہدہ ہے جس میں جسم اور روح دونوں فعال ہیں
جسم کے ساتھ صورت بھی ہے۔ دوم عالم مثال ہے جس میں صرف صورت ہوتی ہے جسم نہیں ہوتا۔ سوم عالم ارواح ہے جس
میں صرف روح ہوتی ہے۔ ۷

یہاں قال بیدنیہ فنبذہما درحقیقت جف القلم بما انت لاقی کی طرح ہے معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا اور "فرغ ربکم" اسی پر وال ہے۔

دوا اور علاج بھی تقدیر کے تحت ہے

﴿١٩﴾ وَعَنْ أَبِي جَزْأَمَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ رُفِي نَسْتَرْقِيَهَا وَكَوْءُ نَسْتَدَاوِي بِهَا وَنُقْفَاةٌ نَسْتَقِيهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ شَيْئًا قَالَ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ (رواه أحمد والبخاري وابن ماجه) ۞

نتیجہ بحث: حضرت ابو خریمہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سرکارِ دہ عالم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عملیات جن کو ہم (شفاء کے لئے) پڑھواتے ہیں اور وہ دوائیں جن کو ہم (حصولِ صحت کیلئے) استعمال کرتے ہیں اور وہ چیزیں جن سے ہم حفاظت حاصل کرتے ہیں (مثلاً ڈھال اور زرد وغیرہ) ان کے بارے میں مجھے بتائیے کہ یہ سب چیزیں نوشتہ تقدیر میں کچھ اثر انداز ہو جاتی ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چیزیں بھی نوشتہ تقدیر ہی کے مطابق ہیں۔

(احمد ارتضیٰ، ایسٹنا ماہ)

توضیح: رقی: جمع رقیۃ کی ہے جھاڑ بھونک دم اور معوذات کو کہتے ہیں۔ ۷۷

تلقاً: وہ چیز جس سے پناہ اور بچاؤ حاصل کیا جاتا ہے خواہ وہ حال ہو اسلحہ ہو دیو ہو یا انسان ہو۔ جھاڑ پھونک اور دم وغیرہ کے تفصیلی مسائل جلد ثانی میں انشاء اللہ آئیں گے یہاں اتنا جان لیں کہ جس دم اور تعویذ میں الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں یا اس میں ترکیب الفاظ مذکور ہوں اس کا استعمال حرام ہے اور جس کا معنی صحیح ہو شریعت میں وہ دم استعمال کے لئے موجود ہو وہ جائز ہے اور جس کا معنی تو معلوم نہ ہو مگر رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہو وہ بھی جائز ہے جیسے شجرۂ قرنیۃ ملحہ بھو " بچھو کے کاٹنے کے لئے ایک منتر ہے یہ بھی جائز ہے بہر حال صحابی کے پوچھنے اور سوال کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جب تمام امور مقدرات میں ہیں تو رقیہ ادویہ اور بچاؤ کی چیزوں کے استعمال کا کیا فائدہ ہے آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ یہ اشیاء بھی تقدیر میں ہیں تقدیر سے باہر نہیں تو استعمال اور اشتغال بالا سباب جائز ہے۔ اتکال بالا سباب ناجائز ہے جائز تعویذات بھی اس وقت ممنوع ہو جاتے ہیں جب ان کو لوگ موثر بالذات ماننا شروع کر دیتے ہیں۔

تقدیر میں بحث نہ کرو

﴿۲۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدْرِ فَعَضِبَ حَتَّى لَأَمَحَّرَ وَجْهُهُ حَتَّى كَانَمَا فِيقَىٰ فِي وَجْهَتَيْهِ حَبُّ الرُّمَانِ فَقَالَ أَيْلَئِكَ أَمْرُكُمْ أَمْ يَهْدَانَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ إِنَّمَا هَلَاكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِينَ تَنَازَعُوا فِي هَذَا الْأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَنْ لَا تَنَازَعُوا فِيهِ. (رواه الترمذی وروى ابن ماجه نحوه عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم قضاء و قدر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ تشریف لے آئے (ہمیں اس مسئلہ میں الجھا ہوا دیکھ کر) آپ ﷺ کا چہرہ انور غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انار کے دانے آپ کے رخسار پر پھوڑ دیئے گئے ہیں (اسی حالت میں) آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسی لئے تمہارے پاس (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں؟ جان لو! تم سے پہلے کے لوگ اس لئے ہلاکت کی وادی میں پھینک دیئے گئے کہ انہوں نے اس سلسلے میں الجھنا پنا مشغلہ بنالیا تھا۔ لہذا میں تمہیں اس بات کی قسم دیتا ہوں (اور پھر دوبارہ) قسم دیتا ہوں کہ تم اس مسئلہ پر بحث نہ کیا کرو (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اسی طرح کی روایت عمرو بن شعیب سے نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔

توضیح: تننازع: یعنی یہ بحث تھی مثلاً ایک فریق کہہ رہا تھا کہ جب سب کچھ اس عالم کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے تحت ہو رہا ہے تو پھر گناہ گاروں کو عذاب کیوں دیا جاتا ہے۔ دوسرا فریق کہہ رہا تھا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ بعض بندوں کو جنت کے لئے اور بعض کو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا۔

فغضب: حضور اکرم ﷺ کی ناراضی اس لئے تھی کہ مسئلہ تقدیر "سور من اسرار اللہ" ایک پوشیدہ راز ہے جہاں تک عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہے اس میں جستجو گمراہی تک پہنچا دیتی ہے نیز جو چیز عقل انسانی کے دائرہ کار سے باہر ہو اس میں بحث مباحثہ کرنا بے سود ہے پھر انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہے تو غلام اگر اپنے آقا کی حکمتوں کی جستجو شروع کر دے کہ یہ کیوں کیا یہ کیوں نہ کیا یہ کیسا کرنا ہے یہ کیسا کرو گے کیوں کرو گے یہ سوالات کرنا بڑی بے ادبی بھی ہے اور اس کا نتیجہ یا جبری ہے یا قدری ہے اور یا کفری ہے۔

اس لئے آنحضرت ﷺ سخت ناراض ہوئے اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک نوکر اپنے آقا سے کہتا ہے کہ آج آپ کیا کام کریں گے؟ کہاں کریں گے؟ کیوں کریں گے؟ اور شہر میں کہاں کریں گے اور کب کریں گے ان سوالات سے آقا اس کو کام سے فارغ کر دے گا کہ تم کو میں نے چوکیداری پر مقرر کیا تھا میرے کاموں میں حکمتیں اور علما

ڈھونڈنے کے لئے نہیں رکھا تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ تقدیر کے مسئلہ میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

لہذا تقدیر کا اثبات صرف مسلمانوں کے ذمہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ عقلیہ ہے اس کا سمجھنا سمجھانا سب کے ذمہ ہے۔
 کائنات فانی وجنتیہ: گویا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار میں انار کے دانے نچوڑے گئے ہوں یہ غضب اور غصہ کی وجہ سے ہوتا تھا، صاف دل لوگوں پر ایسا اثر ہوتا ہے اور اثر چہرہ پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔
 عزمت علیکم: یعنی میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ ایسا نہ کرو عربی محاورہ میں یہ ہوتا تھا کہ تمہیں قسم دیتا ہوں پشتونوں میں بھی یہ دستور ہے کہ مہمان کو قسم دے کر کہتے ہیں کہ اور کھاؤ۔

انسان میں مٹی کی صفات نمایاں ہیں

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبْضَتِهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدْرِ الْأَرْضِ مِنْهُمْ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْحَبِيبُ وَالطَّيِّبُ. (رواه أحمد والترمذي وأبو داود)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ایک مٹی (مٹی) سے کی جو ہر جگہ کی زمین سے لی گئی تھی لہذا آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے موافق پیدا ہوئی چنانچہ (انسانوں میں) بعض سرخ، بعض سفید، بعض کالے، بعض درمیانہ رنگ کے، بعض نرم مزاج، بعض تند مزاج، بعض پاک اور بعض ناپاک ہیں۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: فجاء بنو آدم: یعنی اولادِ آدم اس قبضہ ارض کی کیفیات کے مطابق پیدا ہوئی جس قبضہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر تیار کیا گیا تھا، علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان میں یہ چار رنگ مشہور تھے تو اس کا ذکر فرمایا۔ یعنی احمر، ابیض، اسود اور بین بین، یہ انسان کے ظاہری اوصاف ہیں اسی کے مطابق انسان پیدا ہوا ہے یعنی کیفیات ارضی اور خصوصیاتِ خاکی حضرت آدم علیہ السلام میں آئیں تو پھر اولادِ آدم میں بھی آئیں ان ظاہری اوصاف کے مقابلہ میں چار باطنی اوصاف کا ذکر بھی کیا گیا جنہیں السهل والحزن سے شروع کیا گیا، سہل نرم زمین اور حزن سخت زمین کو کہتے ہیں یہاں سہل سے نرم اخلاق کا مالک شخص مراد ہے اور الحزن سے تند مزاج اور سخت بد اخلاق شخص مراد ہے۔ الطیب نہایت کریمہ رائج رکھنے والی چیز کو کہتے ہیں اس سے مراد نہایت شریر بد بودار سڑا ہوا کافر ہے۔ الطیب خوشبودار اور رائج طیبہ رکھنے والی چیز کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد خیر و صلاح رکھنے والا مومن ہے۔

لے المرقاۃ ۱/۲۲۲ لے المرقاۃ ۱/۲۲۲ لے احمد ۲/۲۰۰ والترمذی ۲۴۵ ج و ابو داؤد ۲۹۲

لے الکشاف ۱/۲۲۵ مرقاۃ ۱/۲۰۱ لے المرقاۃ ۱/۲۰۱ لے المرقاۃ ۱/۲۰۱ لے المرقاۃ ۱/۲۰۱

اب نور ہدایت صرف اسلام میں ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ فِي ظِلِّهِ قَائِلِي عَلَيْهِمْ مِنْ نُورِهِ فَمَنْ أَصَابَهُ مِنْ ذَلِكَ النُّورِ اهْتَدَى وَمَنْ أَخْطَأَهُ ضَلَّ فَلِذَلِكَ أَقُولُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلَى عِلْمِ اللَّهِ (رواه الترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (جن و انس) کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا پر تو ڈالا، لہذا جس کو اس نور کی روشنی میسر آگئی وہ راہِ راست پر لگ گیا اور جو اس کی مقدس شعاعوں سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تقدیر الہی پر قلم خشک ہو چکا ہے (کتاب تقدیر میں تغیر و تبدل ممکن نہیں)۔“ (احمد ترمذی)

توضیح: فی ظلمۃ: حافظِ تورینٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظلمۃ سے مراد وہ خواہشات اور فحشوات ہیں جو انسان کی طبیعت میں ہیں اور انسان کی تخلیق کے وقت سے اس کے ساتھ ہیں اور ”خلق مخلوقہ“ سے مراد انسان اور جنات ہیں فرشتے اس سے خارج ہیں اور ”من نورہ“ سے شریعت اور وہ براہین مراد ہیں جن سے ہدایت کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ سہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظلمت سے مراد بچپن کا زمانہ ہے جس میں انسان پیدا ہوتا ہے اور نور سے مراد یہ کہ بڑا ہو کر براہین شریعت کو اپناتا ہے یہ اس کے لئے نورِ ہدایت ہے۔ بہر حال انسان بالطبع ہدایت و شریعت کا محتاج ہے ورنہ باد لے کتے کی طرح ایک درندہ ہے۔

من نورہ: میں اضافت تشریفی ہے اور نور سے مراد اللہ کا پیدا کردہ نورِ ہدایت ہے اللہ کا جزء مراد نہیں ہے۔

انسان ہر وقت خطرہ میں ہے

﴿۲۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُكَلِّمُ أَنْ يَقُولَ يَا مُقَلِّبِ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللَّهِ آمَنَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهِ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ إِنَّ الْقُلُوبَ بَيْنُ اضْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللَّهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ (رواه الترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ اکثر و بیشتر بطور دعا کے یہ فرماتے تھے ”اے قلوب کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ! میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین و شریعت پر بھی ایمان لائے تو کیا اب بھی ہمارے بارے میں آپ ڈرتے ہیں (کہ کہیں ہم گمراہ نہ ہو جائیں)“ آپ ﷺ

نے فرمایا ہاں تم پر ڈرتا ہوں کیونکہ ”بے شک قلوب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ (یعنی اس کے تصرف و اختیار میں ہیں) اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو ٹرڈش میں لاتا ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: فہل تخاف علینا: یعنی آپ تو معصوم ہیں آپ نے اوروں کی ہدایت کے لئے دین و شریعت پیش کیا ہے آپ کے بارے میں احتمال نہیں کہ سرموراہ ہدایت سے بھٹک جائیں تو اب ظاہر یہ ہے کہ یہ دعا آپ ہمارے لئے کرتے ہوں گے تو کیا شریعت پر ایمان لانے کے باوجود آپ کی موجودگی میں بھی ہمارے گمراہ ہونے کا احتمال ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ”نعم“ ہاں تمہارے پھر جانے سے ڈرتا ہوں کیونکہ انسان کا دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے لہذا کسی وقت بھی بھٹکنے کا خطرہ ہے اس لئے ہر وقت حفاظت ایمان کی دعا کرنی چاہیے۔

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَقْلُ الْقَلْبِ كَرِيْشَةٍ بِأَرْضٍ فَلَا قِيْلَ بِهَا الزِّيَاحُ ظَهَرَ الْبَطْنُ۔ (رواۃ ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”دل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پرکھی میدان میں پڑا ہوا اور ہوائیں اسے پیچھے سے پیٹھ اور پیٹ سے پیچھے کی طرف پھیرتی رہتی ہیں۔“ (احمد)

توضیح: کریشہ: ریشہ پرندے کے پر کو کہتے ہیں اس حدیث میں یہ انسانوں کے دلوں کا حال بتایا کہ کبھی برائی سے بھلائی کی طرف رخ کرتے ہیں اور کبھی بھلائی سے برائی کے راستہ پر جا نکلتے ہیں جیسا کہ چٹیل میدان میں ہواؤں کے سامنے پرندوں کا پر ہو جو ہواؤں سے الٹ پلٹ ہو رہا ہو اور کسی بھی وقت ادھر ادھر ہو سکتا ہو یہ دل کے بہت جلدی بدلنے کو بیان کیا ہے کہ خواہشات کی وجہ سے وساوس اور ہوا جس و خطرات کی وجہ سے کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے لہذا آدمی کو چوکنا رہنا چاہیے۔

ظہر البطن: یعنی اوپر نیچے ہو رہا ہو کبھی پیٹھ اور کبھی پیٹ کی طرف پلتا رہتا ہو۔

چار چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ يَشْهَدُ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالتَّبَعِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ۔ (رواۃ الترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے ① اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ② اور میں بلاشبہ خدا کی جانب سے بھیجا ہوا رسول ہوں اور حق (دین اسلام) لے کر اس دنیا میں آیا ہوں ③ موت اور مرنے کے بعد (میدان

مختصر میں) اٹھنے پر ایمان ۵ اور تقدیر پر ایمان لانا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: یومن ہا ربیع: اقرار شہادتین کے ساتھ تقدیر کو جوڑا گیا اس سے یہ اشارہ کیا گیا کہ تقدیر کا ماننا اور شہادت دو وحدانیت کا ماننا ایک ہی مقام رکھتا ہے شیخ عبدالحق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن بننے کیلئے اقرار شہادتین تو ضروری ہو اور تقدیر پر ایمان ضروری نہ ہو جس طرح حقیقت ایمان کا تحقق شہادتین کے ماننے سے ہوتا ہے اسی طرح تقدیر کا ماننا حقیقت ایمان کے لئے ضروری ہے یہ نہیں کہ اگر تقدیر پر ایمان نہیں تو ایمان کامل نہیں ہوگا بلکہ ناقص ہوگا فرمایا ایسا نہیں بلکہ اگر تقدیر پر ایمان نہیں تو ایمان ہی نہیں ایمان بالموت کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے تمام چیزیں عارضی اور فانی ہیں اور ہر ذی روح کیلئے موت لازمی اور یقینی ہے اور یہ موت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگرچہ اس کی نسبت خارجی حوادث کی طرف ہوتی ہے۔

جواب: یہاں پانچ چیزوں کا ذکر ہوا ہے اور حکم چار کا تھا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ شہادتین میں "انی رسول اللہ" الگ نمبر نہیں بلکہ یہ شہادت کے ضمن میں ہے۔

والبعث: یعنی اس پر ایمان ہو کہ قیامت آئے گی ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا انسان جسد غضری کے ساتھ وہاں حاضر ہوگا حساب دے گا اگر کامیاب ہو گیا تو جنت میں جائے گا ورنہ دوزخ میں جائے گا۔ ویومن باللہ ایمان باللہ میں جو مباحث تھے وہ ابتداء میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیر مقرر فرما کر تسلی اور صبر کا بڑا سامان فراہم کیا ہے پس جو لوگ تقدیر کو مانتے ہیں وہ ہر مصیبت پر یہ کہتے ہیں کہ بس تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا تقدیر کا فیصلہ تھا اس سے حادثہ کے وقت بہت ہی سہارا ملتا ہے لیکن جو لوگ تقدیر کو نہیں مانتے جیسے کافر یا منکرین تقدیر تو وہ حادثہ کے وقت سوائے درد و غم اور افسوس و الم کے کیا حاصل کر سکتے ہیں ان کے پاس سہارے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا چنانچہ غم برداشت کرتے کرتے پگھل جاتے ہیں۔

۱۰۱۰

قدر یہ جبر یہ کون ہیں؟

﴿۲۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي لَيْسَ لَهُمَا فِي الْإِسْلَامِ نَصِيبُ الْمَرْجَةِ وَالْقَدَرِ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہر کار و دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کو اسلام کا کچھ بھی حصہ نصیب نہیں ہے اور وہ "مرجہ" و "قدر" ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

توضیح: صنفان من امتی: اس حدیث میں دو قسم کے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ اگرچہ یہ لوگ

اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کریں گے لیکن اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ایک قدرتیہ کی جماعت اور دوسرے مرجہ کی جماعت۔

اصحی: امت کی دو قسمیں ہیں امت دعوت اور امت اجابت۔ امت دعوت میں وہ تمام جن و انس داخل ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قیامت تک وجود میں آئیں گے اور جنہوں نے اسلام کو اب تک قبول نہیں کیا ہے جب تک وہ کفر پر قائم رہیں گے امت دعوت میں شمار ہوں گے امت اجابت سے مراد امت کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کو قبول کر لیا۔ لے
مرجہ: سے مراد جبریہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ معزز نہیں ہے جس طرح کفر کے ساتھ کوئی نیکی معتبر نہیں ہے ان کے نزدیک انسان مجبور محض اور اپنے اعمال میں بے بس ہے یہ لوگ اسباب کے قائل نہیں، کہتے ہیں کہ اعمال کی نسبت انسان کی طرف ایسی ہے جیسے پتھر یا درخت کی طرف کسی عمل کو منسوب کیا جائے مرجہ سے مشہور فرقہ مرجہ مراد نہیں ہے۔ لے

قدریہ: اس فرقہ کو یا تو اس لئے قدریہ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر کے منکر ہیں یا اس لئے ان کو قدریہ کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر بحث تقدیر میں کرتے رہتے ہیں یا اس لئے ان کو قدریہ کہتے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے افعال کی تخلیق کی قدرت دے دی ہے افعال کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال خیر کا خالق اللہ ہے اور افعال شر کا خالق نفس امارہ یا شیطان ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ قدریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال خیر کا خالق ”نور“ ہے اور افعال شر کا خالق ”ظلمت“ ہے دوسری حدیث میں ان کو اس امت کے مجوسی قرار دیا گیا ہے کیونکہ مجوسی بھی افعال کے دو خالق مانتے ہیں خیر کے افعال کا خالق ان کے ہاں ”یزدان“ اور شر کا خالق ”ابرمسن“ ہے بہر حال یہ دونوں فرقے ایک حد تک گمراہ ہیں نور و ظلمت کی طرف افعال کو منسوب کرنے والوں کے بارے میں متنبی کہتا ہے۔ لے

وكم لظلام الليل عندى نعمة تخبر ان المانوية تكذب

لیس لہما فی الاسلام نصیب: جبریہ اور قدریہ کے بارے میں سلف صالحین کی دورائیں ہیں۔

بعض نے ان کو کافر قرار دیا ہے اور بعض نے کافر نہیں کہا بلکہ مبتدع اور فاسق فاجر کہا ہے دونوں قولوں پر اس مذکورہ حدیث کی وجہ سے اشکال اٹھتا ہے اگر ان کو کافر کہا جائے تو اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ان کو ”من امتی“ فرمایا ہے اگر ان کو صرف فاسق مبتدع کہا جائے تو اشکال یہ ہے کہ حدیث میں ان کے متعلق فرمایا کہ ”لیس لہما فی الاسلام نصیب“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اسلام سے خارج ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اہل تاویل ہیں ان کی تکفیر نہیں کرنی چاہیے جمہور اہل السنۃ بھی کہتے ہیں کہ ان کی تکفیر سے زبان کو روکا جائے کیونکہ یہ لوگ صریح کفر کا اقرار نہیں کرتے اور نہ کفر کا ارادہ رکھتے ہیں اگرچہ ان کے عقائد خطرناک حد تک جانپنچے ہیں لیکن انہوں نے کفر کا ارادہ نہیں کیا ہے اور تاویل کرتے ہیں اس لئے ان کے متعلق احادیث

میں جو وعیدات ہیں یا تکفیر کے اشارات ہیں علماء اور محدثین اس میں تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ حدیث میں نصیب سے مراد یا تو یہ ہے کہ کامل حصہ اسلام کا ان کو نہیں ملا یہ ناقص مسلمان ہیں یا نصیب بخت و قسمت کے معنی میں ہے کہ یہ بد بخت ہیں بد نصیب ہیں یا یہ تغلیظ و تشدید پر محمول ہے اب رہ گیا مذکورہ حدیث پر اوپر مذکور دو طرح کا اشکال تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے اوپر گزر چکا ہے کہ امت دو قسم پر ہے امت اجابت اور امت دعوت۔ حدیث میں ان کو امتی سے جو یاد کیا ہے اس سے امت دعوت مراد لی جاسکتی ہے اور یہ ان لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا جو ان کی تکفیر کرتے ہیں اور جو لوگ تکفیر نہیں کرتے وہ "نصیب" میں وہی تاویل کرتے ہیں جو اوپر متعدد اقوال میں گزر رہی ہے۔

تقدیر کے منکرین کو سزا

﴿۲۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ يَكُونُ فِي أُمَّتِي خَسْفٌ وَمَسْخٌ وَذَلِكَ فِي الْمَكَلِّينَ بِالْقَدْرِ. (رواہ ابو داؤد و ترمذی و ابوداؤد و ترمذی و ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں (خدا کے دردناک عذاب) زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہو جانا بھی ہوگا اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں (ابوداؤد) امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

توضیح: خسف: زمین میں دھنس جانے کو خسف کہتے ہیں مسخ شکل بگڑ جانے کو مسخ کہتے ہیں "ہو قہویل صورۃ الی ما ہو اقبح منها" اس مسخ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ ابدان و اجسام اور پیرے سب چھوٹا کر دیے اور بندروں کی شکل میں بدل جائیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوموں میں ہوا جنس انسانیت نے خسف سے چھوٹ کر سیاہ ہونا اور مسخ سے دلوں کا سیاہ ہونا مراد لیا ہے یہ "خسف" اور یہ "مسخ" تو روز روشن کی طرح اس امت میں عام ہے۔

جواب: سوال یہ ہے کہ خسف اور مسخ کا عذاب سابقہ امتوں پر آتا تھا اس امت کے لئے آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی جو قبول ہوئی پھر خسف اور مسخ کیسے؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں یہ عذاب بطور عموم آتا تھا وہ اس امت کے لئے اب بھی منفی ہے حدیث میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک مخصوص فرقہ کے لئے مخصوص احوال میں ہے۔

اس امت کے مجوس

﴿۲۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَبِيضُ طَلِيقِ الْأُمَمِ إِنْ مَرُّوا فَلَا تَعُوذُ لَهُمْ وَإِنْ مَاتُوا فَلَا تَشْهَدُ لَهُمْ. (رواہ احمد و ابوداؤد و ترمذی و ابوداؤد)

﴿تَوَجَّهْ﴾: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرقہ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں لہذا اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کے لئے نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں شریک مت ہونا۔“ (احمد، ابوداؤد)

توضیح: القدیریہ مجوس ہذا الامۃ: قدریہ کو اس لئے مجوس کہا گیا کہ مجوس بھی تعددِ خالق کے قائل ہیں ان کے ہاں ایک خالق خیر ہے جس کو وہ لوگ ”یزدان“ کہتے ہیں اور دوسرا خالق شر ہے جس کو وہ لوگ ”اہرمن“ کہتے ہیں یزدان کو یا ان کے ہاں رحمان ہے اور اہرمن شیطان ہے قدریہ چونکہ تقدیر کے منکر ہیں اور بندوں کے افعال کا خالق بندوں کو قرار دیتے ہیں اس لئے ان کو اس امت کا مجوسی قرار دیا لیکن یہ مجوسیوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ مجوسی صرف دو خداؤں کے قائل ہیں اور قدریہ معتزلہ بے شمار خالقوں کو مانتے ہیں۔ ۱۔

فلا تعوذوہم: یعنی ان کی عیادت نہ کرو جو لوگ قدریہ کو کافر مانتے ہیں ان کے نزدیک تو یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ کافر ہیں تو ان کی عیادت نہ کرو بلکہ سوشل بائیکاٹ رکھو اور جو لوگ قدریہ کی تکفیر نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ کلام تغلیظ و تشدید اور زجر و توبیخ پر مبنی ہے۔ ۲۔

وان ماتوا: یعنی مرنے کے بعد ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرو اس کا مطلب بھی وہی ہے جو پہلے جملے کا ہے۔ ۳۔

اہل باطل سے میل جول نہ رکھو

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَجَالِسُوا أَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تَفَاتِحُوهُمْ (رواہ ابوداؤد)

﴿تَوَجَّهْ﴾: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قدریہ کی ہم نشینی اختیار نہ کرو اور نہ ان کو اپنا حکم ثالث بناؤ۔“ (ابوداؤد)

توضیح: لا تجالسوا: یہ ایک نمونہ ہے جس سے امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اہل باطل اہل نفاق اور بد عقیدہ اور گمراہ لوگوں کی مجالس سے اجتناب رکھو اور ان سے اختلاط نہ رکھو خاص کر جو لوگ دین اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں ان سے میل جول رکھنا تو درحقیقت ان کے اعمال میں شریک ہونا ہے۔ ۱۔

ولا تفاتحوہم: اس جملہ کے کئی مطالب ہیں: ① ان کے پاس فیصلے نہ لے جاؤ و فتاحہ کا معنی فیصلہ ہے۔ ② ان سے ابتداء میں سلام کلام نہ کرو۔ ③ ان سے مناظرہ نہ کرو کیونکہ وقت ضائع ہوگا اور فائدہ کی امید نہیں بلکہ نقصان کا خطرہ ہے۔ ۴۔

چھ قسم کے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سِتَّةٌ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ مُّجْتَابٍ الزَّائِدُ فِي كِتَابِ اللَّهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدْرِ اللَّهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوتِ لِيُعْزَّزَ مَنْ أَدْلَهُ اللَّهُ وَيُذِلَّ مَنْ أَعَزَّكَ

اللَّهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللَّهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عَثْرَتِي مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَالْثَّارِلُ لِسُنَّتِي۔

(روافد البیہقی فی المستحل والیستحل فی کتابہ)۔

تذکرہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور خدا نے بھی ان کو ملعون قرار دیا ہے اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے (پہلا) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا (دوسرا) تقدیر الہی کو جھٹلانے والا (تیسرا) وہ شخص جو زبردستی غلبہ پانے کی بناء پر ایسے شخص کو معزز بنائے جس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کر رکھا ہو اور اس شخص کو ذلیل کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت و عظمت کی دولت سے نوازا رکھا ہو (چوتھا) وہ شخص جو حدود اللہ سے تجاوز کر کے اس چیز کو حلال جانے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو۔ (پانچواں) وہ جو میری اولاد سے وہ چیز (قتل) حلال جانے جو اللہ نے حرام کی ہے اور (چھٹا) وہ شخص ہے جو میری سنت کو چھوڑ دے۔“ (تتقی رزین)

توضیح: وکل ذبی بھاب: یعنی ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے تو میری بھی قبول ہوئی۔

لعنہم: لعنت دو قسم پر ہے: ① لعنت کفر وہ ”ابعاد من رحمۃ اللہ“ ہے جو کفار کے ساتھ خاص ہے۔

② دوم لعنت فسق ہے جو ”ابعاد من رضاء اللہ“ ہے یہ مسلم کے لئے ہے شریعت میں جو شخص قطعی طور پر کفر پر مرا ہے اس پر لعنت جائز ہے لیکن جس کی موت یقینی طور پر کفر پر نہ ہو تو اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے مثلاً فرعون ابو جھل کی موت کفر پر یقینی ہے اور یزید کی موت کفر پر یقینی نہیں ہے تو اول پر لعنت جائز ثانی پر نہیں اسی طرح اسلام میں کسی معین شخص کو ملعون نہیں قرار دیا جاسکتا ہاں اعمال و افعال کی وجہ سے ایسا ہی طور پر لعنت فسق احادیث میں آئی ہے مذکورہ حدیث میں یہ چھ باتیں اگر کفار کے لئے ہیں تو یہ لعنت کفر ہے اور اگر یہ لوگ دائرہ اسلام میں ہیں تو یہ لعنت فسق ہے حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ تغلیظ تشدید ہے۔

① الزائد فی کتاب اللہ: اگر کتاب اللہ کے الفاظ میں کوئی زیادتی کرتا ہے یا اس کا قائل ہے تو وہ کافر ہے اور اگر

معنوی طور پر تاویل و تحریف کرتا ہے تو وہ مبتدع اور فاسق فاجر ہے کہ مخلف شرع تاویل کرتا ہے۔

② المکذب بقدر اللہ: یہ وہی معتزلہ خوارج اور قدریہ ہیں۔

③ المتسلط بالمجہدوت: یعنی انتہائی تکبر اور غرور و تجبر سے حکومت پر غلبہ پانے والا ”لیعز“ یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی وجہ سے عزت دی ان کو ذلیل کرے اور جن کو اللہ نے فسق کی وجہ سے ذلت دی اس کو عزت دے۔

④ والمستحل لحرم اللہ: اسی بیت اللہ کہ حرم کعبہ میں قتل کرے شکار کرے اور گھاس کاٹے۔

⑤ والمستحل من عثرتي: یعنی اہل بیت کے احترام کو پامال کرے ان کی تعظیم میں کوتاہی کرے ان کے حقوق کو

غضب کرے ان کو ایذا پہنچائے۔

① اخرجہ البیہقی ② المرقاٹ ③ المرقاٹ ④ المرقاٹ ⑤ المرقاٹ

① المرقاٹ ② المرقاٹ ③ المرقاٹ ④ المرقاٹ ⑤ المرقاٹ

● التارک لستمی: ترک سنت علی طریق الہامہ مراد ہے جیسے دائرہ کا مذاق اڑائے تو روح ایمان نہیں رہے گی اگرچہ کلمہ گو ہے۔ لے

جہاں موت آئے گی انسان وہاں جائے گا

(۳۱) وَعَنْ مَطَرِ بْنِ عَكْلَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَضَى اللَّهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَمُوتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَٰهًا حَاجَةً. (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت مطر بن عکلس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کو کسی زمین میں مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین کی طرف اس کی حاجت کو بھی پیدا کر دیتا ہے (تاکہ وہاں جانے پر مجبور ہو) اور وہاں جا کر موت کا شکار ہو۔“ (احمد زئی)

توضیح: جعل له الہا حاجۃ: جس طرح اکثر لوگ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں مٹی لے آئی ہے تو تقدیر کے تحت آدمی اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اس کی موت مقدر ہوتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا قصہ مشہور ہے کہ ملک الموت نے گھور گھور کر اس کو دیکھا اس نے ڈر کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ مجھے دور کسی جزیرہ میں لے چلو جب یہ جزیرہ پہنچ گیا تو موت کے فرشتے نے روح لے لی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پوچھنے پر فرشتہ نے بتایا کہ اس کی موت یہاں مقدر تھی وقت کم تھا یہ یہاں سے کوسوں میل دور بیٹھا تھا تو میں نے یہ حربہ استعمال کیا یہ ڈر گیا یہاں آ گیا تو موت بھی آ گئی۔ لے

فوت شدہ چھوٹے بچے کا حکم

(۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَدْ أَرَى الْمُؤْمِنِينَ قَالَ مِنْ آبَائِهِمْ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَلَا عَمَلٍ قَالَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ قُلْتُ قَدْ أَرَى الْمُشْرِكِينَ قَالَ مِنْ آبَائِهِمْ قُلْتُ بَلَا عَمَلٍ قَالَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ. (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا ”یا رسول اللہ! (جنت و دوزخ کے سلسلہ میں) مسلمان بچوں کا کیا حکم ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں (یعنی وہ اپنے باپوں کے ساتھ جنت میں ہیں)۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ بغیر کسی عمل کے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے۔“ میں نے پھر پوچھا ”اچھا شرکوں کی اولاد کے بارے میں کیا حکم ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں“ میں نے (تعجب سے) پوچھا ”بغیر کسی عمل کے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے۔“ (ابوداؤد)

اپنے بچے کو قتل کرنے والی ماں کی سزا

﴿۳۳﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْوَائِدَةُ وَالْمَوْدُودَةُ فِي النَّارِ. (رواہ ابو داؤد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ” (زندہ بچہ کو) گاڑنے والی (عورت) اور وہ جس کو گاڑا گیا دونوں دوزخ میں ہیں۔“ (ابوداؤد)

توضیح: الوائِدَة: زمانہ جاہلیت میں اولاد کو زندہ درگور کرنے کا عمل عرب کے امیر و غریب دونوں گھرانوں میں ہوتا تھا مگر دو قسم کے نظریات کے تحت یہ عمل ہو رہا تھا ① کہ فقر و فاقہ ہے یا آئندہ آجائے گا ② کہ میری بچی ہے کل کسی کی بیوی بنے گی اس کو کیسے برداشت کروں گا یہ شرم و عار کی بات ہے (حالانکہ خود بھی کسی کی بیوی سے پیدا ہوا تھا)۔
جواب: شبہ یہ ہے کہ وائِدَة زندہ درگور کرنے والی عورت تو ظاہری طور پر قائلہ ہے جو دوزخی ہے لیکن یہ موؤدَة مقتولہ کیوں دوزخ کی مستحق بن گئی؟ مقتولہ مظلومہ کا کیا قصور ہے۔

﴿۳۴﴾ الوائِدَة سے مراد قابلہ دایہ ہے اور المودودَة سے مراد موؤدَة لہا ہے جو ماں ہے تو یہ دایہ اور ماں دونوں اس جرم میں شریک ہیں اس لئے اصحابِ نار ہیں۔

﴿۳۵﴾ یہ کہ ظاہر حدیث سے اولاد کی تبعیت معلوم ہوتی ہے کہ ماں کا فرہ دوزخی ہے تو بچی بھی اسی طرح ہے۔
﴿۳۶﴾ یہ کہ اس سے زندہ درگور ہونے والی بالذکر کی مراد ہے تو اس وقت وہ خود کا فرہ تھی۔ س

۱۲ محرم ۱۲۱۰ھ

الفصل الثالث

پانچ چیزوں کا فیصلہ ہو چکا ہے

﴿۳۷﴾ وَعَنِ أَبِي الدُّدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ أَلَّهَ عَزَّ وَجَلَّ فَرَعَ إِلَى كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهِ مِنْ تَحْسِينٍ مِنْ أَجْلِهِ وَتَكْمِلَةٍ وَمُضْجَعِهِ وَأَثَرِهِ وَرِزْقِهِ. (رواہ احمد)

حضرت ابودراء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے (تقدیر لکھ کر) فارغ ہو گیا ہے۔ ① اس کی موت (کہ کب آئے گی) ② اس کے (نیک و بد) اعمال۔ ③ اس کے رہنے کی جگہ۔ ④ اکی واپس کی جگہ ⑤ اور اس کا رزق۔ (احمد)

توضیح: فرغ الی کل عبد: فرغ انتہی کے معنی کو متضمن ہے اس لئے صلہ میں، الی، کا کلمہ آ گیا ہے۔ مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے ہر بندے کے متعلق پانچ باتوں سے تقدیر لکھ کر فارغ ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم ان پانچ چیزوں تک منتهی ہو گیا ہے۔ ہ

خلقہ: تخلیق کے معنی میں ہے یعنی ہر بندہ کی تخلیق کے پانچ کاموں سے فراغت ہوئی، یعنی دنیا میں جو چیزیں جس طرح آنے والی ہیں ازل میں اس کا فیصلہ ہو گیا ہے اس میں اب کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی تغیر آ سکتا ہے چنانچہ ہر انسان کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے:

- ① کہ اس کی عمر کتنی ہے اور موت کب آئے گی اس میں ایک سیکنڈ کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔
- ② اسی طرح انسان کے اچھے اور برے اعمال کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کا انجام خیر پر ہوگا یا شر پر ہوگا بعض نے کہا کہ مضجع سے مراد سکون و قرار ہے اور اثر سے مراد حرکت ہے انسان کی تمام کیفیات ان دو لفظوں میں آگئیں۔ یا اثرہ سے اقدام مراد ہیں کہ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کے قدم کہاں کہاں پڑیں گے آیت ”و نكتب ما قدموا و آثارهم“ اس پر دلالت کرتی ہے۔
- ③ اسی طرح انسان کے رزق کا مسئلہ تقدیر میں پہلے سے لکھا جا چکا ہے کہ کتنا رزق اس کو ملے گا کہاں کہاں سے کمائے گا کم ملے گا یا زیادہ ملے گا حلال ملے گا یا حرام ملے گا سب کچھ تقدیر میں پہلے سے لکھا گیا ہے۔

تقدیر میں گفتگو نہ کرو

﴿۳۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ تَكَلَّمَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقَدْرِ يُسْئَلُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيهِ لَمْ يُسْأَلْ عَنْهُ (رواہ ابن ماجہ)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”جو شخص تقدیر کے مسئلہ میں بحث و مباحثہ کرے گا قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی اور جو (شخص اس پر ایمان لا کر) خاموشی اختیار کرے گا وہ اس مواخذہ سے بچ جائے گا۔“ (ابن ماجہ)

توضیح: من تکلم: مباحثہ غیر ضروری مراد ہے کیونکہ اس کا انجام یا قدری ہے یا جبری ہے یا کفری ہے اس لئے اس میں گفتگو سے منع کیا گیا ہے ہاں جس کو اعتماد ہو اور اس کو علمی و عقلی جستجو کا مقام حاصل ہو اور وہ تردد سے پاک ہو تو اس کے لئے فرق باطلہ کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لئے اور ان سے مباحثہ کرنے کے لئے ضروری حد تک مباحثہ جائز ہے تاکہ حق واضح ہو جائے علماء کرام اسی جستجو کے مقام پر تھے تو علم الکلام میں کلام کیا اور کتب تصنیف فرمائیں۔

وہی ہوگا جو تقدیر میں لکھا ہے

﴿۳۶﴾ وَعَنِ ابْنِ الدِّينَالِيِّ قَالَ أَتَيْتُ ابْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِي نَفْسِي شَيْءٌ مِنَ الْقَدْرِ فَخَذَّ بِي لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَذْهَبَهُ مِنْ دَقْلِي فَقَالَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ عَذَّبَ أَهْلَ سَمَوَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ عَنْهُمْ هُوَ

غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمُ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَصْحَابِهِمْ وَلَوْ أَنْفَقْتُ مِثْلَ أُحُدٍ خَبْرًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا قَبِلَهُ اللَّهُ مِنْكَ حَتَّى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَإِنْ مَا أَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبِكَ وَلَوْ مُنَّكَ عَلَى غَيْرِ هَذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِكَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ حَذِيفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ أَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَخَدَّثَنِي عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَ ذَلِكَ (رواه أحمد وداؤد وابن ماجه) ۱

ترجمہ: حضرت ابن دہلی رحمہ اللہ (تابعی) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو رہے ہیں (کہ جب تمام چیزیں نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر یہ ثواب یا عذاب کیسا؟) تو اس بابت آپ مجھے کچھ بتائیں شاید اللہ تعالیٰ میرے دل کو اس شبہ سے پاک کر دے (یہ سن کر) انہوں نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کرے تو وہ ان پر کسی طرح کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ (یعنی وہ اہل زمین اور اہل آسمان کو کتنا ہی عذاب دے اسے ظالم نہیں کہا جائے گا) اور اگر وہ ان کو اپنی رحمت سے نواز دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے یقیناً بہتر ہوگی۔ اور اگر تم خدا کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو تمہارا یہ عمل خیر خدا کے نزدیک اس دقت تک قبول نہیں ہوگا جب تک کہ تم تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھو اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم کو پہنچا ہے وہ (رکنے) اور خطا کرنے والا نہ تھا اور جو چیز رک گئی اور تمہیں نہیں پہنچی تو (سمجھو کہ) وہ تمہارے مقدر میں نہیں تھی۔ اور اگر تم اس حالت میں مر جاؤ کہ اس کے خلاف عقیدہ ہو (یعنی تقدیر پر کامل ایمان نہ ہو) تو یقیناً دوزخ میں جاؤ گے۔" ابن دہلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ بیان سن کر میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی یہی بیان کیا پھر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور پھر میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا انہوں نے بھی اس قسم کی حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا۔ (احمد و داؤد و ابن ماجہ)

توضیح: شیعی من القدر: یعنی میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں کہ جب سب کچھ پہلے سے مقدر میں لکھا جا چکا ہے تو پھر ثواب و عتاب کا قانون کس لئے ہے؟
یعنی یہ اضطراری کیفیات اور یہ ہوا جس باعث پریشانی ہیں اگرچہ باعث مواخذہ نہیں۔ ۱
فحدثنی: یعنی کوئی تسلی دہانی بات بیان کریں یا کوئی حدیث نبوی بیان کر دیں۔ ۲

"وہو غیر ظالم لہم": کیونکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے تصرف کا حق حاصل ہے اور اپنی ملکیت میں کسی قسم کا تصرف ظلم نہیں اس سے فرقہ قدریہ اور خوارج کی تردید مقصود ہے کہ وہ ہر تصرف کو اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں سمجھتے ہیں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جب اس تابعی نے پوچھا تو آپ نے

اس حدیث کو مرفوع حدیث کے طور پر بیان کیا۔ ۱۔
 ولورجھم: اس نے معلوم ہوا کہ دخول جنت کے لئے علت اعمال نہیں بلکہ رحمت خدا ہے اعمال صرف علامات ہیں۔
 وتعلم: یہ تو قن کے معنی میں ہے یعنی یقین کرلو۔ ۲۔
 لہد یکن لیعطشک: یعنی وہ چیز ایسی نہیں تھی کہ تجھ کو نہ پہنچتی تو یہ خیال نہ کرو کہ یہ میری محنت و کوشش کی وجہ سے مجھے حاصل ہوئی ہے بلکہ وہ تقدیر میں پہلے سے لکھی ہوئی تھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں اور انسانی محنت و کوشش تقدیر کے ماتحت ہے۔ ۳۔

منکرین تقدیر پر پتھر برسیں گے

﴿۳۷﴾ وَعَنْ تَابِعٍ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ إِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ فَقَالَ إِنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّهُ قَدْ أَخَذَتْ فَإِنْ كَانَ قَدْ أَخَذَتْ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ يَكُونُ فِي أُمَّتِي أَوْ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ خُسْفٌ وَمَسْخٌ أَوْ قَذْفٌ فِي أَهْلِ الْقَدْرِ.

(رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ و قال الترمذی هذا حديث حسن صحيح غريب)

تفسیر: حضرت تابع سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ”فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے۔“ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص نے دین میں (کوئی) نئی بات نکالی ہے۔ اگر واقعی اس نے دین میں (کوئی) نئی بات پیدا کی ہے تو میری طرف سے (جواب میں) اسے سلام نہ پہنچاؤ۔ اس لئے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے یا یہ فرمایا کہ اس امت میں سے (خدا کے) درو پاک عذاب زمین میں دھنسن جانا اور صورت کا مسخ ہو جانا یا سنگباری، اہل قدر (یعنی تقدیر کا انکار کرنے والوں) پر ہوں گے۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ، اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح و غریب ہے۔)

توضیح: فلا تقريئہ منی السلام: سلام کے مسائل و فضائل انشاء اللہ مشکوٰۃ کے باب السلام میں آئیں گے یہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کے سلام کے پیغام کے جواب میں قاصد سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سلام بھیجنے والے نے کچھ نئے نظریات اور نئی بدعات ایجاد کی ہیں اگر ایسا ہے تو میرا سلام ان کو نہ کہنا، اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں بدعت گھڑنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں، اسی لئے فقہاء کرام نے اہل بدعت کے ساتھ اختلاط اور ان کے اکرام و تعظیم کو مکروہ لکھا ہے۔ ۵۔

او قذف: یعنی تقدیر کے منکرین پر آسمان سے پتھر برسیں گے قوم لوط کی لواطت کی وجہ سے اس قوم پر آسمان سے

پتھروں کی بمباری ہوئی تھی یہاں مکرین تقدیر کے بارے میں پتھروں کے برسنے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیح عمل مکرین تقدیر میں بھی بڑے پیمانے پر ہوگا۔

اپنے بچوں کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سوال

﴿۳۸﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ خَدِيجَةَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ وَلَدَيْنِ مَا تَأْتِي لَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هُمَا فِي النَّارِ قَالَا فَلِمَا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِي وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَأَبْغَضْتَهُمَا قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَوْلِي مِمَّنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمُشْرِكِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ

(رواہ احمد)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے اپنے ان دو بچوں کے بارے میں پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) مر گئے تھے (کہ وہ جنتی ہیں یا دوزخی) سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ وہ دونوں (بچے) دوزخ میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چہرہ کا رنگ (اپنے بچوں کے بارے میں یہ سن کر) بدلا ہوا (یعنی ان کو رنجیدہ) دیکھا تو فرمایا ”اگر تم ان (بچوں) کے ٹھکانے اور ان کا حال دیکھو کہ کس طرح خدا کی رحمت سے دور ہیں تو تم کو ان (بچوں) سے نفرت ہو جائے گی پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! اچھا میری وہ اولاد جو آپ ﷺ سے پیدا ہوئی ہے (یعنی قاسم اور عبداللہ) آپ ﷺ نے فرمایا وہ جنت میں ہیں اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ”مومنین اور ان کی اولاد جنت میں ہیں۔ اور مشرکین اور ان کی اولاد دوزخ میں ہیں اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ (الطور)

ترجمہ: (جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کی اطاعت کی) (تو) ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) انہیں کے ساتھ رکھیں گے۔ (امر)

توضیح: عن ولدین: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ان دو بچوں کے متعلق پوچھا جو پہلے شوہر ”حالہ“ سے تھے اور جاہلیت میں مر چکے تھے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ وہ دونوں دوزخ میں ہیں، اس روایت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اولاد اپنے والدین کے تابع ہوگی۔ یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

لورایت مکانہما: یعنی ان بچوں کے مستقبل کو اگر تو دیکھ لیتی اور ان کا مبغوض عند اللہ ہونا تمہیں معلوم ہوتا تو تم خود ان کو مبغوض سمجھتی کیونکہ ان کا مستقبل تقدیر کے حوالہ سے انتہائی تاریک اور ڈراؤنا تھا۔

وَالْبَعْثُ خَرِيعُهُمْ: آنحضرت ﷺ نے بطور استعھا دیہ آپت تلاوت فرمائی کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے وہ بچے ملا دیئے جائیں گے جن بچوں نے والدین کی طاعت کی تاکہ جنت میں والدین کو کمال خوشی حاصل ہو جائے اور مشرکین کی اولاد کو دوزخ میں ان کے ساتھ ملا دیا جائے گا تاکہ کفار کو دوزخ میں کمال غم حاصل ہو جائے اب سوال یہ ہے کہ بیوی بچوں کے اس ملانے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت تو کمال درجہ کی ہوئی لیکن غیر نبی کو نبی کے مقام میں کیسے پہنچایا جائے گا مثلاً انبیاء کرام کی زوجات محترمت کو اور ان کی اولاد کو برابر کا درجہ کیسے حاصل ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے درجات تو بلند ہوں گے مگر لذت و استلذ از میں فرق ہوگا مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھانے میں وہ لذت نہیں پائیں گی جو نبی اکرم ﷺ کو نبوت کے درجہ کی وجہ سے حاصل ہوگی۔ لہ

حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی کچھ عمر دے دی

(۲۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَسَقَطَ مِنْ ظَهْرِهِ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبَيْنَ صَاحِبِهِ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى آدَمَ فَقَالَ أَمَى رَبِّ مَنْ هَؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَأَى رَجُلًا مِنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَبَيَّضَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ أَمَى رَبِّ مَنْ هَذَا قَالَ دَاوُدُ فَقَالَ أَمَى رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ قَالَ سِتِّينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِي أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَلَمَّا انْقَطَعَ عُمْرُ آدَمَ إِلَّا أَرْبَعِينَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ آدَمُ أَوْلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِي أَرْبَعُونَ سَنَةً قَالَ أَوْلَمْ تُعْطَهَا إِيَّاكَ دَاوُدُ فَجَعَلَ آدَمُ تَجَعَّدَ ذُرِّيَّتَهُ وَنَسِيَ آدَمَ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَتَنَسَّيَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَخَطَأَ آدَمُ وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهُ (رواه الترمذی)

مترجم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا (تو) ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا (یعنی فرشتے کو ہاتھ پھیرنے کا حکم دیا) چنانچہ ان کی پشت سے وہ تمام جانیں نکل پڑیں جن کو آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا اور ان میں سے ہر ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی پھر ان سب کو آدم علیہ السلام کے روبرو کھڑا کیا (ان سب کو دیکھ کر) آدم علیہ السلام نے پوچھا ”پروردگار! یہ کون ہیں؟ پروردگار نے فرمایا ”یہ سب تمہاری اولاد ہے“ آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان غیر معمولی چمک ان کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پوچھا ”پروردگار! یہ کون ہے؟“ فرمایا یہ داؤد (علیہ السلام) ہیں۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا ”میرے پروردگار! تو نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟“ فرمایا ”ساتھ برس“ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا ”میرے پروردگار! اس کی عمر میں میری عمر سے چالیس سال زیادہ کر دے۔“ (راوی کہتے ہیں کہ) سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر میں چالیس سال باقی رہ گئے

تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کہا ”کیا ابھی میری عمر میں چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا ”کیا آپ نے اپنی عمر میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیئے تھے؟“ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم علیہ السلام (اپنے عہد) کو بھول گئے، انہوں نے شجر ممنوعہ کو کھالیا اور ان کی اولاد بھی بھولتی ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی تھی اور ان کی اولاد بھی خطا کرتی ہے۔“ (ترمذی)

توضیح: وبیضا: ای لمعاثا وشعاثا من نور اس نور کی چمک سے مراد ہدایت کی وہ استعداد ہے جو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو عطا کی ہے حضرت داؤد علیہ السلام میں یہ نور زیادہ چمک دمک کے ساتھ روشن تھا اب سوال یہ ہے استعداد کی یہ روشنی حضرت داؤد علیہ السلام میں اگر زیادہ تھی تو آنحضرت ﷺ کے متعلق کیا کہا جائے گا اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ایک جزئی فضیلت تھی اور نبی اکرم ﷺ کو کئی فضیلت حاصل ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ محاورہ کلام کا دستور ہے کہ متکلم اپنے کلام سے خارج اور مستثنیٰ ہوتا ہے تو آنحضرت ﷺ نے دوسروں کی روشنیوں کا ذکر فرمایا ہے خود آپ کی روشنی اعلیٰ دار فاع ہوگی مگر وہ محل بحث نہیں تھی اس لئے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہ

قال داؤد: یعنی استعداد کی یہ روشنی حضرت داؤد علیہ السلام کی پیشانی میں سب سے زیادہ تھی تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو پسند کر کے ان کے بارے میں سوال کیا۔

جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ داؤد ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام میں خلافت ارضی کی قدر مشترک مناسبت موجود تھی اور ان دونوں کو خلیفہ کے لقب سے اس طرح یاد کیا گیا ”یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض“ اور ”انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی نظر انتخاب حضرت داؤد علیہ السلام پر پڑی۔ لہ

اربعین سنہ: اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ آیا ہے کہ آپ نے اپنی عمر سے چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیئے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن مشکوٰۃ شریف جلد دوم باب السلام فصل سوم ص ۴۰۰ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس طرح آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی اور حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو ساٹھ سال دے دیئے تو دونوں حدیثوں میں واضح تعارض اور تضاد ہے۔ لہ

اس کے جواب میں علماء نے لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث اور اس کا عدد صحیح ہے اور جلد دوم میں کسی راوی سے سہو ہو گیا ہے اس نے چالیس کو ساٹھ کی جگہ رکھ دیا اور ساٹھ کو چالیس کی جگہ بیان کیا ہے۔

فبعد آدم: یہ جھوٹا روایت نہیں تھا بلکہ جھوٹ سیانی تھا چونکہ عالم ارواح کا معاملہ تھا تو زمانے کے گزرنے سے ذہول آگیا، باقی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ معاملہ عالم ارواح کا تھا اب عالم شہود میں اگر کوئی شخص اپنی عمر کسی کو دینا چاہتا ہے تو یہ ناجائز بھی ہے اور ناممکن بھی ہے کیونکہ تعین عمر اور تعین موت دونوں امور تکوینیہ میں سے ہیں اس میں کسی کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

نکتہ:

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد انبیاء کرام میں نبوت اور خلافت کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ رکھا تھا کہ جو نبی ہوتا وہ خلیفہ نہیں ہوتا تھا اور جو خلیفہ ہوتا وہ نبی نہیں ہو سکتا تھا اللہ تعالیٰ نے نبوت اور خلافت کو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام پر جمع فرما دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد

﴿وَعَنْ أَبِي النَّذَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ جَدُّنَ خَلْقِهِ فَضَرَبَ كَيْفَهُ الْيُمْنَى فَأَخْرَجَ خُرْنَةً بَيْضَاءَ كَأَنَّهَا النَّذُّ وَضَرَبَ كَيْفَهُ الْيُسْرَى فَأَخْرَجَ خُرْنَةً سَوْدَاءَ كَأَنَّهَا الْحُمُّ فَقَالَ لِلْيَمْنَى فِي تَحِيَّاتِهِ إِلَى الْجَنَّةِ وَلَا أَبَالِي وَقَالَ لِلْيُسْرَى فِي كَيْفِهِ الْيُسْرَى إِلَى النَّارِ وَلَا أَبَالِي﴾

(رواہ احمد)

حضرت ابو ذر وہابیؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے داہنے مونڈھے پر ہاتھ (یعنی دستِ قدرت) مارا (یا مارنے کا حکم دیا) اور اس سے سفید اولاد نکالی گویا کہ وہ چوہنیاں ہوں پھر بائیں مونڈھے پر ہاتھ مارا اور اس سے سیاہ اولاد نکالی گویا کہ وہ کوئلہ ہوں پھر خدا نے دائیں طرف والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں اور ان (آدم) کے بائیں مونڈھے والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ روزنی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ (ترمذی)

توضیح: ضرب علی کتفہ: یہ تجلیات ربانی کے اقام کی ایک صورت تھی جیسے سورج کی شعاعیں کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کا اثر ہوتا ہے۔

بہیضہ: یہ سفیدی اور یہ روشنی نورِ ایمان اور استعدادِ اتمام کی نشانی تھی کہ دنیا میں آنے کے بعد یہ شخص نورِ ایمان کو اپنائے گا اور ہدایت پر آئے گا اس کے برعکس ظلمت اور سیاہی کی جھلکی تھی جو کفر کی نشانی تھی کہ دنیا میں آنے کے بعد یہ شخص اپنے اختیار سے کفر کی ظلمت اور گمراہی میں جا پڑے گا لہذا یہ دونوں تصویریں عالمِ ارواح میں ایمان اور کفر کی علامت بن گئیں۔

فقَالَ: یہ اشارے کے معنی میں ہے۔

إِلَى الْجَنَّةِ: معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ پر کوئی چیز واجب اور لازم نہیں اور نہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کے مقاصد و اغراض کے بارے میں کوئی سوال کر سکتا ہے وہ بے نیاز ہے، کسی کے جہنم میں جانے سے اس کو خوف و اندیشہ نہیں اور نہ کسی کے جنت میں جانے سے اس کی کوئی غرض و مطلب وابستہ ہے بس وہ "فعالِ لما یرید" ہے۔

اللذ: بضم اللام وفتحھا چوٹی چوٹی کو کہتے ہیں یہ تشبیہ یا چھوٹے ہونے میں ہے یا سفید اور صاف ہونے میں ہے۔
الحمم: جمع حمۃ کوئلہ کے معنی میں ہے۔

تقدیر کے معاملہ میں خوف رکھنا چاہیے؟

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي نَضْرَةَ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ يُقَالُ لَهُ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ دَخَلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ يَعُودُونَهُ وَهُوَ يَبْكِي فَقَالُوا لَهُ مَا يُبْكِيكَ أَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ أُجْزَأْ حَتَّى تَلْقَانِي قَالَ بَلَى وَلَكِنْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَبَضَ بِمِصْبِيهِ قَبْضَةً وَأُخْزِيَ بِالنَّبِيِّ الْأُخْزَى وَقَالَ هَذِهِ لِهَذِهِ وَهَذِهِ لِهَذِهِ وَلَا أُتَالِي. وَلَا أُحْدِثُ فِي آيَةِ الْقَبْضَتَيْنِ أَتَا.

(رواہ أحمد)

ترجمہ: حضرت ابو نضرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص جن کا نام ابو عبد اللہ تھا (ﷺ) کے پاس ان کے دوست ان کی عیادت کے لئے گئے۔ (تو انہوں نے دیکھا کہ) وہ (ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ) رورہے تھے۔ انہوں نے کہا "کہ آپ کو کس چیز نے رونے پر مجبور کیا۔ آپ سے سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنے لب (موٹھوں) کے بال پست کرو اور اسی پر قائم رہو۔ یہاں تک کہ تم مجھ سے (جنت میں) ملاقات کرو۔" ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا "ہاں! لیکن میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ (بھی) فرماتے سنا کہ "اللہ بزرگ و برتر نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ایک جماعت لی اور فرمایا کہ یہ (یعنی داہنے ہاتھ کی جماعت) جنت کے لئے ہے اور بائیں ہاتھ کی جماعت دوزخ کے لئے ہے اور مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر ابو عبد اللہ نے فرمایا "میں نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں ہوں۔" (یعنی دائیں مٹھی میں ہوں یا بائیں مٹھی میں ہوں)۔ (احمد)

توضیح: ثم اقرء: یعنی نبیوں کے بال کاٹ کر اس پر قائم دائم رہو، معلوم ہوا سنت پر قائم دائم رہنا بہت ہی فائدہ مند ہے اگرچہ معمولی سنت کیوں نہ ہو اور سنت سے اعراض کرنا زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ (طبری ج ۲)

حتی تلقانی: یعنی مجھ سے تیری ملاقات ہو جائے حوض کوثر پر یا کسی اور مقام پر، اس جملہ میں دخول جنت کی بشارت ہے کیونکہ کافروں سے آپ کی ملاقات نہیں ہوگی۔

ولا احدى: یعنی میں نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں ہوں اس لئے رورہا ہوں یہ "الایمان بین الخوف والرجاء" کا نقشہ ہے۔

مطلب:

اس حدیث کا مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے وہ بیمار ہو گئے دوسرے حضرات ان کی عیادت کے لئے گئے تو وہ رورہے تھے انہوں نے ان کے رونے پر تعجب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کیوں رورہے ہو حالانکہ آپ کو تو نبی کریم ﷺ نے جنت اور کامیابی کی بشارت دی تھی؟ اس پر صحابی نے قصہ سنایا اور دو مٹھیوں کی بات بیان کی اور پریشانی

کی وجہ بتائی کہ ”الایمان بین الخوف والرجاء“ میں بے خوف نہیں ہو سکتا ہوں۔
جواب: اشکال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کی بشارت ان کو ملی تو پھر رونے اور اس بشارت میں شک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: بہت ممکن ہے کہ آپ اس وقت یہ بشارت بھول گئے ہوں مگر اس سے بہتر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور مطلق العزم بادشاہ ہیں آپ کے وعدے اور تمام معاہدے بیشک سچے ہیں لیکن آپ کسی چیز کے پابند نہیں اور نہ کوئی چیز آپ پر واجب العمل ہے آپ کا احسان اپنی جگہ مگر آپ کا جلال اور شان جبروت و کبریائی ایسی چیز ہے جس نے ہر فرد بشر کو ہیبت میں ڈال رکھا ہے صحابی نے اللہ تعالیٰ کی اسی بے نیازی کی طرف اشارہ کیا۔

عہد النبی کا قصہ

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ أَخَذَ اللَّهُ الْبَيْعَاتِ مِنْ ظَهْرِ آخِرِ بَنِي عِمْرَانَ بَعِيَّةً عَرَفَةً فَأَخْرَجَ مِنْ صُلَيْبِهِ كُلَّ خِزْيَةٍ فَرَأَاهَا فَتَنَزَّهَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَالَّذِي تَكُنْ كَلِمَتُهُمْ قَبْلًا قَالَ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْبَيْعَةِ إِنْ كُنَّا عَنْ هَذَا غَائِبِينَ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا خِزْيَةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتَعْلَمُ كُنَّا بِمَا فَعَلَ الْمُتَعَبِّلُونَ (رواہ ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے میدانِ عرفات کے قریب مقامِ نعمان میں آدم ﷺ کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا جن کو (ازل سے اب تک) پیدا کرنا تھا اور ان سب کو جہنمیوں کی طرح آدم ﷺ کے سامنے بھیلادیا۔ پھر خدا نے ان سے رو برو گفتگو کی اور فرمایا۔ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ آدم ﷺ کی اولاد نے کہا ”بے شک آپ ہمارے رب ہیں“ پھر خدا نے فرمایا ”یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل و نادان تھے۔ یا تم یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا۔ اور ہم ان کی اولاد تھے۔ ہم نے ان کی اطاعت کی تھی کیا تو باطل پرستوں کے اعمال کے سبب ہمیں ہلاک کرتا ہے۔“ (احمد)

توضیح: بنوعمان: علامہ جوہری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ نعمان نون کے فتح کے ساتھ ایک وادی کا نام ہے جو طائف سے عرفات جاتے ہوئے راستہ میں واقع ہے صاحبِ قاموس لکھتے ہیں کہ نعمان عرفات کے پیچھے ایک وادی کا نام ہے اس کو نعمان الاراک کہتے ہیں جیسے شاعر نے کہا۔

اما والراقصات بذات عرق ومن صلی بنوعمان الاداک
 ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نعمان عرفات کے پاس ایک پہاڑ کا نام ہے جس کو نعمان صاب کہتے ہیں۔ انہیں احتمالات کے پیش نظر راوی نے حدیث میں تعین کے لئے ”ای عرفۃ“ کہہ دیا۔

اور پھر گویا کی مجلس اور انہوں نے باتیں کیں پھر ان سے عہد و پیمان کیا۔ اور پھر ان کو اپنے اوپر گواہ قرار دے کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اولاد آدم نے کہا ”ہے شک! آپ ہمارے رب ہیں“ خدائے تعالیٰ نے فرمایا میں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو تمہارے سامنے گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو بھی شاید قرار دیتا ہوں۔ (اس لئے کہ قیامت کے دن) کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے ناواقف تھے۔ (اس وقت) تم اچھی طرح جان لو کہ نہ تو میرے سوا کوئی معبود ہے اور نہ میرے سوا کوئی پروردگار ہے (اور خبردار) کسی کو میرا شریک قرار نہ دینا۔ میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول بھیجوں گا جو تمہیں میرا عہد و پیمان یاد دلایں گے اور تم پر اپنی کتابیں نازل کروں گا (یہ سن کر) اولاد آدم نے کہا ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ کہ تو ہمارا رب ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا نہ تو ہمارا کوئی پروردگار ہے۔ اور نہ تیرے علاوہ ہمارا کوئی معبود ہے۔ چنانچہ آدم کی ساری اولاد نے اس کا اقرار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا گیا۔ وہ (اپنی نگاہیں بلند کئے ہوئے) اس منظر کو دیکھ رہے تھے آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد میں امیر بھی ہیں اور فقیر بھی، خوبصورت بھی ہیں اور بد صورت بھی (یہ دیکھ کر) انہوں نے عرض کیا ”پروردگار اپنے تمام بندوں کو تو نے یکساں کیوں نہیں بنایا؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”میں اسے پسند کرتا ہوں کہ میرے بندے میرا شکر ادا کرتے رہیں“ پھر آدم علیہ السلام نے انبیاء کو دیکھا جو چہرہ غلوں کی مانند روشن تھے۔ اور نور ان کے اوپر جلوہ گر تھا۔ ان سے خصوصیت کے ساتھ رسالت و نبوت کے عہد و پیمان لئے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے **وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ۔ (الاحزاب) (ترجمہ) اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد و پیمان لیا اور آپ ﷺ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے (بھی) عہد و پیمان لیا ان رزوحوں کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے) حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے منہ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہو گئی۔ (اح)**

توضیح: خصوصاً ميثاق آخر: یہ عہد و پیمان اور یہ ميثاق ميثاق نبوت تھا جو خدمت خاص یعنی تبلیغ رسالت کے لئے لیا گیا۔

فرای الغی والفقر: حضرت آدم علیہ السلام کو تعجب ہوا کہ ان کی اولاد میں اتنا فرق کیوں ہے کہ ایک سرمایہ دار تو دوسرا نان جوئ کا محتاج تلاش چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی وجہ پوچھ لی۔

جنبل گرد و جبلت نہ گردد

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَبِي الْكَذَّاءِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَتَلَاكَ مَا يَكُونُ إِذْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا سَمِعْتُمْ جَبَلًا زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدِّقُوهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَدَّرَ عَنْ خُلُقِهِ فَلَا

تَصَدَّقُوا بِهِ فَإِنَّهُ يُصِيرُ إِلَى مَا جُعِلَ عَلَيْهِ. (رواۃ احمد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ ہم سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی خلقت بدل گئی ہے۔ تو اس کا اعتبار نہ کرو۔ اسلئے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے۔ جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (احمد)

توضیح: اذا سمعتم: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے منتقل ہونا اور زلزل ہونا ممکن ہے بشرطیکہ اس کے متعلق کوئی بتادے اور کوئی قرینہ انکار بھی نہ کرے تو تصدیق کر لو چنانچہ بعض مغربی ممالک کے بعض پہاڑ بل کر اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں اس کے مقابلے میں اگر کوئی تم سے کہہ دے کہ فلاں شخص اپنی جبلت سے پھر گیا ہے تو اس کی تصدیق مت کرو کیونکہ طبیعت اور جبلت سے پھرنا ممکن نہیں ہے ہاں ظاہری عارضی تبدیلی تو ہو جائے گی مگر حقیقی تبدیلی نہیں ہوگی سچ ہے "جبل گردد جبلت نہ گردد"۔

﴿٤٥﴾ وَعَنْ أَنَسٍ سَلَّمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا يَزَالُ يُصِيبُكَ فِي كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّيْءِ الْمَسْمُومَةِ الَّتِي أَكَلْتَ قَالَ مَا أَصَابَنِي شَيْءٌ مِنْهَا إِلَّا وَهُوَ مَكْتُوبٌ عَلَيَّ وَأَدْرِي فِي طِينَتِهِ.

(رواۃ ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انس سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ نے جو ہر آلودہ کاری کھائی تھی (جو خیر میں ایک بیہودہ نے کھلائی تھی) ہر سال اس کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جو چیز (یعنی اذیت و تکلیف یا بیماری) مجھ کو پہنچتی ہے۔ وہ میرے لئے اسی وقت لکھی گئی تھی۔ جب کہ آدم مٹی کے اندر تھے۔ (یعنی میری تقدیر میں یہ اس وقت سے لکھا تھا جبکہ آدم اپنی تخلیق کے مراحل میں تھے)۔ (ابن ماجہ)



باب اثبات عذاب القبر

عذاب قبر کے ثبوت کا بیان

قبر میں جس طرح گنہگاروں کو عذاب ہوتا ہے وہاں نیک لوگوں کو ثواب بھی ہوتا ہے۔ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے صرف عذاب کا ذکر کیا اور ثواب کا ذکر نہیں کیا اس کا ایک جواب یہ ہے کہ چونکہ کفار اور فساق کی تعداد زیادہ ہے اس لئے ان کے جزا و سزا کا ذکر کیا اور متین و عنوان میں ان کو اہمیت دی۔ دوسرا جواب یہ کہ لفظ عذاب القبر کے ذکر کرنے سے ثواب القبر خود بخود سمجھ آتا ہے کیونکہ یہ دونوں ضدین ہیں تو ایک ضد کو ذکر کر دیا دوسرا جو ثواب ہے وہ خود بخود سمجھ میں آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عذاب قبر کی حدیثوں میں صرف عذاب کا ذکر نہیں بلکہ ثواب کا ذکر عموماً پہلے آتا ہے اور پھر عذاب کا آتا ہے۔

القبر: لفظ قبر کا اطلاق حقیقتہً اسی ظاہری حسی گڑھے پر ہوتا ہے جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اسی ظاہری حسی مقام کو قبر کہا ہے "ولا تلقہ علی قبرہ" اور "ثم امانہ فاقبرہ" مجازی طور پر قبر کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے مرنے کے بعد پورے برزخی مقام کو قبر کہا جاتا ہے لیکن اس سے ظاہری قبر کی نفی نہیں ہوگی بلکہ قبر سے شروع ہو کر اگلے تمام مراحل تا قیام قیامت برزخ ہیں لہذا اگر کوئی آدمی جل جائے یا کھایا جائے یا فضاؤں میں اڑ کر ختم ہو جائے وہ برزخ سے غائب نہیں ہو سکتا بلکہ وہیں حاضر ہو جاتا ہے اور اس کا حساب و کتاب ہوتا ہے۔

عقوالیہ: عالم کل تین ہیں: ① عالم دنیا ② عالم برزخ ③ عالم آخرت۔

عالم دنیا میں احکام کا تعلق اولاً اور بالذات جسم سے ہوتا ہے اور تبعاً روح سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کو کسی نے دنیا میں مراقبہ اور روحانی تصرف سے قتل کر دیا تو قصاص نہیں ہوگا کیونکہ جسم نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

عالم برزخ میں احکام کا تعلق اولاً اور بالذات روح سے ہوتا ہے اور ثانیاً و تبعاً بدن سے ہوتا ہے۔

سوم عالم آخرت ہے وہاں احکام کا تعلق روح و بدن سے ہوتا ہے کیونکہ روح راکب اور بدن مرکوب ہے۔

اور دنیا میں عمل دونوں کے اشتراک سے سرزد ہوا ہے تو حکم کا اجرا بھی دونوں پر ہوگا روح یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تو عالم بالا سے آئی تھی میں مجرم نہیں بلکہ مجرم بدن اور جسم ہے ان دونوں کے اشتراک عمل کی مثال انگڑے اور اندھے کی چوری کی ہے کہ انگڑا چل نہیں سکتا مگر دیکھ سکتا ہے اور اندھا دیکھ نہیں سکتا مگر چل سکتا ہے لہذا دونوں میں اتفاق ہو گیا انگڑا اندھے پر سوار ہو گیا اور راستہ دکھاتا رہا اور اندھا اس کو اٹھا کر چلتا رہا یہاں تک کہ باغ میں پہنچ کر انگڑے نے خوب پھل توڑ دیئے اور پھر دونوں نے مل کر کھایا یا باغ والا جب دونوں کو پکڑ لیتا ہے تو دونوں کو سزا دیتا ہے نہ انگڑا بچ سکتا ہے اور نہ اندھا بہانہ کر کے بچ سکتا ہے اسی طرح جب آخرت میں جسم اور روح کا معاملہ پیش ہوگا تو دونوں مجرم ہوں گے دونوں کو ثواب و عقاب ہوگا یہی وجہ ہے کہ مراقبہ اور روحانی تصرف سے اگر کسی کو کسی نے مارا تو آخرت میں بدلہ لیا جائے گا۔

عالم برزخ کی مثال:

عالم برزخ کی سب سے زیادہ مناسب حسی مثال خواب اور خواب کی کیفیت ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں ایک کو اپنے خواب میں راحت اور دوسرے کو زحمت ہوتی ہے وہ دونوں اپنے اپنے خواب میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہیں کوئی مکہ، کوئی مدینہ، کوئی زمین، کوئی آسمان میں گھومتا ہے کوئی راحت اور کوئی زحمت محسوس کرتا ہے لیکن ان کے قریب پاس بیٹھنے والے کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ کس کو راحت ہے اور کس کو زحمت ہے، اس خواب میں کبھی سونے والا ہنستا ہے کبھی روتا ہے کبھی دوڑتا ہے کبھی اڑتا ہے مگر کسی کو کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ سونے والے کی کیفیت کیا ہے ہاں کبھی کبھی کچھ حرکات مثلاً ہنسا بولنا معلوم بھی ہو جاتا ہے لیکن اسی طرح عالم برزخ میں روح کا معاملہ جسم اور بدن کے ساتھ ہے۔ وہاں سب کچھ ہوتا ہے مگر کسی دیکھنے والے کو محسوس نہیں ہوتا بس صرف میت کو احساس ہوتا ہے عام حالات میں بدن بالکل بے حس معلوم ہوتا ہے ہاں کبھی کبھی روح کا اثر بدن پر ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔

قبر میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق

قبر میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق تین قسم پر ہے:

قسم اول: یہ کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ بدن کے صحیح سالم رہنے کے ساتھ ساتھ اس کا اثر دنیا پر بھی پڑتا ہے جیسے انبیاء کرام کی ارواح ہیں ان کی ارواح کا تعلق بدن سے اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ قبر سے متجاوز ہو کر دنیا پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کا مال بطور میراث تقسیم نہیں ہوتا ان کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اور جسم مبارک قطعی طور پر خاک سے متاثر نہیں ہوتا۔

قسم دوم: یہ کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ اتنا قوی ہوتا ہے کہ ان کا جسد خاک کی متاثر نہ ہو لیکن اس تعلق کا اثر دنیا پر نہیں پڑتا جیسے شہداء کی ارواح کہ ان کا جسم تو سلامت رہتا ہے لیکن میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویوں سے نکاح بھی کیا جاتا ہے۔

قسم سوم: یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم کے ساتھ کمزور تر ہوتا ہے جو نہ دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ قبر میں جسم کو محفوظ رکھ سکتا ہے یہ عام مسلمانوں کی ارواح کا تعلق ان کے اجسام سے ہے ہاں بعض مومنین کی ارواح کا تعلق قوی ہوتا ہے جس سے ان کے اجسام محفوظ رہتے ہیں، لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے اگر کسی شہید کا جسد خاک نے خراب کر دیا تو اس کی وجہ یا شہادت میں نقصان ہوتا ہے اور یا موتی اور ارضی حالات سے متاثر ہو کر جسم خراب ہو جاتا ہے یہ ایک عارضی معاملہ ہے۔

عذاب قبر کی کیفیت میں اختلاف:

عذاب قبر یا راحت قبر کے تعین اور اس کی کیفیت میں کافی اختلاف ہے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱ پہلا قول: یہ کہ قبر میں چونکہ جسد ہے اور وہ مثل جہاد ہے لہذا قبر میں نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے کیونکہ ثواب و عقاب

حیات پر متفرغ ہیں اور وہ حیات قبر میں نہیں ہے۔ یہ عقیدہ خوارج، بعض معتزلہ اور بعض مرجعہ کا ہے یہ عقیدہ اور یہ مسلک قرآن وحدیث اور اجماع امت کے صریح نصوص کے خلاف ہے لہذا قابل التفات نہیں۔

① دوسرا قول: یہ ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب کا تعلق صرف بدن اور جسم سے ہے روح کا اس سے کوئی تعلق نہیں یہ مسلک محمد بن جریر کرامی اور عبداللہ بن کرام کا ہے علامہ خیالی نے کہا ہے کہ روح کے بغیر خالی جسم کے عذاب کی بات محض حماقت والی بات ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "جوز بعضهم تعذيب غير الحی ولا شك انه سفسطة" بعض نے غیر زندہ کے عذاب کو جائز مانا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ ایک احمقانہ نظریہ ہے۔

② تیسرا قول: یہ ہے کہ قبر میں عذاب صرف روح کو ہوتا ہے کیونکہ اجسام تو اکثر دینہ شتر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں یا جانور رکھا جاتے ہیں یہ مسلک بعض صوفیاء اور ابن حزم ظاہری کا ہے مگر احادیث سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

③ چوتھا قول: یہ ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب جسم اور روح دونوں کو ہوتا ہے اور روح کا بدن کے کسی جزء سے اتصال ہوتا ہے یہ اتصال سورج کی شعاعوں کی طرح اشراق و اشراق کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ روح کا اثر تو جسم کے کسی جزء پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ روح کا جسم کے کسی جزء سے تعلق و اتصال ہو جاتا ہے جس سے بدن راحت والہم کو محسوس کرتا ہے اور اسی سے فرشتوں کو جواب دیتا ہے یہ مسلک اہل حق اہل السنۃ والجماعہ کا ہے۔

اہل حق کے دلائل:

اہل سنت والجماعت نے اثبات عذاب قبر پر قرآن کریم کی چند آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً:

① النار یعرضون علیہا غدواً وعشیاً ویوم تقوم الساعة ادخلوا الٰہ فرعون اشد العذاب۔ لہ اس آیت میں واضح طور پر دو عذابوں کا ذکر ہے ایک قیامت کا عذاب اور ایک قیامت سے پہلے کا عذاب اور یہی عذاب قبر ہے۔

② مما خطیبتہم اغرقوا فادخلوا ناراً فلم یجدوا للہم من دون اللہ انصاراً۔ لہ

یہاں فاتعیب مع الوصل کے لئے ہے یعنی قوم نوح ادھر پانی میں غرقاب ہو گئی اور ادھر آگ میں داخل کی گئی، ظاہر ہے یہ قیامت سے پہلے برزخی عذاب ہے اور یہی عذاب قبر ہے کیونکہ قبر برزخ کا پہلا مرحلہ ہے۔

③ ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائکۃ باسطوا ایدیہم اخرجوا انفسکم الیوم

تخرجون عذاب الہون مما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن اياته تستکبرون۔ لہ

اس آیت کا تعلق بھی اس عذاب سے ہے جو اخراج روح کے وقت فرشتے انسان کو دیتے ہیں ظاہر ہے یہ قیامت سے پہلے عذاب قبر ہے۔

① ولنذیقنہم من العذاب الا حتیٰ یحون العذاب الا کبیر۔

عذاب اکبر یعنی آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے دنیا کا چھوٹا عذاب مراد ہے اس میں عالم برزخ کا عذاب (جو بڑے عذاب کے مقابلہ میں کم ہے) بھی آیت کے مصداق میں آ سکتا ہے۔

② جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے عذاب قبر پر اجماع امت نقل کیا ہے۔

① مذکورہ باب کی تمام احادیث اثبات عذاب قبر پر دال ہیں جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں اگر لفظی توازن نہ ہو تو معنوی توازن یقیناً موجود ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عذاب قبر کے اثبات پر ۳۵ روایات نقل فرمائی ہیں۔ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ۷۰ تک روایات نقل کی ہیں امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ روایات جمع کی ہیں مجموعی طور پر یہ ایک سو گیارہ روایات بنتی ہیں۔

ترجمہ: شبہ یہ ہے کہ اتنی روایات اور نصوص کے منکرین کی تکفیر کیوں نہیں کی جاتی ہے؟

جواب: بعض نے تکفیر کی ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کف لسان کا فتویٰ دیا ہے کہ تاویل کرتے ہیں اس لئے مُتَأَوِّلِینَ کو کافرت کہو۔

منکرین عذاب قبر کے شبہات اور ان کے جوابات

سوال نمبر ①:

پہلا شبہ اور اعتراض ان لوگوں کا یہ ہے کہ دیکھو عذاب قبر کی جو کیفیات احادیث میں وارد ہیں کہ سانپ اور اڑدھے کاٹنے ہیں بچھو ڈنگ مارتے ہیں فرشتے گرز اور ہتھوڑے مارتے ہیں مردے کو بٹھایا جاتا ہے وہ چیختا ہے چلاتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں سنتے ہیں میت کے سینہ پر سامان رکھ دو وہ اسی طرح مدت تک پڑا رہتا ہے اس کے ساتھ قبر میں ٹیپ رکھ دو کچھ پتہ نہیں چلتا تو کیسے عذاب ہو رہا ہے؟

جواب: ہم پہلے اس کا جواب دے چکے ہیں کہ برزخ کا معاملہ خواب کی طرح ہے اس کو دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے نیز اس عذاب کا اولاً اور اصلاً تعلق روح سے ہے بدن اس کا تابع ہے درد و تکلیف تو بدن محسوس کر رہا ہے لیکن اصل میں عذاب روح سے متعلق ہے تو بدن پر اثرات ہم محسوس نہیں کرتے کبھی کبھی بدن پر اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا لہذا دنیا سے برزخ کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

سوال نمبر ②:

دوسرا شبہ یہ ہے کہ ہم نے اس عذاب کو دیکھا نہیں ہے اگر دیکھ لیتے تو مان لیتے بن دیکھے ہم نہیں مانتے۔

جواب: جس چیز کو ہم نے نہیں دیکھا تو کیا اس کا انکار کرو گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی اللہ کے رسول ﷺ نے

خبر دے دی اجماع امت نے بتا دیا پھر بھی انکار کرو گے تو پھر جنات کو تم نے نہیں دیکھا اس کا بھی انکار کرو تا کہ کافر ہو جاؤ کیونکہ قرآن میں اس کا ثبوت ہے فرشتے تم نے نہیں دیکھے ان کے وجود کا منکر کافر ہے۔ بدن انسان میں لوہا ہے، چونا ہے، تم نے نہیں دیکھا تو کیا اس کا انکار کرو گے، مہاجس کی تیلی میں مسالہ ہے اس میں آگ ہے تم نے کب دیکھا ہے دودھ اور دہی میں مکھن ہے تم نے کب دیکھا ہے تو انکار کرو گے؟ بے ہوش آدمی کے احوال کا تم کو کیا معلوم تو اس کا انکار کرو گے کہ نظر نہیں آتا یہ تو ایک بے کار قاعدہ ہے جس کو سر سید احمد خان نے ایجاد کیا اور لوگوں کو دھریہ بنا دیا۔

سوال نمبر ۷۰:

تیسرا شبہ یہ ہے کہ مردے کے اجزاء کبھی درعدوں پر ندوں کا کھانا بنتے ہیں، کبھی سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بنتے ہیں کبھی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں تو عذاب قبر کیسے ہوگا؟

جواب: ہم نے پہلے کہا تھا کہ قبر سے مراد عالم برزخ ہے صرف یہ مخصوص گڑھا نہیں بلکہ اس قبر سے شروع ہو کر آگے قیامت تک سب عالم برزخ ہے جہاں ہر جاندار کا لوٹنا اور پہنچنا ضروری ہے خواہ کسی بھی صورت میں ہو لہذا مردہ جہاں بھی ہو برزخی عذاب کے لئے اس کا کوئی نہ کوئی جزء موجود ہوگا ہم کو نظر نہیں آئے گا مگر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگا جیسا کہ ایک آدمی کے تحریق جسد کا واقعہ مشکوٰۃ شریف میں آنے والا ہے کہ ہواؤں نے اور سمندر نے اس کے جسم کے اجزاء کو اکٹھا کیا پھر حساب ہوا اس نے وصیت کی تھی کہ مجھے مرنے کے بعد جلا دو اور راکھ سمندر اور صحرائیں اڑا دو۔

سوال نمبر ۷۱:

چوتھا شبہ یہ ہے کہ دوسرے جاندار تمہارے کہنے کے مطابق عذاب قبر کا ادراک کرتے ہیں تو انسان اور جنات کیوں نہیں کرتے؟ اگر عذاب واقعی ہوتا تو انسان و جن بھی احساس کر لیتے۔

جواب: انسان و جنات چونکہ ایمان بالغیب کے مکلف ہیں اس لئے ان سے یہ عذاب پوشیدہ رکھا گیا ہے ان پر ظاہر ہوتا تو ایمان بالغیب کہاں رہتا نیز دہشت کی وجہ سے اپنے مردوں کو دفنانا بند کر دیتے۔

سوال نمبر ۷۲:

پانچواں شبہ یہ کہ وقت واحد میں لاکھوں انسان مدفون ہوتے ہیں تو فرشتے سب کو عذاب کیسے دیتے ہیں؟
یہ کہ وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا کہ کیسے عذاب دیتے ہیں۔

تفسیر: یہ کہ منکر تیر چند فرشتوں کا نام نہیں بلکہ یہ ایک محکمہ اور نوع کا نام ہے اس کے ماتحت بے شمار فرشتے ہیں جو یہ کام سرانجام دیتے ہیں جیسے روح قبض کرنے پر بہت فرشتے مقرر ہیں یہ عذاب قبر کے ابتدائی مباحث تھے آئندہ سامع مولیٰ کا مسئلہ مختصراً آ رہا ہے۔

الفصل الاول

کلمہ شہادت سے قبر میں استقامت ملتی ہے

﴿۱﴾ عَنْ الْمَرْءِ بْنِ عَارِبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ فَنُذِرُكَ قَوْلَهُ تَعَالَى يُعَذِّبُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. وَفِي رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يُعَذِّبُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ تَوَلَّى عَذَابِ الْقَبْرِ يُقَالُ لَهُ مَنْ رَبُّكَ فَيَقُولُ رَبِّي اللَّهُ وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس وقت قبر میں مسلمان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اس ارشاد ربانی کا ”یُعَذِّبُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ“ (ابراہیم ۲۰) (ترجمہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت وقائم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط و محکم طریقہ پر ثابت رکھنا دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ آیت یُعَذِّبُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ عذاب قبر کے بیان میں نازل ہوئی ہے (چنانچہ قبر میں مردہ ہے) سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد (ﷺ) ہیں۔ (بخاری، مسلم)

توضیح: مسلمان عورت ہو یا مرد وہ قبر میں منکر تکبیر کے سوال کے جواب میں اقرار عہداتین کرتے ہیں اور منافق کہتا ہے ”لا ادری اقول ما يقول الناس“ اور کافر ”ہا ہا ہا لا ادری“ کہتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ ابن قیم رحمہ اللہ اور ابن عبد البر رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال منافق اور مؤمن سے قبر میں ہوتا ہے خالص کافر سے نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ سوال امتیاز کے لئے ہوتا ہے اور کافر تو کفر میں ممتاز ہوتا ہے وہاں امتیاز کی ضرورت نہیں اور جہاں احادیث میں آیا ہے کہ کافر سے قبر میں سوال ہوتا ہے وہاں منافق مراد ہے مگر شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور دیگر محققین نے کہا ہے کہ یہ سوال سب سے ہوگا اور کافر کو طرم ٹھہرانے کے لئے یہ سوال ہوگا جو ذلیل ہو کر کہے گا ”ہا ہا ہا لا ادری“۔

یہاں سوال یہ ہے کہ قیامت میں کفار اور منافقین طرح طرح کے بہانے بنا کر انکار کریں گے حالانکہ وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوگا تو قبر اور برزخ میں کیوں اس طرح صفائی سے جواب دے کر اقرار کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قبر میں معاملہ فرشتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو کونی طور پر یہاں سچ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کفار و منافقین جھوٹ نہیں بول سکیں گے تاکہ فرشتوں پر معاملہ پوشیدہ اور مبہم نہ ہو اور میدان محشر میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اگر جھوٹ بولیں گے تو اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے نامہ اعمال موجود ہے اعضا و بدن بھی گواہی کے لئے حاضر ہیں اس لئے وہاں میدان کھلا رکھا گیا ہے۔

بالقول الثابت: اس سے مراد کلمہ توحید اور اقرار شہادتین ہے دنیا میں بھی اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مسلمان کے پائے استقامت کو استقلال بخشا ہے اور آخرت میں بھی اس کی بدولت قوت و توانائی اور استقامت و رحمت عطا کرتا ہے۔
نولت: اس جگہ بظاہر یہ اعتراض آتا ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے لئے عذاب قبر کا کوئی ذکر نہیں ہے پھر یہ کیسے فرمایا کہ یہ آیت عذاب قبر کے بارے میں اتری ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یقین کا ذکر ہے اور تثبیت فرغ ہے تعذیب کی تو مطلب یہ ہوا کہ جب مسلمان کو عذاب قبر کا سامنا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو قول ثابت کے ساتھ ثبات عطا فرماتا ہے۔

مردے جو توں کی آہٹ سنتے ہیں

﴿وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وَضِعَ فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ أَصْحَابُهُ إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نَعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيَقْرَأَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ لِمَعْمَدٍ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ فَيَقَالُ لَهُ أَنْظِرْ إِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبَدَكَ اللَّهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيعًا وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيَقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ فَيَقَالُ لَهُ لَا كَذِبْتَ وَلَا ثَلَمْتَ وَيُضْرَبُ بِمِطْرَاقٍ مِنْ حَدِيدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيحُ صَيْعَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ

(مُقَفَّعَاتُ الْبَغَارِيِّ)

تَرْجُمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب بندہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اعزاء و احباب واپس آتے ہیں تو وہ (مردہ) ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور اس کے پاس (قبر میں) دو فرشتے آتے ہیں اور ان کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص (محمد ﷺ) کے بارے میں کیا کہتے تھے اس کے جواب میں بندہ مومن کہتا ہے میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ (محمد ﷺ) بلاشبہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں پھر اس بندہ سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھو جس کو خدا نے بدل دیا ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں جنت میں جگہ دی گئی ہے چنانچہ وہ مردہ دونوں مقامات (جنت و دوزخ) کو دیکھتا ہے اور جو مردہ منافق یا کافر ہوتا ہے اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص (یعنی

عمر (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو اور لوگ (مومن) کہتے تھے وہی میں بھی کہہ دیتا تھا اس سے کہا جاتا ہے نہ تو نے عقل سے پہچانا اور نہ تو نے قرآن شریف پڑھا، یہ کہہ کر اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کے چپختے اور چلانے کی آواز سوائے جنوں اور انسانوں کے قرب و جوار کی تمام چیزیں سنتی ہیں۔

(بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

توضیح: وتولی: مردہ دفن کرنے کے بعد عادتاً لوگ جاتے ہیں اس لئے وتولی فرمایا اگر لوگ نہ بھی جائیں تو پھر بھی مردہ جوتوں کی چھاپ کی آواز سنتا ہے یہاں سماع سوتی کی بحث چھیڑی جاتی ہے حالانکہ عام شارحین نے یہاں اس مسئلہ کو ذکر نہیں کیا ہے میں باب کے آخر میں انشاء اللہ مختصر طور پر بیان کروں گا۔

حضرت رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اتاہہ ملکلن کا عجیب مفہوم بیان کیا ہے فرمایا کہ یہ سرعت اتیان ملک کی طرف اشارہ ہے "انہ لیسع قرع نعالہم اتاہہ ملکلن" یعنی وقت اتنا قریب ہوتا ہے کہ گویا ابھی مردہ جوتوں کی آہٹ سنتا ہے کہ فرشتے سوال و جواب کے لئے آجاتے ہیں۔

فی هذا الرجل: اس جملہ میں اشارہ نبی اکرم ﷺ کی طرف ہے اور اشارہ حاضر اور محسوس کے لئے ہوتا ہے لہذا فرشتوں کا سوال قبر میں ایک وقت میں لاکھوں انسانوں سے ہوتا ہے اور حضور اکرم ﷺ وہاں پر ہر قبر میں حاضر ہوں گے لہذا ہر جگہ حاضر و ناظر ہو گئے یہ استدلال بریلوی حضرات اس جملہ سے کرتے ہیں اور حاضر ناظر کا مسئلہ ثابت کرتے ہیں اس استدلال کے کئی جواب ہیں۔

۱ پہلا جواب: یہ کہ یہ اشارہ ذہنیہ ہے اور صاحب کافیہ نے اشارہ ذہنیہ کا تذکرہ کیا ہے ہر قل نے ابو سفیان سے کہا "ما تقول فی هذا الرجل" کلام عرب میں یہ عام محاورہ ہے اس سے کوئی کسی کو حاضر ناظر نہیں سمجھتا۔

۲ دوسرا جواب: یہ کہ قبر میں حضور اکرم ﷺ کی شبیہ پیش کر کے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

۳ تیسرا جواب: یہ کہ هذا الرجل کے ساتھ کچھ اضافی تفصیل بھی ہے یعنی الذی بعث فیکم یعنی جو شخص تم میں رسول بنا کر بھیجے گئے تھے ان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو بعد میں یہ لفظ صریح طور پر حدیث میں آ رہا ہے۔

۴ چوتھا جواب: یہ کہ میت اور آنحضرت ﷺ کے درمیان سے حجابات ہٹا کر براہ راست نبی اکرم ﷺ کو دکھا کر سوال کیا جاتا ہے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب کو رد کیا ہے کہ یہ محض ایک احتمال ہے بہر حال شارحین نے یہ جوابات اس لئے دیئے ہیں کہ قرآن کریم نے حاضر ناظر کا عقیدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے بتایا ہے۔

مقعد لکھتا: مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر مومن و کافر کے لئے جنت و دوزخ دونوں جگہ میں ایک ایک سیٹ تیار ہے اگر کوئی شخص جہنم میں گیا تو جنت والی سیٹ خالی ہو کر کسی اور کو میراث میں دی جاتی ہے اور اگر جنت میں گیا تو دوزخ والی سیٹ کسی اور کے لئے میراث میں رہ گئی۔ ہر انسان اور ہر مکلف کے لئے ایک سیٹ جنت میں اور ایک سیٹ دوزخ میں ہونے کی

بات شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لغات میں لکھی ہے جس کو مشکوٰۃ ص ۳۸۵ کے حاشیہ ۳ میں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ لے
غیر العقولین: اس عالم کائنات پر دو ثقیل مخلوق قائم ہیں ایک انسان اور دوسرے جنات ہیں ان کو ثقلین کہا گیا مردوں کی
چٹی دھپکار اور فریاد کی آواز انسان اور جنات اس لئے نہیں سن سکتے ہیں کہ اگر یہ سن لیں تو پھر ایمان بالغیب ختم ہو جائے گا جبکہ
یہ لوگ ایمان بالغیب کے مکلف ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ اگر یہ ہنگامہ قبر میں لیں گے تو وہشت کی وجہ سے یا مرجائیں گے یا گھر بار چھوڑ دیں گے اور صحراؤں میں کم
ہو جائیں گے اور یا مردوں کو دفنانا چھوڑ دیں گے۔ لے

ما بین المشرق والمغرب: کے الفاظ بھی آرہے ہیں اس سے بھی مراد یہی ثقلین ہیں۔
مطارق: جمع مطرقة تھوڑے کو کہتے ہیں۔ 'حدید': لوہے کو کہتے ہیں یعنی یہ تھوڑے لکڑی وغیرہ کے نہیں بلکہ
لوہے کے ہوں گے۔ لے

لا حریت ولا تلیت: نعت اور قیاس کے مطابق قلوب لفظ آنا چاہیے تھا مگر حریت کی پڑوس اور اس کے اثر کی وجہ
سے تلیت لایا گیا ہے جیسے عشاہا کی وجہ سے عشاہا لایا جاتا ہے اور خزہا کے وزن پر نداہی لایا جاتا ہے جیسا وفد
عبد القیس کی حدیث میں تشریح گزری ہے۔ لے

مردے کو اپنا ٹھکانہ نظر آتا ہے

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ
مَقْعَدُهُ بِالْعَدَاةِ وَالْعُشِيِّ إِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَمِنْ أَهْلِ
النَّارِ فَيَقُولُ هَذَا مَقْعَدُكَ حَتَّى يَبْعَثَكَ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

میت (رحمہ اللہ) : عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مرتا ہے تو (قبر کے اندر)
میں اور شام اس کا ٹھکانہ اس کے سامنے لایا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اگر دوزخی ہوتا ہے
تو دوزخ میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا ٹھکانہ اس کا انتظار کر، یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ
تعالیٰ تجھے اٹھا کر وہاں بھیجے۔ (بخاری و مسلم)

قبر کا عذاب حق ہے

﴿۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ يَهُودِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَهَا أَعَاذُكَ اللَّهُ مِنْ
عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَأَلَتْ عَائِشَةَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ

قَالَتْ عَائِشَةُ فَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا ”(عائشہ!) اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب قبر سے محفوظ رکھے!“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عذاب قبر کا حال پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں! قبر کا عذاب حق ہے!“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور قبر کے عذاب سے پناہ نہ مانگی ہو۔ (بخاری مسلم)

توضیح: فقال نعم: یعنی یہودیہ عورت نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تجھے اللہ عذاب قبر سے بچائے تو اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا ہاں عذاب قبر حق ہے اب سوال یہ ہے کہ اس یہودیہ کو عذاب قبر کا علم کیسے ہو گیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کیسے معلوم نہ ہو سکا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیہ کو اس کا علم تورات سے ہوا تورات کی تعلیم اسی طرح تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس لئے معلوم نہ تھا کہ اب تک اسلام میں اس کا حکم بذریعہ وحی آنحضرت ﷺ پر نہیں اترا تھا بلکہ مسند احمد اور مسلم شریف کی ایک روایت میں تو اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”كُذِبَ يَهُودُ لَا عَذَابَ حُونَ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَأَمَّا تَفْتَنُ الْيَهُودَ“

پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو عذاب قبر کے متعلق معلوم ہوا تو آپ تعوذ فرماتے تھے یہ تعوذ تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آنحضرت ﷺ کو خود عذاب قبر کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

عذاب قبر کا مشاہدہ

﴿ه﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ كَابٍ قَالَ بَيْنَمَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلَى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ إِذْ حَدَّثَنَا بِهَذَا فَكَادَتْ تُلْقِيهِ وَإِذَا أَقْبَرُ سِنَّةٍ أَوْ عَشْرَةَ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ أَحْصَابَ هَذِهِ الْأَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ أَنَا قَالَ فَمَنْ مَاتُوا قَالَ فِي الْبُيُوتِ فَقَالَ إِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةُ تُبْتَلَى فِي قُبُورِهَا فَلَوْ لَا أَنْ لَا تَدْفَنُوا لَدَعَوْتُ اللَّهَ أَنْ يُسَبِّحَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِي أَنْتُمْ مِنْهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوا

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ قَالُوا نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ (رواہ مسلم)

مفسر جبریل: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک روز) جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی نجار کے باغ میں اپنے ٹھہر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ اچانک ٹھہر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرا دے، تا کہہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟" ایک شخص نے کہا "میں جانتا ہوں!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کب مرے ہیں؟" (یعنی حالت کفر میں مرے ہیں یا ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں) اس شخص نے عرض کیا "یہ تو شرک کی حالت میں مرے ہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے (یعنی ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے) اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم (مردوں کو) دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں ضرور اللہ سے یہ دعا کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر (کی اس آواز) کو سنا دے جس کو میں سن رہا ہوں" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "ہم آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قبر کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "ہم عذاب قبر سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ظاہری اور باطنی فتنوں سے خدا کی پناہ مانگو" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "ہم ظاہری اور باطنی فتنوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دجال کے فتنہ سے خدا کی پناہ مانگو" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "ہم دجال کے فتنہ سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔" (مسلم)

توضیح: من الفتن ما ظہر منها وما بطن: ظاہری فتنہ وہ ہے جو محسوس ہو جائے اور جس کے اسباب بھی معلوم ہوں اور باطنی فتنہ وہ ہوتا ہے جو محسوس نہ ہو اور نہ اس کے اسباب ظاہر ہوں۔ یا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری فتنہ وہ ہوتا ہے جو ظاہری بدن سے متعلق ہو اور باطنی فتنہ وہ ہوتا ہے جو ایمان و عقیدہ کے فساد سے متعلق ہو۔

الفصل الثانی

قبر میں منکر نکیر کا سوال

﴿۶﴾ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَقْبَرُ الْمَيِّتَ أَكَاهُ مَلَكَانِ اسْوَدَانِ أَرْرَقَانِ يُقَالُ لِأَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ وَلِلْآخَرِ النُّكِيرُ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ فَإِنْ كَانَ مُؤْمِنًا فَيَقُولُ هُوَ عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ فَيَقُولَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُولُ هَذَا ثُمَّ يُفْسَخُ لَهُ فِي قَبْرِهِ سَبْعُونَ ذِرَاعًا فِي سَبْعِينَ ثُمَّ يُنَوَّرُ لَهُ فِيهِ ثُمَّ يُقَالُ

لَهُمْ قَبُولُ أَرْجِعْ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَأُخْبِرُهُمْ فَيَقُولَانِ نَحْنُ كَقَوْمِ الْعَرُوسِ الَّتِي لَا يُوقِظُهُ إِلَّا أَحَبُّ أَهْلِهَا إِلَيْهِ حَتَّىٰ يَبْعَثَهُ اللَّهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذَلِكَ وَإِنْ كَانَ مُكَافِئًا قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ قَوْلًا فَقُلْتُ مِثْلَهُ لَا أُخْرِجِي فَيَقُولَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُولُ ذَلِكَ فَيَقَالُ لِلْأَرْضِ اإِنْعِمِي عَلَيْهِ فَتَلْتِمِمْ عَلَيْهِ فَتُخْتَلِفُ أَصْلَاحُهُ فَلَا يَزَالُ فِيهَا مُعَذِّبًا حَتَّىٰ يَبْعَثَهُ اللَّهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذَلِكَ

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب مردہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس کالے رنگ کے نعلی آنکھوں والے دو فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں وہ دونوں اس مردہ سے پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص یعنی محمد ﷺ کی نسبت کیا کہتا تھا؟ اگر وہ شخص مؤمن ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“ (یہ سن کر) وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں ”ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا۔“ اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ۷۰ ستر ۷۰ گز کشادہ کر دی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ ”سو جاؤ!“ مردہ کہتا ہے (میں چاہتا ہوں) کہ اپنے اہل و عیال میں واپس چلا جاؤں تاکہ ان کو (اپنے اس حال سے) باخبر کر دوں۔“ فرشتے اس سے کہتے ہیں ”تو اس دہن کی طرح سو جا جس کو صرف وہی شخص جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے محبوب ہو (یعنی ہر کسی کا جگانا اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس سے وحشت ہوتی ہے البتہ جب محبوب جگاتا ہے تو اچھا لگتا ہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے۔“ اور اگر وہ مردہ منافق ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں کہتا تھا لیکن میں (اس کی حقیقت کو) نہیں جانتا (منافق کا یہ جواب سن کر) فرشتے کہتے ہیں ”ہم جانتے تھے کہ یقیناً تو یہی کہے گا۔“ (اس کے بعد) زمین کو مل جانے کا حکم دیا جاتا ہے چنانچہ زمین اس مردہ کو اس طرح دباتی ہے کہ اس کی رانیں پسلیاں بائیں اور بائیں پسلیاں دائیں طرف نکل جاتی ہیں اور اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے۔“ (ترمذی)

توضیح: اذا اقدبر المیت: یہ عام عادت کے مطابق فرمایا ورنہ قبر سے مراد برزخ ہے اب کوئی دفن ہو یا نہ ہو فرشتے برزخ میں اس میت کو پالیتے ہیں اور ان کے پاس آتے ہیں۔

المنکر والنکیر: یعنی نا آشنا مکروہ اور ناپسندیدہ، یہ صفات ان کی ذرا آونی شکل ظاہر کرنے کے لئے ہیں کافر و منافق کے لئے یہی فرشتے آتے ہیں اور مؤمنین کے لئے جو آتے ہیں، ان میں ایک کا نام بشیر ہے، دوسرے کا نام نذیر ہے۔

اصودان: کالے سیاہ ازرقان: نعلی آنکھوں والے یہ صفت عرب کے ہاں نہایت مقبوح اور ہیبت ناک ہوتی ہے۔

سبعون: یہ وسعت سے کنایہ ہے تعین مراد نہیں ہے مد بصر اور سبعون میں تعارض نہیں ہے کیونکہ سبعون میں یکسیر اور وسعت

کی طرف اشارہ ہے جو مدبصر کے منافی نہیں ہے۔ سیدھون فی سیدھون میں عدد دوسرے عدد کے لئے طرف ہے جس سے ہر چار اطراف کی مقدار مراد ہے وسعت قبر یا اعتبار اشخاص بھی ہوتی ہے۔ ل۔

کنا نعلم: یعنی چہروں سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا یا الہام کے طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ تم ایسا جواب دو گے۔ ل۔
نہ: یہ توجہ ہٹانے کے لئے کہہ دیا کہ جاؤ آرام کرو۔ ل۔

قبر میں سوال و جواب

﴿۷﴾ وَعَنِ الْمَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَائِكَةُ فَيَجْلِسُ لَهُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَنْ رَبُّكَ فَيَقُولُ رَبِّي اللَّهُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَا دِينُكَ فَيَقُولُ دِينِي الْإِسْلَامُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِفَ فِيكُمْ فَيَقُولُ هُوَ رَسُولُ اللَّهِ فَيَقُولَانِ لَهُ وَمَا يُدْرِيكَ فَيَقُولُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللَّهِ فَأَمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ قَوْلَهُ يُقْبَلُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الْغَائِبِ الْآيَةِ. قَالَ فَيَتَادَعِي مُتَادِعِي السَّمَاءِ أَنْ صَدَّقَ عَبْدِي فَأَقْرِ شَوْهًا مِنَ الْجَنَّةِ وَالْأَيْسُوءُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوا لَهُ تَابًا إِلَى الْجَنَّةِ فَيَفْتَحُ لَهُ قَالَ فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبُهَا وَيُفْسَخُ لَهُ فِيهَا مَدَّ بَصَرِهِ وَأَمَّا الْكَافِرُ فَقَدْ كَرَّمَ مَوْتَهُ قَالَ وَيُعَادُ رَوْحُهُ فِي جَسَدِهِ وَيَأْتِيهِ مَلَائِكَةُ فَيَجْلِسُ لَهُ فَيَقُولَانِ مَنْ رَبُّكَ فَيَقُولُ هَاهُ لَا أُخْبِرُ فَيَقُولَانِ لَهُ مَا دِينُكَ فَيَقُولُ هَاهُ لَا أُخْبِرُ فَيَقُولَانِ مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِفَ فِيكُمْ فَيَقُولُ هَاهُ لَا أُخْبِرُ فَيَتَادَعِي مُتَادِعِي السَّمَاءِ أَنْ كَذَّبَ فَأَقْرِ شَوْهًا مِنَ النَّارِ وَالْأَيْسُوءُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوا لَهُ تَابًا إِلَى النَّارِ قَالَ فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُومِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتَّى تَخْتَلِفَ فِيهِ أَهْلَاغُهُ ثُمَّ يَقْبِضُ لَهُ أَعْمَى أَصْحَمُ مَعَهُ مِرْزَبَةٌ مِنْ حَدِيدٍ لَوْ ضَرَبَ بِهَا جَهْلٌ لَصَارَ ثَوَابًا فَيَضْرِبُ بِهَا حَزْبَةً فَيَصْبِغُ صَبِغَةً يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِلَّا الْقَقْلَيْنِ فَيَصْبِغُ ثَوَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيهِ الرُّوحُ. (رواه أحمد وأبو داود)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”(قبر میں) مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے پوچھا کرتے ہیں کہ ”تیرا رب کون ہے؟“ وہ جواب دیتا ہے ”میرا رب اللہ ہے“ پھر فرشتے پوچھتے ہیں ”تیرا دین کیا ہے؟“ وہ جواب میں کہتا ہے ”میرا دین اسلام ہے“ پھر فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں ”جو شخص (خدا کی طرف سے) تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ کون ہے؟“ وہ کہتا ہے ”وہ خدا کے رسول ہیں“ پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں ”یہ تجھے کس نے بتایا؟“ وہ کہتا ہے ”میں نے خدا کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کو سچ جانا (یعنی جو کلام اللہ

پر ایمان لائے گا وہ رسول اللہ پر پہلے ایمان لائے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ﴿وَيُخَبِّرُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾ (الایہ) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ثابت بات پر ایمان لائے (خیر آیت تک) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ آسمان سے پکارنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتے) پکار کر کہتا ہے ”میرے بندے نے سچ کہا لہذا اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ اور اس کو جنت کی پوشاک پہناؤ“ اور اس کے واسطے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو، چنانچہ جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اس جنت کے دروازے سے) اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حد نظر تک اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اب رہا کفر! تو آنحضرت ﷺ نے اس کی موت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا ”پھر اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں ”تیرا رب کون ہے؟“ وہ کہتا ہے ”ہا ہا میں نہیں جانتا“ پھر وہ پوچھتے ہیں ”تیرا دین کیا ہے؟“ وہ کہتا ہے ”ہا ہا میں نہیں جانتا“ پھر وہ پوچھتے ہیں یہ شخص کون ہے جو (خدا کی جانب سے) تم میں بھیجا گیا تھا وہ کہتا ہے ”ہا ہا میں نہیں جانتا“ پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا ”یہ جھوٹا ہے اس کے لئے آگ کا فرش بچھاؤ، آگ کا لباس اسے پہناؤ اور اس کے واسطے ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دو“ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ”دوزخ سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور لوہیں آتی ہیں“ اور فرمایا اور اس کی قبر اس کے لئے تنگ کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ ادھر کی پسلیاں ادھر اور ادھر کی پسلیاں ادھر نکل آتی ہیں پھر اس پر ایک اندھا بہر فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اس کو اگر پیاز پر مارا جائے تو وہ مٹی ہو جائے اور وہ فرشتہ اس کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ (اس کے سینے چلانے کی آواز) مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہے مگر جن انسان نہیں سنتے اور اس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کے اندر روح ڈالی جاتی ہے۔ (احمد اور دیگر)

توضیح: وما یددیک: اس جملہ سے معلوم ہوا کہ قبر میں فرشتے کئی مختلف سوالات کرتے ہیں صرف وہ مشہور تین سوالات نہیں جو مشہور ہیں۔

مد بصرہ: یعنی حدنگاہ تک قبر میں وسعت آتی ہے دنیا میں اس کی مثال بعض شیش محل سونے کی دکانیں ہیں جن میں آدمی تا حدنگاہ وسعت محسوس کرتا ہے حالانکہ وہ چھوٹ کی دکان ہوتی ہے۔ لے
ہا ہا ہا: یہ عربی لخت میں ایک لفظ ہے جو انتہائی دہشت اور تحیر و تحمر کے وقت آدمی بولتا ہے جیسے اردو میں ہائے وائے کے الفاظ آتے ہیں لا اھدی اسی کا بیان ہے۔ لے

الذی بعث فی کھ: جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کو مانا ہو آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کیا ہو سنت پر چلے ہوں وہ فوراً پہچان لیں گے کہ اس مبعوث سے مراد محمد عربی ﷺ ہیں اور جو لوگ دنیا میں بعثت و شریعت سے اندھے بہرے رہے وہ وہاں بھی اسی طرح اندھے بہرے رہیں گے۔ لے

ہینادی مناد: جیسے ریڈیو پر اعلان فوراً پہنچ جاتا ہے ایسا ہی یہ اعلان ہوگا۔ "ان کذب:" یعنی یہ شخص باطل پر تھا یہی مطلب ہے ورنہ یہاں جھوٹ نہیں ہے نہ اس نے یہاں جھوٹ کہا ہے۔ ۱۔

اعلیٰ اہم: یعنی بمنزل اعلیٰ ہے کہ ترس نہیں آتا اور بمنزل بہر ہے گویا سنا ہی نہیں، یہ اس لئے تاکہ مجرم پر نہ ترس آئے نہ احساس ہو۔
مورثہ: گرز کو کہتے ہیں جو لوہے کا ہوتا ہے۔ ٹھہرے: یعنی روح پھر تازہ کی جاتی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روح دوبارہ ڈالی جاتی ہے۔ ۲۔

قبرستان رونے کی جگہ ہے

﴿۸﴾ وَعَنْ عُمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَقَفَ عَلَى قَبْرِ بَنِي حَتَّى يَبْلُغَ حَيْثُ قَبِيلَ لَهُ تَذَكُّرُ الْحَيَّةِ وَالنَّارِ فَلَا تَبْكِي وَتَبْكِي مِنْ هَذَا فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَلَوِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ فَإِنْ نَجَّاهُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَتَسْرُ مِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ قَالَ وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا رَأَيْتُ مَنَظَرَ أَقْطَعَ إِلَّا وَالْقَبْرَ أَقْطَعَ مِنْهُ.

(رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حديث غریب)

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس گزرے ہوتے تو (خوف خدا سے) اس قدر روتے کہ ان کی داڑھی (آنسوؤں سے) تر ہو جاتی، ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور اس جگہ گھڑے ہو کر روتے ہیں (اس کے جواب میں) انہوں نے کہا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے "آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے لہذا جس نے اس منزل سے نجات پائی اس کو اس کے بعد آسانی ہے اور جس نے اس منزل سے نجات نہیں پائی اس کو اس کے بعد سخت دشواری ہے۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت نہیں دیکھا۔" (ترمذی ابن ماجہ اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے)

توضیح: ہنسی: الايمان بين الخوف والرجاء: کی بنیاد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والنورین روتے تھے مقررین بارگاہ الہی زیادہ رویا کرتے ہیں یہ ردنا اس کے منافی نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے بلکہ بشارت والے تو عبادات و اعمال میں زیادہ چست ہو جاتے ہیں۔ اور ہر موقع و مقام کو اس کا حق دیتے ہیں نہ یہ کہ عبادات و اعمال میں سستی کرتے ہیں قبر تو ایسا مقام ہے جو تمام لذات کو بھلا دیتا ہے۔ ۳۔

فما بعده أشد منه: کہتے ہیں کہ دنیا کے ۹۰۰ مصائب اور حالت نزع کے ایک مصیبت برابر ہے، نزع کے ۹۰۰ مصائب اور قبر کی ایک مصیبت برابر ہے، قبر کے ۹۰۰ مصائب اور محشر کی ایک مصیبت اور محشر کے ۹۰۰ مصائب اور دوزخ کی ایک مصیبت برابر ہے۔ ۴۔

تدفین کے بعد دعا کا ثبوت

﴿وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ كَفِّنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ ثُمَّ سَلُوا لَهُ بِالتَّيْبَةِ فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ﴾ (رواہ ابو داؤد)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر (لوگوں سے) فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا مانگو (یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت اس کو ثابت قدم رکھے) اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

توضیح: استغفروا والاخیکم: حدیث شریف کے ان جملوں سے قبر پر استغفار اور قبرستان میں دعاء کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے لہذا دفن میت کے بعد عام طور پر دعاء مانگی جاتی ہے علماء ربانین نے اس دعاء میں ہاتھ اٹھانے کو خلاف اولیٰ لکھا ہے کیونکہ مردہ سے مانگنے کا شہ ہو سکتا ہے ہاں اگر ہاتھ نہ اٹھانے کی وجہ سے قندارعتا ہو تو ہاتھ اٹھا کر دعائے لیکن مردہ کے محاذات میں کھڑا نہ ہو، اگر اپنے ماحول میں اپنے احباب کے ساتھ ہو تو ان کو بارہا سال پیرین کا حکم دے دے۔ کیونکہ یہ افضل ہے۔

بالتبیت: تثبیت کی دعاء اس طرح ہے "اللھم ثبتہ اللھم اشھرہ اللھم ارجہ وغیرہ وغیرہ" یہ تنفیہ کا مسلک ہے شوافع حضرات نے اس حدیث سے مردہ کی تدفین کے بعد تلقین کا مسئلہ بھی نکالا ہے، تاہم تلقین کا مسئلہ سماع موتی پر متفرع ہے جو حضرات سماع موتی کے قائل ہیں وہ تلقین کے بھی قائل ہیں اور جو حضرات سماع موتی کے قائل نہیں وہ اس تلقین کے بھی قائل نہیں۔ جو تدفین کے بعد قبر پر ہوتی ہے، سورہ بقرہ کی ابتدا اور انتہاء سے ایک ایک رکوع پڑھنا اتفاقی مسئلہ ہے۔

تلقین تلقین نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جمع الجوامع میں طلبہ اوائی سے نقل کیا ہے اور ابن نجار، ابن عساکر رحمہ اللہ اور دیلمی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی انتقال کر جائے اور تم اس کو دفن کر دو تو ایک شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو جائے اور کہے اے فلاں ابن فلاں اے فلاں بن فلاں، مردہ جواب دیتا ہے اگرچہ تم نہیں سنتے ہو پھر کہے اے فلاں! اس کلمہ کو یاد کرو جس پر تم اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور وہ "اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا عبدا ورسوله" کی گواہی ہے نیز تم اس پر راضی ہوئے کہ خدا تمہارا پروردگار ہے اور محمد ﷺ تمہارے پیغمبر ہیں اور قرآن تمہارا رہبر و امام ہے، جب یہ کہا جاتا ہے تو مگر تکبیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں کہ چلو اس بندہ کے سامنے سے باہر نکلو ہمیں اس سے کیا سروکار ہے کیونکہ اللہ کی جانب سے اس کو تلقین کی جا رہی ہے۔ (مطابقت ۱۶ ص ۱۶۹)۔

یہ حدیث ضعیف ہے اور اس تلقین میں اختلاف ہے لیکن ایک اور تلقین ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے مشکوٰۃ شریف ص ۱۲۹ پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تمہارا کوئی

مر جائے تو اس کو گھر میں مت روکو بلکہ جلدی اس کو قبر میں دفن کے لئے لے چلو پھر اس مردہ کی قبر کے سرہانے سورہ بقرہ کی ابتداء سے پڑھو، اور پاؤں کی جانب سورہ بقرہ کے آخر (آمن الرسول) سے پڑھو۔ یہی نقلی نے اس روایت کی تخریج کی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے ایک تلقین حالت نزاع میں شہادتین کی تلقین ہے تاکہ قریب الموت آدمی سن کر پڑھنے لگ جائے چنانچہ حکم ہے لَقُتُوا مَوْتَكُمْ اَلْح۔

قبر میں (۹۹) اژدھے

(۱۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ لَكَ عَلَى الْكَلْبِ فِي قَبْرِهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ يَوْمًا تَلَدُّهُ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ لَوْ أَنَّ يَدَيْنَا مِنْهَا تَفَعَّ فِي الْأَرْضِ مَا أَتَيْنَتْ خَصْرًا۔

(رواہ الدارمی و ترمذی و توفی الزمینی و قال سننہون بتل تیسعہ و تیسعون)

ترجمہ: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "کافر کے اوپر اس کی قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں جو اس کو قیامت تک کاٹتے اور ڈستے ہیں اور وہ اژدھے ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک اژدھا زمین پر پھٹکار مارے تو زمین بیزہ اگانے سے محروم ہو جائے" (دارمی) اور ترمذی سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے لیکن اس میں بجائے ننانوے کے ستر کا عدد ہے۔

توضیح: تعیناً: اس بڑے سانپ کو کہتے ہیں جس کو اژدھا کہا جاتا ہے قہسہ و تلدغہ: بعض شارحین نے ان دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی بتایا ہے یعنی کانٹا ڈسنا ڈنگ مارنا، بعض شارحین نے اس میں فرق کیا ہے کہ قہسہ اس کانٹے کو کہتے ہیں جس سے کمال اتر جائے اور تلدغہ صرف ڈسنے کو کہتے ہیں۔

اب یہاں سوال یہ ہے ۹۹ اژدھوں کے مسلط کرنے کی حکمت کیا ہے؟

پہلا جواب: تو یہ ہے کہ یہ شارع کا کلام ہے اس میں کسی تعداد کی خصوصیات یا حکمتیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
دوسرا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں ہر نام کی الگ خصوصیت ہے کافر جب کفر کرتا ہے تو سب کا انکار کرتا ہے لہذا ہر نام کے انکار پر ایک ایک اژدھا مقرر کیا جاتا ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت کائنات میں تقسیم ہوگئی ہے اور ۹۹ رحمتیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں جو عالم آخرت میں ظاہر ہوں گی اور مؤمنین کے ساتھ خاص ہوں گی کافر چونکہ ان سب کا انکار کرتا ہے تو مؤمنین کے برعکس کفار پر ۹۹ اژدھے مسلط کئے جائیں گے۔

ترمذی کی روایت میں ۹۹ کے بجائے ستر کا ذکر آیا ہے جو عربی کلام میں تکثیر کے لئے آتا ہے مراد وہی ۹۹ ہے۔

الفصل الثالث

قبر کا تنگ ہو جانا

﴿۱۱﴾ عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِينَ تُوُفِّيَ فَلَمَّا صَلَّى عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَوُضِعَ فِي قَبْرِهِ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ سَبَّحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَسَبَّخْنَا ظَوِيلًا ثُمَّ كَثُرَتْ فَكَثَرْنَا فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَمْ سَبَّخْتَ ثُمَّ كَثُرَتْ فَقَالَ لَقَدْ تَضَائِقُ عَلَى هَذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهُ حَتَّى فَرَّجَهُ اللَّهُ عَنْهُ. (رواه أحمد)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ ان کے جنازہ پر گئے جب آنحضرت ﷺ جنازہ کی نماز پڑھ چکے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی برابر کر دی گئی تو سرکارِ دو عالم ﷺ تسبیح (یعنی سبحان اللہ) پڑھتے رہے تو ہم نے بھی دیر تک تسبیح پڑھی پھر آپ ﷺ نے تکبیر (یعنی اللہ اکبر) کہی ہم نے بھی تکبیر کہی، پھر آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ آپ نے تسبیح کیوں پڑھی اور پھر تکبیر کیوں کہی؟ فرمایا "اس بندہ صالح پر اس کی قبر تنگ ہو گئی تھی پھر خدا نے (ہماری تسبیح و تکبیر کی وجہ سے) اسے کشادہ کر دیا۔" (احمد)

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَذَا الَّذِي تَحْرُكُ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَشَهِدَتْهُ سَبْعُونَ أَلْفًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ لَقَدْ حُمِ حَمَمَةٌ ثُمَّ فُتِحَ عَنْهُ. (رواه النسائي)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ (یعنی سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ) وہ شخص ہیں جن کے لئے عرش نے حرکت کی (یعنی اس کی پاک روح جب آسمان پر پہنچی تو اہل عرش نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا) اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور ان کے جنازے پر ستر ۷۰ ہزار فرشتے حاضر ہوئے (لیکن پھر بھی) ان کی قبر تنگ کی گئی پھر نیکی اور ہوائی (اور آنحضرت ﷺ کی برکت سے ان کی قبر کشادہ ہو گئی)۔" (نسائی)

توضیح: تحرك له العرش: دونوں حدیثوں میں اشارہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جو جنگ خندق کے موقع پر زخمی ہوئے تھے اور بعد میں شہید ہو گئے تھے عرش کی حرکت خوشی کے طور پر تھی کہ اس عظیم الشان انسان کی روح سے عرش کی ملاقات ہو جائے گی عرش اگرچہ جماد ہے مگر اپنے انداز سے تو آسمان بھی روتا ہے اور دوسرے جمادات بھی روتے ہیں جب کوئی نیک آدمی دنیا سے اٹھ جاتا ہے لہذا عرش کا خوش ہو کر حرکت کرنا کوئی مستبعد امر نہیں علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات پر بطور غم و افسوس عرش میں یہ حرکت آئی ہو اور یہ غم سے کن یہ ہو۔

لقد هم حملة: یہ قبر کے دبانے سے کنا یہ ہے، اس حدیث میں قبر کے ہیبت ناک اور خوفناک منظر سے ڈرانا مقصود ہے کہ اتنے بڑے درجات اور اتنی بڑی شان والے صحابی کو دیکھو کہ عرش ان کے لئے جھونکے لگا، ستر ہزار فرشتے جنازہ میں شریک ہوئے، شہادت کا عالی درجہ پایا اور آسمان کے سارے دروازے استقبال کے لئے کھل گئے مگر پھر بھی قبر نے دبوچنے کی کوشش کی تو دوسروں کا کیا حال ہوگا اس لئے کسی کو اپنے انجام سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ بعض نے کہا کہ قبر نے محبت میں دبا یا جس سے ظاہری تکلیف ہوتی ہے مگر باطنی لذت ہوتی ہے۔ احباب و ابرار کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے اگرچہ غبار کے ساتھ ایذا کا معاملہ ہوتا ہے یہ کلام بہت ہی بعید ہے حدیث کا سیاق و سباق اس کو قبول نہیں کرتا ہے بعض نے کہا کہ ابتداء میں کچھ زحمت کا اشارہ کر دیا تاکہ بعد میں سرور و راحت کا اچھی طرح احساس ہو واللہ اعلم۔

قبر کا فتنہ و جال کے فتنے کے برابر ہے

۱۳۰) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَطِيبًا فَنَزَلَ فِي ثَنَاءِ الْقُبُورِ الَّتِي يُفْتَنُ فِيهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذَلِكَ خُفَّ الْمُسْلِمُونَ حَتَّى

هَكَذَا وَرَأَى النِّسَاءُ حَالَتِ بَنِي وَهَبٍ أَنْ أَفْهَمَ كَلَامَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَلَمَّا سَكَتَ طَعَنَهُمْ قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِيبٍ مِنِّي أَيْ تَارَكَ اللَّهُ فِيكَ مَاذَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي آخِرِ قَوْلِهِ قَالَ قَالَ قَدْ أُوجِىءَ إِلَى أَنْتُمْ تُفْتَنُونَ فِي الْقُبُورِ قَرِيبًا مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک دن سرکارِ دو عالم ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور قبر کے فتنہ کا ذکر فرمایا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے چنانچہ اس ذکر سے مسلمان خوف زدہ ہو کر روتے اور چلاتے رہے یہ روایت بخاری کی ہے اور نسائی نے اتنا اور زیادہ بیان کیا ہے کہ (خوف و دہشت کی وجہ سے) مسلمانوں کے پیچھے اور چلانے کے سبب میں آنحضرت ﷺ کے الفاظ کو نہ سن سکی جب یہ چیخا چلانا بند ہوا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا ”خدا تمہیں برکت عطا فرمائے (یعنی تمہارے علم و عمل میں زیادتی ہو) آخر میں آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا؟“ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے فرمایا مجھ پر یہ وحی آئی ہے کہ تم قبروں کے اندر فتنہ میں ڈالے جاؤ گے (یعنی تم کو آزمایا جائے گا) اور یہ آزمائش و امتحان فتنہ و جال کے قریب قریب ہوگا۔

قبر میں نماز پڑھنے کی خواہش

۱۴۰) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا أَدْجَلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُقِلَّتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوبِهَا فَيَجْلِسُ مَسْخُوعًا عَلَيْهِ وَيَقُولُ دَعُونِي أَصِلْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب مردہ (مومن) کو قبر کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے سامنے غروب آفتاب کا وقت پیش کیا جاتا ہے چنانچہ وہ مردہ ہاتھوں سے آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تاکہ میں نماز پڑھ لوں۔“ (ابن ماجہ)

توضیح: دعویٰ اصلی: یہ دعا دستِ صلوة کی دلیل ہے کہ جو لوگ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں ان کو ہوش بے ہوشی اور موت و حیات کے ہر لمحہ میں نماز کی فکر لگی رہتی ہے اور یہ ایمان کامل کی نشانی ہے۔

مثبت له الشمس: یعنی سورج غروب کا نظارہ پیش کرتا ہوا مردے کو نظر آئے گا یہ وقت مسافر کے لئے پریشان کن ہوتا ہے وہ سوچتا ہے کہ رات کہاں گزاریں گا یہ شخص بھی عالم شہود عالم دنیا سے عالم غیب اور عالم آخرت کا مسافر ہے اس کو پریشانی ہے کہ سورج غروب ہو رہا ہے نماز بھی ابھی پڑھنی ہے مکان تلاش کر کے رات گزارنی ہے کسی سے واقفیت نہیں ہے زبان بھی نا آشنا ہے مکان بھی نا آشنا ہے لوگ بھی نا آشنا ہیں سوال و جواب بھی نا آشنا ہے کتاب بھی نا آشنا ہے امتحان بھی نا آشنا ہے کسی نے پشتوں میں کہا: اے

نا شنا وطن نا شنا مکان دے نا شنا کتاب نا شنا تپوس رانہ کویت
کسی فارسی والے نے کہا:

توزلف را کشادی و تار یک شد جہاں اکنون قناد شام، غریباں کجا روند

احوال قبر

﴿۱۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ الْمَيِّتَ يَصْبِرُ إِلَى الْقَبْرِ فَيَجْلِسُ الرَّجُلُ فِي قَبْرِهِ خَيْرَ فِرْعَ وَلَا مَشْغُوبٍ ثُمَّ يُقَالُ فِيهِمْ كُنْتُمْ فِي الْإِسْلَامِ فَيَقَالُ مَا هَذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ فَصَدَّقْنَاهُ فَيَقَالُ لَهُ هَلْ رَأَيْتَ اللَّهَ فَيَقُولُ مَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَرَى اللَّهَ فَيَفْرَجُ لَهُ فُرْجَةٌ وَبِئْسَ النَّارُ فَيَنْظُرُ إِلَيْهِ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَيَقَالُ لَهُ أَنْظُرْ إِلَى مَا وَقَّالَكَ اللَّهُ ثُمَّ يُفْرَجُ لَهُ فُرْجَةٌ وَبِئْسَ الْجَنَّةُ فَيَنْظُرُ إِلَى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيهَا فَيَقَالُ لَهُ هَذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الْيَمِينِ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مَكٌ وَعَلَيْهِ ثُبَعٌ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى وَتَجْلِسُ الرَّجُلُ السَّوْءُ فِي قَبْرِهِ فِرْعًا مَشْغُوبًا فَيَقَالُ لَهُ فِيهِمْ كُنْتُمْ فَيَقُولُ لَا أُدْرِي فَيَقَالُ لَهُ مَا هَذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ قَوْلًا فَقُلْتُهُ فَيَفْرَجُ لَهُ فُرْجَةٌ وَبِئْسَ الْجَنَّةُ فَيَنْظُرُ إِلَى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيهَا فَيَقَالُ لَهُ أَنْظُرْ إِلَى مَا صَرَفَ اللَّهُ عَنْكَ ثُمَّ يُفْرَجُ لَهُ فُرْجَةٌ إِلَى النَّارِ فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا

تَغْطَا فَيَقَالُ هَذَا مَقْعَتُكَ عَلَى الشَّيْءِ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مَتَّعْنَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى.

(روافد ابنی حاجہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جب مردہ قبر کے اندر پہنچتا ہے (یعنی اسے دفن کر دیا جاتا ہے) تو (نیک) بندہ قبر کے اندر اس طرح اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تودہ خوفزدہ ہوتا ہے اور نہ گھبرایا ہوا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کس دین میں تھے وہ کہتا ہے میں دین اسلام میں تھا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے یہ شخص (محمد ﷺ) کون ہیں؟ وہ کہتا ہے ”محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں جو خدا کے پاس سے ہمارے لئے کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے اور ہم نے ان کی تصدیق کی“ پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ ”خدا تعالیٰ کو تو کوئی نہیں دیکھ سکتا“ اس کے بعد اس کے لئے ایک روشن دان دوزخ کی طرف کھولا جاتا ہے اور وہ ادھر دیکھتا ہے اور آگ کے شعلوں کو اس طرح بھڑکتا ہوا پایا جاتا ہے گویا اس کی لپٹیں ایک دوسرے کو کھارہی ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے ”اس چیز کو دیکھو جس سے اللہ نے تجھے بچایا ہے“ پھر اس کے لئے ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جاتی ہے وہ جنت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے ”یہ تمہارا ٹھکانہ ہے کیونکہ تمہارا اعتقاد مضبوط اور اس پر تمہیں کامل یقین تھا اور اسی (یقین و اعتماد) کی حالت میں تمہاری وفات ہوئی اور اسی حالت میں تمہیں (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور بدکار بندہ اپنی قبر میں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے پس اس سے پوچھا جاتا ہے تو کس دین میں تھا؟ وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے یہ شخص (محمد ﷺ) کون تھے وہ کہتا ہے میں لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں کہتا تھا اس کے بعد اس کے لئے بہشت کی طرف ایک روشن دان کھولا جاتا ہے جس سے وہ بہشت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف دیکھو جسے خدا نے تجھ سے پھیر لیا ہے پھر اس کے لئے دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ آگ کے تیز شعلے ایک دوسرے کو کھارہے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے اس شک کے سبب جس میں تو جلتا تھا اور جس پر تو مر اور اسی پر تو اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

توضیح: غیور فوج: بغیر گھبرائے ہوئے ولا مشغوب: غیر فتنہ رسیدہ یہ دوسرا کلمہ پہلے کے لئے تاکید بھی بن سکتا ہے ہل دایت رہن چونکہ حضور اکرم ﷺ سے متعلق سوال کے جواب میں فرشتوں کو میت نے کہا تھا کہ ”جاءنا بالہمدات“ اس لئے فرشتہ نے سوال کیا کہ کیا تو نے اپنے رب کو دیکھا ہے کہ من عند اللہ کہتے ہو؟ اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں مشہور تین سوالات کے ضمن میں کچھ اور سوالات بھی ہوں گے جیسے یہ مذکورہ سوال ہے ”علی الیقین کنت“ یعنی تمہارا عقیدہ مضبوط تھا ایمانی کیفیات میں کوئی تزلزل نہیں تھا اور اسی پر اٹھائے جاؤ گے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ الگ ایک مستقل جملہ ہے۔

سماع موتی کا مسئلہ

"باب اثبات عذاب القبر" کی بعض احادیث میں ایسے جملے آئے ہیں جن سے مردوں کا قبروں میں سنا ثابت ہوتا ہے بالخصوص اس باب کی دوسری حدیث جو "حدیث قروع النعال" کے نام سے مشہور ہے اس میں مردوں کا سنا واضح طور پر مذکور ہے اس لئے اس مسئلہ کا مختصر طور پر ذکر کرنا قاعدہ سے شاید خالی نہ ہو لیکن یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ سماع موتی سے ان اموات کا سماع یا عدم سماع مراد ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ ہیں اس لئے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کا قابل ذکر اختلاف نہیں ہے بلکہ انبیائے کرام کا اپنی قبور میں سنا اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ انبیاء کو اسی وجہ سے مشکئی کیا ! اس نے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۵۹ بحوالہ شرف التوضیح)

بندہ نے جب بھی اس مسئلہ میں بحث کی ہے تو اپنے شاگردوں سے کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ انبیائے کرام کے علاوہ اموات کے سماع و عدم سماع میں جو تحقیق کر دو کہ مگر انبیائے کرام کے سماع میں خدا کے لئے بحث نہ کرو کیونکہ ب ادبی کا خطرہ ہے۔ جب ایک حدیث سے ثابت ہے کہ "من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا ابلغته" (مشکوٰۃ ص ۸۷) اب یہ ایک حدیث ہے اس کو خواہ مخواہ ضعیف کرنے کی مجبوری کیا ہے؟ آیا کوئی ایسی روایت یا حدیث صحیح یا اجماع امت ہے جو ہمیں عدم سماع النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مجبور کر رہا ہو جس کی وجہ سے ہم مذکورہ روایت کو ترک کریں اور اس حدیث یا اجماع کو لے لیں۔ مشکوٰۃ ص ۱۲۰ اور صفحہ ۱۲۱ پر بھی دو حدیثیں ہیں جو حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دال ہیں بہر حال انبیائے کرام کے علاوہ موتی میں سماع و عدم سماع کی بحث ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی قبروں کے پاس جا کر کچھ کہے تو کیا یہ مردے اس کہنے کو سنتے ہیں یا نہیں سنتے اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک سے اب تک اختلاف چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ مردے سنتے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ مردے نہیں سنتے ہیں فتاویٰ رشیدیہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

سوال: سماع موتی ثابت ہے یا نہیں در صورت جواز یا عدم جواز قول راجح کیا ہے اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں؟
جواب: یہ مسئلہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہا ہے اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تلقین کرنا بعد دفن کے اسی پر ہی مبنی ہے جس پر عمل کرے درست ہے۔

سوال: میت قبر میں سختی ہے یا نہیں؟

جواب: اموات کے سننے میں اختلاف ہے اور بعض کے نزدیک سختی ہے بعض کے نزدیک نہیں سختی۔

(فتاویٰ رضویہ ص ۱۰۸)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں اس کے قریب قریب فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں ایک طرف جزی فیصلہ اور حتمی حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

طرفین کے دلائل

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر قائلین سماع موقی کے استدلالات یہ ہیں۔

● "باب عذاب القبور" کی دوسری حدیث ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں انہ لیسمع قورع نعالہم کے الفاظ آئے ہیں۔

● قلب بدر کا واقعہ اور تفصیلی حدیث ہے جس میں یہ الفاظ ہیں والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع لہما اقول منہم وفي رواية ما انتم باسمع منہم۔ (مشکوٰۃ ص ۳۷۰)

● مردوں کو قبروں میں سلام کرنا، ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے السلام علیکم یا اهل القبور والی حدیث کو صحیح کہا ہے۔

● طبرانی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ مردہ جس کو جاتا ہے وہ نہلاتے وقت اس نہلانے والے کو پچھاتا ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی احادیث اپنی تفسیر میں جمع فرمادی ہیں جو ایک طویل فہرست ہے۔

● علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے عالم برزخ میں مردوں کے علم پر اجماع نقل کیا ہے یہ اگرچہ محل نظر ہے مگر انہوں نے شرح مقاصد میں لکھا ہے۔

● ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ مردہ جاتا ہے کہ کون اس کو کفن پہناتا ہے کون نماز پڑھتا ہے کون اس کو اٹھاتا ہے کون دفن کرتا ہے ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مردہ کھٹ کھٹ کی آواز سنتا ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ قبر میں مردہ زندہ ہے ورنہ احساس کے بغیر حیات محال ہے بعض نے کہا روح لوٹائی جاتی ہے اور مردہ کو زندہ کیا جاتا ہے یہ قائلین سماع موقی کے دلائل ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر عدم سماع کے قائلین نے قرآن عظیم کی تین آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

● سورہ نمل کی آیت (۸۰) انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین۔ اس سے استدلال کیا ہے۔

● سورہ روم کی آیت (۵۲) فانک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین۔ اس سے استدلال کیا ہے۔

② سورۃ قاطر کی آیت (۲۲) وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يَسْمَعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا الَّا يَسْمَعُ مَنْ فِي الْقُبُورِ لَهٗ سَمْعٌ لَّذٰلِكَ سَمِعَ مَا تَدْعُو

③ عدم سماع اموات پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سماع اموات سے انکار یا توقف کے قول سے استدلال کیا ہے۔
 ④ فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ کسی نے قسم کھائی کہ فلاں سے بات نہیں کروں گا اس نے مرنے کے بعد اس سے بات کی تو حادث نہیں ہوگا۔ کیونکہ مردہ نہیں سنا اس مسئلہ کو مسئلہ ایمان سے یاد کیا جاتا ہے اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ مردے نہیں سنتے ہیں شیخ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے خوب عدم سماع کے اثبات کی کوشش کی ہے۔

”ایک دوسرے کو جوابات“

قائلین سماع موتی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف عدم سماع کی نسبت صحیح نہیں ہے اور فقہاء احناف نے مردہ سے کلام کی وجہ سے حادث نہ ہونے کا جو مسئلہ لکھا ہے وہ قسم اور ایمان کا مسئلہ ہے جس کا مدار عرف پر ہے جس سے عدم سماع پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قرآنی آیات کے بارے میں قائلین سماع موتی نے فرمایا کہ ان تینوں آیتوں میں نفی اسماع یعنی سنانے کی نفی ہے کہ آپ سنا نہیں سکتے نفس سماع کی نفی نہیں کہ وہ سنتے نہیں ہیں سنا اپنی جگہ پر ہے البتہ سنانے کی نفی کی گئی ہے۔

سُبْحَانَ: شبہ یہ ہے کہ جب مردے سنتے ہیں تو پھر اسماع اور سنانے کی نفی قرآن کریم نے کیوں کی؟

جواب: ہر وہ عمل جو خارق عادت یا مافوق العادۃ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف فرماتے ہیں اور مخلوق سے اس کی نفی کرتے ہیں مثلاً کسی شخص نے کسی کو گولی مار دی اور وہ مر گیا تو نسبت مارنے والے کی طرف کی جاتی ہے کہ اس نے مار کر قتل کر دیا کیونکہ عادت کے مطابق اس سے آدمی مارا جاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے لیکن بدر کے میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر مٹی کافروں کی طرف پھینک دی جس سے عادت کے مطابق موت واقع نہیں ہو سکتی تھی مگر اس مٹی نے مافوق العادت اثر دکھادیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمادی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی فرمادی اور فرمایا: ”وَمَا رَمَيْتُ اِذْ رَمَيْتُ وَلٰكِنْ اَللّٰهُ رَمٰی“۔

اسی طرح عادت کے مطابق مردہ کو قبر میں ظاہری اسباب کے تحت نہیں سنایا جاسکتا ہے اس لئے اس اسماع کی نفی کی گئی۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں سماع و عدم سماع کی بات نہیں بلکہ یہ عدم انفاع اور عدم انتفاع کی نفی ہے کہ نہ سنانے والے کے سنانے سے ان کفار کو فائدہ ہے اور نہ سنتے سے اب ان کو فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دارالعمل سے جاپچکے ہیں اسی لئے عام علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان آیات میں اسماع کی جو نفی ہے یہ تشبیہ ہے کہ عدم انتفاع میں یہ کفار مردوں کی طرح ہیں کہ یہ کافر سنتے تو ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھاتے تو مردے بھی سنتے ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھا سکتے

ہیں باقی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں "یعلمون" بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان مردوں کو اس سنانے کا علم ہو جاتا ہے تو یسبعون اور یعلمون میں تعارض آگیا لہذا استدلال تام نہیں رہا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں "ان تسمع الامن یؤمن" بھی آیت کا حصہ ہے تو جو لوگ عام سماع کی نفی ان آیات سے نکالتے ہیں وہ اس آیت کے ساتھ کیا کریں گے کیا وہ یہ کہیں گے کہ کفار نہیں سنتے ہیں اور مؤمنین قبروں میں سنتے ہیں؟ یہ تو عجیب بات ہوگی۔

غلط نتیجہ:

مشہین سماع موتی کے مندرجہ بالا دلائل کو دیکھ کر کمزور عقائد کے ایک طبقہ نے مردوں سے خطابات شروع کر دیئے اور ان سے طرح طرح کی حاجتیں مانگنی شروع کیں اور مردوں کو مرجع حوائج بنادیا حالانکہ یہ ایک علمی بحث ہے جو اپنی جگہ پر ہے غیر اللہ سے استدعا اور غائبانہ حاجات میں ان کو پکارنا قرآن وحدیث کی رو سے ویسے بھی حرام ہے نیز یہ کیا ضروری ہے کہ جو سنے وہ حاجت پوری کرنے والا بھی ہو۔ زندہ لوگوں میں کتنے ہیں جو سنتے ہیں مگر بے بس ہیں۔ ادھر اس جانب سماع موتی کے منکرین نے جب قرآن کی آیتوں کو دیکھا کہ اس میں ظاہری طور پر عدم سماع ہے نیز امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف عدم سماع کی نسبت کو دیکھا اور مسئلہ ایمان کو دیکھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واضح انکار کو دیکھا تو انہوں نے مطلقاً سماع موتی کا انکار کیا ان حضرات نے قرآن کی آیتوں کے مقابلے میں احادیث کو پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے احادیث ثبوت سماع میں انہوں نے تاویل کی اور کہا کہ قلیب بدر والی روایت یا تونبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا تو یہ خصوصیت چغیری تھی اور یا تمکیت وتذلیل کے لئے ان کو زندہ کیا گیا یہ خصوصی جزئی واقعہ ہے جس پر دوسرے مواقع کو قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قریع لعال والی روایت کے بارے میں انہوں نے ابن میر کے قول کے مطابق کہا کہ اس میں اذا ان راوی ضعیف ہے یا قریع لعال والی روایت سرعت اتیان ملائکہ سے کنا یہ ہے اور یہ ایک تشبیہی کلام ہے جو وقت دفن کے ساتھ خاص ہے اسی طرح دیگر روایات سماع موتی میں یا تاویل کی یا ان کی تضعیف کی اور معاملہ یہ کہہ کر صاف کرنے کی کوشش کی کہ سماع موتی کی نفی سے شرک کا راستہ بند ہو جائے گا اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ جہاں شرک کا خطرہ ہو وہاں نفی سماع موتی ضروری ہے ان حضرات نے یہ بھی کہا کہ اصل عدم سماع ہے جہاں سماع موتی ثابت ہے وہ عارضی ہے اصل اپنی جگہ پر برقرار رہے گی۔

دوسرا غلط نتیجہ:

عدم سماع موتی کے دلائل کو دیکھ کر انیک طبقہ نے مردوں کو جمادات کے قبیلہ سے قرار دے کر عذاب قبر کا انکار کیا کہ جب حیات نہیں سنتے نہیں تو پھر عذاب کیسے ہوگا اسی نظریہ پر معتزلہ اور دیگر کفر قسم کے لوگ ڈٹ گئے اور انہوں نے عذاب قبر کا انکار کیا حالانکہ عذاب قبر قرآن وحدیث سے قطعی طور پر ثابت ہے اس کا انکار کرنا گمراہی ہے۔

بحث سماع موتی کا خلاصہ

خلاصہ کلام یہ کہ جہاں جہاں احادیث صحیحہ میں سماع موتی کا ثبوت ہے اس کو ماننا چاہیے جیسے سلام عند القبور ہے اور مدفون کے دفن کا وقت ہے ان میں سماع کا ثبوت ملتا ہے تو ماننا چاہیے اسی طرح قلب بدر میں سماع ثابت ہوا تو ماننا چاہیے لیکن جہاں سماع کا ثبوت نہیں وہاں نہیں ماننا چاہیے جیسے کوئی سلام کرتا ہے تو ہم کہیں گے سن لیا اور جب کلام و درخواست شرع کی تو ہم کہیں گے نہیں سنتے ہیں کیونکہ سماع اسوات کی نص غیر معقولی المعنی اور خلاف القیاس ہے تو یہ اپنے مورد میں بند رہنا چاہیے جیسا کہ اصول کا قاعدہ ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ لطائف رشیدیہ میں اس پر طویل کلام فرمایا ہے یہ رسالہ تالیفات رشیدیہ میں شامل ہے اور تالیفات رشیدیہ ص ۲۷۶ پر یہ مسئلہ مذکور ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، مسئلہ سماع موتی قرن اول میں مختلف ہوا ہے اب اس کا فیصلہ تو ممکن ہی نہیں مگر بتقلید اپنے مجتہد مقلد کوئی ترجیح کی جانب اگر میلان کرے تو مضائقہ نہیں "الی ان قال" الحاصل اربع مذہب عدم سماع کا ہے حسب قواعد پس احادیث سماع میں تاویل مناسب ہے ورنہ دوسری جانب بھی مذہب قوی ہے۔ (تالیفات رشیدیہ ص ۲۷۶)

اگر سماع موتی میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ فی الجملہ سماع موتی ثابت ہے اور فی الجملہ نہیں ہے تو اس سے تمام نصوص میں تطبیق ہو جائے گی اور اختلاف میں نرمی آجائے گی ورنہ ایک طرف پر جم کر دوسری طرف کی تبدیلی و تضلیل اگر شروع ہو جائے تو علماء حق کے ہاں اور سلف صالحین کے ہاں شاید یہ طریقہ مناسب نہیں ہوگا آج کل اسلام کو کتنے بڑے خطرات کا سامنا ہے مگر اہل حق آپس میں سماع موتی میں ایسے الجھے ہوئے نظر آ رہے ہیں گویا اسلام میں کوئی اختلافی مسئلہ اگر ہے تو وہ صرف یہی ہے اور اسی پر جھگڑنا فرض ہے حالانکہ ایک طرف پر جم جانا دوسری جانب کے بزرگوں کی بے ادبی کا قوی خطرہ ہے۔

اس مسئلہ میں شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کس طرح اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے جو اہل القرآن میں فرماتے ہیں۔

سماع موتی کا مسئلہ زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے یہ مسئلہ اعتقادات ضروریہ میں سے نہیں جن کی نفی یا اثبات پر کفر و اسلام کا مدار ہے بلکہ یہ ایک علمی اور تحقیقی بحث ہے جس میں بحث و تحقیق اور نظر و تحقیق کی منجائش ہے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں ہمیشہ دورائے رہی ہیں کچھ علمائے کرام کی یہ رائے رہی ہے کہ مردے سنتے ہیں جبکہ دوسرے علماء نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر سماع موتی کی نفی کی ہے۔

علمائے کرام کی ان دونوں جماعتوں کے پاس دلائل ہیں جن پر انہوں نے اپنی اپنی رائے اور تحقیق کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ جو علماء سماع موتی کی نفی کرتے ہیں ان کا استدلال ظواہر قرآن سے اور احادیث صحیحہ سے ہے جب کہ قائلین سماع بھی صحیح حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ (جواہر القرآن ج ۲ ص ۹۰۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سورہ روم کی آیت ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہو جائے گا اسی حد تک ہم کو سماع موتی کا قائل ہونا چاہیے۔ محض قیاس کر کے دوسری باتوں کو سماع کے تحت نہیں لاسکتے۔ بہر حال آیت میں اسماع کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی واللہ اعلم۔ (تفسیر مہنی ص ۵۳۵)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور فیصلہ بھی یہی ہے کہ فی الجملہ اثبات سماع کو مانا جائے اور فی الجملہ عدم سماع کو مانا جائے۔ اس سے تمام نصوص میں تطبیق آجائے گی۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن کے نام سے قرآن عظیم کی عربی زبان میں ایک تفسیر لکھی ہے جو حکیم الامتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد ہیں اور آپ کے حکم سے لکھی گئی ہے۔

اس میں حضرت مفتی صاحب نے بہت ہی تفصیل سے سماع موتی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اور اثبات سماع موتی کو راجح قرار دیا ہے لیکن ایک جگہ لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے جب طرفین کے دلائل کو دیکھا تو پریشان ہو گیا اسی پریشانی میں رات کو خواب میں ایک اللہ والے نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کیوں اس مسئلہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں عالم برزخ ایک مستقل عالم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو زندوں کا کلام مردوں تک پہنچا دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا تو نہیں پہنچاتا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس خواب کے بعد لکھا ہے کہ ”فأصبحت منشوراً صمدی“ یعنی میں شرح صدر کی حالت میں صبح کو اٹھا کہ واقعی عالم برزخ کا فیصلہ یہاں عالم دنیا سے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کلام سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی الجملہ سماع ہے اور فی الجملہ عدم سماع ہے لہذا ایک جانب پر ڈٹ کر دوسری جانب کی تضلیل و تمہیل مناسب نہیں ہے اگرچہ مسئلہ میں اختلاف ہے اختلاف تو موت میں بھی ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

مخالِف الدّاس حتّٰی لا اتّفاق لہم الاعلیٰ شہب والمخلف فی الشہب
فقیل مخلص نفس النّرا سالمة وقیل تشرک نفس المرأ فی العطب

یعنی انسانوں کا موت کے سوا ہر چیز میں اختلاف ہے لیکن موت میں بھی اختلاف ہے کیونکہ بعض کہتے ہیں کہ روح نہیں مرقی ہے مگر بعض کہتے ہیں کہ جسم کے ساتھ روح بھی مرجاتی ہے۔



باب الاعتصام بالكتاب والسنة

کتاب وسنت کا بیان

اعتصام باب افتعال سے چنگ زدوں اور چنگل مار کر مضبوطی سے کسی چیز کو پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ ۱۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" اسی تمسکوا بالقرآن والسنة ۲۔

یعنی قرآن کریم اور سنت نبویہ کے اوامر اور نواہی اور اس کے سارے احکام کو ذل و جان سے مان کر اس پر عمل کرنا اعتصام بالکتاب والسنة ہے۔

"الكتاب" سے مراد وحی متلو اور وحی مجلی ہے "والسنة" سنت سے مراد وحی غیر متلو اور وحی نغلی ہے تو کتاب بمعنی قرآن مجید ہے اور سنت بمعنی سیرت ہے یہ نبی اکرم ﷺ کے اس مسلوکہ مسنونہ طریقہ کا نام ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے مواعبت فرمائی ہے یا سنت سے مراد اقوال الدینی والفعالہ واحوالہ المعبر عنہا بالشريعة والطريقة والحقیقة، وما سلك علیہا الصحابة والتابعون ۳۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ شریعت کا مدار ذات رسول اللہ ﷺ پر ہے چنانچہ کبھی احکام بعد میں آئے ہیں اور عمل ذات رسول کی وجہ سے پہلے ہوتا رہا ہے جیسے وضو کا مسئلہ ہے کہ اس کا حکم کئی سال بعد میں آیا اور اس پر عمل ذات رسول کی وجہ سے پہلے سے ہوتا رہا کتاب وسنت کی مثال متن اور شرح کی ہے۔ کتاب مجمل متن ہے اور سنت اس کی تفصیل اور شرح ہے۔ اب اگر اس مجمل متن سے اس شرح کو الگ رکھا جائے تو کتاب مجمل بلکہ مھمل رہ جائے گی کیونکہ حج و زکوٰۃ، روزہ و نماز کا حکم تو کتاب اللہ میں ہے لیکن بیئت و کیفیات کی تفصیلات و شریعات تو سنت ہی سے ثابت ہوئی ہیں۔

پھر ان دونوں کے ظاہری احکام کے لئے دستور العمل چاہیے وہ فقہ ہے جو الگ الگ عملی دفعات کا نام ہے اور اسی قرآن وسنت سے مستنبط ہے کوئی الگ چیز نہیں ہے اب اگر فقہ کو قرآن وحدیث سے الگ کیا جائے تو یہ دونوں اولہ بغیر دستور کے رہ جائیں گے اور باطنی احکام کے لئے دستور العمل تصوف اور سلوک واحسان ہے تو یہی شریعت و حقیقت و طریقت ہے۔

اس باب کی روایات نہایت واضح اور مؤثر انداز سے "توحییب الی السنة" اور "تحذیر عن البدعة" کی تعلیم پڑ مشتعل ہیں دین میں نوابجا بدعات کی قلع قمع کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخہ ممکن نہیں۔

الفصل الاول

دین میں نئی بات نکالنا بدعت ہے

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَخَذَ فِي أَمْرِ قَاهُذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: من احدث۔ "ای اوچدوا بتداع وزعم کو نہ دینا"۔

فی امرنا: اس سے دین اسلام اور شریعت مطہرہ مراد ہے۔ ہذا۔ یہاں اشارہ قریب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اگرچہ دین محسوس و مبصر نہیں ہے۔ اس سے دین اسلام کے نہایت واضح اور روشن ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کہ دلائل اور یقینات کے اعتبار سے یہ دین ایسا روشن ہے جس طرح کوئی محسوس اور مبصر چیز ہوتی ہے۔

بدعت کی تعریف اور اس کی شناخت:

احداث: اور احداث فی الدین بدعت کے معنی میں ہے۔ لغوی طور پر بدعت نئی چیز اور نئے کام کے کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح شرع میں بدعت وہ نیا کام ہے جو خیر القرون میں نہ ہوا اور سلف خلف اس کی طرف محتاج ہوں۔ اور کوئی شخص حصول ثواب کی نیت سے اسے کرے۔

بدعت کی اس تعریف شرعی کے پیش نظر اس کا کوئی فرد حسن نہیں بلکہ اس کا ہر فرد قبیح اور سیدہ ہی ہے۔ ہاں بدعت کے لغوی مفہوم میں ہر نو ایجاد شے داخل ہو جاتی ہے جس سے بدعت لغوی کی بہت ساری قسمیں بن جاتی ہیں۔ لیکن وہ ایجادات کے قبیلے سے ہیں بدعت اصطلاحی و شرعی نہیں۔

اس تعریف سے عادات کھل گئیں جیسے نئے طرز کے کپڑے، رکن بہن اور کھانے پینے اور فیشن کے نئے نئے طریقے وغیرہ وغیرہ۔ نیز وسائل و ذرائع میں بدعات نہیں آتیں بلکہ مقاصد میں آتی ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص مثلاً نماز وغیرہ کے لئے سوار ہو کر جاتا ہے۔ یا پیدل جاتا ہے یا اڑ کر جاتا ہے جس وسیلے اور ذریعہ کو استعمال کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ سلف یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم بعد میں آنے والوں کی طرح اس کام کی طرف محتاج ہوں اور پھر بھی نہ کیا ہو۔

اور اگر صحابہ کسی خاص طرز اپنانے کی طرف محتاج نہ ہوں اور بعد میں آنے والے لوگ اس کی طرف محتاج ہوں مثلاً خاص طرز پر نماز کا قیام، مساجد کے انداز اور صرف و نحو وغیرہ فنون کی تعلیم۔ یہ ایجاد بھی بدعت نہیں کیونکہ سلف کے ہاں اس کا

وجود اس لئے نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف محتاج نہ تھے، اگر اس خاص انداز اور خاص طریقہ کار ہی میں ثواب ہوتا تو وہ اس کو اپناتے کیونکہ ثواب کی طرف تو وہ بھی محتاج تھے۔ ”ثواب کی نیت“ شرط ہے کیونکہ بدعت اسی ثواب کی نیت سے بنتی ہے۔ اور شرک اور بدعت ہمیشہ محبت اور ثواب کے راستے سے آتے ہیں۔ شرک اور کفر کے بعد بدعت کا نمبر ہے۔

اس لئے اب کہا گیا ہے ”البدعة شرک الشریک“۔ یعنی بدعت شرک کا ایک قسم اور شاخ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے اور ”الیوم اکملت لکم دینکم“ قرآنی آفاقی اعلان ہو چکا ہے۔ اب جو شخص دین میں کوئی نیا چیز یہ لاتا ہے تو ہم ان سے پوچھیں گے۔ کہ یہ نواہد ثواب کا کام حضور ﷺ کو معلوم تھا یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ معلوم نہ تھا تو علم میں افضلیت کا دعویٰ کر کے یہ شخص کافر ہو گیا۔ اور اگر کہے کہ حضور ﷺ کو معلوم تھا تو ہم پوچھیں گے کہ امت کو اس کی تبلیغ کی یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ تبلیغ نہیں کی تو پھر بھی کافر ہو گیا۔ کیونکہ فریضہ رسالت پر اعتراض کیا اور اگر کہے کہ تبلیغ کی ہے تو بتاؤ کہاں ہے؟ کہ حضور ﷺ نے میلاد کا حکم دیا ہو یا جلوس کا حکم دیا ہو یا اذان سے پہلے خاص نمائشی درود کا حکم دیا ہو۔ یا عرسوں یا میلوں کا حکم دیا ہو۔ یا جمعہ کے بعد حلقہ باندھ کر کھڑے کھڑے خود ساختہ سلام پڑھنے کا حکم دیا ہو وغیرہ وغیرہ۔

اگر وہ کہے کہ ہم عومات سے استدلال کرتے ہیں کہ درود پڑھنے کا عام حکم ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ”الاستدلال بالعمومات عند وجود سنة مخصوصة باطل“۔ ”یعنی مخصوص سنت کی موجودگی میں عومات اور عام نصوص سے استدلال کرنا باطل ہے“۔

اچھا ہم کو یہ بتا دو کہ آپ نے جن عومات سے استدلال کیا ہے کیا آنحضرت کو ان عومات کا علم تھا یا نہیں؟ اور اس کو آپ سمجھتے تھے یا نہیں؟ اگر سمجھتے تھے تو بتاؤ کہ عمل ان عومات پر کہاں کیا ہے؟ تو جن عومات سے آنحضرت ﷺ نے استدلال نہیں کیا بلکہ عومات کے برعکس آپ کی خاص سنت موجود ہے۔ تو ہم کو کس نے عومات کی پٹی پڑھا کر بدعت میں لگا دیا؟ یہاں یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ بدعت اور رسم میں فرق یہ ہے کہ بدعت کو ثواب کی نیت سے کیا جاتا ہے اور رسم ادا کرنے میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ بدعت میں عقیدہ اور عمل دونوں کی خرابی ہوتی ہے اور رسم میں صرف عمل کی خرابی ہوتی ہے۔ بدعت کی مندرجہ بالا اشریحات کے لئے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی ایک تفسیری عبارت بطور تائید بہت مناسب ہوگی۔ فرماتے ہیں۔

واما اهل السنة والجماعة فيقولون في كل قول وفعل لم يثبت عن الصحابة رضي الله عنهم هو بدعة لانه لو كان خيرا سبقونا اليه لانهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير الا وقد بأدروا

علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ میر سید سند شریف نے اپنی کتاب "التعریفات: ص ۳۷" میں بدعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔
 "البدعة هي الامر المحدث الذي لم يكن عليه الصحابة والتابعون ولم يكن مما اقتضاه
 الدليل الشرعي. (التعریفات ص ۳۷)"

یعنی بدعت اس نوا ایجاد کام کا نام ہے جس کو نہ صحابہ نے کیا ہو نہ تابعین نے کیا ہو اور نہ کسی شرعی دلیل نے اس کا تقاضہ کیا ہو۔
 بدعت کی ان شرعی تعریفات کو دیکھ کر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بدعت ایک قبیح عمل ہے۔ اور اس کا کوئی فرد اچھا اور حسنہ نہیں
 ہے۔ ہاں لغوی مفہوم جو مطلق ایجاد کے معنی میں ہے۔ اس میں اقسام بن سکتی ہیں لیکن شرعی بدعت میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔
 جن حضرات نے تقسیم کی ہے وہ شرعی بدعت کی تقسیم نہیں بلکہ لغت کے حوالے سے ہے۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف
 ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اما این فقیر دریں مسئلہ بایشاں موافقت ندارد و پنج فرد بدعت را حسنہ نمی داند و جز ظلمت و کدورت در آں احسان نمی نماید۔"

قال عليه وعلى آله الصلوة والسلام كل بدعة ضلالة. (مکتوبت ج ۲ ص ۲۸)

میر تقی محمد: بہر حال یہ فقیر تقسیم بدعت کے مسئلے میں ان لوگوں کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا اور بدعت کے کسی فرد اور قسم
 کو حسنہ نہیں سمجھتا، بلکہ بدعت میں تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں پاتا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ ہر بدعت
 گمراہی ہے۔

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک کلام کا مطلب یہ ہوا کہ اصطلاحی اور شرعی بدعت میں کوئی تقسیم نہیں کہ بدعت بھی ہو اور
 اچھی بھی ہو بلکہ بدعت شرعی ہر فرد کے اعتبار سے قبیح اور گمراہی ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

﴿وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ كِتَابُ اللَّهِ
 وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. (رواه مسلم)﴾

میر تقی محمد: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا "بعد
 از اس جانا چاہئے کہ بے شک سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے سب سے بہترین راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور سب سے بدترین
 چیز وہ ہے جس کو (دین میں) نیا نکالا گیا ہو اور ہر بدعت (اپنی طرف سے دین میں پیدا کی ہوئی نئی بات) گمراہی ہے۔"
 توضیح: اما بعد: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شاید خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس لئے اما بعد کا کلمہ ادا فرمایا اس کلمے کے متعلق
 ابتدا میں پوری تفصیل گزر چکی ہے۔

وکل بدعة ضلالة: ایک روایت میں آیا ہے، ”وکل ضلالة فی النار“ یعنی گمراہی کے اہل لوگ سب دوزخ میں ہوں گے۔ دین اسلام میں بدعت ایک خطرناک چیز ہے جس سے دین کے سچ ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور دین فاسد ہو کر رہ جاتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: لا

وهل افسد الدين الا الملوک واحبار سوء ورهبانها
بے دین ملحد بادشاہ اور بدعت پسند علماء سوء اور جہالت سے لبریز باطل پرست درویش دین کے بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔
بعض نے کہا:

وخیر امور الدین ما کان سنة وشراً الامور المحدثات البدائع
سب سے زیادہ مبغوض لوگ

﴿وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْفَعُ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ ثَلَاثَةٌ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُتَّبِعٌ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَمُظْلِمٌ كَمَّا امْرَأَتِي مُسْلِمٌ يَغْتَرِبُ حَقِّي لِذُنُوبِي ذَمَّةٌ﴾ (رواية البخاري)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض (جن سے اللہ سخت ناراض ہے) تین لوگ ہیں: ① حرم میں کجروی کرنے والا، ② حاسلام میں ایامِ جاہلیت کے طریقوں کو ڈھونڈنے والا، ③ کسی مسلمان کے خونِ ناحق کا طلبگار تا کہ اس کے خون کو بہائے۔“

(بخاری)

توضیح: ملحد فی الحرم: الحاد راہِ راست سے ہٹنے اور کجروی کو کہتے ہیں اور ملحد فی الحرم وہ شخص ہے جو حرم شریف میں احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ خدا کے حرم کی بے حرمتی کرتا ہے۔ اور وہاں پر بد امنی پھیلاتا ہے، جھگڑا کرتا ہے اور وہاں شکار کرتا ہے۔ کہتے ہیں حرم شریف میں گناہ کا تصور کرنا بھی گناہ ہے۔ اور صغیرہ بھی کبیرہ شمار ہوتا ہے۔ سنۃ الجاہلیۃ: یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد بدعتی سے جاہلیت کے رسم و رواج کو اسلام میں رائج کرتا ہے۔ مثلاً نوح کرنا، گریبان چاک کرنا، ماتم کرنا، بال نوچنا، قومی تعصب کو ہوا دینا اور جاہلیت کی بدعت کو اسلام میں داخل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

مطلب دمہ امراء: یعنی ایک مسلمان کے ناحق خون کی تلاش میں لگا رہنا بڑا گناہ ہے علماء نے لکھا ہے کہ اس جملہ اور اس سے قبل جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص ان گناہوں کی تلاش کی وجہ سے گناہگار بن گیا تو جو لوگ یہ گناہ کرنے والے ہوں ان کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟

ان تینوں فصلوں کو خاص کیا کیونکہ اول میں تخصیص مرکز اور اس کا احترام ہے۔ دوسرے میں حدود اسلام کی رعایت ہے اور تیسرے میں خصوصیت امن عامہ ہے۔ یاہوں کہہ دیں کہ اول میں قباحت اور شاعت بوجہ محل ہے۔ دوسرے میں شاعت بوجہ فاعل ہے اور تیسرے میں شاعت بوجہ فعل ہے۔ تو فعل و فاعل و محل تینوں آگئے۔

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ أُمَّتٍ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَلَى قَبِيلٍ وَمَنْ أَلَى قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَلَى﴾ (رواہ البیہقی)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا اور سرکشی کی" (جنت میں داخل نہ ہوگا) پوچھا گیا کہ وہ کون شخص ہے جس نے انکار کیا اور سرکشی کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری اطاعت اور فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا اور سرکشی کی۔ (بخاری)

توضیح: الا من ابی: یہاں امتی سے اگر امت دعوت یعنی کفار مراد لیا جائے تو "الا من ابی" سے مراد کافر ہوں گے۔ اس صورت میں امتی متصل ہو جائے گا یعنی جن کافروں نے ایمان سے انکار کیا وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ اور اگر امت سے مراد امت اجابت یعنی مسلمان ہیں تو پھر "الا من ابی" میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اعتقاد انکار کیا تو وہ کافر ہو گیا اور امتی منقطع ہوگا۔ یعنی سب مسلمان امتی جنت میں جائیں گے۔ لیکن جنت کا عقیدہ نہ رکھنے والا نہیں جائے گا۔ اور اگر عصیان انکار ہے تو پھر امتی متصل ہے یعنی سب مسلمان امت جنت میں جائے گی۔ مگر انکار کرنے والا مسلمان نہیں جائے گا۔ یعنی دخولِ اولیٰ کے ساتھ نہیں جائے گا کیونکہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے سزا بھگتنے کے بعد ہی جائے گا۔

فرشتوں نے حضور اکرم ﷺ کی حیثیت کو واضح کر دیا

﴿وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالُوا إِنَّ لِمُصَاحِبِكُمْ هَذَا مَقْلًا فَاصْرِبُوا لَهُ مَقْلًا قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ تَلَامُتُهُ وَالْقَلْبَ يَقْطُانُ فَقَالُوا مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَلَى دَارًا وَجَعَلَ فِيهَا مَأْكُتَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا فَمِنْ أَجَابِ الدَّاعِي دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْكُتَةِ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِي لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْكُتَةِ فَقَالُوا أَوَلَوْهَا لَهُ يَفْقَهُهَا قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ تَلَامُتُهُ وَالْقَلْبَ يَقْطُانُ فَقَالُوا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَالنَّاسُ مُعْتَدُونَ أَطَاعَ اللَّهُ وَمَنْ عَصَى مُعْتَدًا فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَمُعْتَدٌ فَرَّقِي بَيْنَ النَّاسِ﴾ (رواہ البیہقی)

تفسیر حکیم: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ (کچھ) فرشتے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے جب آپ سو رہے تھے فرشتوں نے آپس میں کہا ”تمہارے اس دوست (یعنی آنحضرت) کے متعلق ایک مثال ہے اس کو ان کے سامنے بیان کرو۔“ دوسرے فرشتوں نے کہا ”وہ تو سوئے ہوئے ہیں۔“ (لہذا بیان کرنے سے کیا فائدہ؟) ان میں سے بعض نے کہا ”بے شک آنکھیں سو رہی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے“ پھر اس نے کہا ”ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور لوگوں کو کھلانے کے لئے دسترخوان چنایا اور پھر لوگوں کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا لہذا جس نے بلانے والے کی بات کو مان لیا وہ گھر میں داخل ہوگا اور کھانا کھائے گا۔ اور جس نے بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوگا اور نہ کھانا کھائے گا۔“ یہ سن کر فرشتوں نے آپس میں کہا ”اس کو (وضاحت کے ساتھ) بیان کریں۔ تاکہ یہ سمجھ لیں۔“ بعض فرشتوں نے کہا (بیان کرنے سے کیا فائدہ کیونکہ) وہ تو سوئے ہوئے ہیں۔ دوسروں نے کہا بے شک آنکھیں سوئی ہوئی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے۔ اور پھر کہا ”گھر سے مراد تو جنت ہے۔ اور بلانے والے سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔ اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ (بخاری)

توضیح: فاضل ہوالہ مثلاً: یہ گفتگو فرشتوں کی آپس کی گفتگو ہے بطور مثال یہ حدیث بیان کی ہے تو یہ مرفوع حدیث ہے۔

والقلب یقظان: عام لوگوں کی نیند کا اثر ظاہری اور باطنی تمام اعضاء پر ہوتا ہے اور آنکھوں کے ساتھ دل بھی سوکر ادراک و شعور سے غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن نبی کی نیند سے صرف ظاہری اعضاء متاثر ہوتے ہیں دل کے ادراک و شعور پر نیند کا اثر نہیں ہوتا۔

متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کے دل نہیں سوتے۔ کیونکہ نبی کے دل پر ہر وقت عالم بالا سے وحی کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ تو نیند اور بیداری میں علوم وحی کے حصول کے لئے اس دل کا تیار رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کا خواب وحی کی ایک مستقل قسم ہے۔ جو قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب ہی کی وجہ سے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا فیصلہ کیا اگر خواب کی حیثیت یقینی اور قطعی نہ ہوتی تو قتل اولاد جیسے عمل کا ارتکاب کیسے ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ نبی کو خواب سے جگانا جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وحی ہو رہی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کی نیند ناقض وضو نہیں ہے۔

میان: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آئندہ کتاب الصلوٰۃ میں لیلۃ التعویس کے نام سے ایک حدیث آرہی ہے۔ اس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور سب لشکر والے سو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی سو گئے۔ اور طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھل گئی اور نماز فجر قضاء ہو گئی، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل جاگ رہا تھا تو نماز کیوں قضاء ہو گئی؟ اور وقت پر جاگ کیوں نہ آئی؟

چکا۔ اس سوال کا اکثر شارحین نے یہ جواب دیا ہے کہ انسانی جسم میں ہر عضو کا اپنا الگ کام اور ذمہ داری ہے۔ صبح کا اور اک کرنا اور اسے دیکھنا اور معلوم کرنا یہ دل کی ذمہ داری نہیں بلکہ آنکھوں کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آنکھیں بند کرے تو جاننے کی حالت میں بھی وہ صبح صادق کا اور اک نہیں کر سکتا حالانکہ دل بیدار ہے۔ مگر آنکھیں بند ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کا دل جاگ رہا تھا لیکن صبح کا اور اک دل کا کام نہ تھا بلکہ آنکھوں کا تھا اور ظاہری طور پر آنکھیں بند کی وجہ سے متاثر تھیں۔ تو صبح کا اور اک اس وقت ہوا جب سورج نے جسم کو احساس کے ساتھ متاثر کیا اور جسم کی قوت حاسہ نے محسوس کیا کہ صبح کا وقت نکل گیا بلکہ دھوپ نکل آئی ہے۔

اولوہالہ: یعنی اس مثال کی تفسیر بیان کر دتا کہ نبی اکرم ﷺ بھی اس کو سمجھ لیں۔

الداعی محمد: بعض دیگر روایات میں "داعی" سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اور "صاحیہ" سے مراد جنت ہے۔ اور "دار" سے مراد اسلام لیا گیا ہے۔ جس سے بظاہر تعارض معلوم ہو رہا ہے شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اصل اور بلا واسطہ داعی اللہ تعالیٰ ہے۔ اور نبی کریم ﷺ بلا واسطہ داعی ہیں۔ تو کبھی نسبت بلا واسطہ اور کبھی بالواسطہ کر دی گئی ہے۔

نق طرح چونکہ جنت کے لئے سبب ہے اور خود جنت مسبب ہے تو داری تفصیل کہیں پر اسلام سے کی گئی جو جنت کے لئے ہے اور کہیں پر داری تفصیل جنت سے کی گئی جو مسبب ہے۔ اور سبب کا اطلاق مسبب پر اور مسبب کا سبب پر عام اور خاص ہے۔

محمد فرق بین الناس: یعنی آنحضرت ﷺ مومن اور کافر کے درمیان فارق ہیں کہ آپ ﷺ کو ماننے والا زمین اور نہ ماننے والا کافر ہے۔ جو محمدی ہے وہ مومن ہے اور جو محمدی نہیں وہ مسلمان نہیں۔ کیونکہ میدان حقانیت میں اب محمدیت کا دور دورہ ہے۔

عمل میں اپنے نبی ﷺ سے آگے نہ بڑھو

﴿وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ جَاءَ فَلَانَةٌ رَهْطٌ إِلَىٰ أَرْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أُخْبِرُوا بِهَا كَانَتْهُمْ تَفَالُوهَا فَقَالُوا أَتَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَا أَنَا فَأَصِلَ اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ الْآخَرُ أَمَا أَصُومُ النَّهَارَ وَلَا أَفْطِرُ وَقَالَ الْآخَرُ أَمَا أُعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ أَنْتُمْ الَّذِينَ كُنْتُمْ كَذَا وَكَذَا وَأَنَا وَاللَّهِ إِنِّي لَا أَحْشَاكُمْ بَلَاءً وَأَنْتُمْ كُنْتُمْ لَكُمْ أَصُومُ وَأَفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأُزْقِدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي﴾ (متفق عليه)

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ تین شخص آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آنحضرت ﷺ کی عبادت کا حال دریافت کریں اور جب ان لوگوں کو آپ ﷺ کی عبادت کا حال بتلایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو کم خیال کر کے آپس میں کہا ”آنحضرت ﷺ کے مقابلے میں ہم کیا چیز ہیں اللہ تعالیٰ نے تو ان کے اگلے پچھلے سارے اعمال کو ف کر دیئے ہیں“ ان میں سے ایک نے کہا ”اب میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا“۔ دوسرے نے کہا ”میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا“۔ تیسرے نے کہا ”میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہ کروں گا“ (ان میں آپس میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ) آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا ”تم لوگوں نے ایسا دیا کہا ہے، خبردار! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ اختیار کرتا ہوں لیکن (اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سونا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے لہذا) جو شخص میرے طریقے سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں (میری جماعت سے خارج ہے)۔“

(بخاری و مسلم)

توضیح: جا، ثلاثہ رھط: ان تین آدمیوں کو جب آنحضرت ﷺ کی عبادت کا علم ہوا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ نبی اکرم ﷺ تو معصوم ہیں اور ہم گنہگار ہیں۔ حضور ﷺ مامون العاقبہ ہیں اور ہم اپنے انجام کے بارے میں مامون نہیں ہیں۔ لہذا ہمیں عبادت میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ چنانچہ اسی محنت کا ذکر آگے آتا ہے کہ ایک نے کہا میں رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، ولا المطر، یعنی ایام ممنوعہ منہیہ کے سوا روزہ رکھوں گا اور کبھی بھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے عدم نکاح کا عہد کیا۔ لے

فلیس منی: ای لیس من اشیاعی ولا تعلق له منی بشیعی:

ترجمہ: اس قسم کے جموں سے متعلق ایک مشہور اشکال ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ مجھ سے یا ہم میں سے نہیں ہے تو اس کا ظاہر مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ اس کام کے ارتکاب کے بعد وہ شخص مسلمان نہیں رہے گا بلکہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

جواب: اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ کلام اسلوب حکیم کے طریقہ پر ہے کہ اس طرح بیزاری کا اعلان جب ایک مسلمان سنے گا تو وہ چیخے گا چلائے گا اور رونے لگا کہ میں تو اپنے نبی اور اپنے عقیدہ سے کٹ گیا لہذا تو بہ کرے گا اور اس معصیت کے قریب بھی نہ جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ فلیس منی کا جو جملہ ہے اس کا تعلق عام اسلام و ایمان سے نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسی جزئیہ اور اس عمل میں یہ شخص مجھ سے نہیں اور نہ مسلمانوں کے طریقہ پر ہے بلکہ اس جزئی میں یہ شخص کسی اور مذہب والوں کی طرح ہے مسلمانوں کی طرح نہیں ہے۔

عصمتِ انبیائے کرام کا مسئلہ

وقد غفر الله له: اس جملہ سے عصمتِ انبیاء کا مطلب نکلتا ہے بطور اشارہ چند جملے عرض کرتا ہوں۔ عصمت اس حفاظت کا نام ہے کہ قدرت و اختیار کے موجود ہوتے ہوئے کسی کو بالفعل گناہ سے محفوظ رکھنا، علماء کے ہاں اس پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام سے قبل النبوة اور بعد النبوة شرک و کفر کا صدور نہیں ہوتا اس سے وہ معصوم ہیں اور کبار کے بارے میں بعد النبوة معصوم ہونے میں اہل السنۃ کا اجماع ہے۔ اور قبل النبوة بعض علماء کے نزدیک کبار کا صدور ممکن ہے لیکن یہ مسلک مرجوح ہے ارجح نہیں ہے۔ اور صفائے بارے میں اشاعرہ کہتے ہیں کہ اس کا صدور قبل النبوة اور بعد النبوة جائز ہے۔ لیکن ماترید یہ مطلق نفی کرتے ہیں اور یہی عام علماء کے نزدیک رائج ہے۔ کیونکہ نبی عام انسانوں اور گناہگاروں کی ہدایت کے لئے آتا ہے جب خود وہ گناہوں سے محفوظ نہیں تو اوروں کی کیا رہنمائی کر سکے گا؟ لہ

عالم کہ تن آسانی و تن پروری کند او خوشترن گم است کرار بہری کند
”فرقد شویہ انبیائے کرام کو معصوم نہیں سمجھتا ہے۔“

حضرات انبیائے کرام کی طرف قرآن کریم میں ذنب و معصیت کی جو نسبتیں ہوئی ہیں وہ ”حسنات الابرار سیئات المقربین“ کے طور پر ہیں۔ نیز ان کی شان عالی کے پیش نظر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ نے الفاظ کی حد تک سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہ اپنوں کے ساتھ اپنوں کا انداز کلام ہوتا ہے۔ کسی اور کو اس کی اجازت نہیں ہے بلکہ قرآن عظیم کی تفسیر و تحقیق کے ضمن میں اگر ان ذلالت اور لغزشوں کا ذکر آتا ہے تو ایک آدمی اس پر کلام کر سکتا ہے۔ ورنہ مستقلاً انبیائے کرام کی لغزشوں کے قصے بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ لہ

سورۃ طہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کے تذکرہ میں مفسرین لکھتے ہیں۔

قال ابو بکر بن العربی فی احکام القرآن واضعاً اساساً لادب الانبیاء وقاعدة غریبة . يقول
”لا يجوز لاحدنا اليوم ان يعبر بذلك عن آدم الا اذا ذكرناه في الثناء قوله تعالى عنه او قول
نبیه . فاما ان يبتدأ ذلك من قبل نفسه فلیس بجائز لنا فی آبائنا الادنین الینا المماثلین لنا
فکیف فی ابینا الاقدم الاعظم الاکرم النبی الاقدم الذی عذره الله سبحانه وتاب علیه
وغفر له۔ (قرطبی، بحر محیط، معارف القرآن)

ایک جواب یہ بھی ہے کہ ذنب کی نسبت کے مختلف درجات ہیں نبی کی طرف نسبت ہو تو خلاف اولیٰ کا ارتکاب مراد ہوتا ہے، یا ذنوب امت مراد ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی اطاعت میں کامیابی ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَنَعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيهِ فَعَزَّزَهُ عَنْهُ قَوْمٌ فَلَبَّغَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَطَّبَ فَعَمِدَ اللَّهُ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَذَكَّرُونَ عَنِ الشَّيْءِ أَصْنَعُهُ فَوَاللَّهِ إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ بِاللَّهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً. (مسند فقہ علیہ)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کی اجازت دے دی لیکن کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا جب آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور خدا کی حمد و تعریف کے بعد فرمایا ”لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں خدا کی قسم! میں اللہ تعالیٰ کی مرضی و تائیدی سے کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔“ (بخاری و مسلم)

توضیح: صنع: یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک کام کیا اور لوگوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دی مگر کچھ لوگوں نے اس احتیاط کے پیش نظر پرہیز کیا جس پر نبی اکرم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

ممکن ہے کہ اس کام سے مراد روزہ کی حالت میں بوس و کنار کی اجازت ہو آپ ﷺ نے خود عمل کیا لوگوں کو رخصت پر چھوڑا مگر کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کو احتیاط تصور کیا آپ ﷺ نے فرمایا۔

انی لا علمہم: یعنی میں ان سب سے زیادہ جاننے والا بھی ہوں اور سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ خوفِ خدا رکھنے والا بھی ہوں۔ اور حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ادا کرتا ہوں۔ اور یہ کام اور یہ چیزیں خوفِ خدا اور تقویٰ کے منافی نہیں ہیں۔ کچھ لوگ حضور اکرم ﷺ سے عمل میں آگے بڑھنا چاہتے تھے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو معتب ہوئے کیونکہ کثرتِ عبادت مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ شدتِ اطاعت مقصود و مطلوب ہے۔

مورخہ ۱۸ محرم ۱۴۱۰ھ

تأبیر نخل میں آنحضرت ﷺ کا ایک حکم

﴿۸﴾ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قَدِمَ نَبِيُّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ وَهُمْ يُؤْتِرُونَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُونَ قَالُوا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوا كَانَ خَيْرًا فَنَزَعُوا فَنَقَصَتْ قَالَ قَدْ كَرِهْتُ لَكُمْ ذَلِكَ فَقَالَ إِنَّمَا أَتَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَعُدُّوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيٍ فَإِنَّمَا أَتَا بَشَرٌ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ (جب) سرکارِ دو عالم ﷺ مدینہ تشریف لائے اس

وقت مدینہ کے لوگ کجور کے درختوں میں تاثیر کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا ”یہ تم کیا کرتے ہو؟“۔ اہل مدینہ نے عرض کیا ”ہم ایسا ہی کرتے رہے ہیں“۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو (چنانچہ لوگوں نے آپ کا یہ ارشاد سن کر) اسے چھوڑ دیا اور اس سال پھل کم آیا۔ روای کہتے ہیں کہ اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ”میں بھی ایک آدمی ہوں لہذا میں جب بھی تمہیں ایسی بات کا حکم دوں جو تمہارے دین کی ہو تو اسے قبول کر لو اور جب کوئی بات اپنی عقل سے تمہیں بتاؤں تو سمجھ لو کہ میں بھی انسان ہوں“۔ (مسلم)

توضیح: بَابُ وَنِ الْفَخْل: تاثیر باب تفعلیل سے اصلاح کے معنی میں ہے۔ نیز یہ حلیہ اور ہوند کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ زکھجور کے درخت کے گاہ بھے کا مادہ درخت کے گاہ بھے میں جوڑ دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زکھجور کے درخت کے پھول مادہ کے پھول پر جھاڑ دیا جائے تاکہ پھل کثرت سے آجائے۔ مدینہ منورہ کے لوگ یہ عمل مدینہ کے باغات میں کیا کرتے تھے کیونکہ کجور کا درخت حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی کے باقیہ حصہ سے بنا ہے اس لئے اس میں وہی عادات ہیں جو انسان میں مذکور اور مومنٹ میں ہیں جس باغ میں زکھجور نہیں ہوتا وہاں پھل نہیں آتا پھر اس تاثیر کے عمل سے فصل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور پھل بھی عمدہ آتا ہے۔

لعلکم لو لم تفعلوا: آنحضرت ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ یہ بھی جاہلیت کا طریقہ ہے اللہ تعالیٰ نے جیسا لکھا ہے ویسا ہی ہوگا۔ تو اس طریقہ کار کی کیا ضرورت ہے؟ نیز اس میں تکلف اور محنت بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نفی فرمائی نہ منع کیا بلکہ اس عمل کی ضرورت کو سلب کیا جو از تو پھر بھی باقی۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکوئی طور پر عالم اسباب میں اس عمل اور اس محنت کی بھی ضرورت تھی اس لئے اس عمل کے چھوڑنے سے پھل بھی کم آگئے۔

انما انا بشر: یعنی میں ایک انسان ہوں اور جب میں کوئی حکم دین سے متعلق تمہیں دوں تو اس کو اختیار کرو کیونکہ وہ لاحالہ وحی سے ہوگا اور جب میں تمہیں کوئی حکم اپنی رائے اور اجتہاد سے دے دوں تو ہو سکتا ہے کہ اس میں خطا آجائے کیونکہ میں بشر ہوں تو صحیح اور خطا دونوں کا احتمال بہر حال موجود ہے۔

امرتکم بشیء من رأی: ایک سلسلہ تشریعات اور شرعی امور کا ہے اس میں آنحضرت ﷺ سے غلطی کا امکان نہیں کیونکہ ”وما یفطن عن الہوی ان هو الا وحی یوحی“۔ آیت موجود ہے دوسرا سلسلہ دنیوی معاملات اور سلسلہ اسباب کا ہے تو اس میں خطا کا احتمال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب تمام توجہات آخرت کی طرف ہوں تو دنیا کی پریشانیوں میں پڑنے کی کہاں فرصت تھی؟ اور دنیوی مشقتیں حصول دنیا کے ساتھ لگی ہوئی تھیں جس کو دنیا دار جانتے تھے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”انتم اعلم بامور دنیا کم“: یعنی یہ سب اور مسبب کا جوڑ اور محنت و مشقت کے ترک کرنے پر نقصان کا ظہور تم دنیا دار خوب جانتے ہو۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنی امت کو اقتصادیات کے میدان میں اور معاملات میں شریعت کے قواعد سے آزاد کرنے کا اعلان فرما رہے ہیں جیسا کہ بعض ملحدین

نے اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر حضور ﷺ کا مقصد یہ ہوتا تو آپ ﷺ نے معاملات اور خرید و فروخت کے ہزاروں مسائل کیوں بیان فرمائے ہیں؟

حضور اکرم ﷺ کی مثال

﴿وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا مَثَلُ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَنِّشَ يَعْنِي وَيَأْتِي أَكَا الْغَنِيِّ الْعُرَيَّانِ قَالَ النَّجَاءُ النَّجَاءُ فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَذْكَبُوا فَأَنْطَلَقُوا عَلَى مَهْلِهِمْ فَذَبُّوا وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَنِّشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَأَحَهُمْ قَدْ لَكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِي وَكَذَّبَ مَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ﴾ (متفق علیہ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا میری اور اس چیز کی مثال جسے دے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے (دین و شریعت) اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا ”اے قوم میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اور میں نکاح (یعنی بے غرض) ڈرانے والا ہوں۔ لہذا تم اپنی نجات کو تلاش کرو چنانچہ اس قوم کی ایک جماعت نے اس کی فرمانبرداری کی اور راتوں رات آہستہ آہستہ نکل گئی اور نجات پائی ان میں سے ایک گروہ نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک اپنے گھروں میں رہا صبح کو لشکر نے آکر ان کو پکڑ لیا اور ہلاک کر ڈالا۔ (یہاں تک کہ) ان کی جڑیں کھود لیں (یعنی ان کی نسل تک کا خاتمہ کر دیا) چنانچہ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے میری فرمانبرداری کی اور جو (احکام) میں لایا ہوں ان کی پیروی کی اور اس شخص کی مثال بھی یہی ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق کی بات (یعنی دین اور شریعت) میں لے کر آیا ہوں اس کی تکذیب کی۔“ (بخاری مسلم)

توضیح: وانی انا النذیر العریان: یعنی میں نکاح ڈرانے والا ہوں۔ یہ ایک عام ضرب المثل ہے عرب کے لوگ اس کو شدت خوف اور قرب آفت و مصیبت کے وقت کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص اپنے کپڑے چیر پھاڑ کر اتار لیتا تھا اور سر پر یا لکڑی پر لٹکا کر بالکل ننگا ہو کر چٹا تار ہٹا تھا تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بات کو غور سے سنیں بعد میں یہ صرف ضرب المثل رہ گئی جس کو واضح اعلان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا یہ مقصد ہے کہ جس طرح وہ شخص خطرے سے اپنی قوم کو آگاہ کرتا ہے میں تم کو بھی اسی طرح سے آگاہ کرتا ہوں۔ سرزمین عرب اور خاص کر قریش میں ”نذیر“ کا لفظ رسول سے زیادہ مشہور تھا۔ کاہن لوگ اس کو زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ایک کاہن عورت نے جب رسول اللہ ﷺ کی والدہ کو دیکھا تو کہنے لگی کہ یہ عورت یا تو خود نذیرہ ہے یا نذیر کو جتنے والی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں لفظ نذیر کثرت سے حضور اکرم ﷺ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

النَّجَاءُ النِّجَاءُ: منصوب علی الاغراء ہے ای اطلبوا النجاء۔ یعنی نجات کو تلاش کرو بچنے کی کوشش کرو۔
فادجوا: رات کے پہلے صبح میں چپکے سے نکلے کو کہتے ہیں شاعر سحر کہتا ہے: ۲

فالحمد قبل له والحمد بعد لها وللقنا ولا دلاجی وتاویبی

اجتاحت: سچ کئی اور جڑیں اکھڑنے کے معنی میں ہے۔ ۳۔ مہلہم بمعنی مہلت، اطمینان اور سکون۔ ۴۔
فلذلك مثل من: اس مثال میں تشبیہ ہیئت اور تمثیل کی صورت بن سکتی ہے۔ کہ ایک ہیئت کی تشبیہ دوسری ہیئت سے دی
گئی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: ۵

كأن مشار النقع فوق رؤسنا واسيفاد ليل تهاوى كواكبها

ہدایت کے لئے حضور اکرم ﷺ کی مثال

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقِيلٌ كَمَقِيلٍ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا
فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْقَرَأُشُ وَهَلِيلُهُ الدُّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا وَجَعَلَ
يَحْجُزُهُنَّ وَيَغْلِبُنَّهُ فَيَتَقَلَّبْنَ فِيهَا فَأَنَا آخِذٌ بِحُجْرَتِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَقَعُمُونَ فِيهَا. هَلِيلُهُ رَوَايَةُ
الْبُخَارِيِّ وَلَيْسَ لِي مَخُوضًا وَقَالَ فِي آخِرِهَا قَالَ فَلَدِكْ مَقِيلٌ وَمَقِيلُكُمْ أَنَا آخِذٌ بِحُجْرَتِكُمْ عَنِ النَّارِ
هَلُمُّ عَنِ النَّارِ هَلُمُّ عَنِ النَّارِ فَتَقَلَّبُوتُنَّ فِيهَا. (متفق عليه) ۱

۱۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ "میری مثال اس شخص
کی مانند ہے جس نے آگ روشن کی چنانچہ جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلادی تو پروانے اور دوسرے وہ جاندار جو آگ
میں گرتے ہیں آکر آگ میں گرنے لگے آگ روشن کرنے والے شخص نے ان کو روکن شروع کر دیا، لیکن وہ (نہیں رکتے بلکہ اس کی
کوششوں پر) غالب رہتے ہیں اور آگ میں گر پڑتے ہیں اسی طرح میں بھی تمہاری کمریں پکڑ کر تمہیں آگ میں گرنے سے روکتا
ہوں اور تم آگ میں گرتے ہو۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم میں بھی ایسی ہی روایت ہے البتہ مسلم کی روایت کے آخری الفاظ
یہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بالکل ایسی ہی مثال میری اور تمہاری ہے میں تمہاری کمریں پکڑے ہوئے ہوں کہ تمہیں
آگ سے بچاؤں اور یہ کہتا ہوں کہ دوزخ سے بچو میری طرف آؤ دوزخ سے بچو میری طرف آؤ لیکن مجھ پر تم غالب آتے ہو اور
آگ میں گر پڑتے ہو۔ (بخاری مسلم)

توضیح: کمثل رجل: کمثل کاف زائد ہے۔ یعنی مثل مثل رجل۔

استوقد: آگ روشن کرنے کے معنی میں ہے۔ سین تا مبالغہ کے لئے ہے اصل میں "او قد" تھا۔ استوقد نار سے

ہدایت اور اس کی تبلیغ کی روشنی مراد ہے۔ یعنی آگ روشنی کا سبب ہے اور اندھیرے میں نفع بخش چیز ہے۔ لیکن جب اس سے اعراض کیا جائے گا تو یہ سبب ہلاکت بنے گی۔ جس طرح چراغ پروانوں کے لئے روشنی اور رہنمائی کا سبب ہے مگر پھر یہی مفید چیز ان کی ہلاکت کا ذریعہ بنتی ہی ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے جس لوہر اسلام کو پیش کیا ہے اس نفع بخش اور خالص نافع چیز سے جو کوئی اعراض کرے گا تو یہی چیز اس کی ہلاکت کا باعث بھی بنے گی۔

فانا اخذ بحجز کم: حجز حوزۃ کی جمع ہے۔ "معلق الازار" ازار بند کی جگہ یعنی پتلی کمر کو کہتے ہیں۔ حجز بحجز لہر سے روکنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے۔ الفرائض: پروانوں کو کہتے ہیں۔

"فیتقہم: تقہم کسی مشکل کام میں مٹھنے کے معنی میں ہے، یہاں آگ میں گر جانا اور گھسنا مراد ہے، یہاں بھی تمثیل ہے۔ یعنی ایک ہیئت کی دوسری ہیئت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک شخص کا آگ روشن کرنا پھر لوگوں کا آنا اور اس میں گر جانا یہ ایک ہیئت ہے اور محمد ﷺ کا راستے میں کھڑا ہونا اور لوگوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر پیچھے دھکیل کر بچانا یہ دوسری ہیئت ہے۔

ہلم عن العار ای ہلم الی وابعدا عن العار: میری طرف آؤ اور آگ سے دور رہ کر خود کو بچانے کی کوشش کرو۔

وحی کی مثال

(۱۱) وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَلِبَةُ الْمَاءِ فَأُتِيتِ الْمَاءَ فَأُتِيتِ الْكَلَاءَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أُمْسَكِ الْمَاءِ فَتَفَعَّ اللَّهُ بِهَا النَّاسُ فَسَقَرُوا وَسَقُوا وَزَرَعُوا وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةٌ أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاءً فَلِذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَعَّ اللَّهُ فِي دِينِ اللَّهِ وَتَفَعَّ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَزَفَعْ بِذَلِكَ زَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ. (متفق علیہ) ۵

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "اس چیز کی مثال جسے خدا نے مجھے دے کر بھیجا یعنی علم اور ہدایت کثیر بارش کی مانند ہے جو زمین پر ہوئی ہو چنانچہ زمین کے اچھے ٹکڑے نے اسے قبول کر لیا (اپنے اندر جذب کر لیا) اور اس سے بہت زیادہ خشک و ہری گھاس پیدا ہوئی۔ اور زمین کا ایک ٹکڑا ایسا سخت تھا کہ اس کے اوپر پانی جمع ہو گیا۔ اللہ نے اس سے بھی لوگوں کو نفع پہنچایا۔ لوگوں نے اسے پیا اور پلایا اور کھتی کو سیراب کیا۔ اور یہ (بارش کا پانی) زمین کے ایسے ٹکڑے پر (بھی) پہنچا جو چٹیل میدان تھا نہ تو اس نے پانی کو روکا اور نہ گھاس کو اگا یا لہذا یہ سب (مذکورہ مثالیں) اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین کو سمجھا اور جو چیز خدا نے میری وساطت سے بھیجی تھی اس نے اس سے نفع اٹھایا پس اس نے خود سیکھا اور

دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے خدا تعالیٰ کے دین کو سمجھنے کے لئے (تکبر کی وجہ سے) سر نہیں اٹھایا اور خدا تعالیٰ کی ہدایت کو جو میرے ذریعہ بھیجی گئی قبول نہیں کیا۔“ (بخاری و مسلم)

توضیح: الکلام: عشبہ حشیش گھاس کی تین اقسام ہیں۔ کلام، ہبز اور خشک دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور عشب صرف ہبز گھاس کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اور حشیش صرف خشک گھاس کو کہا جاتا ہے۔ الغیث: اس بارش کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ خشک سالی اور قحط کے بعد آجائے۔ لہٰذا "اجادب" اس سخت زمین کو کہتے ہیں جہاں پانی تو جمع ہو سکے لیکن ہبز گھاس نہ اگ سکے۔ لہٰذا "طائفۃ" زمین کا ایک حصہ اور کلڑا مراد ہے۔ لہٰذا "قیحان" یہ قاع کی جمع ہے اور قاع صاف میدان کو کہتے ہیں یہاں ایسا چٹیل میدان مراد ہے جہاں پانی نہ ٹھہر سکے اور نہ ہبز اگ سکے۔ لہٰذا تمسک ماء اسی قیحان کی تفسیر ہے۔ ۵

مطلب حد پش:

اس حدیث میں بلیغ تشبیہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل جب کفر و جہالت کی خشک سالی تھی تو لوگ رشد و ہدایت کے پیاسے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے لائے ہوئے نظام اسلام نے ان کے لئے ایسی بارش کا کام کیا جو مردہ زمینوں کو حیات نو عطا کرتی ہے اس لئے آپ ﷺ نے دین کو ”حیہ“ سے تشبیہ دی ہے۔

مثال اور مشکل کی وضاحت:

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے زمین کے تین حصوں کا ذکر فرمایا۔

- ۱۔ اول قسم مسک ماء کے ساتھ ساتھ منہبت کلاہ بھی ہے۔
- ۲۔ دوسری قسم ”مسک ماء“ ہے۔ لیکن ”منہبت کلاہ“ نہیں
- ۳۔ تیسری قسم نہ ”مسک ماء“ ہے اور نہ ہی ”منہبت کلاہ“ ہے۔

ان تینوں قسموں کو یہاں مثال یا الفاظ دیگر مشبہ بہ کی حیثیت سے سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد مثل لہ یا مشبہ کا ذکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے جو دو قسم کے انسان ہیں۔

- ① اول جو فقہ فی الدین ہو۔ ② دوسرے جو سچا کھانا کھاتا نہ کرے۔ بلکہ متکبر و مغرور ہو۔ ③

سوال: اب یہاں یہ شبہ ہے کہ اس تشبیہ میں مشبہ بہ یعنی اقسام زمین تین ہیں اور مشبہ یعنی اقسام انسان دو ہیں۔ تو مشبہ اور مشبہ بہ میں مطابقت نہیں پایا کہ کوہ مکمل لہ اور مثال میں توافقی نہیں ہے۔

جواب: حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشہدہ میں بھی دو چیزیں ہیں۔

اول: ”ارض نافع“ ہے جس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے میں نافع ہے اور ایک ادنیٰ درجے میں نافع ہے۔ مگر نافع ہر صورت میں ہے۔

دوم: ”ارض غیر نافع“ ہے۔ اب مشہد میں بھی دو چیزیں ہیں ایک استفادہ کرنے والا انسان جو نافع ہے اور دوسرا استفادہ سے محروم انسان جو غیر نافع ہے۔ اور مشہد بہ میں بھی دو چیزیں ہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔

لکھنؤ سنٹرل جج کا بیٹہ: یہ ہے کہ مشہد میں بھی تین اقسام کے انسان ہیں۔ اول وہ انسان جو خود بھی متعلم اور مستفیع ہے۔ اور دوسروں کے لئے بھی معلم و نافع ہے۔ یہ فقہائے کرام ہیں۔ ان کی مثال میں زمین کی پہلی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا وہ انسان ہے جو اپنے لئے تو نافع ہے خوب ذخیرہ جمع کرنے والا ہے مگر دوسرے کے لئے نہیں یعنی معلم تو ہے مگر معلم نہیں ہے۔ یہ محدثین کرام کی جماعت ہے جنہوں نے احادیث کو جمع تو کر دیا مگر استدلال و استنباط نہیں کیا۔ اسی کی طرف امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کر کے فرمایا: ”یا معشر الفقہاء انتہم الاطباء ونحن الصیادلۃ“ ”اے فقہاء! تمہاری مثال مثالی طبیب و ڈاکٹر کی ہے جو نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اور ہماری مثال دوا کی رکھنے والوں کی ہے“۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو نہ خود اس دولت سے منتفع ہوئے ہیں اور نہ دوسروں کے لئے نافع ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی شریعت کو دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔

اب تشبیہات اس طرح ہو گئیں حضور اکرم ﷺ بمنزلہ سیاح و بادل ہیں۔ وحی آسمانی بمنزلہ بارش ہے۔ عام بارش جب کسی زمین پر ہوتی ہے تو زمین کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔ یا تو بالکل بخر اور پیکار زمین ہوتی ہے اس سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ کسی نے کہا: اے

زمین شورہ سنبل بر نیارو درو ختم عمل ضائع مگرداں

یا وہ زمین پتھر کی ہوتی ہے جو پانی کو تالابوں اور حوضوں کی صورت میں محفوظ کر لیتی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیسری قسم وہ زمین ہے جو پانی کو اندر جذب کر کے حاصلات اور ثمرات کی شکل میں رنگارنگ سبزہ لگاتی ہے اور براہ راست دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔ زمین کی اسی اختلافی تقسیم کے بارے میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در بارغ لالہ روئید در شورہ بوم و خس

اب ان تشبیہات کو اس طرح سے سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات بمنزلہ سیاح فیاض ہے۔ اور وحی آسمانی بمنزلہ بارانِ رحمت ہے۔ وحی کی تعلیمات کے آنے کے بعد لوگ تین قسموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک قسم اعلیٰ اور نافع فقہاء کی ہے۔ دوسری قسم نافع محدثین کی ہے اور تیسری قسم محرومین کی ہے جو اس میدانِ رحمت سے باہر ہیں۔

فقہاء و محدثین اور کفار کے درمیان جو لوگ ہیں ان کا تذکرہ اس حدیث میں نہیں کیونکہ اگر وہ نیک ہوں گے تو قسم اول میں ہیں ورنہ پھر قسم ثانی میں عارضی طور پر شمار ہوں گے۔

محکمات و تشابہات کی بحث

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تَلَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَيْكَ الْكِتَابُ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ وَقَرَأَنِي وَمَا يَنْكَرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا زَأَيْتِ - وَعِنْدَ مُسْلِمٍ - رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ سَخَّاهُمُ اللَّهُ فَاحْذَرُوهُمْ - (متفق عليه)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **هُوَ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَيْكَ الْكِتَابُ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ** (ترجمہ) اللہ تعالیٰ وہ (خدا) ہے جس نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی۔ جس کی بعض آیات محکم ہیں اور آخر آیت و ما ید کو الا اولو الالباب۔ اور میں نصیحت پکڑتے مگر صاحب عقل، سبک پرہیز۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (یہ آیت پڑھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”جس وقت تو دیکھے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ لوگ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو تشابہ ہیں (تو تم سمجھو کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے (کجرو یا گمراہ) رکھا ہے۔ لہذا ان لوگوں سے بچتے رہو۔“ (بخاری و مسلم)

توضیح: منہ آیات محکمات: قرآن کریم میں دو طرح کی آیتیں ہیں اول محکمات ہیں یہ وہ آیتیں ہیں جن کے معنی و مطالب مضبوط، واضح، غیر منسوخ اور ظاہر ہوتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کا ابہام یا اختفاء نہیں ہوتا ہے۔ دوسری آیات تشابہات ہیں۔ تشابہات پھر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی وہ آیات ہیں جو معلوم المعنی ہیں مگر معلوم المراد نہیں۔ جیسے ید اللہ، وجہ اللہ استوی علی العرش، جاء ربك وغیرہ۔

اس قسم تشابہات کے متعلق علماء سلف صالحین کا عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی تاویل نہ کی جائے بلکہ جو الفاظ ہیں ان کو بغیر تاویل کے اسی طرح رکھا جائے ہاں ”ما یلیق بشانہ“ کے الفاظ کو ساتھ کر دیا جائے یعنی ید اللہ ما یلیق بشانہ، استوی ما یلیق بشانہ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے جب استوی علی العرش کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ”الاستواء معلوم والکیفۃ مجهولة والسوال عنہا بدعة“۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”ید اللہ“ میں ید کا ترجمہ قدرت سے کرنا صفات باری تعالیٰ میں تحریف ہے۔ لہذا جو الفاظ ہیں اسی طرح سے ترجمہ کر کے ما یلیق بشانہ کہا جائے۔

دوسری قسم تشابہات کی وہ آیات ہیں جن کے نہ لفظی معنی معلوم ہیں اور نہ مرادی معنی معلوم ہیں جیسے حروف مقطعات ہیں۔

جو سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں اس کے متعلق علماء فرماتے ہیں کہ "اللہ اعلم بمراۃ ہذالک" سلف صالحین کا عقیدہ رکھا جائے اور کسی قسم کی تاویل نہ کی جائے۔

جو لوگ نیک اور صالح ہیں اور جن کے قلوب ایمان سے منور ہوتے ہیں وہ لوگ آیات محکمات پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ اور انہی کو مدار احکام بناتے ہیں اور مشابہات کو انہی محکمات کی روشنی میں دیکھ کر مانتے ہیں۔ مثلاً قرآن اعلان کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بشر ہیں اور اس پر آیات محکمات موجود ہیں۔ مثلاً "قل انما انا بشر مشلکم" محکم آیت ہے اس کے مقابلے میں اگر کہیں لفظ "نور" آیا ہے تو وہ ذومعانی ہے جو متشابہ ہے۔ اس کو اس محکم کی روشنی میں دیکھنا پڑے گا۔ بہر حال صاف دل لوگ مشابہات کو مانتے ہیں مگر اسکے معنی اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

اور جن لوگوں کے دلوں میں "زلیغ" اور کج بردی ہے وہ مشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس میں بے جا تاویلیں کرتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مشابہات میں عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں اور ان کے اصلی معانی پانے کی کوشش کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کج برد اور گمراہ قرار دیا ہے۔

حروف مقطعات کے معنی اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو سمجھائے ہیں۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے جس پر کسی اور کو مطلع نہیں کیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اعجاز کے اعتبار سے سارا قرآن مشابہ یعنی "متشابه فی الفصاحۃ والبلاغۃ والحسن" ہے۔ اور تاویل و تفسیر کے اعتبار سے بعض محکم اور بعض متشابہ ہے۔ مگر مدار حکم محکم پر ہے۔ ل۔

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ هَجَرْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَالَ فَسَمِعَ أَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اخْتَلَفَا فِي آيَةٍ فَرَجَّ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَرِّفُ فِي وَجْهِهِ الْغَضَبُ فَقَالَ إِنَّمَا هَلَكْتَ مِنْ كَأَن قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو ایک (متشابہ) آیت میں اختلاف کر رہے تھے۔ (یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے) آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے چہ مبارک پر غصہ کے آثار نمایاں تھے آپ ﷺ نے فرمایا "تم سے پہلے کے لوگ کتاب (الہی) میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔" (مسلم)

توضیح: ہجرت: ای ذہبت وقت الہجیرۃ: یعنی میں عین دوپہر کے وقت حاضر ہوا۔

فسمع اصوات رجلین: یعنی دو آدمی قرآن کریم کی ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے اس سے وہ اختلاف رائے مراد ہے جس میں ایک دوسرے پر اعتراض ہو۔ جس سے قرآن کریم میں تردد اور شک پیدا ہوتا ہو۔ اور قرآن پر اعتراض

لازم آتا ہو۔ اور بدعت و کفر تک نوبت پہنچتی ہو۔ یہ اختلاف باعث ہلاکت ہے۔ جو ممنوع ہے۔ اور اختلاف منشا منہج نہیں ہے۔ جو مجتہدین آیات کے معانی کو دیکھ کر کیا کرتے تھے۔ وہ تو احسن ہے اور "اختلاف امتی رحمة" کے درجہ میں ہے۔ لہٰذا

بلا ضرورت مسائل میں نہیں الجھنا چاہیے

﴿۱﴾ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ فِي الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحْزَمْهُ عَلَى النَّاسِ فُحْرَمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ.

(مشفق علیہ)۔

ترجمہ: اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "مسلمانوں میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کا سوال کیا جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہو گئی۔"

(بخاری و مسلم)

توضیح: ان اعظم المسلمین جرمًا: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بلا ضرورت کسی شے کا سوال کر کے اس کی حرمت نازل کرانے والا شخص مسلمانوں کے لئے بدترین مجرم ہے۔ کیونکہ نزولِ وحی کے وقت ضروری احکام خود نبی اکرم ﷺ بیان فرماتے تھے۔ سکوت اس بات پر ہوتا تھا جو معاف اور غیر ضروری ہوتی، تو اس طرح کی باتوں میں کھود کرید کر اوز پوچھ پوچھ کر سوال کرنا منع کر دیا گیا تاکہ عام مسلمانوں پر تنگی نہ آجائے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل نے گائے کے متعلق سوال کرتے کرتے تنگی پیدا کر دی تو اس قسم کے تصنع اور سرکشی پر مبنی سوال منع کیا گیا ہے۔ ورنہ اچھے سوال کو تو قرآن نے "فاسئلوا اهل الذکر" سے جائز قرار دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اچھے سوال کو نصف علم فرمایا ہے۔ وہ منع نہیں ہے۔

دجالوں سے ہوشیار رہنا چاہیے

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَالُونَ كَذَّابُونَ يَأْتُونَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيثِ يَتَّبِعُونَكُمْ وَيَأْتِيَهُمْ لَا يُضِلُّونَكُمْ وَلَا يَفْتِنُونَكُمْ.

(رواہ مشفق)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "آخری زمانے میں ایسے فریب دینے والے اور جھوٹے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنہیں تم نے سنا ہوگا اور تمہارے باپوں نے سنا ہوگا لہٰذا ان سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ تاکہ وہ تمہیں نہ گمراہ کریں اور نہ فتنہ میں ڈالیں۔" (مسلم)

توضیح: دجالون: دجال و جل سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت بڑا فراڈی اور فریب دینے والا۔ وجل اس

”تلبیس“ کا نام ہے جس میں حق و باطل کے درمیان فرق کرنا دشوار ہو۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین اسلام میں مشاء صیح کے بغیر محض اپنی رائے سے اختراع کرتے ہیں۔ آخر زمانہ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوگی کیونکہ یہ فتنوں کا دور ہوگا۔

ان دجالوں میں وہ نام نہاد علماء سوء اور مصنوعی مشائخ بھی داخل ہیں جو لوگوں سے کہیں گے کہ ہم علماء اور مشائخ ہیں تم کو دین کی طرف بلا رہے ہیں مگر وہ لوگ حدیثیں گھڑتے رہیں گے۔ اور لوگوں کے سامنے بیان کریں گے غلط عقائد کی ترویج کریں گے اور عجیب عجیب نئی باتیں کریں گے۔ جو غیر دین کی طرف لے جائیں گی۔ ایسے لوگوں سے بچنا کہ وہ اپنے مکر و فریب سے تم کو گمراہ نہ کریں۔ ۱۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے نیز بدعتی اور دین میں دھوکہ دینے والوں کی مجلس سے بھی دور رہنا چاہیے۔ (مظاہر حق نمبر کے ساتھ)

﴿۱۶﴾ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَفْرَؤْنَ التَّوْرَةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُونَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَلِّبُوهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنَ الْآيَةِ. (رواة البخاری)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے (جو یہودیوں کی زبان ہے) اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (ان) کا یہ عمل دیکھ کر (صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ”تم اہل کتاب کو نہ تو سچا جانو اور نہ ان کو جھٹلاؤ صرف یہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ہے ایمان لائے۔ (آخر آیت تک)۔“ (بخاری)

توضیح: لا تصدقوا: کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ ہو محرف ہو جیسا کہ تحریف ان کی عادت ہے۔ ۲۔
ولا تکلبوہم: کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ سچ ہو منزل من اللہ ہو۔ ۳۔

وقولوا امنا باللہ: یعنی سابقہ تمام ادیان جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تھے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اب صرف دین اسلام عمل کے لئے باقی ہے۔ ”ان الدین عند اللہ الاسلام“ ۴۔

علامہ ابن کثیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سابقہ ادیان کی روایت اگر ہمارے دین کے موافق ہیں تو وہ درحقیقت ہمارے دین میں ہیں اس کی طرف محتاج نہیں اور اگر وہ مخالف ہیں تو ہم اپنے معصوم نبی کی اطاعت کریں گے۔

ملاحظہ قاری رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ جن امور میں آدمی پر اشتباہ آجائے اور علمی مسئلے کا حل مشکل ہو جائے تو وہ توقف کرے۔ ۵۔

ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنا صحیح نہیں ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ. (رواه مسلم)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جس بات کو سنے (غیر تحقیق کے) اسے نقل کر دے۔“ (مسلم)

توضیح: کفی بالمرء: یعنی یہ شخص جب ہر سنی سنائی بات کو نقل کرے گا تو یقیناً اس میں بہت ساری غلط باتیں بھی آجائیں گی اور یہ ناقل خواہ کذب کا ارادہ نہ رکھتا ہو مگر پھر بھی بلا تصدیق بات نقل کرنے پر کاذب شمار ہوگا۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ ہر سنی سنائی بات بلا تحقیق بیان نہ کریں اور اس حدیث میں شدید زجر اور وعید ہے اس شخص کے لئے جو ایسی بات نقل کرتا ہے جس کی اس کو تحقیق و تصدیق نہ ہو خصوصاً جب احادیث نبوی ﷺ نقل کر رہا ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ دجال لوگ پیدا ہوں گے

﴿۱۸﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِي أُمَّتِهِ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتُلُونَ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ يَبِيدُوا فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ يَلْسَانُهُ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْقَلٍ. (رواه مسلم)۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”مجھ سے پہلے کسی قوم میں خدا نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور دوست اس قوم سے نہ ہوں جو اس (نبی) کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے، پھر ان (دوست و مددگار) کے بعد ایسے ناخلف (تالاق) لوگ پیدا ہوتے جو لوگوں سے ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا انہیں حکم نہیں ملا تھا (جیسا کہ علماء سوء اور امراء و سرداروں کا طریقہ ہے) لہذا (تم میں سے) جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس کے علاوہ (جو شخص ان کے خلاف اتنا بھی نہ کر سکے اس) میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے۔“ (مسلم)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: "خرونی ما ترکتہ" ہم کتاب مناسک (ج) میں ذکر کریں گے۔ نیز معاویہ رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ کی دونوں حدیثیں "لا یزال من امعی الخ" اور "لا یزال طائفة من امعی" بھی اس امت کے ثواب کے باب میں ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ (یعنی یہ حدیثیں صاحب مصابح نے اسی باب میں ذکر کی تھیں لیکن ہم نے ان کو ان بابوں میں ذکر کیا ہے۔) (فہمہ الحمد)

توضیح: لیأرز: آرزو یا رز ضرر یا ضرب سے ٹھکانہ پکڑنے اور سکر کر اپنے مقام پر جانے کو کہتے ہیں۔ زیادہ تر سانپ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے بل اور سوراخ میں سکر کر جاتا ہے۔ سانپ تیز دوڑ کر اپنے بل میں داخل ہونے اور ٹھکانہ پکڑنے میں مشہور ہے اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اسلام کی یہ حالت یا تو ابتداء ہجرت میں تھی کہ مکہ وغیرہ سے سارے مسلمان مدینہ منورہ میں جا کر اکٹھے ہو گئے تھے اور ایمان نے وہاں ٹھکانہ پکڑ لیا۔ یا اس سے مراد وہ آخری دور ہے جب مسلمان تھوڑے رہ جائیں گے اور سب سمٹ سمٹ کر مدینہ منورہ چلے جائیں گے۔ اور پھر حضرت مہدی علیہ الرضوان کا ظہور بھی ہو جائے گا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خروج دجال کے وقت ہوگا۔ بہر حال حدیث سے مدینہ منورہ کے لئے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مدینہ منورہ مشکل وقت میں بھی دین اسلام کے لئے مرکز بنارہے گا۔

صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ باب ثواب هذه الامة کے تحت میں دو حدیثیں لاؤں گا۔ ایک حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ہے لیکن وہاں پر صاحب مشکوٰۃ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر نہیں فرمایا ہے، بلکہ بھول گئے کیونکہ وخلق الانسان ضعيفا مشکوٰۃ ص ۵۸۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۰ محرم ۱۴۱۰ھ

الفصل الثانی

حضور اکرم ﷺ کی مثال

﴿۲۲﴾ عَنْ رَبِيعَةَ الْجُرَشِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ أَتَى نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ لَهُ لَيْتَنَّمَا عَيْنُكَ وَلَيْتَنَّمَا أُذُنُكَ وَلَيْتَنَّمَا قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنَايَ وَسَمِعَتْ أُذُنَايَ وَعَقَلَ قَلْبِي قَالَ فَقِيلَ لِي سَيِّدُ بَنِي دَارٍ أَفَصَنَعْتَ مَأْدِبَةً وَأَرْسَلْتَ دَاعِيًا فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدِبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدِبَةِ وَسَوَّطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَإِنَّهُ السَّيِّدُ وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيَ وَالِدَارُ الْإِسْلَامُ وَالْمَأْدِبَةُ الْجَنَّةُ. (رواه الدارمي)

ترجمہ: حضرت ربیعہ الجرجسی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خواب میں فرشتے دکھائے گئے اور آپ ﷺ سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) چاہیے کہ آپ کی آنکھیں سوئیں اور آپ کے کان سنیں اور آپ کا دل سمجھے آپ ﷺ نے فرمایا ”میری آنکھیں سوئیں، میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے سمجھا۔“ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا (یعنی مثال کے طور پر فرشتوں نے میرے سامنے بیان کیا) کہ ایک سردار نے گھر بنایا اور کھانا تیار کیا، پھر ایک بلا نے والے کو بھیجا (تاکہ وہ لوگوں کو بلائے) لہذا جس نے بلائے والے کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانے میں سے کھایا اور سردار اس سے خوش ہوا۔ اور جس نے بلائے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ کھانے میں سے کھایا اور نہ ہی سردار اس سے خوش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اس مثال میں سردار سے مراد خدا ہے، بلائے والے سے مراد محمد ہیں، گھر سے مراد اسلام ہے اور کھانے سے مراد جنت ہے۔“ (دارقطنی)

توضیح: لتدم عينك ولتسمع: یہ کلمات لفظوں میں انشاء ہیں اور معنی میں اخبار ہیں یعنی چاہیے کہ آپ کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوں، مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے اور کچھ نہ دیکھیں اور کانوں سے اور کچھ نہ سنیں یعنی غور و خوض سے یہ مثال سننا اور سمجھنا چاہیے، یہ خواب کا معاملہ تھا فرشتوں نے ایک مثال سے سمجھانے کے لئے پورا کلام سنا دیا۔ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام بطور الہام ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں نے حقیقتاً یہ کلام آپ ﷺ کو مخاطب بنا کر کیا ہو۔ بہر حال آپ ﷺ نے قال سے جواب دیا کہ میں سننے کے لئے ہمد تن تیار ہوں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس باب میں اس سے پہلے حدیث نمبر ۵ گزر چکی ہے۔ مذکورہ حدیث کا اس حدیث سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں پر ”دار“ جنت کو ٹھہرایا ہے اور یہاں دار اسلام کو کہا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جنت کے لئے ایک سبب ہے اور جنت مسبب ہے۔ تو کہیں پر سبب کا ذکر ہے اور کہیں پر مسبب کا ذکر آیا ہے۔ یہ تعارض نہیں ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں ”السید“ کا لفظ آیا ہے جس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور داعی کا لفظ نبی کریم ﷺ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور کہیں پر داعی سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ تو اس میں بھی تعارض نہیں کیونکہ اصلاً داعی تو اللہ تعالیٰ ہے جو بے نیاز ہے اور بالواسطہ داعی حضور اکرم ﷺ ہیں۔ لہ

منکرین حدیث کی تردید

(۲۳) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا الْفِرَقَ أَحَدَ كُمْ مُتَكِبًا عَلَى أَرِيكَه يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي يَكَا أَمْرُ يَهُ أَوْ تَهَيَّيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا أُحْدِي. مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ الْتَبَعًا. (رواه أحمد والترمذي وأبو داود وابن ماجه والبيهقي في دلائل النبوة) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال

میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے کوئی حکم اس کے پاس پہنچے اور وہ (اسے سن کر) یہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ ہمیں غذا کی کتاب میں ملا ہم نے اس کی تائید کی۔ (امرو اور او ورتزہ فی ما بین ما جہ بتقی)

توضیح: لا الفہن احد کہہ: یعنی تم ایسی حالت میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ میں تم کو اس حالت میں پالوں۔ متکا علی اریکتہ: تحت شامی کو اریکتہ کہتے ہیں جس کی جمع ارائک ہے۔ اس کو چھپر کھٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس شخص کی نہایت غرور و تکبر کی کیفیت کا بیان ہے نیز اس میں عیش و ترذہ اور ناز و نعم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ لہذا امر: یہاں مطلق دین اسلام مراد ہے امر ہو یا نہی ہو یا کوئی اور حکم ہو۔

اس حدیث میں منکرین حدیث پر تبلیغ رد و تردید ہے۔ جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور جہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ نہایت غرور و تکبر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے بس صرف قرآن ہی کافی ہے۔ اس کا مشاہدہ علماء حق نے اس وقت کیا تھا جب وہ وفد کی شکل میں عبداللہ چکڑالوی منکر حدیث کے پاس گئے تھے وہ چھپر کھٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور غرور کے ساتھ علماء سے کہہ رہا تھا کہ ”حسبنا کتاب اللہ“ کہ بس ہمارے لئے صرف قرآن ہی کافی ہے۔

قرآن کی طرح احادیث بھی واجب العمل ہیں

﴿٤٤﴾ وَعَنِ الْبُقَعَاءِ بْنِ مَعْلُوكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبَعَانٌ عَلَى أُرَيْكِيهِ يَقُولُ عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَجْلَوْهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرَّمُوهُ وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ أَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ الْحِمَامُ الْأَهْلِيَّةُ وَلَا كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ وَلَا لَفْظَةُ مُعَاهِدٍ إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِي عَنْهَا صَاحِبُهَا وَمَنْ نَزَلَ يَقُومُ فَعَلَيْهِمْ أَنْ يَقْرُؤَهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُؤَهُ فَلَهُ أَنْ يُعَقِّبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَآءَةٍ. (رواه أبو داود وروى الترمذي ما جہ إلى قوله كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ ﷺ)

ترجمہ: اور حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار غریب اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ایک شخص کہے گا کہ اس قرآن کو اپنے اوپر لازم جانو (یعنی فقط قرآن ہی سمجھو اور اس پر عمل کرو) اور جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال جانو اور جس چیز کو تم قرآن میں حرام پاؤ اس کو حرام جانو۔ حالانکہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے خدا نے حرام کیا۔ خبردار تمہارے لئے نہ اہلی (گھریلو) گدھا حلال کیا ہے اور نہ کھلی رکھنے والے درندے، اور نہ تمہارے لئے معاہد (یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو) کا

لفظ حلال کیا ہے مگر وہ لفظ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی مہمانی کریں۔ اگر وہ مہمانی نہ کریں تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ مہمانی کے مانند ان سے حاصل کرے۔

(ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ)

توضیح: اولیت القرآن ومثله: یعنی قرآن کی طرح احکام کے اثبات کے لئے مجھے احادیث بھی دی گئی ہیں۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور احادیث وحی غیر متلو ہے۔ واجب العمل دونوں ہیں حلت وحرمت دونوں سے ثابت ہوتی ہے۔

رجل شعبان: اس لفظ سے اس شخص کی بلادت وحمایت و جہالت اور عیش و عشرت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بھرے پیٹ والا بلید اور بے وقوف ہوتا ہے۔ لہذا وہ اس بلادت و جہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرے گا۔

وان ما حرم: ای والحال أن ما حرم رسول الله کہا حرمہ اللہ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے اسی طرح چیزیں حرام ہوئی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ لہذا حضور ﷺ کی ذات حقیقت میں اسی طرح شارع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ شارع ہے۔ کیونکہ "وما یبطع عن الهوی ان هو الا وحی یوحی" واضح آیت ہے۔

الا لا یحیل: یہاں سے ان اشیاء کا بیان شروع کیا گیا ہے جن کی حرمت سنت رسول اللہ میں مذکور ہے اور قرآن کریم میں نہیں ہے۔ یہ کل چار چیزیں ہیں۔

① پالتو گدھا نہ کہ وحشی گدھا کیونکہ وہ صحرائی ہے اور حلال ہے۔ جس کو زہرا کہتے ہیں اب پالتو گدھے کی حرمت کا حکم حدیث میں ہے اور قرآن کریم میں نہیں ہے۔

② ذی ناب: یعنی ڈانڈھوں اور کچلی سے شکار کرنے والے جانوروں کی حرمت کا ذکر قرآن میں نہیں ہے احادیث میں ہے۔

③ معاهد کا لفظ استعمال کرنا، معاہدہ یا ذی ہوتا ہے اور یا حلیف کا فر ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر ذی مسلمان کا لفظ استعمال کرنا بطریق اولیٰ حرام ہے ہاں "معمولی چیز جو کوئی خود ہی پھینک دے یا کرنے کے بعد اس کے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کرے" تو وہ مستثنیٰ ہے۔

④ ومن نزل: یہ چوتھی چیز ہے کہ کوئی مسلمان کسی قوم پر اتر آیا تو اس قوم پر ان کی ضیافت واجب ہے ورنہ ضیف ابینی ضیافت کی مانند ان لوگوں سے اس کا عوض لے لے۔

سوال: یہاں یہ شبہ کہ کسی کے مال میں تعرض کرنا یا چھین کر زبردستی لینا کہاں جائز ہے اس حدیث میں یہ اجازت کیسی ہے؟

جواب: اس سوال کے کئی جواب ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ اہل کتاب کے ساتھ جزیہ کا معاہدہ ہوتا تھا۔ اس

معاہدہ میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر مسلمانوں کا تمہارے گاؤں پر گزر ہو تو تم ان کو کھانا کھلاؤ گے۔ لہذا یہ جزیہ اور ٹیکس کا حصہ تھا نہ دینے پر زبردستی لینا اور چھیننا جائز تھا۔

نکاح سنن جلالین

یہ ہے کہ یہ حالت اضطرار کا حکم ہے۔ کہ جو شخص مختصہ اور اضطرار میں ہو وہ جان بچانے کے لئے یہ لے سکتا ہے۔ پھر عرض واپس کرنے کا یہی مطلب اعقاب کا ہے۔

نکاح سنن جلالین

یہ ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام کا تھا پھر منسوخ ہو گیا پہلا جواب واضح ہے اور آنے والی روایت بھی اسی پر محمول ہے۔ جو حضرت عرباض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یاد رہے کہ حجت حدیث پر کلام ابتداء میں ہو چکا ہے۔

بھرے پیٹ والے غافل لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں

﴿۲۶﴾ وَعَنِ الْعُرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَيُّكُمْ أَحَدُكُمْ مُتَكَبِّرًا عَلَى آيَةِ اللَّهِ يُظَنُّ أَنَّ اللَّهَ لَهُ يُحَرِّمُ شَيْئًا إِلَّا مَا فِي الْقُرْآنِ أَلَا وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ أَمَرَتُ وَوَعَّظْتُ وَتَهَيَّيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ إِنْهَا لَيُفْلُ الْقُرْآنِ أَوْ أَكْثَرُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُ يُحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِأُذُنٍ وَلَا تُضْرِبُوا نِسَاءَهُمْ وَلَا أَكْلُكُمْ مِمَّا رَزَقُوا إِذَا أَعْطَوْكُمْ الَّذِي عَلَيْهِمْ.

(رواہ ابوداؤد)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے پیچھے کھٹ پر بٹکی لگائے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں۔ خبردار خدا کی قسم بلا شک میں نے حکم دیا، میں نے نصیحت کی اور میں نے منع کیا چند چیزوں سے جو مثل قرآن کے ہیں۔ بلکہ زیادہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کئے بغیر چلے جاؤ۔ اور نہ تمہارے لئے ان کی عورتوں کا مارنا حلال ہے۔ اور نہ تمہارے لئے ان کے پھلوں کا کھانا جائز ہے۔ جبکہ وہ اپنا مطالبہ ادا کر دیں جو ان کے ذمہ تھا۔

(ابوداؤد) اور اس کی سند میں اشعث بن شجبہ صحیح ہیں جن کے بارے میں کلام ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں؟

توضیح: او اکثر: یہ "او" بمعنی "ہل" ہے۔ یہ شک کے لئے نہیں بلکہ پہلی وحی سے متصل دوسری وحی آئی تو ہل اکثر فرمایا۔ علماء اصول نے لکھا ہے کہ احکام پر مشتمل قرآنی آیات پانچ سو ہیں اور اسی طرح احادیث بھی پانچ سو ہیں۔

ولا ضرب نساءہم: اس سے مراد مفتوح قوم کی عورتوں کے مارنے کی ممانعت ہے۔ نیز ان کے گھروں کی عمرستی کی ممانعت ہے۔ جیسا کہ عام فاقہین کی عادت ہوتی ہے۔ دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے احکام بہت سارے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں لیکن احادیث سے ثابت ہیں۔ جس کی تفصیل حجت حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

عبدالاحد شیعہ: سوال یہ ہے کہ اسلام میں غلام بادشاہ نہیں بن سکتا ہے۔ بلکہ حدیث میں تو آیا ہے کہ "الائمة من قریش" تو پھر حبشی غلام کی بادشاہت کو کیسے واجب الاطاعت قرار دیا گیا؟

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ علی سبیل المبالغہ ہے کہ گویا معمولی آدمی بھی جو جس کا سر کشمش کے دانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو مگر تم اطاعت کرو تا کہ انتظام باقی رہے اور انتشار نہ آنے پائے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بادشاہ بننا علی سبیل المغالبہ ہے کہ یہ حبشی غلام تم پر زبردستی مسلط ہوا ہو۔ تو پھر اطاعت کرو یہ وقتی ضرورت ہے صبر کرو۔ بشرطیکہ یہ غلام اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے سنائے نہ کہ اپنے حکم پر چلائے۔ "ای مالہ یأمر بمعصیۃ"۔ وسنة الخلفاء الراشدين: خلفائے راشدین سے مراد خلفاء اربعہ ہیں۔ مشہور یہی چار ہیں۔ اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی خلافت کی ہے۔ وہ بھی خلفاء تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو بھی علماء نے خلفائے راشدین میں شمار کیا ہے۔ یہاں چار خلفاء کی امتیازی شان بیان کی گئی ہے۔ اس سے ان کی تخصیص مراد ہے۔ دیگر خلفاء کی خلافت کی نفی مراد نہیں ہے۔ قیامت تک خلفاء آئیں گے مگر یہاں خلافت علی منہاج النبوة کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عضوا علیہا: ڈاڑھوں سے پکڑنا اہتمام کے ساتھ عمل کرنے سے کنایہ ہے یعنی ڈاڑھوں سے ان کے فرامین کو مضبوط پکڑو تا کہ چھوٹ نہ جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ حق پر ہیں اور اس کے علاوہ بدعات سے بچو۔ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو بھی لازم پکڑنے کا حکم فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی معیار حق ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ خلفائے راشدین کا مقام تشریع اور اجتہاد کے درمیان ہے۔ تشریع نبی کا مقام ہوتا ہے۔ اور اجتہاد ائمہ مجتہدین کا کام ہے۔ خلفائے راشدین کا مقام نہ تو تشریع والا ہے بلکہ اس سے نیچے ہے۔ اور نہ مجتہدین والا ہے بلکہ اس سے اوپر ہے بلکہ دونوں کے درمیان ہے۔

سنت کے روشن شاہراہ پر چلو

﴿۷۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هَذَا سَبِيلُ اللَّهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَقَالَ هَذِهِ سُبُلٌ عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ وَقَرَأَ وَأَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَأُثْبِتُوا فِيهِ الْآيَةَ. (رواه أحمد والنسائي وابن ماجه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں سمجھانے کے لئے) ایک (سیدھا) خط کھینچا اور فرمایا، یہ اللہ کا راستہ ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے دائیں اور بائیں کئی (یعنی سات چھوٹے اور بڑے)

خطوط کھینچے اور فرمایا۔ یہ بھی راستے ہیں جن میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان (بیٹھا ہوا) ہے۔ جو اپنے راستے کی طرف بلاتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وان هذا صراط مستقیم فالتبعوا ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله۔ ترجمہ: اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہذا اس کی پیروی کرو (دوسرے) راستے کی پیروی نہ کرو تاکہ کئی راستے تمہیں منتشر نہ کر دیں۔ (احمد نسائی، دارمی)

توضیح: تقریباً ہم کے لئے اور سمجھانے کے لئے خطوط کھینچے ہیں تاکہ آدمی افراط و تفریط سے بچ جائے۔ کیونکہ اسلام کا خط وسط میں مستقیم اور معتدل ہے۔ اور یہی شریعت کی شاہراہ اعظم ہے۔ اس کے علاوہ نیز ہر خطوط بدعات اور گمراہی کے ہیں۔ جو شیطان کے راستے ہیں۔

دین اطاعت کا نام ہے

﴿۲۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ۔

(رواہ فی شرح السنن قال النووي فی أنعم فیہ و هذا حدیث صحیح عن زونہ فی کتاب الخصال و یستلزم توضیح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز (یعنی دین و شریعت) کی تابع نہ ہو جائیں جس کو میں (خدا کی جانب سے) لایا ہوں۔ اس حدیث کو ”شرح السنن“ میں روایت کیا گیا ہے۔ اور امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی چہل حدیث میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ جس کو ہم نے کتاب انجیل میں صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

توضیح: لا یؤمن احدکم: علامہ تورہ شتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نفی کمال کی ہے کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کو ہر چیز میں مقدم رکھتا ہے۔ تو جب تک اس نے اپنی طبیعت و جبلت اور خواہش کو شریعت کا تابع نہ کیا اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا۔

لیکن شیخ مظہر وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہاں اصل ایمان کی نفی ہے۔ یعنی مدارِ ایمان اتباعِ شریعت پر ہے۔ تو جو شخص اطاعت کرتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ یہ اس کا دین ہے اگرچہ طبیعت نہیں چاہتی ہے اس پر اس کو ثواب بھی ملتا ہے۔

لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا ہے کہ وہ خواہش کے مطابق ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس پر عمل کرے اور وہ شخص عمل کرتا ہے مگر اتباع کا ارادہ نہیں تھا بلکہ خواہش پوری کرنے کا ارادہ تھا تو اس شخص کا یہ عمل دین نہیں رہا لہذا وہ مومن نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اتباعِ شریعت اصل مقصود ہے۔

سنت زندہ کرنے کا ثواب

﴿۲۹﴾ وَعَنْ بَلَالِ بْنِ حَارِثٍ الْمُرَزِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِي قَدْ أُمِيتَتْ بَعْدِي فَإِنَّ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِي أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ ابْتَدَعَ بِدْعَةً ضَلَالَةً لَا يَرْضَاهَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ ظُلْمُكَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا.

(رواہ الترمذی ورواہ ابن ماجہ عن کثیر بن عبد اللہ بن عمر وعن ابنہ عن جابر)۔

ترجمہ: حضرت بلال بن حارث المرزئی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا (یعنی رائج کیا) جو میرے بعد چھوڑ دی گئی تھی تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس سنت پر عمل کرنے والے کو ملے گا، بغیر اس کے کہ ان (سنت پر عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جس شخص نے گمراہی کی کوئی ایسی نئی بات (بدعت) نکالی جس سے اللہ اور اس کا رسول خوش نہیں ہوتا تو اس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا کہ اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو گناہ ہوگا، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کمی کی جائے۔“ (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو کثیر بن عبد اللہ بن عمرو سے اور کثیر نے اپنے والد عبد اللہ سے اور عبد اللہ نے کثیر کے دادا عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے۔

توضیح: سنت سے مراد مطلق حکم اسلام ہے۔ خواہ فرائض سے ہو یا واجبات کے قبیل سے ہو یا سنن کی قسم سے ہو۔ اس کے احیاء اور زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود بھی اس پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی خوب تبلیغ کرے۔ ایسے شخص کو ایک اپنے عمل اور ایک دوسرے کے لئے سبب بننے کا ثواب ملے گا۔ بدعت: بدعت کے ساتھ جو قیودات لگی ہوئی ہیں یہ احترازی نہیں۔ بلکہ مزید تحقیق کے لئے صفات کا شفعہ ہیں۔

دین اسلام حجاز میں ٹھکانا پکڑے گا

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الدِّينَ لَيَأْتِي رُذَالَى الْحِجَازِ كَمَا تَأْتِي الْحَيَّةُ إِلَى مُخْرِهَا وَلَيَعْقِلَنَّ الدِّينُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْأَوْيَةِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ إِنَّ الدِّينَ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَيُطَوَّنِي لِلْغُرَبَاءِ وَهُمْ الَّذِينَ يُضِلُّونَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِي مِنْ سُنَّتِي. (رواہ الترمذی)

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ دین (اسلام) حجاز (مکہ) میں پیدا ہوا اس کے متعلق (کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح کہ سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز میں اس طرح جگہ پکڑے گا جیسے کہ بکری پہاڑ کی چوٹی پر جگہ پکڑ لیتی ہے اور دین ابتداء میں غریب پیدا ہوا تھا اور آخر میں ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ابتداء میں تھا۔ چنانچہ خوشخبری ہو غریبوں کے لئے وہی اس چیز (یعنی میری سنت) کو درست کریں گے جس کو میرے بعد لوگوں نے خراب کر دیا ہوگا۔“ (ترمذی)

توضیح: جھوٹا: جھوٹا سوراخ کو کہتے ہیں اور ضمیر ”حیۃ“ کی طرف لوثی ہے۔ سانپ اپنے بل کی طرف لوٹنے اور تیز چلنے اور محفوظ ہو کر بیٹھنے میں مشہور ہے۔ اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ولیعقل: جگہ پکڑنے کے معنی میں ہے۔ اصل میں عقل سے ہے اور عقل رسی کو کہتے ہیں اونٹ کو جس رسی سے باندھا جاتا ہے اس کو بھی عقل کہتے ہیں۔

الحجاز: مکہ مدینہ اور اس کے قرب و جوار کے شہروں کو حجاز کہتے ہیں یہاں مراد مکہ اور مدینہ ہے۔

معقل: عقل سے یا تو مصدر یہی ہے یا ظرف مکان کا صیغہ ہے۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر محفوظ مقام مراد ہے۔ اور کلام میں تشبیہ ہے۔

الارویۃ: پہاڑی بکری کو ارویہ کہتے ہیں۔ منہج نے ارویہ کی جو تصویر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشکل ناف ہے۔ اور بل کی جو تصویر دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی بکرا ہے۔ جس کے سیدھے اور بلند سینک ہوتے ہیں۔ اور نہایت ہی مشکل پہاڑی مقامات پر رہتا ہے انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں میں پتھروں اور چٹانوں کے ساتھ چپکنے کا مادہ اور معائنہ لگا ہوا ہے۔ یہ بکری کے وقت چرنے کے لئے چراگاہ میں ریوڑ بن کر آتے ہیں اور اندھیرے ہی میں سیدھے ایک لائن میں واپس چلے جاتے ہیں۔ شکاری لوگ ان کی بہت سی خصوصیات بیان کرتے ہیں اور پشتو میں اس کو ”غرض“ کہتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے یہاں ارویہ مؤنث کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ جگہ پکڑنے میں مذکر اور نر سے زیادہ محتاط ہوتی ہے۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ یوشن گوئی فرمائی کہ قرب قیامت کے وقت فقے زیادہ ہو جائیں گے اس ظہورِ فتن کے زمانے میں دینِ سنٹ کر پھر حجاز مقدس کی طرف لوٹ آئے گا اور حجاز میں اس کو پناہ لینے اور حفاظت کے لئے محفوظ مقام ملے گا۔ حضرت مہدی علیہ الرضوان کے زمانے میں ان واقعات کا ظہور ہوگا کہ معاشرہ سے ان کو ہر لحاظ سے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ نہ کسی خوشی میں ان کو کوئی پوچھنے والا ہوگا اور نہ کسی غم میں۔

فطونی للمغرباء: یعنی ان کو سہارا دیا ہو اور ان کو جنت طوبی کی بشارت ہے۔

وہمہ اللہین: یہ ان کی نشانی ہے کہ سنت پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور لوگوں نے دین میں جو بگاڑ پیدا کیا ہوگا اس کی اصلاح

انی امہ علاقیتہ: اس سے سوتیلی ماں مراد ہے۔ کیونکہ حقیقی ماں کے ساتھ بدکاری سے طبع مانع ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شاید اس سے سوتیلی ماں مراد ہو۔ ان حضرات کا کہنا اپنی جگہ صحیح ہے لیکن آج کل واقعات بتا رہے ہیں کہ اس سے حقیقی اور سوتیلی دونوں ماںیں مراد ہو سکتی ہیں کیونکہ یورپ نے فحاشی سے انسان کو حیوان بنا دیا ہے۔ جہاں ماں، بیٹی اور بیوی کا فرق نہیں رہا۔

وتلفرق امتی: اس سے مراد امت اجابت ہے کیونکہ امت دعوت یعنی غیر مسلموں میں تو بے شمار فرقے ہیں۔ یعنی امت اجابت کے بہتر فرقے نہیں گئے۔ یہ افتراق اور فرقہ بندی فردعات کے اعتبار سے نہیں بلکہ بنیادی عقائد کے اعتبار سے مراد ہے اسی لئے ان فرقوں پر دوزخ کا حکم لگایا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ بد اعتقادی اور غلط نظریات کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔ اور صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا جو اپنے اچھے عقائد کی وجہ سے دوزخ سے بچ جائے گا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین ہو کہ فرقہ ناجیہ کے علاوہ یہ بہتر فرقے اپنے اصول اور عقائد کے اعتبار سے چھ ہیں۔ پھر انہی میں سے فردعات کے اعتبار سے ۷ فرقے نکل آئے ہیں۔ وہ چھ یہ ہیں:

① معتزلہ ② مرجئہ ③ مجسمہ ④ جہویہ ⑤ شیعہ ⑥ خوارج

معتزلہ کے اندر بارہ فرقے ہیں۔ شیعہ میں ۳۲ فرقے ہیں، خوارج میں پندرہ ہیں اور جہویہ یعنی جہمیہ میں تین ہیں، مرجئہ میں ۵ ہیں، اور مجسمہ میں بھی پانچ ہیں تو یہ کل ۷۲ فرقے ہو گئے۔ اور ایک اہل سنت والجماعت ہے تو کل ۷۳ فرقوں میں امت بٹی ہوئی ہے۔

سبحان: یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ناجیہ جماعت صرف اہل سنت ہے اور باقی غیر ناجیہ دوزخی ہیں۔

جواز شیعہ: یہ امتیاز عقلی دلائل سے ہوگا عقلی دلائل اور علامات سے بھی ہو جائے گا۔ وہ اس طرح کہ اس جماعت ناجیہ کی یہ شان ہوگی کہ حفاظ قرآن انہی میں ہوں گے۔ محدثین کی کثرت ان میں ہوگی۔ فقہاء بھی ان میں ہوں گے۔ باعمل علماء زیادہ اور اہل تصوف اور خدا ترس متقی اور پرہیزگار ان میں ہوں گے اور صحابہ کرام ایسے ہی تھے۔

دیگر فرقوں میں یہ چیزیں موجود نہیں ہوں گی تو وہ صحابہ کے نقش قدم پر نہیں ہوں گے۔ اور آنحضرت ﷺ نے "معاذاً علیہ واصحابی" فرمایا ہے۔

بدعت کی مثال:

وہی الجماعة: اس سے جماعت حقہ جماعت ناجیہ کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اس کا پورا نام "اہل السنۃ والجماعۃ" پڑ گیا۔ یہ پورا نام اصل میں ان کا نہیں تھا بلکہ اچھے عقائد، نیک اعمال و افعال، اچھے کردار اور صحیح راستے پر چلنے کی وجہ سے ان کا نام بعد میں اہل السنۃ والجماعۃ پڑ گیا۔ اہل سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت نبوی ﷺ پر چلنے والے لوگ اور الجماعۃ کا مطلب یہ ہے کہ جماعت صحابہ کے پیروکار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ اہل سنت و

الجماعت ہیں۔ جو لوگ سنت پر چلنے والے نہ ہوں یا جماعت صحابہ سے عقیدت نہ رکھتے ہوں وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں خواہ وہ اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتے ہوں۔ لے

قتل جاری بہہ: یعنی خواہشات و بدعات ان میں ایسی جاری ہوں گی جیسے ہڑک کی بیماری جس کو "دام الکلب" کہتے ہیں۔ "الکلب" کاف اور لام کے فتح کے ساتھ اس خوفناک بیماری کا نام ہے جو باؤ لے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے پورے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ لے

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے اہل باطل کے جسم و جاں میں اور ان کے رگ و ریشہ میں خواہشات اور بدعات ایسے گھس کر داخل ہو جائیں گی جس طرح سے ہڑک کی بیماری باؤ لے کتے کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ تو وہ کتا مجنون ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ پانی سے بھاگتا ہے نہ پانی دیکھ سکتا ہے نہ پی سکتا ہے اور جس کو کاٹتا ہے وہ بھی اسی طرح مجنون ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بدعتی ہے کہ خود بدعت کی بیماری اس کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جاتی ہے تو وہ حق کے قریب نہیں جاسکتا بلکہ حق سے دور بھاگتا ہے۔ اور جب کسی دوسرے سے ملتا ہے تو بدعت کی یہ بیماری اس کے اندر بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اور اسے بھی بدعتی بنا دیتی ہے۔ اسی لئے بدعتی واجب الاجتناب ہے۔ لے

ما انا علیہ واصحابی: یہ فرقہ ناجیہ کی وضاحت ہے ما انا علیہ سے اشخاص مع القانون مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے آسمانی مذاہب بھیجے ہیں ان کے ساتھ بطور نمونہ انبیائے کرام بھی بھیجے ہیں۔ آسمانی قانون کے بغیر اشخاص کی پیروی شرک ہے۔ اور اشخاص کے بغیر قانون بھی معتبر نہیں ہے۔ لے

اجماع امت حجت ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّةً أَوْ قَالَ أُمَّةً مُحَمَّدٌ عَلَى ضَلَالَةٍ وَيُذِلُّ اللَّهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَدَّ شُدَّ فِي النَّارِ (رواۃ الترمذی)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کو یا (بجائے میری امت کے) یہ فرمایا کہ امت محمدیہ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ اور جو شخص جماعت سے الگ ہے وہ (جنتیوں کی جماعت سے) الگ کر کے جہاد و زخ میں ڈالا جائے گا۔ (ترمذی)

توضیح: لا یجمع امتی: یعنی اس امت کے افراد کی رائے تو غلط ہو سکتی ہے مگر جس بات پر تمام علماء و فقہاء اور مجتہدین اکٹھے ہو جائیں وہ بات غلط نہیں ہو سکتی۔ امت سے مراد "امت اجابت" ہے۔ کیونکہ امت کفریہ تو "الکفر ملۃ واحداً" کے اصول کے تحت سب کفر پر جمع ہو سکتی ہے۔ "امتی" میں اضافت تشریفیہ ہے۔ جس سے اس امت کی شرافت

معلوم ہوتی ہے۔ نیز اس میں اشارہ ہے کہ اجماع امت کا یہ شرف صرف نبی کریم ﷺ کی امت کو ہی حاصل ہے۔ سابقہ امتوں کو یہ امتیاز حاصل نہیں تھا۔ پھر اس اجماع سے علماء و فقہاء کا اجماع مراد ہے۔ عوام کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ شارحین حدیث نے لکھا کہ اس حدیث سے اجماع امت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجماع ادلہ اربعہ میں سے ایک دلیل ہے۔ اجماع امت کی حجیت قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ يَشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُسْلِمِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ

یہاں سبیل المسلمین کا سب سے بڑا مصداق اجماع ہی ہے۔

اجماع کی حجیت میں یہ حکمت ضرور ہے کہ دین اسلام میں اختلاف اور رخنہ اندازی کی صورت میں دین کی حفاظت کے لئے ایک قوت حافظہ اور قوت معصومہ کا وجود ضروری ہے۔ جس کی بات حرف آخر ہو اور اس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اصل میں یہ قوت معصومہ تو نبوت ہوتی ہے۔ سابقہ امتوں میں تو موقع بموقع نبی آتے تھے اور اس ضرورت کو پورا فرماتے تھے۔ لیکن اس امت میں ختم نبوت کی وجہ سے نیا نبی نہیں آ سکتا ہے تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرآن و حدیث کی روشنی میں اجماع امت کا وجود ہے۔ اس امت کے اس طویل دورانیہ میں تغیر احوال کی وجہ سے جو نئے مسائل انھیں گئے تو شریعت کی روشنی میں اس کا حل صرف علماء امت کا اجماع ہے تاکہ شریعت کی حفاظت کے لئے اجماع کی یہ قوت حافظہ ہر وقت نئے مسائل کا حل پیش کرے۔

اسی ضرورت کے پیش نظر اس امت کو نبی اکرم ﷺ نے اجماع کی یہ اتھارٹی عنایت فرمادی اور پھر ان کی محفوظ و مامون حیثیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں فرمائے گا۔ اجماع کی یہ امتیازی شان صرف اس امت کو ختم نبوت کی برکت سے ملی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۚ

وَمَنْ شَذَّ: یعنی جماعت حقہ سے الگ ہوا عقائد و خیالات کے اعتبار سے کتاب وسنت سے دور جانکا۔

شَذَّ فِي النَّارِ: یعنی جہنم میں جہاں ڈال دیا جائے گا۔

سواد اعظم کا کیا مطلب ہے

﴿۳۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اتَّبِعُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ فَإِنَّهُ مِنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ

(رواۃ ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بڑی جماعت کی پیروی کرو اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہو وہ تنہا آگ میں ڈالا جائے گا۔“ ابن ماجہ نے یہ حدیث کتاب السنۃ سے انس اور ابن عاصم سے روایت کی ہے۔

توضیح: السواد الاعظم: اس کا مطلب یہ ہے کہ اصول و قواعد میں انہیں اعتقادات و نظریات کی پیروی کرنی چاہئے جو اکثر علماء کے نزدیک حق ہوں اسی طرح ان اقوال و افعال کو قبول کرنا چاہئے جو جمہور علماء امت سے ثابت ہوں۔ فروعات میں اختلاف تو جائز ہے لیکن اصول میں نہیں۔

بیہ خان: اہل حق ہر زمانے میں اہل باطل کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں پھر ان کو ”سواد اعظم“ یعنی بڑی جماعت کیسے کہہ دیا؟
جواب: سواد اعظم سے صرف ایک زمانے کے لوگ مراد نہیں بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جتنے لوگ حق پر قائم چلے آئے ہیں وہ اہل حق سواد اعظم ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بڑی جماعت ہے اور ہر زمانے کے اہل باطل سے زیادہ ہے۔ اس کے برعکس کفر ایک جماعت نہیں ہے بلکہ ہر زمانے کی ہر ہر جماعت الگ الگ کفر میں مبتلا رہی ہے۔ جس میں تسلسل نہیں تو وہ سواد اعظم نہیں اس توجیہ سے اہل بدعت کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ہم زیادہ ہیں تو ہم سواد اعظم ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل بدعت سواد اعظم نہیں کیونکہ ان کی جماعت کا تسلسل نہیں کیونکہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے مطابق بدعت کی الگ الگ صورتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ مگر اہل حق تو حق سے وابستہ ہیں ان کا ایسا تسلسل ہے جو سب سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پہاڑ کی چوٹی پر اگر ایک آدمی بھی اہل حق سے وابستہ ہو تو وہ اکیلا شخص بھی سواد اعظم ہے۔

دل کو کھوٹ سے پاک رکھنا بہت اہم ہے

﴿۳۴﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا بُنَيَّ إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ وَلَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لَأَحَدٍ فَا فَعَلْ ثُمَّ قَالَ يَا بُنَيَّ وَذَلِكَ مِنْ سُنَّتِي وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ القزوينی)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا: ”اے میرے بیٹے اگر تم اس پر قدرت رکھتے ہو کہ صبح سے شام تک اس حالت میں بسر کرو کہ تمہارے دل میں کسی سے کینہ نہ ہو تو ایسا ہی کرو“ پھر فرمایا اے میرے بیٹے! یہی میری سنت ہے لہذا جس شخص نے میری سنت کو محبوب رکھا اس نے مجھ کو محبوب رکھا اور جس نے مجھ کو محبوب رکھا وہ میرے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوگا۔“

(ترمذی)

توضیح: غش: ضد الصلاح ہے اس میں قلبی کھوٹ کینہ و بغض حسد وغیرہ بری صفات سب داخل ہیں۔

کلن معی فی الجنة: یعنی سنت کو محبوب رکھنا اور اس کو پسند کرنا حضور ﷺ کو محبوب رکھنا ہے۔ اور حضور ﷺ سے محبت جنت میں حضور اکرم ﷺ کی معیت کو لازم کرتی ہے۔ سنت سے محبت کا یہ مقام ہے تو سنت پر عمل کرنے کا کیا مقام ہوگا؟

ایک سنت کو زندہ کرنے سے سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے

﴿۳۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فُسَادِ أُمَّيْ فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میری امت کے بگڑنے کے وقت جس شخص نے میری سنت کو دلیل بنایا اس کو سو ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا۔“۔ تنقیح نے یہ روایت کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

توضیح: عند فساد امتی: کہ اغلباً و اکثر ا لوگوں میں جہالت پھیلی ہوئی ہو اور ہر طرف بدعات و شرکیات کا اند میرا چھایا ہوا ہو، اور یہ بندہ خدا سنت کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر عمل کرتا ہو اور ہر طرف سے یہ شخص لوگوں کا نشان بن رہا ہو تو شہید تو ایک تیر یا گولی لگنے سے شہید ہو جاتا ہے مگر اس بیچارے پر تو تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور یہ مضبوط ڈٹا ہوا ہے تو عادات و اعتراض ہوتے ہیں۔ تو سوتیراں پر چلے تو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یاد رہے یہ آخرت اور ثواب کا شہید ہے اس پر شہید کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوں گے لہذا ان کو غسل دیا جائے گا اور کفن پہنایا جائے گا۔ نیز اس سنت سے مراد ایسی سنت ہے جن کے زندہ کرنے میں دنیا کے لوگوں کے جھگڑے مول لینے پڑتے ہیں۔ باقاعدہ اہل باطل سے مقابلہ ہوتا ہے لوگ اس سنت کو زندہ نہیں کرنے دیتے مگر یہ شخص ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور سنت کو زندہ کرتا ہے اور معاشرہ کی پرواہ نہیں کرتا ہے جیسے ڈاڑھی رکھنے اور اسیائے جہاد کی سنت کی یہی حیثیت ہے۔

قرآن و حدیث کی موجودگی میں تورات و انجیل کو دیکھنا منع ہے

﴿۳۶﴾ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِئْنَا أَتَانَا عُمَرُ فَقَالَ إِنْكَا نَسْمَعُ أَحَادِيثَ مِنْ يَهُودَ تُصَيِّبُنَا أَفْتَرَى أَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا فَقَالَ أَمْتَهُوَ كُونَ أَنْكُم كَمَا تَهُوَ كَبِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَفِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا مَا وَسِعَتْهُ إِلَّا التَّبَاعِي۔

(رواه أحمد والنسائي في شعب الإيماني)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بار بار رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم یہودی حدیثیں سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں کیا آپ ﷺ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو

لکھ لیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کیا تم بھی اس طرح حیران ہو جس طرح یہود و نصاریٰ حیران ہیں؟ (جان لو) کہ میں بلاشبہ تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت لایا ہوں۔ اگر سوئی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی پر مجبور ہوتے۔“ (احمد بن حنبل)

توضیح: انا نسبح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش صرف اس لئے تھی کہ وہ کلمہ خیر و حکمت کے متلاشی تھے۔

امتبہو کون: یہ صیغہ باب تفعیل سے ہے اور ابتدا میں الف استقامت لگا ہوا ہے۔ یہ تخریج راہی کے معنی میں ہے۔ یعنی ان کی کتابیں محرف ہونے کی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہیں اب وہ احکامات اپنے راہیوں کی رائے سے لیتے ہیں۔ کیا تم ان کی طرح اپنے دین اور اپنی کتاب کے بارے میں حیران و پریشان ہو کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی کتاب کو پڑھنا شروع کرنا چاہتے ہو تو تم تو قرآن کریم کو اپنے پاس رکھتے ہو کیا تم اس میں پریشان و حیران ہو گئے کہ آیا یہ وہی آسانی کتاب ہے یا نہیں؟ اس تہدید سے معلوم ہوا کہ اب خیر و ہدایت قیامت تک قرآن کریم میں منحصر ہے۔

بیضاء لقیۃ: یعنی روشن، بے عیب و واضح اور افراط و تفریط اور شک و شبہ اور ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔

۳۲ محرم ۱۰۱۰ھ

کامیابی کی تین باتیں

﴿۳۷﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَكَلَ طَيِّبًا وَعَمِلَ فِي سُنَّتِهِ وَأَمِنَ النَّاسَ بِوَائِقِهِ دَخَلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ هَذَا الْيَوْمَ لَكُوْزِي فِي النَّاسِ قَالَ وَسَيَكُونُ فِي قُرُونٍ بَعْدِي. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص نے حلال رزق کھایا سنت کے طریقہ پر عمل کیا اور لوگ اس کی زیادتیوں سے امن میں رہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا“، ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ایسے لوگ تو آج کل بہت ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اور میرے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے۔“ (ترمذی)

توضیح: من اکل طیباً: اس حدیث میں حلال رزق کو مقدم کیا اور عملِ بابت کو مؤخر کیا۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سنت پر عمل وہی شخص کر سکتا ہے جو حلال رزق کھاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”يَا أَيُّهَا الرِّسَالُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا“ یہاں ”طبیہات“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حرام کا لفظ نہیں بولا گیا کیونکہ طیبہا خوشبو کو متضمن ہے۔ اور حلال رزق سے بھی تقویٰ کی معنوی خوشبو اٹھتی ہے۔ ”طیبہا“ سے یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ شخص مشتبہ اشیاء سے بھی بچتا ہے۔ اس حدیث میں یہ دو عجیب جملے ہیں جس میں ”اکل طیبہا“ سے تمام حقوق اللہ کی طرف اشارہ ہے اور ”وامن الناس بوائقہ“ سے تمام حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعے کا نام اسلام اور شریعت ہے اور شریعت پر عمل سے جنت ملتی ہے۔

ہوائیہ: ہائیکہ کی جمع ہے جو بڑی مصیبت اور ایذا رسانی کو کہتے ہیں۔ ۱۔

دخل الجنة: یعنی دخول جنت کا حکم ہو گیا یہاں ماضی کا صیغہ لا کر دخول کو یقینی بنایا گیا ہے۔ ۲۔

فقال رجل: یعنی آج کل تو عہد نبوی ﷺ کی برکت سے ایسے لوگ بہت ہیں آیا آئندہ بھی ایسے لوگ ہوں گے یا کم ہو کر ختم ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آئندہ بھی ایک مدت تک ایسے لوگ ہوں گے یعنی صرف تمہارے زمانے تک خاص نہیں بلکہ خیر القرون کے زمانے تک بھی ہوں گے۔

شیخ عبدالحق عظیمی نے اشعۃ المبعات میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ خیر و بھلائی قیامت تک باقی رہے گی۔ ۳۔

دور اول میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت تھی

﴿۳۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ مَن تَرَكَ مِنْكُمْ عَشْرَ مَا أَمَرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ مِّنْ عَمَلٍ مِنْهُمْ بِعَشْرِ مَا أَمَرَ بِهِ نَجَا. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ان احکام کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے جو دیئے گئے ہیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن ایک زمانہ آیا بھی آئے گا کہ اگر کوئی شخص ان احکام کے دسویں حصے پر بھی عمل کرے گا تو نجات پائے گا۔“ (ترمذی)

توضیح: عشر ما امر بہ: اس حدیث مبارک کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے یہ سوال سمجھنا ضروری ہے کہ اگر یہاں مامورہ سے فرائض اسلام مراد لیا جائے تو حدیث کا پہلا جز تو صحیح ہو گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر فرائض کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دیا تو ہلاکت کا خطرہ ہے مگر حدیث کا دوسرا جز صحیح نہیں ہو سکے گا کیونکہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے بھی فرائض اسلام کا ایک جز بھی چھوڑنا جائز نہیں چہ جائیکہ ۹ حصے چھوڑ کر دسویں پر عمل کریں اور کامیاب ہو جائیں۔ اور اگر مامورہ سے مستحبات اور سنن مراد لیا جائے تو حدیث کا دوسرا حصہ تو صحیح رہے گا کہ سنتوں کے دسویں پر عمل کرنے والا بھی کامیاب ہے مگر حدیث کا پہلا حصہ صحیح نہیں رہے گا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سنتوں کے معاملہ میں عام امت کی طرح تھے۔ کیونکہ سنتیں چھوڑنے سے آدمی و عید و تہمد ید کے اس درجہ میں نہیں آتا ہے خواہ وہ دور اول کے لوگ ہوں یا دور ثانی کے ہوں۔

اس سوال کا جواب شارحین نے یہ دیا ہے کہ یہاں مامورات سے عام مامورات اور فرائض مراد نہیں بلکہ یہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر مراد ہے۔ جس کو دوسرے الفاظ میں امور تبلیغ سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ تو فرمایا کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کے حوالے سے تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر ایک جز بھی چھوڑ دیا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس وقت حق کے حامی زیادہ ہیں اور عہد نبوی کا مبارک دور ہے اگر تم دین کی تبلیغ و اشاعت میں سستی کرو گے تو اسلام جزیرہ عرب میں محدود ہو کر رہ جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ انصار اسلام بھی زیادہ تھے اور مخلص بھی تھے اور ضرورت تبلیغ بھی زیادہ تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان بھی

عالی تھی تو ان سے دس بٹے دس کا مطالبہ کیا گیا بعد میں اسلام کے حامی برائے نام رہ گئے، اخلاص و قربانی بھی کم ہو کر رہ گئی، اعمال بھی کمزور ہو گئے اور دین اسلام بھی پھیل گیا اور انصار اسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے نہ رہے تو فرمایا کہ وہ لوگ اگر دین کے اس شعبہ میں امر بالمعروف کے دسویں حصے پر بھی عمل کریں تو کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر ہدایت ہاتھ سے چلی گئی تو جھگڑے رہ جائیں گے

﴿۳۹﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ إِلَّا أُوْتُوا الْجِدْلَ ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَذِهِ الْآيَةَ مَا ضَرَبُوا لَكَ إِلَّا جَدْلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ.

(رواؤا أخذوا القوم مني والي ما جاءه)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہدایت پانے اور ہدایت پر قائم رہنے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر (اس وقت جب) اس میں جھگڑا پیدا ہوا“ پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ (ما ضربه لك الا جدلا بل هم قوم خصمون) ترجمہ: وہ تمہارے لئے نہیں بیان کرتے مثال مگر جھگڑنے کے لئے بلکہ وہ جھگڑا تو مہی ہے۔

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: الجدل: یعنی لوگ جب سنت چھوڑنے کی وجہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ تو بطور سزا اور عذاب ان کو جدل، جھگڑا اور تنازعہ بدلے میں دے دیا جاتا ہے پھر وہ عناد اور تعصب سے اپنے موقف کی بے جا حمایت کرتے ہیں۔ مکابرہ و محاربہ پر اتر آتے ہیں جو حرام ہے۔ علامہ طبری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جدل سے مراد عناد اور جھگڑے ہیں اور اسی طرح اپنے مذہب اور مسلک کی ترویج کے لئے تعصب کرنا جدل ہے۔ اپنے مشائخ اور بزرگوں کی رائے اور ان کے اقوال پر سختی سے کار بند رہنا جبکہ شریعت ان کے اقوال و افعال کی تائید نہیں کرتی ہو۔ یہ جدل ہے جو حرام ہے۔

ہاں اگر کسی مسئلہ کی وضاحت کے لئے یا صحیح صورتحال جاننے کے لئے یا معلومات میں اضافہ کی غرض سے یا سامعین کو تعلیم دینے یا آگاہ کرنے کی غرض سے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ممنوع جدل میں داخل نہیں ہے۔

ما ضربه لك الا جدلا: یعنی آپ کے مقابلے میں کہا کہ اَللّٰهُمَّ خَيِّرْ اَمْرَهُ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ انہوں نے بطور جدل ایک جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔

اعمال میں تشدد اختیار کرنے سے اجتناب کرو

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ لَا تُشَدُّوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَإِنَّ قَوْمًا شَدَّحُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ فَشَدَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ فَيَتْلِكَ بَقَايَا هُمْ فِي

الصَّوَامِعَ وَالْيَتَامَىٰ اِئْتَدِعُوْهَا مَا كُنْتُمْ عَلَيْهَا (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)۔

میز جیکم: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”تم اپنے نفس پر سختی نہ کرو اس لئے کہ پھر خدا بھی تم پر سختی کرے گا، ایک قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے اپنے نفس پر سختی کی تھی چنانچہ اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ پس آج جو لوگ صومعوں اور یتیموں میں پائے جاتے ہیں یہ انہی لوگوں نے پیدا کیا ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔“ (ابوداؤد)

توضیح: لا تشدوا: یعنی سختیوں کے ترک پر تشدد اور سختی مت کرو کیونکہ زمانہ وحی میں تشدد اختیار کرنے کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ حکم فرض ہو جائے گا اور پھر اس کو پورا کرنے کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کی مثال بھی دی کہ انہوں نے اپنے اوپر سختی کر کے رہبانیت اختیار کی چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے انہیں اپنی نگرانی میں پال کر راہب بنایا اور زمین پر پیروں سے چلنے کے بجائے منہ کے بل چلتے پھرتے تھے۔ عورتوں سے قریب ہونے کو سناہ اور بڑی معصیت سمجھتے تھے اور بالوں سے اپنے آپ کو روزانہ چھت کے ساتھ باندھا کرتے تھے۔ منلی کی ہڈی میں سوراخ کر کے رسیوں سے اپنے آپ کو چھت کے ساتھ باندھا کرتے تھے۔ لہذا مذاکل و شرب سے اور مجامعت نساء سے اپنے آپ کو دور رکھا کرتے تھے۔ لے۔ صومعہ: نصاریٰ کے راہب کی کوٹھری کو کہتے ہیں جمع صوامع، دیار کی جمع ذنیو ہے۔ یہود کی اصطلاح میں ان کے عبادت خانہ کو کہتے ہیں۔ لے۔

بقایاھم یعنی خریصہم و بقیہم: یعنی خالی مکانات اور غاروں میں بمنزلہ آثارِ قدیمہ چند راہب رہ گئے باقی پوری ملت ہی ختم ہو گئی۔ لے۔

رہبانیت: یہ لفظ ابتدعوا عامل کی وجہ سے منصوب ہے، بیوی بچوں اور عام معاشرہ کو چھوڑ کر غاروں میں عبادت کے لئے تہا زندگی گزارنے کے عمل کو رہبانیت کہتے ہیں یہودیوں نے اس بدعت کو اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے، اسلام اس طرح زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا، کسی شاعر نے بہت اچھا شعر کہا ہے: ھ۔

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَزَلُ الْقُرْآنَ عَلَى خَمْسَةِ أَوْجُو حَلَالٍ وَحَرَامٍ وَمُحْكَمٍ وَمُنْتَشَاهٍ وَأَمْقَالٍ فَأَجِلُوا الْحَلَالَ وَخَرِّمُوا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوا بِالْمُحْكَمِ وَآمِنُوا بِالْمُنْتَشَاهِ وَاعْتَصِمُوا بِالْأَمْقَالِ۔

(هَذَا لَفْظُ التَّصَابِيحِ وَرَوَى التَّيْمِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ وَلَفْظُهُ فَأَجِلُوا بِالْحَلَالِ وَاجْتَنِبُوا الْحَرَامَ وَآمِنُوا بِالْمُحْكَمِ)۔

تَبَيَّنَ جَبَرًا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قرآن کریم پانچ صورتوں پر نازل ہوا ہے۔ ① حلال ② حرام ③ محکم ④ تشابہ ⑤ امثال، لہذا تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام جانو، محکم پر عمل کرو، تشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال (قصوں) سے عبرت حاصل کرو، یہ الفاظ مصاصع کے ہیں اور یہی نے جو روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔" لہذا حلال پر عمل کرو، حرام سے بچو، اور محکم کی پیروی کرو۔

توضیح: تشابہ سے اگر مراد مقابل محکم ہے تو محکم پر عمل ہوگا اور تشابہ کو بلا تفتیش اور بلا کیف ماننا ہوگا اور یہ کہنا ہوگا "ما یلیق بشانہ"۔ اور اگر تشابہ سے مراد یہ ہو کہ نہ صریح امر ہے نہ صریح نہی ہے دلائل میں تشابہ ہے کہ کچھ دلائل حلت کی طرف مشیر ہیں اور کچھ حرمت پر دلالت کرتے ہیں۔ تو اب اس کا فیصلہ مجتہد کر سکتا ہے کہ کس کو اجتہاد کی بنیاد پر ترجیح دے۔ عام لوگوں کو اس میں توقف کا حکم ہے۔ تشابہات پر کلام اس باب کی پہلی فصل میں ہوا ہے۔

دین اسلام واضح مذہب ہے

﴿٢٠﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَمُرُّكُمْ ثَلَاثَةً رُشْدُهُ فَاَتْبِعُهُ وَأَمْرُ بَيْنِ غَيْبِهِ فَاَجْتَنِبْهُ وَأَمْرُ اخْتِلَافٍ فِيهِ فَاِكْلَهُ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (رواہ احمد) ۱

تَبَيَّنَ جَبَرًا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "امریں طرح کے ہیں: ① وہ امر جس کی ہدایت ظاہر ہے اس کی پیروی کرو، ② وہ امر جس کی گمراہی ظاہر ہے اس سے بچو، ③ وہ امر جو مختلف فیہ ہے اس کو خدا کے سپرد کر دو۔" (امر) توضیح: امر بین وشدنہ: یعنی جس کی ہدایت اور رشد واضح ہو جیسے فرائض صوم وصلوۃ۔ ۱۔ امر بین غیبہ: یعنی ممنوع اور حرام ہونا بالکل ظاہر ہو جیسے شراب، سود، زنا وغیرہ۔ ۲۔

وامر اختلاف فیہ: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ تشابہات میں سے ہے یا غیر تشابہات میں سے ہے۔ یا اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا اس میں اپنی طرف سے اختلاف پایا گیا ہو جس کی وجہ سے اس کی حقیقت کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہو کیونکہ اس کی اصل حقیقت گم ہو گئی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو۔ ۳۔

الفصل الثالث

اہل حق سے الگ ہونے کا نقصان

﴿٢١﴾ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ ذُئِبَ الْإِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ يَأْخُذُ الشَّادَةَ وَالْقَاصِيَةَ وَالنَّاجِيَةَ وَإِنَّا كُمْ وَالشَّعَابُ وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ (رواہ احمد) ۲

تذکرہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا "شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے جس طرح بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ اس بکری کو اٹھالے جاتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ نکلی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو یا ریوڑ کے کنارے پر ہو اور تم پہاڑ کی گھاٹیوں (یعنی گمراہی) سے بچو نیز جماعت اور مجمع کا ساتھ پکڑے رہو۔" (ام)

توضیح: ذنب الانسان: یہ تشبیہ افساد و ہلاک اور تباہی بچانے میں ہے کہ جس طرح بھیڑیا بکریوں کے لئے سب ہلاکت و فساد ہے اسی طرح شیطان انسان کے لئے بمنزلہ بھیڑیا ہے۔ خصوصاً جب بکری ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے تو یہ ہلاکت و فساد زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتا ہے اسی طرح جب کوئی انسان جماعتِ حقہ سے الگ ہو جاتا ہے جمہور کا راستہ چھوڑ کر حق کی شاہراہِ اعظم سے ہٹ کر طرح طرح کی گمراہیوں کی پگڈنڈیوں میں جا گھٹتا ہے تو شیطان کے لئے اس کا شکار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ لہذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اہل حق کے کارواں کے ساتھ چلے تاکہ شیطان کے حملوں سے بچ جائے۔ دیگر احادیث میں سواۃِ اعظم کے نام سے جس جماعت کا ذکر آیا ہے جماعتِ حقہ اسی کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک حق پر چلی آ رہی ہے۔ جو تمام اہل باطل سے زیادہ ہے کیونکہ حق اور اہل حق تسلسل کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص صحابہ کی جماعت کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ تابعین کی جماعت سے بھی محروم ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ جماعتِ حقہ سے کٹ جائے گا جس طرح آنحضرت ﷺ نے بکریوں کی تین قسموں کا ذکر فرمایا ہے۔ ۱۔

الشاذة: اس بکری کو کہتے ہیں جو غیر مانوس ہو کر جانوروں سے الگ ہو جائے۔ ۲۔

الفاصية: گھاس اور پانی کی تلاش میں دور نکل جانے والی بکری کو قاصیہ کہتے ہیں۔ ۳۔

العاصية: غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے جب بکری ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے وہ ناحیہ کہلاتی ہے۔ ۴۔

﴿وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شَبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ﴾ (رواہ أحمد و ابوداؤد) ۵۔

تذکرہ: اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی (یعنی ایک ساعت کے لئے بھی) جدا ہوا، اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے نکال دیا۔" (احمد و ابوداؤد)

توضیح: من فارق الجماعة شبرًا: یعنی جماعتِ حقہ سے ایک بالشت جدا ہوا مطلب یہ کہ احکامات میں بہت تھوڑی مقدار میں الگ ہو یا تھوڑے سے زمانے کے لئے الگ ہوا۔ ۱۔

فقد خلع: یعنی اس نے گردن سے اسلام کا پٹہ نکال دیا یہ حکم تغلیظ و تشدید پر محمول ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ جب الگ ہونا اس کی عادت ہے تو ایک نہ ایک دن وہ اسلام کو خیر باد کہہ دے گا۔ اور اس کا پٹہ گردن سے اتار پھینک دے گا۔ ۲۔

﴿۷۶﴾ وَعَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَزَكُّتْ فِيكُمْ أَمْوَنِينَ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمْسِكُكُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللَّهِ وَسُنَّةُ رَسُولِهِ. (رواۃ فی النوٹا)۔

ترجمہ: حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے۔ وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سنت رسول اللہ (احادیث) ہیں۔“ (موطا)

توضیح: مرسل: مرسل اس روایت کو کہتے ہیں کہ کوئی تابعی براہ راست حضور اکرم ﷺ سے حدیث نقل کرے جیسے قال الاعمش قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اب یہاں یہ سوال ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تابعی نہیں بلکہ تبع تابعی ہیں۔ اب اس منقطع روایت کو مرسل کیسے کہہ دیا گیا؟ خطیب بغدادی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ توسعاً اور مسامحۃً فرمایا گیا۔ حدیث مرسل کی قبولیت میں اس طرح اختلاف ہے کہ اگر اس کے نقل کرنے والا راوی ثقہ ہو اور وہ ثقہ راوی سے روایت کرتا ہو تو امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک یہ روایت مقبول ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرسل روایت کی اگر دیگر صحیح روایات سے توثیق ہوتی ہو تو مقبول ہے ورنہ نہیں۔ یعنی کسی اور روایت سے اس کی توثیق و تائید ہوتی ہو خواہ خود وہ روایت مرسل کیوں نہ ہو۔

ما تمسکتہم بہما: یعنی جب تک تم مضبوطی سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو پکڑے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ ہدایت فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اب ہدایت کس صورت میں سہیا ہوگی؟ جبکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت آخری نبی کی نبوت ہے، نیا کوئی نبی نہیں آ سکتا ہے۔ لہذا ہدایت کے جاری رہنے کا حضور ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ قرآن کریم اور میری سنت یعنی احادیث مقدمہ میرے بعد ہدایت کے لئے ہدایت کا سامان ہے اور قرآن کریم چونکہ ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے، احادیث مبارکہ بھی قرآن عظیم کی برکت سے محفوظ ہیں تو جو کوئی ہدایت کے ان سرچشموں کو مضبوط پکڑے گا وہ گمراہی سے بھی بچا رہے گا۔

۲۲ خرم ۱۰۱۰ھ

بدعت کی نحوست

﴿۷۷﴾ وَعَنْ غُضَّيْفِ بْنِ الْحَارِثِ النَّخَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَحَدَثَ قَوْمٌ بَدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِنْهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسَّكَ بِسُنَّةِ خَلَاوٍ مِنْ أَحْدَاثِ بَدْعَةٍ. (رواۃ فی النوٹا)۔

ترجمہ: حضرت غصیف بن حارث ثمالی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات نکالتی ہے (یعنی ایسی بدعت جو سنت کے مزام ہو) تو اس کے مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے لہذا سنت کو مضبوط پکڑنا نئی بات نکالنے (یعنی بدعت) سے بہتر ہے۔“ (صحیح)

توضیح: الرفع: یعنی بدعت کے لانے اور اس کو رواج دینے سے اس کی مانند ایک سنت اٹھالی جائے گی۔ کیونکہ بدعت سنت کی ضد ہے اور جب بدعت کا غلبہ ہو جائے گا تو سنت اٹھ کر چلی جائے گی اور اسی طرح اس کا کس ہے کہ جب بطور غلبہ سنت عام ہو جائے گی تو بدعت مٹ کر ختم ہو جائے گی یہ دونوں ضدیں ہیں جو یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہذا فتیسک ہسنہ: یعنی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا ایجاد بدعت سے بہتر ہے۔ یہاں لفظ خیر اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ اصل صیغہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے ”الصیف احر من الشتاء“ یہاں مثلھا کا لفظ ضدین کی نسبت تضاد کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ لہذا

یہاں ”سنة“ میں تہوین تقلیل کے لئے ہے۔ یعنی چھوٹی سنت یا قلیل سنت ”ہمدعة“ یعنی بڑی بدعت تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ لہذا

بدعت اپنانے والوں سے سنت چھینی جاتی ہے

﴿۷۶﴾ وَعَنْ حَسَّانَ قَالَ مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةٍ فِي دِينِهِمْ إِلَّا نَزَعَ اللَّهُ مِنْ سُلْبِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيدُهَا إِلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (رواہ الذہبی)

ترجمہ: حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”جب کوئی قوم اپنے دین میں نئی بات (یعنی ایسی بدعت سیئہ جو سنت کے مزام ہو) نکالتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سنت میں سے اس کا مثل نکال لیتا ہے (یعنی جب کوئی بدعت سیئہ پیدا ہوتی ہے تو اس کے مثل سنت دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) اور پھر وہ سنت قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں کی جاتی۔“ (دوری)

توضیح: ثم لا يعيدها اليهم: اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سنت اپنی جگہ پر پایدار اور برقرار تھی اور اس نے درخت کی طرح زمین میں جڑیں پکڑ لی تھیں پس جب اسے اکھڑ کر زائل کر دیا گیا تو وہ دوبارہ اس شکل میں قائم نہیں ہو سکتی ہے جس طرح ایک درخت زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ تو اکھڑنے کے بعد وہ درخت اور اس کی جڑیں اپنی سابقہ اصلی حالت کی طرف واپس نہیں جاسکتی ہیں۔ اور نہ وہ درخت مضبوط ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سنت مٹنے کے بعد دوبارہ اپنی پہلی حالت کی طرح مضبوط نہیں ہو سکتی ہے اگرچہ اس کو دوبارہ زندہ بھی کر دیا جائے۔ لہذا

بہر حال سزا کے طور پر ان سے بوجہ ناقدری یہ سنت چھین لی جاتی ہے پھر ان ناقدروں کو ان نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بدعتی کا اکرام کرنا بڑا گناہ ہے

﴿۸﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْرُوقٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بَدْعٍ فَقَدْ أَغَانَ عَلَى هَلْمِ الْإِسْلَامِ. (رواه البخاری فی شعب الایمان مؤسلاً)

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن مسروق سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ستون کو گرانے میں اس کی مدد کی۔" (حقیق)

توضیح: من وقّر: یعنی لوگوں میں اس کو مقبول بنا دیا اس کی تعظیم کی اس کا اکرام واحترام کیا جس کی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد پیدا ہو گیا تو اس شخص نے اسلام کی سرحدات گرانے میں مدد کی۔

ہدم الاسلام: ہر چیز اپنی حدود پر قائم رہتی ہے۔ اگر حدود نہیں تو وہ چیز بھی باقی نہیں رہتی بلکہ مٹ جاتی ہے۔ تو مبتدع آدمی اپنی بدعات اور نئی چیزوں کو اسلام میں داخل کرنے سے اسلام میں نقب زنی کرتا ہے اور اس کی حدود کو گراتا ہے۔ وہ اپنی جہالت کے ذریعے سے سنت کو مٹاتا ہے اور اس کی جگہ بدعت کو لاتا ہے۔ تو ایسے بدعتی کو مقبول بنانا بعینہ اسلام کی عمارت ڈھانے کے مترادف ہے لہذا یہ شخص بھی اسلام کی حدود گرانے میں اس بدعتی کا معاون ہوا۔

قرآن پر عمل کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا

﴿۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللَّهِ ثُمَّ اتَّبَعَ مَا فِيهِ هَدَاهُ اللَّهُ مِنَ الصَّلَاةِ فِي الدُّنْيَا وَوَقَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوءَ الْحِسَابِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ مَنْ افْتَدَى بِكِتَابِ اللَّهِ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْفَى فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ فَمَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْفَى. (رواه ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا اور پھر اس چیز کی پیروی کی جو اس (کتاب اللہ) کے اندر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں گمراہی سے ہٹا کر راہ ہدایت پر لگائے گا (یعنی اس کو ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رکھے گا اور گمراہی سے بچائے گا) اور قیامت کے دن اس کو برے حساب سے بچائے گا۔ (یعنی اس سے مواخذہ نہیں ہوگا) اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کی پیروی کی تو نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بد بخت ہوگا (یعنی اسے عذاب نہیں دیا جائے گا) اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَمَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْفَى۔ ترجمہ: جس شخص نے میری ہدایت (قرآن) کی پیروی کی نہ وہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) بد بخت ہوگا۔ (ترمذی)

اپنے ایمان کی حفاظت ہر آدمی کی ذمہ داری ہے

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ صَرَبَ اللَّهُ مَقْلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا وَعَنِ جَنَّةِ أَبِي
الْخِطْرِ إِطْ سُوْرَانِ فِيهِمَا أَبْوَابٌ مُفْتَحَةٌ وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُورٌ مُرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الْخِطْرِ إِطْ دَاغٌ
يَقُولُ اسْتَقِيمُوا عَلَى الْخِطْرِ وَلَا تَعُوجُوا وَفَوْقَ ذَلِكَ دَاغٌ يَدْعُو كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ أَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا
مِنْ بَلَدِكَ الْأَبْوَابِ قَالَ وَيَمْنُكَ لَا تَفْتَحْهُ فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلْجُهُ ثُمَّ فَتَرَهُ فَأَخْبَرَ أَنَّ الْخِطْرَ إِطْ هُوَ
الْإِسْلَامُ وَأَنَّ الْأَبْوَابَ الْمُفْتَحَةَ عَمَّارُ اللَّهِ وَأَنَّ السُّتُورَ الْمُرْخَاةَ مُدَوِّدُ اللَّهِ وَأَنَّ الدَّاعِيَ عَلَى
رَأْسِ الْخِطْرِ إِطْ هُوَ الْقُرْآنُ وَأَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهِ هُوَ وَاعِظُ اللَّهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ.

(روافد زینت و اعتماد و التذلل فی شعب الایمان عن النواہی فی صفحان و کذا البیرونی عنہ إلا آتہ ذکرًا مختصرًا منه)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے (وہ یہ ہے کہ) ایک سیدھا راستہ ہے اور ان کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستے کے سرے پر پکارنے والا کھڑا ہوا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے ”سیدھے راستے پر چلے آؤ۔ غلط راستے پر نہ لگو۔“ اس پکارنے والے کے اوپر (یعنی اس کے آگے کھڑا ہوا) ایک دوسرا پکارنے والا ہے جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ (دوسرا پکارنے والا) پکار کر کہتا ہے ”مجھ پر افسوس ہے! اس کو نہ کھول اگر تو اس کو کھولے گا تو اس کے اندر داخل ہو جائے گا“ (اور وہاں سخت تکلیف میں ہوگا) پھر آنحضرت ﷺ نے اس مثال کی وضاحت فرمائی اور فرمایا ”سیدھے راستے سے مراد اسلام ہے (جس کو اختیار کر کے لوگ جنت میں پہنچتے ہیں) اور کھلے ہوئے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ پاک نے حرام قرار دیا ہے۔ (جس کو اختیار کرنا تکمیل اسلام کے منافی ہے) اور (دروازوں پر) پڑے ہوئے پردوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں اور راستے کے سرے پر پکارنے والا جو کھڑا ہے اس سے مراد قرآن کریم ہے اور وہ دوسرا پکارنے والا جو پہلے پکارنے والے کے آگے کھڑا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجتے والے فرشتے ہیں جو ہر مومن کے دل میں ہے۔“ (رزین، احمد بن حنبل، ترمذی)

توضیح: ”ستور“: پردے کو کہتے ہیں اور ”مرخاۃ“: لٹکنے کو کہتے ہیں۔ یعنی لٹکے ہوئے پردے دروازوں پر پڑے ہیں۔

ولا تعوجوا: یعنی غلط راستے پر نہ چلو۔ بلکہ تلجہ: یعنی تم اس میں داخل ہو جاؤ گے۔

واعظ اللہ: اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے اور مومن کے دل میں بھلائی کا الہام کرتا رہتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل باب الوسوسہ میں گزر چکی ہے۔

بہر حال پوری حدیث ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کا ایک خفیہ دشمن ہے جس کا نام شیطان ہے۔ جو ہر وقت ہماری تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ ذرا یہ مسلمان اہل حق کی جماعت سے ادھر ادھر ہو جائے تو شیطان اسے مکمل طور پر ہلاک کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پوشیدہ دشمن کے لئے فرشتوں کا ایک خفیہ پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ جو بھلائی کی نصیحت اور الہام کرتا رہتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان

﴿۵۱﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدَّمَاتُ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولَئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوا أَفْضَلَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبْرَهًا قُلُوبًا وَأَعَمَّقَهَا عِلْمًا وَأَقْلَبَهَا تَكَلُّفًا اخْتَارَهُمُ اللَّهُ لِصُغْبَةِ نَبِيِّهِ وَلَا قَامَةَ دِينِهِ فَأَعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوهُمْ عَلَى أَثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيمِ۔ (رواہ زرین)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی طریقے کی پیروی کر رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرے جو مر گئے ہیں کیونکہ زندہ آدمی (دین میں) فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو مر گئے ہیں (اور جن کی پیروی کرنی چاہئے) ان حضرات کے اصحاب ہیں جو اس امت کے بہترین لوگ تھے، دلوں کے اعتبار سے انتہا درجے کے نیک، علم کے اعتبار سے انتہائی کامل اور بہت کم تکلف کرنے والے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی رفاقت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب کیا تھا لہذا تم ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کے آداب و اخلاق کو بھی اختیار کرتے رہو (اس لئے کہ) کوئی لوگ ہدایت کے سیدھے راستے پر ہیں۔ (زرین)

توضیح: مستنن: استنان کسی کی پیروی اور کسی کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے سنت ہے۔

اعمقہا علمًا: ای اکثرها غورًا فی حقائق العلم۔ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علم وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ گہرا اور عمیق بھی تھا۔ ہر صحابی علم و معرفت، فہم و فراست، تدبر و فکر، عقل و دانش کا مینارہ نور تھا۔ جن سے دنیا کے ظلم زدہ اور جہالت کدہ انسانوں نے تعلیم و ترقی، تہذیب و شرافت اور عظمت و انسانیت کا درس لیا۔ چنانچہ کوئی صحابی تفسیر وحدیث میں یکتا تھا و کوئی فقہ و قرأت کا امام تھا کوئی تصوف کا علمبردار تھا تو کوئی علم القرآن اور علم الاحوال و الحرام کا امام تھا۔

واقلہا تکلفًا: یعنی علم و عرفان کے جہاں ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ خواہ وہ عالی منصب پر فائز ہی کیوں نہ ہوں انہیں ننگے پاؤں پھرنے میں کوئی عار نہ تھا اور نہ زمین کے فرش پر نماز پڑھنے یا بیٹھنے لینے

کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔“ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ تمہارے درمیان ظاہر ہوتے اور تم ان کی پیروی کرتے اور مجھے چھوڑ دیتے تو تم سیدھے راستے سے بھٹک کر گمراہ ہو جاتے اور (حالانکہ) اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانہ نبوت پاتے تو وہ (بھی) یقیناً میری (ہی) پیروی کرتے۔“ (داری)

توضیح: ثكلتك العواکل: شکل کاف کے کسرہ کے ساتھ گم کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ثواکل فاکلہ کی جمع ہے اس عورت کو کہتے ہیں جس کا بچہ گم ہو چکا ہو یا ہلاک ہو چکا ہو اور وہ زار و قطار رو رہی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تجھے گم کر دیالی مائیں گم کر دیں، یا بہنیں یا بیٹیاں گم کر دیں۔

یہ محاورہ عرب کے تحت عام گفتگو میں بولا جاتا ہے اس سے حقیقی معنی مراد نہیں لیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم کے حریض اور شوقین تھے۔ حکمت و معرفت کے قدردان تھے۔ یہود کے ہاں کبھی کبھی آتے جاتے تھے۔ پہلے کچھ نیک باتوں کو سننے کی اجازت مانگتی تھی اب کچھ اچھی باتیں سنانے لگے خیال کیا کہ شاید یہ غیر محرف اور منقول من اللہ تو رات کا حصہ ہوگا۔ آپ کو یہ خیال نہ تھا کہ حضور ﷺ غصہ ہو رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے خیالی میں پڑھتے رہے۔ تب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رونے والی عورتیں تجھے روکیں یعنی تو گم ہو جائے، کسی فعل کے انکار پر اور ناراضگی کے وقت یہ جملہ محاورہ عرب میں بولا جاتا ہے تو یہاں صرف انکار اور تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے۔

فنظر عمر: حضرت عمر تو پھر عمر تھے۔ ملّھم و محدث تھے اشدھم فی امر اللہ عمر تھے فوراً توبہ کی اور غضب الہی اور غضب رسول ﷺ سے تعوذ کرتے رہے۔ آنحضرت ﷺ کا غصہ اسی سے ٹھنڈا ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری اطاعت کے سوا چارہ کار نہیں تھا کیونکہ یہ دین اسلام کا دور ہے۔

سورۃ النجم ۱۰۱

ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ

﴿۵۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَلَامَيْنِ لَا يَنْسَخُ كَلَامُ اللَّهِ وَكَلَامُ اللَّهِ يَنْسَخُ كَلَامِي وَكَلَامُ اللَّهِ يَنْسَخُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”میرا کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا اور کلامِ اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے اور کلامِ اللہ کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔“

توضیح: لغت میں نسخ کا معنی نقل کرنا مٹانا لکھنا وغیرہ آتا ہے۔ اور اصطلاح میں نسخ کی تعریف اس طرح ہے: رفع الحكم الشرعي بدليل شرعي متأخر۔ یعنی سابق شرعی حکم کو آنے والی دلیل سے اٹھانا ہٹانا۔

کلامی لا ینسخ کلام اللہ: نسخ کی کل چار صورتیں ہیں:

① قرآن کریم قرآن کے لئے ناسخ ہو۔

② حدیث حدیث کے لئے ناسخ ہو۔

③ قرآن کریم حدیث کے لئے ناسخ ہو۔

④ حدیث شریف قرآن کریم کے لئے ناسخ ہو۔

پہلی تین صورتوں میں امت کا اتفاق ہے آخری صورت میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں حدیث سے قرآن کا نسخ جائز نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں حدیث مشہور سے نسخ قرآن واقع ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث بظاہر امام شافعی رحمہ اللہ و امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل ہے لیکن اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں کلامی سے مراد کلام اجتہادی ہے۔ جس سے نسخ کلام اللہ نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میرا کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کو منسوخ نہیں کرتا حکم کو منسوخ کرتا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خود منسوخ ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں ایک روای جبرون بن واقد ہے جو نہایت ضعیف بلکہ متعمد بالکذب ہے۔ لہذا یہ روایت ناقابل احتجاج ہے کیونکہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ سنت مشہورہ متأخرہ سے کلام اللہ میں نسخ آ سکتا ہے۔

سوال: بعض جہال یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نسخ کے بارے میں ہم پوچھتے ہیں کہ پہلا نازل کردہ حکم صحیح تھا یا غلط تھا اگر صحیح تھا تو منسوخ کیوں ہوا؟ اور اگر غلط تھا تو پہلے سے کیسے نازل ہوا؟

جواب: اس کا جواب واضح ہے کہ نسخ کا مدار حکمت پر ہے۔ اور حکیم کی حکمت پر اعتراض نادانوں کا کام ہے۔ دیکھو مثلاً ایک مریض کو ایک حکیم ایک وقت میں ایک نسخہ دیتا ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی طبیب اس نسخے کو تبدیل کرتا ہے تو کیا یہ پہلا نسخہ غلط تھا یا غیر مفید تھا؟ نہیں بلکہ طبیب نے مریض کے مزاج کے مطابق نسخہ تبدیل کیا ہے۔ اسی طرح حالات و واقعات اور ضرورت کے تغیر سے نزول وحی کے دوران حکم میں تغیر آتا رہتا ہے۔ نماز و روزہ کے احوال میں تغیر آیا ہے۔ جہاد میں تعداد مقامین میں تغیر آ گیا ہے تو یہ تغیر اور نسخ ہمارے علم کے اعتبار سے تھا اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ حکم نزول کے وقت سے اتنے ہی وقت کے لئے اترتا تھا جس وقت میں یہ منسوخ ہو گیا ہے بہر حال نسخ ہماری نسبت سے ہے، نیز نسخ کا ذکر قرآن عظیم میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔

﴿وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَحَادِيثَنَا يَنْسَخُ بَعْضُهَا﴾

بَعْضًا كُنْصَحَ الْقُرْآنِ ۱۔

تَرْجُمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہماری (بعض) احادیث بعض کو اس طرح سے منسوخ کرتی ہیں جیسا کہ (قرآن کے بعض حصوں کو) قرآن منسوخ کرتا ہے۔“

توضیح: کنسح القرآن: لفظ نسخ یہاں مصدر واقع ہوا ہے جو قرآن کی طرف مضاف ہے۔ اب اگر اس مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے تو ترجمہ اس طرح ہوگا جیسا کہ قرآن کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کرتا ہے۔ اور اگر اضافت مفعول کی طرف ہو جائے تو ترجمہ اس طرح ہوگا کہ ہماری احادیث آپس میں ایک دوسرے کو ایسے ہی منسوخ کرتی ہیں۔ کنسح القرآن: جس طرح کہ یہ حدیثیں قرآن کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس ترجمہ کے مطابق یہ حدیث مابقی حدیث کے لئے نسخ بن جائے گی۔ اور پھر یہاں حناف اور مالکیہ کی دلیل بن جائے گی لیکن اس روایت میں بھی ایک راوی محمد بن حارث کا قذیب ہے۔

حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو

﴿۵۴﴾ وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخَشَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ قَرَضَ قَرَائِصَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا وَحَرَّمَ حُرْمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا وَسَكَّتْ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نَسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا۔ (رَوَى الْأَحْمَدُ فِي الْفَلَاقَةِ الدَّارِ قُطْنِي ۱)

تَرْجُمہ: حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے چند قرائص کو قرض کیا ہے لہذا تم ان کو ضائع نہ کرو۔ (یعنی ان کو نہ چھوڑ دیا ان کے شرائط و امکان کو ترک نہ کرو۔ یا یہ کہ ان قرائص میں نمائش و ریاضت و شب اور غرور و تکبر نہ کرو) اور چند چیزیں اللہ پاک نے حرام قرار دی ہیں۔ (یعنی ان کو اختیار کرنا گناہ قرار دیا ہے) لہذا تم ان کے نزدیک بھی مت جاؤ۔ اور چند حدود و مقرر کی ہیں۔ (مثلاً حدود و قصاص وغیرہ) لہذا تم ان سے تجاوز مت کرو۔ (یعنی ان میں اپنی طرف سے کمی و زیادتی مت کرو) اور چند چیزوں کے بارے میں بھول کر نہیں (بلکہ دانستہ) سکوت اختیار کیا ہے (یعنی کتنی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ حرام ہیں یا حلال اور یا واجب ہیں) لہذا ان چیزوں میں تم (اپنی طرف سے) بحث نہ کرو۔“ (مذکورہ تینوں حدیثیں دارقطنی نے روایت کی ہیں)۔

بدعت کی مثال

باب الاعتصام بالکتاب والسنة: کی یہ آخری حدیث ہے ان تمام احادیث سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام میں اپنی پسند کی چیز داخل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ کیونکہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے کہ خواہشات سے مغلوب ہو کر انہوں نے اپنی پسند کی خواہشات کو اسلام کے ساتھ بطور

بیوند جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسلام اپنی حدود و سرحدات کو سختی سے محفوظ نہ رکھتا تو نہ معلوم کتنے خواہش پرستوں کی کتنی خواہشات دین کا حصہ بن چکی ہوتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ لہذا اس امت میں ایسے علماء موجود ہیں جو ہر بدعت پسند شخص کی بدعت کو قرآن و حدیث کے مضبوط اصولوں سے مسترد کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ بدعت ایسا جرم ہے جو ناقابل معافی ہے۔ اس کی مثال آپ یہ سمجھیں کہ ایک پوسٹ آفس ہے اس سے ڈاک یہ خطوط اور رسیدوں پر مشتمل ایک تھیلی دوسرے ڈاکخانہ تک پہنچاتا ہے اب اگر یہ ڈاک یہ اس مہر شدہ تھیلی کو کھول کر اندر سے کوئی خط نکال لیتا ہے تو بھی حکومت وقت کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اور اگر وہ اس تھیلی میں ایک عمدہ خط اپنی طرف سے داخل کرتا ہے تو پھر بھی مجرم ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ اندر کے خطوط پر حکومت کا سرکاری ٹھپہ لگا ہوا ہے ڈاک یہ غیر تصدیق شدہ بغیر مہر کا غلاف اس میں داخل کرتا ہے تو یہ بغاوت و خیانت کی طرح بہت بڑا جرم ہے۔

بدعت کی دوسری مثال آپ یہ سمجھیں کہ اگر کوئی شخص کسی حکومت میں جعلی سکہ بناتا ہے اور پھر اس پر جعلی ٹھپہ لگا کر رائج الوقت سرکاری سکہ میں اس کو داخل کر کے چلاتا ہے تو وہ شخص حکومت اور قانون کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ٹھہرے گا؟ بالکل اسی طرح ایک بدعتی شخص ہے جو مستند شریعت میں اپنی طرف سے غیر مستند عمل داخل کرتا ہے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دے کر اس مصنوعی عمل کو اصلی عمل کی صورت میں رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ شخص خدا اور خدا کے رسول اور قانون اسلام کے نزدیک کتنا بڑا مجرم بنے گا؟ لہذا ہر مسلمان کو بدعات گھڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

وخیر امور الدین ما کان سنۃ وشر الامور المحدثات البدائع

ترجمہ: دین اسلام میں بہترین چیزیں وہ ہیں جو سنت ہیں اور بدترین چیزیں من گھڑت بدعات ہیں۔



کتاب العلم علم اور اس کی فضیلت کا بیان

کتاب العلم ای تعلیہ وتعلیہ وفضله وفضل تعلیہ

باب الاعتصام بالکتاب والسنة کے بعد کتاب العلم کا لانا تعمیم بعد التخصیص ہے کیونکہ علم میں بے پناہ وسعت اور عموم ہے۔ جس کے ضمن میں اعتصام بالکتاب والسنة بھی ہے۔ یہاں علم کی حقیقت و ماہیت سے بحث نہیں بلکہ احادیث میں علم کی جو فضیلت اور ضرورت آئی ہے اس سے بحث کرتی ہے۔

علم کی تعریف:

علم لغت میں دانستن کہہ جاتے ہیں۔ اور علم کی اصطلاحی تعریف میں علماء کی دورائے ہیں۔ علماء کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ علم کی تعریف یا بالکل نہیں ہو سکتی اور یا مشکل ترین چیز ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"نعم تحقیق حقيقة عسير جداً"

یعنی علم کی تہ اور حقیقت تک پہنچنا بہت ہی دشوار ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ علم "اجلی البدیہیات" میں سے ہے اس لئے یہ ناقابل تحدید و تعریف ہے۔ علماء کے دوسرے طبقے جمہور کا خیال ہے کہ علم کی تحدید و تعریف ممکن ہے اور غلطو ترتیب کی وجہ سے یہ تعریفات اٹھارہ تک جا پہنچی ہیں۔ جس سے علم کی شان کی بلندی کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کے ہاں ایک تعریف "حصول صورة الشیء" ہے، ایک تعریف: "الصورة الحاصلة عند العقل" ہے۔ ایک تعریف: "الحاضر عند المدرك" ہے۔

اہل شرع کے ہاں بھی علم کی کئی تعریفات ہیں۔ چنانچہ ماترید نے علم کی تعریف اس طرح کی ہے:

① العلم صفة مودعة في القلب كالقوة الباصرة في العين والسماعة في الاذن۔

② علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے اس طرح تعریف کی ہے: العلم صفة توجب تمييزاً لا ياحتمل النقيض۔

③ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علم کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

"العلم نور في قلب المؤمن مقتبس من مصابيح مشكوة النبوة من الاقوال المحمدية"

والافعال الاحمدية يهتدى به الى الله وصفاته واحكامه۔

● امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی تعریف اس طرح سے فرمائی ہے: "معرفة النفس مالها وما عليها"۔
اس تعریف میں علم نقد اور تصوف بھی داخل ہو گیا۔

علم کی اقسام

مطلق علم دو قسم پر ہے: اول مبادی دوم مقاصد

قسم اول: جیسے علم لغت، علم صرف، علم نحو، علم معانی و بیان اور علم اشتقاق وغیرہ۔

قسم دوم: جیسے علوم شرعیہ، احکام و عقائد وغیرہ

یہ شرعی علوم پھر دو قسم پر ہیں: اول کسی، دوم وہابی۔ وہابی وہ علوم ہوتے ہیں کہ جن کے حصول میں انسان کے اکتساب کا دخل نہ ہو، یہ وہی علوم پھر دو قسم پر ہیں: اول وہ کہ جو بغیر واسطہ بذریعہ وحی حاصل ہو جائیں یہ علوم النبوة ہیں۔
چنانچہ وہ کہ جو کمال اتباع نبی کی وجہ سے مل جائیں۔ یہ الہام و کشف و فراست پر مشتمل علوم ہوتے ہیں۔ الہام کے لئے علامات نہیں ہاں کشف و فراست کے لئے علامات ہوتی ہیں۔

دوسری قسم کسی علوم ہیں۔ یہ کسب بشر سے بواسطہ بشر حاصل ہونے والے علوم ہیں جو علوم الشرعیات کہلاتے ہیں۔ اس میں ایک علم الاحکام ہے جس سے مقبول اور غیر مقبول میں امتیاز ہوتا ہے۔ اگر قبولیت ظاہر سے متعلق ہو تو یہ علم الفقہ ہے اور اگر باطن سے متعلق ہو تو یہ علم التصوف ہے۔ تو علم تصوف بھی علوم کسبیہ میں داخل ہے۔

پھر جو اشیاء فرض ہیں ان کا علم بھی فرض ہے، جو سنت ہیں ان کا علم بھی سنت ہے، جو اعمال واجب ہیں ان کا علم بھی واجب ہے، جو اشیاء حرام ہیں ان کا علم فرض ہے، جو طہرہ تحرکی ہیں ان کا علم واجب ہے۔ جو مکروہ تحرکی ہیں ان کا علم سنت ہے۔

"طلب العلم فريضة" سے مراد یہی ضروری علم ہے، باقی دینی امور کا ماہر ایک بڑے عالم دین کا وجود علاقے میں ضروری ہے۔ یعنی ایک جید عالم دین کا علاقہ میں ہونا فرض کفایہ ہے۔ اگر سب لوگوں نے اس ضرورت کو نظر انداز کیا تو سب کے سب تنہا رہ جائیں گے۔ درجہ فرض سے آگے بڑھ کر علوم میں کمال پیدا کرنا مستحب ہے۔ بہر حال آدمی جس حالت میں بھی ہو اس حالت کا علم کہ آیا یہ حالت جائز ہے یا ناجائز ہے۔ اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔
علم کی فضیلت پر قرآن پاک کی آیات اور احادیث مقدسہ کے واضح فرامین بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ اس سے جتنا ممکن ہو فائدہ اٹھالینا چاہئے۔

علم کی فضیلت میں حضرت سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے چند تقابلی آیات کہے ہیں ملاحظہ ہوں:

صاحب دلے بدر سے آمد ز خانقاہ بشکستہ عہد صحبت ال طریق را

گفتیم میان عابد و عالم پہ فرق بود کہ تو کردی اختیار از اس ایں فریق را
گفت آں کلیم خویش بردن می بردز موج و ایں جہد میکند کہ گیرد غریق را

الفصل الاول

علم کو عام کرو اور جھوٹ کو نہ پھیلاؤ

﴿عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَلَبَ عَلَى مُتَعَتِدٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعِدَهُ مِنَ النَّارِ﴾ (رواه البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ اور بنی اسرائیل سے جو تمہیں سنو لوگوں کے سامنے بیان کرو۔ یہ گناہ نہیں اور جو شخص قصدِ امیری طرف جھوٹی بات منسوب کرے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈ لے۔“ (بخاری)

توضیح: بلغوا عنی: یعنی علوم میرے ہوں گے پھیلاؤ تمہارا کام ہے۔ میری بات مستند طریقہ سے دوسروں تک پہنچاؤ۔

ولو آیۃ: اس جملہ میں آیت کے لفظ کے دو مفہوم ہیں اول یہ کہ آیت سے مراد قرآنی آیت ہے۔ یعنی میری طرف سے قرآنی آیت بھی پہنچاؤ۔ اگرچہ اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اور جب ایسی محفوظ آیت کی تبلیغ ضروری ہے تو پھر میری احادیث کی تبلیغ تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آیت بمعنی نشانی اور خبر اور کلام مفید ہے۔ اس سے مراد احادیث کے علاوہ دین کی تمام باتیں ہیں۔ حسب موقع و ضرورت اس کو پہنچانا ہر جاننے والے پر لازم ہے۔ ”آیۃ“ ”شبی قلیل“ پر بولا گیا ہے۔ یعنی خواہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اس کو بھی پہنچاؤ۔ یہ لفظ ”کان“ مخدوف کے لئے خبر ہے۔

بہر حال تبلیغ باب تفعیل سے ہے۔ اس کا مفعول پورا دین ہے۔ یعنی تبلیغ الدین اور پہنچانے کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ پہنچانے والا پہلے اس کو خود سمجھ چکا ہے تب ہی تو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور جو شخص خود نہیں سمجھتا تو وہ دوسروں تک صحیح بات کو کیسے پہنچا سکتا ہے۔ ”الکل فن رجال“ بہر حال حدیث میں علم کو عام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور جھوٹ پھیلانے سے منع کیا گیا ہے۔

وحدثوا عن بنی اسرائیل: باب الاعتصام بالکتاب میں حدیث ۳۶ سے بظاہر اس حدیث کا تعارض ہے۔ کیونکہ وہاں شدت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے تورات کے اور اہل پڑھنے سے منع کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جو ممانعت آئی ہے وہ احکام کے نقل کرنے سے متعلق ہے۔ اور یہاں جو اجازت ہے یہ قصص مواعظ و امثال کے نقل کرنے کی اجازت ہے جو تاریخی اعتبار سے منقول ہیں یا قرآن و حدیث میں بنی اسرائیل کے واقعات کا جو ذکر عبرت و نصیحت کے لئے آیا ہے اس کے بیان کرنے کی اجازت ہے احکام بیان کرنے کی نہیں کیونکہ وہ منسوخ ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر جو سرزنش ہوئی وہ اس لئے کہ وہ نسخہ تحریف شدہ تھا۔

حدیث گھڑنے کی شدید وعید:

فلیتنبوا: یہ امر انشاء بمعنی خبر ہے۔ یعنی اس شخص نے اپنے لئے دوزخ میں ٹھکانہ تیار کر لیا۔ اس حدیث میں احادیث گھڑنے کی شدید وعید آئی ہے۔ اسی کے پیش نظر علامہ ابو محمد جوینی رحمہ اللہ نے حدیث گھڑنے والے کو کافر قرار دیا ہے۔ لیکن جمہور امت نے اس کو بہت بڑا گناہ کہا ہے۔ یعنی اگر کوئی اس گھڑنے کو جائز کہتا ہے پھر تو یہ کفر ہے ورنہ نہیں۔ جمہور امت اس پر بھی متفق ہیں کہ وضع حدیث مطلقاً ناجائز ہے۔ خواہ نیک ارادے سے ہو یا کسی بھی ارادہ سے ہو۔ بعض جاہل صوفی سمجھتے ہیں کہ ترغیب و ترہیب کے لئے حدیث گھڑنا جائز ہے۔ اس میں دین کا فائدہ ہے۔ لوگوں کو فائدہ ہے کوئی نقصان نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دین اسی راستے سے آتا ہے جو دین کا راستہ ہو بنی دینی کے راستے سے دین نہیں آتا تو جو فائدہ دین پر جھوٹ باندھنے سے حاصل ہوا وہ کیا فائدہ ہوا؟ وہ تو نقصان ہی نقصان ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کسی کے فائدے کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ اس کو دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا آیا اس کی خوبصورت شکل کو برقرار رکھا گیا یا اسے بگاڑ دیا گیا۔

ایک مقام پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقات میں لکھا ہے کہ حدیث کی عبارت پڑھنے والا طالب علم جب حدیث پڑھنے میں غلطی کرتا ہے تو وہ بھی اس وعید میں آتا ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ عبارت میں غلطی کرتا ہے اور پھر بھی پڑھتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آدمی حدیث نقل کرنا جائز ہے۔ جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کرتے ہیں۔ لے۔

متعمداً: اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کذب عمد کے لئے وعید ہے۔ اگر غلطی سے ہو یا کتاب میں عبارت غلط ہو تو وہ اس سے خارج ہے۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ متعمداً کا لفظ بعض روایات میں ہے اور بعض میں یہ لفظ نہیں ہے۔ لہذا یہ وعید عمد غیر عمد دونوں صورتوں کے لئے ہے۔ علامہ دارقطنی رحمہ اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حدیث میں متعمداً کا لفظ نہیں ہے لوگوں نے اس کو بڑھایا ہے۔ (بحوالہ مقدمہ موضوعات کبیر)

علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ وعید عام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی موافقت میں ہو یا مخالفت میں ہو دونوں صورتوں میں بڑا گناہ ہے۔ حدیث کے پہلے جملے میں تبلیغ کی ترغیب تھی تو خطرہ تھا کہ کوئی جوش میں آکر بے سرو پار دایات بیان کرنا نہ شروع کر دے۔ اس لئے اس جملہ میں فرمایا کہ تبلیغ کرو مگر جس نے بے سند باتیں بیان کیں اور مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ لے۔

جھوٹی حدیث بیان کرنے کی وعید

﴿۲﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُزِي أَلَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَافِرِينَ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص میری (طرف منسوب کر کے کوئی ایسی) حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال یہ ہو کہ وہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹے آدمیوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ (مسلم)

توضیح: یوں: یہ صیغہ مجہول یظن کے معنی میں ہے۔ مجہول ہی مستعمل ہوتا ہے اور روایت سے مراد روایت قلبی ہے۔

احد الکاذبین: یہ جمع کا صیغہ ہے اور اسی کو رائج قرار دیا گیا ہے یعنی دیگر کذابین میں سے ایک یہ شخص بھی ہے۔ کیونکہ یہ بھی ان کی انفرادی تائید کر کے نقل کرتا ہے بعض نے اس کو تنبیہ کا صیغہ مانا ہے۔ کہ ایک جھوٹا تو وہ ہے جس نے گھڑ لیا ہے اور دوسرا جھوٹا یہ بیان کرنے والا شخص ہے جو گھڑنے والے کا ساتھ دے رہا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ موضوعی حدیث بیان کرنا حرام ہے ہاں اگر کوئی نقل کر کے یہ بتاتا ہے کہ یہ موضوعی ہے تو یہ طرزِ صحیح ہے، موضوعات پر علماء نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

علم بڑی دولت ہے

﴿۳﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ يُدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقِهَهُ فِي الدِّينِ وَإِنَّمَا أَكَا قَائِمٌ وَاللَّهُ يُعْطِي۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص کے لئے خدا تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ اور میں (علم کو) تقسیم کرنے والا ہوں۔ عطا کرنے والا تو خدا ہی ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: يفقهه في الدين: اسرار احکام کے علم کا نام فقہ ہے۔ لہذا فقہت اس ملکہ اور سمجھ بوجھ کا نام ہوا جس کے ذریعے سے انسان غیر حاصل معلومات کا استخراج کر سکتا ہے۔ یہ نعمت عظیمہ ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متعارف فقہاء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم عام ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ فقہاء نے ایسا فرمایا ہے تو آپ نے کہا تیرا بھلا ہونے لگے کسی فقیہ کو دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو زاهد عن الدنیا راغب فی الآخرة ہو۔ اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہو اور ہمیشہ اپنے رب کی

عبادت میں لگا رہتا ہو۔

واضحاً انا قاسم: یعنی وحی کے علوم کا میں قاسم ہوں اور میں علوم کو تقسیم کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کے سمجھنے کا فہم دیتا ہے۔ اس حدیث کا تعلق علوم نبوت کی تقسیم سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کو محدثین کتاب العلمہ میں لاتے ہیں۔ لہذا واللہ یعطی: کا مطلب یہ ہے کہ پھر اللہ پاک انسانوں کو درجہ بدرجہ فہم اور اکاب بھی عطا کرتا ہے۔ تو کوئی اعلیٰ درجہ کا ذہین ہوتا ہے کوئی متوسط درجہ کا ہوتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔

یہاں اس حدیث سے اہل بدعت یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس تقسیم سے مراد رزق و ارزاق کی تقسیم ہے۔ چنانچہ اہل بدعت کے امام احمد رضا خان صاحب نے کہا ہے:

خلق کے حاکم ہو تم رزق کے قاسم ہو تم تم سے ملا جو ملا تم پہ کروڑوں درود اس نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بھی کہا ہے:

کیوں نہ قاسم ہو کہ تم ابن ابی القاسم ہو کیوں نہ قادر ہو کہ مختار ہے بابا تیرا۔ یہ سب اہل بدعت کی بد فہمی اور کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ شارحین حدیث نے یہ شرح نہیں کی ہے۔ اور اگر احادیث میں کہیں تقسیم اور قاسم ہونے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوئی ہے تو وہ مال غنیمت کی تقسیم کی بات ہے۔

انسانی ملکات کا ذکر

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ اللَّحَبِ وَالْفِطْرَةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فُقِيَ هُوَا. (رواہ مسلم)

تیسرے ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”انسانوں کی اسی طرح کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے۔ جو لوگ ایام جاہلیت میں بہتر تھے، وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر ہیں۔ اگر وہ فقاہت حاصل کریں۔“ (مسلم)

توضیح: الناس معادن: یہ معدن کی جمع ہے کان کو کہتے ہیں یعنی جس طرح زمین کی کان میں سونا ہوتا ہے چاندی ہوتی ہے تانبہ لوہا زمر اور جواہر وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنے مکارم اخلاق سے متفاوت ہوتے ہیں۔ انسان کے اچھے اخلاق شجاعت مروت سخاوت علم و حیا اور ذکاوت و ذہانت وغیرہ ہیں۔

تو جس طرح کانوں میں دھاتوں اور سونے چاندی کے خزانوں میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کانوں میں کہیں سونا چاندی زیادہ اور کہیں کم کہیں اعلیٰ کہیں ادنیٰ اسی طرح انسان بھی اپنی خوبیوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہوتے ہیں۔

نفیاً رحمہ: یعنی اسلام قبول کرنے سے کسی برتری کم یا ختم نہیں ہوگی۔ بلکہ جاہلیت میں جو اس کی نسبت خاندانی برتری اور شرافت تھی، اسلام قبول کر کے اگر فقہت حاصل کرے اور عالم بن جائے تو وہ برتری اور بڑھ جائے گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ "الاسلام یزید العزیز شرفاً"۔ اسلام تو انسانی شرافت کو بڑھاتا ہے۔ ہاں یہ فضیلت اور برتری اس وقت ہے جبکہ اسلام میں فقہت حاصل کرے اگر کسی اعلیٰ خاندان کے آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد علم دین اور فقہت حاصل نہیں کی اور دوسرے آدمی اور بے کے انسان نے اسلام میں آکر فقہ کا علم حاصل کیا تو اس اعلیٰ خاندان والے سے وہ آدمی خاندان والا برتر ہو جائے گا۔ کیونکہ شرط فقہت ہے۔ لہ

اذا فقهوا: یعنی یہ ملکات پوشیدہ تھے اسلام نے ان کو چمکا دیا بشرطیکہ یہ انسان زیور تعلیم سے آراستہ ہو جائے۔ اس حدیث میں سونے چاندی سے انسان کی خوبیوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح ان مستور خزانوں کو نکالنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح سے انسان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں محنت اٹھانا پڑے گی نیز سونا چاندی آگ میں پگھل کر محنت برداشت کر کے زیور کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو علمی کمالات میں محنت کر کے اپنی خوبیوں کو ظاہر کرنا پڑے گا۔ اس حدیث نے ہر انسان کو احساس کتری سے بچنے کی تعلیم دی ہے۔ لہ

پنے علم چوں شمع باید گداخت کہ بے علم تنواں خدارا شناخت

دو قابل رشک چیزیں

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَىٰ مَلَائِكَةٍ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بَيْنَهَا وَيُعَلِّمُهَا﴾ (متفق علیہ)۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "دو شخصوں کے بارے میں حسد کرنا ٹھیک ہے ایک تو وہ جسے خدا نے مال دیا ہے اور پھر اسے راہِ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ دوسرا وہ شخص جسے خدا نے علم دیا ہے چنانچہ وہ اس علم کے مطابق حکم کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: لا حسد: غیر کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا حسد کہلاتا ہے۔ خواہ اس کو ملے یا نہ ملے۔ مگر اس غیر سے زائل ہو جائے یہ بالاتفاق حرام ہے۔ دوسرا غبطہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ اس طرح کی چیز مجھے بھی مل جائے اور اس کے پاس بھی باقی رہے یعنی نعمت غیر کی تمنا کرے مگر اس غیر سے زوال مقصود نہ ہو۔

بیخوال: شبہ یہ ہے کہ حسد تو شرعاً ناجائز نہیں تو ان دو چیزوں میں اس کی اجازت کیسے دی گئی ہے؟

جواب: اس سوال کے دو جواب ہیں پہلا جواب تو وہی ہے کہ یہاں اس حدیث میں لفظ حسد آیا ہے لیکن یہ غبطہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر حسد سے مراد غبطہ اور رشک ہی تھا تو پھر صرف ان دو

چیزوں میں رشک کی اجازت کا کیا مطلب ہوا؟ رشک جب جائز امر ہے تو پھر وہ ہر چیز میں جائز ہے۔ لہذا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کلام فرض اور تقدیر کے طور پر ہے، کہ حد کسی چیز میں جائز نہیں ہے۔ مگر یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اگر فرض کر لو کہ کسی چیز میں حد جائز ہوتا تو ان دو چیزوں میں ہوتا لیکن حد چونکہ کہیں بھی جائز نہیں تو ان دو میں بھی جائز نہیں۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دو خصلتیں اتنی بڑی ہیں کہ اس میں حد کرنا بھی جائز ہے گویا یہ دو چیزیں حد کے عام قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ لے

تین چیزیں صدقہ جاریہ ہیں

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ أَلَا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ﴾ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ اس سے منقطع ہو جاتا ہے۔ مگر تین چیزوں کے ثواب کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔ ① صدقہ جاریہ۔ ② علم جس سے نفع حاصل کیا جائے۔ ③ صالح اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرتی ہے۔ (مسلم)

توضیح: الا من ثلثة: دنیا دار العمل ہے۔ اور آخرت دار الجزاء ہے۔ انسان جب تک دنیا میں زندگی گزارتا ہے تو اس کا اچھا اور برا عمل جاری رہتا ہے۔ لیکن جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ انسان کے مرجانے کے بعد بھی ان اعمال کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

① اول: صدقہ جاریہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً ایک زمین وقف کرتا ہے یا کوئی کنواں یا تالاب تیار کرتا ہے اور وقف کرتا ہے۔ اب مرنے کے بعد ان چیزوں سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس کا ثواب مرحوم کو پہنچتا ہے۔

② دوم: علم نافع ہے۔ یعنی ایک عالم باعمل کا انتقال ہو گیا زندگی میں وہ مخلوق خدا کو علم دین سے فائدہ پہنچاتا رہا اور ثواب کما رہا جب وفات آئی تو پیچھے علمی ذخیرہ چھوڑ گیا یا تو اپنی تصنیفات سے یا تقریرات و تحریرات سے اور یا قابل قدر شاگردوں کے ذریعے سے یا کتب دینیہ کے وقف کر دینے سے اور یا اپنی اولاد کو علم پڑھا کر علم نافع کا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ دینے سے جس کا فائدہ وفات کے بعد اس کو ملتا رہے گا۔

③ سوم: کوئی شخص خود مر جاتا ہے اور اپنے پیچھے صالح اور نیک اولاد چھوڑ جاتا ہے وہ اپنے مرحوم والدین کے لئے دعائیں کرتے ہیں سبق پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتے ہیں، صدقات دیتے ہیں، یہ سب چیزیں مرنے کے بعد مردے کے لئے باعثِ ثواب ہیں۔ یہاں حدیث میں ”یدعو لہ“ کے الفاظ ہیں بعض علماء کا کہنا ہے کہ نیک اولاد کی نیکی میں والدین کا حصہ ہے۔ خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے۔ لے

اسلامی تعلیمات

﴿۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُزْبَةً مِنْ كُزْبِ الدُّنْيَا نَفَسَ اللَّهُ عَنْهُ كُزْبَةً مِنْ كُزْبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَكْثِرْ عَلَى مُعْسِرٍ يَشَرَّ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ سَعَرَ مُسْلِمًا سَعَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَحِبِّهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَذَكَّرُونَ فِيهِ نُسُوتَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا كُتِبَتْ عَلَيْهِمُ الشَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمْ الرَّحْمَةُ وَخَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ وَمَنْ بَطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُتْرَعْ بِهِ نَسَبُهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص دنیا کی خصلتوں میں سے کسی مسلمان کی کوئی سختی اور تنگی دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن وہاں کی سختیاں اس سے دور کرے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا ہے جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔ اور جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کے راستے کو آسان کر دیتا ہے۔ اور جب کوئی جماعت خدا کے گھر (مسجد یا مدرستہ) میں قرآن شریف پڑھتی اور پڑھاتی ہے تو اس پر خدا کی جانب سے تسکین نازل ہوتی ہے۔ رحمت خداوندی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ اور فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ نیز اللہ پاک اس جماعت کا ذکر ان (فرشتوں) میں کرتا ہے۔ جو اس کے پاس رہتے ہیں۔ اور جس نے عمل میں تاخیر کی تو آخرت میں اس کا نسب کام نہیں آئے گا۔ (مسلم)

توضیح: اس حدیث میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور آفاقی ہدایات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی مصیبت زدہ مسلمان بھائی کی چھوٹی سی مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک بڑی مصیبت اس سے ہٹا دے گا۔ یہاں مومن مسلمان کی خدمت کی بات ہے غیر مسلم کی نہیں۔ لہذا جو لوگ ایمان و اسلام کو نظر انداز کر کے صرف خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں رکھ کر خدمت کرتے ہیں تو وہ اپنی جگہ جیسے بھی ہوں لیکن اس حدیث کے مصداق نہیں ہیں۔

دوسری تعلیم کسی تنگدست کی مدد سے متعلق ہے۔ یعنی کسی نادار کی ضرورت کو دنیا میں پورا کیا مثلاً وہ مقروض ہے تو یا تو قرض معاف کیا یا اس کی ادائیگی کا انتظام کیا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت کی تنگیوں سے اس شخص کو نجات دلانے گا۔

تیسری تعلیم: یہ ہے کہ کسی شریف آدمی سے بشری کمزوری ظاہر ہوگئی اور اس نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کا ڈھنڈورا پیٹو۔ بلکہ اس پر ستر کا پردہ ڈالو تاکہ اس کی زندگی بچ جائے ورنہ وہ ضائع ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ عادی مجرم ہے اور اس کا گناہ متعذر ہے تو اس کا چھپانا جائز نہیں ہے۔

چوتھی تعلیم: یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی مسلمان کی مدد میں لگا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور یہ مدد نصرت مسلسل جاری رہتی ہے۔

پانچویں تعلیم: یہ ہے کہ جو شخص علم دین سیکھنے کے راستے پر چل پڑتا ہے اور حصول تعلیم کے لئے محنت اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔

چھٹی تعلیم: یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کی جماعت کسی مسجد یا مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ میں بیٹھ کر اللہ کی کتاب قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس میں لگی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فرشتے اس کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور ان پر رحمت برسی رہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے ہاں ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

ساتویں تعلیم: یہ ہے کہ جس شخص کو اس کے نیک اعمال نے پیچھے دھکیل دیا یعنی وہ نیک اعمال سے پیچھے رہ گیا تو خاندان اور اونچا حسب نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے: ملہ

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جای کہ درین راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

۱۰ صفحہ ۱۰۱

ریا کاری بُری بلا ہے

﴿۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْطَعُ عَلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أَسْتَشْهَدُ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَتْ فَبِكَ حَتَّى أَسْتَشْهَدُكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِي فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْآنَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَةً فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَتْ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ إِنَّكَ عَالِمٌ وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَةً فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَتْ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ مُجِبٍ أَنْ يَنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَفْفَقْتُ فِيهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ

وَلَكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أَمَرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ۔

(زَوَاكُفُ الْمُنْبِلِ)

میکر جھک کر: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قیامت کے دن پہلا شخص جس پر (خصوصی نیت کو ترک کر دینے کا) حکم لگایا جائے گا وہ ہوگا جسے دنیا میں شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ (میدانِ حشر میں) وہ پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی (دی ہوئی) نعمتیں یاد دلانے کا جو اسے یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں جتنا کر اڑانا فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکرانے میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا: ”میں تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا“۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے کیونکہ تو اس لئے لڑا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے۔ چنانچہ تجھے بہادر کہا گیا۔ (اور تیرا اصل مقصد مخلوق سے حاصل ہوا) اب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچنا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے علم حاصل کیا، دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن مجید کو پڑھا چنانچہ اسے بھی خدا کے حضور میں لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلانے گا، جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا: ”میں نے علم حاصل کیا، اور دوسروں کو سکھایا اور تیرے ہی لئے قرآن مجید پڑھا“۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے علم محض اس لئے حاصل کیا تھا تا کہ تجھے عالم کہا جائے۔ اور قرآن اس لئے پڑھا تھا کہ تا کہ تجھے لوگ قاری کہیں۔ چنانچہ تجھے (عالم قاری) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچنا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے معیشت میں وسعت دی۔ اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا۔ اس کو بھی خدا کے حضور میں لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی عطا کی ہوئی نعمتیں یاد دلانے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا کہ میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں تو خرچ کرنا پسند کرتا ہو۔ اور تیری خوشنودی کے لئے میں نے اس میں خرچ نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے تو نے خرچ اس لئے کیا تا کہ تجھے سخی کہا جائے۔ اور تجھے (سخی) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچنا جائے۔ یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

توضیح: اول الناس: یہاں یہ اشکال ہے کہ اس حدیث میں بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے سب اور فیصلہ اس نمائشی شہید کا ہوگا۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ سب سے پہلے فیصلہ ناحق خون کرنے والے قاتل اور مقتول کا ہوگا۔ تیسری حدیث میں مذکور ہے کہ سب سے پہلے فیصلہ قیامت کے دن نماز کا ہوگا۔ چنانچہ عام مساجد میں پہلے زمانے میں یہ فارسی شعر محراب کے پاس لکھا ہوتا تھا:

روز محشر کہ جان گداز بود اولین پرش نماز بود

اس اشکال اور احادیث کے اس ظاہری تعارض کا جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن معاملات اور حقوق العباد میں سب سے پہلے فیصلہ ناحق خون کا ہوگا۔ اس کی ایک صورت تو ناحق قتل کی ہے اور دوسری صورت ریاکاری اور نمائشی خون کی ہے۔ جیسے اس حدیث میں اس ریاکار شہید کا خون ہے لہذا حقوق العباد میں سب سے پہلے اس قسم کے معاملات کے فیصلے ہوں گے اور حقوق اللہ اور عبادت میں سب سے پہلے فیصلہ نماز کے ہوں گے۔ تو کوئی تعارض نہیں تو حدیث میں "اول الناس" کی جواولیت ہے باعتبار انواع ہے۔ انواع عبادت کے فیصلے الگ ہوں گے۔ اور انواع معاملات کے فیصلے الگ ہوں گے۔

فعرفہ نعمتہ: اس جملہ میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ نعمتوں کا سلسلہ تو غیر متناہی ہے اس کو کیسے یاد دلایا جائے گا؟ جبکہ حدیث میں ہے کہ اس کو عام نعمتیں یاد دلانی جائیں گی اور وہ شخص اس کو یاد کر کے پہچان لے گا۔ اس کا جواب آج کل کے زمانے کی جدت اور جدید آلات نے آسان کر دیا ہے۔ کیونکہ کمپیوٹر سسٹم اور ٹیلی ویژن پر دیگراموں میں اقوال و افعال، حرکات و سکنات مقامات و زمانیات سب کو محفوظ کر کے ضرورت کے مطابق کسی وقت بھی دہرایا جاسکتا ہے۔ تو قادر مطلق بادشاہ کے لئے نعمتوں کا دہرانا کیا مشکل ہے۔

قرأت فیک: یعنی تیری رضا اور خوشنودی کے لئے میں نے قرآن پڑھا اور پڑھایا، علم سیکھا اور سکھایا، اس حدیث میں صرف تین آدمی مراد نہیں بلکہ یہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ اس حدیث سے ہمیں یہ تعلیم ملی کہ کسی بھی عمل کے لئے بنیادی چیز خلوص نیت ہے، اگر نیت خالص نہیں تو بڑے سے بڑا عمل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ مثلاً بدنی قربانی کے میدان میں جان کی قربانی بہت بڑا عمل ہے۔ معرفت الہی کے میدان میں علم سب سے بڑا عمل ہے۔ اور مالی قربانی میں مال خرچ کرنا سب سے بڑا عمل ہے۔ لیکن اگر اخلاص میں نقصان ہو یا بالکل اخلاص نہ ہو، تو اتنے بڑے اعمال بھی رائیگاں جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ریاکاری پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ بہر حال حدیث میں خرابی نیت کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ مگر اس حدیث کو بعض حضرات اخلاص نیت کے لئے اس طور پر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شہید اور شہادت کوئی چیز نہیں، علم اور علماء ریاکاری کا شکار ہیں۔ اس طرح کا بیان بہت ہی خطرناک ہے حالانکہ اخلاص کی ترغیب کے لئے اس حدیث کے علاوہ اور بہت ساری حدیثیں ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ بیان کریں۔

لوگوں سے علم کیسے اٹھتا ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ إِنْ تَزَاعَى يَتَزَوَّعُ مِنَ الْعِبَادِ وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتَّى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا

وضیحت کیا کرتے تھے۔ (ایک روز) ایک شخص نے عرض کیا۔ ”اے ابو عبد الرحمن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمارے درمیان روزانہ وعظ و نصیحت کیا کریں۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ اس سے تم لوگ نکل آ جاؤ گے۔ میں نصیحت کے معاملے میں تمہاری خبر گیری اس طرح ہے کہ تا ہوں جیسا کہ ہماری نصیحت کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اور ہمارے اکتا جانے کا بھی خیال رکھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: حضرت شقیق رضی اللہ عنہ تابعی ہیں انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہر روز نصیحت اور وعظ کہنے کی درخواست کی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ جس سے امت کو یہ تعلیم ملی کہ وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے معاملے میں اعتدال اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہر وقت اور ہر موقع پر وعظ و نصیحت نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے دل اکتا جائیں گے اور وہ دین کی بات کو بوجھ محسوس کرنے لگیں گے۔ اور دین کی بات کو بوجھ محسوس کرنا درحقیقت نفرت کا ذریعہ ہے۔ اور دین کی بات سے نفرت کرنا باعث کفر ہے۔ تو کثرت وعظ یا طوالت وعظ کا انجام کتنا خطرناک ہو گیا اور شد و ہدایت کے بجائے دہش و رحمت بن کر گر رہی کا ذریعہ بن گیا۔

آج کل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے اور مسلسل وعظ و نصیحت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ درس و تدریس کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اس میں تسلسل مستند اور منقول ہے۔ جمعرات کا دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن کی عظمت اور قرب کی وجہ سے منتخب کیا تھا۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتَّى تُفْهَمَ عَنْهُ وَإِذَا أَلَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا. (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات کہتے تو اس کو تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیتے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کے پاس آتے اور سلام کرنے کا ارادہ فرماتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ (بخاری)

توضیح: اعادھا ثلاثا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر بات کو تین مرتبہ نہیں دہراتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار بات دہرانے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب آپ کو سننے والوں کے نہ سمجھنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

حدیث کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہم اور ضروری علمی بات کو آپ تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ اول بار ذہن آدمی سمجھ لے دوسری بار متوسط ذہن کا آدمی سمجھ لے اور تیسری بار غبی آدمی بھی سمجھ لے۔ آپ ہر بات نہیں دہراتے تھے۔ حدیث میں قرینہ بھی موجود ہے۔ کہ لوگ آپ کی بات سمجھ سکیں۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہر بات نہیں دہرائی جاتی تھی۔ سلم علیہم ثلاثا: یعنی جب آپ جمع میں آ کر سلام کرتے تو تین بار سلام کرتے تھے۔ یہ عادت شریفہ اس وقت ہوتی تھی جب جمع کثیر ہوتا تھا۔ تو پہلا سلام آپ کی آمد پر تھا، دوسرا سلام جمع کی جانب یحییٰ اور تیسرا سلام جانب یسار میں ہوتا۔

یابیوں مطلب ہے کہ مجمع کے پہلے حصے میں پہلا سلام اور بیچ کے حصے میں دوسرا سلام اور مقام مقصود پر پہنچنے کے بعد یا رخصت کے وقت تیسرا سلام ہوتا تھا۔ یہ آج کل بھی ہوتا ہے حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ہی جگہ پر تین بار سلام دہراتے تھے۔ لہ

نیکی کی رہنمائی بھی نیکی ہے

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ إِنَّهُ أُبْدِيَ لِي فَأَخْبَلَنِي فَقَالَ مَا عِنْدِي فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَمَا أَذْلُهُ عَلَى مَنْ يَحْمِلُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ. (رواه مسلم)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری سواری چلنے سے عاجز ہو گئی ہے۔ آپ مجھے سواری عنایت فرمادیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے (کہ تمہیں دے دوں)“ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں ایسا شخص بتلاتا ہوں جو اسے سواری دے دے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بھلائی کی طرف رہنمائی کرے تو اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو۔ (مسلم)

توضیح: ابداع بی: یہ لفظ ابداع سے ماخوذ ہے بدیع نئے اور انوکھے کام کو کہتے ہیں۔ یعنی میرے ساتھ عجیب کھیل ہو گیا عجیب نئی بات ہو گئی، عربی محاورہ میں یہ لفظ اونٹ وغیرہ سواری کے راستے میں عاجز آنے اور تھک کر چلنے سے رک جانے کو کہتے ہیں۔ یہ حدیث ”الدال علی الخیر کفا عله“ کی طرح ہے۔

فقراء کے لئے چندے کی اپیل

﴿۱۷﴾ وَعَنْ جَرِيرٍ قَالَ كُنَّا فِي صَنْدِ الثَّهَارِ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَجَاءَ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَنِبِي الرِّمَارِ أَوْ الْعِمَاءُ مُتَقَلِّدِي السُّيُوفِ غَامَتُهُمْ مِنْ مُضَرٍّ بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرٍّ فَتَمَعَّرَ وَجْهَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَأَى بِهِمْ مِنَ الْفَقَاةِ فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَأَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ وَأَقَامَ فَصَلَّى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ إِلَى آخِرِ الْآيَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا وَالْآيَةُ الَّتِي فِي الْحَدِيدِ اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ تَصَدَّقْ رَجُلٌ مِنْ دِينَارٍ مِنْ دَرَاهِمٍ مِنْ ثَوْبٍ مِنْ صَاعٍ بُزَّةٍ مِنْ صَاعٍ ثَمَرَةٍ حَتَّى قَالَ وَلَوْ بِشِقِّ ثَمَرَةٍ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ

مِنَ الْأَنْصَارِ بِضَرْبَةٍ كَانَتْ كَقُفَّةٍ تَعْبَرُ عَنْهَا بَلْ قَدْ عَجَزْتُ ثُمَّ تَكَابَعَ النَّاسُ حَتَّى رَأَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ
كُلِّ عَامٍ وَثِيَّابٍ حَتَّى رَأَيْتُ وَجْهَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَأَنَّهُ مُذْهَبَةٌ فَقَالَ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَنٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةٌ حَسَنَةٌ فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا
مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَجُورِهِمْ شَيْءٌ وَمِنْ سَنٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةٌ سَيِّئَةٌ كَانَ عَلَيْهِ
وَزْرُهَا وَوَزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَجُورِهِمْ شَيْءٌ (رواهُ الترمذی)

ترجمہ: حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم دن کے ابتدائی حصے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں
حاضر تھے کہ ایک قوم آپ ﷺ کی خدمت میں آئی جو ننگے بدن تھی اور عبا یا کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اور گلے میں تلواریں لٹکی ہوئی
تھیں۔ ان میں سے اکثر بلکہ سب کے سب قبیلہ مضر کے لوگ تھے۔ ان پر فاقہ کا اثر دیکھ کر آپ ﷺ کا چہرہ مبارک تغیر ہو گیا۔
آپ ﷺ (ان کے لئے کھانے کی تلاش میں) گھر تشریف لے گئے اور (جب گھر میں کچھ نہ ملا تو) واپس تشریف لائے اور
حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو (اذان کہنے کا حکم) دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور تکبیر پڑھی اور (جمعہ کی یا غمہ کی) نماز پڑھی گئی۔
پھر آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیا۔ اور یہ آیت پڑھی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ الْآيَةِ. ترجمہ: ”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو
جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا ہے۔“ پوری آیت تلاوت کی جس کا آخری حصہ یہ ہے۔ ”البتہ اللہ تمہارا نگہبان
ہے۔“ اور پھر یہ آیت آپ ﷺ نے پڑھی جو سورہ حشر میں ہے: وَلَتَنْظُرَ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ الْآيَةِ. ترجمہ: اے
ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کر کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بچھا ہے۔ پھر آپ ﷺ
نے فرمایا ”خیرات کرے آدمی اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑے میں سے، اپنے گہیوں کے پیانے میں
سے“ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”خیرات کرے اگرچہ کھجور کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔“

راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری شخص (دینار یا درہم سے بھری ہوئی چٹلی) لایا جس کے وزن سے اس کا ہاتھ جھکنے کے قریب تھا، بلکہ
تھک گیا تھا پھر تو لوگوں نے بے درپے چیزوں کا لانا شروع کر دیا یہاں تک کہ میں نے دو دوے غلہ اور کپڑے کے (جمع شدہ)
دیکھے پھر میں نے دیکھا کہ آنحضرت کا چہرہ اقدس (خوشی کی وجہ سے) کندھن کی طرح چمک رہا تھا پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا
”جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقہ کو رائج کرے تو اسے اس کا بھی ثواب ملے گا اور اس کا ثواب بھی جو کوئی اس کے بعد اس پر عمل
کرے۔ لیکن عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو رائج کیا تو اسے
اس کا بھی گناہ ہوگا۔ اور اس شخص کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا۔ لیکن عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔“

(مسلم)

توضیح: قوم عرۃ: یعنی ایک قوم کے لوگ آئے اور وہ لوگ بدن سے ننگے تھے یعنی کپڑا کم تھا۔ پورے جسم کے لئے کپڑا پورا نہ تھا۔ وہ کپڑا دنی بھی تھا اور پھٹا ہوا بھی تھا۔

عجائبی النہار: اجتیباب کپڑا پسینے کے معنی میں ہے۔ اور نماد نمر سے ہے یہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سفید دھاریاں ہوں۔ اور جواون اور بکری کے بالوں سے ملا کر بنایا گیا ہو۔ یہ لوگ بنو مضر کے تھے۔ جو پہلے کافر تھے اور قبیلہ عبدالقیس کے دشمن تھے۔ یہ مجاہدین کپڑے تو نہیں رکھتے تھے، مگر جہاد کے لئے تلواریں لٹکائے رکھتے تھے۔ جس سے آج کے مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ جو اسلحہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور دنیا کے قیثش سے محبت کرتے ہیں۔

فتیمہ: چہرہ کے تغیر کو کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کو ان کے فاقوں سے دکھ ہوا۔

تصدق: یہ ماضی کا صیغہ ہے جو خبر ہے مگر یہاں انشاء کے معنی میں آیا ہے یعنی ہر آدمی سے جو کچھ ہو سکے وہ صدقہ کرے۔ علامہ ابن انباری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں تصدق میں لام امر مخذوف ہے۔ اصل میں لی تصدق تھا۔ لہذا یہ امر غائب کا صیغہ ہوا۔ یعنی ہر آدمی کو صدقہ کرنا چاہیے۔

رجل: نکرہ مفردہ ہے جو جمع کے مقام پر آیا ہے۔ "ای لی تصدق کل احد من درہمہ من دینارۃ۔" صرۃ: تھیلی کو کہتے ہیں چونکہ اس وقت درہم و دینار سکہ کی صورت میں ہوتے تھے اس لئے تھیلی اٹھانا اس شخص کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

کو ملین: کوہر ڈھیر کو کہتے ہیں چونکہ غلہ اور کپڑوں کے ڈھیر بن جاتے ہیں اس لئے یہاں تو دے اور ڈھیر کا ذکر آ گیا ہے۔ اور درہم و دینار کے ڈھیر عادتاً نہیں ہوتے ہیں اس لئے اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔

برائی کی بنیاد رکھنا بھی برائی ہے

﴿۱۴﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْتُلْ نَفْسًا ظَلَمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آخَرِ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دِمَائِهِ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَقَى الْقَتْلَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. سَنَدٌ كَوْنٌ حَدِيثٌ مُعَاوَنَةٌ لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّمِي فِي بَابِ ثَوَابِ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى. ۛ

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص ظلم کے طریقے پر قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قاتل) پر ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری: مسلم) اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس کی ابتدا یہ ہے "لا يزال طائفة من امةي" ہم انشاء اللہ باب "ثواب هذه الامة" میں بیان کریں گے، (مگر حضرت بھول گئے)۔

الفصل الثانی

علماء اور طلباء کے فضائل

۱۵۰ عَنْ كَثِيرِ بْنِ قَنَسٍ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي النَّدَّاءِ فِي مَسْجِدِ دِمَشْقَ لَمَّا فَارَ جُلٌّ فَقَالَ يَا أَبَا النَّدَّاءِ إِنِّي جِئْتُكَ مِنْ مَدِينَةِ الرَّسُولِ ﷺ لِيُخْبِرَنِي بِلَغْيِي أَنْتَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتُكَ بِحَاجَةٍ قَالَ قُلْ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَتَطَلَّبُ فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا مِنْ طَرِيقِ الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَتَّخِذُ أَجْزَعَتَهَا رِطًى لِيَطْلُبَ الْعِلْمَ. وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالْجِبَتَانِ فِي جُوفِ الْمَاءِ وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَقَّةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُولَدُوا دِينًا زَاوِلًا وَلَا ذَرْبًا وَأَتَمُّهَا وَأَزْكَا الْعِلْمُ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَقٍّ وَافِرٍ.

(رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والبیہقی وابن خلیون)

ترجمہ: حضرت کثیر ابن قنس سے روایت ہے کہ میں (ایک صحابی) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق (شام) کی ایک مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے شہر سے آپ کے پاس ایک حدیث کے لئے آیا ہوں جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسے آپ سرکارِ دو عالم ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ کے پاس میرے آنے کی اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”جو شخص کسی راستے کو (خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر) علمِ دین حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہشت کے راستے پر چلاتا ہے۔ اور فرشتے طالبِ علم کی رضامندی کے لئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں۔ اور عالم کے لئے ہر وہ چیزِ بڑا آسمانوں کے اندر ہے (یعنی فرشتے) اور جو زمین کے اوپر ہے (یعنی جن و انس) اور پھیلیاں جو پانی کے اندر ہیں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ اور عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے کہ چودہویں کا چاند تمام ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ اور عالمِ انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء وراثت میں دینار و درہم نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا ورثہ علم ہے۔ لہذا جس نے علم حاصل کیا اس نے کامل حصہ پایا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی اور ترمذی نے راوی کا نام قنس ابن کثیر ذکر کیا ہے۔ لیکن صحیح کثیر بن قنس ہی ہے۔) جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے۔

توضیح: فی مسجد دمشق: دمشق صحابہ کرام کا مرکز تھا۔ اور دین کے سپاہیوں کی گزرگاہ اور فوجیوں کی بندرگاہ تھا۔ یہیں سے صحابہ کرام گزر کر افریقہ میں جا کر جہاد کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرہ امتیاز تھا کہ وہ علم اور طلبِ علم کے

لئے ہر قسم کی مشقتیں اٹھایا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک صحابی کا یہ سفر ہے۔ شوق اور ذوق کو دیکھو کہ مدینہ منورہ سے شام تک تقریباً آٹھ سو کلومیٹر کا سفر صرف ایک حدیث کے لئے کیا۔ دوسرا کوئی مقصد نہ تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ صحابی سواری سے نیچے بھی نہیں اترے تاکہ علم کا یہ سفر خالص علم کے لئے ہو جائے۔ سبحان اللہ! خلوص نیت کا کیا مقام تھا۔

انک تحدیثہ: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجملہ ان کو حدیث معلوم تھی۔ تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے یہ سفر کیا۔ یا واسطہ سے حدیث معلوم تھی اور انہوں نے چاہا کہ خود ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے سن کر علو سند بھی حاصل کر لیں اور سند کا واسطہ بھی ختم ہو جائے۔ کیونکہ "الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء"۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کا شوق علم دیکھ کر ان کو یہ حدیث بطور خوشخبری سنائی تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ اور ان کی مطلوبہ حدیث شاید کوئی اور تھی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جس حدیث کے سننے کے لئے یہ صحابی دمشق کے طویل سفر پر گئے تھے، یہ وہی حدیث ہو اگر ایسا ہو تو یہ عجیب اتفاق ہوگا کہ حدیث بھی ملی اور مناسب حال بشارت بھی ملی "وہذا هو اعجب واغرب والاول هو اقرب"۔ (ماہی تری رحمۃ اللہ علیہ)

یطلب فیہ علماً: ای علم الدین لوجہ اللہ لا لاجل الدنیا۔ ۳

لتضع: بطور اعزاز و اکرام اور بطور تواضع فرشتے پر بچھاتے ہیں جس طرح بادشاہ کے اعزاز کے لئے اس کی گاڑی کے سامنے کئی میل تک قالین بچھائے جاتے ہیں جس پر ان کی گاڑی گزرتی ہے۔

علامہ حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی استعجاب نہیں کہ یہ کلام حقیقت پر محمول ہو جائے اور ہم کو اس کا مشاہدہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی خائب علم نے اپنے پاؤں کو زور سے زمین پر مارا کہ فرشتے کے پر کہاں ہیں کہ میں انہیں کچل دوں تو اس کے پیر شل ہو گئے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حدیث مجاز پر محمول ہو، یعنی فرشتے تواضع اور انکساری کرتے ہیں۔ یعنی پر بچھانا طلب علم پر نزول رحمت الہی سے کنایہ ہو۔ ۴

یستغفر لہ من فی السبوات: میں فرشتے اور ارواح مومنین داخل ہیں۔ یہ مغفرت جنس علماء کے لئے مانگی جاتی ہے۔

سَبَوَات: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشیاء مثلاً حشرات الارض بھائم اور حیوان فی البحر اور چوہنیاں وغیرہ غیر ذی عقل ہیں تو ان کو علماء کا کیا علم ہو گیا کہ ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نیز وہ علماء کے لئے استغفار اور دعا کی یہ مشقت اور زحمت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: سوال کی پہلی شق کا جواب تو یہ ہے کہ جن اشیاء کو وجود بخشا گیا ہے ان کو وجود کے ساتھ ساتھ محدود پیمانے پر کچھ علم بھی دیا گیا ہے۔ جس طرح پتھروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔

جانوروں اور حیوانات کو اپنے خالق اور مالک کا علم ہوتا ہے۔ نیز ان کو موت اور قیامت کا ایسا ہی علم بھی ہے۔ ان کے ایسا ہی علم میں یہ بھی ہے کہ ان کی بقاء اور کائنات کی بقاء دین کی بقاء سے وابستہ ہے۔ اور دین اسلام کی بقاء علم اور علماء کی بقاء سے وابستہ ہے۔ اگر دین نہیں رہا تو وجود کائنات بھی نہیں رہے گا۔

اس لئے ہر چہ ندر پرند علماء کی بقاء کی دعا مانگتے ہیں۔ تاکہ ان کا اپنا وجود اور عالم کائنات کا وجود محفوظ رہے۔ عالم باللہ اور عالم بامر اللہ کے لئے یہ دعائیں ہوتی ہیں۔

علماء کی تین قسمیں:

① عالم بامر اللہ ② عالم باللہ ③ عالم بامر اللہ

اول قسم وہ ہے کہ جو مسائل میں بہت ماہر ہے لیکن مظہر جلال و جمال رب العالمین نہیں بنا ہے۔

دوم وہ ہے کہ احکام فرضیہ کو جانتا ہے مگر احکام کے مصادر و مناشی کو نہیں جانتا ہاں مظہر جلال و جمال رب العالمین بنا ہے۔

سوم وہ کہ ماہر احکام بھی ہے و احکام کے مصادر و مناشی کو بھی جانتا ہے۔ اور مظہر جلال و جمال رب العالمین بھی بنا ہے۔

اول قسم کے عالم سے صرف مسائل پوچھے جائیں ان کی مجلس میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔

قسم دوم سے مسائل نہیں پوچھنے چاہئیں ہاں ان کی مجلس میں ضرور بیٹھنا چاہئے۔

اور قسم سوم کبریت امر ہے۔ ان سے مسائل بھی پوچھے جائیں اور ان کی مجلس میں بھی بیٹھنا چاہئے۔ کائنات کے حشرات و حیوانات انہی قسم سوم کے علماء کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

وان فضل العالم: یعنی جن کو احکام کے مناشی و مآخذ کا علم بھی ہو اور ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہوں۔

کفضل اللہ: یہ عجیب تشبیہ ہے کیونکہ چاند کی روشنی سے جس طرح جہان منور ہوتا ہے تو اسی طرح عالم کے علم سے جہان روشن ہوتا ہے۔ جس طرح چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے حاصل اور مستفاد ہے۔ اسی طرح علماء کے علم کی روشنی علم نبوت کی روشنی سے مستفاد ہے۔

عوام کی مثال ستاروں کی سی ہے علماء چاند جیسے ہیں اور رسالت مآب ﷺ سورج جیسے ہیں جیسے چاند کے سامنے ستارے بے نور سے لگتے ہیں اور سورج کی موجودگی میں چاند چھپ جاتا ہے ایسے ہی علماء کی موجودگی میں عوام کا علم کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور رسول اللہ ﷺ کے علم کے سامنے علماء کے علم کی کوئی حیثیت نہیں۔

وان العلماء ورثة الانبیاء: وارث وہ ہوتا ہے جو مورث کے تمام اموال اور جائیداد میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک چیز میں حصہ دار ہے تو وہ وارث نہیں بلکہ قرض خواہ اور دائن ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ کے وارث وہ علماء ہوں گے جو آپ ﷺ کے اخلاقیات، آپ ﷺ کے معاملات، آپ ﷺ کے علوم و امانات و دیانات و معاشیات و معاشرات کے جامع ہوں گے۔ آپ ﷺ کی دعوت و جہاد اور آپ ﷺ کی عبادات و ریاضات کے امین ہوں

گئے۔ صرف ایک شعبہ کے پیچھے پڑنے والا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ علماء سے یہاں مراد عالم بامر اللہ اور عالم باللہ ہیں۔ لے

لہ یورثوا دیعارا: اس جملے سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام نے مادی میراث نہیں چھوڑی ہے بلکہ روحانی میراث یعنی علم کو چھوڑا ہے۔ تو روافض اپنے اس قول میں غلطی پر ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث نہیں دی گئی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری میراث نہیں ہے گی۔ "ما تو کناہ فہو صدقہ" جو ہم نے چھوڑا وہ سب مسلمانوں پر صدقہ ہے تو میراث کہاں سے آئی؟ چلو فرض کرو کہ میراث تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں تقسیم کیوں نہ کی؟ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے تقسیم کیوں نہ کی؟ اور فدک کا باغ واپس کیوں نہ لیا؟ لے

عابد پر عالم کی فضیلت

۱۶۱ ﴿وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ دُرَيْرُ بْنُ سُوَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ عَلِيٍّ أَذْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّهُ الثَّمَلَةُ فِي بَحْرِهَا وَحَتَّى الْخُفَاتُ لَيَصَلُّونَ عَلَى مُعَلِّمِ الثَّانِي الْحَيْزَرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ مَكْحُولٍ مُرْسَلًا وَلَهُ يَذْكُرُ رَجُلَانِ وَقَالَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ عَلِيٍّ أَذْنَاكُمْ ثُمَّ ثَلَا هَذِهِ الْآيَةَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ وَتَرَدَّ الْحَدِيثُ إِلَى آخِرِهِ ۝

ترجمہ: حضرت ابی امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جس میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم تھا۔ (یعنی آپ سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ میری فضیلت اس شخص پر جو تم میں سے ادنیٰ درجے کا ہو"۔ پھر اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات یہاں تک کہ حیوانیاں اپنے بلوں میں اور پھلیاں اس شخص کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی (یعنی علم دین) سکھاتا ہے"۔ ترمذی اور دارمی نے اس روایت کو مکحول سے مرسل طریقہ پر نقل کیا ہے جس میں لفظ رجُلان کا ذکر نہیں ہے۔ اور کہا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "عابد کو عالم پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی مجھے تمہارے ادنیٰ آدمی پر ہے"۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ ترجمہ: "خدا کے بندوں میں علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں"۔ اور پھر پوری حدیث آخر تک اسی طرح بیان کی ہے۔

توضیح: کفَضلی علی ادناکم: اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں مکمل تشریح آگئی ہے یہ حدیث بھی

اسی طرح ہے صرف یہ مذکورہ جملہ الگ انداز سے ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ یہ نسبت غیر متناہی نسبت ہے کیونکہ کائنات میں نبی کا درجہ اور جب اس مقام تک بلند ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے ادنیٰ (امتی) اور اپنے بلند رہے کے تقادوت سے عالم اور عابد کی تشبیہی ہے۔ لہذا جس طرح حدیث کی تشبیہ میں نسبت غیر متناہی ہے اسی طرح عالم اور غیر عالم عابد کی نسبت بھی غیر متناہی ہے۔ تو جس طرح آنحضرت ﷺ کی فضیلت کا اندازہ ایک ادنیٰ امتی کے مقابلے میں نہیں لگایا جاسکتا اسی طرح ایک عالم کی فضیلت کا اندازہ ایک غیر عالم کے مقابلے میں نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

دینی مدارس کے طلباء مہمانانِ رسول ہیں

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ النَّاسَ لَكُمُ تَبِعٌ وَإِنْ رَجَلًا يَأْتُونَكُمُ مِنَ الْأَرْضِ يَتَفَقَّهُونَ فِي الدِّينِ فَإِذَا آتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا۔

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لوگ تمہارے یعنی صحابہ کے تابع ہیں اور بہت سے لوگ علمِ دین سمجھنے کے لئے اطرافِ عالم سے تمہارے پاس آئیں گے۔ لہذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔“ (ترمذی)

توضیح: ان الناس لکم تبع: یعنی دین میں تمہارے تابع ہیں۔ تم لوگ اپنے آنے والے لوگوں کے لئے متبوع ہو، وہ تمہارے نقش قدم پر چلیں گے اور تمہارے زمانے میں تمہارے پاس آکر وہ تم سے علم سیکھیں گے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوگئی کہ صحابہ کرام آنے والی امت کے لئے معیارِ حق ہیں۔ مودودی صاحب نے اس بات میں امت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔

فاستوصوا: اس جملے کا ایک مطلب یہ ہے کہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں تم ان کے بارے میں میری وصیت قبول کر لو اور ان کی بھلائی کرو، دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جب تمہارے سامنے آئیں تو ان کو خیر و بھلائی کی وصیت کرتے جاؤ اس میں کوتاہی نہ کرو، ان کی اچھی تربیت کرو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دینی مدارس کے طلباء حضور اکرم ﷺ کے مہمان ہیں، لہذا ان کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، الحمد للہ حدیث کا یہ نقشہ دینی مدارس میں آج بھی موجود ہے۔

علمی نکتہ متاعِ گمشدہ ہے

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْكَلِمَةُ الْحَكِيمَةُ مَنَالَةُ الْحَكِيمِمْ لَحِيفٌ وَجَدَهَا فَهَوَّ أَحَقُّ بِهَا۔

(رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الراوی يَتَعَلَّقُ فِي الْحَدِيثِ)

﴿تَفْهِيْمٌ﴾: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”(دین میں) فائدہ دینے والی بات دانش مند کا مطلوب ہے لہذا وہ جہاں بھی اسے پائے وہ اس کا مستحق ہے۔ (ترمذی و ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث میں ایک راوی ابراہیم بن فضل ہیں جن کو (روایت حدیث میں) ضعیف خیال کیا جاتا ہے۔

توضیح: الکلمۃ الحکمة: حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد فقاہت ہے دانائی کی بات ہے علمی نکتہ اور علمی مسئلہ ہے۔

فحیث وجدھا: یعنی جہاں بھی ملے تو یہ شخص زیادہ مستحق ہے کہ اس کو قبول کر لے کیونکہ پہلے وہ نااہل کے پاس تھا اب اہل کو مل گیا تو قدر کر کے لے لے یا مطلب یہ ہے کہ دین کی بات ہے عمل کے لئے نیک اور مومن شخص جس کسی سے بھی اچھی بات سن لے اسے قبول کر کے عمل کرے، انظروا الی ما قیل ولا تنظروا الی من قال۔ یہ نہ سوچے کہ یہ بات تو میں نے ایک کم تر آدمی سے سنی ہے اس پر کیا عمل کروں گا؟ کسی بزرگ سے سن لیتا تو عمل کر لیتا۔ شیخ سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حقیقت کو ظاہر کیا ہے:

مرد باید کہ گیرد اندر گوش مگر نوشت است پند بر دیوار

نظار است آنچه مدعی گوید خفته را خفته کے کند بیدار

یعنی آدمی کو چاہئے کہ وہ نصیحت کو قبول کرے خواہ وہ دیوار پر لکھی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔ مدعی غلط کہتا ہے کہ سویا ہوا آدمی سوئے ہوئے کو کیسے جگا سکتا ہے۔ (دیکھو دیوار کی نصیحت سے فائدہ ہوا، خلاصہ یہ کہ علمی نکتہ مومن کا متاع گمشدہ ہے)

ایک عالم ایک ہزار عابدوں پر بھاری ہے

﴿۱۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

﴿تَفْهِيْمٌ﴾: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ایک فقیہ (یعنی عالم دین) شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔“ (ترمذی و ابن ماجہ)

توضیح: فقیہ واحد: یعنی وہ عالم جو احکام اور مناشی احکام کو بھی جانتا ہو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ ہو۔ فقاہت سے مراد دین اسلام کی سمجھ بوجھ ہے۔ خواہ وہ جہاں بھی ہو اور جس شعبہ میں ہو۔ عابد سے مراد وہ عابد ہے جو فرائض کو جانتا ہے۔ مگر احکام کے مناشی کو نہیں جانتا ہے۔ عابد سے مراد نرا جاہل عابد نہیں کیونکہ وہ تو خطرناک ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے:

فساد کبیر عالم متہتک و اکبر منه جاہل متنسک

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ خود ابلیس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رات کے وقت آیا اور فضا کو رنگ برنگے قشموں سے روشن کر کے کہا کہ میں فرشتہ ہوں اور اللہ نے مجھے بھیجا ہے کہ عبد القادر نے بہت عبادت کی ہے اور اب وہ معاف ہے اسے مزید اور عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جاؤ مردود شیطان اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موت تک عبادت کا پابند بنایا تو میں کون ہوں جو معاف ہو گیا۔ ابلیس نے کہا کہ ابھی چالیس پیروں کو میں نے اسی طرح سے گمراہ کیا ہے مگر آپ کے پاس بڑا علم تھا علم نے بچا لیا۔

شیخ نے کہا کہ جاؤ مردود علم سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے بچ گیا ہوں۔ شیخ سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا:

صاحب دلی بدر سے آمد ز خانقاہ بشکست مد عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عابد و عالم چه فرق بود کہ تو کردی اختیار از ایں فریق را
گفت آں حکیم خویش بروں می بروز موج و ایں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

میں نے کہا: ایک عارف خانقاہ کو چھوڑ کر بدر سے آیا اور تصوف کے قدیم طور و طریق کو اس نے توڑ دیا میں نے ان سے پوچھا کہ عالم اور عابد میں کیا فرق تھا کہ تم نے صوفیوں کو چھوڑ کر علماء کی رفاقت کو اختیار کیا ہے اس نے کہا کہ صوفی لوگ سمندری موجوں میں صرف اپنی چادر بچاتے ہیں اور علماء محنت کر کے ڈوبنے والے کو بچاتے ہیں۔

نالائق کو علم سکھانا علم کی توہین ہے

﴿۲۰﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمَقْلِدٍ الْخَتَائِرِ الْجَوْهَرِ وَاللُّؤْلُؤِ وَالذَّهَبِ. (رواه ابن ماجه، وروى الترمذی فی شعب الایمان إلی قولہ مسلیم، وقال هذا عید من مئة مئة وروى قاسم بن سلام في حديثه، وقد روى من أوجع كل لها ضيقة) ۱

میں نے کہا: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور نالائق کو علم سکھانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سوار کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار ڈال دے (ابن ماجہ) اور ترمذی نے اس روایت کو شعب الایمان میں لفظ ”مسلم“ تک نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے اور اسناد ضعیف ہے اور یہ حدیث مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جو سب ضعیف ہیں۔

توضیح: طلب العلم فریضۃ: علوم ضروریہ تو ہر مسلمان پر فرض ہیں یعنی ہر عاقل بالغ مسلمان مرد و زن پر حالتِ راہنہ کی حد تک علم فرض ہے۔ حالتِ راہنہ کا مطلب یہ ہے کہ جس حالت میں بھی مسلمان ہے اس حالت کے جائز یا ناجائز ہونے کی حد تک علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ مناشی اور مصادر اور آخذ کا معلوم کرنا فرض کفایہ ہے کہ

علاقہ میں اس قسم کے جید عالم کا موجود ہونا فرض کفایہ ہے ورنہ سب کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔ لہ
غیر اہلہ: نا اہل لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو طالب دینار اور اہل اہواء و اہل بدعت ہیں یا نا اہل سے مراد وہ نالائق
طالب علم ہیں جن میں علم دین کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ تو ان کے سامنے علم کو پیش کرنا علم کی ناقدری ہے جیسا کہ خنزیر
کے گلے میں پھولوں کا ہار یا جواہرات اور موتیوں کا یا سونے کا ہار ڈال دیا جائے۔ لہ

اس حدیث میں علم سے مراد علم دین ہے۔ جو مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو قرآن وحدیث کا علم ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ
نے سکول و کالج کے علوم وفنون کی ترغیب نہیں دی ہے اور نہ یہ علوم وفنون اس وقت دنیا میں موجود تھے، جو لوگ اس قسم کی
احادیث کو سکول و کالج کی جدید انگریزی تعلیمات کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ دین اسلام میں تحریف کرتے
ہیں۔ ان کو خدا کا خوف کرنا چاہئے۔

ممالک اسلامیہ میں جتنے اسکول و کالج ہیں یہ یہود و نصاریٰ کے نظریاتی مدد سے ہیں۔ جس طرح مسلمان اور علماء کرام دینی
مدارس کی حفاظت ضروری سمجھتے ہیں یہود و نصاریٰ پوری دنیا میں اپنے ان کالجوں یونیورسٹیوں اور مشن سکولوں کی حفاظت
ضروری سمجھتے ہیں۔

افسوس! اس پر ہے کہ انگریزی تعلیمات کے لئے مسلمانوں کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات پر تمام
دروازے بند ہیں۔

کہ قلد الخذازیو: اس جملہ میں نالائق شخص اور بے ادب طالب علم کو علم سکھانے کی مثال بتائی گئی ہے کہ تالائق اور بے
ادب کو علم سکھانا ایسا ہے جس طرح کوئی شخص سونے چاندی کے ہار اور موتی جواہرات کو خنزیر کے گلے میں لٹکا دے جس طرح
خنزیر ایک نالائق اور مبغض و منحوس حیوان ہے اس کو جواہرات کا ہار پہنا دینا جواہرات کی توہین ہے۔ اسی طرح بے ادب
گستاخ کو علم سکھانا علم کی توہین ہے۔ کیونکہ دین ادب واحترام کا نام ہے۔ عارفین کا کلام ہے کہ: "الدین کلہ ادب"۔
اس سلسلہ میں شعراء کے چند اشعار لکھنا بھی مناسب ہے۔ لہ

قال الشاعر:

فَمَا عَجَبًا لِمَنْ رَكِبَتْ طِفْلًا أَلْقِيَهُ بِأَطْرَافِ الْهَيْتَانِ

ہائے تعجب ہے اس شخص پر جس کو میں نے اس طرح بچہ پالا کہ اپنی انگلیوں سے اس کے منہ میں لقمہ دیا کرتا تھا۔

أَعْلَمُهُ الْمَرْوَةَ كُلَّ يَوْمٍ فَلَمَّا ظَرَ شَارِبُهُ جَفَانِي

میں ہر روز اس کو انسانی مروت سکھایا کرتا تھا مگر جب اس کی مونچھیں نکل آئیں تو اس نے میرے ہی ساتھ بے مروتی کی۔

أَعْلَمُهُ الرِّمَاطَةَ كُلَّ يَوْمٍ فَلَمَّا اشْتَدَّ سَاعِدُهُ زَمَانِي

میں ہر روز اس کو تیر اندازی سکھایا کرتا تھا مگر جب اس کے بازو مضبوط ہو گئے تو اس نے مجھے ہی تیر مارا۔

أَعْلَمُهُ الْقَوَائِي كُلُّ يَوْمٍ فَلَمَّا قَالَ قَائِيَّةٌ هَجَائِي

میں ہر روز اس کو شاعری سکھایا کرتا تھا مگر جب اس نے پہلا شعر پڑھا تو میری ہی مذمت کی۔

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم غشت از فضل رب

میں اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق مانگتا ہوں کیونکہ بے ادب اللہ کی رحمت سے محروم رہتا ہے۔

چوں خدا خواهد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنہ پا کاں برد

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کا پردہ پاک کرنا چاہتا ہے تو اس کو نیک لوگوں پر طعن کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

ہر چہ گیرد غلطی علت شود کفر گیرد کالے ملت شود

جو شخص دوسروں میں عیب ڈھونڈتا ہے وہ خود عیب دار بن جاتا ہے مگر کامل شخص کی بظاہر غلطی بھی ملت بن جاتی ہے۔

کار پا کاں بر قیاس خود مکبر در نوشتن گرچہ یکساں شیر دشیر

نیک لوگوں کا کام اپنے کام پر قیاس نہ کروا کرچہ لکھنے میں شیر جو درندہ ہے اور شیر جو دودھ ہے ایک جیسا ہے۔

کس نیا سوخت علم غیر از من کہ مرا عاقبت نشاند نہ کرد

کسی بھی شخص نے مجھ سے تیرا انداز ہی نہیں سیکھی کہ جس نے آخر میں مجھے نشانہ نہ بنایا ہو۔

بشد یا شیر از یا چندے مدہ کم ذات را کم ذات چوں ملا شود دشنام داد استاد را

اے سعدی شیر از ہی ابد ذات شخص کو علم نہ سکھاؤ کیونکہ بد ذات جب عالم بن جائے گا تو اپنے استاد کو گالی دے گا۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

بھیڑ یا کچھ آخر میں بھیڑیا بن جاتا ہے اگرچہ وہ انسان کے ساتھ بزرگ بن جائے۔

چوں بشنوی سخن اہل دل گو کہ خطا است سخن شناس نہ بیے دلبرا خطا ای جا است

جب عارفین کے کلام کو سن لو تو اس کو غلط نہ کہو میری جان! غلطی اس میں ہے کہ تم اللہ والوں کی بات سمجھتے نہیں ہو۔

ہزار کشتہ باریک تر زمو این جا است نہ ہر کہ سر ہتر شد قلندر داند

قلندر بننے کے لئے یہاں ہزار سے زیادہ باریک ہزاروں نکات ہیں صرف سر منڈانے سے کوئی شخص قلندر نہیں بنتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تو اس تا فتن کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر مقام پر گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا ہے کہ کیونکہ بہت سارے مقامات ایسے ہیں جہاں ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔

اصل مرغ سمجھتے بھی ہیں اور ہیں خاموش سنو گے پھٹیوں میں چوں چرا کا جوش و خروش
 دو ازار نہ چا بازار ندے مند لے ڈیر عالم مدے پدے ستر گولید لے
 دل آزاری سے کسی نے کامیابی کا بازار نہیں پایا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح بہت سارے لوگوں کو دیکھا ہے۔

2017 年 12 月 15 日

دین کی سمجھ سے منافق محروم رہتا ہے

﴿٢١﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِي مُتَافِي حُسْنٍ سَمِيحٍ وَلَا فِقْهٍ فِي الدِّينِ. (رواه الترمذي) ١

میں نے کہا: حضرت البربرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ”دو شخص ایسی ہیں جو منافق ہیں جمع نہیں ہوتیں ایک تو خلقِ نیک اور دوسری دینی سمجھ۔“ (ترمذی)

توضیح: حسن سمعت: حسن خلق اور خوش خلقی کو حسن سماعت کہا گیا ہے۔ اچھے اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے لئے مجسمہ خیر بن جائے اور بھلائی و آسانی کا ذریعہ بن جائے۔ دوست اور دشمن سب برابر نظر آئے۔ یہ اسلامی اچھے اخلاق ہیں جو منافق میں نہیں ہوتے ہیں۔ ایک تاجر انہ اخلاق ہوتے ہیں جو کوئی تاجر گاہک کے ساتھ برقرار رکھتا ہے۔ حدیث میں یہ اخلاق مراد نہیں ہیں۔ تیسری قسم مشن کے اخلاق ہوتے ہیں۔ جیسے انگریزوں میں مشن کے تحت اخلاق ہوتے ہیں۔ جس میں وہ ہر بے حیائی کو اخلاق کا نام دے کر مسلمانوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ تو اخلاق نہیں بلکہ بد اخلاقی ہے۔

طالب علم اللہ تعالیٰ کی راہ میں رہتا ہے

﴿٢٢﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ - (رواه الترمذي في المعجم) ٥

تذکرہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص گھر سے علم حاصل کرنے کے لئے نکلا تو وہ جب تک (گھر واپس نہ آجائے) خدا کی راہ میں ہے۔“ (ترمذی، داوری)

توضیح: فہو فی سبیل اللہ: یعنی جب تک یہ طالب علم سفرِ علم سے واپس گھر نہیں لوٹتا یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے۔ فی سبیل اللہ کی تشریح و تفصیل کتاب الجہاد میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔ یہاں اتنی بات سمجھ لیں کہ فی سبیل اللہ سے



خاص جہاد کا راستہ مراد ہے۔ اس راستے میں ایک روپیہ سات سو سے ساتھ لاکھ تک بڑھ جاتا ہے۔ طالب علم چونکہ سفرِ علم میں بہت بڑی مشقتیں اٹھاتا ہے اس لئے اس کو مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ بن گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی مشقتوں اور محنتوں کی وجہ سے اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض فقہاء نے مصرفِ زکوٰۃ ”فی سبیل اللہ“ میں مجاہدین کے ساتھ طلباءِ علم دین کو بھی داخل مانا ہے۔

طلبِ علم سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿۲۳﴾ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ الْأَزْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَطَى.
(رواہ البیہقی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث ضعیف الإسناد وأبو داود والزاوی یضعفہ) ۳

ترجمہ: اور حضرت سعد بن الازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”جو شخص علم طلب کرتا ہے تو وہ اس کے گزرے ہوئے (صغیرہ) گناہوں کے لئے کفارہ ہو جاتا ہے۔ (ترمذی) (دارمی) اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف الاسناد ہے یعنی اس حدیث کے ایک راوی ابو داؤد (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔

توضیح: کان کفارۃ: اگر اس نیک عمل کے ساتھ اس شخص نے توبہ بھی کی تو اس کے چھوٹے بڑے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے اور اگر توبہ نہ کی تو چھوٹے گناہ طلبِ علم کی برکتوں سے معاف ہو جائیں گے اور بڑے گناہ کمزور پڑ جائیں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ابو داؤد نامی ایک راوی ضعیف ہے۔ یاد رہے کہ یہ راوی ابو داؤد شریف کے مؤلف نہیں بلکہ کوئی اور آدمی ہے جو ضعیف ہے۔ ۳

عالم کبھی علم سے سیر نہیں ہوتا

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَنْ يَشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَسْمَعُهُ حَتَّى يَكُونَ مِنْهَا لِحْجَةً.
(رواہ البیہقی) ۴

ترجمہ: حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ ”مومن بھلائی (یعنی علم) سے سیر نہیں ہوتا وہ اس کو سنا (یعنی حاصل کرتا ہے)۔ یہاں تک کہ اس کی انتہا جنت ہوتی ہے۔ (ترمذی)

علم چھپانا گناہ ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلَيْهِ ثُمَّ كَتَبَهُ الْحِجْمَ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ بِلَجَامٍ مِنْ كَارِهِ - (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو كَاوُودٌ وَاللَّيْمِيُّ وَزَوَادُ الْإِسْنَاءِ مَنَاجِدَةً عَنْ أَنَسٍ) ۱

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اسے معلوم تھی مگر اس نے چھپایا (یعنی نہیں بتایا) تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔ (احمد، ابوداؤد) اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

توضیح: الحمد: آگ کی لگام کا مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص دوزخ میں جائے گا کیونکہ آگ کی لگام کسی اور جگہ نہیں پڑے گی۔ ۲

ثمہ کتمہ: یہ وعید فرائض اور واجبات کے متعلق ہے مگر یہاں چند شرائط بھی علماء نے ذکر کی ہیں۔ ۳

اول بات: تو یہ ہے کہ یہ عالم مسائل کے لئے متعین ہو اور صرف یہی عالم ہو دوسرا عالم موجود نہ ہو۔

دوسری بات: یہ ہے کہ اس عالم کو یہ مسئلہ معلوم بھی ہو اور جانتے ہوئے وہ اس کو چھپا رہا ہو۔

تیسری بات: یہ ہے کہ یہ مسئلہ فرائض یا واجبات سے متعلق ہو اور نہ بتانے سے ضروری حکم شرعی کو نقصان پہنچ رہا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ وعید مستحبات و نوافل کے مسائل سے متعلق نہیں ہے۔

جھگڑے اور ریاکاری کا علم وبال ہے

﴿۲۶﴾ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَلَبَّ الْعِلْمَ لِيَجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءُ أَوْ لِيَجَارِيَ بِهِ الشُّفَهَاءُ أَوْ يَضُرَّ بِهِ وَجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللَّهُ النَّارَ -

(رَوَاهُ اللَّيْمِيُّ وَزَوَادُ الْإِسْنَاءِ مَنَاجِدَةً عَنْ أَبِي عُمَرَ)

ترجمہ: حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر کرے یا بیوقوفوں سے جھگڑے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔“ (ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے)

توضیح: ”من طلب العلم“: علم ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اس کے حصول سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت میں صالح انقلاب آنا چاہیے۔ اور علم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کی نیابت اور وراثت علمی میں دین کی اس روشنی کو مخلوق خدا کے دلوں میں اور ان کے دماغوں میں پہنچا کر ان کو روشن کرے۔ اس عالی مقصد کے برعکس اگر ایک عالم ابتداء سے علم فقط اس لئے پڑھتا ہے کہ وہ کل عالم بن کر علماء سے مناظرہ کرے گا اور عوام الناس سے جھگڑا کرے گا۔ اس کا اولین مقصد یہی ہے کہ لوگوں سے مناظرہ مجادلہ اور مقابلہ کرنا ہے، تاکہ

اس کی آڑ میں وہ اپنی شخصیت بنائے اس کا ارادہ یہ ہو کہ لوگوں میں اس کی سرداری قائم ہو جائے اور اس کے مقابل کو لوگ ذلیل سمجھیں۔ علماء اور عوام سے جھگڑ کر اس کا سکہ لوگوں میں بیٹھ جائے اور یہ تمام حلقوں میں اپنا لوہا منوائے اور پھر دنیوی اغراض و اموال کے حصول میں کامیاب ہو جائے تو ایسا شخص عالم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جاہل ہے، اور دوزخ کا امید من ہے۔ جنت کی خوشبو اس پر حرام ہے کیونکہ بنیاد غلط ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

لیکن اگر اس شخص نے علم تو اچھی نیت سے پڑھا اور عالم بن کر پھر احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے اہل باطل سے مناظرہ مجادلہ مقابلہ کی نوبت آئی تو یہ ممنوع نہیں بلکہ مشروع و محمود ہے۔ بلکہ علماء سوء کے مفاد کے ازالہ کے لئے ضروری بھی ہے۔

لیجاری: مجارات سے ہے تکبر و تعلیٰ اور فخر و مہابا ت کو کہتے ہیں۔ ۱۔

لیجادی: ممارات سے ہے جھگڑے اور مقابلہ کو کہتے ہیں۔ ۲۔

اویصر ف: یعنی لوگوں کی توجہات اور مدح و تعریف کے جذبات کو اپنی طرف کھینچ کر لانا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کی آڑ میں وہ اپنی اغراض فاسدہ کو حاصل کرے۔ دینی فکر اور سوچ کے لئے نہیں بلکہ دنیوی مقاصد کے لئے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے علم حاصل کیا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے: ۳۔

یا اللہ میری بیری میں زور رہنے دے چشم عالم کو کور رہنے دے

دنیا کے حصول کے لئے علم جنت سے محروم کر دیتا ہے

﴿۲۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا يَتَّبِعُ فِيهِ وَجْهَ اللَّهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرَفَ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِي رَمَحَهَا.

(رواؤا أحمد و ابوداؤد و ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی رضا طلب کی جاتی ہے اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کی متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں ہوگی۔“ (امرواؤا احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ)

توضیح: علماً: یعنی علم حاصل کرنے سے غرض صرف اور صرف دنیا ہو تو اس کے لئے یہ وعید ہے اگر حصول علم سے غرض حفاظتِ دین اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا ہو اور پھر اس پر ترہب دنیا ہو جائے اور دنیا بھی اس کو حاصل ہو جائے تو

مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا اس لئے کہ جماعت کی دعا ان کو چاروں طرف سے گھیری ہوئی ہے۔ (شافعی، بیہقی و درمذہبی)

توضیح: غیر فقیہ: یعنی حدیث کے الفاظ یاد رکھنے والے بعض علماء تو ایسے ہوتے ہیں جو فقہات اور زیادہ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے ہیں وہ الفاظ کے تو ماہر ہوتے ہیں مگر استنباط سے قاصر رہتے ہیں، اور مسائل کے استخراج سے عاجز رہتے ہیں۔ اور الفاظ کے یاد رکھنے والے بعض علماء سمجھدار تو ہوتے ہیں مگر وہ جن کے سامنے حدیث کو بیان کریں گے بسا اوقات وہ سننے والے اس سنانے والے سے زیادہ سمجھدار اور فقیہ ہو سکتے ہیں۔ لہذا حدیث یاد رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ حدیث کو اپنے الفاظ کے ساتھ بحفاظت دوسروں تک پہنچایا کریں۔ ل

اس حدیث میں ”اذا ہا“ کے الفاظ سے تبلیغ اور آگے پہنچانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات اس تبلیغ و اشاعت میں کچھ رکاوٹیں پیش آتی ہیں مثلاً ریاکاری یا حسد یا کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اس تبلیغ سے مانع بنتے ہیں۔ اسی کے بیان کے لئے آنے والا جملہ ارشاد فرمایا۔

فلا تَلَا يَغُلُّ عَلْمَهُنَّ: اگر لایِغُلُّ یاہ کے زبر کے ساتھ ہوا اور غین کے زیر کے ساتھ ہو تو یہ ”غل“ حسد اور کینہ کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اخلاص عمل اور مسلمانوں کی بھلائی نصیحت، خیر خواہی اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ جزار ہنایہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر کسی مسلمان کے دل میں کسی قسم کا حسد اور کینہ باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی مسلمان ان تین چیزوں کے متعلق تلخ و اشاعت میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

اور اگر "لا یدخل" یاء کے پیش اور غنیم کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا جائے تو یہ لفظ غلول سے ہو کر خیانت کے معنی میں ہوگا۔ غلول مال غنیمت میں خیانت کو بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں حدیث شریف کا مطلب یہ ہوگا کہ ان تین چیزوں میں مسلمان کا دل خیانت نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ ہر مسلمان ان تین چیزوں کے متعلق تبلیغ و اشاعت میں بغیر کسی خیانت کے دلچسپی لے گا۔ اس تشریح سے حدیث شریف کے تمام حصوں میں جوڑ اور ربط پیدا ہو گیا۔ ۷

فان نحوہم: یہ جملہ اس سے قبل "ولرؤہ جماعتہم" کے لئے تفصیل اور علت ہے۔ اور فاء کو تفصیل و توضیح کے لئے لیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو قلبی طور پر مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ رہنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کی جماعت کی دعائیں سب کے لئے عام ہیں۔ وہ جماعت میں شامل ہو کر ان دعاؤں کا مستحق بن سکتا ہے۔ سہ

﴿٢٩﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ نَظَرَ اللَّهُ إِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا قَبْلَهُ كَمَا سَمِعَهُ قُرْبُ مَبْلَغٍ أَوْ عَلَى لَهٍ مِنْ سَامِعٍ.

(رواه الترمذي وابن ماجة ورواه النيسابوري عن أبي النضر حماد بن عمار)

یہ حدیث: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اس

تخص کو تازہ رکھے (یعنی خوش اور باعزت رکھے) جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور جس طرح سنی تھی اسی طرح اسے دوسروں کو پہنچائی۔ چنانچہ اکثر وہ لوگ جنہیں پہنچادی جاتی ہے سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔“ (ترمذی، ابن ماجہ) اور داری نے اس حدیث کو ابو درداء سے روایت کیا ہے۔

احادیث میں جھوٹ بولنا موجب نار ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَى مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

(رواہ الترمذی ورواہ ابن عباس عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ ولہ ہذا کثر اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر اس حدیث کو بیان کر دیجئے تم (سچ) جانو چنانچہ جس شخص نے (جان) کر مجھ پر جھوٹ بولا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرے۔“ (ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے) (حدیث کے پہلے جزء) کہ میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جسے تم سچ جانو کا ذکر نہیں کیا۔

قرآن کی تفسیر میں رائے شامل نہ کرو

﴿۳۱﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے قرآن مجید کے اندر اپنی عقل سے کچھ کہا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تلاش کرے۔“ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کچھ کہا اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرے۔“ (ترمذی)

﴿۳۲﴾ وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ.

(رواہ الترمذی واکو داؤد)

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے قرآن پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ حقیقت اور واقع کے مطابق بھی ہو اس نے تب بھی غلطی کی۔“ (ترمذی واکو داؤد)

توضیح: برآیہ: تفسیر اسے کہتے ہیں کہ قرآن کا مطلب مفسرین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور احادیث اور اہل لغت کی لغت کے مطابق ہو، تاویل اسے کہتے ہیں کہ کسی آیت کے معانی و مطالب کو بطور احتمال بیان کیا جائے۔ کہ میں جو معنی بتا رہا ہوں ممکن ہے کہ مطلب اسی طرح ہو۔ یہ تاویل اس وقت جائز ہے جب اس کا مطلب لغت اور شریعت کے قواعد کے مطابق ہو۔ اور جس شخص نے نہ علماء کی تفسیر کو دیکھا اور نہ احادیث اور شریعت اور لغت کا لحاظ رکھا محض اپنی عقل و دانش کے زور پر آیت کی تفسیر کی یہ غلط اور ناجائز ہے۔ اگرچہ اتفاق طور پر وہ تفسیر صحیح بھی ہو کیونکہ اس شخص نے ابتدا سے جو مطلب بیان کیا ہے اس کی بنیاد ہی صحیح نہ تھی یہ تفسیر بالرائے ہوئی جو درست نہیں۔

قرآن میں جھگڑاؤں کا کفر ہے

﴿۳۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ (رواہ احمد و ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔“

(احمد و ابوداؤد)

توضیح: المراء فی القرآن کفر: مراد جھگڑنے کے معنی میں ہے یعنی جو شخص اپنی خواہش پوری کرنے کی غرض سے قرآن کریم کی آیتوں اور نصوص کو آپس میں ٹکراتا ہے اور اس میں بے جا تاویل کرتا ہے اور ایک آیت کو چھوڑتا ہے ایک کو قبول کرتا ہے یہ کفر ہے مثلاً وہ شخص آیت ”ما اصاب من مصیبة فباذن اللہ“ کو آیت ”ما اصاب من مصیبة فاما کنسبت ایدیکم“ سے متعارض بنا کر جھگڑا کھڑا کرتا ہے۔ ایک فریق ایک آیت کو لے کر دوسری کو ٹکراتا ہے دوسرا فریق ایک آیت کو لے کر دوسری کو ٹکراتا ہے تو یہ صورت جانہیں کے لئے باعثِ خطر و باعثِ کفر ہے۔ کیونکہ یہ ایسا خطرناک عمل ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی نوبت کفر تک پہنچ سکتی ہے۔

﴿۳۴﴾ وَعَنْ عُمَرَو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا يَتَنَادَوْنَ فِي الْقُرْآنِ فَقَالَ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهَذَا صَرَبُوا كِتَابَ اللَّهِ بَعْضُهُ يَبْغِضُ وَآلِمَا نَزَلَ كِتَابَ اللَّهِ يُصْطَفَى بَعْضُهُ بَعْضًا فَلَا تُكَلِّمُوا بَعْضُهُ يَبْغِضُ فَمَا عَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُولُوا وَمَا جَهِلْتُمْ فَيَكُونُوا إِلَى عَالِيهِ (رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمر بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک جماعت کے بارے میں سنا کہ وہ آپس میں قرآن کریم کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور جھگڑ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بے شک تم سے پہلے کے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے انہوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض پر مارا (یعنی آیات

میں تضاد اور اختلاف ثابت کیا کہ فلاں آیت اس آیت کے مخالف ہے (اور یہ آیت فلاں آیت کے مخالف ہے۔ اور بے شک کتاب اللہ کا بعض حصہ بعض کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم قرآن کے بعض حصے کو بعض سے نہ جھٹلاؤ اور اس کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو اس کو بیان کرو اور جو نہیں جانتے اسے جاننے والوں کی طرف سوئپ دو۔ (رد ۱۳۱:۱۳۲ ابن ماجہ)

توضیح: یتدارثون: یہ "خز" دفع کرنے کے معنی میں ہے مراد بحث و جھگڑا کرنا اور قرآن کریم کی آیتوں کو آپس میں ٹکراتا ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بعض کم فہم اور کم فہم لوگ اپنی تاہلی اور بیمار ذہنیت کی وجہ سے قرآن میں اختلاف پیدا کر کے حق سے ہٹ کر باطل پر ٹٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ جب قرآن کریم کی آیتوں کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کے علم کو جاننے والے علماء پر چھوڑ دیں اور علماء سے پوچھیں۔ اس حدیث سے تقلید کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے۔

قرآن کا سات لغات پر نازل ہونے کا مطلب

﴿۳۰﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدِّ مُطْلَعٌ. (رواؤ فی تہذیب الشُّعْر)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قرآن کریم سات طرح پر نازل کیا گیا ہے ہر ایک آیت کے لئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر حد کے واسطے ایک جگہ خبر دار ہونے کی ہے۔"

(ردا شرح السنہ)

توضیح: انزل القرآن علی سبعة احرف: یہ حدیث مشکل ترین احادیث میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سمجھنے کے لئے اس میں ۴۰ تو جیہات کی گئی ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں فصاحت اور بلاغت اور لب و لہجہ کے اعتبار سے مختلف اسلوب اور مختلف لغات ہوتے ہیں اسی طرح عربی زبان کی بھی سات لغات عرب میں مشہور تھیں۔ اس حدیث کی تشریحات میں سب سے آسان تشریح تو جیہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ میں اسی کا خلاصہ لکھ دیتا ہوں کیونکہ یہ حدیث کے مفہوم سے زیادہ اقرب و اوفق ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"احرف" حرف کی جمع ہے جو لغات کے معنی میں ہے۔ "ای سبعة لغات" قرآن کا نزول قریش کی لغت میں ہوا تھا مگر اس کے علاوہ عرب میں چھ لغات مشہور اور متعارف تھیں۔ جو یہ ہیں۔

① لغت قریش ② لغت بنو مطی ③ لغت بنو تمیم ④ لغت حوازن ⑤ لغت اہل یمن ⑥ لغت ثقیف ⑦ لغت ہذیل۔
ان قبائل کی لغات چونکہ مختلف تھیں اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کی لغت کو نہیں سمجھتا تھا قرآن کریم کا پڑھنا اور یاد کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ پاک نے سات لغات تک آسانی فرمادی اور سات لغات تک پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔

یہ اجازت اس طرح نہیں تھی کہ ہر لغت میں سات طرح پڑھنا ہوتا تھا بلکہ مجموعی اعتبار سے ان لغات کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔ قبائل کا یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ پشتو زبان میں مختلف قوموں کے ہاں لحاف کے مختلف نام ہیں مثلاً ① بدستون ② رضائی ③ کبوتر ④ ملٹیک ⑤ ترنگز ⑥ ٹالے وغیرہ۔

یہ ایک ہی زبان بولنے والے قبائل کی زبان میں اختلاف ہے۔

سات لغات کا مصداق قراء سبعہ کی سات قراءتیں نہیں ہیں۔ اس آسانی کی ایک مثال وہ واقعہ ہے کہ ایک عرب دیہاتی کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھا رہے تھے۔ ”طعامہ الا لیسہ“ وہ شخص اٹیم کے لفظ کو زبان سے ادا نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”ان طعامہ الفاجو“ پڑھا کرو وہ اسی طرح سے پڑھنے لگا۔ یہ طریقہ آنحضرت ﷺ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک تک چلتا رہا۔

پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اصرار پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قرآن کریم کو لکھ کر ایک جگہ جمع کیا جائے اس لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جامع قرآن مشہور ہو گئے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مختلف قبائل اسلام میں داخل ہو گئے اور قرآن کی ان سات لغات کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں تنازعات شروع ہو گئے تو عراق کے گورنر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس امت کو اختلاف و افتراق سے پہلے پہلے بچا لیجئے۔ تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کریم ابتدا میں لغت قریش پر اترا تھا۔ لہذا اس لغت کے مطابق قرآن کو جمع کیا جائے اور لغت قریش کے علاوہ لغات کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع بھی ہو گیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اس میں قرآن عظیم کے کسی حکم یا کسی آیت میں تبدیلی قطعاً نہیں ہوئی جیسا کہ شیعہ حضرات کی غلط فہمی ہے۔ بلکہ سات طرح پڑھنے کو ایک طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ اختلاف و افتراق ختم ہو جائے۔

لکل آية منها ظہر وبطن: اس جملہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک تاویلی اور باطنی معنی ہے۔ تو تاویل باطن ہے اور ظاہر ظاہر ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے جو تمام اہل زبان اور علمائے اسلام سمجھتے ہیں اور ایک باطنی معنی ہے جس کو علماء باطن اور اہل معرفت و طریقت سمجھتے ہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ ہدایت کا ایک ظاہر ہے یعنی ان معانی کا تعلق اعمال ظاہر سے ہے اور ایک باطن ہے یعنی احکام باطنیہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔

ولکل حد مطلع: یعنی ہر حد و سرحد کے واسطے خبردار ہونے اور اطلاع پانے کی جگہ ہے۔ ”حد“ تہایت اور طرف کے معنی میں ہیں۔ اور ”مطلع“ پہنچنے کے مقام کو کہتے ہیں۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ ہر آیت کے ظاہر اور باطن کی ایک حد اور طرف

تَنْكِحُ كَبِيرًا: حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تین آدمی قصہ (وعظ) بیان کریں گے حاکم یا محکوم یا تکبر کرنے والا“ (رواہ ابوداؤد) اور داری نے اس حدیث کو عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور داری کی روایت میں لفظ ”مختال“ (یعنی تکبر کرنے والا) کے بجائے ”مراء“ (ریاکار) ہے۔

توضیح: لا یقص: قص یقص۔ قصاص اور قاص واعظ کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ وعیدین اور دیگر خطبوں کا حق غیر ذمہ دار افراد کو نہیں ہے۔

الا امیر: یعنی وہ امیر جو شرعاً مسلمانوں کا خلیفہ یا بادشاہ ہو اور شرعی طور پر بھی ذمہ دار ہو۔
او مامور: یعنی جو شخص شرعی امیر اور حاکم کی طرف سے مامور اور مقرر ہو اور یا براہ راست اللہ پاک کی طرف سے مقرر ہو جیسے علمائے کرام ہیں جبکہ خود حاکم نا اہل جاہل ہو جیسا کہ آج کل کے مسلمان حکمران ہیں۔ جو یا تو جاہل اور منافق ہیں اور یا غیر اعلانیہ کافر ہیں ایسے حالات میں دین اسلام کے احکامات کے سنبھالنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمائے حق پر عائد ہوتی ہے۔

او مختال: یہ لفظ اختیال سے تکبر کرنے کے معنی میں ہے۔ ایک لفظ ”مراء“ بھی ہے جس کا معنی ریاکاری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وعظ و نصیحت تین آدمی کر سکتے ہیں مگر دو کے لئے جائز ہے اور تیسرا متکبر ہے اور دکھاوے والا ہے آج کل جو غیر علماء وعظ و بیان کرتے پھرتے ہیں وہ اس تیسری قسم میں داخل ہیں۔

علم کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں

﴿۳۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُهُ عَلَى مَنْ أَفْتَاهُ وَمَنْ أَشَارَ عَلَى أَخِيهِ بِأَمْرٍ يَعْلَمُ أَنَّ الرَّسُولَ فِي غَيْرِهِ فَقَدْ خَانَهُ. (رواہ ابوداؤد)

تَنْكِحُ كَبِيرًا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہو گا تو اس کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے اس کو (غلط) فتویٰ دیا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے بھائی کو کسی ایسے کام کے بارے میں مشورہ دیا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے تو اس نے خیانت کی۔“ (ابوداؤد)

توضیح: من افقی: فتویٰ پوچھنے والے مستفتی پر لازم ہے کہ وہ عالم اور ماہر مفتی سے مسئلہ پوچھے تاکہ وہ صحیح مسئلہ بتائے اگر پوچھنے والے نے کسی نا اہل سے پوچھا اور اس نے غلط مسئلہ بتا دیا تو اس غلطی میں مفتی اور مستفتی دونوں گنہگار ہوں گے۔ اور اگر پوچھنے والے نے خوب تلاش اور تحقیق و اعتماد کیے بغیر کسی سے مسئلہ پوچھ لیا اور وہ عالم نما صاحبِ جبہ و دستار تو تھا مگر حقیقت میں نرا جاہل کور تھا اور اس نے غلط مسئلہ بتا دیا تو گنہگار صرف یہی غیر عالم مفتی ہو گا۔ آج کل اس قسم کے ان پڑھ جاہل بھی فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگ مستند علماء کی طرف رجوع نہیں کرتے ہیں۔

چستان اور معمرہ کا حکم

﴿۳۹﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْأَغْلُوطَاتِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے مخالفت دینے سے منع فرمایا ہے۔ (ابو داود)

توضیح: اغلوطات: اغلوطہ کی جمع ہے ہر زبان میں اپنے اپنے انداز سے چیتائیں اور معے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مخالطات سے منع کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ علمائے کرام کو مخالفہ میں ڈالنے کے لئے ان سے ایسے مسائل نہیں پوچھنے چاہئیں جو عجیدہ ہونے اور ذومعنی ہونے کی وجہ سے ایذا رسانی اور تکلیف پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً کسی نے کسی سے پوچھا کہ تم فرعون پر ایمان لاتے ہو یا نہیں؟ اب اگر وہ کہتا ہے کہ میں ان پر ایمان لاتا ہوں تو مسائل کہتا ہے کہ تم کافر ہو گئے۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ میں فرعون کو نہیں مانتا ہوں تو مسائل کہتا ہے کہ فرعون کا قصہ اور تذکرہ قرآن مجید میں جگہ جگہ آیا ہے تم نے قرآن کا انکار کیا۔ یا کوئی آدمی کہتا ہے۔ "من قال قال الله فقد كفر" اب سنئے والا قال کو قول سے سمجھتا ہے اور بولنے والا اس کو قولہ سے لیتا ہے اس میں ایمان کے لئے خطرات ہیں تو اس سے منع فرمایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ چستان اگر غیر کی تذلیل اور توہین کے لئے ہو تو منع ہے ہاں ویسے خوش طبعی اور شریفانہان کے لئے اگر کوئی کرے تو وہ جائز ہے۔ جیسے "قال زيد تحت الشجرة فنقض وضوئہ" یا "الدار في الشتاء خير من الله ورسوله"۔ یہاں من قسم کے لئے ہے۔ یا "أَنْ زَيْدٌ كَرِيحٌ وَغَيْرُهُ" وغیرہ۔

علم میراث پڑھنے کی اہمیت

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلَّمُوا النَّاسَ فَإِنَّ مَقْبُوضٌ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم فرائض (یعنی فرض چیزیں، یا علم فرائض) اور قرآن کریم سیکھ لو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ اس لئے کہ میں قبض کیا جاؤں"۔ (یعنی اس عالم سے اٹھالیا جاؤں گا)۔ (رواہ ترمذی)

توضیح: الفرائض: اس سے مراد قرآن وہ ریث سے ثابت شدہ احکام ہیں۔ یا علم میراث مراد ہے۔ کیونکہ علم الفرائض میراث کا نام ہے۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ علوم میں سب سے پہلے اٹھایا جائے۔ والا علم علم میراث ہی ہوگا۔

فانی مقبوض: دوسری توجیہ پر یہی قرینہ ہے۔ کہ میں دنیا سے اٹھنے والا ہوں تم علم میراث کا زیادہ اہتمام کرو۔ اور لوگوں کو بھی سکھاؤ۔

والقرآن: یعنی قرآن مجید سیکھنے کا اہتمام کیا کرو کیونکہ اس امت کے لئے میرے بعد قرآن مجید ہی ہدایت کا واحد ذریعہ ہے۔
اگر انفرادی سطح پر احکام فرضیہ مرا لیا جائے تو پھر قرآن بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو جائے۔

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي الذُّذَاءِ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَشَخَّصَ بِبَصَرِهِ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ قَالَ هَذَا أَوَّانٌ يُخْتَلَسُ فِيهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتَّى لَا يَقْدِرُوا مِنْهُ عَلَى شَيْءٍ (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم سرکارِ دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ ﷺ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا "یہ وقت ہے کہ علم آدمیوں میں سے جاتا رہے گا یہاں تک کہ وہ علم کے ذریعے کسی چیز پر قدرت نہ رکھیں گے۔" (ترمذی)

توضیح: مختلس: اختلاس اچکنے اور اٹھنے کے معنی میں ہے۔ اور علم سے مراد علم وحی ہے۔
آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ وحی کے انتظار میں آپ ﷺ اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے رہتے تھے۔ اس دفعہ دیکھنے کے دوران آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے آپ کی وفات کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وحی آتا بند ہو جائے اس سے آپ ﷺ نے اپنی وفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

مدینہ کا عالم بڑا عالم ہوگا

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَوَيْتُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّاسَ أَكْثَادَ الْإِبِلِ يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ فَلَا يَجِدُونَ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْ عَالِيهِ الْمَدِينَةِ (رواه الترمذی) وَفِي تَابِعِهِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّهُ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ وَمِغْلَةُ عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ وَقَالَ ابْنُ مَوْسَى وَتَوَصَّفَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَنَّهُ قَالَ هُوَ الْعَبْرُ عَلَى الزَّاهِدِ وَالنَّحْوِ عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ جب لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اونٹوں کے جگر پھاڑ ڈالیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی کو نہیں پائیں گے۔

(ترمذی) اور جامع ترمذی میں ابن عیینہؒ سے منقول ہے کہ مدینہ کے وہ عالم مالک بن انسؒ ہیں۔ اور عبدالرزاق نے بھی یہی لکھا ہے اور اسحق ابن مویٰ کا بیان ہے کہ میں نے ابن عیینہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ مدینہ کا وہ عالم عمری زاہد ہے۔ (یعنی وہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان سے ہے) جن کا نام عبدالعزیز بن عبد اللہ ہے۔

توضیح: یضرب الناس: ضرب مارنے کے معنی میں آتا ہے لیکن یہاں مراد سفر ہے الضرب سفر کے معنی میں آتا ہے۔

اکہاد: کہاد کی جمع ہے جگر کو کہتے ہیں اونٹوں کے جگر مارنے کے لفظ میں تیز اور سریع چلنے کا استعارہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی

جانور تیز دوڑتا ہے تو اس کے جگر میں حرکت آتی ہے گویا جگر کو مارا جاتا ہے بہر حال اس جملہ سے دور دراز کا سفر مراد ہے۔
 من عالم المدینۃ: حدیث شریف کی یہ پیشین گوئی ایک خاص زمانے کے مخصوص عالم کے بارے میں ہے جو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہوں گے۔ اس پیشین گوئی کے مصداق زیادہ تر علماء کے نزدیک "امام دارالہجرۃ امام مالک" ہیں۔ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اور مشہور محدث شیخ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حدیث کا مصداق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد عمری زاہد ہیں جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

بعض نے کہا اس سے مراد خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز ہیں مگر راجح پہلا قول ہے کیونکہ دنیا بھر کے دور دراز علاقوں سے ہزاروں شاگرد انہوں کو ہنکا کر مدینہ آیا کرتے تھے۔ اور خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ واقعی مدینہ منورہ کے عالم بھی تھے۔ کیونکہ پیشاب اور قضاء حاجت کے سوا آپ کبھی مدینہ منورہ سے باہر نہیں جاتے تھے۔ ایسا اور کون ہو سکتا ہے؟

مجدد کون ہوتا ہے

﴿۱۳﴾ وَعَنْهُ قِيَمًا أَعْلَمُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنْ أَلْفَ عَزَّ وَجَلَّ يَنْعَمُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا. (رواۃ ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اس امت کے نفع کے واسطے ہر سو ۱۰۰ برس پر ایک شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کو تازہ کرتا ہے۔"

(ابوداؤد)

توضیح: یہ عہد: بھیجنے اٹھانے اور پیدا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

من مجدد: یہ لفظ تجدید سے جدت کے معنی میں ہے۔ یعنی ہر صدی کے موقع پر اللہ تعالیٰ ایک مجدد کو پیدا کر کے کھڑا کرتے ہیں۔ ہر صدی اور سو سال پر ایک قرن ختم ہو جاتا ہے۔ جب پہلے علماء دسلحاء ختم ہو جاتے ہیں یا کمزور پڑ جاتے ہیں تو بدعات، رسومات اور طرح طرح کے مفاسد دین میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ علمائے کرام اور مجددین کو اٹھاتا ہے جو دین اور غیر دین میں امتیاز کر کے رسوم و بدعات کو مٹا کر دین کی اصلاح کرتے ہیں۔ ساری دنیا کے لئے ایک مجدد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ الگ الگ علاقوں اور ملکوں کے لئے ایک زمانہ میں کئی مجدد ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ایک صالح جماعت بھی مجدد کہلائی جاسکتی ہے۔ لیکن مجدد کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کا سلسلہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑا ہوا ہو اور اس کی وجہ سے علمی و عملی اعتبار سے دین کو غلبہ حاصل ہو۔ جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے میں حدیث ہو ہر محرک مجدد نہیں ہوتا کیونکہ شاعر نے کہا ہے:

ہزار کتب باریک تر زمو این جا است نہ ہر کہ سر برآشد قلندری داند

دین کی حفاظت

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مَنْ كُلِّ خَلْفٍ عُدُولُهُ يَنْتَفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفُ الْغَالِينَ وَالْتِحَالُ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلُ الْجَاهِلِينَ﴾

(رواۃ المجمع فی کتاب المدخل وسنن کبریٰ ج ۱ ص ۱۸۱ فی کتاب التعلیم فی باب العلم ۱۸۱)

حضرت ابراہیم بن عبد الرحمن عذری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ہر آئندہ آنے والی جماعت میں سے اس کے نیک (یعنی ثقہ اور مستند) لوگ اس علم (کتاب و سنت) کو حاصل کریں گے۔ اور وہی لوگ اس (علم) کے ذریعہ (آیات و احادیث) میں حد سے گزرنے والوں کی تحریف کو باطلوں کی افتراء پر دازی اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔“ (اس حدیث کو بیہقی نے اپنی کتاب مدخل میں عذری سے نقل کیا ہے) اور حضرت جابر رحمہ اللہ کی روایت (جس کی ابتداء یہ ہے) فانما شفاء العی السؤال ہم باب تیم میں بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ا۔

توضیح: بحمل: یہ لفظ اٹھانے کے معنی میں بھی ہے اور اس کا ترجمہ بحصل سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ ا۔ ہذا العلم: کا لفظ بحمل کے لئے مفعول بہ ہے اور ”عدولہ“ اس کا فاعل ہے۔ ”من کل خلف“ بحمل سے متعلق ہے۔ عدل عادل سے معتدل اور افراط و تفریط سے پاک اور ثقہ و مستند لوگ مراد ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ من کل خلف میں اگر من زائد ہو جائے تو یہ بحمل کا فاعل اور عدولہ اس سے بدل بن جائے گا۔ ا۔

خلف: پیچھے آنے والے اچھے لوگوں کو کہتے ہیں یہاں اچھے لوگوں کی جماعت مراد ہے۔ ا۔

غالین: غلو سے غالی کی جمع ہے حد سے گزرنے کے معنی میں ہے یہاں دین میں غلو کرنے والے مبتدعین اور اہل بدعت مراد ہیں۔ ا۔

التحال: جھوٹی نسبت کو کہتے ہیں یعنی اہل باطل کی جھوٹی نسبتیں جو وہ علماء اور بزرگوں کی طرف کرتے ہیں اور جھوٹے حوالہ جات دیتے رہتے ہیں۔ ا۔

وتأویل الجاہلین: یعنی آیتوں میں یہ جاہل لوگ بے موقع تاویلیں کرتے ہیں۔ اور آیتوں کو اپنے مقصد میں بے جا چسپاں کرتے ہیں۔

اس حدیث میں دین اسلام کی حفاظت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ہر زمانے میں جید علمائے کرام افراط و تفریط سے پاک ہو کر دین حق کی سرحدات کی حفاظت کے لئے موجود ہوں گے۔ جو دین میں تین قسم کے ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے۔

ذاکوؤں کا پہلا طبقہ وہ ہے جو اس میں اپنے مقصد کے لئے تحریف کرتا ہے جیسے قادیانی، پرویزی وغیرہ۔
ذاکوؤں کا دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس میں جھوٹے قصے اور بزرگوں کی طرف غلط خیالات منسوب کر کے اپنے مقاصد کو پورا کرتا ہے جیسے روافض اور اہل بدعت وغیرہ ہیں۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جو جاہل ہے وہ اپنی جہالت کی وجہ سے آیتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ آج کل اس کا مصداق دو ماڈرن طبقہ ہے جو دانشوروں، پروفیسروں اور نجوموں پر مشتمل ہے۔ جو قرآن و حدیث کے حکموں کو اپنی عقل و دانش کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور اس میں طرح طرح کی مکروہ تاویلیں کرتے ہیں۔ لے

گویا:

خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں

۱۵ ستمبر ۱۴۱۰ھ

الفصل الثالث

طالب علم کی انتہائی فضیلت

﴿عَنِ الْحُسَيْنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُخْبِيَ بِهِ الْأَسْلَامَ فَبَيْتُهُ وَبَنِينَ النَّبِيِّينَ كَرَجَةٍ وَاحِدَةً فِي الْجَنَّةِ﴾ (رواه الدارِمِيُّ)

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جس شخص کی موت اس حالی میں آئے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو اور (وہ علم) اس غرض سے (حاصل کر رہا ہو) کہ وہ اس کے ذریعہ سے اسلام کو رائج کرے گا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔“ (وردہ مرتبہ نبوت ہے)۔ (دارمی)

توضیح: فبیئہ: جنت میں ۱۰۰ درجے ہیں۔ جو انبیاء کرام کو ملیں گے۔ اور جو انبیاء کرام کے ناکین علماء ہیں ان کو ۹۹ درجے ملیں گے۔ اس وجہ سے ان کے اور انبیاء کرام کے درمیان ایک درجہ کا فرق بتایا گیا ہے اور یہ درجہ نبوت کا ہے۔ کہ علم دین کے احیاء و اشاعت کے لئے جو علم و طالب محنت کرتے کرتے مرجاتا ہے تو نبوت کے علاوہ تمام درجے اس کو ملیں گے۔

حسن سے مراد حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ تابعین کے طبقے میں جب مطلق حسن کا نام آجائے اس سے مراد حسن بصری ہوتے ہیں۔ اور صحابہ کے طبقہ میں جب مطلق عبد اللہ کا نام آجائے تو اس سے مراد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہوتے ہیں۔ لے

عابد پر عالم کی انتہائی فضیلت

﴿۶﴾ وَعَنْهُ مُرْسَلًا قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِي بَيْتِ إِسْرَائِيلَ أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّي الْمَكْتُوبَةَ ثُمَّ يَخْلُسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَالْآخَرُ يَصُومُ النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيْلَ أَيُّهُمَا أَفْضَلُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ هَذَا الْعَالِمِ الَّذِي يُصَلِّي الْمَكْتُوبَةَ ثُمَّ يَخْلُسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِي يَصُومُ النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيْلَ كَفَضْلِي عَلَى أَخِي كُمْ. (رواه الدارمی)

ترجمہ: اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے بارے میں سوال کیا گیا، ان میں سے ایک تو عالم تھا جو فرض نماز پڑھتا تھا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھاتا تھا۔ اور دوسرا شخص وہ تھا جو دن کو تو روزے رکھتا تھا اور تمام رات عبادت کیا کرتا تھا۔ (چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا) کہ ان دونوں میں بہتر کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اس عالم کو جو فرض نماز پڑھتا ہے اور بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھاتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں عبادت کرتا ہے ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ مجھے تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر ہے۔“ (دارمی)

عالم کو بے نیاز رہنا چاہئے

﴿۷﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَعْمَدُ الرَّجُلُ الْفَقِيرُ فِي الدِّينِ إِنْ أُحْتِجَّ بِرَأْيِهِ نَفَعَ وَإِنْ أَسْتُغْنِيَ عَنْهُ أَغْلَى نَفْسُهُ. (رواه الزين)

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”بہتر شخص وہ ہے جو دین کی بھجور رکھتا ہو۔ اگر اس کے پاس کوئی حاجت لائی گئی تو اس نے نفع پہنچایا۔ اور اگر اس سے بے پرواہی برتی گئی تو اس نے (بھی) اپنے نفس کو بے پرواہ رکھا۔“ (زین)

توضیح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک عالم دین کی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا محتاج کر کے اپنی حیثیت کو کمزور و کمتر نہ کرے۔ اور اپنے غلط مقاصد اور دنیوی اغراض کی وجہ سے عوام اور ظالم جہال کی طرف نہ جھکے اور نہ لالچ رکھے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے علوم کو چھپا کر مخلوق خدا سے الگ تھلگ ہو کر اپنے علوم سے ان کو محروم رکھے۔ جب عوام الناس کو اس کے علم کی ضرورت ہو اور دوسرا کوئی عالم متعین نہ ہو تو اس صورت میں عوام سے ربط و ارتباط رکھنا ضروری ہے۔

ہاں اگر عوام بالکل کسی چیز میں اس عالم کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں اور اس سے لاپرواہی برتتے ہیں اور اس سے علمی استفادہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں تو اس عالم کو بھی جائز ہے کہ وہ ان سے مستغنی اور بے پرداہ ہو جائے۔ اور اپنی عبادات اور علمی مشاغل میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ ”لیس للمسلم ان یذل نفسه“ بھی ایک حدیث ہے۔

زیادہ وعظ نہ کرو

﴿۴۸﴾ وَعَنْ عِكْرِمَةَ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَإِنْ أَهَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَإِنْ أَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا تُؤْمَلُ النَّاسَ هَذَا الْقُرْآنَ وَلَا الْهِيْئَتُكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِهِمْ فَتَقْصُ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيثَهُمْ فَتَبْلُغُهُمْ وَلَكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمْرُكَ فَخَذْلَهُمْ وَهُمْ يَشْتَمُونَ وَالنَّظَرُ السَّجْعُ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَإِنِّي عَهَدْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ لَا يَفْعَلُونَ ذَلِكَ. (رواه البخاری)

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عکرمہ سے فرمایا ”تم ہر جمعہ کو ایک بار لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرو۔ اگر اسے قبول نہ کرو (یعنی سنتے میں ایک بار وعظ و نصیحت کو کافی نہ جانو) تو (ہفتے میں) دو بار اور بہت کرو تو ہفتے میں تین بار (وعظ و نصیحت کر سکتے ہو) اور تم لوگوں کو اس قرآن سے تنگ نہ کرو (یعنی ہفتے میں تین بار سے زیادہ وعظ و نصیحت کا بیان کر کے لوگوں کو ملال نہ کرو) اور میں تمہیں اس حالت میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تم ان کی باتوں کو منقطع کر کے ان کے سامنے وعظ و نصیحت شروع کر دو (اور اس طرح) تم ان کو کبیدہ خاطر کرو۔ ایسے موقع پر تمہیں چاہیے کہ تم خاموش رہو۔ البتہ وہ اگر تم سے وعظ و نصیحت کی فرمائش کریں تو جب تک اس کے خواہش مند ہوں تم ان کے سامنے حدیث بیان کرو۔ اور تم دعا میں مقفی عبارت سے صرف نظر نہ کرو اور اس سے بچو۔ چنانچہ میں نے معلوم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب ایسا نہیں کرتے تھے۔“ (یعنی دعائیں مقفی عبارت استعمال نہیں کرتے تھے)۔ (بخاری)

توضیح: کل جمعہ مرثا: اس حدیث میں اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ وعظ و نصیحت کے معاملہ میں اعتدال اور موقع و ماحول کی رعایت ضروری ہے کیونکہ اثر اندازی کے اعتبار سے دعوت و تبلیغ کا یہ بنیادی پتھر ہے۔ جس پر تبلیغ کی کامیابی کا پورا دار و مدار ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگرد کو پہلی بات یہ بتائی کہ جمعہ میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ تین بار عوام کے سامنے وعظ و نصیحت کر دیا کرو۔

دوسری بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی کہ قرآن کریم کے ذریعے سے لوگوں کو تنگ نہ کیا کرو۔

تیسری بات یہ بتائی ہے کہ ایسا ہرگز نہ کرو کہ تم کسی قوم کے پاس آ جاؤ وہ اپنی گفتگو میں لگی ہوئی ہو اور تم فوراً وعظ شروع کر دو اور ان کی گفتگو کو کاٹ دو بلکہ تم خاموش بیٹھ جاؤ ان کی باتیں سنو اگر وہ تمہیں وعظ و نصیحت کا حکم دیں تو تم ان کی چاہت کے

مطابق مختصر بات چیت کرلو۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جب دعائے توبہ کی اور قافیہ سے بچو "انظر" کا مطلب یہ ہے کہ سچ سے بچنے کا خیال رکھو۔ یہاں کا انہوں کی طرح تکلف کر کے سچ بنا کر دعائے توبہ سے منع کیا گیا ہے۔ ورنہ بغیر تکلف اور تسبیح کے اگر دعا میں سچ آ گیا تو وہ منع نہیں ہے۔ کیونکہ احادیث میں جو دعائیں وارد ہوئی ہیں ان میں کثرت کے ساتھ سچ موجود ہے۔ جو طبعی کلام میں بغیر تکلف آ گیا ہے سچ مطلق کلام کو کہتے ہیں۔

ناکام طالب علم بھی کامیاب ہے

﴿۹۰﴾ وَعَنْ وَائِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ظَلَبَ الْعِلْمَ فَأُخِّرَ لَهُ كَانَ لَهُ كَيْفَلَانِ مِنَ الْأَجْرِ فَإِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كَيْفَلٌ مِنَ الْأَجْرِ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت وائل بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص علم کا طالب ہو اور اسے علم حاصل بھی ہو گیا تو اس کو دو ہر ثواب ملے گا اور اگر اسے علم حاصل نہ ہوا تو اس کو ایک حصہ ثواب ملے گا۔" (دارقطنی)

توضیح: کفیلان: دو ثواب اس طرح ملیں گے کہ ایک ثواب طالب علم کی محنت و مشقت پر ملے گا اور دوسرا ثواب حصول علم پر ملے گا۔ کیونکہ حصول علم سے اشاعت علم کا راستہ کھلے گا اور علم پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ لہذا دو ہر ثواب ملے گا۔ اور اگر محنت و مشقت کے باوجود علم حاصل نہیں ہوا تو ایک ثواب ضرور ملے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم دین کا طالب علم ناکام اور فیل نہیں ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح نیت سے علم میں لگا ہوا ہو وہ ہر حالت میں کامیاب ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

گرچہ تھوڑا بدوست رہ بردن شرط یاری است در طلب مردن

میت کے لئے صدقہ جاریہ

﴿۹۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ مَكَانَ يُلْعَقُ الْمُؤْمِنُ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَيْهِ وَنَشْرُهُ وَوَلَدًا صَالِحًا كَرَّكَهُ أَوْ مُصْحَفًا وَرَقَّتْهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ أَوْ بَيْتًا لِأَيِّ السَّبِيلِ بَنَاهُ أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْعَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "مومن کو اس کے جس عمل یا حسنات کی بابت مرنے کے بعد ثواب پہنچتا ہے اس میں سے ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا اور رواج دیا تھا۔ دوسرا وہ نیک اولاد ہے جس

کو اس نے اپنے بعد چھوڑا۔ تیسرا قرآن مجید ہے جو وارثوں کے لئے چھوڑا ہو۔ چوتھا مسجد ہے جس کو اپنی زندگی میں بنا گیا ہو۔ پانچواں مسافر خانہ ہے جس کو اس نے تعمیر کیا ہو۔ چھٹی وہ منبر ہے جس کو اس نے جاری کیا ہو۔ اور ساتویں وہ خیرات ہے جس کو اس نے اپنی حدرستی اور زندگی میں اپنے مال سے نکالا ہو۔ ان تمام چیزوں کا ثواب اس کے مرنے کے بعد اس کو پہنچتا ہے۔

(ابن ماجہ و ترمذی)

توضیح: ان مما یلحق: انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے اپنے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اگر مرنے کے بعد عالم برزخ میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس پر ان کو ثواب نہیں ملتا ہے ہاں حدیث میں چند اعمال کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا رہے گا۔ یہاں حصر کرنا مقصود نہیں بلکہ خیر و بھلائی کا جو بھی سلسلہ ہو گا وہ مراد ہے اور اس کا ثواب میت کو ملتا رہے گا۔ اس سے ایصالِ ثواب کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کا معتزلہ انکار کرتے ہیں۔ ۱۔

طلب علم کے راستے جنت کے راستے ہیں

﴿۵۱﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَوْحَى إِلَيَّ أَنَّهُ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِي طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيقَ الْجَنَّةِ وَمَنْ سَلَكَ كَرِهِيَّتِهِ أَكْبَدْتُ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ وَفَضَّلُ فِي عِلْمٍ خَيْرٌ مِنْ فَضْلِ فِي عِبَادَةٍ وَمَلَكَ الدِّينِ الْوَرَعُ.

(رواة الترمذی فی شعب الایمان) ۲

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ ”اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی (خفی) بھیجی ہے کہ جو طلب علم کے لئے راستہ اختیار کرے تو میں اس پر جنت کے راستے کو آسان کر دوں گا اور جس شخص کی میں نے دونوں آنکھیں چھین لی ہوں (یعنی کوئی شخص ناپیدا ہو گیا ہو تو اس دنیاوی نعمت سے محرومی اور اس پر صبر و شکر کی بناء پر) میں اس کا بدلہ اسے جنت میں دوں گا۔ اور علم کے اندر زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جز پر ہیز گاری ہے۔“

(بخاری)

توضیح: سلبت کرمیتیہ: سلب چھیننے کے معنی میں ہے۔ کرمیتیہ دونوں آنکھوں کو کہتے ہیں مراد آنکھوں کا نور چلا جانا ہے کیونکہ زیادہ کسب کی وجہ سے نور کے پٹھے سوکھ جاتے ہیں۔ ۳

وفضل: اس سے مراد علم میں اضافہ اور زیادتی ہونا ہے۔ یعنی علمی اضافہ عبادت کے اضافہ سے بہتر ہے۔ ۴

وملاک: اصل اور جز اور دنیا و کوملاک کہتے ہیں۔ ۵

الورع: پرہیز گاری کو کہتے ہیں۔ ۶

تدریس کرنا تہجد سے افضل ہے

﴿۵۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ رَاحِيَتَيْهَا. (رواہ الدارمی) ۱

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”رات میں تھوڑی دیر علم کا درس دینا تمام رات کو زندہ رکھنے سے بہتر ہے۔“ (دارمی)

توضیح: تدارس العلم: یعنی ایک گھڑی اور تھوڑی دیر کے لئے علمی درس و تدریس کا مشغلہ رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے کیونکہ عبادت کا تعلق اس شخص کی ذات سے وابستہ ہے اور علمی مشغلہ درس و تدریس و تحریر و تصنیف امت اسلامیہ کی عمومی خدمت ہے۔ نیز عابد اور اس کی عبادت ایک وقتی عارضی عمل ہے۔ اور علمی مشغلہ دائمی اور متعدی و پائیدار عمل ہے۔ اس لئے یہ افضل ہے۔ ۲

آنحضرت ﷺ معلم بن کر آئے تھے

﴿۵۳﴾ وَعَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِي مَسْجِدِهِ فَقَالَ كِلَا مَجْلِسَيْنِ خَيْرٌ وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهِ أَمَّا هَؤُلَاءِ فَيَتَذَكَّرُونَ اللَّهَ وَيَزْعُمُونَ إِلَيْهِ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ وَأَمَّا هَؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُونَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُونَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ وَأَمَّا بَعْضُ مُعَلِّمَاتِهِمْ جَلَسَ فِيهِمْ. (رواہ الدارمی) ۳

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ کا گزر دو مجلسوں پر ہوا، جو مسجد نبوی میں منعقد تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”دونوں بھلائی پر ہیں لیکن ان میں سے ایک (نیکی میں) دوسرے سے بہتر ہے۔ ایک جماعت عبادت میں مصروف ہے، خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی رغبت کا اظہار کر رہی ہے (یعنی حصول مقصد کے لئے خدا کی طرف امیدوار ہے اور حصول مقصد رضا کے الہی پر موقوف ہے) لہذا اگر خدا چاہے تو انہیں دے دے اور چاہے نہ دے۔ اور دوسری جماعت فقہ یا علم حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم سکھا رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بہتر ہیں اور میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں“ اور پھر آپ ﷺ خود بھی ان میں بیٹھ گئے۔ (دارمی)

توضیح: فہم افضل: اس سے ان حضرات کی ترغیب مقصود ہے ورنہ خیر و بھلائی پر تو دونوں ہی ہیں۔ مگر مجلس علم کا فائدہ نفع بخش اور متعدی ہے۔ اس وجہ سے یہ افضل ہے۔ مجلس عبادت و عابدین کی فضیلت کی نفی مقصود نہیں۔ ۴
انما بعثت معلما: بعض ناواقف حضرات کہتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم و تعلم کا ذکر آیا ہے۔ درس و تدریس کا نہیں آیا

ہے۔ لہذا اہم تعلیم کرتے ہیں ہم ہی ان فضائل کے مستحق ہیں۔ یہ نغور اور لا یعنی قسم کی بات ہے جو لاعلمی کی وجہ سے منہ سے نکلتی ہے۔ قرآن کریم میں درس کا لفظ آیا ہے۔ لہ

اور اس حدیث سے پہلے حدیث میں تدریس کا لفظ آیا ہے۔ لہذا درس و تدریس اور مدرسین کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔

ثم جلس فہم: اس جماعت کے اہتمام شان و اکرام و اعزاز کا ہر کرنے کی غرض سے ان میں تشریف فرما ہوئے کیونکہ:۔

کلاہ گوشہ دہقان بہ آفتاب رسید کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانی
نیز آنحضرت ﷺ مجلس علم میں اس لئے بیٹھ گئے کہ شاید ان کو تعلیم دینے کی ضرورت پیش آجائے۔

چالیس احادیث یاد کرانے کی فضیلت

﴿٤٤﴾ وَعَنْ أَبِي التَّوَدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا خُذَ الْعِلْمَ الَّذِي إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيمًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلَى أَقْبَى أَرْبَعِينَ حَدِيثًا فِي أَمْرِ دِينِهِ بَعَثَهُ اللَّهُ فَقِيمًا وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَشَهِيدًا ۝

ترجمہ: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ علم کی مقدار کیا ہے کہ جب انسان اتنا علم حاصل کرے تو فقیہ (عالم) ہو جائے (اور آخرت میں اس کا شمارِ زمرۂ علماء میں ہو)۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص میری امت کو فائدہ پہنچانے کے لئے امرِ دین کی چالیس حدیثیں یاد کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں فقیہ اٹھائے گا۔ اور میں قیامت کے دن میں اس کا شفاعت کرنے والا اور (اس کی اطاعت پر) گواہ بنوں گا۔“

توضیح: من حفظ علی امتی: یعنی میری امت کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے چالیس حدیثیں پڑھا دیں اور ان تک پہنچا دیں خواہ یاد کیں یا تصنیف سے پہنچا دیں اور یا کسی اور ذریعہ سے امت تک پہنچا دیں۔ سب اس میں داخل ہیں۔ اس حدیث کی بشارت کے پیش نظر اس امت کے محدثین اور علماء نے اربعین یا اربعینات کے نام سے بہت سی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔

امرِ دینہا: یعنی جو احادیث و سن کے احکامات سے متعلق ہوں صرف واقعات سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ۵

علم دین کا عالم سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے

﴿٥٥﴾ وَعَنْ أَنَسٍ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَذَرُونَ مِنْ أَجْوَدُ

جُودًا قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ اللَّهُ أَجُودُ جُودًا ثُمَّ أَنَا أَجُودُ نَبِيَّ آدَمَ وَأَجُودُهُمْ مِنْ بَعْدِي
رَجُلٌ عَلِمَ عَلَيْهِمْ فَلَمْ يَرَهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمِيرًا وَحَدَّثَهُ أَوْ قَالَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۝

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا "کیا تم جانتے ہو کہ سخاوت کے معاملے میں سب سے بڑا نفعی کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا سخاوت کرنے میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا نفعی ہے اور نبی آدم میں سب سے بڑا نفعی میں ہوں، پھر لوگوں میں میرے بعد سب سے بڑا نفعی وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور اسے پھیلا یا وہ شخص قیامت کے دن ایک "امیر" یا فرمایا کہ "ایک کردہ کی طرح آئے گا"۔

توضیح: اجود جوداً: یعنی تمام سخیوں میں یعنی تمام سخیوں میں سخاوت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا نفعی ہے۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر آج تک جانداروں کو اور تمام کفار و شرار کو اور تمام ابرار کو کھلا رہا ہے۔ پلا رہا ہے اور خیر و نعمت کو بچھائے رکھا ہے۔ ۝

امیراً واحداً: یعنی اکیلا ہوگا مگر امیر ہو کر آئے گا گویا اس کے ماتحت جم غفیر ہوگا۔ کیونکہ اس نے جن کو پڑھایا یا اس کی تعلیمات جن تک پہنچیں اور انہوں نے آگے اوروں کو پہنچایا تو لاکھوں کا عمل اس کو ملے گا اس لئے وہ اکیلے ہوتے ہوئے بھی امیر ہوگا۔ ۝

علم کا حریص کبھی سیر نہیں ہوتا

(۵۶) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ هُوَ مَانٍ لَا يَشْبَعَانِ مَنِ هُوَ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنِ هُوَ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا۔ (روى الشيخان في التلخيص) (روى الشيخان في التلخيص) (روى الشيخان في التلخيص)
أَخْبَدَ فِي عَيْنِهِ أَبِي النَّوْذَاءُ هَذَا مَنِ هُوَ مَانٍ لَا يَشْبَعَانِ مَنِ هُوَ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنِ هُوَ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا۔ (روى الشيخان في التلخيص) (روى الشيخان في التلخيص) (روى الشيخان في التلخيص)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "حرم کرنے والے دو شخص ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک علم میں حرم کرنے والا کہ اس کا پیٹ علم سے کبھی بھی نہیں بھرتا، اور دوسرا دنیا کی حرم کرنے والے کہ اس کا پیٹ دنیا سے کبھی نہیں بھرتا"۔

مذکورہ بالا تین حدیثیں متفق نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں۔ حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں مشہور ہے مگر اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔

توضیح: منہوم: حریص کے معنی میں ہے۔ شبع: پیٹ بھرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی دو قسم کے حریص ہیں۔

ایک دنیا کا حریص ہے جو مذموم ہے دوسرا علم کا حریص ہے جو محمود ہے کیونکہ دنیا کا طالب انجام کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رضا سے دور ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے اور علم کا طالب جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف جاتا ہے اور اس کا انجام کامیاب ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق امام احمد ابن حنبل رحمہم اللہ نے فرمایا: ”کہ لوگوں میں اس حدیث کا متن مشہور ہے مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے۔“ امام نووی رحمہم اللہ نے فرمایا: ”کہ یہ حدیث بے شک ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعدد ہیں۔ لہذا اس میں قوت ہے۔“

ادھر علمائے کرام نے تصریح کی ہے کہ فضائل اعمال میں قدرے ضعیف حدیث بھی قبول کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی حدیث یا شرعی قاعدہ سے متصادم نہ ہو۔ ۱۔

﴿۵۷﴾ وَعَنْ عَوْنٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ مَسْعُودٍ مَنْهُوَ مَا لَا يَشْبَعَانِ صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا وَلَا يَسْتَوِيَانِ أَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَلَمَّا دَاوَرَهُ لِلْمُحْسِنِ وَأَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَمْلَأُ فِي الطُّغْيَانِ ثُمَّ قَرَأَ عَبْدُ اللَّهِ كَلَامًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ أَن رَّآكَ اسْتَغْفِي قَالَ وَقَالَ الْآخَرُ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (رواه الدارمی) ۲۔

ترجمہ: حضرت عون روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”دو حریص ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ ایک عالم اور دوسرا دنیا دار لیکن یہ (درجہ میں) برابر نہیں ہیں۔ کیونکہ عالم تو خدا کی خوشنودی اور رضا مندی کو زیادہ کرتا ہے اور دنیا دار سرکشی میں زیادتی کرتا ہے۔“ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دنیا دار کے حق میں (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی۔ ترجمہ: خبردار! انسان البتہ سرکشی کرتا ہے جبکہ وہ اپنے آپ کو (کثرت مال کی بناء پر لوگوں سے) غنی دیکھتا ہے۔ حضرت عون رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دوسرے (یعنی) عالم کے حق میں یہ آیت پڑھی۔ ترجمہ: ”خدا کے بندوں میں عالم خدا سے ڈرتے ہیں۔“ (دارمی)

توضیح: یہ حدیث مرفوع ہے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حدیث کے مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے اس سے پہلے جو حدیث گزر چکی ہے اس کی تشریح اور زیر بحث حدیث کی تشریح ایک جیسی ہے۔ اس کو ملاحظہ کیا جائے۔

دنیا داروں سے علماء کو دور رہنا چاہیے

﴿۵۸﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أُمَّتِي سَيَنْفَقُهُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَيَقْرَأُونَ الْقُرْآنَ يَقُولُونَ نَأْتِي الْأَمْرَاءَ فَتُصِيبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ

يَذِيْنُنَا وَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَا لَا يُجْتَلٰى مِنَ الْقَتَادِ اِلَّا الشُّوْكُ كَذٰلِكَ لَا يُجْتَلٰى مِنْ قُرَيْشِهِمْ اِلَّا قَالَ مُحَمَّدٌ بَنِي الصَّبَاحِ كَاَنَّهُ يَعْصِي الْخَطَايَا. (رواۃ ابن ماجہ)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”میری امت میں بہت سے لوگ دین میں کچھ (یعنی دین کا علم) حاصل کریں گے اور قرآن مجید پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جا کر ان کی دنیا اور (دولت) میں سے اپنا حصہ حاصل کریں گے اور اپنے دین کو ان سے یکسو رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا (کہ دین و دنیا ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں کیونکہ امراء کی محبت میں بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے) جیسا کہ جس طرح خاردار درخت سے صرف کاٹا ہی حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح امراء کی محبت سے نہیں حاصل ہوتا مگر! حضرت محمد ابن صباح کہتے ہیں کہ گویا آنحضرت ﷺ کی مراد لفظ ”الا“ کے بعد خطایا تھی۔ (ابن ماجہ)

توضیح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس امت میں بعض ایسے مطلب پرست علماء پیدا ہوں گے جن کا رخ نظر صرف حصول دنیا ہوگا اس غرض کے حصول کے لئے وہ مالداروں اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے پیچھے گھومتے پھریں گے اور اگر ان کو طعنہ دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ بھائی ہم مائی فرزند تو حاصل کرتے ہیں لیکن اپنا دین اپنے دل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا یہ اس طرح محال ہے جس طرح کسی کا نئے دار بے پھل درخت سے پھل حاصل کرنا اس سے تو کاٹنے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور پھل ملنا محال ہے۔

الا: آنحضرت ﷺ نے ”الا“ کے بعد کوئی لفظ ارشاد نہیں فرمایا اور ”الا“ پر کلام کو ختم فرمایا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد محمد بن صباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے گویا الخطایا کے کلمہ کا ارادہ کیا تھا مگر زبان سے ادا نہیں فرمایا، اس میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جرم کو ہم چھوڑ کر اشارہ فرمایا کہ یہ اتنا بڑا جرم ہے جو زبان پر بھی نہیں لایا جاسکتا ہے۔

عالم کو اپنے علم کی حفاظت خود کرنی چاہیے

﴿۵۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوهُ عِنْدَ أَهْلِهِ لَسَاخُوهُ أَهْلَ زَمَانِهِمْ وَلَكِنَّهُمْ بَدَلُوهُ لِأَهْلِ الدُّنْيَا لِيَتَأَلَّوْا بِهِ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوا عَلَيْهِمْ سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ مَتًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهِ كَقَاءِ اللَّهِ هَمَّ دُنْيَاةٍ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُومُ أَحْوَالُ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللَّهُ فِي أَقْبَى أَوْ دَرَجَتِهَا هَلْكَ ۚ

(رواۃ ابن ماجہ ورواۃ الترمذی فی شعب الایمان عن ابن عمر عن قولہ من جعل الہموم مٹا واحدًا ہم آخریۃ کی آخریۃ)

﴿تَرْجُمَةً﴾: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ”اگر اہل علم (یعنی علماء) علم کی حفاظت کریں اور علم کو اس کے اہل ہی (یعنی قدردانوں) کے حوالے کریں تو وہ بے شک اپنے علم کے سبب دنیا والوں کے سردار بن جائیں لیکن (علماء نے ایسا نہیں کیا بلکہ) انہوں نے علم کو دنیا داروں پر خرچ کیا تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنی دنیا (یعنی جاہ و جلال) کو حاصل کریں (اور علم کا حقیقی مقصد یعنی دنیا والوں کی ہدایت و نصیحت کو موقوف کر دیں) تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہو گئے۔ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اپنے مقاصد میں صرف ایک ہی مقصد یعنی آخرت کے مقصد کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی مقصد کو پورا فرما دیتا ہے۔ اور جس شخص کے مقاصد پر اگندہ ہوں جیسے کہ دنیا کے حالات ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پھر پرواہ نہیں ہوتی خواہ وہ کسی بھی جنگل (یعنی دنیا کی کسی بھی حالت) میں ہلاک ہو۔ (ابن ماجہ)

تنبیہ: اس حدیث کو شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قول **مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ** سے آخر تک روایت کیا ہے۔
توضیح: **لَوْ اَنْ اَهْلَ الْعِلْمِ:** اس روایت کا پہلا حصہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور ”سمعت نبیکم“ سے آخر تک آپ نے مرفوع حدیث بیان فرمائی ہے۔ روایت کا مطلب واضح ہے کہ جب عالم اپنے علم کی دولت کی خود قدر کرے گا اور اس کی عزت و عظمت کو برقرار رکھے گا تو وہ دنیا والوں کے سامنے معزز و مکرم رہے گا۔ اور اگر وہ خود اس کی ناقدری کرے گا تو لوگوں کے سامنے خود ذلیل ہو جائے گا۔ اور ناقدری یہ ہے کہ علم کی اس عظیم دولت کو نیابتاً عن رسول اللہ خدمت دین کے بجائے اپنے دنیوی مقصد کے لئے استعمال کرے اور مخلوق خدا کی رہنمائی کو نظر انداز کر کے اغراض کے پیچھے پڑ جائے۔

وَمِنْ تَشْعِبَتِ: اس کا ترجمہ پراگندہ ہونا، مختلف ہونا، شاخ و درشاخ ہونا ہے۔
الہوم: یہ ہم کی جمع ہے غم کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں مقاصد اور حالات مراد ہیں۔ اور ”احوال الدنیا“ اس سے بدل ہے جو حالات و مقاصد کے معنی میں ہے۔ ترجمہ اس طرح ہوگا کہ جن کو مختلف غموں اور حالات نے مختلف راستوں پر لگا دیا۔

ضیاع علم کے اسباب

﴿۶۰﴾ وَعَنِ الْأَعْمَشِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آفَةُ الْعِلْمِ التَّسْيَانُ وَاضَاعَتُهُ أَنْ تُحَدِّثَ بِهِ غَيْرَ أَهْلِهِ. (رواہ الدارِمی عن مسندہ)

﴿تَرْجُمَةً﴾: حضرت اعمش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”علم کی آفت بھولنا ہے اور علم کا ضائع کرنا یہ ہے کہ اس کو نا اہل کے سامنے بیان کیا جائے۔“ (دارمی نے بطریق ارسال اسے نقل کیا ہے)
توضیح: آفة العلم: حصول علم ایک عظیم دولت ہے اور ہر دولت کے حصول میں رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں تو علم کے حصول کے سامنے بھی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: **لِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ**۔

یہ تو حصول علم سے پہلے کی آفات ہیں مگر علم کے حصول کے بعد بڑی آفت آتی ہے وہ علم کا بھولنا اور نسیان ہے۔ علم کے بھولنے کے کئی اسباب ہیں ان میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس علم کی ناقدری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے۔ یا تو نالائق کو علم سکھایا جائے یا اس پر عمل نہ کیا جائے جیسے کہا گیا ہے: "تعتف العلم بالعمیل ان اجاب والا فارمحل"۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے بھولنے کی بیماری کا تذکرہ اپنے استاد کعب رحمہ اللہ کے سامنے کیا تو آپ نے نیک اعمال کی وصیت فرمائی:

شكوت الی وكيع سوء حفظی فاوصانی الی ترك المعاصی
فان العلم فضل من الہ وفضل اللہ لا یعطى لعاصی

حقیقی عالم کون ہوتا ہے

﴿۶۱﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عُثْرَةَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لِكُعْبٍ مِنْ أَزْهَابِ الْعِلْمِ قَالَ أَلَيْسَ يَتَعَلَّمُونَ بَمَا يَتَعَلَّمُونَ قَالَ قُلْنَا أَخْرِجِ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوبِ الْعُلَمَاءِ قَالَ الْكَلْبُ (رواه الدارمی)

حضرت سفیان رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رحمہ اللہ نے حضرت کعب رحمہ اللہ سے فرمایا: ”(تمہارے نزدیک) صاحب علم کون ہے؟ حضرت کعب نے جواب دیا: ”وہ لوگ جو اپنے علم کے موافق عمل کریں۔“ پھر حضرت عمر رحمہ اللہ نے پوچھا کہ کون سی چیز عالموں کے دل سے علم کو نکال دیتی ہے؟ حضرت کعب رحمہ اللہ نے جواب دیا: ”وہ ”کلب“ ہے۔“

(دارمی)

توضیح: الطبع: طبع ایک ایسی آفت اور بلا ہے جس کی وجہ سے آدمی علم کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ جب دل میں ہر وقت دنیا دار سے حصول دنیا کی لالچ موجود ہو تو ایسا شخص حق کو کیسے بیان کر سکتا ہے؟ اور جب حق کو چھپائے گا تو علم کا نور اور اس کی عظمت و برکت اس کے دل سے محو ہو کر نکل جائے گی۔ ایک حدیث میں ہے: ”کن فی الایمان مافی ایدی العاس تکن اظنی العاس۔“

علماءِ سوء سے بچو

﴿۶۲﴾ وَعَنْ الْأَخْوَصِ بْنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الشَّيْءِ فَقَالَ لَا تَسْأَلُونِي عَنِ الشَّيْءِ وَسَلُونِي عَنِ الْخَيْرِ يَقُولُهَا قَلًا قَلًا ثُمَّ قَالَ أَلَا إِنَّ قَدْرَ الشَّيْءِ وَرَأُ الْعُلَمَاءِ وَإِنَّ قَدْرَ الْخَيْرِ خَيْرُ الْعُلَمَاءِ (رواه الدارمی)

حضرت احوں بن حکیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے برائی کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھ سے برائی کے بارے میں مت پوچھو۔ بلکہ بھلائی کے بارے میں سوال کرو۔ اور ان جملوں کو آپ نے تین بار دہرایا۔ خبردار ابد لوگوں میں بدترین برے علماء ہیں۔ اور بھلے لوگوں میں سب بہتر بھلے علماء ہیں۔“

(داری)

توضیح: لا تستلونی عن الشر: یعنی صرف شر اور برائی کے بارے میں سوال نہ کرو یا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بدترین آدمی کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہے کہ سب سے بدترین آدمی کون ہے تو آنحضرت ﷺ نے یہ جواب دیا۔ حدیث کے سیاق و سباق سے یہی مطلب زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے سوال سے منع فرمایا ہے۔ کہ آپ سرپا رحمت تھے۔ تو آپ سے صرف برائی کے بارے میں نہیں بلکہ برائی اور بھلائی دونوں کے متعلق سوال کرنا چاہئے تھا۔ ۱۔

شر الشر: یعنی بدترین آدمیوں میں سے بدتر لوگ۔ ۲۔

شر العلماء: یعنی برے علماء ہیں جو اپنے آپ کو علماء بھی کہتے ہیں اور سب سے بدتر بھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کا شر اور ان کی بدی متعدی ہے جیسا کہ ان کی بھلائی متعدی ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں علماء کی ذات معیاری نمونہ اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر علماء اعلیٰ معیار کے ہوں گے تو عوام بھی ان کی تقلید میں اعلیٰ مثال قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ورنہ عام تباہی آجائے گی۔ اس حدیث میں علماء سوء مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے: ۳۔

فساد کبیر عالم متہتک واکبر منه جاہل متنسک

عالم اگر برائی کو دیکھ کر خاموش رہتا ہے تو عوام الناس مزید برائی پر جری ہو جائیں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً ایک شخص کو کسی نے گریبان سے پکڑ لیا ہے اس کے ایک بچے نے دیکھ لیا مگر جا کر مسجد میں بیٹھ کر تسبیح پھیرنے لگا۔ دوسرا بیٹا آیا۔ اس نے بھی دیکھا مگر کچھ برا مان کر چلا گیا۔ اور مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ تیسرا آیا اور اس نے معمولی سا فیصلہ کیا اور باپ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ چوتھا آیا اور اس نے تمام نوافل کو چھوڑ کر اس آدمی کو پکڑ کر ہٹا دیا اور اس کی پٹائی لگا کر باپ کو چھڑا لیا۔ اب تم خود بتاؤ کہ وہ باپ کس بیٹے سے خوش ہوگا؟ یہی معاملہ فساق و فجار کا ہے۔ کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے گریبان میں گویا ہاتھ ڈالا ہے اب جو عالم ہاتھ سے پکڑ کر ان کو ہٹائے گا تو حضور ﷺ اس سے ہی خوش ہوں گے۔

اس حدیث کے بعد آنے والی حدیث کو بھی اسی تشریح سے سمجھ لیا جائیے۔ ان حدیثوں کے مصداق اگر جدید دنیا کے وہ علماء ہوں جو دنیاوی عدالتوں کے جج ہیں اور مشرق و مغرب کے دنیا دار انہیں کو علماء مانتے ہیں تو پھر مسئلہ بہت واضح ہوگا۔

بے عمل عالم کی مذمت

﴿۶۳﴾ وَعَنْ أَبِي الدُّدَاءِ قَالَ إِنْ مِنْ أَهْلِ النَّاسِ عِنْدَ اللَّهِ مَذْلُومَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِمٌ لَا يَنْتَفِعُ بِهِ. (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت ابو دواءؓ سے روایت ہے کہ ”قیامت کے دن خدا کے نزدیک مرتبہ میں سب سے بدتر وہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔“ (دارمی)

دین کو گرانے والی چیزیں

﴿۶۴﴾ وَعَنْ زِيَادِ بْنِ حُنَيْرٍ قَالَ قَالَ لِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مَا يَهْدِيهِمُ الْإِسْلَامَ قُلْتُ لَا قَالَ يَهْدِيهِمُ أَلَّةٌ لِلْعَالِمِ وَجَدَالُ الْمَنَافِقِ بِالْكِتَابِ وَحُكْمُ الْأُمَمَةِ الْمُهْيِلِينَ. (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت زیاد بن حنیرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا ”کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کی عمارت ڈھانے والی چیز کیا ہے؟“ میں نے کہا ”مجھے معلوم نہیں ہے۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”عالم کا پھسلنا (یعنی کسی مسئلے میں عالم کا غلطی کرنا اور اس کا گناہ کرنا) منافق کا کتاب (منافی کا کتاب اللہ میں جھگڑنا اور گمراہ سرداروں کا حکم جاری کرنا۔ اسلام کی عمارت) کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔“ (دارمی)

توضیح: زلۃ العالم: یعنی ایسی لغزش جس سے سارے لوگ گمراہ ہوں گے اور اسلام کے بنیادی پانچ ارکان بھی گر جائیں گے۔

وجدال المنافق: یعنی زبان سے تو اسلام کا دم بھرتا ہے اور اندرونی طور پر اسلام کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اور اسلام کی اصل شکل کو بگاڑتا ہے۔ اور نصوص میں غلط تاویلات کرتا ہے۔ جیسے روافض اور خوارج اور دیگر اہل بدعت طبقات ہیں۔ جو علماء کی شکل میں جہال سے بدتر ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: وِیْلٌ لِلْجَاهِلِ مَعَ قَوْلٍ لِلْعَالِمِ سَبْعَ مَرَّاتٍ۔

علم نافع اور غیر نافع کی پہچان

﴿۶۵﴾ وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ أَلْعِلْمُ عَلَمَانِ فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلْمُ الثَّاقِفُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَاكَ حُجَّةُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى رَأِيهِ آتَمَ. (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت حسن بصریؓ سے روایت ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جو دل کے اندر ہوتا ہے۔ یہ علم تو نفع دیتا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جو زبان کے اوپر ہوتا ہے یہ علم آدمی پر خدا کے عزوجل کی حجت اور دلیل ہے۔ (دارمی)

توضیح: فعلم فی القلب: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں سے ایک علم ظاہر ہے۔ اور دوسرا علم باطن ہے۔ یہ دونوں علوم انجام کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ ان دونوں میں گہرا ربط ہے۔ جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ لہ

حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم نافع وہ ہوتا ہے کہ جس سے دل منور ہو جاتا ہے۔ پھر یہ علم نافع انسانی معاملات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تو معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ لہ

اور دوسرا علم مکافہ ہے جو ظاہری اعمال کے اثرات میں سے ہے۔ جس کا تعلق قلب اور باطن سے ہے۔ دوسرا علم زبانی ہے جو نہ دل پر اثر ڈالتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو متاثر کر سکتا ہے:

علم چوں بر دل زند یارے شود علم چوں بر تن زند مارے شود
عالم کہ تن آسانی دتن پروری کند او خوشترن گم است کرا رهبری کند
حجۃ اللہ: یعنی بے عمل اور صرف زبانی علم بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور دلیل وسند ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو لازم دے کر فرمائے گا کہ میں نے تمہیں علم دیا تھا تم نے اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ لہ

ہر جگہ ہر مسئلہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا

﴿۶۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَعَائِشُ قَالَا أَخَذُ هُنَا فَبَعَثْنَاهُ فِيكُمْ وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَعَثْنَاهُ قُطِعَ هَذَا الْبَلْعُومُ يَنْبَغِي فَهَرَى الظَّلَامُ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے علم کے دو برتن (یعنی دو طرح کے علم) یاد رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے۔ اور دوسرا علم وہ ہے کہ اگر میں اسے بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ ڈالا جائے۔ (بخاری)

توضیح: وعائش: یعنی نبی کریم ﷺ سے میں نے علم کے دو برتن یاد کر کے بھر لئے ایک علم کو تو میں نے عوام میں پھیلا دیا ہے جس کا تعلق ظاہر اور علم الاحکام سے تھا۔ لہ

واما الآخر: اس دوسرے علم کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ علم ظاہر کے مقابلے میں علم باطن سے میں نے برتن بھر لیا۔ یہ عارفین اور اہل اللہ سے متعلق علوم ہیں۔ اگر میں اس کو بیان کرتا شروع کروں تو لوگ نہ سمجھنے کی وجہ سے میرا گلا کاٹ دیں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس میں دوسرے علم کا تعلق آئندہ آنے والے فتنہ پرور اور فتنہ ساز وقتہ باز حکمرانوں سے ہے۔ اگر میں ان فتنوں کی نشاندہی کر کے اس علم کو ظاہر کروں گا تو یہ لوگ میری گردن اڑا دیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے دعا

مانگی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ لوٹدوں کی حکمرانی سے پہلے ہی اٹھالیں چنانچہ یزید کی حکومت آنے سے کچھ پہلے ہی آپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۔

بشلتہ: یہ بہت پیسہ سے پھیلانے اور کھولنے کے معنی میں ہے۔ ۲۔

البلعوم: یہ قلعوم کے وزن پر ہے۔ مراد قلعوم اور گھٹا ہے۔ ۳۔

واللہ اعلم کہنا بھی علم ہے

﴿۶۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهِ وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ اللَّهُ أَعْلَمُ قِيَانٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ أَنْ تَقُولَ لِمَا لَا تَعْلَمُ اللَّهُ أَعْلَمُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِيُنَبِّئَهُ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (متفق علیہ) ۴۔

ترجمہ: اور روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے (لوگوں کو مخاطب کر کے) فرمایا: ”اے لوگو! جو شخص کسی بات کو جانتا ہو تو چاہیے کہ اسے بیان کر دے اور جو نہ جانتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ کہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا اسے علم نہیں ہے اس کے بارے میں ”اللہ اعلم“ کہنا بھی علم کی ایک قسم ہے۔ (یعنی معلوم کا غیر معلوم سے تمیز کرنا بھی علم کی ایک قسم ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے واسطے فرمایا کہ قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین۔ ۵۔

ترجمہ: اے محمد! کہہ دیجئے کہ میں اس قرآن پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا اور میں تکلف کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ (بخاری)

ہر قسم کے استاد سے علم نہیں لینا چاہئے

﴿۶۸﴾ وَعَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ إِنَّ هَذَا الْعِلْمَ دِينٌ فَاَنْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُونَ دِينَكُمْ (رواہ مسلم) ۶۔

ترجمہ: حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”یہ علم (یعنی کتاب و سنت کا علم) دین ہے۔ لہذا جب (تم اسے حاصل کرو تو) یہ دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔“ (مسلم)

توضیح: فانظروا: یعنی علم دین کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ جس سے علم حاصل کیا جاتا ہے اس پر یہ اطمینان اور اعتماد ہو کہ وہ متدین، متقی، پرہیزگار اور صحیح عقائد کا حامل ہے۔ ہر کس و نا کس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ کیونکہ استاد کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ دینی مدارس میں اساتذہ دیندار ہوتے ہیں۔ تو باوجود فلسفہ اور منطق پڑھانے کے آج تک کوئی طالب علم گمراہ نہیں ہوا اور اسکول و کالج میں چونکہ عموماً اساتذہ بے دین اور طرد ہوتے ہیں تو وہاں اسلامیات پڑھانے

والے ساتھ کہ شاگرد طبع اور گراہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسلامیات پڑھانے والا خود اسلامیات کا مخالف ہوتا ہے۔ ل

غلط قاریوں کی مذمت

﴿۶۹﴾ وَعَنْ حَدِيثِهِ قَالَ يَا مَعْشَرَ الْقُرَّاءِ اسْتَعِينُوا فَقَدْ سَبَقَتْكُمْ سَبَقًا بَعِيدًا وَإِنْ أَخَذْتُمْ يَمِينًا وَثِقَةً ۚ لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا (رواہ البخاری) ۱

ترجمہ: حضرت حدیث سے روایت ہے کہ انہوں نے (قاریوں کو مخاطب کر کے فرمایا) اے قاریوں کی جماعت! سیدھے رہو، اس لئے کہ تم سبقت لے گئے ہو دوڑ کی سبقت (اگر تم سیدھے راستے سے ہٹ کر) ادھر ادھر ہو گئے تو البتہ بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔ (بخاری)

﴿۷۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَعَوُّذُوا بِاللَّهِ مِنْ حُبِّ الْحُزْنِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا حُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادِّي جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلُّ يَوْمٍ أَرْبَعِينَ مَرَّةً قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَنْ يَدْخُلُهَا قَالَ الْقُرَّاءُ الْمَرَاوُنُ بِأَعْمَالِهِمْ (رواہ الترمذی وکذا ابن ماجہ ورواہہ عن ابن عباس قال قال النبی ﷺ الخ)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا) ”تم اللہ سے پناہ مانگو جب الحزن یعنی غم کے کنوئیں سے۔“ صحابہ نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! غم کا کنواں کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دوزخ میں ایک نالہ ہے جس سے دوزخ دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔“ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ قرآن پڑھنے والے جو اپنے اعمال دکھانے کے لئے کرتے ہیں“ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ ”خدا کے نزدیک مبغوض ترین قاری ہیں جو سرداروں سے ملاقات کرتے ہیں“ اس حدیث کے راوی بخاری نے کہا کہ سرداروں سے مراد ظالم سردار ہیں۔

علماء سوء کی مذمت

﴿۷۱﴾ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَنْفَعِي مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا إِشْمُهُ وَلَا يَنْفَعِي مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رُسْمُهُ مَسَاجِدُهُمْ غَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهَدْيِ عُلَمَاؤُهُمْ شُرٌّ مَنْ تَحْتَ أَجْنِمِ السَّمَاءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِثْنَةُ وَفِيهِمْ تَعَوَّذُ ۚ (رواہ الترمذی فی شعب الایمان)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مفخر رب لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اسلام میں صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہ جائیں گے۔ ان کی مسجدیں (بظاہر تو) آباد ہوں گی مگر حقیقت میں یہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سے سب سے بدتر ہوں گے۔ انہی سے (ظالموں کی حمایت و مدد کی وجہ سے) دین میں فتنہ پیدا ہوگا۔ اور انہی میں لوٹ آئے گا۔“ (یعنی انہی پر ظالم مسلط کر دیئے جائیں گے)۔ (نقل)

توضیح: الاربعہ: یعنی مفہیم ہوں گے مصداقین نہ ہوں گے مثلاً لفظ تقویٰ ہوگا تقویٰ کا وجود نہیں ہوگا۔ لفظ علم ہوگا لیکن علم کی حقیقت اور اس کا وجود معدوم ہوگا۔ لفظ امانت ہوگا امانت نہیں ہوگی۔ لفظ خیر ہوگا خیر نہیں رہے گی۔ ہدایت کا لفظ ہوگا ہدایت نہیں ہوگی۔ نام ہوگا کام نہیں ہوگا۔

مساجد آباد ہوں گی لیکن اس میں شریعت کے مطابق عبادت نہیں ہوگی۔ لہذا مساجد اپنے اصلی مقصد سے خالی ہوں گی۔ علماء گواہ اپنے آپ کو امت کا رہنما اور پیشوا کہیں گے لیکن وہ تمام انسانوں سے زیادہ بدتر ہوں گے کیونکہ وہ تفرقہ پیدا کریں گے۔ اور ظالموں کی مدد و حمایت کریں گے۔ اپنے باطل مقاصد کے لئے طرح طرح کے فتنے برپا کریں گے۔ اس سے آخر زمانے کے علماء سوء مراد ہیں۔ اگرچہ بد دور کے علماء مراد لئے جائیں تو مطلب بہت واضح ہو جائے گا۔ کیونکہ جدید دور میں حج حضرات کو لوگ عالم مانتے ہیں۔ لہ

چونکہ حدیث میں علماء ہمد یعنی ان کے علماء کا جملہ آیا ہے۔ اور آج کل مدارس کے فضلاء کو ماڈرن طبقہ عالم نہیں سمجھتا ہے۔ جبکہ ان کے نزدیک حج حضرات علماء ہیں۔ پروفیسر علماء ہیں اصل علماء کے علم کو وہ علم تصور ہی نہیں کرتے ہیں۔ نیز ان کے علماء کے متعلق جو یہ فرمایا بالکل بر محل ہے اور دین کے مخالف غلط فیصلوں کی وجہ سے آئے روز انہی سے فتنے نکلتے ہیں اور پھر وہ فتنے انہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

زوالِ علم کا بڑا سبب عمل نہ کرنا ہے

﴿۷۲﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ لَيْبٍ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذَلِكْ عِنْدَ أَوَّانٍ ذَهَابَ الْعِلْمُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَكَمْ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَقَالَ فَكَلِّمْكَ أُمَّكَ زَيْدًا إِنَّ كُنْتُ لَأُرَاكَ مِنْ أَفْقِهِ رَجُلٍ بِالسَّبِيلَةِ أَوْ لَيْسَ هَذَا الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى يَقْرَأُونَ الشُّورَةَ وَالْإِنْجِيلَ لَا يَعْمَلُونَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيهِمَا. (رواه أحمد وابن ماجه وروى الترمذی عنه نحو ثمان مائة عن أبي أمامة)

حضرت زید بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے کسی چیز (یعنی فتنہ اور ابتلاء) کا ذکر کیا۔ پھر

فرمایا۔ ”یہ اس وقت ہوگا جب کہ علم جاتا رہے گا۔“ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! علم کس طرح جاتا رہے گا؟ حالانکہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”زیادہ! تمہیں تمہاری ماں گم کرے، میں تو تمہیں مدینہ کے لوگوں میں بڑا سمجھدار سمجھتا تھا، کیا یہود و نصاریٰ تو رات اور انجیل کو نہیں پڑھتے ہیں؟ لیکن ان کی کتابوں کے اندر جو کچھ ہے (یعنی احکام) اس میں سے وہ کس چیز پر عمل کرتے ہیں؟“ (احمد ابن ماجہ) اور ترمذی رحمہما اللہ نے اسی طرح کی روایت ”زیادہ“ سے اور اسی طرح داری نے ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

توضیح: لا یعملون: یعنی تورات و انجیل کی تعلیم جاری ہے مگر اس کے مندرجات اور تعلیمات پر عمل ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں علم کی عمارت زمین بوس ہو گئی ہے۔ کتابیں موجود ہیں تعلیم کا انتظام بھی ہے مگر علم چلا گیا ہے۔ اس لئے کہ عمل نہیں ہے اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ عمل کے انحطاط سے علم کا انحطاط آتا ہے۔ مگر مندرجہ نصاب کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ مشوروں پر مشورے جاری ہیں مگر اصل بیماری کی طرف کسی کی انگلی نہیں اٹھتی ہے کہ جس ادارہ میں صرف علماء اور طلبہ نہیں بلکہ انتظامیہ اور مربی اساتذہ تک نمازوں میں سستی کرتے ہوں اور عملی میدان میں پیچھے ہوں تو وہاں علمی انحطاط نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی بالکل سچی ثابت ہو رہی ہے ہمیں عمل کی اصلاح کرنی چاہئے۔ ل

علم میراث سب سے پہلے ضائع ہوگا

﴿۷۳﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَعْلَمُوا الْعِلْمَ وَعَلِمُوهُ النَّاسَ تَعْلَمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِمُوهَا النَّاسَ تَعْلَمُوا الْقُرْآنَ وَعَلِمُوهُ النَّاسَ فَإِنِّي إِمْرُءٌ مَقْبُوضٌ وَالْعِلْمُ سَيَقْبُضُ وَتُظْهِرُ الْفِتَنُ حَتَّى يَخْتَلِفَ اثْنَانِ فِي فَرِيضَةٍ لَا يَهْدِيَانِ أَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا.

(رواہ الدارقطنی)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ”علم کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔“ (یا فرض احکام) کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ (اسی طرح) قرآن کو سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھاؤ۔ اس لئے کہ بے شک میں ایک شخص ہوں جو اٹھایا جاؤں گا اور علم بھی اٹھایا جائے گا، اور فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ دو شخص ایک فریضہ میں اختلاف کریں گے اور کسی کو ایسا نہ پائیں گے جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ (یعنی علم کے کم ہو جانے اور فتنوں کے بڑھ جانے سے یہ حال ہو جائے گا)۔ (داری و دارقطنی)

علم بلا عمل کی مثال

﴿۷۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَثَلُ عِلْمٍ لَا يُنْفَعُ بِهِ كَمَثَلِ كَلْبٍ لَا يُنْفِقُ مِنْهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. (رواه أحمد والدارقطني)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے (یعنی نہ دوسروں کو پڑھایا جائے اور نہ ہی اس پر عمل کیا جائے) اس خزانہ کی مانند ہے جس میں سے خدا کی راہ میں کچھ بھی خرچ نہ کیا جائے۔“ (احمد وری)

توضیح: مثل علم: یعنی اس علم کی مثال جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے اس بے فائدہ رکھے ہوئے خزانے کی طرح ہے جس میں سے کوئی پیسہ کسی بھلائی پر خرچ نہ کیا جائے۔ نہ اپنے بال بچوں پر خرچ کرے اور نہ اپنے جسموں پر خرچ کرے۔ اور نہ قومی اجتماعی امور میں خرچ کرے اور نہ جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس تشبیہ سے صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ علم سے فائدہ اور استفادہ نہ کرنا ایسا ہے جیسا کہ خزانے سے خرچ نہ کرنا۔ علامہ طبری رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ اگر اس تشبیہ سے عام تشبیہ مراد لی جائے تو پھر علم کی تشبیہ خزانہ سے دیکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور خزانہ گھٹتا ہے۔ علم باقی رہتا ہے اور خزانہ فانی ہے۔ علم کی چوری نہیں ہوتی اور خزانے کی چوری ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

رھینا قسمة الجہار فیما لنا علم وللجہال مال
فان المال یفنی عن قریب وان العلم باقی لا یزال

کتاب العلم کے اختتام پر اکبر الہ آبادی وغیرہ کے چند آیات کا درج کرنا مفید ہوگا فرمایا:

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی
کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے
بچوں میں کیا آئے ٹو ماں باپ کے اطوار کی دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی
مسٹر نقلی کو عقیقی میں سزا کیسے ملی شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسے ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس چارہ ہی کیا تھا خدا تعلیم ہی ایسی ملی

الحمد للہ آج ۱۶ شعبان ۱۴۰۲ھ کو مشکوٰۃ شریف کی ابتداء سے کتاب العلم کی انتہا تک شرح اردو توضیحات کا کام مکمل ہو گیا۔ آئندہ کتاب الطہارۃ سے شرح کی ابتدا ہوگی۔ انشاء اللہ۔

کتاب الطہارۃ

پاکیزگی کا بیان

طہارت لغت میں نظافت اور پاکیزگی کو کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کی تعریف اس طرح ہے:

”غسل اعضاء مخصوصة بصفة مخصوصة“۔ (کذا فی التعریفات)

صاحب مشکوٰۃ نے سب سے پہلے کتاب الایمان کو رکھا ہے کیونکہ ایمان کے بغیر کسی چیز کا اعتبار نہیں پھر علم کا درجہ بہت اہم تھا کیونکہ علم ہر چیز کی بنیاد ہے۔ چنانچہ کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم کو رکھا علم اور ایمان کے بعد سب سے اہم درجہ نماز کا تھا کیونکہ شریعت نے ایمان کے بعد نماز کو رکھا ہے نیز نماز کائنات کی تمام عبادات کو شامل ہے اس میں قیام کی حالت میں اشجار سے مشابہت ہے، رکوع میں حیوانات کی عبادت اور سجدہ میں تمام سر بسجود چیزوں اور فرشتوں سے مشابہت ہے اور قعود میں جبال اور پہاڑوں کی عبادت سے مشابہت ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنے سے حج کی مشابہت آگئی کیونکہ حج کا تعلق بیت اللہ سے ہے اور تزکیہ نفس حاصل ہونے کی وجہ سے نماز زکوٰۃ کی عبادت کو جامع ہے اور نماز میں اکل و شرب بند کرنے سے روزہ سے مشابہت آگئی اور انتہائی عظمت و تعظیم ہونے کی وجہ سے یہ توحید کو بھی شامل ہے۔

لہذا نماز جامع العبادات ہے تو ایمان کے بعد اسی کا رتبہ و مقام ہے لیکن چونکہ طہارت نماز کے لئے شرط ہے اور شرط کا درجہ مشروط پر مقدم ہوتا ہے لہذا کتاب الصلوٰۃ سے پہلے کتاب الطہارۃ کو رکھنا پڑا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ طہارت مقام تنقیہ ہے اور نماز مقام تخلیہ ہے اور تخلیہ تخلیہ پر مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے طہارت کو مقدم رکھا۔

اہم غزالی رحمہ اللہ نے طہارت کو چار قسموں کی طرف تقسیم کیا ہے ترتیب اور تقسیم اس طرح ہے:

① طہارۃ البدن من الاخباث والانیاس۔

② طہارۃ الجوارح من الاثام۔

③ طہارۃ القلب من الرذائل والذمائم۔

④ طہارۃ السر عن ماسوی اللہ۔

یعنی دل کے احساسات اور خیالات و تصورات کو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے پاک کرنا کہ مرکز محبت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو جائے اور ماسوائے اللہ پر کوئی نظر نہ ہو۔ یہ طہارۃ السر عن ماسوی اللہ کا درجہ ہے۔

الفصل الاول

پاکیزگی نصف ایمان ہے

(۱) عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الظُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ الْيَمِينَ وَشُبْحَانُ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ أَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالصَّلَاةُ نُورٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَالْقُرْآنُ نَجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَايِعَ نَفْسِهِ فَنَعِيْفُهَا أَوْ مُؤَبِّقُهَا - رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةٍ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ - لَمْ أَجِدْ لِهَذِهِ الرِّوَايَةِ فِي الصَّحِيحَيْنِ وَلَا فِي كِتَابِ التَّحْتِيْقِ وَلَا فِي الْجَامِعِ وَلَكِنْ ذَكَرَهَا الدَّارِمِيُّ بِذَلِكَ شُبْحَانُ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ -

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”پاک رہنا آدھا ایمان ہے اور الحمد للہ کہنا (اعمال کے) ترازو کو بھردیتا ہے اور سبحان اللہ والحمد للہ بھردیتے ہیں یا فرمایا ہر ایک کلمہ بھردیتا ہے اس چیز کو جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے نہ نماز نور ہے، صدقہ دلیل ہے، صبر کرنا روشنی ہے اور قرآن تمہارے لئے یا تمہارے اوپر دلیل ہے۔ ہر شخص (جب) صبح کرتا ہے (یعنی سوکر اٹھتا ہے) تو اپنی جان کو اپنے کاموں میں بیچتا (یعنی لگاتا) ہے۔ لہذا وہ اپنی جان کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے۔ (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ ”لا الہ الا اللہ واللہ اکبر“ بھردیتے ہیں اس چیز کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔“ (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) ”میں نے اس روایت کو نہ بخاری میں پایا ہے نہ مسلم میں نہ ہی کتاب حمیدی اور جامع الاصول میں مجھے یہ روایت ملی ہے۔ البتہ دارمی نے اس روایت کو بچائے سبحان اللہ والحمد للہ کے ذکر کیا ہے۔“ (لہذا صاحب معراج کا اس روایت کو فصل اول میں ذکر کرنا درست نہیں)۔

توضیح: الظہور شطر الایمان: طہارت کے دو پہلو ہیں یعنی طہارت ظاہر اور طہارت باطن اور ہر پہلو کی دو قسمیں ہیں مثلاً طہارۃ البدن اور طہارۃ الجوارح دونوں کا تعلق ظاہر طہارت سے ہے اور طہارت باطنی میں طہارۃ القلب عن الرذائل ایک قسم ہے اور طہارۃ السر عن ماسوی اللہ دوسری قسم ہے جو درحقیقت ایمان خالص ہے۔ اب طہارۃ ظاہر آدھا ایمان ہے اور طہارت باطن بھی آدھا ایمان ہے چنانچہ اس ظاہر اور باطن کو ملانے سے مکمل ایمان بن جائے گا۔

کیونکہ ظاہری طہارت کے متعلق فرمایا کہ الظہور شطر الایمان اور طہارت باطن کے متعلق بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ

الطهور شطر الايمان تو صرف ایک قسم کی طہارت سے ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے طہارت کے مندرجہ بالا چاروں درجوں کو نصف ایمان بتایا ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ طہارت کی چاروں اقسام مقام تخلیہ میں ہیں یعنی صفائی اور پاکیزگی کا درجہ ہے اس کے بعد مقام تحلیہ ہے تو تخلیہ اور تحلیہ مل کر مکمل ایمان بنے گا۔ بعض علماء نے شطر نصف کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ صرف حصہ کے معنی میں لیا ہے تو مطلب ہوا کہ طہارت ایمان کا ایک حصہ ہے تو یہ اعتراض ختم ہوا کہ طہارت نصف ایمان کیسے ہوئی۔

الحمد لله تملأ الميزان: یعنی ثواب تولنے کا جو ترازو ہے وہ الحمد للہ کے ثواب سے بھر جائے گا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ثواب تو اعراض میں سے ہے اس سے ترازو بھرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اس کا جواب گزشتہ زمانہ کے علماء کے لئے کچھ مشکل تھا مگر آجکل تو اعراض کے تولے جانے کا مسئلہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ اعراض تو لانا مشاہدہ میں آگیا ہے مثلاً تھرما میٹر سے بخار کے درجات تولے جاتے ہیں بعض آلات سے نظر تولی جاتی ہے۔ درجہ حرارت و برووت معلوم کیا جاتا ہے۔ اس کا الگ ترازو ہے اور جہاز میں ارتفاع و انخفاض طوالت مسافت اور قرب و بعد تولا جاتا ہے۔ اگر ایک کمزور انسان اتنا کچھ کر سکتا ہے تو قادر مطلق بادشاہ کے لئے اعراض کا تولنا کیا مشکل ہے؟

قدیم زمانہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ اعراض دنیا میں اعراض ہیں عالم آخرت میں مجسم ہوں گے پھر ان کو تولنا جائے گا بعض نے اعمال کے دفاتر اور نامہ اعمال کے رجسٹر مراد لیا ہے کہ گناہ اور ثواب کے بنڈل تولے جائیں گے۔

والصلوة نود: جیسا ادھر بیان کیا گیا کہ صلوٰۃ تمام عبادات کے لئے جامع ہے تو یہ عالم دنیا عالم برزخ اور عالم آخرت میں برتاری کی اور ظلمت کے لئے نور ہی نور ہوگی۔

والصدقة برهان: یعنی ایمان پر دلیل ہے کیونکہ ایمان کے پرکھنے کے لئے سب سے معیاری کسوٹی مالی قربانی ہے کھرے ایمان والا قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور کھوٹا تو کھوٹا ہے۔ صدقہ کی یہ قربانی فرض نفل واجب سب قربانیوں کو شامل ہے مالی قربانی کتنی مشکل ہے ملاحظہ ہو۔

گر جان ظلی تو بخشم گر سر ظلی تو بخشم
وگر زر ظلی سخن دریں است

الصبر: صبر کا لفظ پوری شریعت کو شامل ہے کیونکہ صبر کی تین قسمیں ہیں: صبر علی المصیبة، صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصية ان تین قسموں میں پوری شریعت آگئی۔

القرآن حجة: یعنی اگر قرآن کو پڑھ کر اس کے احکامات پر عمل کیا تو یہ پڑھنے والے اور عمل کرنے والے کے لئے دلیل اور حجت ہے کہ وہ مومن مسلمان اور مستحق جنت ہے ورنہ یہی قرآن اس بد عمل پر دلیل بنے گا اور اس کے خلاف شکایت کرے گا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔

۱۔ المرقاۃ ۲۸ ۲۔ المرقاۃ ۲۸ ۳۔ المرقاۃ ۲۸

۴۔ المرقاۃ ۲۸ ۵۔ المرقاۃ ۲۸ ۶۔ المرقاۃ ۲۸

"یغلبو" صبح کو نکلتا "ہائے نفسہ" یعنی اپنی جان کو بچتا ہے عمل کے بدلے میں نیک عمل کے بدلے میں یا برے عمل کے بدلے میں اسی پر آنے والا جملہ مقرر ہے۔ لہ

فمعنیہا: یعنی نیکی کر کے دوزخ سے اپنی جان چھڑاتا ہے۔ او موبقہا یعنی برائی کے بدلے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ لہ

تین چیزوں سے گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَخْلِكُكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللَّهُ بِهِ الْخَطَايَا وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ اسْتَبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطَى إِلَى الْمَسَاجِدِ وَالْعِظَازُ الصَّلَاةُ فَذَلِكُمْ الرِّبَاطُ وَفِي حَدِيثٍ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ فَذَلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذَلِكُمْ الرِّبَاطُ زَكَاةٌ مَرَّتَيْنِ﴾ (رواہ مسلم فی رد المحتار ج ۱ ص ۱۸۸)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا اور کہا میں تمہیں وہ چیز نہ بتا دوں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو دور کر دے اور جس کے سبب (جنت میں) تمہارے درجات کو بلند کرے؟ صحابہ نے عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ" آپ ﷺ نے فرمایا مشقت کے وقت (یعنی بیماری یا سخت جاڑے میں) وضو کا پورا کرنا، مسجد کی طرف (گھر سے دور ہونے کی وجہ سے) کثرت سے قدموں کا رکھنا اور (ایک) نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ رباط ہے اور مالک بن انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پس یہ رباط ہے پس یہ رباط ہے دوسرے (مسلم) اور ترمذی کی روایت میں تین مرتبہ ہے۔

توضیح: الا ادلکھ: یہاں ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور "الا" کا کلمہ نفی کے لئے ہے تنبیہ کے لئے نہیں کیونکہ اس کے جواب میں ہلی کا کلمہ آیا ہے جو نفی پر دلیل ہے۔ لہ

یمحو: محو کرنے سے مراد معاف کرنا ہے یا نامہ اعمال سے مٹانا مراد ہے۔ لہ
استبَاغُ الْوُضُوءِ: یعنی مکمل وضو بنانا کہ تین بار پانی بہایا جائے عضو کو مکمل طور پر دھویا جائے اور محل کے دھونے میں تطویل غرہ سے کام لیا جائے۔ لہ

علی المکارہ: مکرہ کی جمع ہے مشقت کے معنی میں ہے کہ سخت سردی میں یا سخت گرمی میں یا بیماری کی حالت میں وضو بنا رہا ہے اور محنت اٹھا رہا ہے یا پانی کا ملنا مشکل ہو رہا ہے یا بچنے والوں مل رہا ہے یہ سب مکارہ کی صورتیں ہیں۔ لہ
و کثرة الخطا: خطوۃ قدم اٹھانے کے معنی میں ہے مراد کثرت سے مسجد میں آنا جانا ہے کہ نماز کے لئے یا ویسے عبادت

کے لئے یا مسجد سے محبت کے لئے بار بار مسجد میں آتا جاتا ہے ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دور دراز علاقہ سے مسجد میں آتا ہے تو قدم زیادہ پڑتے ہیں جس سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہ

انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز پڑھ لی اور دوسری نماز کے لئے مسجد میں بیٹھ کر انتظار کر رہا ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز پڑھ لی اور گھر وغیرہ چلا گیا لیکن دل دوسری نماز کے ساتھ لگا ہوا ہے جیسا حدیث میں ہے:

”وَزَجَلَ قَلْبُهُ مُعَلِّقٌ بِالْمَسَاجِدِ“۔

فذلکھ: یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ذالک اسم اشارہ ہے اور کم کی ضمیر مخاطب کے اعتبار سے آتی ہے اگر مخاطب مفرد ہے تو ذالک آتا ہے متنیہ ہے تو ذالکھا آتا ہے اور جمع کے لئے ذالکم آتا ہے اس کا ترجمہ اس طرح ہوتا ہے یہ جو کام ہے تم ایک یا تم دو یا تم سب کو کہہ رہا ہوں فذلکھن زلیخائے کہا یہ جو کام ہے تم سب عورتوں کو کہہ رہی ہوں آنحضرت نے فرمایا: ”کیف تیکن“ یعنی یہ عانتہ کیسی ہے تمہیں کہہ رہا ہوں۔

الرباط: سرحدات اسلامیہ پر کفر کے مقابلے میں پہرہ دینے کو رباط کہتے ہیں کیونکہ اس شخص نے اپنے آپ کو اور اپنے گھوڑوں کو وہاں پابند کر کے گویا باندھ رکھا ہے اس لئے یہ رباط کا اصل مفہوم اور مصداق ہے پھر اس کا چونکہ بڑا ثواب ملتا ہے لہذا وہ ثواب یہاں اس انتظار میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے دیتا ہے تو یہ ثواب کے اعتبار سے رباط ہے اصل رباط تو سرحد پر ہوتا ہے۔

۱۱۱۱۱۱۱۱

وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں

﴿۳﴾ وَعَنْ عُمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ غَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِهِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح کرے (یعنی اس کے سنن و مستحبات کی رعایت کے ساتھ) تو اس کے (مغیرہ) گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: فأحسن الوضوء: یعنی اچھی طرح وضو کرے اچھے وضو سے مراد یہ ہے کہ اس کے فرائض و سنن اور مستحبات و آداب کا پورا پورا خیال رکھے اور اس میں کسی کراہت کا ارتکاب نہ کرے۔

خروج خطایاہ: اس مقام پر بھی وہی معترض آتا ہے کہ گناہ اعراض کے قبیل سے ہیں اور لفظ خروج تو اجرام و اجسام

کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سوال کے بھی وہی جوابات ہیں جو اس سے پہلے حدیث نمبر (۱) میں گزر چکے ہیں کہ آج کل اعراض تو لے جاتے ہیں لہذا اب یہ مسئلہ مشکل نہیں رہا۔ یہاں دوسرا جواب یہ ہے کہ خطا یا سے مراد اس کے اثرات ہیں کہ ان گناہوں کے داغ زائل ہو جاتے ہیں یا یہ کہ عالم مثال میں معاصی کی ایک مجسم شکل ہوتی ہے اس کے اعتبار سے خروج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے "من جسدہ" یعنی تمام بدن سے یا اعضاء وضو سے گناہ خارج ہو جاتے ہیں۔ ل۔

من لمحضت اظفارہ: یہ مبالغہ کے طور پر فرمایا گیا ہے کہ گناہ بالکل ختم ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل کر ختم ہو جاتے ہیں یہ محاورہ ایسا ہی ہے جیسا کہتے ہیں "تمہاری شخی ناک کے راستے سے نکال دیں گے"۔ اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ خطا یا سے کون سے گناہ مراد ہیں آیا کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

تو علماء نے جواب دیا ہے کہ اس سے صفائے گناہ مراد ہیں کبار بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے کیونکہ حدیث میں "معالہ یؤت کھیرۃ" کی قید صراحت کے ساتھ موجود ہے ہاں اگر وضو کرتے کرتے توبہ بھی کی تو کبار بھی معاف ہوں گے اگر توبہ نہ کی تو صفائے سارے معاف ہو جائیں گے اور کبار کمزور پڑ جائیں گے۔

یہاں دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وضو سے صفائے معاف ہوتے ہیں تو شریعت نے نصوص کو مطلق کیوں چھوڑا ہے صفائے کی قید لگا کر اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں مسلمان کی شان ایسی ہے کہ اس کے ذمہ بھی کوئی کبیرہ گناہ ہی نہ ہو یا کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا اور یا ارتکاب کے ساتھ بے چین ہو کر توبہ کی لہذا وضو کے وقت صفائے معاف ہوتے ہیں کبار نہیں ہوتے۔

اب یہاں ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ جب وضو سے سارے صفائے محل گئے تو پھر مسجد میں جانے اور نوافل وغیرہ نمازوں سے کون سے خطا یا معاف ہوں گے جبکہ وہاں بھی صفائے کی معافی کا ذکر آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ صفائے کا ارتکاب بھی ہر وقت ہوتا ہے تو دوسرے اعمال سے وہ معاف ہوں گے یا وضو کے بعد دیگر اعمال سے درجات بلند ہوں گے اور وضو سے صفائے معاف ہوں گے یا خاص قسم کے گناہ وضو سے معاف ہوں گے اور کچھ اور قسم کے صفائے نماز سے معاف ہوں گے۔ ل۔

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوْ الْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَ مِنْ وَجْهِهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ تَقَرَّرَ إِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ كَانَتْ تَطَعُّهَا يَدَاؤُهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَ كُلُّ خَطِيئَةٍ مَسَّتْهَا رِجْلَاؤُهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ حَتَّى يَخْرُجَ نَجَافًا مِنَ الذُّنُوبِ. (رواه مسلم)﴾

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا جب کوئی بندہ مسلمان یا فرمایا مسن

وضو کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے منہ کو دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے چہرے سے نکل جاتے ہیں (یعنی جو گناہ آنکھوں سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب دونوں ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں کے تمام گناہ جن کو اس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں (یعنی جو گناہ ہاتھ سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب وہ دونوں پاؤں کو دھوتا ہے تو اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف وہ پاؤں سے چلا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: خروج من وجہہ: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اذنین اور فم دونوں بھی وجہ یعنی چہرے میں داخل تھے مگر ان کا ذکر یہاں نہیں کیا حالانکہ ان سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں صرف آنکھوں کے گناہ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آنکھیں بدن میں دل کے لئے سب سے بڑی جاسوس ہیں اور ارتکاب معاصی میں ان کو امتیازی شان حاصل ہے جب آنکھوں کے گناہ وضو سے دھل گئے تو باقی اعضاء مثلاً ناک کان اور زبان کے گناہ بطریق اولیٰ خارج ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ کہ ناک اور منہ کے گناہ تو مضمرہ اور اشتقاق سے نکل جاتے ہیں اور کان کے گناہ مسح کے ذریعہ خارج ہو جاتے ہیں اس لئے یہاں صرف آنکھوں کے گناہوں کے خروج کا ذکر فرمایا۔

او مع آخر قطر الماء: یعنی پانی کے آخری قطرہ سے گناہ زائل ہو جاتے ہیں یہاں اوٹک راوی کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور بعض نے کہا کہ او تویع کے لئے بھی لیا جاسکتا ہے۔

حتی ینخرج: یہاں سوال یہ ہے کہ جب تمام گناہوں سے پاک ہو گیا تو پھر مشی الی المسجد اور صلوٰۃ کس چیز کے لئے کفارہ بنیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے بعض قسم کے صغائر وضو سے دھل گئے ہوں اور بعض نماز سے دھل جائیں گے دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے نماز کبار کے لئے کفارہ بن جائے جب تو بہ ساتھ ہو جائے یا نماز کبار کمزور کرنے کا کام کرے یا رفع درجات کا کام کرے۔

نہلیا: پاک و صاف کے معنی میں آتا ہے یہ حال واقع ہے اگر وضو کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھ لی اچھی نیت کی تو پورا بدن پاک ہو جائے گا ورنہ وضو کے اعضاء پاک ہو جائیں گے جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے۔

اچھا وضو اور اچھی نماز گناہوں کا کفارہ ہے

﴿وَعَنْ عُمَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ أَمْرٍ مُسْلِمٍ تَحْطَرُّهُ صَلَاةٌ مَكْتُوبَةٌ فَيُخْسِنُ وَضُوءُهَا وَخُشُوعُهَا وَرُكُوعُهَا إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلُهَا مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يُؤْتِ كَيْبَرَةً وَذَلِكَ الذَّهْرُ كُلُّهُ﴾ (رواہ مسلم)

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو مسلمان فرض نماز کا وقت آنے پر اچھی طرح وضو کرے اور نماز میں خشوع و رکوع اچھی طرح ادا کرے تو (اس کی یہ نماز) ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے جو اس نے نماز سے پہلے کئے تھے بشرطیکہ وہ گناہ کبیرہ نہ ہوں اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ (یہ فضیلت ہر زمانہ میں قائم رہتی ہے)۔

(مسلم)

توضیح: فیحسن وضوءہا: ضمیر نماز کی طرف راجع ہے اچھا وضو وہ ہوتا ہے جس میں فرائض اور سنن و مستحبات کا پورا خیال رکھا جائے۔ ۱۔

وخشوعہا: یعنی ظاہری اور باطنی عاجزی کے ساتھ نماز ادا کرے اعضاء پر سکون ہوں اور قلب متوجہ ہو اور نگاہیں جائے سجدہ پر جھکی ہوئی ہوں۔ ۲۔

ورکوعہا: رکوع کا ذکر کیا سجدہ کا نہیں کیا کیونکہ رکوع کے بعد سجدہ آتا ہے تو الگ ذکر کی ضرورت نہ تھی نیز رکوع سجدہ سے زیادہ مشکل تھا اس لئے خصوص کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رکوع کا خصوص کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ یہ مسلمانوں کا خصوصی شعار ہے۔ من الذنوب: اس سے صفائے مراد ہیں۔ ۳۔

مالہ یؤت کبیرۃ: یہ استثناء کی جگہ میں ہے یعنی الا کبیرۃ کبیرہ کے علاوہ گناہ معاف ہوں گے کیونکہ کبار کی مغفرت کے لئے توبہ کرنا ضروری ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ کبار اور صفائے کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑنا چاہیے اور احادیث کے ظاہری الفاظ کو اپنانا چاہیے۔ چنانچہ متقدمین علماء فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے مگر متاخرین نے صفائے اور کبار کا فرق کیا ہے کیونکہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے لہذا صفائے معاف کبیرہ نہیں، بعض نے تطہیر دی ہے کہ لغت کے اعتبار سے ذنوب و سیئات کا فرق کرنا چاہیے یعنی جس طرح لغت میں ذنوب اس گناہ کو کہتے ہیں جو باعث عیب ہو ”الذنوب العیوب“ اور المخطیاء اس گناہ کو کہتے ہیں جو صحیح کے برعکس غلطی ہو ”معصیت“ نافرمانی کو کہتے ہیں اور ”سیئات“ برائی کے معنی میں ہے تو سب سے اعلیٰ درجے کے گناہ ”المعاصی“ ہیں اس کے بعد دوسرے نمبر پر ”الاثم“ ہے اس کے بعد تیسرے نمبر پر ”السیئات“ ہیں پھر چوتھے نمبر پر ”المخطیاء“ ہیں اور پانچویں نمبر پر ”الذنوب“ ہیں تو جو لفظ جہاں احادیث میں آجائے اس کے مفہوم کے اعتبار سے معنی مراد لینا چاہیے اگر صغیرہ کا لفظ ہو تو صغیرہ لیا جائے اور اگر کبیرہ کا لفظ ہو تو کبیرہ مراد لیا جائے۔

وذلك الدهر كله: یعنی نماز کا کفارہ ہونا کسی زمانہ کے ساتھ خاص نہیں اور نہ کسی خاص فرض نماز کے ساتھ خاص ہے بلکہ یہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر فرض نماز کے لئے۔ ۴۔

وضو کرنے کا طریقہ

﴿۶﴾ وَعَنْهُ أَنَّهُ تَوَضَّأَ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ تَمْضِضُ وَاسْتَنْزَلْتَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْبِرْفِ فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرَى إِلَى الْبِرْفِ فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ الْيُسْرَى فَلَا تَأْكُلُ ثُمَّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا ثُمَّ يُصَلِّيَ رَكَعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهُ فِيهِمَا يَشْفِي عُفْرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ ۖ (متفق عليه وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)

متفق ہے: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ وضو کیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اپنے ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈالا پھر تین مرتبہ گلی کی اور ناک جھاڑی (یعنی ناک میں پانی دینے کے بعد ناک نکلے) پھر تین مرتبہ منہ دھویا، پھر تین مرتبہ اپنا داہنا ہاتھ کنبی تک دھویا (یعنی کنبی سمیت دھویا) پھر تین مرتبہ اپنا بائیں ہاتھ کنبی تک دھویا پھر اپنے سر پر مسح کیا پھر اپنا دایاں پیر تین مرتبہ دھویا، پھر بائیں پیر تین مرتبہ دھویا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا جس طرح اب میں نے وضو کیا“ پھر فرمایا جو شخص میرے اس وضو کی مانند وضو کرے (یعنی فرائض و سنن اور مستحبات و آداب کی رعایت کے ساتھ وضو بنائے) پھر دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے اندر اپنے دل سے کچھ باتیں نہ کرے (یعنی پورے دھیان سے نماز پڑھے) تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم) اس روایت کے الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

توضیح: ثم مسح برأسه: اس حدیث میں وضو کے اعضاء کے ساتھ تین بار دھونے کا لفظ آیا ہے لیکن مسح کے ذکر کے ساتھ تین بار کا لفظ نہیں آیا اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تین بار مسح کرنا اور مسح میں تثلیث کرنا کوئی مسنون حکم نہیں ہے اور یہی احناف کا مسلک ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی ہاتھ اور چہرہ کے دھونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہاں مضبوطی اور استنشاق میں اختلاف ہے جو بعد میں آ رہا ہے۔

لا يحدث نفسه: یعنی دو رکعتیں ایسی پڑھ لے جس میں امور دنیوی کے خیالات دل میں نہ لائے اس سے وہ خیالات مراد ہیں جو اختیاری ہوں غیر اختیاری خیالات مراد نہیں کیونکہ ایسے وساوس اور خیالات جو حدیث النفس کے درجہ میں ہوں وہ شرعاً معاف ہیں بہر حال اس عظیم فضیلت کے حصول کے لئے حضور قلب ضروری شرط ہے بعض اللہ والوں نے ان دو رکعتوں کی فضیلت کے حصول کے لئے دو دو رکعتیں مسلسل پڑھیں ہیں۔

وضو کے بعد دو نفل کا ثواب

﴿۷﴾ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ

فِيْخَيْرِيْنَ وَطَوَّأْتُمْ يَكُوْمَ فَيُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلٰی مَا يَاقِلُهُ وَوَجْهًا اِلَّا وَجْهًا لِّه الْجَنَّةُ.

(رواۃ مسلم)

ترجمہ: اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو مسلمان وضو کرے اور اچھا وضو کرے پھر کھڑا ہو اور دو رکعت نماز پڑھے دل اور چہرہ سے متوجہ ہو کر (یعنی ظاہر و باطن سے متوجہ ہو کر) تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

توضیح: رکعتین: مضمون کے اعتبار سے یہ حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث ایک جیسی ہیں۔ دو رکعتوں سے مراد یا توحیۃ الرضو ہے اور یا تحیۃ المسجد ہے۔ اے وجہاً لہ الجنة یعنی ان دو رکعتوں کی خاصیت تو یہی ہے کہ جنت واجب ہو جائے گی لیکن آخرت میں فیملہ مجنون مرکب پر ہوتا ہے۔ تو صرف ان رکعتوں کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ دیگر حسنات و سیئات کو ملا کر حدِ اوسط نکالی جائے گی اور پھر فیملہ ہوگا بہر حال کسی دنیوی خیال سے پاک ہو کر دو رکعت پڑھنا بھی آسان کام نہیں "الا من رزقہ اللہ"۔

وضو کے بعد کی دعا

﴿۸﴾ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبَلِّغُ أَوْ فَيَسْبِغُ الْوُضُوءَ ثُمَّ يَقُولُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ قُلِي رَوَاتِهِ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا فُوجِعَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ النَّارِيَّةِ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ. فَكُنَّا رَوَاتِهِ مُسْلِمًا فِي صُحُوفِ الْحَمْدِ يَدْنِي فِي أَفْرَادِ مُسْلِمٍ وَكَذَا الْبَيْتُ الْأَيْدِي فِي جَامِعِ الْأَصْوَابِ وَذَكَرَ الشَّيْخُ عَمِّي الدِّينِيُّ الْقَوَوِيُّ فِي آخِرِ حَدِيثِهِ مُسْلِمًا عَلَى مَا رَوَيْنَاهُ وَرَأَى الدِّينِيُّ أَلْفُ مَرَّةٍ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ وَالحديث الذي رواه عَمِّي الشَّيْخُ فِي الصَّحَاحِ آمَنَ تَوَضَّأُ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ إِلَى آخِرِهِ.

(رواۃ الترمذی فی جامعہ و تہذیبہ الا حلیۃ اشہد ان لا اله الا الله)

ترجمہ: اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے جو شخص وضو کرے اور اس (کی خوبوں) کو انتہا پر پہنچا دے یا آپ نے یہ الفاظ فرمائے کہ پورا وضو کرے پھر کہے اشہد ان لا اله الا الله وان محمدًا عبدہ ورسولہ (یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ خدا کے بندے اور رسول ہیں) اور ایک روایت میں ہے کہ (اس طرح کہے) اشہد ان لا اله الا الله وحده لا

شريك له واشهد ان محمدًا عبدا ورسوله تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جس دروازے میں سے اس کا جی چاہے جنت میں داخل ہو۔ (مسلم، حمیدی، جامع الاصول) اور امام نووی نے مسلم کی حدیث کے آخر میں جس کو ہم نے روایت کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ ترمذی نے (شہادتین پر اس دعا کے) یہ الفاظ زیادہ لکھے ہیں اے اللہ مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا اور پاکیزگی کرنے والوں میں شامل کر (یعنی مسلم کی روایت جس طرح ہم نے ذکر کی ہے وہی روایت امام نووی نے مسلم کی شرح میں نقل کی ہے اور اس کے آخر میں دوا الترمذی الخ کی عبارت بڑھادی ہے) اور وہ حدیث جس کو امام محی السنۃ نے صحاح میں نقل کیا ہے یعنی من توضحاً فاحسن الوضوء الخ جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا“ آخر تک اس کو امام ترمذی نے اپنی جامع میں بیحدہ اسی طرح نقل کیا ہے صرف ان محمد اسے پہلے احمد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

توضیح: اللہم اجعلنی: اس حدیث میں وضو کے دوران روایات میں مختلف دعائیں اور مختلف الفاظ آئے ہیں۔ جس سے بظاہر تضاد و اضطراب کا خیال گزرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے مختلف روایات کے مختلف الفاظ کو یکجا کر کے اشارہ کیا کہ جو شخص ان دعاؤں میں سے جو پڑھنا چاہتا ہے وہ پڑھ سکتا ہے۔ بعض روایات میں تقدیم و تاخیر سے بھی ان دعاؤں کا ذکر آیا ہے۔ بعض میں شہادتین کا ذکر ہے بعض میں نہیں ہے مطلب یہ کہ جو شخص جو دعا پڑھے گا سنت ادا ہو جائے گی۔ آخر میں صاحب مشکوٰۃ نے صاحب مصابیح پر اعتراض کیا کہ اس نے جس روایت کو صحاح میں ذکر کیا ہے یہ وہاں نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ترمذی نے ذکر کی ہے۔ لہ

شماعیۃ ابو اب: داخل تو ایک دروازہ سے ہوگا مگر ایسے جنتیوں کے اکرام و تعظیم کے لئے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے جہاں سے جانا چاہیں گے جائیں گے۔

کے جہاں سے جانا چاہیں گے جاگن گے۔

قیامت میں وضو کے اغضاء چمکتے ہوں گے

﴿٩﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنْ أَقْبَحَ يَدْعُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُسْتَجْلِبِينَ مِنْ أَكْأَادِ الْوُطُوءِ فَمَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ٥

اور حضرت ابو جریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قیامت کے روز میری امت اس حال میں پکاری جائے گی کہ وضو کے سبب سے ان کی پیشانیاں روشن ہوں گی اور اعضاء چمکتے ہوں گے۔ لہذا تم میں سے جو شخص چاہے کہ وہ اپنی پیشانی کی روشنی بڑھائے تو اسے چاہئے کہ ایسا ہی کرے۔“ (بخاری و مسلم)

توضیح: غڑا: یہ اگر کی جمع ہے اور غڑا اصل میں اس سفید داغ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی پر ہوتا ہے مراد چہرہ ہے پھر ہر روشن اور مشہور چیز پر بولا گیا ہے۔ **مچھلین:** یہ مچھیل اور مچھل سے مشتق ہے جس کا اطلاق جانوروں کے پاؤں کی سفیدی پر ہوتا ہے جو نہایت خوبصورت ہوتی ہے اور یہ بمنزل قید ہوتی ہے کیونکہ یہ سفیدی پاؤں پر قید کی طرح محیط

قائم و دائم رہو۔ استقامت سے متعلق حضرت پاک ﷺ نے فرمایا شہید بنی ہو جو اخواستھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا استقامت اس کو کہتے ہیں کہ "لا یو و خون رو شان الشعالب" یعنی لومڑیوں کی طرح قلابازیاں نہ کھائیں بلکہ حق پر ڈٹ جائیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے فرائض اعمال پر قائم رہنے کو استقامت فرمایا اور امام غزالی رضی اللہ عنہ نے اس کو پہل صراط کا نام دیا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کہتے ہیں: "الاستقامة فوق الف کرامۃ" چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اولن تمحصوا یعنی یہ کام تمہارے لئے بہت مشکل ہے اگر تم یہ نہیں کر سکو تو اتنا تو کرو کہ دوام علی الوضو کرو کیونکہ یہ مومن کی شان ہے اور محافل علی الصلوٰۃ کے لئے معاون ہے۔ دوسرا مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ دین پر بغیر افراط و تفریط کے چلتے رہو مکمل حقوق ادا کیا کرو۔ اخلاق کی استقامت ہو عقائد و عبادات کی استقامت ہو مگر یہ مشکل ہے محنت کرنی پڑے گی۔ ۱۔

وضو پر وضو کی فضیلت

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ عَلَى طَهْرٍ كُتِبَ لَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔ ۱۔
(رواۃ ابی داؤد)

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص وضو کے اوپر وضو کرے تو اس کے واسطے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ (ترمذی)

توضیح: علی طہر: یہ وضو علی الوضو کا مسئلہ ہے اس میں دس گنا ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے مگر اس میں چند شرائط ہیں ایک یہ کہ پہلے وضو کے ساتھ کچھ عبادت کرے یا کوئی دنیوی کام کر کے فاصلہ پیدا کرے جس سے حد فاصل بن جائے اور مجلس کی بھی تبدیلی آجائے اگر ایسا نہ ہو تو ایک مجلس میں وضو بنانے کے بعد نیک کام کئے بغیر وضو بنانا تحصیل حاصل اور اسراف کے زمرہ میں آتا ہے جس کو صاحب فتح القدیر نے مکروہ لکھا ہے۔ ۱۔

الفصل الثالث

وضو نماز کی کنجی ہے

﴿۱۷﴾ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطَّهُّورُ۔ ۱۔
(رواۃ ابی داؤد)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جنت کی کنجی نماز اور نماز کی کنجی وضو ہے"۔ (احمد)

توضیح: مفتاح الجنۃ: یہ تشبیہ ہے کہ صلوٰۃ و نماز ایک خزانہ کی مانند ہے اور وضو اس کے لئے کنجی کی مانند ہے اور ایسے ہی جنت ایک خزانہ ہے اور نماز اس کی کنجی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ مقتل خزانہ کنجی کے بغیر نہیں کھولا جاسکتا ہے۔ لہذا نماز وضو کے بغیر ممکن نہیں ہے اور جنت کا داخلہ نماز کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مقتدی کا خراب وضو امام کو خراب کرتا ہے

﴿۱﴾ وَعَنْ شَيْبِ بْنِ أَبِي رَوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّؤْمَةَ فَالتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلَّى قَالَ مَا تَأْتِلُ أَقْوَامٌ يُصَلُّونَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُونَ الظُّهُورَ وَآلَمَّا يَلْتَبَسَ عَلَيْنَا الْقُرْآنُ أَوْ لَمَّا يَكُنْ (رواہ الترمذی) ۷

ترجمہ: اور حضرت شیبہ ابن ابی روح آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے کسی صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (ایک مرتبہ) صبح کی نماز پڑھی اور اس کے اندر سورۃ روم کو پڑھا (ثناء نماز میں) آپ کو تباہ ہو جانا چاہیے جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اچھی طرح وضو نہیں کرتے اور اس وجہ سے یہ لوگ ہم پر قرآن میں اشتہاء ڈالتے ہیں۔ (نقل)

پاکیزگی نصف ایمان ہے

﴿۱﴾ وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي يَدَيْهِ أَوْ فِي يَدِيهِ قَالَ التَّسْبِيحُ نِصْفُ الْإِيمَانِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ وَالتَّكْبِيرُ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَالصُّوْمُ نِصْفُ الصُّوْمِ وَالظُّهُورُ نِصْفُ الْإِيمَانِ (رواہ الترمذی) وقال هذا حديث حسن ۷

ترجمہ: اور قبیلہ بنو سلیم کے ایک شخص روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے چند باتوں کو (جو آگے مذکور ہیں) میرے ہاتھ پر یا اپنے ہاتھ پر شمار کیا (چنانچہ) آپ نے فرمایا سبحان اللہ کہنا (یعنی اس کا ثواب) آدھا ترازو بھر دیتا ہے۔ الحمد للہ (سبحان اللہ کے ساتھ) کہنا (یا فقط الحمد للہ کہنا ہی پورے) ترازو کو بھر دیتا ہے اور اللہ اکبر کہنا بھر دیتا ہے اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ اور روزہ آدھا مہر ہے اور پاک رہنا آدھا ایمان ہے (ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)۔

توضیح: التسبیح نصف الایمان: کیونکہ تسبیح صفاتِ سلیمہ سے تزیین اور پاکی کا نام ہے اور صفاتِ سلیمہ صفاتِ شوبہ کے مقابل میں نصف ہیں اور الحمد للہ صفاتِ شوبہ میں سے ہے لہذا دونوں کے جمع ہونے سے ترازو بھر جاتا ہے۔ ۷

والصوم نصف الصبر: صوم سے شہوت فرج اور شہوت بطن کے تمام مرغوبات چھوٹ جاتے ہیں لیکن صبر تین اجزاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی صبر علی الطاعة صبر علی المعصية اور صبر عن المعصية۔ لہذا صوم میں صبر کے یہ سارے اجزاء نہیں پائے جاتے بلکہ دو بڑے بڑے اجزاء یعنی صبر عن شهوة البطن اور صبر عن شهوة الفرج پائے جاتے ہیں، چنانچہ صوم کو نصف صبر کہا گیا۔

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ السُّنَّامِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فَمَضَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيهِ وَإِذَا اسْتَنْكَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ أُنْفِهِ فَإِذَا غَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَصْفَارِ عَيْنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ يَدَيْهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ يَدَيْهِ فَإِذَا مَسَحَ بِرَأْسِهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَأْسِهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ أُذُنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ رِجْلَيْهِ ثُمَّ كَانَ مَشْيُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ وَصَلَاتُهُ كَالْفِلَةِ لَهُ. (رواه مالك والنسائي)

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ مناہجی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب بندہ مومن وضو کر ارادہ کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتے ہیں اور جب ناک چھوڑتا ہے تو گناہ اس کی ناک سے خارج ہو جاتے ہیں جب اپنا منہ پانی سے دھوتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو گناہ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو گناہ اس کے سر سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں کانوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے تو گناہ اس کے دونوں پاؤں سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں پھر مسجد کی طرف اس کا چلنا اور اس کی نماز اس کے واسطے (اعمال میں) زیادتی ہے۔ (مالک و نسائی)

توضیح: حتیٰ تخرج من اذنه: سر کے مسح کرنے سے جو گناہ خارج ہو گئے اس کا راستہ کان بتایا گیا ہے معلوم ہوا کہ دونوں کان مسح میں سر کے تابع ہیں لہذا اس کے لئے جدید پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ یہ مسئلہ آ رہا ہے۔

وضو والے لوگ قیامت کے دن چمکتے ہوئے

(۱۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَلَى الْمَغْبِرَةِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ذَا رَقِمْ مُؤْمِنِينَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَا حَقْلُونَ وَبَدِثَ أَكَا قَدَرًا أَيْتَا إِنْخَوَانًا قَالُوا أَوْلَسْنَا إِنْخَوَانًا يَا رَسُولَ اللَّهِ

قَالَ أَنْتُمْ أَصْحَابُ وَأَخْوَانُكَ الَّذِينَ لَمْ يَأْتُوا بَعْدَ فَقَالُوا كَيْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَمْ يَأْتِ بَعْدَ مِنْ أُمَّتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ أَرَأَيْتَ لَوْ أَنَّ رَجُلًا لَهُ خَمِيلٌ غُرٌّ مُتَجَلَّةٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنِ خَمِيلٍ خُفِّهِمْ بِهِمْ أَلَا يَعْرِفُ خَمِيلَهُ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ فَإِنَّهُمْ يَأْتُونَ غُرًّا مُتَجَلِّلِينَ مِنَ الْوُضُوءِ وَأَنَا فَرَظْتُهُمْ عَلَى الْخَوْضِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ مقبرہ (یعنی جنت البقیع) میں (دعائے مغفرت کے لئے) تشریف لائے۔ چنانچہ (وہاں پہنچ کر) آپ نے فرمایا ”اے مومنین کی جماعت! تم پر سلامتی ہو (یعنی آپ نے اہل قبور کو سلام کیا اور فرمایا) ہم بھی انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں“ صحابہ نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟“ آپ نے فرمایا تم میرے دوست ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو ابھی (دنیا میں) نہیں آئے۔ صحابہ نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! آپ کی امت میں سے جو لوگ ابھی نہیں آئے انہیں آپ (قیامت میں) کس طرح پہچانیں گے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے پاس سفید پیشانی اور سفید ہاتھ ہیروا لے گھوڑے ہوں اور وہ نہایت سیاہ گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو پہچان لے گا؟“ صحابہ نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ! ان امتیازی اوصاف کی بناء پر تو وہ یقیناً پہچان لے گا) آپ نے فرمایا: ”وہ (قیامت میں) وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ آئیں گے۔ (لہذا اس علامت سے میں انہیں پہچان لوں گا) اور میں خوض کوثر پر ان کا میرا سامان ہوں گا۔ (مسلم)

توضیح: السلام علیکم: قبرستان میں مردوں کو سلام کرنا ثابت ہے اور مسنون طریقہ ہے مردے سلام کو سنتے ہیں اس پر مزید اشیاء کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے سماع موتی کا مطلق انکار کرنا تفریط ہے اور بالکل ہر بات ہر وقت سننے کا عقیدہ رکھنا افراط ہے اعتدال یہ ہے کہ جن نصوص سے سماع ثابت ہے وہاں سماع ہے اور جہاں نہیں وہاں نہیں سماع کی نصوص بھی خلاف عقل ہیں۔ جو اپنے مورد میں بند ہیں اس پر دیگر اشیاء کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

انتم اصحابی: یعنی تم تو ہمارے بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ساتھی بھی ہو اور بعد میں آنے والے صرف بھائی ہیں ساتھی ہونے کا وصف ان میں نہیں ہے اس لئے ”اخواننا“ کہہ دیا۔ ”ہم بہم“ یعنی کالے کلوئے۔

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِي الدُّدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤَدُّ لَهُ بِالشُّجُودِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤَدُّ لَهُ أَنْ يَرَفَعَ رَأْسُهُ فَأَنْظُرَ إِلَى مَا بَيْنَ يَدَيْ فَأَعْرِفُ أَهْلِي مِنْ بَنِي الْأُمِّيَّةِ وَمَنْ خَلْفِي مِقْلٌ ذَلِكَ وَعَنْ يَحْيَى مِقْلٌ ذَلِكَ وَعَنْ شُعْبَةَ مِقْلٌ ذَلِكَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ

تَعْرِفُ أَمَّتِكَ مِنْ بَنِي الْأُمَمِ فَمَا بَنُونَ نُوجِإِلَى أُمَّتِكَ قَالَ هُمْ عُرُوْهُمْ جَلُونَ مِنْ أَقْرِ الْوُطُوْءِ لَيْسَ أَحَدٌ كَذَلِكَ عَزُوْهُمْ وَأَعْرِفُهُمْ أَنَّهُمْ يُؤْتُونَ كُتُبَهُمْ بِأَيْمَانِهِمْ وَأَعْرِفُهُمْ تَسْلَى بَنُونَ أَيْدِيَهُمْ خُذِيَتْهُمْ (رواۃ احمد)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ کی اجازت دی جائے گی۔ اور (پھر) ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ سے سرائھانے کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ میں اس چیز کی طرف دیکھوں گا جو میرے آگے ہوگی (یعنی مخلوق کا جمع) اور میں امتوں کے درمیان اپنی امت کو پہچان لوں گا پھر میں اپنے پیچھے کی طرف اسی طرح اور اپنے دائیں طرف و بائیں طرف (بھی) اسی طرح دیکھوں گا (یعنی چاروں طرف اڑوہام خلق دیکھوں گا اور ان میں اپنی امت کو پہچان لوں گا) ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! نوح علیہ السلام کی امت سے لے کر اپنی امت تک تمام امتوں میں آپ اپنی امت کو کیونکر پہچان لیں گے۔ آپ نے فرمایا ”میری امت کے لوگ وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہوں گے۔ اس امت کے علاوہ کوئی دوسری امت اس طرح (تمیازی وصف کے ساتھ) نہیں ہوگی۔ اور میں اپنی امت کو اس طرح بھی پہچان لوں گا کہ (میری امت کے لوگوں کو) ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، نیز اس وجہ سے بھی شناخت کروں گا کہ ان کی (خوردسال) اولاد ان کے آگے دوڑتی ہوگی۔“ (احمد)

توضیح: ہایمانہم: سوال یہ ہے کہ آخرت میں جتنے کامیاب مسلمان اور مومن ہوں گے سب کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پھر اس امت کے مومنین کی کیا خصوصیت رہے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دیگر امتوں کے افراد کو بھی دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا مگر اس امت کو ایک خاص شان اور خاص اعزاز کے ساتھ دیا جائے گا اسی کو بتایا گیا۔

تسعی بنین ایدیہم: یعنی ان کی اولاد ان سے پہلے آگے آگے جنت کی طرف دوڑتے ہوئے جائے گی یا مطلب یہ کہ وہ ان کے سامنے کھلتے دوڑتے ہوں گے یہ فرانی اور خوشی اور بے خوفی کی طرف اشارہ ہے شاید دیگر امتوں کے لوگ خوشحالی کی اس کیفیت میں نہ ہوں گے۔



باب ما یوجب الوضوء

نواقض وضو کا بیان

الفصل الاول

وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدِكُمْ حَتَّى يَتَوَضَّأَ.

(مشفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے وضو کی نماز قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ وضو نہ کرے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: باب ما یوجب الوضوء ای باب اسباب وجوب الوضو والا فالواجب حقیقۃً ہو اللہ تعالیٰ۔

لا تقبل صلوٰۃ: لا تقبل کا ایک مطلب اور معنی لا تصح ہے دوسرا مطلب اور معنی لا یترتب علیہ الثواب ہے یہاں پہلا معنی مراد ہے یعنی وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے۔

اس بات پر اجماع ہے کہ حالتِ حدث میں نماز پڑھنا حرام ہے اگر کوئی شخص طہارت کے بغیر قصد نماز پڑھتا ہے اور اس کو جائز سمجھتا ہے تو فقہاء کے نزدیک اس شخص پر کافر ہونے کا خطرہ ہے۔ "ای یحشی علیہ الکفر"۔

موجبات وضو میں سے بعض ایسے ہیں جن پر سب صحابہ کرام کا اتفاق ہے نیز تابعین اور فقہاء کا بھی ان پر اتفاق ہے جیسے بول و براز، خروجِ ریح اور خروجِ خدری وغیرہ جن ان سے سب کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

اور بعض موجبات وضو ایسے ہیں جن میں روایات کے اختلاف کی وجہ سے صحابہ و تابعین نے ماں اختلاف رہا ہے۔ پھر فقہائے کرام کا بھی اختلاف رہا ہے جیسے خروجِ دم اور مس المرأة اور مس ذکر اور ماخرج من غیر النہملین وغیرہ ان اسباب کی الگ الگ تفصیل آنے والی ہے۔ بعض موجبات وضو ایسے ہیں جو صدر اسلام میں موجبات وضو تھے پھر آخر میں نواقض وضو نہ رہے یا وہ کسی وقت بھی موجبات وضو نہیں تھے لیکن روایات میں شبہ کی وجہ سے ان کو موجبات وضو سمجھ چکے ہیں جیسے صا

مسئلہ النحر سے وضو کا مسئلہ ہے اب یہ چیزیں جمہور امت کے نزدیک موجبات وضو نہیں ہیں۔ معصن غلو نے ان تینوں اقسام کا ذکر اس باب میں کیا ہے۔ مندرجہ بالا حدیث میں "لا تقبل صلاة" کا لفظ آیا ہے اور جیسا لکھا گیا ہے کہ قبول سے لا تصح اور عدم جواز مراد ہے اب یہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور ترجمہ ہے کہ کوئی نماز بغیر وضو جائز نہیں ہوتی۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ آیا صلوٰۃ کا یہ لفظ نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کو بھی شامل ہے یا نہیں تو جمہور امت کے نزدیک نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کے لئے وضو شرط ہے ان دونوں پر صلوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے اگرچہ یہ اطلاق خفی ہے۔

شیخ شعبی رحمہ اللہ کے نزدیک لفظ صلوٰۃ، جنازہ اور سجدہ تلاوت دونوں کو شامل نہیں ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک ان دونوں کے لئے وضو ضروری نہیں ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک صلوٰۃ کا اطلاق سجدہ تلاوت پر نہیں ہوتا اسی لئے اس میں نہ رکوع ہے اور نہ ہی یہ نماز ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ہاں سجدہ تلاوت بغیر وضو کے جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے بھی عدم وضو پر استدلال کیا ہے کہ "کان یسجد علی غیر وضوء" جمہور امت لا تقبل صلاة کے جملہ سے استدلال کرتے ہیں خواہ اطلاق خفی ہو یا جلی۔ لہذا جنازہ اور سجدہ تلاوت کے لئے وضو ضروری ہے جنازہ پر تو واضح طور پر "صلوا علی اخیکم" میں صلوٰۃ یعنی نماز کا اطلاق ہوا ہے۔ اور سجدہ تلاوت میں اس لئے وضو ضروری ہے کیونکہ سجدہ نماز کا رکن اعظم ہے۔ جب نماز کے لئے طہارت شرط ہے تو اس کے رکن اعظم کے لئے بھی شرط ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں تعارض ہے بعض نسخوں میں "کان یسجد علی طہور" کے الفاظ آئے ہیں۔ لہذا اذا تعارضا تساقطا کے قاعدہ سے یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے اور سجدہ تلاوت بغیر وضو جائز نہیں ہے۔

مسئلہ فاقد الطہورین

اس باب کی حدیث ① اور حدیث ② دونوں سے مسئلہ فاقد الطہورین نکلتا ہے مثلاً ایک شخص شیشہ کے محل میں یا ایسی جگہ میں مجبوس ہے جہاں نہ پانی ہے کہ وضو کرے اور نہ مٹی ہے کہ تیمم کرے اور سر پر نماز کا وقت آگیا ہے اب نماز پڑھنے کے لئے یہ شخص کیا کرے۔ ایسے ہی شخص کو فاقد الطہورین کہتے ہیں ان کے نماز پڑھنے نہ پڑھنے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف

امام شافعی رحمہ اللہ سے چار اقوال منقول ہیں۔ اول یہ کہ فی الحال واجب ہے اور بعد میں پانی ملنے پر قضاء بھی واجب ہے یہ صحیح قول ہے۔ دسرا قول یہ ہے کہ فی الحال نہ پڑھے بعد میں قضاء واجب ہے۔ تیسرا قول یہ کہ فی الحال پڑھنا مستحب ہے اور بعد میں قضاء کرنا واجب ہے۔ چوتھا قول یہ کہ فی الحال پڑھنا واجب ہے اور بعد میں کچھ بھی نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نہ فی الحال پڑھنا واجب ہے اور نہ بعد میں قضاء کرتا ہے بلکہ یہ شخص معاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فی الحال نماز نہ پڑھے اور بعد میں وجوباً قضا کرے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول اسی طرح ہے احناف میں سے صاحبین فرماتے ہیں کہ فی الحال تشبہ بالمصلین کرے اور پھر بعد میں قضا کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا اصح قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہوا اور اسی پر فتویٰ ہے۔ لے

دلائل:

جمہور یعنی شوافع اور صاحبین فرماتے ہیں کہ طہارت بشرط الاستطاعت فرض ہے مگر کبھی کبھی فرض بھی ساقط ہو جاتا ہے جس طرح قرأت فرائض صلوٰۃ میں سے ہے مگر اخس اور گونگے کے حق میں یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے قیام فی الصلوٰۃ فرض ہے مگر کبھی کبھی عجز کے وقت یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح طہارت بھی فرض ہے لیکن مجبوری کے وقت ساقط ہو جاتی ہے لہذا پڑھنا بھی واجب ہے اور قضاء کرنا بھی واجب ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فاقد الطہورین میں نماز پڑھنے کی اہلیت نہیں ہے جس طرح حائضہ عورت حالت حیض میں نماز روزہ نہیں کر سکتی اس کا یہ عمل کرنا نہ کرنا برابر ہے اسی طرح فاقد الطہورین کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ لے

جواب شیخ: جمہور نے قیاس میں جو تمثیلات پیش کی ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ وہاں دونوں مسئلوں میں نائب موجود ہے اخس کے حق میں نائب تسبیحات ہیں یا قلبی تصورات ہیں اور قیام پر جو قادر نہیں ہے تو قعود اس کا نائب ہے ورنہ اضطجاع ہے یہاں فاقد الطہورین میں نائب نہیں لہذا اس پر قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔ بہر حال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں جمہور کی طرف رجوع کیا ہے لہذا مسئلہ متفق علیہ ہو گیا۔

ولا صدقة من غلول: غلول مال غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں یہاں غلول سے مال حرام مراد ہے بہر حال حلال مال سے صدقہ رحمت الہی کا مظہر ہے اور حرام مال سے صدقہ کرنا قہر الہی کا مظہر ہے اس لئے قبول نہیں اگر کسی کے ہاتھ میں حرام مال آگیا تو ثواب کی نیت سے اس کا صدقہ نہ کرے کیونکہ اس میں کافر ہونے کا خطرہ ہے ہاں ذمہ سے فارغ ہونے کی نیت سے خرچ کرے یعنی کسی کو ثواب کی نیت کے بغیر دیدے۔

غللول کے لفظ سے اشارہ کیا گیا کہ مال غنیمت میں اگرچہ مجاہدین کا حق ہوتا ہے پھر بھی اس میں خیانت کرنا اور اس کا صدقہ کرنا اتنا سنگین جرم ہے تو اس کے علاوہ خالص حرام کا کیا حال ہوگا؟ یاد رہے یہ تشریح آنے والی حدیث کی بھی ہوگی اور یہ آخری الفاظ اسی حدیث نمبر دو کے ہیں جو آ رہی ہے۔ لے

﴿وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طَهْوَرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُولٍ﴾
(رواہ مسلم)

میں سے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں کی جاتی اور مالِ حرام کی خیرات قبول نہیں کی جاتی۔ (مسلم)

مذی کا حکم

﴿۳﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا مَذْمُومًا فَكُنْتُ أَسْتَعِيذُ أَنْ أَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَانٍ ابْتَلَيْتُهُ فَأَمَرْتُ الْبَيْتَ أَنْ يَقَالَ يَغْسِلُ ذَكَرَهُ وَيَتَوَضَّأُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

میں سے کہ مجھے مذی بہت زیادہ آتی تھی چونکہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) میرے نکاح میں تھیں اس لئے میں آپ سے اس کا حکم دریافت کرتے ہوئے شرماتا تھا (کہ آیا اس سے غسل واجب ہوتا ہے یا وضو) اس لئے میں نے (اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ سے دریافت کرنے کے لئے) حضرت مقدار رضی اللہ عنہ کو مامور کیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا (اس طرح سے کہ ایک شخص ایسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا (کہ مذی ننگے پر) صرف پیشاب گاہ کو دھو ڈالے اور وضو کرے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: کنت رجلاً مذموماً: مذی سفید پانی کی طرح ایک سیال مادہ ہے جو لامعت زوہ و محبوب کی وجہ سے یا تذکرہ جماع کے وقت شوقِ شہوت کی وجہ سے خارج ہوتا ہے۔ مذی کے خروج سے صرف وضو ٹوٹ جاتا ہے اس لئے وضو واجب اور غسل واجب نہیں ہوتا ہے اس مسئلہ میں تو سب کا اتفاق ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ وضو کے وقت کتنی مقدار ذکر کا دھونا ضروری ہے۔ جمہور کے ہاں موضع العجاسۃ کی مقدار دھونا ضروری ہے اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے ہاں پورے ذکر کا دھونا ضروری ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ ذکر مع الاثنین کا دھونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

امام مالک رضی اللہ عنہ نے ابو داؤد و شریف کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں مذاکیر اور اثنین کا ذکر آیا ہے جو جلد اول ص ۲۸ پر مذکور ہے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں "و اغسل ذکرتک" کے الفاظ آئے ہیں اور ذکر کا اطلاق پورے پر ہوتا ہے۔

جمہور فرماتے ہیں کہ اصل قاعدہ و قانون نجاست کے ازالہ کا ہے تو جہاں نجاست ہے وہاں تک دھونا واجب ہے اس سے زائد کا ذکر اگر آیا ہے یا الاثنین کا ذکر آیا ہے تو وہ علا جاؤ اور تیرا ہے کہ زیادہ پانی ڈالنے سے ٹھنڈک آتی ہے جس سے مذی کا مادہ نکلنا بند ہو جاتا ہے یہ حکم بطور مسئلہ نہیں بلکہ بطور علاج ہے یا یہ حکم استحبی ہے و جوبی نہیں ہے۔

لمکان ابتلئہ: یعنی فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے نکاح میں تھی اب آنحضرت ﷺ کے سامنے مذی مٹی اور ودی جیسی پوشیدہ اشیاء کے ذکر کرنے سے حیاء مانع تھی اس حدیث کے اس جملہ سے ایک لطیف اخلاقی تعلیم ملتی ہے کہ داماد کو سر کے سامنے شہوت سے متعلق باتوں کا چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔

فامرت المقداد: یعنی میں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ یہ مسئلہ آپ معلوم کریں۔

سُئِلَ: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس حدیث اور دوسری احادیث میں تعارض ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے اور مسئلہ معلوم کرنے کے لئے کہا مگر ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ذریعہ مسئلہ پوچھوایا تیسری روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود مسئلہ پوچھا جس طرح کہ فصل ثانی کی حدیث نمبر (۱) میں آ رہا ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں ذکر کیا تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے بھی پوچھا اور مجلس میں بیٹھے ہوئے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے بھی پوچھا تو روایتیں دو ہوں گیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں بوجہ حیا بالواسطہ پوچھا پھر اطمینان حاصل کرنے کے لئے بغیر واسطہ خود پوچھا یا یوں کہیں کہ بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ دینی مسائل میں اگر یہ حیا مانع بن گئی تو بہت سارے مسائل کا نقصان ہو جائے گا اس لئے بعد میں خود پوچھا کیونکہ "ان الله لا يستحي من الحق" علم ہے۔

مسئلة الوضوء مما مست النار

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ تَوَضَّؤُا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ - رَوَاهُ مُسْلِمٌ - قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ الْأَجَلِيُّ مُحْيِي السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى هَذَا مَتَسَوِّحٌ بِمَحْدِثِ ابْنِ عَسَاةٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكَلَ كَبْشًا شَاةٍ لَكُمْ صَلًى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس چیز کو آگ نے پکایا ہو اس کے کھانے کے بعد وضو کرو۔ (مسلم) امام محی السنۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے منسوخ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بکری کا شانہ کھایا پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: توضع مما مست النار: آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے اور استعمال کرنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں اس بارے میں ابتدا میں دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں معمولی سا اختلاف تھا۔

اختلاف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے قائل تھے کہ وضو ٹوٹتا ہے لہذا نیا وضو بنانا چاہیے لیکن بعد میں صحابہ بھی عدم وضو پر متفق ہو گئے۔ تو جمہور صحابہ جمہور تابعین اور جمہور ائمہ کے نزدیک اکل مما مست النار ناقض وضو نہیں ہے۔

دلائل:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کیا ہے جس میں توضوٰ۱۱ مرکب صیغہ آیا ہے۔ جمہور نے جن احادیث سے عدم وضو پر استدلال کیا ہے وہ بہت زیادہ حدیثیں ہیں۔

ایک حدیث تو حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ کی ہے جو مشکوٰ۳۰ ص ۴۰ پر ہے دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ص ۴۱ پر ہے اسی کے ساتھ والی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے پھر فصل ثالث میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے پھر اسی کے ساتھ والی روایت بھی حضرت رافع بن خدیج ہی سے ہے جس میں قصہ بھی ہے اور نہایت وضاحت بھی ہے اس کے ساتھ والی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے۔ ۱۔
ان تمام احادیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مہامست النار سے وضو کا حکم نہیں ہے۔

جوابات:

اب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے علماء نے کئی جوابات دیئے ہیں۔

پہلا جواب: تو اسی روایت میں صاحب مصابیح نے دیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنے والی روایت سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منسوخ ہو گئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ نسخ بجا ہے مگر اس میں اتنی تصریح نہیں ہے جتنی تصریح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جو ابو داؤد شریف میں ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ان اخذ الامورین من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث الوضوء مہامست النار" اس آخر امرین سے زندگی بھر کے دو اعمال میں سے آخری عمل مراد ہے لہذا یہ واضح طور پر سابقہ حکم کے لئے ناسخ ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ وضو کا حکم اب بھی ہے مگر یہ حکم استحبانی ہے کیونکہ آگ مظہر غضب الہی ہے تو خواص وضو کر لیں دیے بھی پکانے میں کتنی مصیبتیں آتی ہیں آگ کی تپش ہے، پسینہ ہے، ناک سے ریخت نکلتی رہتی ہے میل کچیل الگ ہے، بد بو الگ ہے، دھواں الگ ہے تو پکانے والے اور پکا کر کھانے والے کے لئے وضو مستحب ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ وضو سے مراد لغوی وضو ہے جو ہاتھ دھونا اور مضغہ کرنا ہے اور ترمذی جلد ثانی کتاب الاطعمہ میں حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "یا عکراش هذا وضوء مہامست النار" وہاں آنحضرت ﷺ نے صرف ہاتھ دھو کر کھانے کی قسمی یہ تصریح ہے کہ وضو سے مراد لغوی وضو ہے اصطلاحی شرعی وضو نہیں ہے۔

مسئلة الوضوء من لحوم الابل

﴿۵﴾ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَكُونُضًا مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ قَالَ إِنْ شِئْتَ فَتَكُونُضًا وَإِنْ شِئْتَ فَلَا تَكُونُضًا قَالَ أَتَكُونُضًا مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ قَالَ نَعَمْ

فَقَوَّضًا مِنْ لَحْمٍ الْإِبِلِ قَالَ أَصْلِي فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَالَ نَعَمْ قَالَ أَصْلِي فِي مَرَابِضِ الْإِبِلِ قَالَ لَا۔ (۱۵۱۵ مشعل)

ترجمہ: اور حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ ”کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تمہارا جی چاہے تو وضو کرو اور نہ چاہے تو نہ کرو۔ پھر اس شخص نے پوچھا کیا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو پھر اس شخص نے سوال کیا کہ کیا بکریوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھ لوں؟ آپ نے فرمایا ”ہاں“ پھر اس شخص نے دریافت کیا کہ اونٹوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ (مسلم)

توضیح: انتوضاً من لحم الابل: اونٹوں کے گوشت کھانے کے بعد آیا وضو واجب ہو جاتا ہے یا نہیں اس مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو واجب نہیں ہوتا البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہرِ حدیث کو دیکھ کر جمہور کے خلاف یہ فیصلہ کیا ہے کہ لحوم اہل کے استعمال کے بعد وضو واجب ہو جاتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ما مسست النار کا حکم عام تھا لحوم اہل کا حکم خاص ہے اس کا ہما مسست النار سے کوئی تعلق نہیں دونوں میں فرق ہے۔ لہذا لحوم الابل میں وضو واجب ہے ما مسست النار والی حدیث کے منسوخ ہونے سے لحوم اہل والی حدیث منسوخ نہیں ہوگی

الحق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

جسکی ابتداء: جمہور نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں وضو استحبابی مراد ہے وجوبی نہیں ہے۔ استحبابی وضو اس لئے کہ اونٹ کے گوشت میں سخت دوسمت، رانجہ کر یہہ اور چکنائی ہوتی ہے۔ اس لئے وضو کرنے کو مستحب قرار دیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حکم ابتداء میں تھا پھر ما مسست النار کی احادیث کے منسوخ ہونے سے یہ بھی منسوخ ہو گیا کیونکہ اس عموم کے تحت یہ بھی داخل ہے کوئی فرق نہیں ہے۔

فی مَرَابِضِ الْغَنَمِ: یعنی بکریوں کے باڑہ میں اگر کوئی صاف جگہ ہے تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جائز ہے اور اونٹوں کے باڑہ میں جائز نہیں ہے۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ بکری ایک مسکین جانور ہے اس کے قریب نماز پڑھنے سے تشویش کی کوئی بات نہیں ہوتی نیز وہ جھک کر پیشاب کرتی ہے تو چھبھیٹیں پڑنے کا خوف نہیں ہوتا پھر وہ ہتھیلی زمین میں رہتی ہے ہاں پیشاب زمین میں جذب ہو کر پھیلتا نہیں ہے اس کے برعکس اونٹ ایک متوحش جانور ہے اس کے قریب میں نماز پڑھنے میں تشویش ہوگی نیز وہ آسمان جیسی بلندی سے پیشاب چھوڑتا ہے جس سے چھبھیٹیں

پڑنے کا خطرہ ہے اسی طرح وہ نرم زمین میں رہتا ہے تو پیشاب جذب ہو کر پھیلتا ہے۔ پیشاب زیادہ بھی ہوتا ہے لہذا اونٹوں کے بازو میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی عرب کے ہاں اونٹ کا بازو ناپاک جگہ میں ہوتا تھا لوگ خود بھی وہاں پیشاب کیا کرتے تھے۔ ۱

شک کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرو

﴿٦٥﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ أَخْرَجْ مِنْهُ شَيْئًا أَمْ لَا فَلَا تَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتَّى يَسْتَعِ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا
(رواه مسلم)

جیز جگہ پر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ کے اندر کچھ پائے (یعنی قرقر) اور اس پر یہ بات مشتبه ہو کہ کوئی چیز خارج ہوئی یا نہیں تو اس وقت تک وضو کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے جب تک آواز کو نہ سنے یا بونہ پائے۔“ (مسلم)

توضیح: حق یسمع صوتاً اور یحاً: ان دو چیزوں کو بطور نمونہ اور تمثیل ذکر کیا گیا ہے ان دو میں کوئی حصر کرنا نہیں اسی طرح اس میں بھی حصر نہیں کہ آواز کا سننا شرط ہے یا بدیوآنی شرط ہے بلکہ اصل مقصود یقین حاصل ہو جانا ہے کیونکہ جب تک یقین نہیں آتا کہ واقعی ہوا خارج ہوئی ہے تب تک شک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تو اصل چیز یقین آنا ہے ورنہ اگر کوئی بہرہ اہل توحید آواز نہیں سنے گا یا کسی کی قوت شامہ خراب ہے وہ سوچے نہیں پاتا تو کیا وضو نہیں ٹوٹے گا؟ خلاصہ یہ کہ یقین آنے سے وضو ٹوٹنے کا حکم لگے گا بعض غیر مقلدین اس میں نقصان کرتے ہیں کہ وہ ہوا خارج ہونے کے بعد بھی بدیوآنی صوت اور آواز کا انتظار کرتے ہیں۔

چکناہٹ والی چیز کھانے کے بعد کلی کرنا ضروری ہے

﴿٧﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍاءَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ إِنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَرَبَ لَنَا فَمُتُّمْ هُزْ وَقَالَ إِنْ لَهُ دَسَمًا (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۝

تذکرہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دوعالم رحمہ اللہ نے دودھ پیا (اس کے بعد) کلی کی اور فرمایا دودھ میں چکناٹا ہوتی ہے۔ (مسلم)

توضیح: ان لہ دسماً: یعنی دو وہ میں چکناٹا ہوتی ہے اس کے ازالہ کے لئے کلی فرمائی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جو منہ میں انک کر رہ جاتی ہے یا چپک کر رہتی ہے اس کا ازالہ نماز سے پہلے ضروری ہے ورنہ نماز کی حالت میں

نمازی اس کا ذائقہ محسوس کرے گا کچھ حصہ پیٹ میں چلا جائے گا تو نماز میں وہ کھانے والا شمار ہوگا جو ناچار ہے۔ علماء نے اس احتمال و سومت کے لئے کلی کو مستحب قرار دیا ہے۔ یعنی اجزاء کے ازالہ کے لئے تو کلی کرنا ضروری ہے اس روایت کے یہاں لانے پر یہ اعتراض ہے کہ اس حدیث کی اس باب سے مناسبت کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ کلی کرنا وضو کے اعمال میں سے ایک عمل ہے کیونکہ کلی کرنا وضو کے مکملات و متمات میں سے ہے اس اعتبار سے اس حدیث کو تواضع وضو میں ذکر کیا گیا۔

ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں

﴿۸﴾ وَعَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الصَّلَوَاتِ يَوْمَ الْفَتْحِ بِوُضُوءٍ وَاحِدٍ وَمَسَّحَ عَلَى خُفَّيْهِ فَقَالَ لَهُ عُثْمَرُ لَقَدْ صَنَعْتَ الْيَوْمَ شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهُ فَقَالَ عُمَرَا صَنَعْتُهُ يَا عُثْمَرُ. (رواہ ابن ماجہ)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں (یعنی ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں پڑھیں) اور موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ﷺ نے آج وہ چیز کی ہے جس کو آپ نے کبھی نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا "عمر" میں نے ایسا قصد کیا ہے۔

(مسلم)

توضیح: یوم الفتح: اس سے مراد فتح مکہ ہے اور بطور شکر صلوٰۃ فتح آٹھ رکعات پڑھی جاتی ہے جو آپ نے بھی پڑھی ہے۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوئی باتوں کی وجہ سے سوال کیا یہ کہ آنحضرت ﷺ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے اس بار کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھیں، دوسری وجہ سوال کا یہ بنا کہ آنحضرت نے موزوں پر مسح فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے قصد ایسا کیا ہے کہ امت کے لئے ضابطہ بن جائے اور دین کے امور میں وسعت آجائے۔

ہر نماز کے لئے وضو کرنا جمہور کے نزدیک مستحب ہے اگر پہلا وضو ہے اور کوئی شخص نیا وضو کرنا چاہتا ہے تو اس کو مستحب کا ثواب ملے گا وادعا ہری کا کہنا ہے کہ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنا ضروری اور واجب ہے ان پر مذکورہ حدیث حجت ہے۔

ما مسست النار کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا

﴿۹﴾ وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ الثُّعْمَانِ أَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ غَامَةً حَتَّى إِذَا كَانُوا بِالصُّفْهَاءِ وَهِيَ مِنْ أَهْلِ حَيْبَرَ صَلَّى الْعَصْرَ ثُمَّ دَعَا بِالْأَرْوَادِ فَلَمْ يَبُتْ إِلَّا بِالسُّوَيْبِيِّ فَأَمَرَ بِهِ فَلُزِيَ فَأُكِّلَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمُضِضٌ وَمَضْطَضٌ ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)۔

ترجمہ: اور حضرت سید بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے ہمراہ خیبر (کے فتح) کے سال سفر پر گئے جب صہباء کے مقام پر پہنچے جو خیبر کے نزدیک ہے وہاں آپ نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر آپ ﷺ نے توشہ (زادراہ) منگوایا چنانچہ ستو کے علاوہ کچھ نہ تھا جو حاضر کیا گیا اور آپ کے حکم سے اسے ترک کیا گیا پھر آنحضرت ﷺ نے اور ہم نے اسے کھایا اور پھر مغرب کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے کھلی کی اور ہم نے بھی کھلی کی اور وضو نہیں کیا۔ (معلوم ہوا ماست التار سے وضو ضروری نہیں ہوتا)۔ (بخاری)

توضیح: صہباء: خیبر کے قریب ایک مقام کا نام ہے "سویق" ستو کو کہتے ہیں کسی چیز مثلاً گندم یا جو اور یا کھلی کے دانے پہلے بھون لیتے ہیں پھر اس کو پیس لیا جاتا ہے یہ ستو ہے۔ "فلوی" یہ تغریہ سے ہے لڑی ترمنی کو کہتے ہیں یہاں ستو کا پانی میں بھگونا مراد ہے تاکہ کھانا آسان ہو جائے۔

الفصل الثانی

ہو اخرج ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا وَضُوءَ إِلَّا مِنْ صَوْتٍ أَوْ رِيحٍ.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو کرنا آواز یا بوسے واجب ہوتا ہے۔ (احمدی)

توضیح: یہ حصر اضافی ہے یعنی مسجد کے اندر تو یہی حدیث ہو سکتا ہے کہ ریح یا بصوت یا بغیر صوت خارج ہو جائے یا یہ حصر کسی سائل کے سوال کے جواب میں آیا ہے یعنی ما الحدیث فی المسجد یا اہا ہریرۃ قال لا وضوء الا من صوت اور ریح۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَلِيحِيِّ فَقَالَ مِنَ الْمَلِيحِيِّ الْوُضُوءُ مِنَ الْمَلِيحِ الْغُسْلُ.

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)۔

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے (حضرت مقداد کے واسطے سے) سرکارِ دو عالم ﷺ سے غدی کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ غدی نکلنے سے وضو لازم آتا ہے اور منی نکلنے سے غسل واجب ہوتا ہے۔ (ترمذی)

مسئله تکبیر التحریمة

﴿۱۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ وَتَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ۔ (رواہ ابو داؤد و الترمذی و الزواہد و ابن ماجہ عن ابی سعید)۔

تکبیر تحریمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز کی کئی وضو ہے اور نماز کی تحریم تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا) ہے۔ اور نماز کی تحلیل تسلیم (ابو داؤد، ترمذی، دارمی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت علی اور حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے)

توضیح: و تحريمها التكبير: خبر پر الف لام داخل کر کے مسند کو مسند الیہ میں محصور کر دیا گیا ہے یعنی نماز کے تمام محرمات صرف تکبیر سے وابستہ ہیں جب تکبیر کہہ دی تو نماز سے باہر کی تمام جائز چیزیں حرام ہو گئیں اس حدیث کے تین اجزاء ہیں۔ پہلے جز "مفتاح الطهور" میں کوئی اختلاف نہیں دیگر دونوں اجزاء میں فقہائے کرام کا اختلاف ملاحظہ کریں۔

فقہائے کرام کا اختلاف:

اس میں اختلاف ہے کہ دخول صلوٰۃ کے لئے جو تکبیر تحریمہ ہے آیا یہ صرف لفظ اللہ اکبر کے ساتھ خاص ہے یا دیگر الفاظ سے بھی دخول فی الصلوٰۃ جائز ہے ہاں تکبیر تحریمہ سب کے ہاں فرض ہے خالی نیت سے دخول صحیح نہیں اگرچہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ صرف نیت سے بھی دخول فی الصلوٰۃ کو جائز مانتے ہیں مگر جمہور کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف تخصیص الفاظ میں ہے چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دخول فی الصلوٰۃ کے لئے صرف "اللہ اکبر" کا لفظ خاص ہے اس کے علاوہ کوئی لفظ جائز نہیں ہے، مذکورہ حدیث میں حصر ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف دو لفظ اللہ اکبر اور اللہ الا اکبر سے جائز ہے اس کے علاوہ جائز نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ الا اکبر کے معنی باللام ہونے سے مزید حصر آتا ہے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ کبریائی میں اضافہ ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ اکبر، اللہ الا اکبر، اللہ کمید، اور اللہ الکبیر یہ چار الفاظ جائز ہیں اس کے علاوہ جائز نہیں وہ فرماتے ہیں اللہ اکبر صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ بہت بڑا ہے یہ اسم تفضیل نہیں تو یہ صیغہ کبریائی کے لئے آیا ہے جو تکبیر کے معنی میں ہے جب اللہ کمیدو جائز ہو تو پھر اس مادہ کے دیگر الفاظ بھی جائز ہوئے، جو مزید کبریائی پر دال ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ہر وصف جو بڑائی کو مستلزم ہو وہ جائز ہے اس سے تکبیر تحریمہ کا فرض پورا

ہو جاتا ہے ہاں خاص طور پر لفظ اللہ اکبر کا پڑھنا واجب ہے لہذا جو لفظ شمر تعظیم ہو وہ جائز ہے جیسے اللہ اعظم یا اللہ عظیم وغیرہ کے الفاظ ہیں۔

دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ و احمد رحمہ اللہ کی ایک دلیل تو مذکورہ حدیث ہے جس میں حصر ہے کہ تحریر کے لئے صرف اللہ اکبر خاص ہے دوسری دلیل وریک فکیو ہے۔ تیسری دلیل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے زندگی بھر صرف اللہ اکبر پر مداومت فرمائی ہے کسی اور لفظ کو ادا نہیں فرمایا شوافع حضرات کے دلائل بھی وہی ہیں جو مالکیہ اور حنابلہ کے ہیں ہاں اللہ الاکبر میں کبریائی کا اضافہ ہے تو وہ بھی جائز ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے بھی مالکیہ و حنابلہ کی دلیل سے دیگر صیغوں کی نفی کی ہے مگر اکبر کبر کے معنی میں ہے لہذا چار صیغہ جائز ہو گئے کیونکہ جب کبر جائز ہو تو اکبر اور الاکبر بھی جائز ہوا اس لئے کہ یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی دلیل "وذکر اسم ربہ فصلی" ہے کہ یہ تکبیر تحریرہ کے لئے ہے اور "اسم ربہ" کے لفظ میں عموم ہے تو جس لفظ سے اسم رب کی تعظیم ہو وہ جائز ہوگا اور اس سے فرض ادا ہو جائے گا۔ یہاں اس آیت سے ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ احناف کے ہاں تکبیر تحریرہ رکن صلوٰۃ نہیں بلکہ شرط صلوٰۃ ہے دیگر ائمہ کے نزدیک تو تحریرہ رکن صلوٰۃ ہے۔ شرط اپنے مشروط پر مقدم ہوتا ہے اور رکن داخل صلوٰۃ ہوتا ہے۔

یہاں آیت "فصلی" میں فاتعقب مع الوصل کے لئے آئی ہے تو وذکر اسم ربہ اور چیز ہے اور فصلی اس کے بعد اور چیز ہے تو تحریرہ رکن نہیں ہوا بلکہ خارج صلوٰۃ شرط کے درجہ میں ہوا۔

جنگلیہ: احناف نے دیگر ائمہ کے دلائل کے جواب میں مالکیہ اور حنابلہ کو یہ جواب دیا ہے کہ وہ محمد و آلہ التکبیر میں حصر کا قاعدہ جو بیان کیا گیا ہے یہ قاعدہ اکثر یہ ہے قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ اور علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ زید العالم میں یہ حصر نہیں کہ دنیا میں صرف زید ہی عالم ہے بلکہ یہ کبھی کبھی اہتمام شان کے لئے اور کامل فرد بیان کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ باقی وریک فکیو تو احناف کی دلیل ہے کیونکہ اس میں تعظیم کا حکم دیا گیا ہے کہ بڑائی بیان کر، اس میں خصوصیت اللہ اکبر نہیں۔ مالکیہ کی تیسری دلیل کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ اکبر پر مداومت فرمائی اس کا جواب یہ ہے کہ مداومت سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور اللہ اکبر کی تخصیص کے وجوب کے تو ہم بھی قائل ہیں آپ تو اس کو فرض کہتے ہیں حالانکہ فرض کے ثبوت کے لئے قطعی الشبوت اور قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے کیونکہ احکام کے اعتبار سے دلائل اثبات بھی چار قسم ہیں۔

① قطعی الشبوت قطعی الدلالۃ اس سے فرض ثابت ہوتا ہے۔

① قطعی الثبوت ظنی الدلالة

② ظنی الثبوت قطعی الدلالة

③ ظنی الثبوت ظنی الدلالة

ان دونوں دلائل سے واجب ثابت ہوتا ہے۔
اس سے سنن مؤکدہ اور مستحبات ثابت ہوتے ہیں۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ شارع نے اگر مداومت کی ہے مگر کبھی کبھی ترک بھی کیا تو یہ سنت مؤکدہ ہے اور کبھی کیا کبھی ترک کیا تو وہ مستحب ہے اور ایک ہی بار جواز کے لئے کیا تو وہ مباح ہے بیان جواز کے لئے کبھی کبھی مکروہ تنزیہی کا ارتکاب بھی کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث خبر واحد ہے اس سے فرض ثابت نہیں ہوتا یہ تفصیل ان دلائل اور فصوص کی جانب اشارت میں ہوئی اور جانب نفی و عدم میں قسم اول سے حرام ثابت ہوتا ہے اور قسم دوم سوم سے مکروہ تحریمی ثابت ہوتا ہے اور قسم چہارم سے مکروہ تنزیہی وغیرہ ثابت ہوتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو جواب یہ ہے کہ جس طرح آپ نے اللہ اکبر کے لفظ میں تعیم لفظی کر کے چار الفاظ کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح آپ تعیم معنوی کر کے ہر اس لفظ کو جائز قرار دیں جو شعر تعظیم ہو تعیم لفظی جب کی تو تعیم معنوی بھی کیجئے۔

وتحلیلہا التسلیم: نماز سے نکلنے کے لئے جو لفظ اختیار کیا جاتا ہے اس میں بھی فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ تینوں ائمہ اور جمہور کے نزدیک صرف لفظ سلام سے نمازی اپنی نماز سے خارج ہو سکتا ہے ورنہ نماز نہیں ہوگی۔ ان کی دلیل یہی حدیث اور یہی الفاظ ہیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں خاص لفظ سلام کے ساتھ نماز سے نکلنا واجب ہے اور صغیر مصلیٰ کے ساتھ نماز سے نکلنا فرض ہے خواہ کوئی بھی لفظ یا کوئی عمل ہو اور یہ نکلنا درحقیقت دوسری نماز کی تیاری اور پڑھنے کی وجہ سے فرض ہو جاتا ہے مثلاً کسی نے مغرب کی نماز اتنی طویل کی کہ عشاء کا وقت آ گیا تو اب نکلنا فرض ہے تاکہ عشاء پڑھ لے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: فان شئت ان تقوم فقم (رواہ ابو داؤد) نیز اعرابی کو تعلیم کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض سلام کا ذکر نہیں کیا بکیر تحریر کی بحث میں جن جوابات کو ذکر کیا گیا ہے وہ جوابات یہاں بھی ملتے ہیں۔ بہر حال مداومت سلام کی وجہ سے ہم بھی لفظ سلام کو واجب کہتے ہیں فرض کا قاعدہ الگ ہے۔

اپنی بیوی سے اغلام بازی کرنا حرام ہے

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَسَا أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ وَلَا تَأْكُلُوا الرِّيشَاءَ

فِي الْأُجَانِيزِ (رواہ ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ)

ترجمہ: اور حضرت علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی حدیث کرے (یعنی بغیر آواز کے ہوا خارج ہو) تو اسے وضو کرنا چاہیے۔ اور تم عورتوں سے (خلاف فطرت) ان کی مقعد (یعنی پاخانہ کی جگہ) میں جماع نہ کرو۔ (ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: اذا فسا احدا کم: فسوة ہوا خارج ہونے کو کہتے ہیں یعنی جب یقینی طور پر ہوا خارج ہو جائے تو وضو کر دیکونکہ اس ہوا سے ممکن ہے اندر کے ذرات خارج ہوں یا یہ خود گندگی ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ہاں قبل اور ذکر سے اگر ہوا خارج ہو جائے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹا الا یہ کہ عورت مفضضة ہو پھر پتہ نہیں چلے گا کہ آیا یہ ہوا قبل سے آئی ہے یا دبر سے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

ولا تاتوا النساء فی اعجازهن: اعجاز عجز کی جمع ہے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے مراد مقعد اور دبر ہے اب سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کے ذکر کرنے کی یہاں کیا ضرورت تھی اور اس کی یہاں کیا مناسبت ہے تو علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جب ہوا خارج ہونے سے دبر کا تذکرہ آگیا تو آنحضرت ﷺ نے اس مناسبت سے اس اہم مسئلہ پر بھی تنبیہ فرمائی۔

۲۰ عشر مظفر ۱۳۱۰ھ

مسئلة النوم ناقض للوضوء ام لا؟

﴿۱﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّمَا الْعَيْنَانِ وَكَاءُ السَّهْوِ فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَظَلَّتِ الْوُكُوءُ (رواه الدارمي)

ترجمہ: اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”آنکھیں سرین کا سر بند ہیں چنانچہ آنکھ سو جاتی ہے تو سر بند کل جاتا ہے۔“ (دارمی)

توضیح: وكاء السه: وكاء او كيه اس تسمہ کو کہا جاتا ہے جس سے چھٹی کو باندھ لیا جاتا ہے اور ”السه“ سین کے فتح اور حا کے سکون کے ساتھ دبر اور مقعد کو کہا جاتا ہے کہتے ہیں یہ اصل میں ”سسته“ تھا تا کو حذف کیا گیا تو ”سه“ رہ گیا اس کی دلیل استتہا ہے کہ وہاں تا موجود ہے بہر حال وكاء سر بند اور چھٹی کی ڈوری کو کہا جاتا ہے۔ یہاں انسان کی تشبیہ ایک مشکیزہ سے دی گئی ہے جس کی ڈوری انسان کی آنکھیں ہیں جب آنکھیں کھلی رہتی ہیں تو مشکیزہ بند رہتا ہے اور جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو گویا گر و کھل جاتی ہے اور مشکیزہ غیر محفوظ ہو جاتا ہے اور سرین کے دھاگے کھٹنے سے ہوا خارج ہونے کا قوی احتمال پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ نیند خود ناقض وضو نہیں ہے لیکن نیند کی وجہ سے بدن میں استرخاء مفاصل آ جاتا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور استرخاء مفاصل موجب خروج ہوا ہے اور ہوا کا پتہ تو نہیں چل سکتا لہذا شریعت نے نیند کو خروج ہوا کا قائم مقام بنا دیا ہے اب ہوا خارج ہو یا نہ ہو محض نیند نقض وضو کی نشانی اور علامت بن گئی۔

فقہائے کرام کا اختلاف:

نوم کے اس مسئلہ میں چار قسم کی احادیث آئی ہیں اور چاروں کا رنگ الگ الگ ہے۔ لہذا فقہائے کرام میں بھی ان روایات کی وجہ سے اختلاف آگیا ہے یہاں کئی مذاہب ہیں لیکن مشہور و معروف مذاہب پانچ ہیں۔

① پہلا مسلک: ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، امام اوزاعی اور شعبہ کا ہے کہ نیند قلیل ہو یا کثیر ہو جس حالت میں بھی ہو وہ مطلقاً ناقض للوضو نہیں ہے۔

② دوسرا مسلک: اسحاق بن راہویہ اہل غواہر اور ابو عبد الرحمن مزیٰ کا ہے کہ نوم مطلقاً ناقض للوضو ہے۔

③ تیسرا مسلک: امام مالک رضی اللہ عنہ اور احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا ہے کہ نوم قلیل ناقض نہیں ہے اور کثیر ناقض ہے۔

④ چوتھا مسلک: امام شافعی رضی اللہ عنہ کا ہے کہ وہ نیند جو جالساً قاعداً معتماً مقعدہ علی الارض ہو وہ ناقض نہیں اس کے علاوہ ہر حالت میں ناقض للوضو ہے۔

⑤ پانچواں مسلک: احناف کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ آدمی اگر کسی بیت من بینات صلوٰۃ میں ہو تو ناقض نہیں جیسے قائماً را کعاً قاعداً جالساً غیر معتماً علی شیء لوزیل لسطق ان بینات کے علاوہ میں نیند ناقض وضو ہے۔

دلائل:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، امام اوزاعی اور شعبہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ظاہری روایت "حتی تخفق رؤسہم" اور ترمذی کی روایت "ینامون" سے استدلال کیا ہے کہ اس قدر سوتے تھے، پھر بھی وضو کے بغیر نماز پڑھتے تھے ترمذی کی روایت اس طرح ہے کان اصحاب النبی رضی اللہ عنہ ینامون ثم یصلون ولا یتوضؤون ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے "کان اصحاب النبی ینتظرون العشاء حتی تخفق رؤسہم ثم یصلون ولا یتوضؤون"۔

اسحاق بن راہویہ، اہل غواہر اور ابو سعید مزیٰ نے زیر نظر حدیث "انما العینان وکاء السہ" سے استدلال کیا ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اور احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے احادیث میں تطبیق اور جمع بین الا احادیث کا راستہ اختیار کیا ہے کہ جہاں نقض وضو کا حکم ہے وہاں کثیر نوم مراد ہے اور جہاں عدم نقض وضو کا حکم ہے وہاں نوم قلیل مراد ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے "انما الوضوء علی من نام مضطجعاً" سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے مفہوم مخالف کے طور پر کہا کہ اضطجاع کے علاوہ کسی بھی صورت میں نیند ناقض وضو نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث میں جو علت بیان ہوئی ہے احناف نے اس علت کو بنیاد بنایا ہے وہ علت یہ ہے قالہ اذا اضطجع استرخت مفاصلہ تو نقض وضو کے لئے جسم کا ڈھیلا ہونا ضروری ہے یعنی جوڑوں کا سست ہونا علت ہے اور انسان جب بینات صلوٰۃ میں سے کسی بیت پر سوتا ہے تو قوت ماسکہ ختم نہیں ہوتی جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ استرخاء مفاصل نہیں ہوا ہے لہذا وضو نہیں ٹوٹتا۔

جوابات :

جن حضرات نے مطلقاً نوم کو ناقض نہیں کہا جیسے ابو موسیٰ، رضی اللہ عنہ، امام اوزاعی اور شعبہ وغیرہ تو ان کا استدلال نوم قلیل پر محمول ہے جس میں استرخاء مفاصل نہیں ہوتا ہے۔

اور دوسرے مسلک والوں کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ مسلک کہ نوم بالکل ناقض وضو نہیں ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ مسلک صریحاً حضور اکرم ﷺ کی قولی روایات اور آپ ﷺ کی فعلی روایات سے متعارض ہے جس میں آپ نے وضو کا حکم دیا ہے یا خود وضو فرمایا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ کو جواب یہ ہے کہ آپ نے جو جمع بین الاحادیث کیا ہے یہ ٹھیک ہے لیکن قلیل اور کثیر کی تحدید ضروری ہے تاکہ اس پر عمل کیا جاسکے صرف قلیل اور کثیر کہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

باقی امام شافعی رحمہ اللہ جو قاعدہ اولیٰ نیند میں ہمارے ساتھ ہیں اور اس کے علاوہ حالات میں مخالف ہیں ان کو جواب یہ ہے کہ انما الوضوء علی من نام مضطجعا کا جملہ سائل کے جواب میں واقع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال ہوا تھا کہ آپ سو گئے ہیں وضو کرنا چاہئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تو بیٹھ کر سو گیا تھا اور وضو لیٹ کر سونے والے پر ضروری ہوتا ہے تو یہاں سائل کے جواب میں یہ جملہ واقع ہوا ہے اس میں کوئی حصر نہیں کہ اس کے علاوہ کسی ہیئت کی نیند قائل معافی نہیں ہے بلکہ حدیث میں واضح علت موجود ہے کہ اصل علت استرخاء مفاصل ہے۔

اور وہ بیہکات صلوٰۃ کی کسی ہیئت پر سونے سے نہیں ہوتا ہے تو احناف نے پوری حدیث کو دیکھ کر عمل کیا ہے اور شوافع نے وسیع حکم کو ایک لفظ تک محدود کر دیا ہے جو مناسب نہیں ہے یہ تشریح و تفصیل اس کے بعد آنے والی روایتوں کے لئے بھی کافی ثانی ہے۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَأَنَّ الشَّوْءَ أَلْعَيْنَانِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَقَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُعِي السُّلْتَنُ رَحِمَهُ اللَّهُ هَذَا فِي عِلْمِ الْقَاعِدِ لِمَا صَحَّ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ حَتَّى تَخْفِقَ رُؤُوسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّأُونَ.

(رواہ ابو داؤد والترمذی الا انہ ذکر فیہ ینامون تکل ینتظرون العشاء حتی تخفق رؤوسہم)۔

ترجمہ: اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا "سرین کا سر بند آنکھیں ہیں لہذا جو شخص سو جائے اسے چاہئے کہ وضو کرے۔ (ابوداؤد) اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس شخص کے واسطے ہے جو بیٹھنا ہو (بلکہ لیٹ کر سویا ہو) اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے

دلائل:

اگر مثلاً اپنے استدلال میں حضرت بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں جس میں مس الذکر کے بعد وضو کا حکم دیا گیا ہے۔
 "اذا مس احدكم ذكره فليمتوضاً" ائمہ احناف اپنی دلیل میں حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں:
 "قال وهل هو الا بضعة منه" ائمہ جمہور اور ائمہ احناف دونوں ایک دوسرے کے دلائل پر اعتراضات کرتے ہیں۔ لہ
 چنانچہ ائمہ احناف نے بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عروہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث براہ راست بسرہ سے
 نہیں سنی ہے بلکہ عروہ رضی اللہ عنہ اور بسرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان یا مروان ابن الحکم راوی ہے اور یا مروان کا کوئی شرطی یعنی
 پولیس بیچ میں واسطہ ہے جو مجہول ہے۔

اگر مروان بیچ میں ہے تو وہ حکومت میں آنے کے بعد اس قابل نہیں رہے کہ ان سے روایت لی جائے اور اگر شرطی بیچ میں
 ہے تو وہ مجہول الحال ہونے کے علاوہ مروان سے بھی بد حال ہے لہذا یہ روایت ناقابل استدلال ہے۔
 جمہور نے طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے کیونکہ بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو حضرت
 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی نقل کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو میں مسلمان ہوئے تھے اور طلق بن علی نے اسلام قبول
 کر کے اچھ میں ملاقات کی اور اس کے بعد مدینہ نہیں آئے تو مثلاً خرا لا سلام راوی کی روایت مستقدم الاسلام راوی کی
 روایت کے لئے ناخ بن جائے گی لہذا طلق رضی اللہ عنہ کی روایت منسوخ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ناخ ہے۔

اصل جواب:

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں حسن سے کم درجہ کی نہیں
 ہیں۔ بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت چودہ وجہ سے منقول ہے تو کس کس کو ضعیف کہو گے؟ اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو
 کسی واضح دلیل کے بغیر منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے نسخ کا قول بلا دلیل ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات
 دوبارہ ہوئی ہو محض تقدم اسلام راوی تقدم روایت کی دلیل نہیں بن سکتی ہے نسخ کے اس ضابطہ کو اگر پکڑو گے تو
 بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت خود منسوخ بن جائے گی کیونکہ بسرہ رضی اللہ عنہ مکہ میں اسلام لائی تھی اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کئی سال
 بعد مکہ ہجری میں مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے لہذا تقدم و تاخر کی بات نہیں چلیگی بلکہ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مکہ ہجری کے بعد
 طلق بن علی کی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ طلق رضی اللہ عنہ نے ۹۹ سنۃ الوفود میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی
 تھی جس کو طبقات ابن سعد نے صریحاً ذکر کیا ہے اس تقریر سے محی السنۃ کی بات بھی ختم ہوگئی کہ طلق رضی اللہ عنہ کی روایت منسوخ
 ہے۔ مندرجہ بالا تقریر سے معلوم ہوا کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو اب فیصلہ ترجیحات کی بنیاد پر ہوگا تو طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی
 روایت کی ایک ترجیح یہ ہے کہ قیاس اس کے موافق ہے کیونکہ جب احادیث میں تعارض آتا ہے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا
 پڑتا ہے اور قیاس کہتا ہے کہ جب تک سبیلین سے نجاست کا خروج نہیں ہوتا وضو واجب نہیں ہوتا اور یہاں سبیلین سے کچھ

اور ابن ماجہ نے بھی اس طرح روایت کیا ہے امام محی السنۃ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کے آنے کے بعد اسلام لائے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث منقول ہے کہ جب تم میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ذکر پر پہنچ جائے اور ہاتھ اور ذکر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وضو کرے۔ (شافعی، دارقطنی) اور نسائی نے بسرہ رضی اللہ عنہ روایت نقل کی ہے جس میں لمیس بینہ و بینہا شیء کے الفاظ مذکور نہیں ہیں۔

۲۱۰ نمبر ۱۰۱۰

مسئله تقبیل المرأة

۱۹۹۹ ﴿وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ بَعْضَ أَزْوَاجِهِ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ﴾ (رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَا يَسْبِغُ عِنْدَ أَهْلِهَا بِحَالٍ إِسْنَادُ غُرُوقَةٍ عَنْ عَائِشَةَ وَأَيْضًا إِسْنَادُ ابْنِ أَبِي هَاشِمٍ الْقُمِّيِّ عَنْهَا قَالَ أَبُو دَاوُدَ هَذَا مُرْسَلٌ وَالْبُزْجَانِيُّ الْقُمِّيُّ لَمْ يَسْتَعِنْ بِعَائِشَةَ ۱

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض بیویوں کا بوسہ لیتے تھے اور بغیر وضو کے (پہلے ہی وضو سے) نماز پڑھ لیتے تھے (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک کسی حال میں عروہ کی سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نیز ابراہیم تیمی کی سند بھی حضرت عائشہ سے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم تیمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نہیں سنا ہے۔

توضیح: یقیناً بعض ازواجہ: یہ مسئلہ مس ذکر کی طرح مس المرأة کا ہے جس کو تقبیل المرأة بھی کہتے ہیں مس ذکر کی طرح اس میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ آیا عورت کو چھو لینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں ٹوٹتا۔ روایات میں اختلاف کی وجہ سے صحابہ میں اور پھر تابعین و فقہاء میں اختلاف ہو گیا ہے۔

فقہائے کرام کا اختلاف:

جمہور فقہاء کے ہاں مس المرأة ناقض وضو ہے۔ البتہ شوافع نے بلا حائل کی قید کا اضافہ کیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تین قیود کا اضافہ کیا ہے یعنی عورت اجنبیہ ہو بالغہ ہو اور مس بشھو ہو۔ ائمہ احناف کے نزدیک مس المرأة اور تقبیل المرأة مطلقاً ناقض للوضو نہیں ہیں ہاں اگر مباشرت و ملاعبت فاحشہ ہو یا صرف تقبیل سے خروج نجاست ہو تو پھر ناقض وضو ہے۔

دلائل:

جمہور کے پاس کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے البتہ انہوں نے قرآن عظیم کی آیت سے مسئلہ کو نکالنے کی کوشش کی ہے اور احناف کی دلیل میں جو حدیث ہے اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ حضرات آیت "اولاً مستلم النساء"

سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ اس کس سے کس بالید مراد ہے جہاں مراد نہیں لہذا ثبوت کے چھونے سے وضو لازم ہو جاتا ہے۔

جمہور نے مشکوٰۃ ص ۴۱ کے آخر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر سے بھی استدلال کیا ہے اور پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر اور موقوف روایات سے استدلال کیا ہے۔ ائمہ احناف نے زیر نظر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت سے استدلال کیا ہے۔ احناف کی دوسری دلیل بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے فرماتی ہیں:

كُنْتُ اَنَا مِنْ يَدِي رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَرَجُلَايَ فِي قِبْلَتِهِ فَاِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَتَبْطِئُ رَجُلِي فَاِذَا قَامَ بَسَطَ يَمَانِي وَالْيَمَانُ يَوْمَئِذٍ مِثْلُ الْيَسْ فَدَحَا مَصَابِيحُ. (بخاری ج ۱، ص ۸۲)

اس حدیث کو بخاری نے کئی جگہ مختلف الفاظ سے نقل کیا ہے تاہم یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ احناف کی تیسری دلیل مسلم شریف کی روایت ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح نقل فرماتی ہیں:

"طَلَقْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ مِنَ الْفَرَّاشِ فَالْتَمَسْتُهُ فَوَقَعْتُ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمِهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ"

احناف کی چوتھی دلیل حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو ابن عدی نے کامل میں ذکر کیا ہے ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ الرَّجُلُ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَقْبِلُ أَهْلَهُ وَيَلَاعِبُهَا اِنْقَضَتْ ذَلِكَ الْوُضُوءُ قَالَ لَا"

جمہور نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیر بحث حدیث پر اعتراض کیا ہے جس کو صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک عروہ کی اسناد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی حال میں صحیح نہیں ہے۔

صاحب مرقاة لماعلی قاری رحمہ اللہ نے صاحب مشکوٰۃ کے اس قول کو غیر صحیح کہا ہے کیونکہ امام ترمذی نے اگرچہ اس سند کو ضعیف کہا ہے لیکن انہوں نے عروہ کے سماع کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے انکار نہیں کیا ہے اور یہ انکار وہ کر بھی نہیں سکتے ہیں کیونکہ بخاری و ترمذی میں جگہ جگہ عروہ کے سماع عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصریح موجود ہے البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ حبیب بن ثابت کا سماع عروہ سے ثابت نہیں ہے۔

اس حدیث کی سند پر اعتراض کی صحیح توجیہ ہونی چاہیے تاکہ صاحب مشکوٰۃ کی طرف اتنی بڑی غلطی کی نسبت نہ ہو جائے وہ توجیہ یہ ہے کہ عروہ نام کے دو شخص ہیں ایک عروہ بن زبیر ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں اور دوسرے عروہ مزی ہیں یہاں اگر عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مراد لیا جائے تو ان کا سماع عائشہ رضی اللہ عنہا سے تو ثابت ہے لیکن حبیب بن ثابت کا سماع عروہ بن زبیر سے ثابت نہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر یہاں عروہ سے مراد عروہ مزی مراد لیا جائے تو حبیب

کا سماع اس عروہ سے تو ہے مگر عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا سماع نہیں پھر بھی حدیث میں انقطاع آگیا بہر حال حدیث کی یہ سند منقطع ہے۔ احناف اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس سند میں عروہ سے مراد عروہ بن زبیر ہی ہیں مرنی نہیں ہے اور دارقطنی اور مسند احمد کی روایت میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ عروہ سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ابن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں ادھر ابوداؤد کی روایت میں ایک مضبوط قرینہ ہے کہ مراد عروہ بن زبیر ہیں کیونکہ وہاں یہ الفاظ ہیں "من ہی الا انت فضحکت"۔

بے تکلفی کے یہ الفاظ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

کیونکہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں اور عروہ مرنی تو ایک اجنبی آدمی ہیں وہ کیسے یہ الفاظ کہہ سکتے ہیں؟ اب یہ بات رہ گئی کہ حبیب کا سماع و لقاء عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے واضح کیا ہے کہ حبیب کا سماع عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور عام محدثین نے بھی اس سماع کو تسلیم کیا ہے اب جمہور کا پہلا اعتراض ختم ہو گیا۔

لیکن جمہور نے دوسرا اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث ابراہیم تیمی کی وجہ سے مرسل کی ایک قسم منقطع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرسل روایت جمہور کے نزدیک قابل استدلال ہے صرف شوافع اس میں اختلاف رکھتے ہیں تو ہمارے نزدیک مرسل بھی مقبول ہے نیز طبرانی میں عن ابراہیم تیمی عن ابیہ عن عائشہ کی سند ہے اب تو یہ حدیث مرسل بھی نہ رہی ارسال بھی ختم ہو گیا جمہور نے آیت الوضو کے لفظ "لا مستم" سے استدلال کیا ہے آیت اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا۔

جَوَابِیۡہٗ، قرآن کریم کی اس آیت سے جمہور نے استدلال کیا اور کہا کہ احناف آیت کے مقابلہ میں حدیث کو کیوں لیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اولا مستم النساء کی تفسیر جماع سے کی ہے۔ لکن سنن ابی داؤد، یہ ہے کہ باب مفاہلہ اغلباً جانبین سے فعل کے صدور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور جانبین کا تحقق جماع کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

تَبَیِّنُہٗ جَوَابِیۡہٗ، یہ ہے کہ آیت میں تیمم کا ذکر ہے پانی نہ ملنے کی صورت میں طہارت کے لئے تیمم کافی ہے اب تیمم کو حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں کے لئے عام کرنا چاہئے اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ "اَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ" سے حدث اصغر اور "اَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ" سے حدث اکبر مراد لیا جائے تاکہ تیمم دونوں حدثوں کے لئے طہارت بن

جائے اور تاکید کے بجائے آیت میں تائیس آجائے جو تاکید سے افضل ہے لہذا اولاً مستم سے جماع مراد لینا ہوگا۔
نیز لمس محاورہ عرب میں جماع کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خاص کر جب اس کا مفعول بہ نساء کا لفظ ہو جیسے اردو میں بھی کہتے ہیں حرم پر ہاتھ ڈالا پشتو میں کہتے ہیں: ”ہہ خحنے لاس اولگړو“۔

باقی جمہور نے جن آثار سے استدلال کیا ہے وہ مرفوع احادیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کئے جاسکتے ویسے بھی شوافع کے نزدیک مجتہدین پر لازم نہیں کہ وہ صحابہ کرام کے اجتہادی اقوال کے پابند ہوں وہ کہتے ہیں: ”نعم رجال وہم رجال“۔

آگ پر پکی ہوئی اشیاء کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا

﴿۲۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَكَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْتَفا ثُمَّ مَسَحَ يَدَيْهِ بِمَسْحٍ كَانَ تَحْتَهُ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى. (رواۃ ابوداؤد وابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے بکری کا شاندہ (یعنی بکری بریاں کے شاندہ کا گوشت) کھایا پھر اپنا ہاتھ ناٹ سے پونچھ لیا جو آپ ﷺ کے پونچھا ہوا تھا اور پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھ لی۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّهُ قَالَتْ قَرَّبْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَنْبًا مَشْوًيًا فَأَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. (رواۃ احمد)

ترجمہ: اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بھنا ہوا پہلو لے گئی چنانچہ آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور وضو نہیں کیا۔ (اور نہ ہاتھ منہ دھویا)۔ (احمد رحمہ اللہ)

الفصل الثالث

﴿۲۲﴾ عَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ أَشْهَدُ لَقَدْ كُنْتُ أَشْوِي يَوْمَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَطْنِ الشَّاءِ ثُمَّ صَلَّيْتُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. (رواۃ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو رافع فرماتے ہیں کہ اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے لئے بکری کا پیٹ (یعنی پیٹ کے اندر کی چیزیں مثلاً دلی، کبھی وغیرہ) بھونٹا تھا آپ (اس سے کھاتے) پھر نماز کے لئے کھڑے ہوتے اور وضو نہ کرتے۔ (مسلم)

﴿۲۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ أُهْدِيَتْ لَهُ شَاةٌ فَجَعَلَهَا فِي الْعِدْرِ فَدَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا هَذَا يَا أَبَا رَافِعٍ فَقَالَ شَاةٌ أُهْدِيَتْ لَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ فَطَبَخْنَاهَا فِي الْعِدْرِ فَقَالَ تَأْوِلْنِي الذِّدَاعُ يَا أَبَا رَافِعٍ فَتَأْوِلْنَاهُ الذِّدَاعُ ثُمَّ قَالَ تَأْوِلْنِي الذِّدَاعُ ثُمَّ قَالَ تَأْوِلْنِي الذِّدَاعُ الْآخَرَ فَتَأْوِلْنَاهُ الذِّدَاعُ الْآخَرَ ثُمَّ قَالَ تَأْوِلْنِي الذِّدَاعُ الْآخَرَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّمَا لِلشَّاةِ ذِرَاعَانِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّكَ لَوْ سَكَّيْنَا وَلَتَبَّيْ ذِرَاعًا فَذِرَاعًا مَا سَكَّيْنَا ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَمَضَّضَ فَاةً وَغَسَلَ أَظْرَافَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى ثُمَّ عَادَ إِلَيْهِمْ فَوَجَدَ عَنْدهُمْ لَحْمًا يَارِدًا فَأَكَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلَّى وَلَمْ يَمْسَسْ مَاءً.

(رواہ احمد و زوایہ الدارمی عن ابی عینیہ الا انه لم يذكر كونه دعا بماء الى اليوم)۔

توضیح: حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ (ایک دن) میرے پاس خفہ کے طور پر بکری بھیجی گئی چنانچہ میں نے (اس کے گوشت) کو (پکانے کے لئے) ہانڈی میں ڈال دیا (اسی اثناء میں) آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا "ابو رافع یہ کیا ہے؟" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! بکری کا گوشت ہے، جو میرے پاس ہدیہ کے طور پر آیا تھا اسی کو میں نے ہانڈی میں پکایا ہے۔" آپ نے فرمایا ایک دست مجھے بھی دو چنانچہ میں نے ایک دست آپ کی خدمت میں پیش کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دست اور دو میں نے دوسرا دست بھی خدمت اقدس میں پیش کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا "ایک دست اور دو" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بکری کے تو دو ہی دست ہوتے ہیں (اور دونوں ہی آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں اب کہاں سے لاؤں) سرکارِ دو عالم ﷺ نے ان سے فرمایا ابو رافع اگر تم خاموش رہتے تو مجھ کو دست پر دست دیے چلے جاتے جب تک کہ تم چپ رہتے۔ پھر آپ ﷺ نے پانی منگوا یا اور منہ دھویا (یعنی کلی کی) پھر انگلیوں کے پورے دھوئے اور کھڑے ہوئے اور پھر نماز پڑھ کر ابو رافع کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے ہاں ٹھنڈا گوشت دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے اسے کھایا اس کے بعد مسجد تشریف لے گئے اور (شکرانہ کی) پھر نماز پڑھی اور پانی کو چھو بھی نہیں یعنی نہ تو وضو کیا اور نہ ہی کلی کی (احمد) اور اس حدیث کو داری نے بھی روایت کیا ہے مگر ثمد دعا بماء سے آخر تک ذکر نہیں کیا ہے۔

توضیح: الذداع: بکری کے سامنے والے دونوں پاؤں کے اوپر شانہ تک کے حصہ کو ذراع کہتے ہیں جس کو اردو میں دست یا دسٹی کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کو دست کا گوشت زیادہ پسند تھا کیونکہ گوشت کا یہ حصہ لذیذ بھی ہوتا ہے اور قوت بخش بھی ہوتا ہے۔

ذراعاً فذراعاً: یعنی میرے ماتھے پر اگر تم خاموش رہتے تو معجزاتی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی ذراع کا انتظام ہو جاتا مگر جب تم نے ظاہر اسباب کی تصریح و تشریح شروع کر دی تو پردہ غیب کا کرشمہ موقوف ہو گیا۔

ولم یمس ماء: یعنی آپ ﷺ نے اس صورت میں پانی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کیونکہ یہاں آپ نے ٹھنڈا گوشت تناول فرمایا جس سے

ہاتھوں کو کچھ بھی نہیں لگا تھا۔ تو نہ ہاتھ دھوئے اور نہ وضو کیا یہ ساری حدیثیں جمہور کے دلائل ہیں کہ آگ سے چھوئی ہوئی چیز کے کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ ۱۔

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَأَبِي وَأُمِّي وَطَلْحَةُ جُلُوسًا فَأَكَلْنَا لَحْمًا وَخُبْزًا ثُمَّ دَعَوْتُ بِوَضُوءٍ فَقَالَ لِمَ تَتَوَضَّأُ فَقُلْتُ لِهَذَا الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْنَا فَقَالَ أَتَتَوَضَّأُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَمْ يَتَوَضَّأُ مِنْهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْكَ (رواه أحمد) ۲۔

ترجمہ: اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابوطحہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے گوشت اور روٹی کھائی (کھانے سے فارغ ہو کر) میں نے وضو کے لئے پانی منگوایا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابوطحہ رضی اللہ عنہ نے کہا تم وضو کیوں کرتے ہو، میں نے کہا اس کھانے کی وجہ سے جو میں نے ابھی کھایا ہے ان دونوں نے کہا کیا پاکیزہ چیزوں کے کھانے سے وضو کرتے ہو؟ ان چیزوں کو کھا کر اس شخص نے وضو نہیں کیا جو تم سے بہتر ہیں یعنی آنحضرت ﷺ۔ (احمد)

﴿۲۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُولُ قُبَلَةُ الرَّجُلِ امْرَأَتُهُ وَجَسَّهَا يَمِينُهُ مِنَ الْمَلَأَمَسَةِ وَمَنْ قَبَلَ امْرَأَتَهُ أَوْ جَسَّهَا يَمِينُهُ فَعَلَيْهِ الْوُضُوءُ. (رواه مالك) ۳۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ مرد کا اپنی عورت کا بوسہ لینا یا اس کو اپنے ہاتھ سے چھونا یہ ملاست ہے اور جس شخص نے اپنی عورت کا بوسہ لیا یا اس کو ہاتھ سے چھوا تو اس پر وضو واجب ہے۔ (مالک۔ شافعی)

﴿۲۶﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ مَنْ قُبَلَتِ امْرَأَتُهُ الْوُضُوءُ. (رواه مالك) ۴۔

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ مرد پر اپنی عورت کا بوسہ لینے سے وضو لازم آتا ہے۔ (مالک)

﴿۲۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ إِنَّ الْقُبْلَةَ مِنَ اللَّمَسِ فَتَوَضَّأُوا مِنْهَا. ۵۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بوسہ لینا لمس میں داخل ہے (جو قرآن میں مذکور ہے) لہذا بوسہ لینے کے بعد وضو کیا کرو۔

توضیح: فتوضو: یہ روایت اور اس سے پہلے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہما

لیس فی القبلة وضوء (کذا فی مسند ابی حنیفہ رحمہ اللہ) تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

﴿٢٨﴾ وَعَنْ عُمَرَ ابْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ عَنْ تَمِيمِ الدَّارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
الْوُضُوءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ.

فقہاء کا اختلاف:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل دو صحابہ کا وہ واقعہ ہے جو ابوداؤد نے جلد اول ص ۲۶ ہاں

الوضوء من الدھ میں بیان کیا ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ مہاجر بن بشر رضی اللہ عنہ انصاری غزوۂ ذات الرقاع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر رات کو افواج اسلام کے پہرے پر مقرر ہوئے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ رات کے پہلے حصہ میں آرام کرنے لگے اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ چوکیداری کرنے لگے۔ آپ نماز پڑھنے لگے کہ ایک مشرک نے آپ کو تیر مارا آپ نے نماز جاری رکھی تو ظاہر ہے خون بہہ گیا ہوگا اگر وضو ٹوٹا تو آپ نماز چھوڑ دیتے معلوم ہوا خون کے خروج سے وضو نہیں ٹوٹا اور مذکورہ حدیث کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ اس میں اتقاع بھی ہے اور اس کے دوراوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد دونوں مجہول ہیں۔

ائمہ احناف اور جمہور نے فاطمہ بنت ابی حمیش کی بخاری والی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں فاطمہ بنت ابی حمیش کے پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا حدیث یوں ہے:

”عن عائشة قالت جاءت فاطمة بنت ابی حمیش الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت انی امرأة استعاض فلا اظھر أفأدع الصلوة قال لا انما ذلك دم عرق ثم توضی لكل صلوة“۔

اور بخاری کے بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں:

”توضی ما بین ذلک حتی یھی ذلک الوقت“۔

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خون ناقض للوضو ہے کیونکہ استعاضہ کے خون کے خروج سے ہر نماز کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ دلیل شوافع پر حجت نہیں بلکہ مالکیہ پر حجت ہے جو سیبیلین اور غیر سیبیلین کے خون کا فرق نہیں کرتے ہیں ہاں ”دم عرق“ کے لفظ میں جب عموم ہے تو پھر شوافع پر بھی حجت ہوگی احناف اور حنابلہ نے اس روایت کو اسی عموم کے پیش نظر پیش کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دم عرق فرمایا تو جسم کے جس حصہ سے بھی خون بہہ جائے سب کو شامل ہے۔

احناف اور حنابلہ کی دوسری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اصابہ فیہ اور عاف او قلنس او مذي فلینصرف فلیتوضا ثم لیبین علی صلاتہ وهو فی ذلک لا یتکلم۔ (رواہ ابن ماجہ فی باب ماجاء فی البناء علی الصلاة ص ۴۸)

اس حدیث میں نکسیر کے خون اور تے کو ناقض للوضو بتایا گیا ہے اور یہ دونوں چیزیں خارج من غیر السبیلین ہیں۔

احناف کی تیسری دلیل وہ استنباطی دلیل ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

کہ جس شخص کا نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل جائے۔ طرز استدلال اس طرح ہے کہ وہ شخص شرم کے مارے نماز سے نکل نہیں سکتا ہے کیونکہ لوگ کہیں گے اس کی ہوا خارج ہوگئی اس شرم سے بچنے کے لئے وہ ناک پر ہاتھ رکھے اور لوگوں کو یہ دکھائے کہ میرا وضو ہوا کے خارج ہونے سے نہیں ٹوٹا ہے بلکہ ناک سے خون بہنے کی وجہ سے ٹوٹا ہے اب اگر خون خارج ہونے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اس شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ تدبیر کیوں سمجھائی ہے؟

احناف کی چوتھی دلیل یہی زیر نظر حدیث ہے اس پر صاحب کتاب نے دو اعتراض اٹھائے ہیں پہلا اعتراض یہ کہ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تصیم داری رحمہ اللہ سے نہ روایت ثابت ہے نہ روایت ثابت ہے لہذا حدیث منقطع و مرسل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زیلعی نے تصریح کی ہے کہ ابن عدی نے اس روایت کو سند متصل کے ساتھ نقل کیا ہے نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی یہ حدیث سند متصل کے ساتھ مذکور ہے تو انقطاع اور ارسال ختم ہو گیا ہے نیز کثرت طرق اور تعدد سند کی وجہ سے حدیث میں قوت آگئی ہے اسی وجہ سے ترمذی نے اس حدیث کو حسن کا درجہ دیا ہے ویسے بھی اگر یہ حدیث منقطع ہو یا ضعیف بھی ہو تو احناف کی دلیل کا مدار اس حدیث پر نہیں ہے ان کی دلیل کا مدار تو فاطمہ بنت ابی حبیش رحمہ اللہ اور حضرت عائشہ کی رعاۃ والی حدیث پر ہے نیز یہ بھی شرعی ضابطہ ہے کہ خروج نجاست موجب وضو ہے اور خون اتفاقی طور پر نجس ہے۔ صاحب کتاب نے زیر نظر حدیث پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اس حدیث کے دو راوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد مجہول ہیں لہذا حدیث قائل استدلال نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زیلعی نے صحیح سند کے ساتھ زید بن خالد سے اس کی روایت کی ہے جیسا کتاب ”کامل بن عدی“ میں ہے اور یزید بن محمد اور یزید بن خالد مجہول الحال تو ہیں مگر مجہول الذات نہیں اور ان سے بہت سارے ثقہ راوی روایت لیتے ہیں لہذا وہ مجہول بھی نہ رہے۔

جوابیہ: امام مالک رحمہ اللہ و شافعی رحمہ اللہ نے صحابی کے جس واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ خون بہہ گیا اور وہ نماز پڑھتے رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک صحابی کے جذبات و استغراق اور غلبہ حال کا واقعہ ہے اور کسی کے غلبہ حال اور استغراقی کیفیت سے استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس جزئیہ عامیہ سے قواعد کلیہ نہیں بنائے جاسکتے نیز اس پر آنحضرت ﷺ کی تقریر و تصویب ثابت نہیں نیز اتنا خون بہنے سے کپڑے کیسے پاک رہے حالانکہ شوافع کے ہاں نجاست میں کوئی قدر معاف نہیں اسی لئے علامہ خطابی شافعی نے فرمایا

کہ اس حدیث سے شواہد اس وقت استدلال کر سکتے ہیں جبکہ خون فوارہ کی شکل میں باہر جا کر گرما ہو اور کپڑے محفوظ رہ گئے ہوں ہم نے کہا واہ واہ۔

حضرت علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ توجیہ غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس صحابی کے پاس دوسرے کپڑے تھے جو پاک تھے وہ اس نے پہن لئے اور نماز پڑھی ہم نے کہا شائبہ!

حالانکہ جب اس صحابی کے ساتھی نے ان کو خون میں لت پت دیکھا تو کہا مجھے کیوں نہیں جگایا آپ نے فرمایا میں نے سورہ کہف شروع کی تھی میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ نماز چھوڑوں، معلوم ہوا خون سے وہ کپڑے آلودہ ہو گئے تھے جس میں نماز پڑھی۔ اس حدیث میں جو قصہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غزوہ ذات الرقاع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو پہرہ پر مقرر فرمایا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ تو سو گئے اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اپنی باری میں پہرہ دینے لگے اور نماز میں مشغول ہو گئے ادھر ایک کافر تھا جس کی بیوی میدان جنگ میں ماری گئی تھی اس نے قسم کھائی تھی کہ محمد کے ساتھیوں میں سے کسی کو قتل کر کے بیوی کا بدلہ لوں گا وہ رات کے وقت آیا اور اس صحابی پر حیر مارا صحابی نماز پر قائم رہے پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ جاگ اٹھے تو کافر نے اندازہ کر لیا کہ اب یہ لوگ تعاقب کریں گے تو وہ بھاگ نکلا۔



باب آداب الخلاء

بیت الخلاء جانے کا بیان

آداب ادب کی جمع ہے شرعی طور پر اس کا اطلاق مستحب پر بھی ہوتا ہے۔ اور "اعطاء کل شیء حقہ" یعنی ہر چیز کو اس کا جائز اور مناسب مقام دینے پر بھی ہوتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ادب کی تعریف اس طرح کی ہے:

"الآداب استعمال ما یحمد قولاً أو فعلاً"۔ لے

یعنی ادب ان چیزوں کے استعمال کو کہتے ہیں جن کے استعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق افعال سے ہو یا اقوال سے ہو۔ چنانچہ اس باب میں ان اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو استنجاء کے حوالے سے ممنوع اور مکروہ ہیں اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو استنجاء میں مستحب و محمود و مطلوب ہیں۔

الخلاء: خاک کے فتح اور مد کے ساتھ ہے خلاء ہر اس مکان کو کہا جاتا ہے جس میں انسان قضاء حاجت کے لئے جاتا ہو یہ "خالی" کے معنی میں ہے کیونکہ انسان بھی وہاں سب سے خالی اور تنہا ہو کر جاتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان وہاں نہیں جاتا ہے تو عام اوقات میں وہ مکان خالی رہتا ہے یا انسان وہاں اپنے پیٹ کو خالی کرتا ہے۔

چند آداب:

اس مقام پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے چند چیزوں کو آداب خلاء میں بیان فرمایا ہے۔

- ۱۔ اول قضاء حاجت کے وقت بیت اللہ اور قبلہ کی عظمت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔
 - ۲۔ نظافت اور صفائی کا خیال رکھا جائے لہذا تین پتھروں سے کم نہ ہوں تاکہ خوب صفائی آجائے۔
 - ۳۔ لوگوں کے نقصان سے پرہیز کیا جائے لہذا راستہ یا سایہ دار اور پھل دار درخت کے نیچے قضاء حاجت نہ کرے۔
 - ۴۔ اپنے نقصان سے پرہیز کرے کہ سوراخ میں پیشاب نہ کرے۔
 - ۵۔ حقوق جوار اور اخوان کا خیال رکھے اس لئے جنات کی خوراک ہڈی گوبر وغیرہ سے استنجاء نہ کرے۔
 - ۶۔ حقوق نفس کا خیال رکھے لہذا دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کرے۔
 - ۷۔ دوسرے سے بچنے کی خاطر غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے۔
 - ۸۔ لوگوں کی آنکھوں سے ستر اور حجاب اختیار کرے۔
 - ۹۔ دخول اور خروج کے وقت مسنون دعائیں پڑھے۔
- اس باب میں مندرجہ بالا تمام آداب سے متعلق احادیث آئیں گی۔

الفصل الاول

مسئله استقبال القبلة واستدبارها

﴿عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَايِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا وَلَكِنْ مَرُّوْا أَوْ غَرِّبُوا﴾ (متفق عليه)

قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ إِذَا تَقَدَّيْتُ قَوْقَ بَيْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ حَاجَتِي فَرَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَحِي حَاجَتَهُ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ۔ (متفق عليه) ۱۔

ترجمہ: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم بیت الخلاء جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ اور پشت رکھو“ (بخاری و مسلم) حضرت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ جنگل کا حکم ہے آبادی میں ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اپنی کسی ضرورت سے حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر چڑھا تو میں نے آنحضرت ﷺ کو (بیت الخلاء میں) قضاء حاجت کرتے دیکھا آپ قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کئے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: لا تستقبلوا القبلة: پیشاب پاخانہ کے وقت استقبال قبلہ اور استدبار قبلہ کرنے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ مشہور اور غیر مشہور تمام مذاہب میں اختلاف ہے لیکن مذاہب مشہورہ متبوعہ صرف چار ہیں اسی کو بیان کیا جاتا ہے چونکہ روایات مختلف ہیں اس لئے فقہائے کرام میں بھی اختلاف آگیا ہے اگرچہ یہ طے ہے کہ سب کے نزدیک اصح مافی الباب یہی حدیث ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ ہے جو نفی پر دال ہے اور دوسری حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جو جواز پر دال ہے۔ ۲۔

فقہاء کا اختلاف:

۱۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک استقبال قبلہ اور استدبار قبلہ آبادی میں مطلقاً جائز ہے اور صحرا میں مطلقاً ناجائز ہے گویا انہوں نے حج بین الا حدیث کی کوشش کی ہے کہ جواز کی حد میں آبادی و بُہُنِیَان پر محمول ہیں اور عدم جواز اور نفی کی احادیث صحرا پر محمول ہیں۔

۲۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے استدبار قبلہ صحرا اور بُہُنِیَان دونوں میں جائز قرار دیا ہے اور استقبال کو دونوں میں ناجائز کہا ہے تو جوا حدیث نفی کی ہیں وہ استقبال پر محمول ہیں اور جن احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے وہ استدبار کی ہیں۔

● امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، سفیان ثوری رحمہ اللہ، جمہور صحابہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک استقبال و استدبار آبادی و صحرا دونوں جگہوں میں ناجائز ہے اور کسی کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔

● داؤد ظاہری، ربیعہ الرائی اور اہل قواہر کے نزدیک استقبال و استدبار مطلقاً جائز ہے خواہ ٹہلیان میں ہو یا صحرا میں ہو۔ انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استقبال کا جواز اخذ کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدبار کا جواز اخذ کیا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ روایات متاخر ہیں لہذا یہ ناخ ہیں تو استقبال و استدبار دونوں کا اصل جواز باقی رہ گیا۔ ان چاروں مذاہب میں دلائل کے اعتبار سے شوافع، احناف اور اہل قواہر کا اختلاف نمایاں ہے اس لئے اسی کو بیان کیا جاتا ہے۔
دلائل:

شوافع اور مالکیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی زیر نظر حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل "مستدبر القبلة مستقبل الشام" بتایا گیا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عراک رضی اللہ عنہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے جس میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بتایا گیا کہ کچھ لوگ قضاء حاجت کے وقت استقبال قبلہ کو مکروہ سمجھتے ہیں تو آپ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ لوگوں نے ایسا شروع کیا ہے تم لوگ میری قضاء حاجت کی جگہ قبلہ کی طرف موڑ دو الفاظ حدیث ملاحظہ ہوں:

عراک عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت ذکر عند رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قوم یکرہون ان یتقبلوا بفر وجہہم القبلة فقال اراہم قد فعلوها استقبلوا عن عندی القبلة۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۷)

ان حضرات کی تیسری دلیل مروان اصفری ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ روایت ہے جو مشکوٰۃ کے صفحہ ۳۴ پر مذکور ہے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ کھلے میدان میں استقبال قبلہ منع ہے مگر جب کوئی حائل بیچ میں ہو تو پھر کوئی پرواہ نہیں ہے۔

اہل قواہر اپنے استدلال میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں جس کو ابو داؤد نے ص ۳ پر نقل کیا ہے الفاظ یہ ہیں:

عن جابر قال نہی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ان نستقبل القبلة ببول فرأیتہ قبل ان یقبض بعام یتقبلہا۔ (ترمذی ابو داؤد)

ان حضرات کی دوسری دلیل وہی عراک بن مالک کی روایت ہے جس سے شوافع نے بھی استدلال کیا ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی یہ لوگ استدبار کے جواز کے لئے استدلال کرتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک استدبار و استقبال مطلقاً جائز ہے۔
احمد احناف، جمہور فقہاء اور تابعین کی ایک دلیل تو یہی زیر نظر ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو اصح مافی الباب ہے جس میں مطلقاً استقبال و استدبار کی نہی کر دی گئی ہے۔

جمہور کی دوسری دلیل سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مشکوٰۃ کے ص ۴۲ پر موجود ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

”قال نهانا رسول الله ﷺ ان نستقبل القبلة لغائط او بول“ (مسلم)

جمہور کی تیسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مشکوٰۃ کے اسی صفحہ ۴۲ پر موجود ہے۔ جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

”اذا اهتمم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها“ (دارمی ابن ماجہ)

جمہور کی چوتھی دلیل عبد اللہ بن الحارث بن جزء کی مرفوع حدیث ہے جس کو ابن ماجہ اور ابن حبان نے نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”لا يبولن احدكم مستقبل القبلة“ (ابن حبان ابن ماجہ)

جمہور کی پانچویں دلیل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی دوسری مرفوع حدیث ہے جس میں نہایت واضح بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم قضاء حاجت کے لئے جاؤ تو پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف رخ نہ کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی جانب رخ کرو (ابو ایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) کہ جب ہم شام چلے آئے تو وہاں ہم نے بیت الخلاء کو قبلہ رخ پایا پس ہم استعمال کے وقت قبلہ سے منحرف ہو کر قضاء حاجت کرتے اور (کچھ کوتاہی پر) اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔ (ابو داؤد ص ۳)

مسک احتاف کی ترجیحات:

استقبال قبلہ کے مسئلہ میں احتاف کا مسک بہت سی وجوہات کی وجہ سے رائج ہے چند وجوہات ملاحظہ ہوں۔

● مسک احتاف کے دلائل قوی احادیث ہیں دوسرے مسک کی روایتیں فعلی ہیں اور قول و فعل کا جب تعارض ہو جائے تو ترجیح قوی حدیث کو دی جاتی ہے کیونکہ فعل میں خصوصیت کا احتمال ہوتا ہے اور یہاں خصوصیت کا احتمال قوی ہے کیونکہ محققین علماء کے نزدیک روضہ اطہر میں آنحضرت ﷺ کا جسد مبارک زمین کے جس حصہ سے لگا ہوا ہے وہ حصہ عرش سے افضل ہے تو کعبہ سے جسد انور کی کیا نسبت تو خصوصیت بغیر ہی ہوگئی۔ نیز تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے فضلات پاک ہیں اور نبی ناپاک ہونے کی وجہ سے ہے تو یہ بھی خصوصیت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں جب آنحضرت ﷺ کے بعد بیت الخلاء میں داخل ہوتی تو مجھے وہاں کوئی فضلہ نظر نہیں آتا تھا اور خوشبو اٹھتی رہتی تھی۔ میں نے

اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انبیائے کرام کے جسم جنت کی ارواح طیبہ سے بنتے ہیں جو کچھ ان جسموں سے خارج ہوتا ہے زمین اس کو نگل لیتی ہے۔ (شفاء قاضی عیاض) اسی طرح آنحضرت ﷺ کی لونڈی کا واقعہ ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے پیشاب کو ایک بار غلطی سے پانی سمجھ کر پی لیا آپ نے کوئی تکلیف نہیں فرمائی تو یہ فضلات کی طہارت کی علامت ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شرح لمعات میں بھی انبیائے کرام کے فضلات کو پاک لکھا ہے۔

❶ احناف نے جو دلائل پیش کئے ہیں یہ سب محرم ہیں یعنی حرمت کو ثابت کرتی ہیں اور جب منہج اور محرم میں تعارض آجائے تو ترجیح محرم کو دی جاتی ہے تاکہ حرمت سے بچا جاسکے۔

❷ احناف نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ عام تشریع اور قانون کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں شریعت کا قاعدہ اور ضابطہ کلیہ بیان کیا گیا ہے۔ اور باقی حضرات نے جن روایتوں سے استدلال کیا ہے ان کی حیثیت جزئی واقعات کی ہے اور جزئی واقعہ کے مقابلہ میں قاعدہ کلیہ کو اپنایا جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے زندگی میں دو چار مرتبہ نہیں صرف ایک مرتبہ استدبار کیا ہے اور اس میں بھی اختلافات ہیں۔

❸ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت اپنے مقصود و مطلوب پر دلالت کرنے میں قطعی اور یقینی نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے دیکھنے میں غلطی کا احتمال ہے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا چہرہ انور ایک طرف ہو اور پیشاب دوسری طرف ہو ایسی حالت میں کوئی شخص گھور کر نہیں جھانک سکتا ہے نیز ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی آہٹ سن کر آنحضرت ﷺ نے منہ موڑ لیا ہو یا کوئی اور عذر ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت پر یہ شبہ بھی ہے کہ اس میں آبادی کا ذکر نہیں ہے تو صرف چھت پر قضاء حاجت اور صحرا میں یکساں ہے تو اس حدیث سے ہنسیان کے جواز پر استدلال نہیں ہو سکتا اور چھت کی چار دیواری ثابت کرنا مشکل ہے تو دلیل دعویٰ کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ چھت کی کھلی فضا ہنسیان نہیں ہے۔

الزامی جواب:

احناف نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کی روایات کا یہ الزامی جواب دیا ہے کہ بناءً احادیث میں نہیں عن استقبال القبلة کی علت کیا ہے تو واضح بات ہے کہ ادب کعبہ علت ہے اگر علت یہی ہے تو پھر ہنسیان اور صحرا میں فرق کیوں کرتے ہو؟ یا دونوں جگہ جائز کہہ دو یا دونوں میں حرام کہہ دو، اگر تم یہ فرق کرتے ہو کہ ہنسیان میں

آز اور حاکل ہے صحرا میں نہیں تو ادب کے ساتھ عرض ہے کہ چار بالشت کی دیوار اگر حاکل بن سکتی ہے تو کیا صحرا اور بیت اللہ کے درمیان یہ بڑے بڑے پہاڑ اور جنگلات حاکل نہیں ہو سکتے۔ نیز اگر ادب کعبہ کی وجہ سے ہزاروں میل دور صحراؤں، پہاڑوں اور آبادیوں میں تھوکنہ منع ہے تو کیا پیشاب پاخانہ منع نہیں ہوگا؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں شوافع اور مالکیہ بہت کمزور ہیں یہی وجہ ہے کہ حافظ مغرب ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ نے حنفیہ کا قول اپنایا ہے۔

قاضی ابوبکر مالکی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو لیا ہے ابن قیم حنبلی رحمہ اللہ نے بھی اسی مسلک کو اپنایا ہے۔ باقی جن حضرات نے جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے اور اس کی وجہ سے نبی کی تمام احادیث کو منسوخ قرار دیا ہے تو یہ بہت افسوسناک بات ہے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہے دوسرا ثوبان بن صالح ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں تو یہ روایت شیخین کی ابوالیوب رضی اللہ عنہ والی صحیح تر روایت کے لئے کیسے مانع بن سکتی ہے؟ اگرچہ اس کو حسن بھی قرار دیا جائے، نیز اس میں بھی وہی احتمالات ہیں جو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہیں۔

جن حضرات نے عراق بن مالک رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو اگرچہ بعض حضرات نے حسن کہا ہے لیکن اکثر محدثین نے اس پر بہت کلام کیا ہے چنانچہ علامہ مذہبی، ابن حزم، ابوحاتم، احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں کلام کیا ہے کیونکہ خالد بن ابی الصلت منکر الحدیث مجہول اور ضعیف ہے دو جگہ اس میں انقطاع بھی ہے اور بعض نے موقوف علی عائشہ رضی اللہ عنہا کہا ہے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کا عجیب جواب دیا ہے وہ یہ کہ استقبال و استدبار کی ممانعت سن کر لوگوں نے ہر جگہ بیت اللہ کی طرف پیٹھ کرنے میں غلو کیا اور ہر نشست میں پیٹھ کرنے کو حرام سمجھنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری نشست کو قبلہ رخ کر دو تا کہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہو اور لوگوں میں اعتدال آجائے یہاں بیت الخلاء کا مقعد مراؤ نہیں ہے بلکہ عام مجالس کی بات ہے۔

الغائط: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غائط اصل میں زمین کے نشیبی حصہ کو کہتے ہیں اسی اعتبار سے قضاء حاجت کی جگہ اور بیت الخلاء کو غائط کہا گیا ہے کیونکہ عادت کے مطابق لوگ نشیبی علاقہ کو قضاء حاجت کے لئے تلاش کرتے ہیں کیونکہ اس میں پردہ زیادہ ہوتا ہے پھر اس میں توسیع کر دی گئی اور پاخانہ کو ہی غائط کہہ دیا گیا: "تسمیۃ المحال باسم محلہ"۔

ولکن شرقوا او غربوا: یہ حکم اہل مدینہ اور بیت اللہ کے جنوب یا شمال میں رہنے والوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہاں سے بیت اللہ جنوب کی جانب واقع ہے اور مشرق و مغرب کی طرف بیت اللہ نہیں ہوتا بخلاف ہمارے ممالک کے جو مشرق میں واقع ہیں یہ حکم یہاں کے لئے نہیں ہے کیونکہ یہاں مغرب میں بیت اللہ واقع ہے۔ ہاں جو ممالک بیت اللہ کے

جنوب یا شمال میں واقع ہیں یہ حدیث ان کو بھی شامل ہے۔ شریعت میں بعض احکامات بعض لوگوں کے ساتھ خاص ہو کر آئے ہیں یہ حکم اسی قسم میں سے ہے۔ استقبال و استدبار کا یہ حکم رائج قول کے مطابق بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے بیت المقدس کا حکم ایسا نہیں ہے۔

۲۲ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة الاستنجاء بالاحجار

﴿۲﴾ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ نَهَانَا يَعْزِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بُولٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِينِ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقْلٍ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ بِعَظْمٍ - (رواه مسلم) ۱

ترجمہ: اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے اس سے کہ ہم پاخانہ یا پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں اور اس سے کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجا کریں اور اس سے کہ ہم تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں اور اس سے کہ ہم گوبر یا ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

توضیح: ان نستقبل القبلة: اس حدیث میں تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور تینوں میں الگ الگ حقوق کا ذکر ہے اس پہلے جملے میں استقبال قبلہ کا مسئلہ ہے اس کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے اس جملہ میں حق اللہ کا بیان آ گیا۔

ان نستنجی بالیمن: یعنی ہمیں حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ ہم دائیں ہاتھ سے استنجا کریں اس جملہ میں حق العبد کا بیان آ گیا اور اس میں دوسرے اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو استنجا میں استعمال نہ کرو۔ اہل ظواہر اور بعض شوافع کے ہاں دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے سے طہارت ہی حاصل نہیں ہوگی لیکن جمہور امت کا مسلک یہ ہے کہ یہ ممانعت دائیں ہاتھ کی شرافت کی وجہ سے ہے ورنہ اصل مقصود تو صفائی حاصل کرنی ہے اور وہ دائیں یا بائیں ہر ایک ہاتھ سے حاصل ہو جاتی ہے شریعت نے دائیں ہاتھ کو اچھے کاموں اور بائیں کو ناپسندیدہ اور مکروہ کاموں کے لئے مقرر فرمایا ہے تو استنجا بھی مکروہ کام ہے جو بائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے تاکہ کھانا کھاتے وقت انسان کو گھن نہ آئے کہ ابھی ابھی اس دائیں ہاتھ کو پاخانہ میں آلودہ کیا تھا اور اب اس کو لقمہ کے ساتھ منہ میں داخل کر رہا ہے بہر حال اصل صفائی تو کسی بھی ہاتھ سے ہو جاتی ہے دائیں کو استنجا سے بچانا اس کی شرافت کی وجہ سے ہے۔

ان نستنجی بأقل من ثلاثة أحجار: اس جملہ میں حق النفس کا بیان آ گیا اور اس میں تیسرے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا عنوان استنجا بالاحجار ہے اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

یہاں تین چیزیں قابل لحاظ ہیں: ① انشاء محل یعنی محل کو صاف کرنا ② تعلیث یعنی تین کے عدد کا لحاظ رکھنا۔ ③ ایثار یعنی طاق عدد کی رعایت کرنا اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تینوں کی رعایت کرنی چاہیے مگر اختلاف اس میں ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے۔

تو امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک تثلیث بھی واجب ہے ایثار بھی واجب ہے اور انشاء یعنی صفائی حاصل کرنا بھی واجب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تعدیہ یعنی صفائی واجب ہے اور تثلیث و ایثار مستحب ہے۔

ثمرۂ اختلاف:

اختلاف کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی نے دو دھیلوں سے انشاء کر لیا اب تیسرا ڈھیلا استعمال کرنا واجب ہے یا نہیں تو شوافع اور حنابلہ کے ہاں واجب ہے تا کہ تثلیث حاصل ہو جائے اور مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں واجب نہیں ہے۔ اور اگر چار دھیلوں سے تعدیہ آگیا تو شوافع اور حنابلہ کے ہاں ایثار کے حصول کے لئے پانچواں استعمال کرنا واجب ہے۔ جبکہ مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں واجب نہیں ہے۔

دلائل:

شوافع اور حنابلہ کی پہلی دلیل زیر بحث سلمان فارسی رحمہ اللہ کی حدیث ہے جس میں تین پتھروں سے نم پر انشاء کرنے کو منع کیا گیا ہے، ان کی دوسری دلیل مشکوٰۃ کے اسی صفحہ ۳۲ پر ابو ہریرہ رحمہ اللہ کی روایت ہے "من استجمر فلیوتر" اس میں ایثار کا ذکر ہے پھر اسی صفحہ پر حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ ہی کی روایت ان حضرات کی تیسری دلیل ہے جس میں "وامر بثلاثة احمار" کے الفاظ آئے ہیں، ان حضرات کی چوتھی دلیل مشکوٰۃ صفحہ ۴۴ پر سلمان فارسی رحمہ اللہ کی روایت ہے جس میں "ولا تکتفی بدون ثلاثة احمار" کے الفاظ آئے ہیں۔

ائمہ احناف اور مالکیہ نے حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو مشکوٰۃ کے صفحہ ۴۳ میں مذکور ہے جس میں "من فعل فقلد احسن ومن لا فلا حرج" کے الفاظ آئے ہیں جس سے اباحت اور استحباب معلوم ہوتا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جو مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۲ پر ہے جس میں "فانہا تمزج عنہ" کے الفاظ آئے ہیں جس سے احناف اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے تجویز فرمایا ہے یعنی یہ تین پتھر کفایت کرتے ہیں یعنی تعدیہ کے لئے کافی ہیں یہاں اصل مقصود انشاء کو بیان کیا ہے عدد اور ایثار

و تثلیث کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا اس طرز پر یہ حدیث ہماری دلیل بنے گی ورنہ بظاہر یہ شوافع کی دلیل ہے۔

چکناہٹ: شوافع حضرات نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ تین پتھروں کے ثبوت پر دال اور تین سے کم کی نہی اور ممانعت پر دال ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تین اور طاق ہمارے نزدیک بھی مستحب ہے تو ان احادیث کو استحباب پر حمل کریں گے تاکہ تمام احادیث میں تطبیق آجائے اور تعارض ختم ہو جائے اور تین سے کم پتھروں کے استعمال کو مکروہ تنزیہی سمجھیں گے تو تعارض ختم ہو جائے گا۔

الزامی جواب:

اصل مقصود تنقیہ اور صفائی ہے طاق ہونا یا تین ہونا کوئی مقصود نہیں ہے اگر تثلیث دایتار و جوبی طور پر مقصود ہوتا تو پھر شوافع کے ہاں ایک ایسے پتھر کو جس کے تین کونے ہوں اور ہر کونہ الگ الگ استعمال کیا اور تنقیہ حاصل ہو گیا تو ان کے نزدیک یہ جائز کیوں ہے حالانکہ نہ اس میں تثلیث ہے نہ دایتار ہے معلوم ہوا یہ چیزیں ضروری نہیں صرف مستحب ہیں۔

رجیع: گوہر کو کہتے ہیں "رجیع" فعیل کے وزن پر اسم مفعول "مرجوع" کے معنی میں ہے اردو میں اس کے معنی لوٹنے اور لوٹانے جانے کے ہیں اور گوہر اور غلاخت بھی طہارت سے نجاست کی طرف لوٹ کر آئے ہیں گوہر سے استنجاء اس لئے ناجائز ہے کہ یہ موجب تلویث ہے۔ اور جنات کی خوراک بھی ہے۔

بعظم: ہڈی کو عظم کہتے ہیں ہڈی سے استنجاء جائز نہیں یا تو اس لئے کہ چکناہٹ اور گوشت کی بوٹی لگی ہوئی ہڈی سے صفائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اور اگر خشک پرانی ہڈی ہے تو ملامت کی وجہ سے یعنی کھردرانہ ہونے کی وجہ سے صفائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اور یا نوکلی ہڈی کی وجہ سے زخم لگنے کا خطرہ ہے لیکن حدیث شریف میں ممانعت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ جنات کی خوراک ہے اور یہی واضح تر ہے استنجاء میں استعمال ہونے والی چیزوں اور استعمال نہ ہونے والی چیزوں کے لئے قاعدہ اور ضابطہ اس عربی عبارت میں فرمایا: "کل شیء طاهر قالع للنجاسة غیر محترم" آگے اس کی تفصیل (ص ۵۳۹، ۵۴۳) آنے والی ہے۔

بیت الخلاء جانے کی دعا

﴿۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخَبِيثِ وَالْخَبَائِثِ. (متفق عليه)

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب پاخانہ میں داخل ہوتے (یعنی داخل ہونے کا ارادہ کرتے) تو یہ دعا پڑھتے "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں ناپاک جنوں اور بیبیوں (یعنی تراور مادہ دونوں) سے"۔ (بخاری و مسلم)

النبی ﷺ بقدرین جدیدین اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمان تھے بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے پوچھا آج تم نے یہاں کس کو دفن کیا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمان تھے بعض روایات میں حصر ہے کہ وما یعذبہا الا فی الغیبة والبول معلوم ہوا کہ کفر کی وجہ سے عذاب نہیں تھا بلکہ یہ مسلمان تھے کفر کے علاوہ دو گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا تھا۔

وما یعذبہا فی کبیر: یعنی ان دونوں کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا ہے۔
 یٰقِیْلَان: اب یہاں یہ اعتراض آتا ہے کہ پیشاب سے نہ بچنا اور چغلی کھانا تو کبیرہ ہیں یہاں نفی کیسے کی گئی؟ نیز بعض روایات میں پہلی انہ لکبیر کے الفاظ آئے ہیں تو یہاں کیسے کبیرہ کی نفی کی گئی ہے؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کبیر شاق کے معنی میں ہے جیسے قرآن میں ہے: "وانہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین" وہاں کبیرہ سے شاق اور گراں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ گناہ اگرچہ دوسرے بڑے گناہوں کی نسبت ان جیسے بڑے نہیں ہیں مگر فی نفسہ بڑے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے نزدیک تو یہ کام اور یہ گناہ اتنا بڑا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہے خاص کر جب اس پر مداومت ہو جائے۔

اب یہ شبہ ہے کہ ان گناہوں کا قبر کے عذاب سے کیا تعلق ہے کہ قبر ہی کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔
 تو اس کا جواب یہ ہے کہ بول سے نہ بچنا نماز کو خراب کرتا ہے کیونکہ ظاہری طہارت جب نہ ہو تو نماز نہیں ہوگی اور نماز کا حساب کتاب قیامت میں سب سے پہلے ہوگا اور قبر آخرت کا پیش خیمہ اور پہلی منزل ہے تو قبر ہی سے عذاب شروع ہو گیا اسی طرح چغلی سے بچنا باطنی طہارت ہے جب طہارت ضائع ہوگئی تو قبر سے عذاب شروع ہو گیا۔ یا یوں سمجھو کہ چغلی سے فساد اٹھتا ہے جس سے قتل و قتال واقع ہو جاتا ہے اور قیامت میں سب سے پہلے حقوق العباد میں ناحق خون کا حساب ہوگا اور قبر آخرت کی پہلی منزل ہے تو یہیں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حساب شروع ہو گیا۔

ثم اخذ جریدۃ طیبۃ: قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کھجور کی شاخ کو دو ٹکڑے کر کے آنحضرت ﷺ نے جو ایک ایک قبر پر گاڑ دیا تھا یہ شفاعت پیغمبری کے قبیل سے ایک عمل تھا کہ جب تک شاخ ہری رہے گی میری شفاعت رہے گی تو عذاب نہیں ہوگا تو یہ خصوصیت پیغمبری ہوگئی اور مسلم شریف کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ شفاعت تھی تو کسی اور کو اختیار نہیں کہ یہ عمل کرے۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاخوں کا یہ گاڑنا ایک سبب پر محمول ہے اور اس کی ایک علت تھی اللہ ایہ خصوصیت پیغمبری نہیں تھی بعض علماء نے لکھا ہے کہ تر شاخ خشک ہونے تک تسبیح پڑھتی ہے جس کا اثر صاحب قبر کے عذاب پر ہوتا ہے اور تخفیف آتی ہے۔

نیز بریدہ بن الحصب رحمہ اللہ نے تر شاخ اپنی قبر پر گاڑنے کی وصیت کی تھی اللہ ایہ ایک سبب پر محمول ہے۔ یہ تو ایک علمی بحث

نہیں ہے نیز اس سے وہ راستہ مراد ہے جو عام ہو کسی کے ملکوت راستہ میں بغیر اجازت قضاء حاجت حرام ہے۔ لے
 او فی ظلمہ: یہاں اوتلوخ کے لئے ہے اور ظل مستظل کے معنی میں ہے یعنی سایہ دار درخت کے نیچے جہاں
 لوگ سایہ حاصل کرتے ہیں قضاء حاجت کرنا باعث لعنت ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اس حرکت کرنے والے کو گالی دیتا
 ہے یا اس پر لعنت بھیجتا ہے تو یہ شخص اس کا مستحق ہے۔ سایہ دار درخت کے علاوہ پھل دار درخت کا بھی یہی حکم ہے۔ نیز
 اس سے وہ مقامات بھی مراد ہیں جہاں لوگ دھوپ لینے کے لئے سردیوں میں بیٹھتے ہیں یا عام مجلس جماعے کے لئے
 بیٹھتے ہوں نیز پانی کے گھاٹ اور پارک وغیرہ پبلک مقامات سب مراد ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس میں وہ بیت
 الخلاء بھی آتا ہے جس میں فلش سسٹم نہ ہو اور پاخانہ اس میں پڑا رہتا ہو جس سے دوسروں کو ایذا پہنچتی ہو۔ ہاں جب
 مجبوری ہو تو پھر اس میں تخفیف بوجہ مجبوری ہوگی۔ لے

دائیں ہاتھ سے ذکر کو چھونا منع ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ
 فِي الْإِثْلَةِ وَإِذَا أَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمْسُ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَلَا يَتَمَسَّحُ بِيَمِينِهِ۔ (مشفق علیہ) ۳

ترجمہ: اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تم میں سے کوئی شخص پانی
 پیئے تو (پانی پینے کے) برتن میں سانس نہ لے اور جب پاخانہ میں جائے تو داہنے ہاتھ سے عضو مخصوص کو نہ چھوئے اور نہ داہنے ہاتھ
 سے استنجاء کرے۔“ (بخاری و مسلم)

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْزِلْ وَمَنْ
 اسْتَجَمَرَ فَلْيُؤَوِّزْ۔ (مشفق علیہ) ۳

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص وضو کرے تو اسے
 چاہیے کہ وہ ناک کو بھی جھاڑ دے اور جو شخص (پاخانہ کے بعد ڈھیلے سے) استنجا کرے اسے چاہیے کہ طاق ڈھیلے لے“ (یعنی تین،
 پانچ، یا سات)۔ (بخاری و مسلم)

﴿۸﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَأَحْمِلُ أَنَا وَعُلَمَاؤُنَا وَمِنْ
 مَاءٍ وَعَلَقَةٌ يَسْتَنْجِي بِالنَّاءِ۔ (مشفق علیہ) ۵

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب پاخانہ کے لئے تشریف لے جاتے تو میں اور

ایک لڑکا (یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ) پانی کی چھاگل اور ایک برہمی لیے آپ ﷺ (وحیلوں سے صفائی کے بعد) پانی سے استنجاء کرتے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: غلام: اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ ۱۔

اداوۃ: چڑے کے لونے کو کہتے ہیں جس کو چھاگل کہتے ہیں یعنی چڑے کا بنا ہوا برتن۔ ۲۔

علوۃ: یہ اس برہمی کو کہتے ہیں جو لٹھی سے کچھ بڑی اور نیزے سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کو کسی ضرورت کے لئے یا بوقت نماز سترہ کے لئے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ ۳۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے بھی پانی استعمال کیا ہے اور بھی صرف ڈھیلا استعمال فرمایا ہے اور بھی دونوں کو استعمال کیا ہے یہاں پانی کی وضاحت ہے باقی جائز سب ہے۔ البتہ جمع بین الماء والحجر افضل ہے پھر پانی کا استعمال افضل ہے اور آخر میں صرف ڈھیلا ہے۔ جو لوگ صرف پانی سے استنجاء کو ناجائز کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

الفصل الثانی

قابل احترام چیز کو بیت الخلاء نہ لے جاؤ

﴿۹﴾ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهُ (رواہ ابو داؤد والنسائی والترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب وقال ابو داؤد هذا حديث مذكور في روايته وضعه بتدليس) ۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو اپنی انگلی اتار لیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے نیز ان کی روایت لفظ نزع کے بجائے لفظ وضع ہے۔

توضیح: نزع خاتمہ: بعض روایت میں "وضع خاتمہ" کے الفاظ آئے ہیں اس میں کوئی فرق نہیں ہے آنحضرت ﷺ کی انگلی میں "محمد رسول اللہ" کی عبارت اس طرز پر کھدی ہوئی تھی کہ اوپر والی سطر میں لفظ اللہ تھا پھر لفظ رسول تھا اور سب سے نیچے لفظ محمد تھا، اس لئے آپ اسے قضاء حاجت کے وقت اتارتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز جس پر آیت لکھی ہو یا کسی رسول یا فرشتے کا نام ہو یا قرآن یا اللہ کے ناموں میں کوئی نام ہو اسے بیت الخلاء میں لے جانا مکروہ ہے ہاں اگر تعویذ کی شکل میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہو تو اس کا حکم الگ ہے۔ ابوداؤد نے اس حدیث کو منکر کہا ہے مگر علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل کے لئے صحیح ہے۔ ۲۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ الْبِرَارَ انْطَلَقَ حَتَّى لَا يَرَاهُ أَحَدٌ (رواہ ابو داؤد)

۱۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱ ۲۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱ ۳۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱

۴۔ المرقاۃ ۲/۱۱۲ ۵۔ المرقاۃ ۲/۱۱۲ ۶۔ المرقاۃ ۲/۱۱۲

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب پاخانہ کے لئے (جنگل میں) جانے کا ارادہ کرتے تو (اتنی دور) تشریف لے جاتے کہ آپ ﷺ کو کوئی نہ دیکھتا۔ (ابوداؤد)

توضیح: البزاز: یہ لفظ با کے فتح کے ساتھ ہے کھلی فضا میں نکلنے کے معنی میں ہے۔ یہ قضاء حاجت سے کنایہ ہے پاخانہ کا لفظ چونکہ غیر پسندیدہ ہے لہذا ہر زبان میں اس کو لوگ بطور کنایہ استعمال کرتے ہیں بلکہ قضاء حاجت کی وجہ سے اس جگہ کا نام بھی بوجہ کراہت بدلتا رہتا ہے مثلاً پہلے اس کا نام نئی خانہ تھا وہ مکروہ ہوا تو بیت الخلاء ہو گیا پھر طہارت خانہ پھر سندا اس ہو گیا پھر باتھ روم ہو گیا اب لٹرین چل رہا ہے۔ براز کو با کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا بعض نے غلط قرار دیا ہے کہ وہ لڑائی کے معنی میں ہے مگر وہ بھی صحیح ہے ہاں فتح زیادہ بہتر ہے۔ قضاء حاجت کے لئے دور جانا آنحضرت ﷺ کی حیا اور کریمانہ اخلاق کا حصہ تھا جبکہ بیت الخلاء گھر میں نہ تھا۔ ۱۔

نرم جگہ میں پیشاب کرنا چاہیے

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَرَادَ أَنْ يَبُولَ فَأَلَى دِمْنًا فِي أَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ إِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَبُولَ فَلْيَبْتَئِدْ بِبَوْلِهِ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ ۵)

ترجمہ: اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھا آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کا ارادہ فرمایا چنانچہ آپ ﷺ ایک دیوار کی جڑ میں (یعنی اس کے قریب) نرم زمین پر پہنچے اور پیشاب کیا پھر (پیشاب سے فراغت کے بعد) آپ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ پیشاب کے لئے نرم زمین تلاش کرے۔“ (تاکہ چھینٹیں نہ پڑیں)۔ (ابوداؤد)

توضیح: دمنّا: دال کے فتح اور میم کے کسرہ کے ساتھ صحیح سے نرم مکان اور نرم زمین کو کہتے ہیں یہ لفظ صفت ہے اور اس کا موصوف ”مکانا“ ہے۔ ۵۔ فلیبتدئ: یہ ارتدادیو قتاد سے طلب کرنے کے معنی میں ہے نرم جگہ تلاش کرنا اس لئے تھا کہ چھینٹیں جسم پر نہ پڑ جائیں یا اونچائی سے پیشاب پاؤں کی طرف نہ آئے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ لالٹھی سے سخت زمین کو کرید کر نرم فرماتے اور پھر پیشاب کرتے تھے یہاں یہ شبہ ہے کہ دوسرے کی دیوار کے پاس پیشاب کرنا جائز نہیں اس سے دیوار کی جڑ اور بنیاد خراب ہو جاتی ہے آپ نے کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عام جگہ تھی سب لوگ یہاں پیشاب کرتے تھے یا شاید دیوار سے یہ جگہ فاصلہ پر تھی یا یہ جواب ہے کہ آپ ﷺ نے فاصلہ پر پیشاب کیا۔ ۵۔

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَةَ لَمْ يَفْعَ ثَوْبَهُ حَتَّى يَدْنُو مِنَ الْأَرْضِ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَالْإِسْنَانِيُّ وَالْأَوْثَانِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ ۵)

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب استنجاء کا ارادہ فرماتے تو جب تک (یعنی کے لئے) زمین سے قریب نہ ہو جاتے پھر اٹھاتے تھے۔ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

(۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَكَلْتُكُمْ مِقْلَ الْوَالِدِ لَوْلِيهِ أَعْلَمُكُمْ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِظَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْغَيْلَةَ وَلَا تَسْتَنْدِرُوهَا وَأَمْرٌ بِغَلَاظَةِ أَتْحَارٍ وَتَهْلِي عَنِ الرُّوثِ وَالزَّمَوَةِ وَتَهْلِي أَنْ يَسْتَطِيبَ الرَّجُلُ يَسْمِينِيهِ. (رواه ابن ماجه والدارمي)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (تعلیم و نصیحت کے سلسلہ میں) ”میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے باپ بیٹے کے لئے ہوتا ہے چنانچہ میں سکھاتا ہوں کہ جب تم پاخانہ میں جاؤ تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ پشت کرو۔ اور آپ ﷺ نے (پاخانہ کے بعد) تین دھیلوں سے استنجاء کرنے کا حکم دیا اور لید (یعنی تمام نجاستوں) اور ہڈی سے استنجاء کرنے کو منع فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص دائیں ہاتھ سے استنجاء کرے۔

(ابن ماجہ، دارمی)

دایاں ہاتھ پاخانہ کے لئے نہیں کھانے کے لئے ہے

(۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ يَدُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيُمْنَى لَطُفُورًا وَطَعَامِهِ وَكَانَتْ يَدُ الْيُسْرَى بَحْلًا لَوْ وَمَا كَانَ مِنْ أَدَى. (رواه ابو داؤد)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ کبریٰ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا دایاں دست مبارک وضو کرنے اور کھانے کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء اور ہر کردہ کام کے استعمال کے لئے تھا۔ (ابوداؤد)

توضیح: الیمنی لطفورہ: اسلام ایک جامع مذہب ہے اور یہ کامل مکمل بلکہ اکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے ہر قسم کے مسائل کا حل موجود ہے اسی سلسلہ میں متعدد احادیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کے دائیں اور بائیں ہاتھ کے الگ الگ فرائض ہیں چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا دایاں ہاتھ کھانے پینے اور ہر اچھے اور مبارک کام کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء اور ہر اس کام کے لئے تھا جو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔

شریعت مطہرہ نے انسانی طبیعت کے ساتھ مماشات کی ہے کیونکہ طبعاً انسان کھانے اور پاخانے میں فرق کرنا چاہتا ہے اور کوئی انسانی طبیعت یہ نہیں چاہتی کہ ابھی جس ہاتھ کو پاخانہ میں آلودہ کیا تھا اسے اب منہ میں ڈال کر اپنے کھانے کی لذت کو تباہ کر دے اسی وجہ سے بائیں ہاتھ کو ناپسندیدگی کی وجہ سے شیطان کا ہاتھ کہا گیا ہے یعنی شیطان کے پسندیدہ کاموں میں یہ ہاتھ استعمال ہوتا ہے اب پیشاب، پاخانہ، ناک کی صفائی اور کسی گندی چیز کو اٹھانے میں

ہائیں ہاتھ کو استعمال کیا جائے گا اور دایاں ہاتھ دیگر اچھے کاموں کے لئے ہے تاکہ بر عضو کے لئے الگ الگ تقسیم کار ہو۔ اب جن لوگوں کی طبیعت شیطانی ہوگئی ہے وہ ہائیں ہاتھ کو پسند کرتے ہیں اور کھانے پینے اور پاخانے میں اس کو برابر استعمال کرتے ہیں وہ گندے اور اچھے کاموں میں دائیں ہائیں کا فرق نہیں کرتے ہیں شریعت نے انسانی شرافت کا بہت بڑا خیال رکھا ہے رحمان کا سارا نظام طہارت کا ہے اور رحمان اسی کا حکم دیتا ہے اور شیطان کا سارا نظام نجاست کا ہے اور وہ خبیث اسی کا حکم دیتا ہے۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا ذَهَبَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْغَائِطِ فَلْيَنْهَبْ مَعَهُ بَشَلًا لَّئِيْهِ لَا يَسْتَطِيعُ مِنْهَا تَجَرُّعُ عَنَتِهِ. (رواه أبو داود والنسائي والترمذي)۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جب تم میں سے کوئی شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ساتھ تین پتھر (یا ڈھیلے) لے جائے جو کافی ہوں گے“ (یعنی پانی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی)۔ (امام ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

کن چیزوں سے استنجا جائز اور کن سے ناجائز ہے

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْتَنْجُوا بِالرُّوْثِ وَلَا بِالْعِظَامِ فَإِنَّهُ إِذَا اخْوَايَكُمُ مِنَ الْحَجَنِ. (رواه الترمذي والنسائي)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم لوگ لید اور ہڈی سے استنجا نہ کرو کیونکہ (ہڈی) تمہارے بھائیوں، جنات کی غذا ہے“ (ترمذی، نسائی) مگر نسائی نے ”زاد اخوانکم من الحجن“ کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔

توضیح: روٹ اور رجمیع گوبر کے معنی میں ہے مگر روٹ لید یعنی گھوڑوں کے فضلات کو کہتے ہیں اور رجمیع گوبر بھیڑیہ گوبروں اور اونٹوں کے فضلات کو کہتے ہیں اور سر قین بھینس گائے وغیرہ کے فضلات کو کہتے ہیں۔ رجمیع کی تشریح گزر چکی ہے یہ عام ہے۔

لید سے استنجا کی ممانعت کی ایک وجہ تو حدیث میں آئی ہے کہ تمہارے بھائیوں جنات کی خوراک ہے اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ گوبر کے اندر جو دانے ملتے ہیں اسی کو جنات کھاتے ہیں یا بعض احادیث میں آیا ہے کہ گوبر جنات کے جانوروں کا چارہ اور گھاس ہے تو یہاں جنات کی طرف نسبت ادنیٰ ملا بہت کی وجہ سے ہے یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب جنات اور انسانوں کی شریعت ایک ہے تو پھر جنات کے لئے گوبر کیسے جائز ہوا جو حرام چیز ہے اس کے دو جواب تو اوپر گزر گئے۔

تیسرا جواب یہ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ گوبر اٹھاتے ہی ان کے لئے بھجور میں بندیل ہو جاتی ہے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ ایک ہی شریعت میں مختلف اصناف کے لوگوں کے حق میں حکم بدل جاتا ہے۔ بن طرح مردوں کے لئے ریشم کا لباس حرام ہے اور عورتوں کے لئے جائز ہے تو اسی طرح جنات کے لئے گوبر جائز ہے۔ انسانوں کے لئے حرام ہے۔
 فائدہ: اس ضمیر کے مرجع میں کلام ہے کہ ضمیر مفرد کیوں ہے حالانکہ سابق دو چیزیں ہیں اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ضمیر عظام کی طرف راجع ہے اور عظام اگر جمع ہے لیکن طعام کے معنی میں ہے تو ضمیر لونا نا صحیح ہے۔ یہ ہے کہ ہر ایک کے اعتبار سے ضمیر لونا ٹائی گئی ہے یعنی ہر ایک مذکور کا یہ حکم ہے۔ یہ ہے کہ مرقات میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے جس نسخہ کو نقل کیا ہے اس میں ”انہا“ کی ضمیر مؤنث ہے۔ لے

ولا بالاعظام: ہڈی سے استخوان کی ممانعت کی وجوہات اور شرح اس باب کی حدیث نمبر ۲ میں گزر چکی ہے یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جنات کے لئے ان ہڈیوں پر نیا گوشت پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کھاتے ہیں اور بعض روایات میں صرف سو گھنے کا ذکر آیا ہے۔ سوات کے میرے محترم استاد مولانا فضل محمد رحمہ اللہ نے درس مشکوٰۃ کے وقت فرمایا کہ میں نے ایک جنی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ہم صرف سو گھ کر سیر ہو جاتے ہیں نیا گوشت نہیں آتا ہے۔ لے
 بعض روایات میں کوئلہ کی بھی ممانعت آئی ہے جیسا کہ اس باب کی آخری حدیث نمبر ۳۹ میں ہے۔ اس میں کوئلہ کو جنات کا رزق بتایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں جیسے کھانے پکانے میں آگ جلانے اور روشنی کرنے میں استعمال کرتے ہیں تو ”رزقا“ بمعنی انتفاع ہے۔ جنات بھی عجیب مخلوق ہیں۔

قاعدہ:

ایک جامع قاعدہ کو سمجھ لیا جائے کہ استخوان کن کن اشیاء سے جائز ہے تو فرمایا:

یحوز الاستنجاء بكل جامد طاهر منق قالع للنجاسة غیر مودلیس ہڈی حرمة ولا شرف ولا يتعلق بہ حتی الغیر۔ (شرح نقایہ ملاحل قاری رحمہ اللہ ج ۱ ص ۴۰)

اس عبارت میں لیس ہڈی حرمة کی قید سے وہ کپڑا خارج ہو گیا جو کسی کے کام میں آسکتا ہو اسی طرح روٹی بھی نکل گئی اسی طرح کئی کے بچنے کا دانوں سے خالی حصہ بھی نکل گیا جس سے عموماً عورتیں بچوں کے پاخانہ کو صاف کرتی ہیں نیز اس سے وہ سارے کاغذات بھی نکل گئے جو کسی طور پر قابل احترام ہوں ہاں جو کاغذ اسی صفائی کے لئے بنایا گیا ہو جیسے نوائلٹ پیپر وغیرہ تو وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

داڑھی میں گرہ باندھنا منع ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ قَابِطٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا رُوَيْفِعُ لَعَلَّ الْحَيَاةَ سَتَكُونُ بِكَ بَعْدِي فَأُخْبِرِ النَّاسَ أَنَّ مَنْ عَقَدَ لِحْيَتَهُ أَوْ ثَقَلَ وَثَرًا أَوْ اسْتَنْجَى بِرَجْمٍ ذَابَّةٍ أَوْ عَظِيمٍ فَإِنَّهُ مُمَكَّدًا مِنْهُ بَرَجٌ. (رواه أبو داود)۔

ترجمہ: اور حضرت روئیف بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے روئیف! شاید میرے بعد تیری زندگی دراز ہو لہذا تم لوگوں کو خبردار کرنا کہ جس شخص نے اپنی داڑھی میں گرہ لگائی یا (گلے) میں تانت کا ہار ڈالا یا جانور کی نجاست (لید اور گوبر وغیرہ) اور ہڈی سے استنجاء کیا تو محمد ﷺ اس سے بیزار ہیں۔" (ابوداؤد)

توضیح: من عقد لحيته: جاہلیت میں کفار کی عادت تھی کہ جو شخص شادی کرتا تو وہ داڑھی میں ایک گرہ لگاتا تھا۔ دوسری شادی پر دوسری گرہ باندھتا تھا اس سے منع کیا گیا ہے کہ یہ جاہلیت کی ایک یہودہ رسم ہے اور ان سے مشابہت ہے یا جاہلیت میں لوگ داڑھی سمیٹ کر ٹھوڑی کے نیچے مردز کر دیتے تھے اس سے روکا گیا کیونکہ داڑھی میں سنتِ طریقہ اس کا کھلا چھوڑنا ہے چنانچہ آجکل مسلمانوں اور سکھوں کی داڑھی میں یہی فرق ہے اور اس لحاظ میں اس حکم کی ایک عالمی حیثیت بن جاتی ہے اور مسلمان کا تعارف مسنون داڑھی سے ہو جاتا ہے۔

عقد و ثرا: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ دفعِ نظر اور دفعِ آفات کے لئے گلے میں زورے ڈالتے تھے اور تعویذ اور گندے بنا کر ٹھوڑوں اور بچوں کے گلے میں ڈال دیا کرتے تھے اس سے منع کیا گیا اس لئے کہ اس میں ضعف عقیدہ اور شرک کا قوی امکان تھا اور اہل شرک سے مشابہت بھی تھی۔ بعض علماء نے وتر سے کمان کے وہ چلے مراد لئے ہیں جو تسموں کے بنے ہوئے ہوتے تھے اس کو ٹھوڑوں کے گلوں میں دفعِ آفات کے لئے ڈالتے تھے اس میں خالص شرک تھا تو منع کیا گیا۔

برجی: یعنی اس شخص۔ نبی اکرم ﷺ اور شریعت کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان سے بیزار ہیں اگر وہ اس کو جائزِ حلال سمجھتا ہے تو کافر ہو گیا ورنہ صرف اس ایک عمل میں آنحضرت ﷺ ان سے بیزار ہیں پورے اسلام کی بیزاری مراد نہیں۔

استنجاء میں تین پتھر استعمال کرنا مستحب ہے

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اكْتَحَلَ فَلْيُؤَيِّرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَاحْرَجٍ وَمَنْ اسْتَجَبَرَ فَلْيُؤَيِّرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَاحْرَجٍ وَمَنْ أَكَلَ فَمَا تَحْلَلْ فَلْيَلْفِظْ وَمَا لَكَ بِلِسَايِهِ فَلْيَبْتَلِغْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَاحْرَجٍ وَمَنْ أَتَى

الْغَائِظُ فَلْيَسْتَبْزِ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ إِلَّا أَنْ يَجْمَعَ كَوَيْبًا مِنْ رَمْلِ فَلْيَسْتَنْدِيزْهُ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَلْعَبُ
تَحْتَا عِدْنِي أَدَمَ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَاحُ حَرْجٍ (رواہ ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ و الدارمی)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص سرمہ لگائے اسے چاہئے کہ طاق سلائیاں لگائے جس نے ایسا کیا (یعنی طاق سلائیاں لگائیں) اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو کچھ گناہ نہیں اور جو شخص استنجاء کرے اسے چاہئے کہ طاق ڈھیلے استعمال کرے (یعنی تین پانچ یا سات) جس نے ایسا کیا اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھ گناہ نہیں اور جو شخص کچھ کھائے تو جو چیز خلال کے ذریعہ سے نکلے تو اسے چاہئے کہ پیٹک دے اور جو چیز زبان سے نکلے تو اسے چاہئے کہ نگل لے جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھ گناہ نہیں۔ اور جو شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ پردہ کرے اگر کوئی چیز پردہ کی نہ ملے تو (کم سے کم) ریت کو جمع کر کے اس کا تودہ اپنے پیچھے کر لے اس لئے کہ شیطان بنی آدم (انسان) کے پاخانہ کے مقام سے کھلتا ہے جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کوئی گناہ نہیں۔“

(ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: من استجبر: استجرا را استنجاء بالجھر کے معنی میں ہے اور استجرا رری جمرات کے لئے بھی آتا ہے اور انگوٹھی میں عود ڈال کر خوشبو کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے یہاں استنجاء میں پتھر استعمال کرنا مراد ہے۔
تخلل: یعنی خلال کی لکڑی استعمال کرنے سے جو بوٹی نکل آئی ہے اس کو نہ کھائے۔
يلفظ: پھینکنے کے معنی میں ہے اور ”لاک“ یعنی زبان سے ہلا کر نکال لیا تو اسے کھائے کیونکہ پہلی صورت میں یہ بوٹی دانتوں کی آلودگی سے آلودہ ہو کر زبردستی سے باہر آتی ہے اور دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے تو آلودہ بوٹی کو نہ کھائے غیر آلودہ کو کھائے۔

کشیبا: ریت کا تودہ اور ٹیلہ مراد ہے تاکہ پردہ ہو سکے۔
يلعب: یعنی شیطان پاخانہ کرنے والے کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ دیکھو پیچھے سے وہ آدمی آگیا یہ آگیا اور غیر کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ دیکھو یہ کیسا نکا میٹھا ہے۔

غسل خانہ میں پیشاب کرنے کا حکم

﴿١٩﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُعْقِلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَوَلَّى أَحَدُكُمْ فِي مُسْتَحْبِهِ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ أَوْ يَتَوَضَّأُ فِيهِ فَإِنَّ عَامَّةَ الْوُضُوءِ مِنْهُ.

(رواہ ابو داؤد و الترمذی و النسائی و ابن ماجہ و الدارمی و الترمذی)

۱۔ اخرجه ابو داؤد ۲۵ و ابن ماجہ ۲۲۴ ۲۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱ ۳۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱

۴۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱ ۵۔ المرقاۃ ۲/۱۱۱ ۶۔ اخرجه ابو داؤد ۲۵ و الترمذی ۲۱

میں پیشاب نہ کرے جس میں پھر وہ نہائے یا وضو کرے (یعنی یہ عقل سے بعید ہے کہ آدمی نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور پھر وہیں نہائے یا وضو کرے) اس لئے کہ اس سے اکثر دوسرا پیدا ہوتے ہیں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) ترمذی اور نسائی نے "ثم يغتسل فيه او يتوضأ فيه" کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔

توضیح: فی مستحبہ: مستحب، حمید سے مشتق ہے جس کے معنی گرم پانی کے ہیں اور چونکہ غسل خانہ میں عموماً گرم پانی ہوتا ہے اس لئے اس کو مستحب کہا گیا پھر یہ اطلاق عام ہوا اور ہر قسم غسل خانہ پر بولا جانے لگا خواہ پانی گرم ہو یا ٹھنڈا ہو۔

فان عامۃ: عامۃ کسی چیز کے بڑے حصے یا پوری فی پر بولا جاتا ہے نحاۃ اس لفظ کو حال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اضافت کے ساتھ اس کے استعمال کو نہیں مانتے ہیں لیکن صاحب شریعت اصبیح العرب نے اس کو استعمال کیا ہے تو پھر نحاۃ کو بات کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح مقاصد کے خطبہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

الوسواس: قلبی وسوسہ اور حدیث النفس کو کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے الوسواس سے ایک قسم جنون مراد لیا ہے جس کو مایخولیا کہتے ہیں بعض نے اس سے نسیان مراد لیا ہے۔ حضرت شاہ انور شاہ کا شمیری رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ جنوں کی چھیر چھاڑ سے کیا ہے۔ غسل خانہ میں پیشاب سے متعلق فقہاء کے تین اقوال ہیں۔

① ابن سیرین رحمہ اللہ کے نزدیک غسل خانہ میں مطلقاً پیشاب کرنا جائز ہے۔

② اور بعض علماء کے نزدیک مطلقاً مکروہ ہے۔

③ جمہور کے نزدیک اس میں تفصیل ہے کہ اگر غسل خانہ میں منفلد ہو کہ فوراً پانی نکلا ہو اور زمین بھی چکی ہو تو اس میں پیشاب کرنا جائز ہے اور اگر زمین نرم اور چکی ہے اور پیشاب نکلنے کے لئے راستہ اور منفلد بھی نہیں تو اس میں پیشاب کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ جسم پر چھیننے لگنے کا خطرہ ہے۔ محاکمہ اور فیصلہ والی بات یہ ہے کہ جس صورت میں چھیننے پڑنے کا اندیشہ ہے وہاں پیشاب کرنا مکروہ تحریمی ہے اور جہاں اندیشہ نہیں وہاں مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ حدیث میں کسی تفصیل کے بغیر ممانعت آئی ہے تو کسی نہ کسی کراہت سے خارج نہیں کیونکہ یہ موجب نسیان ہے اور یہ تاثر بالخاصہ کہلاتا ہے کہ اس عمل کا اثر یہی ہے، اب اگر سب ظاہر ہو جائے آگ کا اثر جلاتا ہے تو اس سبب کی طرف نسبت کرنا جائز ہے اور اگر سبب خفی ہو تو اس کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں بلکہ شرک کا خطرہ ہے۔

ربنا اللہ لا شریک لہ: یہ جملہ مشکوٰۃ میں نہیں بلکہ ترمذی میں ہے اور یہ ابن سیرین رحمہ اللہ نے اس روایت کے سننے کے بعد ارشاد فرمایا مطلب یہ ہے کہ غسل خانہ میں پیشاب کرنے کو دوسرے پیدا کرنے کا حقیقی سبب قرار دینا شرک ہے اور

ہمارے رب کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اب اس کلام میں سورۃ حدیث سے معارضہ ہے مگر حقیقتاً معارضہ نہیں ہے کیونکہ وہ تو جائز ہی نہیں بلکہ صحابہ و تابعین نے تو سورۃ معارضہ کو بھی برداشت نہیں کیا اور ایسے شخص سے بایکٹ کیا ہے امام ابن سیرین رحمہ اللہ کو شاید حدیث نہیں پہنچی تھی اس لئے ایسا فرمایا، یا ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر بول فی البغسل کو مؤثر حقیقی سمجھ لیا تو یہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے۔

ثم یغتسل فیہ: اس حدیث میں یہ ثم استبعاد یہ ہے کہ عجیب بات ہے پہلے اس میں پیشاب کرتا ہے اور پھر اس میں وضو بھی بناتا ہے اور غسل بھی کرتا ہے جس طرح آیت: "ثم الذنن کفروا ہرہم یعدلون" میں ثم استبعاد اور تعجب کے مقام میں استعمال ہوا ہے۔ اویتوضا: یہاں اتوضیج کے لئے ہے۔

﴿۲۰﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سُرَّجٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُولُ أَحَدُكُمْ فِي بَحْرٍ. (رواه أبو داود والنسائي) ۱

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن سرجس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی شخص کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرے۔" (ابوداؤد نسائی)

توضیح: فی بحر: بحر پہلے جم اور بعد میں حا ہے سوراخ کو کہتے ہیں۔ سوراخ میں پیشاب کرنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ وہاں کئی خطرات ہیں مثلاً سانپ بچھو وغیرہ سوراخ سے نکل کر ذنگ بھی مار سکتے ہیں نیز ان سوراخوں میں اکثر جنات کے گھر ہوتے ہیں وہ پھر ایذا رسانی پر اتر آتے ہیں۔ جیسا حضرت سعد بن عبادہ رحمہ اللہ کو اسی طرح واقعہ میں جنات نے تیر مار کر شہید کر دیا اور پھر غائبانہ طور پر کہا: ۳۔

نحن قتلنا سيد الخزرج سعد بن عبادہ رمیناہ بسہم فلم نخطئ فؤادہ ۲

"ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا ہم نے انہیں ایسا خیر مارا جو سیدِ حادل میں جا کر ہوسٹ ہو گیا۔"

﴿۲۱﴾ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَتَقُولُوا الْمَلَائِكَةُ الْبَرَاءَةُ الْبَرَاءَةُ فِي الْمَوَارِدِ وَقَارِعَةِ الظَّرْنِيِّ وَالْقَلِّ. (رواه أبو داود وابن ماجه) ۵

ترجمہ: اور حضرت معاذ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم تین چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں: ① گھانوں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے ② راستہ کے درمیان اور ③ سایہ میں پیشاب و پاخانہ کرنے سے۔" (ابوداؤد ابن ماجہ)

۱۔ المرقات ۲/۴۰ ۲۔ الخرجہ ابوداؤد ۲۱ والنسائی ۷/۳۳

۳۔ المرقات ۲/۴۲ ۴۔ الخرجہ ابوداؤد ۲۱ وابن ماجہ ۲۲۸

قضائے حاجت کے وقت باتیں کرنا منع ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَخْرُجُ الرَّجُلَانِ يَضْرِبَانِ الْغَائِطَ كَاشِفَيْنِ عَنْ عَوْرَتَيْهِمَا يَتَحَدَّثَانِ فَإِنَّ اللَّهَ يَمُخِّطُ عَلَى ذَلِكَ. (رواه أحمد وأبو داود وابن ماجه)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”(ایک ساتھ) دو شخص پاخانہ کے لئے (اس طرح) نہ جائیں کہ دونوں اپنی شرمگاہ کھولے ہوئے ہوں اور باتیں کرتے ہوں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ غضب ناک ہو جاتا ہے۔“ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

توضیح: یضربان الغائط: یعنی پاخانہ کے لئے جارہے تھے تو یضربان ضرب سے چلنے کو کہتے ہیں ”ضرب فی الارض ای ذھب“ جب اس کے ساتھ الفاظ آگیا تو یہ یفعلان کے معنی میں ہو گیا یعنی یفعلان الغائط بعض علماء نے یضربان چلنے ہی کے معنی میں لے لیا ہے۔ لیکن الفاظ کو لفظ منصوب بزعم الخافض مانا ہے تو معنی یہ ہوا کہ دونوں ایک ساتھ پاخانہ کے لئے گئے اور شرمگاہیں کھول کر بیٹھ گئے۔

یتحدثان: اور باتیں کرنے لگے یہ موجب غضب الہی عمل ہے اس میں مرد بھی کسی زمانہ میں مبتلا تھے لیکن عورتیں تو آج کل دیہاتوں میں ایک ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کرتی ہیں اور اس سے نہیں شرماتی ہیں یہ بڑی بے حیائی ہے اور غضب الہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

بیت الخلاء میں جانے کی دعا

﴿۲۳﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ هَذِهِ الْخُشُوشُ مُخْتَصَرَةٌ فَإِذَا أَلَى أَحَدُكُمْ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخَبَائِثِ. (رواه أحمد وأبو داود وابن ماجه)۔

ترجمہ: اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”پاخانہ کی جگہیں شیطین اور جنات کے حاضر ہونے کی جگہیں ہیں اس لئے جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو اسے چاہیے کہ یہ دعا پڑھے۔“ اعوذ باللہ من الخبث والخبائث: یعنی میں ناپاک جنوں اور جنیوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔“ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

﴿۲۴﴾ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ رِضَى اللَّهِ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَيُؤْتَى مَا بَيْنَ أَعْيُنِ الْحَمِيقِ وَعَوْرَاتِ الْبَنِي أَدَمَ إِذَا دَخَلَ أَحَدُهُمُ الْخَلَاءَ أَنْ يَقُولَ بِسْمِ اللَّهِ.

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب واصله لا یس یقولی)۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص پاخانہ کی جگہ میں داخل ہو تو جن (شیطان) کی آنکھوں اور انسان کی شرمگاہ کے درمیان کا پردہ یہ ہے کہ بسم اللہ کہے اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند قوی نہیں ہے۔

بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ غُفْرَانِكَ

(رواہ الترمذی وابن ماجہ والنسائی)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب پاخانہ سے باہر تشریف لاتے تو فرماتے غفرانک یعنی اے اللہ میں تیری بخشش کا خواستگار ہوں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: غفرانک: یہ لفظ اغفر امر کے لئے مفعول مطلق ہے ای اغفر غفرانک اور صاحبِ کافہ نے کہا کہ ایسے مقامات میں فعل کا حذف کرنا واجب ہو جاتا ہے اب یہاں سوال یہ ہے کہ اس فعل کے بعد استغفار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا اس نے بیت الخلاء میں جا کر کوئی گناہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک آدمی بیت الخلاء میں رہتا ہے تو وہ شیطان کے پڑوس میں ہوتا ہے اور اندر ذکر کرنے سے محروم رہتا ہے اس کو تباہی پر استغفار کرتا ہے۔

یہ ہے کہ غذا کھا کر ہضم ہونے اور کھل کر پاخانہ آنے سے آدمی کو بہت راحت ملتی ہے اس کا بہت بڑا شکر ادا کرنا چاہیے اس بڑے شکر میں کو تباہی کی وجہ سے استغفار کر رہا ہے تاکہ کو تباہی کا اثر بھی زائل ہو جائے۔ یا بیت الخلاء میں قلبی ذکر جاری تھا اس میں غیر اختیاری بے ادبی پر استغفار کرتا ہے۔

﴿۲۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أُنِيَ الْخَلَاءَ أَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فِي ثَوْبٍ أَوْزُكُوَةً فَاسْتَنْفَسَ ثُمَّ مَسَحَ يَدَيْهِ عَلَى الْأَرْضِ ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِلَذَّةٍ آخَرَ فَنَوَّضًا

(رواہ ابو داؤد والنسائی)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے جاتے تو میں آپ کے لئے پیالہ یا ہڑے کی چھال میں پانی لاتا آپ اس سے استنجہ کرتے پھر ہاتھ کو زمین پر رگڑتے پھر اس کے بعد میں پانی کا دوسرا برتن لاتا اور آپ وضو فرماتے۔ (ابوداؤد، دارمی، نسائی)

توضیح: فی ثوب: یہ پتیل کے برتن اور لوٹے کو کہتے ہیں "او" یہ لفظ راوی کے شک کی بنیاد پر ہے کہ پانی کا وہ برتن پتیل کا تھا یا پتھر کا یا وہ ہڑے سے بنا ہوا برتن تھا جس کو چھال کہتے ہیں یہاں اونچل کے لئے بھی لیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ برتن کس نوع کا تھا۔

۱۔ مسح: یعنی بدبودور کرنے کے لئے استنجاء کے بعد آپ ﷺ از مین سے ہاتھ رگڑ لیا کرتے تھے یہ امت کی تعلیم کے لئے تھا۔ ورنہ آپ ﷺ کی قضاء حاجت میں بدبو نہ تھی۔ ۲۔ ہانپاں: آخر علماء نے لکھا ہے کہ استنجاء اور وضو کے لئے اگر الگ الگ دو برتن ہوں تو یہ بہتر اور مستحب ہے یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہ پہلے برتن میں پانی اتنا ہی ہوتا تھا جس سے صرف استنجاء ہو سکتا تھا اس لئے بعد میں وضو کیلئے نیا برتن لایا جاتا تھا۔ ۳۔

شرمگاہ پر چھینٹیں دینے کا مطلب

﴿۲۷﴾ وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَابَلَ تَوَضَّأَ وَنَضَحَ فَرْجَهُ.

(رواہ ابوداؤد والنسائی) ۴۔

ترجمہ: اور حکم بن سفیان سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب پیشاب کر چکے تو وضو فرماتے اور اپنی شرمگاہ پر چھینٹا دیتے۔ (ابوداؤد نسائی)

توضیح: ونضح فرجہ: انتضاح چھینٹیں دینے کے معنی میں ہے اس کا پہلا اور واضح مطلب یہ ہے کہ جب وضو کر لو تو سامنے کی طرف جواز پر یا شلوار ہے اس میں چھینٹیں مار دتا کہ بول کے قطرات کا دوسرا نہ آئے اور رفتہ رفتہ آدمی خشک اور دوسوا کی نہ بن جائے تو جب ان کو خشک آئے گا کہ یہ حزی پیشاب کے قطروں سے ہے تو وہ کہے گا کہ یہ تو چھینٹے ہیں جو میں نے ابھی دیے ہیں یہ انتضاح وضو سے فراغت کے بعد ہے آئندہ حدیثوں میں بھی یہ حکم مذکور ہے۔ صوفیاء کے ہاں اس کا نام بہل السراویل ہے اس عمل سے دوسرا ختم ہو جاتا ہے۔ بعض نے نضح سے شرمگاہ پر چھینٹے مارنے کا مطلب اخذ کیا ہے تاکہ اس سے بول کے قطرات دفع ہو جائے بہر حال جن لوگوں کو یقینی طور پر یہ قطرات آنے کی بیماری ہے وہ ایسا نہ کریں بلکہ قطرات کے بند ہونے کے یقین تک انتظار کرے۔ ۵۔

بیماری یا مجبوری کی وجہ سے برتن میں پیشاب کرنا

﴿۲۸﴾ وَعَنِ أُمِّمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ قَالَتْ كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ قَدَحٌ مِنْ عَيْدَانٍ تَحْتَ سِرِّيهِ يَبُولُ فِيهِ

بِاللَّيْلِ. (رواہ ابوداؤد والنسائی) ۵۔

ترجمہ: اور حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس لکڑی کا ایک پیالہ تھا جو آپ کی چار پائی کے نیچے رکھا رہتا تھا آپ ﷺ ارات کو اس میں پیشاب کر لیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد نسائی)

۱۔ المرقاۃ ۲/۴۹ ۲۔ المرقاۃ ۲/۴۹ ۳۔ أخرجه ابوداؤد ۱۶۱ والنسائی ۱/۸۸

۴۔ المرقاۃ ۲/۴۹ ۵۔ أخرجه ابوداؤد ۲۴۵ والنسائی ۱/۸۸

توضیح: من عیدان: اس لفظ کو صاحب ازہار نے عود سے لیا ہے یعنی یہ پیالہ لکڑیوں میں سے کسی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عیدان عود کی جمع ہے اور عود سے مراد لکڑی ہے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لکڑی کے مختلف اجزاء کی وجہ سے جمع کا کلمہ لایا گیا ہے ان تمام صورتوں میں عیدان عین کے کسرہ کے ساتھ ہوگا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین نے جو بات لکھی ہے وہی صحیح ہے اور وہ یہ کہ عیدان عین کے فتح کے ساتھ ہے کسرہ نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ عیدان فتح کے ساتھ کھجور کے لیے درخت کو کہتے ہیں اس کا مفرد "عیدانہ" ہے اور اسی کی لکڑی سے یہ پیالہ بنایا گیا تھا۔

تحت سریر: اس جیسی احادیث پر بعض لوگ شک کرتے ہیں یا اس کو عجیب و غریب سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دنیا دشمن تھی آپ کے لئے رات کے وقت نکلنے میں جان کا کتنا خطرہ تھا اس وجہ سے اگر آپ نے پیشاب کا انتظام گھر کے اندر کر لیا تو اس میں کیا تعجب ہے کیا آج کل لوگ نہایت عالیشان کمرہ میں ہاتھ روم نہیں بناتے ہیں؟ جہاں پیشاب نہیں بلکہ پاخانہ کرتے ہیں۔ نیز رات کو نکلنے میں سردی کی کتنی تکلیف تھی نیز سانپ اور بچھو کے کاٹنے کا خوف کتنا یقینی تھا اور ہو سکتا ہے کہ یہ معاملہ بیماری کے زمانے کا ہو پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔ بہر حال ان وجوہات کی بنیاد پر آپ کے لئے چار پائی کے نیچے برتن رکھا جاتا تھا اور صبح اس پیشاب کو پھینکا جاتا تھا۔ صاحب مظاہر حق نے لکھا ہے کہ کسی نے غلطی سے ایک دفعہ یہ پیشاب پی لیا تھا تو ان کے بدن سے خوشبو مہک اٹھی۔ سریر کے لفظ سے ثابت ہو گیا کہ چار پائی پر سونا جائز ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار پائی استعمال فرمائی ہے اگرچہ یہ کبھی کبھی ہوا ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا حکم

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ رَأَى النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَأَنَا أَبُولُ قَائِمًا فَقَالَ يَا عُمَرُ لَا تَبُلُ قَائِمًا فَمَا بُلْتُ قَائِمًا بَعْدُ (رواہ الترمذی وابن ماجہ) قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ السُّنْدُوفِ رَحِمَهُ اللَّهُ قَدْ صَحَّ عَنْ حَدِيثِهِ قَالَ أَلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم سُبَا طَلَّةٌ قَوْمٌ قَبَالَ قَائِمًا (مشفق علیہ وویل لکل خلک بغلہ)۔

ترجمہ: اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک روز) مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا عمر کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو چنانچہ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا (ابن ماجہ، ترمذی) امام محمد بن النبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے کوزے کرکٹ کی جگہ پر گئے اور وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کیا (بخاری و مسلم) کہا جاتا ہے کہ آپ کا یہ فعل کھڑے ہو کر پیشاب کرنا کسی عذر کی بناء پر تھا۔

توضیح: یا عمر لا تبُل قَائِمًا: عرب بیٹھ کر پیشاب کرنے سے بچتے تھے اور اس کو عورتوں کا طرزِ عمل سمجھتے تھے

اور مردوں کی بلندی اور شہامت اس میں سمجھتے تھے کہ وہ کھڑے ہو کر پیشاب کریں اسی اصول کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھ کر منع فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر عمر بھر کبھی میں نے ایسا نہیں کیا اب فقہی مسئلہ یہ ہے کہ منفذ طور پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی ہے بعض علماء کے نزدیک یہ مکروہ تحریمی ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے ضابطہ اور قاعدہ یہی ہے ہاں اگر کہیں آنحضرت ﷺ سے کھڑے ہو کر پیشاب کا ذکر آیا ہے تو اس کو عذر پر حمل کیا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ سے جواز کا ایک قول منقول ہے اوپر جو مسئلہ بیان ہوا ہے یہ جمہور کا مسلک ہے حضرت شاہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اب شعائر کفار میں سے ہو گیا ہے لہذا حرام ہے مزید تفصیل ساتھ والی روایت میں ملاحظہ کریں۔

الفصل الثالث

بیٹھ کر پیشاب کرنا مسنون ہے

﴿۳۰﴾ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَوَلَّى قَائِمًا فَلَا تُصَلُّوهُ مَا كَانَ يَتَوَلَّى إِلَّا قَاعِدًا۔ (رواہ أحمد والترمذی والنسائی)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جو شخص یہ حدیث بیان کرے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اسے سچ نہ مانو آپ ﷺ نے ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کیا ہے۔ (احمد ترمذی، نسائی)

توضیح: فلا تصدقوہ: اس روایت میں اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی "سباطۃ قوم" والی روایت میں بظاہر تعارض ہے اس میں آنحضرت ﷺ سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا عمل منقول ہے اور یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بالکل نفی کرتی ہیں۔

اس کا جواب اور دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی معلومات اور گھر کے اعمال و عادات کے متعلق فرمایا ہے تو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت باہر کے ماحول سے متعلق ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے یا یوں کہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عام عادت کے متعلق فرمایا ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ایک نادر واقعہ سے متعلق ہے۔ اور نادر معدوم کے حکم میں ہوتا ہے یا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت استثنائی صورت پر محمول ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ہے تو کوئی تعارض نہیں ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں آنحضرت ﷺ کو کیا عذر تھا تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ بیان جواز کے لئے کیا اگرچہ کراہت تنزیہی ہو کیونکہ امت کی سہولت کے لئے کبھی کبھی آپ ﷺ نے کراہت تنزیہی والا کام کیا ہے تاکہ لوگ حرام نہ

بعض نے کہا کہ آپ کے گھٹنے میں تکلیف تھی بیٹنا مشکل تھا، بعض نے کہا کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی مجبوری تھی، بعض نے کہا کہ آپ کی کمر میں تکلیف تھی اور اس درد کا علاج کھڑے ہو کر پیشاب میں تھا۔

(رواه أحمد والبيهقي).

ترجمہ: اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام (جب) سب سے پہلے وحی کے موقع پر آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ کو وضو کرنا سکھایا، پھر نماز پڑھنی سکھائی چنانچہ جب وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو مانی لیا اور اس کو اپنی شرمگاہ پر چھڑک لیا۔ (امجد و ارقطی)

الراوي مُنْكَرُ الْحَدِيثِ (٣)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دومِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا اے محمد ﷺ جب آپ وضو کریں تو تھوڑا سا پانی (شرابہ) پر دفع و سواں کے لئے چھڑک لیا کیجئے، (ترمذی) اور امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث منکر ہے اور میں نے محمد (یعنی امام بخاری) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث کے راوی حسن بن علی شافعی منکر الحدیث ہیں۔

(رَوَاهُ أَبُو خَالِدٍ وَابْنُ مَاجَهَ) ۛ

سید صاحبزادہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ نے پیشاب کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پانی کا لونٹا لے کر آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا عمر یہ کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آپ کے وضو کے لئے آپ نے فرمایا مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب بھی میں پیشاب کروں تو وضو بھی کروں اگر میں ایسا کرتا تو یہ (میرا فعل) سنت ہو جاتا۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

استنجاء کے آداب

﴿۳۴﴾ وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ وَجَابِرٍ وَأَنْتَسِ أَنْ هَذِهِ الْآيَةُ لَمَّا تَزَلَتْ فِيهِ وَرَجَالَ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَفْلَى عَلَيْكُمْ فِي الظُّهُورِ فَمَا ظُهُورُكُمْ قَالُوا اذْكُوا صَلَاقًا وَتَغْتَسِلُوا مِنَ الْجَنَابَةِ وَتَسْتَنْجِي بِالْمَاءِ قَالَ فَهُوَ ذَلِكَ فَعَلَيْكُمْ مَوَدَّةُ

(رواہ ابن ماجہ)۔

ترجمہ: حضرت ابویوب، حضرت جابر، حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین یعنی مسجد قبا میں ایسے مرد ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ خوب پاکی حاصل کریں اور اللہ خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند رکھتا ہے تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے انصار کی جماعت اللہ تعالیٰ نے پاکی کے معاملے میں تمہاری تعریف کی ہے۔ بتاؤ تمہاری پاکی کیا ہے انہوں نے عرض کیا کہ ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں جنابت (ناپاکی) سے غسل کرتے ہیں (جیسا کہ دوسرے مسلمان کرتے ہیں) اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں! وہ سبھی ہے لہذا اسے لازم پکڑو۔ (ابن ماجہ)

توضیح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ استنجاء بالماء افضل ہے استنجاء کی کل تین صورتیں ہیں۔

● صرف ڈھیلے اور پتھر استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔

● صرف پانی استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔

● پتھر اور پانی دونوں استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔ فقہاء کے نزدیک یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔

اگرچہ بعض مالکیہ اور سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے پانی سے صفائی کو ناجائز کہا ہے مگر جمہور فقہاء کے نزدیک جائز اور افضل ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں اس کی تصریح موجود ہے اور حضور ﷺ سے اس پر مداومت ثابت ہے۔ اب فقہاء کرام اور جمہور امت کے نزدیک پانی اور ڈھیلے دونوں کو جمع کر کے استنجاء کی صورت سب سے افضل ہے اور کئی احادیث سے یہ جمع ثابت ہے تعدد طرق سے حدیث میں قوت آجاتی ہے۔ نیز فقہاء کے تعامل سے بھی حدیث قوی ہو جاتی ہے اس کے بعد پانی سے استنجاء افضل ہے اور پھر صرف پتھر کا درجہ ہے۔

مسلمان اپنے معاملات میں کسی کے محتاج نہیں

﴿۳۵﴾ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ بَعْضُ الْمَشْرِكَينَ وَهُوَ يَسْتَنْجِي إِلَى لَأَزَى صَاحِبُكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتَّى الْخِرَاءَةَ قُلْتُ أَجَلْ أَمَرْتَا أَنْ لَا تَسْتَقِيمَ الْبَيْتَةَ وَلَا تَسْتَنْجِي بِأَيْمَانِنَا وَلَا تَكْتُمِي بِدُونِ ثَلَاثَةِ أَتْحَابٍ لَيْسَ فِيهَا رَجِيعٌ وَلَا عَظْمٌ۔ (رواہ مسلمہ وأحمد واللفظ للہ)

میں نے کہا: اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرکوں میں سے ایک شخص نے بطور استہزاء یہ کہا کہ میں تمہارے سردار (یعنی آنحضرت ﷺ) کو دیکھتا ہوں کہ وہ تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں یہاں تک کہ پاخانہ میں بیٹھنے کی صورت بھی (سکھاتے ہیں) میں نے کہا ہاں آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ (استنجاء کے وقت) ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھیں اپنے دائیں ہاتھوں سے استنجاء نہ کریں تین پتھروں سے کم سے استنجاء نہ کریں اور ان پتھروں میں نجاست (یعنی پاخانہ، لید و گوبر) نہ ہو اور نہ ہڈی ہو۔ (مسلم، احمد، الفاظ احمد کے ہیں۔)

توضیح: الخراء: خاک کے کسرہ اور را پر مد کے ساتھ پاخانہ کے لئے بیٹھنے کی کیفیت کو کہتے ہیں اور نفس پاخانہ پر اس کا اطلاق تھا۔ کے حذف کے وقت ہوتا ہے یعنی الخواء والخراء۔

لیکن اکثر راویوں نے خاک مفتوح اور را کو بغیر مد کے پڑھا یعنی خوا۔ اصل میں یہ لفظ پرندوں کی بیٹ کیلئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں قضاء حاجت کے لئے استعمال ہوا ہے اس لفظ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی ادب الخراء قضا مطلب یہ ہوا کہ تم کو یہ نبی پاخانہ کرنے کا ادب سکھاتا ہے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے اور بدیہی چیزوں کی بلا ضرورت تعلیم دیتا ہے اس مشرک کی طرف سے یہ کلام استہزاء اور مذاق تھا کہ پاخانہ کا طریقہ سکھاتے ہیں تمہیں بچہ بنا رکھا ہے؟ لے

قلت اجل: یعنی ہاں ہمیں وہ نبی یہ چیزیں سکھاتے ہیں۔ لے

اب سوال یہ ہے کہ اس مشرک نے دین کا مذاق اڑا کر اعتراض کیا اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے "اجل" کہہ کر اس کو تسلیم کر لیا کیا یہ جائز تھا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اسلوب حکیم کے طور پر جواب دیا ہے جس کو علم المعانی والے محاشات مع الخصم اور ارجاء العبدان کہتے ہیں تاکہ وہ جواب سننے کے لئے خوب متوجہ اور تیار ہو جائے گویا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے جانور! سن لو یہ تعلیمات آسمانی ہیں جو مددک بالعقل نہیں ہیں یہ بدیہیات نہیں ہیں تم بیوقوف ہو کہ اس کو عقل کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتے ہو دیکھو میں نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم قبلہ کی طرف قضاء حاجت کے وقت منہ نہ کریں یہ حق ہے دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں یہ حق النفس ہے اور پھر حکم دیا کہ ہڈی و گوبر سے استنجاء نہ کریں یہ حق الاخوان ہے اس تعلیم میں حق النفس اور حق العبادتیں آگئے جو مکمل شریعت ہے اس کا مذاق اڑانا حماقت ہے۔

﴿۳۶﴾ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ حَسَنَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَفِي يَدِهِ الدَّرَقَةُ فَوَضَعَهَا ثُمَّ جَلَسَ فَبَالَ إِلَيْهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ أَنْظَرُوا إِلَيْهِ يَبُولُ كَمَا تَبُولُ الْمَرْأَةُ فَسَمِعَهُ الْيَهُودِيُّ فَقَالَ وَيَبْرَكَ مَا عَلِمْتُ مَا أَصَابَ صَاحِبَ نَبِيٍّ إِشْرَاقًا كَانُوا إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَوْلُ قَرَضَوْهُ بِالْبَقَارِ يَبُصُّ فَتَبَاهُ فَعُذِبَ فِي قَبْرِهِ. (رواه أبو داود وابن ماجه ورواه النسائي عنه عن أبي مؤنس) لے

تفسیر مجاز: اور حضرت عبدالرحمن بن حسنہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) سرکارِ دو عالم ﷺ (گھر سے) نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ اسے آپ ﷺ نے (اپنے سامنے) زمین پر رکھ دیا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کیا (یہ دیکھ کر) ایک مشرک نے کہا ان کی طرف دیکھو اس طرح پیشاب کرتے ہیں جیسے عورت پیشاب کرتی ہے یہ بات آنحضرت ﷺ نے سن لی اور فرمایا تجھ پر افسوس ہے، کیا تو اس چیز کو نہیں جانتا جو بنی اسرائیل کے ساتھی کو پہنچی (یعنی عذاب) بنی اسرائیل (جب پیشاب کرتے اور ان) کے جسم کپڑے کو پیشاب لگ جاتا تو اس کو پہنچی سے کاٹ ڈالتے تھے چنانچہ (بنی اسرائیل میں سے) ایک شخص نے (اس حکم کو ماننے سے) لوگوں کو روکا لہذا اسے قبر کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی نے اس حدیث کو عبدالرحمن سے اور انہوں نے ابوسلمی سے روایت کیا ہے)

توضیح: الدقة: یہ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو خالص کھال اور چمڑے سے بنی ہوئی ہو جس میں لوہا لکڑی وغیرہ نہ ہو۔

بعضہم: اس سے یا کوئی مشرک مراد ہے یا کوئی منافق تھا ثانی واضح ہے۔
کما تبول المرأة: عورت بیٹھ کر پیشاب کرتی ہے کیونکہ وہ کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کر سکتی ہے عرب میں مرد کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اور اس کو مردوں کی نشانی سمجھتے تھے۔

ویحک: یہ کلمہ واضح نے بددعا کے لئے وضع کیا ہے لیکن اس کا اکثر استعمال بددعا کے علاوہ میں ہوتا ہے۔
قروضہ بالمہار یض: بنی اسرائیل کے مشکل اور شاق احکامات میں سے ایک حکم یہ تھا کہ اگر بدن کے ساتھ نجاست لگ جاتی تو بدن کا وہ حصہ چھیننا اور کافی پڑتا اور اگر کپڑا پلید ہو جاتا تو اس کو بھی کاٹنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک شخص نے اس حکم سے انکار کیا اور لوگوں کو بھی منع کیا تو اس شخص کو اس بے احتیاطی کی وجہ سے قبر میں عذاب ہو گیا کیونکہ وہ پیشاب سے نہ بچ سکا۔

یہاں نبی اکرم ﷺ کے پیشاب کرتے وقت بیٹھنے پر اعتراض کرنے والے اور بنی اسرائیل کے آدمی میں کیا مناسبت ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کی مثال دی۔ تو اصل بات یہ ہوئی کہ دیکھو بنی اسرائیل کے آدمی نے ان کی شریعت کے ایک معروف اور اچھے کام سے روکنے کی کوشش کی تو اس کا انجام کتنا برا ہوا کہ عذاب میں مبتلا ہو گیا اسی طرح تم بھی ایک نیک کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہو تو تم کو بھی اسی طرح قبر کا عذاب ہوگا کیونکہ بے احتیاطی کر دے اور پیشاب لگے گا تو عذاب ہوگا۔

﴿۳۷﴾ وَعَنْ مَرْوَانَ الْأَصْفَرِ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّادٍ إِذَا خَرَّ رَأَى رَجُلًا مَسْتَقْبِلَ الْعِبْلَةِ ثُمَّ جَلَسَ يَبْزُلُ إِلَيْهَا فَقُلْتُ يَا أَبَا عُبَيْدٍ الرَّحْمَنُ أَلَيْسَ قَدْ نَهَى عَنْ هَذَا قَالَ بَلِ إِنَّمَا نَهَى عَنْ خُلُوكَ فِي الْقَضَاءِ فَإِذَا كَانَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْعِبْلَةِ شَيْءٌ فَلا تَأْتِسْ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: اور حضرت مروان الصفری سے روایت ہے کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ انہوں نے اپنا اونٹ قبلہ کی طرف بٹھایا! پھر خود بیٹھے اور اونٹ کی طرف پیشاب کیا میں نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا ابو عبد الرحمن (یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی کنیت ہے) کیا اس طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے سے منع نہیں فرمایا کیا انہوں نے فرمایا جنگل میں اس سے منع فرمایا گیا ہے لیکن جب تمہارے اور قبلہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (ابوداؤد)

توضیح: یہ ایک صحابی کی اپنی رائے اور ان کا عمل ہے مرفوع احادیث کی یہ روایت مقابلہ نہیں کر سکتی ہے تفصیل مگر بالکل ہے۔

﴿۳۸﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذَى وَعَافَانِي. (رواہ ابن ماجہ)

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب بیت الخلاء سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے: الحمد للہ الذی اذهب عني الاذى وعافاني یعنی تمام تعریفیں خدا ہی کو زیبا ہیں جس نے مجھ سے گندی اور تکلیف دو چیز (یعنی پاخانہ) کو دور کیا اور مجھے عافیت بخشی۔ (ابن ماجہ)

ہڈی اور گوبر سے استنجاء کی ممانعت

﴿۳۹﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ وَقَدْ اجْتَمَعَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّهُ أَفْعَلُ أَنْ يَسْتَنْجُوا بِعَظْمٍ أَوْ زَوْقَةٍ أَوْ حَمَاقَةٍ فَإِنَّ اللَّهَ جَعَلَ لَنَا فِيهَا رُزْقًا فَتَهَاكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ. (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنات کی جماعت سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے آپ سے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ اپنی امت کو منع فرما دیجئے کہ وہ گوبر، ہڈی اور کوئلہ سے استنجاء نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے ہمارا رزق پیدا کیا ہے" چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں ان (چیزوں کے استعمال) سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد)



باب السواک

مسواک کا بیان

سواک : مسواک استعمال کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور مسواک کی لکڑی پر بھی بولا جاتا ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں کہ مسواک مسواک کرنے کو بھی کہتے ہیں اور مسواک کی لکڑی کو بھی کہتے ہیں۔ مسواک اس لکڑی کا نام ہے جس سے دانت مل کر صاف کئے جاتے ہیں۔ "ما یدلک بہ الاسنان" سرب کہتے ہیں ساک فاہا یسو کہ جب اس کا مفعول بہ مذکور ہو تو ساک فاہا کہتے ہیں اور جب مفعول بہ مذکور نہ ہو تو استاک کہتے ہیں مسواک کتاب کی طرح ہے جس کی جمع بھی سواک گٹھ کی طرح آتی ہے۔ اور مسواک کی جمع مساویک بھی آتی ہے چنانچہ امر القیس اپنی محبوبہ کی انگلیوں کی تعریف میں کہتا ہے:۔

وَتَغْطُو بِرُخْصِ غَيْرِ شَمَنِ كَأَنَّهَا أَسَارِیْعُ ظَلَمِي أَوْ مَسَاوِیْكَ أَسْعَلِ

سب سے افضل مسواک زیتون کی ہے پھر پیلو کی ہے یعنی جس لکڑی میں کڑواہٹ زیادہ ہو وہ عمدہ ہے۔ ملیشھی کی مسواک بھی ملتی ہے جو بہت ہی عمدہ ہوتی ہے برش اور ٹوتھ پیسٹ سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی ہے اگرچہ دانت صاف ہو جاتے ہیں علامہ نووی رحمہ اللہ نے مسواک کی سنت پر اجماع نقل کیا ہے اور مسواک پر تو اتر عملی ہے۔ علماء نے مسواک کے ستر (۷۰) سے زیادہ فوائد لکھے ہیں ایک بڑا فائدہ یہ کہ موت کے وقت کلمہ شہادت نصیب ہوتا ہے، مسواک کرنے کا مستحب طریقہ عرضاً یعنی چوڑائی میں استعمال کرنے کا ہے اگرچہ طولاً بھی جائز ہے مگر اس سے زخم آنے کا خطرہ ہے جس شخص کے دانت نہ ہوں اس کے لئے انگلی مسواک کے قائم مقام ہے، عورتیں بھی مسواک کر سکتی ہیں مگر ان کے لئے دنداسہ بھی مسواک ہے جو زیادہ مناسب ہے۔ جس شخص کے پاس مسواک نہ ہو تو روایت سے ثابت ہے کہ انگلی مسواک کی جگہ لے سکتی ہے۔

مسواک کی مقدار:

مسواک کی مقدار ایک بالشت ہونی چاہیے، موہائی میں انگوٹھے کے برابر ہو، پتے پن میں چھنگلی کے برابر ہو، اگر بالشت سے زیادہ لمبی ہو تو اگر خریدی ہے تو اس کو کاٹنا صحیح نہیں ہے کہ اسراف ہے اگر کسی نے عطیہ دی ہے تو زائد کو کاٹ کر ضائع کیا جا سکتا ہے، استعمال کے بعد جب چار انگلی کے برابر رہ جائے تو کسی جگہ میں دفن کر دی جائے، استعمال کے بعد مسواک کے رکھنے کا ادب یہ ہے کہ اس کو الٹا رکھا جائے تاکہ منہ میں استعمال شدہ حصہ زمین پر آجائے اس طرح اس میں پانی اندر کے بجائے باہر کو نچر جائے گا تو بد بو نہیں آئے گی نیز زمین میں نوشارہ کے اجزاء ہیں اس سے مسواک میں لگے جراثیم بھی

مر جائیں گے۔ جمہور نے مسواک کو سنت قرار دیا ہے صرف داؤد ظاہری نے اس کو واجب کہا ہے فتح القدیر نے پانچ حالتوں میں مسواک کرنے کو مسنون اور ضروری بتایا ہے۔ ۱۔

- ① جب دانت پہلے پڑ جائیں۔
- ② جب منہ سے بد بو آئے۔
- ③ جب آدمی نیند سے جاگ جائے۔
- ④ جب نماز شروع کرے۔
- ⑤ جب وضو شروع کرے۔ ۲۔

الفصل الاول

مسئلة السواك

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أَقْبَى لَا مَرْغُهُمْ بِتَأْخِيرِ الْعِشَاءِ وَبِالنِّسْوَالِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اگر میں اپنی امت پر اس بات کو مشکل نہ جانتا تو مسلمانوں کو یہ حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھیں اور ہر نماز کیلئے مسواک کریں۔“ (بخاری و مسلم)

توضیح: لولا ان اشقی: لولا انتفاء ثانی کے لئے آتا ہے بسبب وجود اول حالانکہ وجود اول یعنی مشقت حقیقی نہیں ہوئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لولا کے ساتھ ”خشية“ کی عبارت محذوف ماننا پڑے گا۔ پھر یہاں دوسرا اشکال یہ ہے کہ انتفاء ثانی متحقق نہیں ہوا ہے کیونکہ مسواک کا حکم ختم نہیں ہوا بلکہ مسنون طریقہ پر موجود ہے اور تاخیر عشاء کا حکم بھی برقرار ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ”امرتھم“ میں فرضیت اور وجوبی طور پر حکم کی نفی کی گئی ہے اور وہ نفی موجود ہے کہ مسواک کرنا نہ فرض ہے اور نہ واجب ہے ترجمہ یہ ہوا کہ اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑنے کا خوف نہ ہوتا تو میں فرض اور وجوبی طور پر مسواک کا حکم دیتا لیکن چونکہ امت کے مشقت میں پڑ جانے کا خوف موجود ہے اس لئے میں نے واجبی طور پر مسواک کا حکم نہیں دیا بلکہ مسنون طریقہ کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح کلام تاخیر عشاء میں بھی ہے۔ ۲۔

عند کل صلوة: دوسری روایت میں ”عند کل وضوء“ کے الفاظ آئے ہیں اور تیسری روایت میں ”مع کل وضوء“ کے الفاظ بھی آئے ہیں ان الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے فقہاء کرام کا اس بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا مسواک سنن وضو میں سے ہے یا یہ سنن صلوٰۃ میں سے ہے۔ ۳۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

ائمہ احناف کے ہاں مسواک سنن وضو میں سے ہے اور شوافع کے ہاں یہ سنن صلوٰۃ میں سے ہے ثرۃ اختلاف اس وقت ظاہر

ہوگا کہ مثلاً ایک شخص نے وضو کے ساتھ مسواک کی اور پھر اسی وضو سے کئی نمازیں پڑھ لیں تو احتاف کے نزدیک یہ ساری نمازیں مسواک والی ہوں گی لیکن شوافع کے ہاں مسواک والی نہیں ہوں گی۔

دلائل:

شوافع نے اپنے استدلال میں وہ روایات پیش کیں ہیں جن میں "عدد کل صلوٰۃ" کے الفاظ آئے ہیں زیر بحث حدیث بھی ان کی دلیل ہے ائمہ احتاف "کثر الله سوادهم" نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جن میں "عدد کل وضوء" کے الفاظ آئے ہیں یا "مع کل وضوء" کے الفاظ ہیں موطا مالک میں "مع کل وضوء" کے الفاظ موجود ہیں، نیز مسند احمد اور سنن کبریٰ میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں اور یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے لہذا جب "مع کل وضوء" میں صراحت کے ساتھ مقارنت کا ذکر ہے تو اسی پر "عدد کل صلوٰۃ" کو بھی حمل کرنا چاہئے اور "عدد کل وضوء" کے الفاظ کو بھی "مع کل وضوء" پر حمل کرنا چاہیے تاکہ تمام احادیث میں تطبیق آجائے اور "عدد کل صلوٰۃ" کے احتمالی کلمات "مع کل وضوء" کے یقینی کلمات پر محمول ہو جائیں تاکہ اختلاف ختم ہو کر اتفاق ہو جائے۔ ائمہ احتاف کی دوسری دلیل فصل ثانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے: "السواک مطهرة للفم ومرضاة للوب" طرز استدلال اس طرح ہے کہ مسواک کا تعلق طہارت سے جوڑا گیا ہے اور طہارت وضو کے ساتھ وابستہ ہے یہ نقلی دلیل بھی ہے اور عقلی بھی ہے، عقلی دلیل میں دیکھا گیا ہے کہ آیا مسواک مقصودی عبادت یعنی صلوٰۃ کے زیادہ قریب ہے یا اس کے وسیلے وضو کے زیادہ قریب ہے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسواک کا تعلق وسیلہ سے زیادہ ہے یعنی وضو سے زیادہ اور اس حدیث نے انکی تصریح بھی کر دی کہ "مطهرة للفم" نیز آنحضرت ﷺ کی مداومت مسواک عند الوضوء پر ہے نیز ہم قبل الصلوٰۃ بھی مسواک کو مانتے ہیں اور فتح القدیر نے پانچ مواضع میں قبل الصلوٰۃ مسواک کا ذکر بھی کیا ہے لیکن چونکہ احتاف کے نزدیک خروج خون ناقض للوضوء ہے تو احاداف عند الصلوٰۃ مسواک سے اس خوف کی وجہ سے بچتے ہیں ورنہ مستحب اس مقام میں بھی ہے جب احتاف نے پانچ مواضع میں مسنون مان لیا تو پھر مسئلہ میں اختلاف ہی نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے مسواک کے اختلاف کو اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں ذکر نہیں کیا ہے جس سے وہ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ اعراف بالخلافیات ہیں۔

مسواک استعمال کرنے کے مواضع

﴿۲﴾ وَعَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَالٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ بِأُتَى شَيْعٍ كَانَ يَتَذَكَّرُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ قَالَتْ بِالنِّسْوَانِ (رواة نسائي)

تذکرہ: اور حضرت شریح بن حالی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو پہلے کیا کرتے؟ انہوں نے فرمایا سب سے پہلے آپ ﷺ مسواک کرتے تھے۔

(مسلم)

توضیح: اذا دخل: یعنی گھر میں آنے کے وقت سب سے پہلا کام مسواک ہوتا تھا یہ امت کو تعلیم دے دی کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنی بیوی سے بوس و کنار کا موقع آسکتا ہے اگر منہ سے بد بو اٹھ رہی ہو تو یہ باعث نفرت ہو سکتا ہے اور نفرت میاں بیوی کے درمیان جدائی کا ذریعہ بن سکتی ہے اس لئے گھر میں آنے کے وقت خوب مسواک کرنا چاہیے تاکہ منہ سے بد بو اٹھنے کا امکان باقی نہ رہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ خَدِيجَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَتَوَضَّأُ فَأَهْلِي السُّبُوحِ.
(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

تذکرہ: اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب رات میں تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تو اپنا منہ مسواک سے ملے اور دھو لیتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

ڈاڑھی بڑھانا اور دس فطری چیزیں

﴿۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاعْتِفَاءُ الْبَهِيمَةِ وَالسُّبُوحِ وَاسْتِئْذَانُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْأَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاثِمِ وَكَتْفُ الرِّبْطِ وَحُلْيُ الْعَاكَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ يَغْنَى الْإِسْتِغْنَاءَ قَالَ الزَّائِرِيُّ وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمُتَضَمِّنَةُ.
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِي رِوَايَةٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمُتَضَمِّنَةُ وَلَكِنْ ذَكَرَهَا صَاحِبُ الْجَامِعِ وَكَذَا الْخَطَّابِيُّ فِي مَقَالِهِ الشُّنَنُ عَنْ أَبِي دَاوُدَ وَابْنُ عَسَاكِرَ فِي تَابِئِهِ)

تذکرہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا دس چیزیں فطرت میں سے ہیں (یعنی دین کی باتیں ہیں) ① لبوں کے بال کٹوانا ② داڑھی کا بڑھانا ③ مسواک کرنا ④ ناک میں پانی دینا ⑤ ناخن کٹوانا ⑥ جوڑوں کی جگہ دھونا ⑦ بغل کے بال صاف کرنا ⑧ زیر ناف بالوں کو سونڈنا ⑨ پانی کا کم کرنا یعنی پانی کے ساتھ استنجا کرنا۔ راوی یعنی مصعب یاد کر یا کا بیان ہے کہ دسویں چیز کو میں بھول گیا ممکن ہے وہ کھلی کرنا ہو (مسلم) اور ایک روایت میں (دوسری چیز) داڑھی بڑھانے کے بجائے ختنہ کرانا ہے اور (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) مجھے یہ روایت نہ سمجھیں یعنی بخاری و مسلم میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں (جو صحیحین کی جامع ہے) البتہ اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اسی طرح خطابی نے معالم السنن میں ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

توضیح: الفطرة: اس لفظ کا ایک مطلب سنن الانبیاء ہے یعنی ان کی خلقت میں داخل تھی تو ہماری خلقت میں بھی داخل ہے اس کا دوسرا مطلب سنن الدین ہے۔ اس لفظ کا تیسرا مطلب انسانی فطرت اور خلقت و طبیعت ہے۔ یعنی یہ دس خصلتیں انسانی طبیعت اور فطرت ہیں ”یہ چیزیں انسانی ہیئت کو باقی رکھتی ہیں ورنہ انسان کی ہیئت غیر فطری ہو جائے گی۔“ ۱۔

قص الشارب: تمام الفاظ حدیث سے لیوں کے کاٹنے کترنے کا اشارہ ملتا ہے مونڈنے کا اشارہ نہیں ملتا ہے اگرچہ فتاویٰ عالمگیری نے اسے جائز کہا ہے مگر چھوڑ کر باقی صاف کرنا اصل سنت ہے لیوں کے برابر بال لینا بھی جائز طریقہ ہے۔ تھنوں کے پاس کچھ بال چھوڑ کر باقی صاف کرنا مسٹر چرچل کا طریقہ ہے اور بیچ سے کچھ حصہ کاٹ کر دونوں طرف کناروں میں کافی بال چھوڑنا مائکی کے شیخان کا نامناسب طریقہ ہے۔ ۲۔

إعفاء اللحية: یہ باب افعال سے اعفاء معاف کرنے کے معنی میں ہے یعنی معاف کر کے خوب چھوڑے اور کترنے مونڈنے سے نہ چھیڑے داڑھی بڑھانے کی کوئی حد نہیں، ہاں اگر منہ چھوٹا ہے اور صلحاء کے ہاں چہرہ بڑا لگتا ہے تو داڑھی اتنی کم کرنا جائز ہے کہ بڑی نہ لگے لیکن ایک مشیت سے کم کرنا جائز نہیں ایک مشیت تک کم کرنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے ورنہ احادیث میں بڑھانے کا حکم ہے ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقات میں لکھتے ہیں کہ: از جن چھوٹی کرنا مجبیوں کا عمل ہے اور آج کل یہ بہت سارے مشرکین اور فرنگیوں اور یہود و ہنود اور ملحد لوگوں کا شعار بن چکا ہے اور طائفہ قلندر یہ کا یہ شعار بن گیا ہے جن کا دین سے کوئی واسطہ نہیں ہاں عورت کی داڑھی اگر آگئی تو اسے منڈانا مستحب ہے داڑھی رکھنا واجب ہے اس کو سنت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سنت طریقہ سے ثابت ہے حضور اکرم ﷺ اور ہر نبی اور ہر صحابی نے داڑھی رکھنے پر مداومت فرمائی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔ ۳۔

وقص الاظفار: یعنی ناخن تراشنا ایک فطری عمل ہے جو لوگ ناخن بڑھاتے ہیں یہ غیر فطری اور غیر انسانی فعل کے مرتکب ہیں ناخن تراشنا ہر طریقہ سے جائز ہے لیکن بہتر طریقہ اس طرح ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کر کے چھوٹی انگلی تک تراش لیا جائے اور پھر انگوٹھے کو تراش کر بائیں ہاتھ کی چھٹکی سے شروع کر کے انگوٹھے تک کاٹ دیئے جائیں، بعض نے کہا ہے کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کر کے انگوٹھے تک تراش لیا جائے اور آخر میں دائیں ہاتھ کے انگوٹھا پر ختم کرے اور پاؤں میں دائیں پیر کی چھوٹی انگلی سے لے کر بائیں کے آخر تک تراش لیا جانا عام اور رائج طریقہ ہے۔ ۴۔

وغسل البواجم: یہ ”بوجہ“ کی جمع ہے انگلیوں کے جوڑوں میں جو لکیریں ہیں اس کو کہتے ہیں لیکن یہ حکم ہر اس جگہ کو عام ہے جہاں میل جمع ہوتا ہے مثلاً کان کے ارد گرد اور اس کے اندر کا حصہ ہے ناک اور اس کے اندر جو میل جمع ہوتا ہے یا جسم کے باقی حصوں میں جہاں میل جمع ہوتا ہے سب اس میں داخل ہیں۔ ۵۔

وَنَتْفِ الْإِبْطِ: یعنی بغل کے بال صاف کرنا "نَتْف" نوچنے کے معنی میں ہے لہذا یہ لفظ بتاتا ہے کہ بغل کے بال استرے سے صاف نہ کئے جائیں کیونکہ اس سے بال گھنے ہو کر جنگل بن جاتا ہے اور پھر بدبو پیدا ہوتی ہے اگلیوں سے جب ابتداء سے اس کو اکھڑنے کی عادت بنائی جائے پھر یہ بال آسانی سے نوچے جاسکتے ہیں۔

وَحَلَقِ الْعَادَةَ: یعنی زیر ناف بال مونڈنا ابنِ مَلِک (جو ایک فقیہ ہیں) فرماتے ہیں کہ زیر ناف بالوں میں منڈانا ہی سنت ہے کسی اور طریقہ سے صاف کرنے سے سنت پوری نہیں ہوگی بعض نے بال صاف اور نورہ سے صاف کرنے کو بھی جائز کہا ہے مگر قہنچی سے کاٹنا جائز نہیں ہے مردوں کے لئے لوہے سے منڈانا باعثِ قوتِ باہ ہے اور عورتوں کیلئے زیر ناف بال نوچنا زیادہ بہتر ہے اس سے ان کی شہوت کثرت ہو جاتی ہے تاہم وہ بال صاف یا نورہ بھی استعمال کر سکتی ہیں مگر ان کے لئے منڈانا خلاف سنت ہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے لئے لبوں کو صاف کرنے ناخن تراشنے بغل کے بال صاف کرنے اور زیر ناف بال صاف کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چالیس دن کا وقت دیا تھا تو پوری امت کے لئے یہی تعلیم ہے علماء نے یہ ترتیب بتائی ہے کہ ہفتہ وار صفائی حاصل کریں ورنہ پندرہ دن میں حاصل کریں ورنہ چالیس دن میں حاصل کریں اس سے زیادہ دیر کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ دس چیزیں وہ تھیں جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے "وَإِذَا بَعَثَ الْإِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتِ فَأَتَمَّهُنَّ" تو یہ آپ کی سنت تھی پھر تمام انبیاء کرام کی سنت رہی اور امتوں کی فطرت کا حصہ بن گیا۔

الفصل الثانی

مسواک کرنے کے فوائد

﴿۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ السِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْطَبَةٌ لِلزَّبْتِ

(رواہ الشافعی وَاَحْمَدُ وَالتَّيْمِيُّ وَالتَّنَائِي وَزَوَى الْبُخَارِيُّ فِي صَحِيحِهِ وَابْنُ اسْتِثْنَانَ)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا مسواک (کرنا) منہ کی پاکی کا سبب ہے اور پروردگار کی خوشنودی کا باعث ہے (شافعی، احمد، دارمی، نسائی) اور امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی (صحیح بخاری) میں بغیر سند کے نقل کیا ہے۔

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي الْيُؤُبَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِينَ الْخِيَاءُ وَيُزَوَّى الْحَوْتَانِ وَالتَّعْطَرُ وَالسِّوَاكُ وَالتَّكَاخُ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: اور حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا چار چیزیں رسولوں کے طریقہ میں سے ہیں:

① حیا کرنا ایک روایت میں غتہ کرنا مروی ہے (یعنی اس روایت میں تو انبیاء کا لفظ ہے اور بعض روایات میں اس کے بجائے الحشاش کا لفظ آیا ہے)۔ ② خوشبو لگانا ③ مسواک کرنا ④ نکاح کرنا۔ (ترمذی)

﴿۷﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَزِيدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَعِظُ إِلَّا يَتَسَوَّكَ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ (رواهُ أَبُو دَاوُدَ) ۱۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب رات اور دن میں سو کر اٹھتے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک کرتے۔ (احمد، ابوداؤد)

﴿۸﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْتَاكُ فَيُعْطِي السَّوَّكَ لِأَعْمَلَةٍ فَأَهْدَأُ بِهِ فَأَسْتَاكُ ثُمَّ أَعْمَلُهُ وَأَذْفَعُهُ إِلَيْهِ (رواهُ أَبُو دَاوُدَ) ۲۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ مسواک کرتے اور پھر مجھے دے دیتے تاکہ میں اسے دھوؤں (چنانچہ میں) (آپ سے مسواک لے کر) پہلے اس سے خود مسواک کرتی پھر دھوتی اور آنحضرت ﷺ کو دے دیتی۔ (ابوداؤد)

الفصل الثالث

مسواک کی اہمیت

﴿۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ أَرَانِي فِي الْمَنَامِ أَتَسَوَّكَ بِسَوَّكِ فَجَاءَنِي رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ فَنَاولْتُ السَّوَّكَ الْأَصْغَرَ مِنْهُمَا فَقِيلَ لِي كَيْفَ قَدْ دَفَعْتَهُ إِلَى الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک دن) سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں (اسی اثناء میں) دو آدمی میرے پاس آئے ان میں سے ایک آدمی دوسرے سے بڑا تھا میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک دینے کا ارادہ کیا مگر مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو مسواک دو چنانچہ میں نے ان میں سے بڑے کو مسواک دی۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: ارانی: یعنی میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا۔ انبیاء کرام کا خواب وحی کا درجہ رکھتا ہے تو جو عمل انہوں نے خواب میں کیا وہ امت کے لئے شریعت بنتی ہے گویا مسواک سبب اعزاز و اکرام ہے تو آپ نے بڑے کو اس اکرام سے نوازا اس حدیث کے بعد آنے والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نمبر ۱۲ میں اس طرح کے قصہ کا بیداری میں بھی پیش آنا مذکور ہے جہاں آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے حکم ہوا کہ مسواک بڑے آدمی کو دے دی جائے۔

اس حدیث کے بعد کئی احادیث میں مسواک کی نہایت ترغیب دی گئی ہے چنانچہ حدیث نمبر ۱۰ میں "لَقَدْ خَشِيتُ أَنْ أَحْفِيَ مُقَدَّمَتِي" کے الفاظ آئے ہیں احفاء چھپانے کے معنی میں ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جبریل امین نے مسواک پر اتنا زور دیا کہ مسواک کرتے کرتے مجھے خوف لاحق ہو گیا کہ میں منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں "فی" لم میں ایک لغت ہے شد کے ساتھ منہ کو کہتے ہیں۔ ۱۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَا جَاءَنِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَطُّ إِلَّا أَمَرَنِي بِالسُّوَالِكِ لَقَدْ خَشِيتُ أَنْ أَحْفِيَ مُقَدَّمَتِي. (رواه أحمد) ۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جبریل علیہ السلام جب بھی میرے پاس آتے تو مجھے مسواک کرنے کا حکم دیتے (یہاں تک کہ) مجھے خوف ہوا کہ (کہیں مسواک کی زیادتی سے) میں اپنے منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں۔" (احمد)

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَقَدْ أَكْثَرْتُ عَلَيْكُمْ فِي السُّوَالِكِ. (رواه البخاری) ۳۔

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تم سے مسواک کے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔ (بخاری)

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسْتَنُّ وَعِنْدَهُ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا أَكْثَرُ مِنَ الْآخَرِ فَأَوْحَى إِلَيْهِ فِي فَضْلِ السُّوَالِكِ أَنْ يَكْبُرَ أَكْبَرُ السُّوَالِكِ أَكْثَرُ هُمَا. (رواه أبو داود) ۴۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ مسواک کر رہے تھے اور آپ کے پاس دو آدمی تھے جن میں ایک دوسرے سے بڑا تھا چنانچہ مسواک کی فضیلت میں آپ کی طرف یہ وحی نازل فرمائی گئی کہ بڑے کو مقدم رکھو یعنی ان دونوں میں سے بڑے کو مسواک دو۔ (ابوداؤد)

مسواک کی عظیم فضیلت

﴿۱۳﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَفْضُلُ الصَّلَاةُ الَّتِي يُسْتَأْتَلُ لَهَا عَلَى الصَّلَاةِ الَّتِي لَا يُسْتَأْتَلُ لَهَا سَبْعِينَ ضِعْفًا. (رواه الترمذی فی شعب الایمان) ۱

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ نماز جس کے لئے مسواک کی گئی (یعنی وضو کے وقت) اس نماز پر جس کے لئے مسواک نہیں کی گئی ستر (۷۰) درجہ کی فضیلت رکھتی ہے۔ (صحیح)

﴿۱۴﴾ وَعَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَوْلَا أَنْ أُشْفِيَ عَلَى أُمَّيْ لَا مَرْغَمُهمْ بِالشَّوَالِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَلَا خُرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ قَالَ فَكَانَ زَيْدُ بْنُ خَالِدٍ يَشْهَدُ الصَّلَوَاتِ فِي الْمَسْجِدِ وَيَسْوَأُكُهُ عَلَى أَذُنِهِ مَوْضِعَ الْقَلَمِ مِنْ أَذُنِ الْكَاتِبِ لَا يَقُومُ إِلَى الصَّلَاةِ إِلَّا اسْتَقَرَّ ثُمَّ رَكَعَ إِلَى مَوْضِعِهِ. ۲

(رواه الترمذی وأبو داؤد والآنسة كندة) وَلَا خُرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ. وَقَالَ الترمذی هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ ۳

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر اپنی امت کے لئے میں اس میں مشکل نہ جانتا تو میں ان کو ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کا حکم دیتا (یعنی یہ اعلان کر دیتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کرنا واجب ہے) اور عشاء کی نماز میں تہائی رات تک تاخیر کا حکم کرتا روای کا بیان ہے کہ (اس کے بعد) زید بن خالد رضی اللہ عنہ نماز کے لئے مسجد میں آتے تو مسواک ان کے کان پر رکھی ہوتی جس طرح کاتب کے کان پر قلم رکھا رہتا ہے وہ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو فوراً مسواک کر لیتے اور پھر کان پر رکھ لیتے۔ (ابوداؤد، ترمذی) ابوداؤد نے لاخرت صلوۃ العشاء الی ثلث الیل کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ملاحظہ:

یاد رہے کہ ۲۳ صفر ۱۴۱۰ کا درس یہاں ختم ہو گیا اور آئندہ سن الوضو مستقل ایک دن کا درس ہے گویا ۲۳ صفر کے عنوان سے جو درس ہے یہ دو دن کا سبق ہے۔



باب سنن الوضوء

وضو کی سنتوں کا بیان

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں سنن الوضوء کے عنوان سے صرف وضو کی سنتیں مراد نہیں بلکہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات سب مراد ہیں خواہ وہ سنت ہوں یا فرض ہوں جس طرح فرض اور واجب کے بارے میں بھی کبھی کبھی آتا ہے کہ سنت میں اس طرح آیا ہے حالانکہ وہاں صرف سنت مراد نہیں، بلکہ سنت طریقہ سے ثابت شریعت کا حکم مراد ہوتا ہے لہذا اس باب میں سنت و فرائض اور آداب و مستحبات سب بیان ہوں گے۔

الفصل الاول

مسئلة خمس اليدين في الاثناء

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الْأَثَاءِ حَتَّى يَغْسِلَهَا فَلَا فَإِنَّهُ لَا يَنْدِرِي أَيْنَ تَأْتَتْ يَدُهُ﴾ (مشفق غلبو) ۱

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اٹھے (تو اسے چاہیے کہ) اپنے ہاتھ کو پانی کے برتن میں نہ ڈالے جب تک اسے (پانیوں تک) تین بار دھونے لے اس لئے کہ اسے نہیں معلوم کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں کہاں رہا۔“ (مشفق غلبو)

توضیح: فلا یغمس یدہ فی الاثناء: یہاں وضو کے آداب میں سے ایک ادب یہ بتایا گیا ہے کہ جب سو کر اٹھو تو پانی کے برتن میں ہاتھ نہ ڈالنے سے پہلے تین دفعہ ہاتھوں کو دھو لیا کرو بغیر دھوئے ہاتھ نہ ڈالو اگر وہاں یہ ہاتھ دھونا واجب ہے یا سنت ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ہاتھ پر گندگی لگنے کا یقین یا ظن غالب ہو تو پھر ہاتھ دھونا واجب ہے اور اگر صرف شک اور احتمال ہو تو پھر ہاتھ دھونا سنون یا مستحب ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل حجاز اکثری طور پر استنجاء بالا حجار کرتے تھے اور وہاں گرمی کی شدت ہوتی تھی نیز وہ لوگ شلوار کے بجائے ازار باندھتے تھے اس لئے قوی احتمال تھا کہ حالت لوم میں ہاتھ نجاست کے مقام پر پڑ جائے اور پسینہ کی وجہ سے ہاتھ نجاست سے آلودہ ہو جائے یا رانچہ کر یہ لگ جائے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالا جائے کیونکہ احتمال نجاست ہے اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر پانی سے کوئی استنجاء کرے یا ازار کے بجائے شلوار پہنے اور علاقہ بھی ٹھنڈا ہو تو ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ڈالا جاسکتا ہے۔

بہر حال جہاں تو ہم نجاست ہو وہاں بھی ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا کیونکہ "الیقین لا یزول بالمشک" ایک مسلمہ قاعدہ ہے ہاں نظافت کے خلاف ہے بہر حال اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف بھی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

اہل علو اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے نزدیک اگر نیند سے اٹھنے والے شخص نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ نے چند قیود کا اضافہ کیا ہے کہ نیند سے اٹھے لہذا بیہوش آدمی کے ہاتھ ڈالنے سے کوئی فرق نہیں آئے گا۔ دوسری قید یہ کہ رات کی طویل نیند ہو لہذا دن کی قلیل نیند کا یہ حکم نہیں۔ تیسری قید یہ کہ برتن میں ہاتھ ڈال دے لہذا غیر برتن کا حکم اس طرح نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ قیودات احترازی ہیں۔

جمہور فقہاء کے نزدیک یہ فعل اگرچہ مکروہ ہے لیکن احتمال نجاست کی وجہ سے پانی کو ناپاک نہیں کہیں گے، کیونکہ پانی تہنی طور پر پاک تھا "الیقین لا یزول بالمشک" ایک قاعدہ ہے ہاں اگر ظاہری نجاست لگ گئی پھر ناپاک ہوگا جمہور یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث میں جو قیودات ہیں وہ احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہیں لہذا اگر بے ہوش آدمی نے غفلت کی وجہ سے پانی میں ہاتھ ڈال دیا تو یہ عمل بھی مکروہ ہوگا کیونکہ یہ بھی غفلت کا نتیجہ ہے اور "فانہ لا یدوی ابن ہالت یدہ" سے اسی علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر برتن بڑا ہے تو پہلے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے پانی لے کر دوسرے ہاتھ کو دھو لے اور پھر اس ہاتھ سے دوسرا ہاتھ دھو لے اور پھر دونوں ہاتھوں سے چلو بھر کر وضو کرے اور اگر برتن چھوٹا ہے تو انڈیل کر ڈالے اور اگر الگ لونا ہے تو بڑے برتن میں ڈال کر پانی حاصل کرے۔

مسئلة المضیضة والاستنشق

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَتَامِهِ فَتَوَضَّأْ فَلْيَسْتَنْشِزْ ثَلَاثًا فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبْسُطُ عَلَى خَيْشُومِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَقِيلَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بِنِ عَاصِمٍ كَيْفَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ قَدْعًا يَوْضُوءَ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَزَ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْبِرْفَقَيْنِ ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ فَأَقْبَلَ بِيَمَانِهِ وَأَذْبَرَ بَدَأَ بِمَقْدَمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِيَمَانِهِ إِلَى قَفَاهُ ثُمَّ رَكْعَتَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتَّيْمِيُّ وَابْنُ دَاوُدَ وَنَحْوُهُ ذَكَرَهُ صَاحِبُ الْحَجَامِجِ وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ قِيلَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بِنِ عَاصِمٍ تَوَضَّأْنَا وَضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَدْعًا

يَاكُفَّاءُ مِنْهُ عَلَى يَدَيْهِ فَعَسَلَهُمَا فَلَاقَا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَغْرَجَهَا فَمَضَمَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفِّ وَاحِدَةٍ فَقَعَلَ ذَلِكَ ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَغْرَجَهَا فَعَسَلَ وَجْهَهُ فَلَاقَا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَغْرَجَهَا فَعَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْيَرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَغْرَجَهَا فَتَسَحَّحَ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِمَنْدِيهِ وَأَذْبَرَ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ هَكَذَا كَانَ وَضُو رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. وَفِي رِوَايَةٍ فَأَقْبَلَ بِمَنْدِيهِ وَأَذْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدِّمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِهَا إِلَى قَفَاهُ ثُمَّ رَفَعَهَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ فَمَضَمَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْشَقَ فَلَاقَا بِفَلَاحٍ غَرَفَاتٍ مِنْ مَاءٍ وَفِي أُخْرَى فَمَضَمَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفِّهِ وَاحِدَةٍ فَقَعَلَ ذَلِكَ فَلَاقَا وَفِي رِوَايَةٍ يَلْبُغَارِي فَتَسَحَّحَ رَأْسَهُ فَأَقْبَلَ بِمَنْدِيهِ وَأَذْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَفِي أُخْرَى لَهُ فَمَضَمَ وَاسْتَنْشَقَ فَلَاحٍ مَرَّاتٍ مِنْ غَرَفَةٍ وَاحِدَةٍ ۱.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تم میں سے کوئی سوکر اٹھے اور وضو کا ارادہ کرے تو تین مرتبہ (ناک میں پانی دے کر) ناک کو جھاڑے اس لئے کہ اس کی ناک کے ہانے پر شیطان رات گزارتا ہے۔“ (بخاری، مسلم)

توضیح: فلمیستعدو فَلَاحًا: یعنی تین بار ناک میں پانی ڈالکر جھاڑ دے جسے استنشاق بھی کہتے ہیں۔ مضضہ اور استنشاق میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

مضضہ اور استنشاق کی وضو اور غسل میں کیا حیثیت ہے اس میں فقہاء کا اختلاف ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مضضہ اور استنشاق دونوں وضو اور غسل میں سنت ہیں۔ اہل ظواہر اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک مضضہ تو دونوں میں سنت ہے لیکن استنشاق وضو اور غسل دونوں میں فرض ہے یعنی شوافع و مالکیہ کے ہاں دونوں جگہ میں دونوں سنت ہے اور حنابلہ کے ہاں مضضہ دونوں جگہ سنت اور استنشاق فرض ہے ائمہ احناف کے نزدیک وضو میں یہ دونوں سنت ہے اور غسل میں دونوں فرض ہے۔

دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل تو آیت الوضو ہے جس میں تمام فرائض کا ذکر کیا گیا ہے وہاں مضضہ اور استنشاق مذکور نہیں ہے اگر ہم حدیث سے فرض ثابت کریں گے تو یہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادت لازم آئے گی جو

نا جائز ہے لہذا فرض نہیں بلکہ سنت ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت عشر من الفطرقہ اور عشر من سنن المرسلین ہے جہاں مضمضہ اور استنشاق کو سنت کہا گیا ہے تو وضو اور غسل دونوں میں یہ دونوں سنت ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل ظواہر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زیر نظر روایت سے استدلال کیا ہے جس میں لیستشعر امر کا صیغہ آیا ہے اور اس سے فرض ثابت ہو گیا جب حدیث اصغر میں فرض ہوا تو حدیث اکبر غسل میں بطریق اوئی فرض ہوگا احمد احناف کو دو الگ الگ دلائل کی ضرورت ہے چنانچہ وضو میں ان دونوں کے سنت ہونے پر احناف کی دلیل وہی آیت ہے جس سے شوافع اور مالکیہ نے استدلال کیا ہے کہ آیت الوضو میں اگر مضمضہ اور استنشاق کو فرض کہیں گے تو اس سے کتاب اللہ پر زیادت آئے گی جو جائز نہیں ہے لیکن غسل میں دونوں کے فرض ہونے کے لئے احناف نے قرآن کی آیت "فاطهروا" سے استدلال کیا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ غسل میں بہت ہی مبالغہ سے کام لیا جائے اس مبالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ جسم میں جو حصہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہو وہ بھی غسل کے حکم میں آکر فرض ہو جائے جب ہم نے دیکھا تو جسم میں ایسی جگہ ناک اور منہ ہیں کیونکہ منہ جب کھل جائے تو یہ حنا ظاہر بدن کا حصہ ہے نیز اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں منہ میں پانی ڈالتا ہے اور حلق سے پانی باہر رہتا ہے تو روزہ نہیں ٹوٹتا معلوم ہوا یہ حکم ظاہر بدن ہے اور اگر منہ سے تھوک کو روزہ دار نگل لیتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکم منہ بدن کے باطن کا حصہ ہے۔ اسی طرح ناک کو اوپر کیا جائے تو اندر نظر آتا ہے یہ ظاہر بدن ہونے کی دلیل ہے اور جب نیچے رہے تو اندر کچھ نظر نہیں آتا یہ باطن کی علامت ہے اب آیت نے جس مبالغہ کو ذکر کیا ہے اس کا مقصد تو تب پورا ہوگا کہ جسم کے ظاہر سے آگے بڑھ کر اس کے اس حصہ کو بھی دھویا جائے جو ایک حیثیت سے باطن سمجھا جاتا ہے لہذا مضمضہ اور استنشاق کو الفاظ قرآن کے مطابق غسل میں فرض ہونا چاہیے یہ کتاب اللہ پر زیادت نہیں بلکہ آیت کا تقاضا ہے تاہم اس فرض کا منکر کافر نہیں بنے گا کیونکہ اس میں اجتہاد کو دخل ہے۔

احناف نے اس کے علاوہ اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ "تحت کل شعرة جنابة" کیونکہ ناک میں ایک بال نہیں سینکڑوں بال ہوتے ہیں اور جنسی تعلقات میں لمسوت قبلوت میں منہ کو بڑا دخل ہے تو مضمضہ و استنشاق ضروری ہے۔

نیز جماع میں حیوانیت کی صفت ہے شریعت کی نظر میں اس میں بہت قلت ہونی چاہیے اس لئے شریعت نے غسل میں شدت کی ہے تاکہ حیوانیت کم سے کم ہو، اس کا بھی تقاضا ہے کہ غسل میں مضمضہ اور استنشاق فرض ہو۔

چچا شیخ: اہل ظواہر اور حنابلہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ امر جب خالی من قرینہ ہو تو وہاں وجوب کے لئے آتا ہے یہاں تو عدم وجوب پر قرینہ صارفہ مانعہ موجود ہے کہ اس سے آیت پر زیادت یا لازم آتی ہے۔

الزامی جواب یہ کہ اگر "فلیستغسل" امر آیا ہے تو حدیث میں "مضض" بھی امر کا صیغہ ہے تو مضض کو کیوں فرض نہیں کیا؟ شوافع اور مالکیہ کو جواب یہ ہے کہ حدیث میں وضو والا مضض اور استنشاق مراد ہے غسل والا نہیں، یا سنن المرسلین سے ان کا طریقہ مراد ہے اور طریقہ فرض واجب اور سنت سب کو شامل ہے۔

۲۲ سفر المظفر ۱۰/۱۴۱ھ

مسئله مسح الرأس

اور حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ سر کا ردو عالم عَلَمُ الْعَالَمِ کس طرح وضو فرمایا کرتے تھے (یہ سن کر) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی منگوا لیا (جب پانی آ گیا تو) انہوں نے دونوں ہاتھوں پر (پانی) ڈالا اور انہیں (پینچوں تک) دو دو مرتبہ دھویا پھر کلی کی اور پانی ڈال کر ناک کو جھکاڑا تین تین مرتبہ اور پھر اپنا منہ تین مرتبہ دھویا پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دو دو مرتبہ دھوئے پھر دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا (اس طرح کہ) دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے تک لے گئے اور پیچھے سے آگے تک لائے یعنی انہوں نے اپنے سر کے اگلے جانب سے شروع کیا اور دونوں ہاتھوں کو گدی کی تک لے گئے پھر ان کو (پھیر کر) اسی جگہ واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا پھر دونوں پاؤں کو دھویا۔ (مالک، نسائی، ابوداؤد)۔

اور بخاری و مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم سے کہا گیا کہ جس طرح آنحضرت ﷺ وضو کرتے تھے اسی طرح آپ ہمارے سامنے وضو کیجئے چنانچہ عبداللہ بن زید نے (پانی کا) برتن منگوا لیا (جب پانی کا برتن آیا تو) انہوں نے اسے جھکایا اور اس سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں تین تین مرتبہ دھویا پھر ہاتھ برتن میں داخل کیا اور اس سے پانی نکالا پھر (اسی) ایک چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اس طرح انہوں نے تین مرتبہ کیا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ دھویا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر نکالا اور سر کا مسح (اس طرح) کیا کہ اپنے دونوں ہاتھ آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے اور پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا پھر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا یہی وضو تھا اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ (مسح کے لئے) اپنے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے یعنی اپنے سر کے اگلے حصہ سے (مسح) شروع کیا اور (ہاتھوں کو) گدی کی طرف لے گئے پھر گدی کی طرف سے وہیں لے آئے جہاں سے (مسح) شروع کیا تھا اور پھر اپنے پاؤں کو دھویا۔ صحیحین کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ "کلی کی، ناک میں پانی دیا اور ناک تین مرتبہ جھکاڑی، تین چلوؤں سے" ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "پس کلی کی اور ایک ہی کلی سے ناک میں پانی ڈالا اس طرح تین مرتبہ کیا" بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پس سر کا مسح کیا (اس طرح کہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پیچھے سے آگے کی طرف لے آئے اور یہ ایک مرتبہ کیا پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا"۔

بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں "بس کلی کی اور ناک جھاڑی تین مرتبہ صرف ایک چلو۔"۔
توضیح: ثم مسح راسه بیدیه: سر کے مسح کا حکم قرآن کریم سے ثابت ہے اس کی فرضیت میں کسی کو اختلاف نہیں ہاں مقدار میں اختلاف ہے کہ کتنا حصہ فرض ہے اس میں چاروں ائمہ کا اختلاف اس طرح ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پورے سر کا مسح ایک بار ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر حصہ سر کا مسح فرض ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کوئی خاص مقدار نہیں بلکہ "اخذنی ما یطلق علیہ المسح" فرض ہے خواہ وہ بعض اشعریوں نہ ہوں ہاں ان کے ہاں مسح میں تثلیث سنت ہے یعنی تین بار تکرار سنت ہے۔

احناف کے ہاں مقدار ناصیہ فرض ہے جو ربع دأس چار انگلیوں کے اندازہ پر ہے استیعاب سنت ہے اور مسح میں تکرار نہیں ہے مسح کی تعریف اس طرح ہے "إمرار اليد المبتلة العضو" یعنی پانی سے تر ہاتھ کو کسی عضو پر پھیرنے کا نام مسح ہے۔

دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت "وامسحوا برؤسکم" ہے کہ یہاں بازائد ہے تو "وامسحوا رؤسکم" سے پورے سر کا مسح فرض ہو گیا یہاں پر "یا" اسی طرح زائد ہے جس طرح تیمم کی آیت "وامسحوا بوجوهکم" میں زائد ہے وہاں پورا چہرہ مراد ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کئی روایات منقول ہیں مگر ان سے مشہور یہی ہے کہ وہ اکثر سر کے مسح کو فرض کہتے ہیں ان کی دلیل بھی امام مالک رحمہ اللہ کی طرح یہی آیت ہے لیکن وہ "للا کث حکم الكل" کے قاعدے کے مطابق اکثر سر کے مسح کو فرض کہتے ہیں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں مطلق مسح کا ذکر ہے اور ایک فرد پر عمل کرنے سے مطلق پر عمل ہو جاتا ہے لہذا چند بالوں پر مسح کرنے سے مطلق کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل بھی یہی آیت ہے جس میں "وامسحوا برؤسکم" ہے طرز استدلال کا ایک طریقہ اس طرح ہے کہ جب کسی فعل کے بعد اس کا مفعول آتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ فعل پورے مفعول پہ پرواق ہو جائے بلکہ فعل اگر مفعول پہ کے بعض حصہ پر واقع ہو جائے تو مقصود پورا ہو جاتا ہے مثلاً "اضرب زیڈاً" میں یہ مراد نہیں کہ زیڈ کے ہر جز کو مارا جائے بلکہ زیڈ کے کسی حصہ پر اگر ضرب واقع ہو گئی تو مقصود پورا ہو جائے گا اور امر کا امثال ہو جائے گا اسی طرح "وامسحوا" میں امر کا صیغہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ سر کے کسی حصہ پر مسح ہو جائے خواہ وہ قلیل کیوں نہ ہو تو مسح کے اعتبار

سے یہ آیت مجمل ہو گئی کہ کتنا حصہ مراد ہے اور مجمل کے لئے شارع کی طرف سے تفسیر چاہیے چنانچہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی تفسیر ہو گئی جس میں مقدار ناصیہ کو متعین کیا گیا ہے الفاظ یہ ہیں "ممسح بनावصیتہ" ناصیہ کی مقدار اور اندازہ ایک چوتھائی سر ہے یا چار انگلیوں کے برابر حصہ اور اتنا ہی فرض ہے۔

اصول کی کتابوں میں طرز استدلال اس طرح بھی لکھا ہے کہ "وامسحوا بروؤسکم" میں باآلہ کے لئے ہے جو ذی آلہ اور محل پر داخل ہے جس سے استیعاب محل مقصود نہیں ہوتا ہے مثلاً محاورہ عرب ہے "مسحت الجدار بالید" سے کل جدار کا مسح مراد ہوتا ہے اور بعض حصہ ہاتھ کا مراد ہوتا ہے اور "مسحت بالجدار" میں بعض جدار کا مسح مراد ہوتا ہے کیونکہ یہاں "ہا" آلہ پر داخل نہیں بلکہ محل پر داخل ہے گویا "آلہ یا ذی الآلہ" جس پر بھی داخل ہوگا اس سے بعض مدخول مراد لیا جائے گا اور آیت میں "ہا" ذی الآلہ اور محل پر داخل ہے لہذا بعض محس مراد ہے اور وہ مجمل حصہ ہے جس کی تفسیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہو گئی ہے جو ناصیہ ہے جس کا اندازہ ایک چوتھائی سر ہے اور یہی فرض ہے۔

پھر رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو جواب یہ کہ "ہا" کو زائد مراد لینا خلاف اصل ہے جب "ہا" موجود ہے تو اس کو کیوں زائد کہتے ہیں باقی تیمم کی آیت پر مسح کی آیت کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے اور وضو میں پورا چہرہ فرض ہے۔ لہذا قائم مقام اور نائب میں بھی پورا چہرہ مراد لینا ضروری ہے تاکہ اصل اور نائب میں اختلاف نہ ہو۔

رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہمیشہ استیعاب ثابت نہیں ہے۔ یہ جواب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہے اور ان کو دوسرا جواب یہ ہے کہ "ملا کثر حکم الكل" تب ہوتا جب "ہا" موجود نہ ہوتا جب آیا ہے تو بعض حصہ مراد لینا ضروری ہے جو مجمل ہے اور اس کی تفسیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

شوافع کو جواب یہ ہے کہ آیت مطلق نہیں ہے کیونکہ مطلق اور مقید کا مسئلہ مفادیم اور افراد میں ہوتا ہے مقادیر میں نہیں ہوتا اور یہاں مقدار کی بحث ہے۔

لہذا آیت مطلق نہیں بلکہ مجمل ہے جس کی تفسیر کی ضرورت ہے اور وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نیز اگر شوافع کا مسلک لیا جائے تو پھر آیت میں سر کے مسح کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ وضو کرنے کے دوران ممکن نہیں کہ سینکڑوں بالوں پر مسح نہ آئے تو اس قسم کا مسح تو خود بخود حاصل ہو جاتا ہے پھر حکم قرآنی کی کیا ضرورت تھی بہر حال تمام بحث کے بعد احتیاط امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں ہے کہ پورے سر کا مسح کیا جائے تاکہ اختلاف ختم ہو جائے۔

مسح میں تکرار کا حکم:

اب یہ مسئلہ رہ گیا کہ سر کا مسح ایک بار کرنا ہے یا تین بار کرنا ہے اس میں تثلیث و تکرار مسنون ہے یا تو حید و عدم تکرار مسنون ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ ایک بار ہے اور عدم تکرار مسنون ہے اور شوافع کے نزدیک تثلیث اور تکرار مسنون ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض روایات سے استدلال کیا ہے جن میں تین بار مسح کا ذکر آیا ہے اور ابو داؤد شریف کے ص ۱۴ پر یہ حدیث مذکور ہے۔

شوافع کی دوسری دلیل مسح کو اعضاء مغسولہ پر قیاس کرنا ہے کہ جب اعضاء مغسولہ میں تین بار غسل ہے اور تکرار ہے تو مسح میں بھی تکرار ہونا چاہیے۔

جمہور کے دلائل تو بے شمار احادیث ہیں جن میں دیگر اعضاء کے تین بار دھونے کا ذکر ہے اور مسح کرنے میں ایک بار کا ذکر آیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی احادیث میں جہاں بھی ذکر آیا ہے وہاں تکرار نہیں اس لئے ابو داؤد نے یہ فیصلہ سنایا ہے:

”احادیث عثمان الصحاح کلھا تدل علی مسح الرأس انہا واحدۃ۔“

اس سے شوافع کی دلیل کا جواب ہو گیا کہ جہاں تثلیث کا ذکر آیا ہے وہ روایت قابل استدلال نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ جو تکرار کسی نے دیکھا ہے وہ مسح کے بعد سر کے بال بنانے کے لئے ہاتھ پھیرنا تھا مسح کا تکرار نہیں تھا دیکھنے والے نے اس کو تکرار سمجھا۔ تیسرا جواب یہ کہ اگر مسح میں تکرار کر دے تو یہ غسل بن جائے گا حالانکہ شریعت نے سر کے لئے مسح مقرر کیا ہے تاکہ اس میں تخفیف ہو کیونکہ سر جسم کا بادشاہ ہے اور یہ ہلد العلماء ہے۔ یعنی جتنے اسباب علم ہیں وہ سب سر میں ہیں جیسے قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوت شامہ، قوت ذائقہ اور قوت لامسہ یہ سب سر میں ہیں لہذا سر کا اعزاز یہی ہے کہ اس پر تخفیف ساج کیا جائے اب اگر تثلیث آجائے تو وہ غسل بن جائے گا جو اس تخفیف اور اعزاز کے منافی ہے۔

باقی اگر آپ سر کو دیگر اعضاء کے دھونے پر قیاس کرتے ہیں تو یہ قیاس مع الفارق ہے اور اس سے اوپر والی حکمت بھی فوت ہو جاتی ہے اور اگر سر کے مسح کو دیگر مسحوں کے مقایس کرے ہو مثلاً جیبوۃ اور زخم کی پٹی وغیرہ پر تو یہ قیاس بھی تکرار کے لئے صحیح نہیں ہے کیونکہ وہاں ایک بار مسح ہوتا ہے تکرار نہیں ہوتی ہے۔ فقہاء نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ ایک عضو میں مسح اور غسل دونوں جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔

فاقبل بہما وادبر: اس جملہ کا لفظ ”ادبر“ جس طرح ہے کہ سر کے پیچھے کی طرف سے آگے کی طرف مسح کرنے میں ہاتھ لے آئے اور پھر آگے کی طرف سے پیچھے کی طرف لے گئے۔ اس ترجمہ کے مطابق بعض سلف نے عمل بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ سر کے پیچھے کی طرف سے مسح شروع کیا جائے لیکن احناف اور جمہور فقہاء اس کے خلاف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سر کے

اگلے حصہ سے مسح شروع کیا جائے گا اور پچھلے حصہ پر جا کر ختم ہوگا اس مفہوم کو واضح کرنے کیلئے اس جملہ کی تفسیر ”مقدمہ“ سے کی گئی ہے تاکہ خلاف واقع مفہوم میں کوئی نہ پڑ جائے دیسے جن حضرات نے ظاہر الفاظ کا ترجمہ لیا ہے وہ ترجمہ عربیت اور محاورہ عرب کے خلاف ہے کیونکہ محاورہ میں عرب ہمیشہ اقبال اور لفظ اقبل کو مقدم ذکر کرتے ہیں۔ جیسے امر القیس نے اپنے گھوڑے کی تعریف میں اقبال کے لفظ کو پہلے ذکر کیا ہے:

مکر مفر مقبل مدبر معا کجل بود صخر حطه السیل من عل

توفصل میں اربار یعنی پیچھے کی طرف لے جانا مقدم ہوتا ہے اور قول میں اقبال یعنی آگے کی طرف لانا مقدم ہوتا ہے اس تشریح سے اس عبارت پر وہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ یہ تفسیر اپنے مفسر کے خلاف ہے اعتراض اس لئے ختم ہوا کہ محاورہ کو اگر دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالکل اپنے مفسر کے موافق ہے۔

گردن کا مسح:

چونکہ سر کے مسح کی بحث چل رہی ہے تو یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ مسح رقبہ یعنی گردن کے مسح کی شریعت میں کیا حیثیت ہے فقہاء کرام کا اس میں اختلاف ہے احناف میں سے بعض حضرات نے اس کو سنت اور بعض نے مستحب لکھا ہے قاضی خان نے لکھا ہے کہ گردن کا مسح نہ سنت ہے اور نہ مستحب ہے ہاں بعض نے اس کو سنت کہا ہے اور جب فقہاء کے اقوال میں اختلاف ہو گیا تو اب نہ کرنے سے مسح کرنا بہتر ہوگا۔ (قاضی خان ص ۱۷)

علامہ نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو بدعت کہا ہے علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے لیکن احناف کے بعض علماء اور شوافع کے بھی بہت سارے علماء گردن کے مسح کو سنت یا مستحب کہتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحب غیر مقلد نے ”بدور الاحلہ ص ۲۸“ پر لکھا ہے کہ مسح رقبہ کی حدیث کو غیر صحیح کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ مسح رقبہ کی روایات تعدد طرق کی وجہ سے استدلال کے قابل ہیں احناف کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حلقوم کا مسح بدعت ہے اور گردن کا مسح جائز ہے (بہر حال میں نے بڑے علماء کو وضو کے دوران مسح کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ (راہم)

مضمضہ کی کیفیت:

من کف واحدة: حدیث مبارک کے اس لفظ سے مضمضہ اور استنشاق کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت اور طرز عمل میں احناف اور شوافع نے اپنے اپنے انداز سے الگ الگ طریقہ کو افضل اور اولیٰ قرار دیا ہے اس میں کل پانچ طریقے ہیں احناف نے پانچوں طریقہ کو افضل قرار دیا ہے اور شوافع نے چوتھے طریقہ کو پسندیدہ قرار دیا

ہے جائز سب طریقے ہیں۔

① اول طریقہ یہ کہ ایک چلو پانی ہاتھ میں لے کر ایک ساتھ منہ اور ناک میں تین بار پانی ڈالا جائے یعنی ایک ہی چلو کا کچھ پانی منہ میں اور کچھ ناک میں تین بار ڈالا جائے۔

② دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی چلو پانی ہے مگر پہلے منہ میں اس کا کچھ حصہ تین بار ڈالا جائے اور پھر باقی حصہ ناک میں تین بار ڈالا جائے۔

③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک چلو سے تین بار مضمضہ کیا جائے پھر دوسرے چلو سے تین بار استنشاق کیا جائے۔

④ چوتھا طریقہ جو شوافع کے ہاں پسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک چلو سے اولاً مضمضہ اور استنشاق کیا جائے پھر دوسرا چلو لے کر مضمضہ اور استنشاق کرے اور پھر تیسرا چلو لے کر مضمضہ اور استنشاق کرے۔

⑤ پانچواں طریقہ یہ ہے کہ الگ الگ تین چلو سے مضمضہ کیا جائے پھر الگ الگ تین چلو لے کر استنشاق کیا جائے گویا چھ چلوؤں سے دونوں کا کام ہو جائے گا یہ طریقہ احناف کے ہاں پسندیدہ ہے۔

اس تفصیل کو آپ مختصر طور پر اس طرح سمجھ لیں کہ مضمضہ کی کیفیت میں چار قول ہیں: ① غرقہ ② غرقین ③ ثلاث غرقات ④ ست غرقات۔ یہ چوتھا قول احناف کے ہاں افضل ہے اور تیسرا قول شوافع کے ہاں افضل ہے۔

شوافع حضرات نے زیر بحث حدیث "من كف واحدة" کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اس میں غرقات میں وصل کا بیان ہے تو چوتھا طریقہ اس کا بہترین مصداق ہے۔

انہما احناف نے کئی روایات سے استدلال کیا ہے لیکن ترمذی کی روایت سب سے زیادہ واضح ہے اور وہ ص ۱۲ پر عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: لے

"قال رأيت النبي ﷺ مضض واستنشق من كف واحدة فعل ذلك ثلاثاً"۔ (رواہ الترمذی)

ادھر ابو داؤد میں بھی یہ الفاظ ہیں صحابی فرماتے ہیں: "فرأيتہ يفصل بين المضضة والاستنشق" (ص ۱۱) انہما احناف "من كف واحدة" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ کہ مضمضہ اور استنشاق میں ایک ہاتھ کو استعمال میں لاؤ ایک ہاتھ کے چلو سے کام چلاؤ چہرہ کی طرح دونوں ہاتھوں کو استعمال نہ کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک چلو سے مضمضہ اور استنشاق بیان جواز کے لئے ہے تو جائز ہم بھی مانتے ہیں اور شوافع کے ہاں فصل بھی جائز ہے تو کوئی اختلاف نہیں اولیٰ غیر اولیٰ کا مسئلہ ہے نیز قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ وضو کے تمام اعضاء کے لئے الگ الگ پانی لے کر تین بار استعمال کیا جاتا ہے تو ناک اور منہ کا بھی اسی طرح حکم ہونا چاہیے نیز زیر نظر روایت میں بھی ثلاث غرقات کے الفاظ موجود ہیں جو احناف کی واضح دلیل ہے۔

اولیٰ درجہ کا وضو

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ تَوَضَّأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً كَمَرَّةٍ نَزِدَ عَلَى هَذَا. (رواه البخاری)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک ایک مرتبہ وضو کیا (یعنی تمام اعضاء وضو کو صرف ایک ایک مرتبہ دھویا) اور اس پر زیادہ نہیں کیا“ (بخاری)

توضیح: سب سے افضل اور اعلیٰ وضو تو وہی ہے جس میں تین بار پانی ہر عضو میں استعمال کیا جائے اگر پانی کم ہے یا بدن کی حالت یا مکان و مقام یا بیان جواز کی حالت کا تقاضا اس سے کم کا ہو تو پھر دو دو بار پانی استعمال کرنا جائز ہے اور اگر حالات اس قسم کے ہیں کہ ایک بار سے زیادہ گنجائش نہیں تو جواز کے طور پر ایک بار بھی کافی ہے وضو ہو جائے گا آنے والی حدیثوں میں یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

متوسط درجہ کا وضو

﴿۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ. (رواه البخاری)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے دو دو مرتبہ وضو کیا (یعنی اعضاء وضو کو دو دو بار دھویا)۔ (بخاری)

اعلیٰ درجہ کا وضو

﴿۵﴾ وَعَنْ عُمَانَ أَنَّهُ تَوَضَّأَ بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ أَلَا أُرِيكُمْ وُضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا. (رواه مسلم)

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے مقامِ مقاعد میں وضو کیا اور کہا کہ کیا تمہیں آنحضرت ﷺ کا وضو نہ دکھلاؤں چنانچہ انہوں نے تین تین مرتبہ وضو کیا (یعنی انہوں نے اعضاء وضو کو تین تین بار دھو کر بتایا کہ آنحضرت ﷺ اس طرح وضو فرماتے تھے)۔ (مسلم)

مقاعد: مسجد نبوی سے باہر باتوں کے لئے اور بیٹھنے کے لئے ایک جگہ تھی مقاعد اس کا نام تھا یہ عرفاً روق رضی اللہ عنہ نے بنائی تھی تاکہ لوگ مسجد میں باتیں نہ کریں۔

مسئله غسل الرجلین

﴿وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجَعْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ مَكَّةَ إِلَى الْمَدِينَةِ حَتَّى إِذَا كُنَّا بِنَاءَ بِالْقَرْيَةِ تَعَجَّلَ قَوْمُهُ عِنْدَ الْعَصْرِ فَتَوَضَّؤُوا وَهُمْ عَجَالٌ فَأَتَيْنَا إِلَيْهِمْ وَأَغْقَابُهُمْ تَلَوُّحٌ لَمْ يَمْسَسْهَا الْمَاءُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَيْلٌ لِلْأَغْقَابِ مِنَ النَّارِ أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ. (رواه مسلم)

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا کہ ہم سرکارِ دو عالم ﷺ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کو واپس لوٹے یہاں تک کہ جس وقت ہم پانی پر پہنچے جو راستہ میں تھا تو کچھ لوگوں نے نماز عصر کے لئے وضو کرنے میں جلدی کی اور وہ لوگ بہت جلدی کرنے والے تھے چنانچہ جب ہم ان لوگوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کی ایزیاں چمک رہی تھیں (یعنی خشک رہ گئی تھیں کیونکہ) ان تک پانی نہیں پہنچا تھا (ان کی خشک ایزیاں کو دیکھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا ویل (خرابی) ہے ایزیاں کے لئے آگ ہے، وضو کو پورا کرو۔ (مسلم)

توضیح: ویل للآغقاب من النار: تمام اہل سنت تمام صحابہ و تابعین اور تمام فقہاء و صلحا اور علماء سلفا و خلفا اس پر متفق ہیں کہ وظیفہٴ رجلین وضو میں غسل ہے اور عدم تحفیف کی حالت میں پاؤں پر مسح کرنا بالکل جائز نہیں ہے شیعہ امامیہ اور روافض نے اس مسئلہ میں پوری امت کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ وظیفہٴ رجلین صرف مسح ہے غسل نہیں بعض نے یہ مسلک ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے لیکن ابن جریر طبری دو ہیں ایک سنی ہے ایک شیعہ ہے یہاں سنی مراد نہیں ہے اور اگر ابن جریر سنی بھی ہو تو ان کا کلام اس مسئلہ میں صریح نہیں صرف کلام میں وہم ہے۔

دلائل شیعہ:

شیعہ روافض نے آیت الوضو میں "وَأَرْجُلُكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ" کی جردالی قرأت سے استدلال کیا ہے کہ جرجی صورت میں یہ "رؤسکم" پر عطف ہے یعنی سر پر مسح کرو اور پاؤں پر بھی مسح کرو شیعہ نے کہا کہ "أَرْجُلُكُمْ" میں نصب والی قرأت بزع الخافض ہے یعنی "أَرْجُلُكُمْ" نصب کی صورت میں درحقیقت "ہأَرْجُلُكُمْ" تھا باکو ہٹانے کی وجہ سے نصب آگیا۔

شیعہ کی دوسری دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہیں "لا يَدُلُّ كَلَامُ اللَّهِ إِلَّا بِالْمَسْحِ"

وَأَبَى الْعَاسَ إِلَّا الْغَسْلَ" بعض نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "أَمَرَ اللَّهُ بِالْمَسْحِ وَأَبَى الْعَاسَ إِلَّا الْغَسْلَ" اسی طرح شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ اقوال بھی پیش کرتے ہیں۔

اہل السنۃ کے دلائل:

اہل سنت و الجماعہ کی دلیل بھی آیت الوضو ہے لیکن وہ "وَأَرَجَلُكُمْ" میں نصب کی قرأت کو لیتے ہیں جو "فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ" پر عطف ہے جو دھونے پر واضح دلیل ہے جمہور کی دوسری دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں پاؤں کی ایڑی خشک رہنے پر شدید وعید آئی ہے جو معلوم ہوا پاؤں کا وظیفہ مکمل طور پر دھونا ہے۔

جمہور کی تیسری دلیل حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جو درحقیقت آیت الوضو کی تفسیر ہے حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے وضو کے متعلق پوچھا آپ نے جواب کے ضمن میں فرمایا:

"ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ كَمَا أَمَرَ اللَّهُ تَعَالَى"۔ (رواہ ابن عمر و ابو عوانہ)

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اللہ کا حکم "وَأَرَجَلُكُمْ" سے غسل اور دھونا مراد ہے جمہور نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوری زندگی میں کبھی ننگے پاؤں پر مسح ثابت نہیں ہے نہ صحابہ کرام نے ایسا کیا ہے بلکہ سب کا عمل غسل پر تھا گویا ایسا اجماع ہے جس میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

جوابات:

جمہور نے شیعہ شنیعہ کے دلائل کے کئی جوابات دیئے ہیں۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ آیت میں جو جر کی قرأت آئی ہے یہ جر جوار ہے یعنی ایک کلمہ کے پڑوس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کا اعراب دوسرے کلمہ کو دیا جاتا ہے تو آیت میں ہو ووسکم میں جر تھا تو و ا ر ج لکم کو بھی اس پڑوس کی وجہ سے مجرور پڑھا گیا یہ لفظوں کے مسح کے ساتھ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے یہ مغسول کے ساتھ ہے کلام عرب میں جر جوار کا اعتبار ہے چنانچہ عبدالرسول لکھتے ہیں:

گاه اسے میشود مجرور از بہر جوار ہم از یں جائز عامہ جر ارجل شد روا

یعنی کبھی کبھی کوئی اسم جر جوار کی وجہ سے مجرور ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عام علماء کے نزدیک و ا ر ج لکم میں جر آ گیا ہے۔ جر جوار قرآن عظیم سے بھی ثابت ہے جیسے "عَذَابُ يَوْمٍ آئِينَ" الیہم عذاب کی مفت ہے جو مرفوع ہونا چاہیے تھا مگر یومہ کے پڑوس کی وجہ سے مجرور ہو گیا ہے۔

اور جیسے "عَذَابُ يَوْمٍ مُّجِيطٍ" ہے کہ محیط جر جوار کی وجہ سے مجرور ہے نیز "يُخَوِّضُ خَيْرُ" "مَاءٌ شَرِيفٌ" اسی طرح حدیث میں "مَنْ مَلَكَ ذَا رَجْعٍ مَخْرُوجٍ" یہاں محرم جر جوار کی وجہ سے مجرور ہے۔ عرب اور عربیت

کا مشہور شاعر امر القیس کہتا ہے:

کُنْ ثَبِيرٌ فِي عَرَانِينٍ وَ بِلَهٍ كَبِيرٍ اِنَاسٍ فِي بَجَادٍ مَزْمَلٍ

یہاں "مزمل" کبیر اناس کی صفت ہے اسے مرفوع ہونا چاہیے مگر "بجَاد" کے پڑوس کی وجہ سے مجرور ہو گیا ہے۔
عبدالرسول جو مشہور نحوی ہیں انہوں نے یہاں اعتراض کیا ہے کہ جر جو اسلسلہ معطوفات میں ممنوع ہے اور یہاں آیت میں وارجلکم معطوف ہے۔

اس کا جواب روح المعانی نے دیا ہے کہ عبدالرسول کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ محاورہ عرب میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں خود قرآن کریم میں "و حور عین" سلسلہ معطوفات میں جر جو اس کے ساتھ آیا ہے پورا کلام اس طرح ہے ولحم طیر مما یشتہون و حور عین (سورہ واقعہ آیت ۲۲) لہٰذا یہاں پر کسائی اور حمزہ اور عاصم کی قرأت میں حور عین میں "حور" مجرور ہے جر جو اس کے ساتھ مجرور ہے اور اس کا پڑوسی لحم کا کلمہ ہے جو پہلے سے مجرور چلا آ رہا ہے باقی قرأتوں میں یہ مرفوع ہے۔

جہور امت کی طرف سے شیعہ کو دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عبدالرسول کے اس اشکال کی وجہ سے ابن حادب رحمہ اللہ نے ایک اور راستہ اختیار کیا ہے آپ نے لکھا ہے کہ "وارجلکم" اصل میں فعل مخذوف کی وجہ سے منصوب ہے اصل عبارت اس طرح ہے: "وامسحوا برؤسکم واغسلوا ارجلکم"۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ از قبیل علفہا تبنا و ماء باردا ہے کہ موجودہ عامل کے علاوہ اصل عامل مخذوف ہے کیونکہ موجودہ عامل کے ساتھ معنی صحیح نہیں رہتا یعنی میں نے اونٹنی کو چارہ اور ٹھنڈا پانی کھلایا حالانکہ پانی پلایا جاتا ہے۔ یہ نہیں جاتا لہٰذا معنی کو درست کرنے کے لئے مناسب فعل کو مخذوف ماننا پڑے گا اور وہ سقیتھا ہے یعنی سقیتھا ماء باردا ایک اور مثال ہے:

"وزجن الحواجب والعیونا":

اذا ما الغانیات برزن یوما وزجن الحواجب والعیونا

"ای واکتھلن العیونا" یعنی جب گیت گانے والی عورتیں ایک دن نکل آئیں تو انہوں نے ابرو کے بالوں کو استرہ سے بنایا اور آنکھوں میں سرمہ ڈالا تو یہاں معنی درست کرنے کے لئے واکتھلن فعل مخذوف ہے کیونکہ آنکھوں میں استرہ نہیں چلتا بلکہ سرمہ ڈالا جاتا ہے اسی طرح شاعر کا یہ شعر ہے:

یا لیت بعلک فی الوحی متقلدا سیفا ورما

اے کاش اگر تیرا شوہر لڑائی کے دن تلوار و نیزہ کو گلے میں باندھ کر آتا۔

یہاں "رغماً" سے پہلے "حاملہ" محذوف ہے تاکہ مطلب درست ہو جائے یعنی تلواریں گلے میں اور نیزہ کندھے پر اٹھا کر آئے تو جس طرح ان مقامات میں معمول کے لئے مناسب فعل محذوف ماننا پڑا ہے اسی طرح وادرجلکھ کے لئے واغسلوا کا فعل محذوف ماننا پڑے گا اور پہلا اغسلوا اس پر دلالت بھی کرتا ہے واغسلوا کا فعل اس لئے محذوف ماننا پڑے گا کہ "الی الکعبین" کا جو لفظ قرآن کی آیت میں موجود ہے یہ قطعاً مسح کو قبول نہیں کرتا ہے کیونکہ مسح میں کسی کے ہاں ٹخنوں تک مسح کرنا لازم نہیں ہے تو یہ الفاظ بیاہنگ دہل کہہ رہے ہیں کہ یہاں پاؤں کا دھونا مراد ہے مسح مراد نہیں ہے واغسلوا محذوف ماننا پڑے گا نیز فعل رسول اور فعل صحابہ اور تمام احادیث بھی کہہ رہی ہیں کہ یہاں پاؤں کا مسح مراد نہیں ہے ان وجوہات کی بناء پر لامحالہ قرأت جزم میں تاویل کرنا ضروری ہے۔

جمہور امت نے قیصر اجواب یہ دیا ہے کہ نصب کی صورت میں "واغسلوا" فعل مقدر ہے اور جرح کی صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ قرآن نے حالت تحفیف کی صورت بیان کی ہے یعنی اگر موزہ پہنا ہوا ہو تو پھر مسح کافی ہے لیکن الی الکعبین نے جو تحدید کی ہے اس کے پیش نظر یہ جواب کمزور ہے کیونکہ مسح میں کعبین تک کی کوئی قید نہیں جبکہ قرآن مقید ہے معلوم ہوا مسح کی صورت نہیں۔

جواب: اب رو کیا یہ کہ شیعہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل کی ہے تو اہل جرح و تعدیل اور محدثین کا کہنا ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے جس کو شیعہ نے گھڑ رکھا ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں یا صحیح احادیث کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں ہے باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہیں یا وہ حالت تحفیف یعنی موزہ پہننے کی حالت پر محمول ہیں یا وضو علی الوضو کی صورت میں ہے۔

شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں بحوالہ طحاوی پاؤں کے مسح اور غسل کے متعلق لکھا ہے کہ آیت میں نصب اور جرد دونوں قرأتیں ہیں اور مستند بھی ہیں اور دونوں میں تعارض ہے جب اس طرح تعارض ہوتا ہے تو دونوں کے حکم کو ساقط کر کے حدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور احادیث مشہورہ کثیرہ نے بھی غسل و جلیون کا حکم دیا ہے لہذا غسل متعین ہے مسح ناجائز ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مسح کا حکم اگر محمد و زمانہ کے لئے تھا بھی تو وہ پھر منسوخ ہو گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ غسل و جلیون کو اللہ تعالیٰ نے مسح کے ساتھ رکھا کہ پاؤں دھوئے وقت پانی میں اسراف سے بچنے کا احساس دلایا جائے کیونکہ لوگ پاؤں پر زیادہ پانی ڈالتے ہیں۔

بہر حال احادیث صحیحہ صریحہ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے پھر نبی اکرم رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام کا دائمی اجماعی عمل موجود ہے اور پھر تابعین فقہاء کرام اور امت محمدیہ کا یہ متفقہ موقف موجود ہے اس کے باوجود شیعہ روافض پاؤں پر مسح کرنے پر تلے ہوئے

ہیں یہ ان کی بڑی گمراہی ہے۔ اور اس ہٹ دھرمی سے ان کی وہ نمازیں بھی بیکار ہو گئیں جو وہ لوگ بھی کبھار پڑھتے ہیں۔

ویل: یہ کلمہ ہلاکت کی بددعا کے لئے آتا ہے بعض نے کہا کہ دوزخ میں ایک خاص وادی کا نام ہے۔

الاعقاب: یہ عقب کی جمع ہے ایڑی کو کہتے ہیں یہاں ایڑی کو امر واقعہ کی وجہ سے خاص کیا کہ ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں یا اس لئے کہ عام طور پر ایڑی ہی خشک رہ جاتی ہے اس کا الف لام استغراق عرفی کے لئے ہے یعنی دنیا بھر کی ایڑیوں کے لئے بددعا نہیں بلکہ جو ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں ان کے لئے بددعا ہے۔

یہاں مضاف محذوف ہے یعنی خشک ایڑیوں کے مالک کیلئے ویل اور سختی و مشقت اور ہلاکت ہے۔

۱۰۶۰

مسئله مسح العمامة

﴿وَعَنِ الْمُؤَيَّزَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَعَلَى الْخُفَّيْنِ﴾ (رواه مسلم)

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے وضو کیا چنانچہ آپ نے اپنی پیشانی کے بالوں کے اوپر اور پگڑی پر اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم)

توضیح: وعلى العمامة: اس روایت میں مسح على الناصية کے ساتھ مسح على العمامة کا ذکر بھی آگیا ہے اس وجہ سے فقہاء کرام کے درمیان مسح على العمامة کے مسئلہ میں اختلاف آگیا۔
فقہاء کرام کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ امام اوزاعی رحمہ اللہ داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک عمامہ پر مسح جائز ہے اس سے سر کے مسح کا فرض پورا ہو جاتا ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ پگڑی طہارت پر پہنی ہو۔ دوسری شرط یہ کہ عمامہ مُحَنَّكٌ ہو یعنی ٹھوڑی کے نیچے پلینا گیا ہو اور پورے سر پر حاوی اور محیط ہو جس طرح موزہ کے لئے پاؤں پر محیط ہونا ضروری ہے امام مالک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ یعنی جمہور کے نزدیک مسح على العمامة جائز نہیں ہے اس سے فرض پورا نہیں ہوگا۔

ولذلك:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل ظواہر نے زیر بحث مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں عمامہ پر مسح کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ سنن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال

کیا ہے جس میں عمامہ کا ذکر ہے۔

ان حضرات نے علی الخفصین پر قیاس بھی کیا ہے کہ جب پاؤں کے بجائے سوزہ پر مسح جائز ہے تو سر کے بجائے عمامہ پر بھی مسح جائز ہے دونوں کا حکم ایک جیسا ہونا چاہیے۔ ۱۔

جمہور کی پہلی دلیل تو قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں "وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ" کا حکم ہے کہ سر پر مسح کرو اور سر غیر ہے اور پگڑی غیر ہے پگڑی پر مسح کرنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سر پر مسح کیا اللہ تعالیٰ کا حکم سر پر مسح کرنے کا ہے پگڑی پر نہیں جمہور کی دوسری دلیل دو صحیح اور صریح احادیث ہیں جو تقریباً ۸۰ صحابہ کرام سے ثابت ہیں جن میں سر کے مسح کا ذکر موجود ہے اور عمامہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جمہور نے مسح علی العمامۃ کی حدیث کا کئی طریقوں سے جواب دیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

جواب ۱۔ کتاب اللہ کی آیت نص قطعی ہے اور مسح علی العمامہ کی روایات اخبار آحاد ہیں لہذا ہم نہ آیت الوضو میں ان احادیث محتملہ کی وجہ سے تخصیص کر سکتے ہیں نہ آیت میں تقید کر سکتے ہیں اور نہ اس میں تاویل کر سکتے ہیں۔

نیز مسح راس کے مسئلے میں اسی (۸۰) صحابہ کرام کی جو روایات ہیں نہ ہم ان کو چھوڑ سکتے ہیں تو آیت کی موجودگی میں اور صحیح صریح کثیر احادیث کی موجودگی میں ہم مسح عمامہ کی اخبار آحاد وغرائب اور محتمل و مضطرب روایات کو کیسے لے سکتے ہیں۔

مسح عمامہ کی روایات میں ایک احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مقدار ناصیہ پر مسح کرنے کے بعد پگڑی پر مسح کیا ہو اور بعض روایات میں اس کا ذکر ملتا ہے تو صرف عمامہ پر مسح نہیں تھا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ مسح اس قاع اور نرم کپڑے پر تھا جو آنحضرت ﷺ پگڑی کے نیچے استعمال فرماتے تھے اس قاع کو عمامہ سے یاد کیا گیا اور قاع باریک ہوتا ہے تو سر پر مسح ہو جاتا ہے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اصل مسح تو سر پر کیا تھا پھر سر پر عمامہ رکھنے کے بعد اس پر ہاتھ پھیرا تا کہ عمامہ کو درست فرمالیں اسی کو دیکھنے والے نے عمامہ پر مسح سمجھ کر بیان کیا۔ چوتھا احتمال یہ ہو سکتا ہے کہ یہ وضو علی الوضو کی صورت میں ہو اور وہاں توسع سر کی ضرورت بھی نہیں لہذا اگر عمامہ پر مسح کیا تو کیا ہوا؟۔ پانچواں احتمال یہ بھی ہے کہ مسح راس قصدی طور پر تھا اور مسح عمامہ بھی طور پر تھا۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسح عمامہ کا حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ شیخ ابو عمرو نے تمہید میں لکھا ہے کہ مسح عمامہ کی ساری روایات معلول ہیں۔ عام علماء فرماتے ہیں کہ مسح عمامہ کی روایات اتنی قوی نہیں جو دیگر صحیح احادیث کا مقابلہ کر سکیں جس پر مسح کا حکم موجود ہے۔

﴿۸﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ فِي ظُهُورِهِ وَتَرَجَّلِهِ وَتَنَقُّلِهِ. (مُلَقَّطٌ عَنْهُ) ۷

ترجمہ: اور حضرت عاکشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ حتی الامکان اپنے تمام کاموں کو سیدھے ہاتھ سے شروع کرنا محبوب رکھتے تھے (مثلاً) اپنی طہارت میں، اپنی کنگھی کرنے میں، اپنا جوتا پہننے میں۔
(بخاری و مسلم)

الفصل الثاني

(۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا لَبِسْتُمْ وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَأَبْدَأُوا بِأَيِّمِكُمْ

(رواه أحمد وأبو داود)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم (لباس وغیرہ) پہنو یا دھو کر دوا اپنے دائیں طرف سے شروع کرو۔ (احمد، ابوداؤد)

مسئلة التسمية عند الوضوء

﴿١٠﴾ وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا وَضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ.

(رواه الترمذي وابن ماجه ورواه أحمد وأبو داود عن أبي هريره قال قال النبي عن أبي سعيد الخدري عن أبيه وزأفوا في أول يوم صلوا
 بمن لا يؤمنون له) ٢

تیسرا جہیز: اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دہ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے (وضو کے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا اس کا وضو نہیں ہوا (ترمذی، ابن ماجہ) اور احمد و ابوداؤد نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور داری نے ابن ابوسعید خدری سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے نیز ان لوگوں نے اپنی روایت کے شروع میں یہ الفاظ زائد ذکر کئے ہیں کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے وضو نہیں کیا۔

توضیح: لا وضوء: اس پر پوری امت متفق ہے کہ وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مستحب اور پسندیدہ فعل ہے ہاں بسم اللہ کی قانونی حیثیت میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اسحاق بن راہویہ وادود ظاہری اور اہل ظواہر کا مسلک یہ ہے کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا فرض اور واجب ہے البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے بھول کر چھوڑ دی تو وضو ہو جائے گا لیکن اہل ظواہر وغیرہ کے ہاں نسانا چھوڑنے سے بھی وضو نہیں ہوگا۔

جمہور فقہاء اور ائمہ فرماتے ہیں کہ تسمیہ وضو میں مسنون ہے اگر تسمیہ رہ گیا تو وضو ہو جائے گا۔
دلائل:

جو حضرات وضو میں تسمیہ کے وجوب اور فرضیت کے قائل ہیں ان کی دلیل یہی زیر بحث حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں لا وضوء کا لفظ موجود ہے جس سے نفی کلی مراد ہے کہ بغیر تسمیہ وضو صحیح ہی نہیں۔

جمہور نے سب سے پہلے قرآن کی آیت الوضوء سے استدلال کیا ہے کہ اگر تسمیہ فرض یا واجب ہوتا تو قرآن میں اس کا ذکر آتا جیسا کہ باقی فرائض کا ذکر آیا ہے جب قرآن نے وضو کے فرائض میں تسمیہ کو شمار نہیں کیا ہے تو خبر واحد سے اس کو فرض یا واجب کہنا اصولاً صحیح نہیں ہے اور یہ کتاب اللہ پر زیادت کے مترادف ہے اور یہ نسخ کے قیبل سے ہے جو جائز نہیں ہے۔

جمہور کی دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی صریح حدیث ہے جو مشکوٰۃ ص ۴۷ پر موجود ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جس نے وضو کے ساتھ بسم اللہ پڑھ لی تو یہ وضو پورے جسم کے لئے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور جس نے وضو میں بسم اللہ نہیں پڑھی تو وضو صرف اعضاء مقبولہ کی طہارت کا ذریعہ بنے گا۔

جواب: جمہور نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زیر بحث حدیث کا جواب دیا ہے۔

کہ یہاں "لا وضوء" میں لا کا کلمہ اصل شئی کی نفی کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ نفی کمال کے لئے آیا ہے نفی کمال کی مثال جیسے
① لا ایمان لمن لا امانة له۔ ② لا دین لمن لا عہد له۔ ③ لا صلوة لجار المسجد الا فی المسجد۔
④ ليس المسکین الذی ترده التمرۃ والتمرتان۔ ⑤ ليس المسلم الذی یمیت وجارہ جائع الی حبیبہ۔

جمہور فرماتے ہیں کہ ان دلائل کی روشنی میں بسم اللہ کو وضو میں سنت پر حمل کرنا چاہیے نہ کہ اس کو فرض یا واجب کہا جائے۔ نیز وضو خود عبادت مقصودہ نہیں بلکہ اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ ہے لہذا جب اس طرح کی عبادت غیر مقصودہ میں خبر واحد سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے تو اس کو سنت پر حمل کیا جاتا ہے فرض اور واجب پر اس کو حمل نہیں کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وضو میں واجب نہیں۔

(ملاحظہ: یہاں سے مسئلہ نبیذ التمر تک تمام مباحث حرمین شریفین میں زیارت عمرہ کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ۱۷ رمضان ۱۴۲۲ھ میں لکھنا شروع کئے الحمد للہ علی ذلک)۔

انگلیوں کا حلال

﴿۱۱۶﴾ وَعَنْ لَهَيْطِ بْنِ صَبْرَةَ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَخْبِرْنِي عَنِ الْوُضُوءِ قَالَ أَسْبِغِ الْوُضُوءَ

وَحَلَّلَ بَيْنَ الْأَصَابِعِ وَبَالَغَ فِي الرِّسْتِ شَقِي إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا۔

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَزَوَى ابْنُ مَاجَةَ وَالْإِسْنَادُ فِي قَوْلِهِ بَيْنَ الْأَصَابِعِ)۔

ترجمہ: اور حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ مجھے وضو کے بارے میں آگاہ فرمائیے آپ نے فرمایا تم وضو کو پورا کرو، انگلیوں میں خلال کر دو اور اگر تمہارا روزہ نہ ہو تو ناک میں اجمعی طرح پانی پہنچاؤ۔“ (ابوداؤد، درائی، نسائی، ابن ماجہ اور درائی نے اس حدیث کو یحییٰ بن الاصابیع تک روایت کیا ہے۔

توضیح: اخیر فی عن الموضوع: اس صحابی نے وضو کے مکملات اور آداب کے متعلق سوال کیا کیونکہ نفس وضو تو ان کے ہاں ایک معروف عمل تھا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکملات اور محسنات وضو جواب میں ارشاد فرمائے۔
الاصابیع: انگلیوں سے یہاں پاؤں اور ہاتھوں کی انگلیاں مراد ہیں حدیث میں دونوں کا ذکر ہے ان دونوں کا خلال جمہور کے ہاں سنت ہے البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر فقہاء کا قول ہے کہ خلال پاؤں کی انگلیوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ہاتھ کی انگلیوں میں کشادگی کی وجہ سے خلال کی ضرورت نہیں ہے نیز اگر پاؤں کا خلال بھی چھوڑ دیا تو پرواہ نہیں۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلال سنت ہے تو پھر بعض احادیث میں اس کے چھوڑنے پر شدید وعید کیوں آئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلال واجب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انگلیاں کشادہ ہیں تو خلال سنت ہے اور اگر پاؤں کی انگلیاں آپس میں مضبوط جڑی ہوئی ہیں تو پھر خلال واجب ہے اور اسی کے چھوڑنے پر وعید آئی ہے۔ تاکہ درمیان میں خشک نہ رہ جائے تو وعید خشکی پر ہے۔

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَحَلَّلْ أَصَابِعَ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَزَوَى ابْنُ مَاجَةَ لَخَوَّكَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَهَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تم وضو کرو تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں اور اپنے پیروں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔“ (ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

توضیح: فحلل: پاؤں کی انگلیوں میں خلال کی کیفیت یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو دائیں پیر کی چھوٹی انگلی کے درمیان داخل کر کے ترتیب سے بائیں پیر کی چھوٹی انگلی تک ملتے چلے جائیں اور ہاتھوں کا خلال یہ کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں دبا کر ایک ساتھ خلال کریں۔

﴿۱۳﴾ وَعَنِ الْمُسْتَوْرِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ يَذُلُّكَ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ بِخُصْفِهِ. (رواه الترمذی وأبو داود وابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت مستورو بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو دیکھا جب آپ وضو فرماتے تو اپنے پاؤں کی انگلیوں کو (بائیں ہاتھ) کی چنگلی سے لے لیتے (یعنی پاؤں کی انگلیوں کے درمیان بائیں ہاتھ کی چنگلی سے خلال فرماتے)۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ڈاڑھی کا خلال

﴿۱۴﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَخَذَ كَفًّا مِنْ مَاءٍ فَأَدَخَلَهُ تَحْتَ حَنَكِهِ فَحَلَّلَ بِهِ لِحْيَتَهُ وَقَالَ هَكَذَا أَمَرَنِي رَبِّي. (رواه ابوداؤد)۔

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب وضو فرماتے تو ایک چلو پانی لیتے پھر اسے ٹھوڑی کے نیچے پہنچاتے اور اس سے اپنی ڈاڑھی میں خلال کرتے اور پھر فرماتے کہ میرے پروردگار نے (حق تعالیٰ کے ذریعہ) اسی طرح سے حکم فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

توضیح: فحلل بہ لحيته: امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک ڈاڑھی میں خلال کرنا سنت ہے امام مالک رحمہ اللہ نے مستحب کا قول اختیار فرمایا ہے ائمہ احناف کے نزدیک ڈاڑھی کا خلال راجح قول کے مطابق سنت ہے امام مرنی اور ایک قول میں احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خلال واجب ہے۔ تمام احادیث کو دیکھ کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاڑھی کا خلال ایک اچھا کام ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر عمل کیا ہے۔

وضو میں ڈاڑھی کا حکم:

اب یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ وضو میں ڈاڑھی کا حکم کیا ہے آیا دھونا ہے یا اس کا مسح کرنا ہے؟

جہور نے کسی تفصیل کے بغیر فرمایا ہے کہ ڈاڑھی کا دھونا وضو میں واجب ہے احناف نے اس میں تفصیل سے کام لیا ہے کہ ڈاڑھی دو قسم کی ہوتی ہے ہلکی اور گھنی، ہلکی وہ ہوتی ہے جس میں کمال نظر آتی ہے اور گھنی وہ ہوتی ہے کہ جس میں چہرہ کی کمال نظر نہ آتی ہو ہلکی ڈاڑھی کا حکم یہ ہے کہ اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب اور ضروری ہے۔

گھنی مخنجان ڈاڑھی کا حکم اس طرح ہے کہ اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں اوپر سے دھونا فرض ہے اور ڈاڑھی کے جو بال نیچے لٹک رہے ہوں ان کا دھونا ضروری نہیں ہے اور نہ مسح کرنا ضروری ہے البتہ خلال کرنا اور خلال کے لئے نیا پانی لینا

ضروری نہیں ہے وضو کا سابقہ پانی کافی ہے۔ خلال کے مسئلہ سے عینی طور پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ شریعت میں ایک قبضہ سے کم ڈاڑھی کا وجود نہیں کیونکہ خشخشی ڈاڑھی میں کیسے خلال ہو سکتا ہے کیونکہ ڈاڑھی کے خلال کی کیفیت اس طرح ہے کہ دھونے کے بعد ہاتھ کی انگلیاں ڈاڑھی کے نیچے سے داخل کر کے اوپر کی طرف بڑھائی جائیں۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْ عُمَانَ أَنَّ النَّبِيَّ كَانَ يُغْتَلُّ بِحَيْثِهِ. (رواہ الترمذی والنسائی)۔

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ (وضو کرتے وقت) اپنی ڈاڑھی میں خلال کیا کرتے تھے۔ (ترمذی و دارمی)

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ قَالَ رَأَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَيْهِ حَتَّى انْقَاهُمَا ثُمَّ مَضَضَ ثَلَاثًا وَاسْتَنْشَقَ ثَلَاثًا وَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَفَرَاعِيَهُ ثَلَاثًا وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ مَرَّةً ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَأَخَذَ فُطْلَ ظَهْرِهِ فَغَرَبَهُ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ أَحَبُّتُ أَنْ أَرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ ظَهْرُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. (رواہ الترمذی والنسائی)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دھویا یہاں تک کہ انہیں پاک کیا۔ پھر تین مرتبہ کھلی کی تین مرتبہ ناک میں پانی دیا تین مرتبہ اپنا منہ دھویا تین مرتبہ دونوں ہاتھ کہنوں تک دھوئے ایک مرتبہ اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے پھر کھڑے ہوئے اور وضو کے نیچے ہوئے پانی کو کھڑے کھڑے پی لیا اور پھر فرمایا کہ میں نے یہ پسند کیا کہ تمہیں دکھاؤں کہ آنحضرت ﷺ کا وضو کس طرح تھا۔ (ترمذی و نسائی)

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ خَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ جُلُوسَ نَظَرٍ إِلَى عَلِيٍّ حِينَ تَوَضَّأَ فَأَدْخَلَ يَدَهُ الَّتِي يَمْنَى ثَلَاثَةً فَتَضَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَكَثَّرَ بَيْنَ يَدَيْهِ الْبُسْرَى فَعَلَّ هَذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ سَرَّكَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى ظَهْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَهَذَا ظَهْرُهُ. (رواہ الترمذی)۔

ترجمہ: اور حضرت عبد خیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے برتن میں سے داہنے ہاتھ سے پانی لیا اور منہ میں بھر کر کھلی کی اور ناک میں پانی دیا اور بائیں ہاتھ سے ناک کی اسی طرح تین مرتبہ کیا پھر فرمایا کہ جس کے لئے یہ بات خوش کن ہو کہ وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے وضو کو دیکھے تو (وہ دیکھے کہ) آنحضرت ﷺ کا وضو یہ ہے (یعنی اس طرح آپ وضو فرماتے تھے) (دارمی)

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَظْمُضٌ وَاسْتَنْقَضَ مِنْ كَلْبٍ وَاحِدٍ فَعَلَّ ذَلِكَ ثَلَاثًا. (رواه أبو داود والترمذي)۔

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم کو دیکھا کہ آپ نے ایک ہی چلو سے گل کی اور ناک میں پانی دیا اور تین مرتبہ اس طرح کیا۔ (ابو داؤد، ترمذی)

﴿۱۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ بِرَأْسِهِ وَأُذُنَيْهِ بِطَائِفَتَيْنَا بِالشَّهَابَتَيْنِ وَظَاهِرَهُمَا بِإِثْمَانِيَّةٍ. (رواه النسائي)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم نے اپنے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا اور کانوں کے اندر کا مسح اپنی شہادت کی انگلیوں سے اور اوپر کا انگوٹھوں سے کیا۔ (نسائی)

﴿۲۰﴾ وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ مُعَوِّذٍ أَنَّكَ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ قَالَتْ فَتَسْمَحُ رَأْسَهُ مَا أَقْبَلَ مِنْهُ وَمَا أَذْبَرَ وَصُدَّغِيهِ وَأُذُنَيْهِ مَرَّةً وَاحِدَةً وَفِي رِوَايَةٍ أَنَّهُ تَوَضَّأُ فَأَدْخَلَ إصْبَعِيهِ فِي بَحْرَتِي أُذُنَيْهِ. (رواه أبو داود وزوي الترمذي والبيهقي والأول والأثنان معاً الفاضل)۔

ترجمہ: اور حضرت زبیر بن معوذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم کو وضو کرتے دیکھا چنانچہ فرمائی ہیں کہ آپ نے اپنے سر کے اگلے حصہ پر، پچھلے حصہ پر، کنپٹیوں پر اور کانوں پر ایک مرتبہ مسح کیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے وضو کیا چنانچہ (مسح کے لئے) اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے دونوں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیا (ابو داؤد) ترمذی نے پہلی حدیث کو اور ابن ماجہ نے دوسری حدیث کو روایت کیا ہے۔

مسح سر کے لئے نیا پانی لینا

﴿۲۱﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأُ وَأَنَّهُ مَسَحَ رَأْسَهُ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلٍ يَدَيْهِ.

(رواه الترمذي وزوي الفاضل مع زوائد)۔

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ نے اپنے سر کا مسح اس پانی سے کیا جو ہاتھوں کا بچا ہوا تھا (یعنی نیا پانی لے کر مسح کیا) ترمذی، مسلم اور مسلم نے اس

لے احرجہ ابو داؤد ۳۹ والترمذی ۲۸ لے احرجہ النسائي ۴۰

لے احرجہ ابو داؤد ۱۲۱ والترمذی ۳۳ لے احرجہ الترمذی ۴۲ ومسلم ۱/۱۲۵

روایت کو زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے (جس میں دیگر اعضاء وضو کے دھونے کا بھی ذکر ہے)۔

توضیح: بماء غلیظ فضل یدیدہ: یعنی آنحضرت ﷺ نے سر کے مسح کے لئے نیا پانی لیا اور ہاتھ کی تری پر اکتفاء نہیں کیا۔ ائمہ احناف کی کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ کسی عضو کے دھونے کے بعد ہاتھ پر جو تری رہ جاتی ہے وہ کسی عضو کے مسح کے لئے کافی ہے نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں ہاں اگر ہاتھوں سے کسی عضو پر مسح کیا تو اس کے بعد ہاتھ کی تری کسی اور عضو کے لئے کافی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ مسح کے بعد ہاتھ کی تری کا پانی مستعمل ہو جاتا ہے جس کو پھر دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے اور دھونے سے جو تری رہ جاتی ہے وہ مستعمل پانی کے حکم میں نہیں کیونکہ مستعمل وہ ہوتا ہے جو کسی عضو پر استعمال میں بہہ جائے یہ حدیث احناف کے علاوہ دیگر ائمہ کی دلیل ہے جو سر کے مسح کے لئے نیا پانی لینے کو ضروری سمجھتے ہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس روایت کو اسی طرح "بماء غلیظ فضل یدیدہ" نقل فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابن لہیعہ کی روایت میں "غلیظ فضل یدیدہ" کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھوں کا بچا ہوا پانی آپ ﷺ نے سر کے مسح میں استعمال کیا ہے اگر یہ روایت صحیح ہو جائے تو یہ احناف کی دلیل بن جائے گی لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس روایت سے پہلے والی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہی مشہور ہے (لمعات) بہر حال اگر نیا پانی لیا جائے تو وہ زیادہ بہتر ہوگا تا کہ اختلافی صورت سے آدھی بچ جائے۔ ۱۔

مسئله مسح الأذنین

﴿۲۲﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ ذَكَرَ وَضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ وَكَانَ يَمْسَحُ الْمَاقِنَ وَقَالَ الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهَ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَذَكَرَ أَقَالَ تَحَاذِلَا أُخْرِجِي الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ مِنْ قَوْلِ أَبِي أُمَامَةَ أُمُّ مِنْ قَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ۔ ۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سر کا ردو عالم ﷺ کے وضو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "آپ آنکھ کے کونوں کو بھی ملا کرتے تھے اور کہا کہ دونوں کان بھی سر میں داخل ہیں۔" (ابن ماجہ، ابو داؤد، ترمذی) اور ابو داؤد رحمہ اللہ ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حماد نے کہا کہ میں یہ نہیں جانتا کہ الاذنان من الرأس (یعنی دونوں کان سر میں داخل ہیں) ابو امامہ رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے یا آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

توضیح: الاذنان من الرأس: وضو میں کانوں کا کیا حکم ہے آیا مسح کرنا ہے یا دھونا ہے تو اس کے بارے میں علماء کی مختلف رائے ہیں۔

فقہاء کا اختلاف:

① امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چہرہ کے سامنے کانوں کو مکمل طور پر دھویا جائے۔

۴) عامر شیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کانوں کا سامنے والا حصہ چہرہ کے ساتھ دھویا جائے اور پشت کے حصے پر سر کے مسح کے ساتھ مسح کیا جائے۔

۵) جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ کانوں پر سر کے مسح کے ساتھ مسح کرنا چاہئے البتہ ان کے آپس میں یہ اختلاف ہے کہ آیا کانوں کے مسح کے لئے نیا پانی لینا چاہئے یا ہاتھوں کا مابقی پانی کافی ہے نقل مذہب میں بھی اختلاف ہے کہ کون کس طرف ہے مگر احناف اور شوافع بہر حال ایک دوسرے کے مقابل ہیں چنانچہ شوافع کے ہاں جدید پانی لینا افضل ہے احناف کے نزدیک جدید پانی لینا افضل نہیں ہے۔

نتیجہ: دلائل:

باب ن مذکورہ حدیث ائمہ احناف کی دلیل ہے کہ مسح میں کان سر سے وابستہ ہیں لہذا جدید پانی لینے کی ضرورت نہیں سر کے مسح میں شہادت کی انگلیاں اور انگوٹھے استعمال نہیں ہوئے انہی کو کانوں میں استعمال کیا جائے گا۔

۱۔ ثانی کی دوسری دلیل وہ حدیث بھی ہے جس میں مسح سر کی وجہ سے گناہوں کے خروج کا راستہ کان بتایا گیا ہے کہ "حت خطا یا ہ من اذنیہ" معلوم ہوا کہ کان مسح میں سر کے تابع ہیں تو جدید پانی ضروری نہیں ہے۔

۲۔ تیسری دلیل ابن خزیمہ کی روایت ہے جس کو بحر الرائق نے نقل کیا ہے جس میں ہے کہ "أخذ عوفہ فمسح بها منہ و اذنیہ" اسی طرح اس باب میں اس سے پہلے حضرت ربیع بنت معوذ رحمہ اللہ کی روایت ہے نیز حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانوں کا مسح سر کے ساتھ ہے اور اس کا تابع ہے شوافع حضرات کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے وہ صرف عقلی دلیل پیش کرتے ہیں کہ کان الگ عضو ہے اور الگ عضو کے لئے الگ پانی کی ضرورت ہے۔

لہذا کانوں کے لئے الگ پانی لینا چاہیے وہ حضرات احناف کی دلیل کو کمزور کرنے کے لئے ابوامامہ رحمہ اللہ کی روایت پر اعتراضات کرتے ہیں۔

ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اب تک یہ معلوم نہیں کہ "الاخذان من الرأس" کا جملہ آیا حضور اکرم ﷺ کا قول ہے یا یہ ابوامامہ رحمہ اللہ کا مقولہ ہے حاد کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کس کا قول ہے۔

جواب: ائمہ احناف نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ ابن ماجہ میں اس کی تصریح ہے کہ "قال قال رسول اللہ ﷺ الاخذان من الرأس" اور اگر بفرض محال یہ ابوامامہ رحمہ اللہ ہی کا قول ہے تو چونکہ یہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے صحابی اپنی طرف سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا ہے تو پھر بھی یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے نیز یہ حدیث صرف ابوامامہ رحمہ اللہ سے مروی نہیں بلکہ حافظ جمال الدین زلیعی رحمہ اللہ نے "نصب الراية" میں اس کی آٹھ صحابہ کرام سے تخریج کی ہے۔

شوافع حضرات کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مرفوع حدیث ہو بھی جائے تو اس کا مقصد نیا پانی لینا نہ لینا نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ کان سر میں ہیں یہ مرکا حصہ ہیں گویا یہ کوئی تشریفی بیان نہیں بلکہ تخلیقی فرمان ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ شارب ہیں خلقت بیان کرنا آپ کا منصب و موضوع نہیں ہے بلکہ حکم شریعت بیان کرنا آپ کا مقصود و مطلوب ہے نیز اگر یہ بیان خلقت اور تخلیق کا ہے تو اس کی ضرورت کیا تھی یہ تو ایک بدیہی معاملہ ہے جس کو ہر ایک جانتا ہے کہ کان سر میں ہیں اور دو ہیں آنکھیں دو ہیں اور سر میں ہیں ناک اور منہ مرکا حصہ ہے اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ کی بعثت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ ۱۔

﴿۲۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُهُ عَنِ الْوُضُوءِ فَأَرَاهُ فَلَا تَأْتِيَهُمْ قَالَ هَكَذَا الْوُضُوءُ فَمَنْ زَادَ عَلَى هَذَا فَقَدْ أَشَاءَ وَتَعَدَّى وَظَلَمَ.

(رواہ النسائی وابن ماجہ وروای ابو داؤد متفقاً) ۲۔

ترجمہ: اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ ایک دیہاتی آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے وضو کی کیفیت پوچھی چنانچہ آپ نے اسے اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھو کر دکھایا اور فرمایا کہ ”(کامل) وضو اسی طرح ہے لہذا جس نے اس پر زیادہ کیا (یعنی تین مرتبہ سے زیادہ دھویا) اس نے برا کیا اور تعدی کی اور ظلم کیا“ (نسائی، ابن ماجہ) اور ابو داؤد نے بھی اسی مطلب کی حدیث روایت کی ہے۔

توضیح: فمن زاد: یہاں یہ سوال ہے کہ اطالت عہد تو مطلوب و مقصود ہے حالانکہ یہاں زیادت فی الوضو کو گناہ اور ظلم بتایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اس کی تبلیغ میں زیادتی یا کمی کی اس نے ظلم کیا یا جس نے اس کے خلاف عقیدہ رکھا تو اس نے ظلم کیا یا جس نے وضو کے مراتب میں زیادتی کی یعنی تین بار سے زیادہ دھویا تو اس نے ظلم کیا ”اشاء“ یعنی ترک سنت کی وجہ سے اس نے گناہ کیا برا کام کیا۔ ۳۔

دعاؤں میں تجاوز نہ کرو

﴿۲۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْمُغْفَلِ أَنَّهُ سَمِعَ إِبْنَةَ يَقُولُ أَلْهَمَ إِلَى أَسْأَلِكَ الْقَضَرَ الْأَكْبَرُ عَنْ يَمِينِ الْجَنَّةِ قَالَ أَيْ بَنِي سَلِ اللَّهُ الْجَنَّةَ وَتَعَوَّذْ بِهِ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ يَقُولُ إِنَّهُ سَيَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَغْتَدُونَ فِي الظُّهُورِ وَالنَّعَاءِ.

(رواہ أحمد وابو داؤد وابن ماجہ) ۴۔

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ”اے اللہ

میں تجھ سے جنت کے دائیں طرف سفید محل مانگتا ہوں" تو انہوں نے کہا "اے میرے بیٹے! تم خدا سے جنت مانگو اور (دور رخ کی) آگ سے پناہ مانگو" میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عنقریب اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو طہارت اور دعائیں غلو کریں گے۔" (احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد)

توضیح: **القصر الابيض:** سفید محل کا ترجمہ انگریزی میں واٹ ہاؤس ہے۔ یہ لفظ آئندہ مشکوٰۃ شریف کے دوسرے حصہ میں بھی آیا ہے وہاں فارس کے بادشاہ کسریٰ کے محل اور اس کے خزانوں کی فتوحات کا ذکر ہے چنانچہ حدیث کی فتوحات میں ایوان کسریٰ میں "القصر الابيض" بھی فتح ہوا تھا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۶۶)

يعتدون: اعتداء تجاوز اور زیادتی کے معنی میں ہے۔ طہارت میں تجاوز یہ ہے کہ تین بار دھونے سے زیادہ دھویا جائے یا بے تحاشا پانی اسراف کی حد تک بہایا جائے یا دھونے میں اس قدر مبالغہ کرے کہ شک اور دوسرے تک نوبت پہنچ جائے یہ سب ظہور میں تجاوز ہے اور دعاء میں تجاوز یہ ہے کہ یا تو بہت لمبی مانگی جائے یا تکلف کے ساتھ اس میں وزن اور سمع اور تصنع کے الفاظ لائے جائیں یا قیودات لگا کر تعین کیا جائے جس طرح اس حدیث میں سفید محل اور جنت کے دائیں طرف کی قیودات ہیں یا اس طرح دعاء مانگی جائے جس کا قبول ہونا محال ہو مثلاً ایک غریب گنوار دیہاتی بادشاہ بننے کی دعا مانگے یہ سب تجاوز کی صورت ہیں۔

شیطان وضو میں وسوسہ ڈالتا ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنْ لَوُضُّوْهُ سَهِيَتْ أَمَا يَقَالُ لَهُ الْوَلَهَانُ فَاتَّقُوا وَشَوَاسَ الْمَاءِ. (رواة الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حديث غریب ولفظہ اشناک بالقیوٹی عند أهل الحديث لا کلاماً تعلقوا عندنا أسندنا غریباً ولفظہ بالقیوٹی عندنا ضعیفاً).

ترجمہ: اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ وضو کا ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے لہذا پانی کے وسوسے سے بچو (ترمذی، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ خارجہ (ایک عالم) کے علاوہ کسی نے اس کی سند بیان کی ہو اور وہ (خارجہ) ہمارے محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

توضیح: **الولہان:** "وَلَهَانٌ مِّنَ الْمَاءِ" کے وزن پر متحرک ہے یہ لفظ غم کے معنی میں ہے یا غم کی وجہ سے حیران اور پاگل ہونے کے معنی میں ہے ولہان اس شیطان کا نام ہے جو وضو کے پانی میں اسراف کے لئے حاضر ہوتا ہے یہ لفظ یا تو خود اس شیطان کی صفت ہے کہ یہ لوگوں کو وسوسہ اور شکی بنانے میں سرگرداں پھرتا رہتا ہے یا حقیقت میں وسوسہ میں تو انسان پڑتا ہے لہذا "ولہان" اس شکی انسان کی صفت ہے لیکن مجازاً اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے کیونکہ شیطان کے درغلانے سے وہ آدمی وسوسہ میں پڑ گیا ہے۔

وضو کے بعد تولیہ وغیرہ کا استعمال

﴿۲۶﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ مَسَحَ وَجْهَهُ بِظَرْفِ تَوْبِهِ.

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ وضو فرماتے تو اپنے کپڑے کے کونے سے منہ پونچھتے۔ (ترمذی)

توضیح: رقة ینشف بہا: وضو کرنے کے بعد اعضاء کو خشک کرنے کے لئے تولیہ یا رومال استعمال کرنا چاہیے یا نہیں اس سلسلہ میں بعض روایات سے پانی پونچھنا اور خشک کرنا ثابت ہوتا ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کپڑا استعمال کرنے سے انکار فرمایا اس وجہ سے فقہاء کے اقوال میں بھی اختلاف آگیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے تین اقوال زیادہ مشہور ہیں ایک قول یہ کہ کپڑا استعمال کرنا اور پانی خشک کرنا مستحب ہے اور دوسرا قول یہ کہ مکروہ ہے۔ تیسرا قول یہ کہ سردیوں میں استعمال کرنا چاہیے اور گرمیوں میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ائمہ احناف میں سے بعض نے اس کو آداب وضو میں شمار کیا ہے بعض نے مستحب لکھا ہے اور بعض نے صرف مباح کا قول اختیار کیا ہے۔ احناف اور جمہور کا معتد قول یہ ہے کہ وضو کے بعد کپڑا استعمال کرنا فقط مباح ہے مستحب ہونے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور مکروہ پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

جن حضرات نے پانی خشک نہ کرنے کا کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ پانی قیامت میں وزن اعمال میں تولا جاتا ہے لہذا اس کو خشک نہ کرو وگرنہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اگر کپڑے سے خشک کرنا نقصان دہ ہے تو جسم پر بھی یہ پانی خشک ہو جاتا ہے بہر حال یہ ایک طبعی معاملہ ہے کوئی تشریح حکم نہیں ہے گرمی میں ضرورت نہیں پڑتی ہے اور سردی میں ضرورت پڑتی ہے۔ جس کو جس میں سہولت ہو وہ صورت اپنالے۔

﴿۲۷﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ خِرْقَةٌ يُنَشِّفُ بِهَا أَعْضَاءَهُ بَعْدَ الْوُضُوءِ.

(رواہ الترمذی وقال هذا حديثٌ كذا في النسخة وأبو معاوية الرازي ضعيف عند أهل الحديث)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس ایک کپڑا تھا جس سے وضو کے بعد اپنے بھیگے ہوئے اعضاء کو پونچھا کرتے تھے (ترمذی) اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور اس کے ایک راوی ابو معاذ محمد شین کے ہاں ضعیف ہیں۔

الفصل الثالث

﴿۲۸﴾ وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ أَبِي صَفِيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِأَبِي جَعْفَرٍ هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي جَعْفَرٍ أَنَّهُ قَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ تَوَضَّأَ مَرَّةً مَرَّةً وَمَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلَاثًا ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ۔ (رواه الترمذی وابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت ثابت ابن ابی صفیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے والد سے جن کا نام محمد باقر رضی اللہ عنہ ہے کہا کہ آپ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ”سرکارِ دو عالم رضی اللہ عنہ نے (کبھی) ایک ایک مرتبہ (کبھی) دو دو مرتبہ اور (کبھی) تین تین مرتبہ وضو کیا ہے انہوں نے فرمایا ”ہاں“۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَقَالَ هُوَ تَوَرُّ عَلَى نُورٍ۔ (ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم رضی اللہ عنہ نے دو دو مرتبہ وضو فرمایا (یعنی اعضاء وضو کو دو دو بار دھویا) اور پھر فرمایا کہ ”یہ نور کے اوپر نور ہے۔“)

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا وَقَالَ هَذَا وَطُؤِي وَوُضُوءُ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي وَوُضُوءُ الْبَرَاءَةِ۔ (رواه الترمذی والنسائی ابی عزیز، مسلم، ابی داؤد، ابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم رضی اللہ عنہ نے تین تین مرتبہ وضو کیا اور پھر فرمایا کہ ”یہ میرا اور مجھ سے پہلے انبیاء کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم کا وضو ہے“ (یہ دونوں حدیثیں رزین نے روایت کی ہیں اور امام نووی رضی اللہ عنہ نے شرح مسلم میں دوسری حدیث کو ضعیف کہا ہے)۔

﴿۳۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَكَانَ أَحَدُنَا يَكْفِيهِ الْوُضُوءُ مَا لَمْ يُحْدِثْ۔ (رواه البخاری)۔

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم رضی اللہ عنہ ہر (فرض) نماز کیلئے وضو فرمایا کرتے تھے اور ہم کو ایک وضو اس وقت تک کافی ہوتا تھا جب تک کہ وضو نہ ٹوٹتا تھا۔ (بخاری)

وضوء علی الوضوء کے بدلے مسواک کا حکم

﴿۳۲﴾ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ جَبْرِ قَالَ قُلْتُ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَرَأَيْتَ وَضُوءَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ لِكُلِّ صَلَاةٍ ظَاهِرًا كَانَ أَوْ غَيْرَ ظَاهِرٍ عَمَّنْ أَحَدُهُ فَقَالَ حَدَّثَنِي أَشْعَثُ بْنُ زَيْدٍ

الْحَطَّابِ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ حَنْظَلَةَ بْنَ أَبِي عَامِرٍ الْغَسِيلِيَّ حَدَّثَهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ أَمَرَ بِالْوُضُوءِ لِكُلِّ صَلَاةٍ ظَاهِرًا كَانَ أَوْ غَيْرَ ظَاهِرٍ فَلَمَّا شَقَّ ذَلِكَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ بِالسُّبُوكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَوَضَعَ عَنْهُ الْوُضُوءَ إِلَّا مِنْ حَدِيثٍ قَالَ فَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُدْرِي أَنَّ بِهِ قُوَّةً عَلَى ذَلِكَ فَفَعَلَهُ حَتَّى مَاتَ. (رواه أحمد)

ترجمہ: اور حضرت محمد بن یحییٰ بن حبان رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے یہ بتائیے کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے خواہ وہ با وضو ہوں یا بے وضو ہوں اور انہوں نے یہ عمل کس سے حاصل کیا تھا؟ حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حضرت اسماء بن زید بن خطاب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ ابی عامر الغسلی رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو ہر نماز کیلئے وضو کرنے کا حکم دیا گیا تھا خواہ آپ با وضو ہوں یا بے وضو جب آپ ﷺ کے لئے یہ مشکل ہوا تو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیا گیا اور وضو کو موقوف کیا گیا (ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا واجب نہ رہا) جب تک وضو ٹوٹ نہ جائے، حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ خیال تھا کہ مجھ میں ہر نماز کیلئے تازہ وضو کرنے کی قوت ہے چنانچہ انہوں نے اسی پر موت کے وقت تک عمل کیا۔ (احمد)

وضو میں بھی پانی کا اسراف منع ہے

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ مَا هَذَا السَّرَفُ يَا سَعْدُ! قَالَ أَيْ الْوُضُوءَ سَرَفٌ قَالَ نَعَمْ وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ. (رواه أحمد وابن ماجہ)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ کا گزر حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر ہوا جبکہ وہ وضو کر رہے تھے (اور وہ وضو میں اسراف بھی کر رہے تھے) آپ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا "اے سعد یہ کیا اسراف (زیادتی) ہے؟" حضرت سعد نے عرض کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اگرچہ تم نہر جاری ہی پر کیوں نہ وضو کر رہے ہو۔" (احمد ابن ماجہ)

بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنے سے پورا بدن پاک ہو جاتا ہے

(۳۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَابْنِ مَسْعُودٍ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللَّهِ فَإِنَّهُ يُطَهِّرُ جَسَدَهُ كُلَّهُ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يَذْكُرْ اسْمَ اللَّهِ لَمْ يَطْهَرْ إِلَّا مَوْضِعَ الْوُضُوءِ. (احمد ابن ماجہ)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا (یعنی بسم اللہ) پڑھ کر وضو شروع کیا تو اس نے اپنا تمام بدن (گناہوں سے) پاک کیا اور جس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا تو اس نے صرف اعضاء وضو کو پاک کیا۔

انگوٹھی ہلا کر وضو بنایا جائے

﴿۳۵﴾ وَعَنْ أَبِي زَافِعٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ وَضُوءَ الصَّلَاةِ حَرَّكَ خَاتَمَهُ فِي إِصْبَعِهِ
(رواهما الدارقطني وروى ابن ماجه الألبانی)

ترجمہ: اور حضرت ابو زافعؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب نماز کے لئے وضو فرماتے تو اپنی انگلی کی انگوٹھی کو بھی گھما کر پھرا لیتے (ان دونوں حدیثوں کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے صرف دوسری حدیث نقل کی ہے)۔

توضیح: وضوء الصلاۃ: یعنی نماز کے لئے جب آپ وضو فرماتے تو خوب مبالغہ کرتے اور اس کے علاوہ دخول مسجد یا تلاوت یا سجدہ تلاوت وغیرہ کے لئے وضو فرماتے تو اس قدر مبالغہ نہ فرماتے اس صورت میں الصلاۃ کا لفظ قید احترازی بن جائے گا۔

حركات خاتمه: یہ تحریک سنت اور مستحب امر ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے زاد الفقیہ میں لکھا ہے کہ اگر انگوٹھی کھلی ہو تو اس کو حرکت دینا سنت ہے اور اگر تنگ ہو تو اس کو گھما کر حرکت دینا واجب ہے تاکہ نیچے جگہ خشک نہ رہ جائے۔ اس حدیث کے حکم کے تحت جسم میں وضو کے اعضاء سے جو بھی چیز چپکی ہوئی ہوگی اس کو حرکت دینا ضروری ہے خواہ وہ گھڑی ہو یا کوئی اور کڑا وغیرہ ہو نیز وضو کے اعضاء میں جہاں سوراخ ہو جیسے عورتوں کی ناک میں ہوتا ہے تو اس میں زیور کو حرکت دے کر پانی اندر پہنچانا ضروری ہوگا اسی طرح کان کے سوراخوں میں غسل کے دوران عورتوں پر لازم ہے کہ اندر تک پانی پہنچائیں اور کان کی بالیوں کو خوب حرکت دے دیں۔



باب الغسل

غسل جنابت کا بیان

الفصل الاول

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعْبَيْهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ وَإِنْ لَمْ يُنْزِلْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب کہ تم میں سے کوئی شخص عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ پھر کوشش کرے (یعنی جماع کرے) تو اس پر غسل واجب ہو گیا اگرچہ منی نہ نکلے۔“ (بخاری و مسلم)

مسئلة انما الباء من الباء

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ. زَوَاةٌ مُسْلِمٌ قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ الشَّيْخِ رَحِمَهُ اللَّهُ هَذَا مَنْسُوخٌ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ فِي الْإِحْتِلَامِ۔

(زَوَاةٌ الْقَوْمِيَّةُ وَلَمْ أَجِدْ فِي الطَّبَعَيْنِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”پانی پانی سے ہے“ (یعنی منی نکلنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے) (مسلم)

اور امام محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے اور ابن عباس نے فرمایا کہ ”پانی پانی سے ہے“ کا حکم احتلام کے لئے ہے اور مجھے یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ملی ہے۔ (ترمذی)

توضیح: انما الماء من الماء: ای انما وجوب استعمال الماء بالماء تو اول ماء سے غسل کا پانی مراد ہے اور دوسرے ماء سے نطفہ اور منی کا پانی مراد ہے اس حدیث کے الفاظ میں حصر ہے کہ غسل صرف اس صورت میں فرض ہے جبکہ منی کا خروج ہو جائے خروج منی کے بغیر غسل واجب نہیں خواہ حشفہ غائب ہو یا غائب نہ ہو اور خواہ التقاء ختانیہ ہو یا نہ ہو انزال منی اگر ہے تو غسل ہے ورنہ غسل نہیں ہے۔

اس مسئلہ کا عنوان اکسال بھی ہے اکسال کسل سے ست ہونے کے معنی میں ہے مطلب یہ کہ جب انزال ہو جاتا ہے تو ذکر

ست پڑ جاتا ہے ورنہ نہیں اور زیر بحث مسئلہ میں اکسال کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص انزال کے بغیر ذکر کو خارج کر کے ست بنانے کی کوشش کرتا ہے اب بظاہر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس سے پہلے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بالکل متعارض ہے اس میں غیبیہوت حشفہ پر غسل واجب قرار دیا گیا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو اور یہاں انزال کو غسل کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بھی متعارض ہے جس میں "اذا جاوز المختان المختان وجب الغسل" کے الفاظ آئے ہیں جو بعد میں آرہی ہے۔ اسی طرح فصل ثالث میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی متعارض ہے جو مشکوٰۃ ص ۳۹ پر آرہی ہے۔ لہ

احادیث کے اس متعارض کی وجہ سے ابتداء اسلام میں دور صحابہ میں اس مسئلہ پر بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا مہاجرین صحابہ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کو لے کر غیبیہوت حشفہ پر غسل کرتے تھے لیکن انصار صحابہ "انما الماء من الماء" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت پر عمل کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس مسئلہ میں صحابہ کرام کو متحد کرنے کی کوشش فرمائی تاکہ سب مسلمان ایک حکم پر متحد ہو جائیں چنانچہ آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا تو طے یہ ہوا کہ اس مسئلہ کا تعلق ازدواجی زندگی سے ہے لہذا ازواج مطہرات سے پوچھنا چاہیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اتفاقاً خنائین والی روایت بیان فرمائی تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکاری فرمان جاری کیا اور انصار کو اکسال سے سختی کے ساتھ منع فرمایا تو اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا اور داؤد ظاہری کے سوا پوری امت میں کسی کا اختلاف نہ رہا اب انزال ہو یا نہ ہو حشفہ کے غائب ہونے سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں صحابہ کرام کے اجماع اور دیگر کئی احادیث کے پیش نظر تاویل کرنا ضروری ہو گیا ہے چنانچہ امام نجی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاویل یہ کی ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے چنانچہ آئندہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر صریح دلالت کرتی ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ دوسری تاویل آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "انما الماء من الماء" کا حکم احتلام کے بارے میں ہے۔ لہ

لیکن اس تاویل اور توجیہ پر حدیث کے شان و رد کی وجہ سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عتبان بن مالک صحابی مسجد قباء کے قریب رہتے تھے میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیر کے دن وہاں گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے گھر کے سامنے سے آواز دے کر بلایا وہ جماع میں مشغول تھے اسے چھوڑ کر باہر آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے آدمی کو جلدی میں ڈال دیا وہ باہر آئے اور آتے ہی مسئلہ پوچھا کہ انزال کے بغیر اگر اکسال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انما الماء من الماء یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں تو یہ واقعہ بیداری کا ہے اس میں

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! خدا نے تعالیٰ حق کے معاملہ میں حیا نہیں کرتا (لہذا یہ بتائیے) کیا عورت پر غسل واجب ہے جبکہ اس کو احتلام ہو (یعنی خواب میں مجامعت دیکھے) آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں“ جبکہ وہ پانی (مٹی) کو دیکھے“ یہ سن کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنا منہ (شرم کی وجہ سے) ڈھانک لیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ (یعنی کیا مرد کی طرح عورت کے بھی منی ہوتی ہے اور نکلتی ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں“ خاک آلود ہو تیرا داہنا ہاتھ (اگر ایسا نہ ہوتا تو) پھر اس کا بچہ اس کے مشابہ کیونکر ہو سکتا تھا (متفق علیہ) اور امام مسلم رحمہ اللہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا) مرد کی منی گاڑھی سفید ہوتی ہے اور عورت کی منی پتلی زرد ہوتی ہے لہذا ان میں سے جو منی غالب ہو یا سبقت کرے تو (بچہ کی) مشابہت اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔

توضیح: او تحتلہ المرأة: اس حدیث پر بظاہر یہ اعتراض ہے کہ ”او تحتلہ المرأة“ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو احتلام نہیں ہوتا ہے تب ہی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے استفہام کے انداز میں پوچھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے؟ پھر اسی حدیث کے ابتدائی حصہ میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اقرار فرما رہی ہیں کہ ”فهل علی المرأة من غسل اذا احتلمت“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو عورتوں کے احتلام کا علم تھا تب ہی تو ام سلیم نے سوال کیا اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کئی جوابات اور توجیہات ہیں اول سرسری جواب یہ کہ امہات المؤمنین کو صفاء باطن کی وجہ سے احتلام نہیں ہوتا تھا تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کیا نیز احتلام میں شیطان متشکل ہو کر آتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی شکل میں شیطان کا آنا محال تھا اور کسی دوسرے آدمی کے خواب میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے ازواج مطہرات کو احتلام کا علم نہیں تھا تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کیا اور ام سلیم رضی اللہ عنہا کو معلوم تھا تو انہوں نے اقرار کیا اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ یہ تب صحیح ہوگا کہ ازواج مطہرات پر کبھی جاہلیت کا زمانہ نہ آیا ہو یا پہلے کسی شوہر سے نکاح نہ ہوا ہو حالانکہ دونوں میں معاملہ برعکس ہے تو کیا گارنٹی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں احتلام نہ ہوتا ہو۔

نیز احتلام تو صرف تشکل شیطان کی صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی نکان کی وجہ سے ہوتا ہے کبھی استلاء بطن کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی استلاء منی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے دوسرا صحیح جواب یہ ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا عورتوں کے احتلام کے اس عیب کو چھپانا چاہتی تھیں کہ ام سلیم ویسے فرضی باتوں کا پوچھتی ہیں عورتوں کو کہاں احتلام ہوتا ہے۔

اس حقیقت پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے آپ نے فرمایا فضضت النساء یعنی اسے ام سلیم تم نے عورتوں کے اس پوشیدہ راز کو فاش کر کے عورتوں کو رسوا کیا معلوم ہوا ام سلمہ رضی اللہ عنہا اس حقیقت کو چھپانا چاہتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سخت لہجہ میں فرمایا ”ترہت بدلت“ یعنی تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں

اگر عورت کا نطقہ نہیں ہے تو پھر کبھی کبھی بچہ ماں کے مشابہہ کیوں ہوتا ہے اس جملہ سے بعض ان اطباء پر رو ہو گیا جن کا خیال ہے کہ عورت کی ذات میں مادہ منویہ نہیں ہے مگر صرف مردوں میں ہوتی ہے۔ لہ

غسل کا مسنون طریقہ

﴿وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَعَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ فَيَغْتِيلُ بِهَا أَصُولَ شَعْرِهِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غُرَفَاتٍ بِيَدَيْهِ ثُمَّ يُفِيضُ الْمَاءَ عَلَى جُلْدِهِ كُلِّهِ. (مشفق عليه) وَرَأَتْهُ لِيُسَلِّمَ يَتَنَا فَيَغْتِيلُ يَدَيْهِ قَبْلَ أَنْ يُدْخِلَهَا إِلَيْهِ ثُمَّ يُغْرِغُ يَدَيْهِ عَلَى عُنُقِهِ فَيَغْتِيلُ قَوْجَهُ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ. ع

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جب غسل جنابت (یعنی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے غسل) کا ارادہ فرماتے تو (غسل) اس طرح شروع فرماتے کہ پہلے دونوں ہاتھ (ہاتھوں تک) دھوتے پھر وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے پھر انگلیاں (ترہونے کے لئے) پانی میں ڈالتے پھر انہیں نکال کر ان (انگلیوں کی تری) سے اپنے بالوں کی جڑوں میں خلال فرماتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے تین چلو (پانی لے کر) سر پر ڈالتے اور پھر اپنے تمام بدن پر پانی بہاتے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (جب آپ غسل) شروع کرتے تو اپنے دامن ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور پھر اپنی شرمگاہ کو دھوتے اور اس کے بعد وضو کرتے۔

توضیح: کہا يتوضأ للصلاة: اس تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ وہم ہو سکتا تھا کہ جب غسل میں سر پر پانی ڈالا جاتا ہے تو شاید اس وضو میں سر کا مسح نہ کیا ہو گا یا غسل میں سارا پانی پاؤں پر آتا ہے تو شاید اس وضو میں پاؤں نہ دھوئے ہوں اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ وضو بالکل نماز کے وضو کی طرح تھا۔ ع

یہاں پر یہ شبہ بھی ہے کہ اس روایت میں وضو کے ساتھ پاؤں دھونے کا ذکر ہے اور بعد والی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں غسل کے بعد پاؤں دھونے کا ذکر نہیں ہے دونوں میں تعارض ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں کوئی تعارض نہیں ویسے احناف کا ایک قول ہے کہ مطلقاً پاؤں بعد میں دھونا چاہیے، شوافع فرماتے ہیں کہ غسل سے پہلے وضو کے ساتھ دھوئے جائیں، صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ اگر جگہ میں تلویحاً قدمین کا خطرہ ہے تو بعد میں پاؤں دھوئے جائیں اور اگر جگہ صاف ہے اور مناسب چوکی وغیرہ ہے تو وضو کے ساتھ دھونا زیادہ بہتر ہے۔ غسل میں پہلے سر پر پانی ڈالا جائے پھر دائیں کندھے پر ڈالا جائے پھر بائیں کندھے پر ڈالا جائے اور پھر سارے بدن پر ڈالا جائے اطباء کے ہاں یہ اچھا طریقہ ہے۔

﴿۶۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتْ مَيْمُونَةُ وَضَعْتُ يَدَيَّيْنِیْ غُسْلًا فَسَعَرْتُهٖ بِقَوِّیْ وَصَبَّ عَلَیْ یَدَیْهِ فَغَسَلَهَا ثُمَّ صَبَّ بِیَمَیْنِیْهِ عَلَی شِمَالِیْهِ فَغَسَلَ فَرَجَهُ فَضَرَبَ بِیَدِیْهِ الْأَرْضَ فَتَسَحَّهَا ثُمَّ غَسَلَهَا فَمَضَضَ وَاسْتَشَقَّ وَغَسَلَ وَخَرَّاعِیْوُ ثُمَّ صَبَّ عَلَی رَأْسِیْهِ وَأَفَاضَ عَلَی جَسَدِیْهِ ثُمَّ تَدَلَّحَی فَغَسَلَ قَدَمَیْهِ وَقَنَا وَلُثَّهٗ ثُمَّ تَوَّأَ فَلَمْ یَأْخُذْهُ فَاَنْطَلَقَ وَهُوَ یَنْفُضُ یَدَیْهِ

(متفق علیہ ولفظہ بالبخاری) ۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کے لئے غسل کے واسطے پانی رکھا اور کپڑا ڈال کر پردہ کیا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں دھویا۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور شرم گاہ کو دھویا پھر اپنا بائیں ہاتھ (جس سے شرم گاہ کو دھویا تھا) زمین پر رگڑا اور اسے دھویا پھر کھلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور چہرہ اور ہاتھ کو (کھینچ کر) دھویا پھر اپنے سر پر پانی ڈالا اور تمام بدن پر بہایا پھر (جہاں آپ نے غسل فرمایا تھا) اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوئے۔ اس کے بعد میں نے (بدن پونچھنے کے لئے) کپڑا دیا لیکن آپ نے کپڑا نہیں لیا پھر آپ ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ (بخاری و مسلم) الفاظ بخاری کے ہیں۔

حائضہ کے غسل کا طریقہ

﴿۶۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ امْرَأَةً مِنَ الْأَنْصَارِ سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيضِ فَأَمَرَهَا كَيْفَ تَغْتَسِلُ ثُمَّ قَالَ خُلِي فِي مِرْصَةٍ مِنْ مِسْكِ فَتَتَطَهَّرِي بِهَا قَالَتْ كَيْفَ أَتَطَهَّرُ بِهَا فَقَالَ تَطَهَّرِي بِهَا قَالَتْ كَيْفَ أَتَطَهَّرُ بِهَا قَالَ سُبْحَانَ لِلَّهِ تَطَهَّرِي بِهَا فَاجْتَنِبِيهَا إِلَى فَقُلْتُ تَتَّبِعِي بِهَا أَكْثَرَ الدَّهْرِ (متفق علیہ) ۲۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک دن) ایک انصاری عورت نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے اپنے غسلِ حیض کے بارے میں پوچھا چنانچہ آپ نے اسے غسل کا حکم دیا کہ کس طرح غسل کیا جائے (یعنی پہلی حدیثوں میں غسل کی جو کیفیت گزری ہے، آپ نے وہ بیان فرمائی) اور پھر فرمایا کہ مشک میں (بھگوئے ہوئے کپڑے) کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کرو۔ اس نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے پاکی حاصل کرو اس نے پھر پوچھا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا سبحان اللہ (یعنی اللہ پاک ہے) تم اس سے پاکی حاصل کرو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (کہ آنحضرت ﷺ کے انہیں الفاظ کو بار بار سن کر) میں نے اس عورت کو اپنی جانب کھینچ لیا اور اس سے کہا کہ (تم اس کپڑے کو) خون کی جگہ (یعنی شرم گاہ پر) رکھ لو۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: المہیض: حیض کے معنی میں ہے فامرہا یعنی آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو غسل کی کیفیت اور طریقہ سمجھا دیا۔

فرصۃ: یہ لفظ فاکے کسرہ کے ساتھ ہے یہ اون یا رودی کے کٹڑے کو کہا جاتا ہے یا کپڑے کے چھوٹے سے کٹڑے کو کہتے ہیں۔ بعض روایات میں یہ لفظ قرصہ قاف کے ساتھ آیا ہے اس سے بھی چھوٹا کٹڑا مراد ہے جو دو انگلیوں کے درمیان میں دب جاتا ہو۔

من مسك: یہ لفظ میم کے کسرہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مشک کے چھوٹے سے کٹڑے کو اندام نہانی پر مل لیا جائے تاکہ وہاں بدبو کا اثر باقی نہ رہے یا مشک سے مراد یہ کہ اس کو کسی کپڑے پر مل لو اور پھر وہ کپڑا اندام نہانی پر مل کر صفائی حاصل کر لو۔ ”تطہری“ کا مطلب یہی ہے کہ صفائی حاصل کر لو مگر بعض روایات میں ”توضی“ کا لفظ بھی آیا ہے اس سے بھی صفائی ستھرائی مراد ہے۔

قال سبحان الله: یعنی آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو جتنا سمجھایا وہ نہ سمجھ سکی اور سوال کرتی رہی ادھر آنحضرت ﷺ کو جواب تھا کہ کھلے اور برہنہ الفاظ استعمال فرمائیں اس پر آپ نے تعجب کے انداز میں لفظ سبحان اللہ استعمال فرمایا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے پردے والے مسائل میں جتنا ممکن ہو کنائی الفاظ استعمال کئے جائیں اور شرم و حیا کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

فاجتنبہا: یہ کھینچنے کے معنی میں ہے اس لفظ کو جتنا الٹ پلٹ دیا جائے اس کا معنی ایک ہی رہتا ہے بعض روایات میں **فاجتنبہا** ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے اللہ تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درجات کو بلند فرمائے انہوں نے جب دیکھا کہ یہ عورت سمجھتی نہیں ہے اور آنحضرت ﷺ کو پریشان کر رکھا ہے تو آپ نے اس کو کھینچا اور برہنہ الفاظ میں سمجھا دیا کہ ایسا کرو کیونکہ عورتوں کے آپس میں اس طرح باتوں کی گنجائش ہوتی ہے۔

غسل میں سر کے بالوں کا مسئلہ

﴿۷﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَمْرَأَةٌ أَشَدُّ طَهْرًا رَأَيْتُ أَفْأَنُقِضَهُ لِيُغْسَلَ الْجَنَابَةُ فَقَالَ لَا إِنَّمَا يَكْفِيكَ أَنْ تَغْتَبِي عَلَى رَأْسِكَ ثَلَاثَ حَفِيَّاتٍ ثُمَّ تُغِيضِينَ عَلَيْكَ الْمَاءَ فَتَطْهَرِينَ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایک ایسی عورت ہوں کہ اپنے سر کے بالوں کو بہت مضبوط گوندھتی ہوں، کیا صحبت کے بعد نہانے کے واسطے انہیں کھولا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں (بالوں

تذکرہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ایک مد پانی سے وضو فرماتے اور ایک صاع سے پاؤں کو دھو کر (پانی) سے غسل فرمالتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

توضیح: بالبدن: یہ لفظ میم کے ضم اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ دورِ رطل یعنی دو پونڈ کے پیمانے کا نام ہے اور صاع اس پیمانہ کا نام ہے جس میں چار مد یعنی آٹھ رطل آتے ہوں یہ احناف کے ہاں ہے آئندہ کسی جگہ انشاء اللہ تفصیل آجائے گی۔ اس حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مد پانی سے وضو اور ایک صاع پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔

فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ وضو اور غسل میں پانی استعمال کرنے کی کوئی حد بندی نہیں ہے البتہ اسراف اور تقیر یعنی کمی سے بچنا ضروری ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امور عادی ہیں عادت کی وجہ سے بدلتے ہیں کبھی زمانہ کبھی مکان و مقام کی وجہ سے اس میں فرق آتا ہے کبھی پانی کی قلت و کثرت اور کبھی مزاج کے تغیر سے اس میں تغیر آتا ہے نبی اکرم ﷺ عموماً اسی مقدار کو استعمال فرماتے تھے جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے۔ لہ

مرد اور عورت کا ایک ساتھ غسل کرنا

﴿۹﴾ وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَكَا وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ إِيَّاهُ وَاحِدًا بَيْنِي وَبَيْنَهُ فَيُبَايِعُنِي حَتَّى أَقُولَ دَعْنِي دَعْنِي قَالَتْ وَهُمَا جُنُبَانِ (متفق علیہ)۔

تذکرہ: اور حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ "میں اور سرکارِ دو عالم ﷺ ایک برتن سے جو دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا نہاتے تھے اور آپ (پانی لینے میں) مجھ سے جلدی کرتے تھے تو میں کہا کرتی تھی میرے لئے تو پانی چھوڑ دے! میرے لئے بھی تو پانی رہے دیجئے۔" حضرت معاذہ فرماتی ہیں کہ وہ دونوں (آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) جنبی (یعنی حالتِ ناپاکی میں) ہوتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

توضیح: کنت اغتسل انا: مرد اور عورت جو میاں بیوی ہو اگر معاً ساتھ ساتھ غسل کریں تو اتفاقاً یہ جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں اور اگر مرد نے پہلے غسل کیا اور عورت نے بعد میں کیا تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں اگر عورت نے تخلیک میں پہلے غسل کیا اور مرد بعد میں اس کے بقیہ پانی سے غسل کرنا چاہتا ہے تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل ظواہر کے نزدیک یہ صورت مکروہ ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک صرف عورت کے پہلے غسل کرنے سے پانی مکروہ نہیں ہوتا لہذا مرد کے لئے اس سے غسل کرنا مکروہ نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہی مذکورہ حدیث ہے حنا بلہ اور اہل ظواہر نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جن میں عورتوں کے بعد مردوں کے اغتسال کو منوع قرار دیا گیا ہے۔

کے بارے میں کیا گیا جس نے نیند میں خواب تو دیکھا احتکام بھی یاد ہے مگر جاننے کے بعد کوئی تری کہیں نظر نہ آئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا کوئی بڑا اختلاف تو نہیں ہے البتہ احناف کے نزدیک اس کی صورتوں میں کافی لمبی تفصیل ہے میں اس کو مختصر طور پر پیش کرتا ہوں۔

احتکام کی صورتیں:

اگر احتکام کے بعد نیند سے اٹھنے کے بعد اس شخص نے نہ تو منی دیکھی نہ کوئی اور تری نظر آئی تو اس صورت میں غسل نہیں ہے اور اگر کچھ خارج ہوا ہے اور تری نظر آئی ہے تو پھر چند صورتیں ہوں گی۔

① اس شخص کو یقین آگیا کہ یہ منی ہے ② یا یقین آگیا کہ مذی ہے ③ یا یقین آگیا کہ ودی ہے۔ پھر یقین کی ان تینوں صورتوں میں اس شخص کو احتکام یاد ہوگا یا احتکام یاد نہیں ہوگا تو یقین کی یہ چھ صورتیں بن گئیں ان میں تین صورتوں میں غسل ہے اور تین میں نہیں ہے وہ اس طرح کہ اس شخص کو یقین ہے کہ منی ہے تو احتکام یاد ہو یا بھول گیا ہو غسل واجب ہے۔ یہ دو صورتیں ہو گئیں یا یقین ہے کہ یہ ودی ہے تو احتکام یاد ہو یا بھول گیا ہو اس میں غسل واجب نہیں ہے یا یقین ہے کہ یہ مذی ہے تو اس میں اگر احتکام یاد ہے تو غسل واجب ہے اگر یاد نہیں ہے تو کچھ نہیں تو منی کی دو صورتوں اور مذی کی ایک صورت ان تینوں صورتوں میں غسل ہے اور ودی کی دو صورتوں اور مذی کی ایک صورت، ان تینوں میں غسل نہیں ہے۔

اب اگر شک کی صورت ہو تو اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ:

① اس میں شک ہے کہ یہ منی ہے یا مذی ہے ② اس میں شک ہے کہ یہ منی ہے یا ودی ہے ③ اس میں شک ہے کہ یہ مذی ہے یا ودی ہے۔ ④ منی مذی ودی تینوں میں ایک ساتھ شک ہے تو شک کی کل چار صورتیں بن گئیں۔

اب ان چاروں صورتوں میں احتکام یاد ہوگا یا نہیں تو یہ کل آٹھ صورتیں ہو گئیں ان میں احتکام یاد ہونے کی صورت میں امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک غسل چار صورتوں میں واجب ہے اور احتکام یاد نہ ہونے کی چار صورتوں میں غسل نہیں ہے۔

شک اور یقین کی یہ سب چودہ صورتیں بن گئیں سات میں غسل واجب ہے اور سات میں نہیں ہے۔ یہ تفصیل احناف کے ہاں ہے باقی ائمہ کے ہاں اگر منی ہے تو غسل ہے ورنہ نہیں ہے۔

ان النساء شقائق الرجال: یعنی تخلیق اور طبائع میں مرد اور عورتیں یکساں ہیں جو کچھ مردوں میں ظاہر ہوتا ہے وہ عورتوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے جو کچھ ایک صنف میں پایا جاتا ہے وہ دوسری صنف میں بھی پایا جاتا ہے لہذا جس طرح احتکام مردوں میں ہوتا ہے عورتوں میں بھی ہوتا ہے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں احتکام کے قلیل اور تادر ہونے کی

وجہ سے ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا عورتوں کے احتلام میں بھی کوئی تری ظاہر ہوتی ہے آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا بعض علماء نے شقاق اور شقیقہ کو اشتراک فی الاحکام کے معنی میں لیا ہے کہ دونوں احکام شریعت میں یکساں ہیں یہ مفہوم زیادہ آسان ہے۔

حشفہ غائب ہونے سے غسل واجب ہو جاتا ہے

﴿۱۱﴾ وَعَلَيْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ فَعَلَتْهُ أَكَا وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَغْتَسَلْنَا. (رواہ الترمذی وابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب مرد کے ختنہ کی جگہ عورت کے ختنہ کی جگہ سے تجاوز کر جائے (یعنی حشفہ غائب ہو جائے تو دونوں پر) غسل واجب ہو جائے گا۔“ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا اور ہم دونوں نہائے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ) اس حدیث کی تشریح باب کی ابتدائی حدیثوں میں گزر چکی ہے۔ (مولف)

ہر بال کے نیچے جنابت ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةٌ فَأَغْسِلُوا الشَّعْرَ وَأَنْقُوا الْبَهْرَةَ. (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ) وقال الترمذی لهذا حديث غريب وأخبار الزاوي وهو ضعيف كحديث مالك

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ہر بال کے نیچے (جنابت) ہوئی ہے لہذا بالوں کو (خوب) دھویا کرو اور بدن کو پاک کیا کرو۔“ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حارث بن وجیہ ایک بوڑھا شخص ہے وہ معتبر نہیں ہے۔ (یعنی کبریٰ اور غلبہ نسیان کی وجہ سے اس کی روایت قابل اعتماد یعنی قوی نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے)

ایک بال کی جگہ خشک رہ گئی تو غسل نہیں ہوگا

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ مَوْضِعَ شَعْرَةٍ مِنْ جَنَابَةٍ لَمْ يَغْسِلْهَا فُجِعَ كَذَا وَكَذَا مِنَ النَّارِ قَالَ عَلِيٌّ قَبْلَ قَوْلِ عَائِشَةَ رَأَيْتُ قَوْمًا تَمَّ عَائِدَتُكَ رَأَيْتُ قُلُوبًا. (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ) وقال الترمذی لهذا حديث غريب وأخبار الزاوي وهو ضعيف كحديث مالك

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے غسل جنابت میں ایک بال کے برابر بھی جگہ (خشک) چھوڑ دی کہ اسے نہ دھویا تو اسے اس طرح آگ کا عذاب دیا جائے۔“ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دھنی کی اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دھنی کی“ (ابوداؤد، احمد، دارمی) مگر احمد اور دارمی نے یہ الفاظ ”اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دھنی کی“ مکرر ذکر نہیں کئے ہیں۔

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ)۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم ﷺ غسل کرنے کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے۔“

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

توضیح: لا يتوضأ: یعنی غسل کرنے کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے کیونکہ غسل سے پہلے آپ مکمل وضو بناتے تھے جیسا کہ اس باب کی حدیث نمبر ۴۲ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”جس وقت بھی آپ غسل کرتے تو حدیث اکبر سے پاک ہو جاتا ہے تو حدیث اصغر کی پاکی تو اس کے ضمن میں ہے اس کے اعادہ کی کیا ضرورت ہے۔“

﴿۱۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَغْسِلُ رَأْسَهُ بِالْخَطْمِ وَهُوَ جُنُبٌ يَحْتَزِي بِذَلِكَ وَلَا يَصُبُّ عَلَيْهِ الْمَاءُ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ”سرکارِ دو عالم ﷺ پانی کی جنابت کی حالت میں (غسل کے وقت) خطمی سے سر کو دھولیتے تھے اور اسی پر کفایت کرتے اور دوبارہ سر پر (خالص) پانی نہ ڈالتے تھے۔“ (ابوداؤد)

توضیح: الخطمی: خاکے کسرہ کے ساتھ ایک پودے کا نام ہے جس کو پانی میں ملا کر اس سے صابن کا کام لیا جاتا تھا جس سے سر خاص طور پر دھویا جاتا تھا۔

يَحْتَزِي بِذَلِكَ: یعنی جس پانی میں خطمی ملا ہوتا تھا اس کو استعمال کر کے غسل کے لئے کافی سمجھتے تھے اور خطمی کو دھونے کے لئے مزید خالص پانی استعمال نہیں کرتے تھے یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ پانی میں گل خطمی بہت کم مقدار میں ملا یا گیا ہو تو یہ خالص پانی کی طرح ہوتا تھا اور مزید خالص پانی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

اس حدیث سے ائمہ احناف کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ پانی میں اگر کوئی پاک چیز مل جائے اور اس کا اثر پانی میں ظاہر ہو جائے اور پانی کی طبیعت رقت سیلان متاثر نہ ہو تو اس سے وضو جائز ہے شوافع اس کو نہیں مانتے ہیں۔

﴿١٦﴾ وَعَنْ يَحْيَى قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا يَغْتَسِلُ بِالْمِزَارِ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْلَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ مِنْ سَيِّئِي الْحَبِّ وَالْحَيَاءِ وَالْعُسْفَرِ فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَبِشِرْ

(رواه أبو داود والنسائي وفي رواية قال إن الله سيبيئكم لئلا أراكم أن يفتنكم فليفتنوا ربهم ١٠)

پھر فرماتا ہے: اور حضرت یحییٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں لگا دیا تو اس نے دیکھا چنانچہ آپ (وعظ کے لئے) ممبر پر چڑھے اور پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی پھر فرمایا اللہ تعالیٰ بہت حیاء دار ہے (یعنی اپنے بندوں سے حیاء داروں کا معاملہ کرتا ہے) بایں طور کہ انہیں معاف کرتا ہے (اور بہت پردہ پوش ہے) (یعنی اپنے بندوں کے گناہ اور عیوب کو پوشیدہ رکھتا ہے) وہ حیاء اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے لہذا جب تم میں سے کوئی (میدان میں) نہائے تو اسے چاہیے کہ وہ پردہ کر لیا کرے۔“ (ابوداؤد و نسائی) اور نسائی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ پردہ پوش ہے لہذا جب تم میں سے جو کوئی نہانے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ کسی چیز کا پردہ کر لیا کرے۔“

الفصل الثالث

﴿١٧﴾ وَعَنْ أَبِي بَرْزٍ كَعْبٍ قَالَ إِنَّمَا كَانَ النَّبَاءُ مِنَ النَّبَاءِ رُحْصَةً فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نُهِيَ عَنْهَا.

(رواہ النیلمی و ابن ماجہ و الدارمی) ۷

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم کہ غسل انزال کے بعد ہی واجب ہوتا ہے ابتدائے اسلام میں آسانی کی وجہ سے تھا پھر اس سے منع فرما دیا گیا (یعنی یہ حکم منسوخ قرار دے دیا گیا)۔ (ترمذی، ابوداؤد و دارمی)

غسل جنابت میں بدن کا کوئی حصہ خشک نہ رہے

﴿١٨﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ إِنِّي اغْتَسَلْتُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَصَلَّيْتُ الْفَجْرَ فَرَأَيْتُ قَلْدَ مَوْجِجِ الظُّفْرِ لَمْ يُصِبْهُ الْمَاءُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتُ مَسَحْتُ عَلَيْهِ بِبَيْدِكَ أَجَزَ أَتَكَ (رواه ابن ماجه) ٥

تذکرہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے غسلِ جنابت کیا اور صبح کی نماز پڑھ لی، پھر میں نے دیکھا کہ (بدن پر) ناخن کے برابر جگہ خشک رہ گئی کہ وہاں پانی نہیں پہنچا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم (اس جگہ اسے بھیجے) ہاتھ سے مسح بھی کر لیتے تو کافی ہو جاتا۔ (ابن ماجہ)

توضیح: مسحت علیہ: اس سے مراد غسل اور دھونا ہے مسح ملنے کے معنی میں ہے اور دھونے میں ملنا ہوتا ہی ہے

یعنی اگر غسل کے بعد اس خشک حصہ پر تم ذرا پانی مل لیتے تو تمہارے لئے یہ جائز ہوتا اور نماز ہو جاتی مگر تم نے ایسا نہیں کیا لہذا فرض نماز نہیں ہوئی اب دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ یہ مسئلہ غسل کیسے بھی ہے اور اعضاء وضو میں وضو کے لئے بھی ہے کہ اگر کوئی جگہ خشک رہ گئی یا نیل پالش یا لپ اسٹک کی وجہ سے یا دیگر روغن یا تارکول یا گوند وغیرہ کی وجہ سے پانی جسم کے مطلوبہ حصہ تک نہیں پہنچا تو نہ غسل صحیح ہوگا اور نہ وضو ہوگا رنگ روغن کرنے والوں اور پالش استعمال کرنے والی عورتوں پر اس مسئلہ میں احتیاط لازم ہے۔ ل

چند احکام میں تخفیف

۱۹۹ وَعَنِ ابْنِ عُمرَ قَالَ كَانَتْ الصَّلَاةُ تَحْسِينِ وَالْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَغَسَلَ الْبُؤْلُ مِنَ الثُّوبِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَزَلْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسْأَلُ حَتَّى جُعِلَتِ الصَّلَاةُ تَحْسِينًا وَغَسَلَ الْجَنَابَةُ مَرَّةً وَغَسَلَ الثُّوبُ مِنَ الْبُؤْلِ مَرَّةً. (رواۃ ابو داؤد)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (پہلے) پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں، نیز جنابت (ناپاکی) سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب دھونا سات سات مرتبہ (فرض ہوا تھا) پھر آنحضرت ﷺ متواتر اللہ تعالیٰ سے ان میں تخفیف کی دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ نمازیں تو پانچ رہ گئیں اور جنابت سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب کا دھونا ایک ایک مرتبہ رہ گیا۔ (ابو داؤد)

توضیح: خمسین: یعنی لیلۃ المعراج میں آنحضرت ﷺ کی امت پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے ہی وہ منسوخ و موقوف ہو گئیں اور صرف پانچ رہ گئیں معلوم ہوا کہ کسی حکم پر عمل کرنے سے پہلے وہ منسوخ ہو سکتا ہے نسخ کی تعریف اور اس کا حکم اس کتاب کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ ل

وغسل الثوب مرة: یعنی نجاست لگنے کے بعد اس کے ازالہ کے لئے سات بار دھونے کا حکم تھا پھر ایک بار دھونے کا حکم رہ گیا یہ مسلک شوافع کا ہے کہ ایک بار دھونے سے کپڑا وغیرہ پاک ہو جاتا ہے ہاں تین بار دھونا مستحب ہے لیکن احناف کے ہاں تین بار دھونا واجب ہے جبکہ نجاست غیر مرئی ہو۔ ل



باب مخالطة الجنب وما یباح له

جنبی سے اختلاط کا بیان

الفصل الاول

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ لَقِيتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا جُنُبٌ فَأَتَخَذَ بِيَدِي فَتَمَشَّيْتُ مَعَهُ حَتَّى قَعَدَ فَأَنَسَلْتُ فَأَتَيْتُ الرَّحْلَ فَأَغْتَسَلْتُ ثُمَّ جِئْتُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَقَالَ أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ لَهُ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجَسُ۔ هَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَالْمُسْلِمِ بِمَعْنَاهُ وَزَادَ بَعْدَ قَوْلِهِ فَقُلْتُ لَهُ لَقِيتُ وَأَنَا جُنُبٌ فَكَرِهْتُ أَنْ أَجَالِسَكَ حَتَّى أَغْتَسِلَ وَكَذَلِكَ الْبُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ أُخْرَى۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے میری ملاقات ہوئی اور میں جنبی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں آپ کے ہمراہ ہوا جب آپ بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نکل کر اپنے مکان پر آیا اور نہا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے (مجھے دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا ”تم کہاں تھے؟“ میں نے آپ سے (اصل واقعہ) ذکر کیا (کہ میں ناپاک تھا اس لئے چلا گیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا ”سبحان اللہ! مومن ناپاک نہیں ہوتا“ روایت کے الفاظ بخاری کے ہیں مسلم نے اس کی ہم معنی روایت نقل کی ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں (انہوں نے کہا) ”میں چونکہ ناپاکی کی حالت میں تھا اس لئے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ آپ کے پاس بیٹھوں جب تک کہ نہا نہ لوں“ اسی طرح بخاری کی دوسری روایت میں بھی یہ الفاظ منقول ہیں۔

جنابت کی حالت میں سونے کا حکم

﴿۲﴾ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ تُصَيَّبَةُ الْجَنَابَةِ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے رات کو جنابت ہو جاتی ہے (یعنی اختلاط یا جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اسی وقت) وضو کر کے عضو تناسل کو دھو کر سو جایا کرو۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: یعنی وضو بنا لو ذکر وھولو اور سو جاؤ۔

رات کو جنابت کی حالت میں بغیر غسل کے سو جانا اہل ظواہر کے نزدیک ناجائز ہے۔ جمہور فرماتے ہیں کہ غسل کرنا مستحب اور افضل ہے ورنہ پھر وضو کا درجہ ہے اور پھر صرف استنجاء کا درجہ ہے شاہ انور شاہ کا شمیری رحمہ اللہ نے فیض الباری میں لکھا ہے کہ جو شخص ہمیشہ جنابت کی حالت میں سوتا ہے تو اس کے جنازہ میں فرشتے شریک نہیں ہوتے بہر حال عام احادیث میں بغیر غسل کے سو جانے کی اجازت موجود ہے اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ غسل کرنے کی بہتری میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

جنبی آدمی کھانے پینے اور سونے کے لئے وضو کرے

﴿۳﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا كَانَ جُنُبًا قَرَّادًا أَنْ يَأْكُلَ أَوْ يَتَنَامَ تَوَضَّأَ وَضُوءًا لِلصَّلَاةِ. (مشفق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ حالاتِ ناپاکی میں ہوتے اور کھانا کھانے اور سونے کا ارادہ فرماتے تو نماز کے وضو کی طرح وضو کر لیتے۔ (بخاری، مسلم)

دوبارہ صحبت کے لئے وضو کرنا مستحب ہے

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَلَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وَضُوءًا. (رواہ مسلیم)

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ ”جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس آئے (یعنی صحبت کرے) اور پھر اس کے پاس دوبارہ آنے کا (یعنی صحبت کرنے کا) ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ دونوں کے درمیان وضو کرے۔“ (مسلم)

توضیح: وضوء: اس میں توہین تعظیم کے لئے ہے مراد کامل اور مکمل وضو ہے یہ حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ استحبالی ہے اس سے نشاط پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ بِغُسْلٍ وَاحِدٍ. (رواہ مسلیم)

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم ﷺ ایک غسل کے ساتھ اپنی ازواجِ مطہرات سے صحبت کیا کرتے تھے۔“ (مسلم)

توضیح: يطوف علی نساءہ: اس حدیث پر بظاہر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ قسم یعنی باری مقرر کرنے کے احکام میں

یہ ہے کہ ایک دن رات کم از کم قسم کے لئے ضروری ہے تو یہاں آپ نے قسم کو کیسے ترک کیا کہ ایک رات میں سب ازواج کے پاس تشریف لے گئے باری کہاں گئی؟ اس شبہ کے کئی جوابات ہیں: ① آنحضرت ﷺ پر قسم لازم نہیں تھا ② ازواج مطہرات کی مرضی سے ایسا ہوا ③ اس طرح واقعے صرف دو آئے ہیں اور دونوں جہد الوداع کے موقع پر حج کے دوران پیش آئے ہیں ایک واقعہ احرام سے پہلے کا ہے اور دوسرا زمانہ منی کے قیام میں پیش آیا ہے اس وقت آپ سفر میں تھے اور سفر میں باری ختم ہو جاتی ہے۔ ل

﴿۶۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَكُفِّرُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ أَحْيَانٍ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَعَدِيْفٌ ابْنُ عَبَّاسٍ سَنَدًا كَرَاهِي كِتَابِ الْأَطْلَعَةِ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم ﷺ ہر وقت یا الہی میں معروف رہا کرتے تھے۔“ (مسلم) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صاحب مصابیح نے اس موقع پر نقل کی ہے، ہم انشاء اللہ کتاب الاطعمہ میں ذکر کریں گے۔

توضیح: علی کل احيائه: اس حدیث پر بظاہر یہ اشکال ہے کہ اس میں ہر وقت ذکر اللہ کرنے کا بیان ہے حالانکہ بعض اوقات میں ذکر اللہ کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے قضاء حاجت وغیرہ میں منع ہے اس اشکال کے کئی جوابات ہیں۔ پہلا جواب: یہ کہ احيائه سے صالحۃ للذکر اوقات مراد ہیں تو نامناسب اوقات یا مقامات اس سے خارج ہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ ”احیاء“ کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف لوٹانے سے یہ اعتراض آتا ہے یعنی آپ اپنے تمام اوقات میں ذکر فرماتے تھے مگر علامہ سندھی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”احیاء“ کی ضمیر ذکر اللہ کی طرف راجع ہے جو اس سے قبل مذکور بھی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ ذکر کے اوقات میں ہر وقت ذکر فرماتے تھے اور ذکر کے اوقات وہی جائز اوقات ہیں۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ ذکر سے مراد ذکر لسانی نہیں ہے بلکہ ذکر قلبی ہے اور وہ ہر وقت جاری رہ سکتا ہے لیکن شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لغات میں اس توجیہ کو رد فرما کر کہا ہے کہ یہ لغت اور شریعت دونوں کے منافی توجیہ ہے کیونکہ لغت اور شریعت ذکر لسانی کو ذکر کہتی ہے نہ کہ ذکر قلبی کو۔ ل

الفصل الثانی

﴿۶۷﴾ وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِغْتَسَلَ بَعْضُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ فَأَرَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَتَوَضَّأَ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِيَّيْ كُنْتُ جُنُبًا فَقَالَ إِنْ الْمَاءَ لَا يُجَدِّبُ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو حَاوٍ وَابْنُ مَاجَهَ وَزَيْدُ الدَّارِمِيُّ نَحْوَهُ وَلِي شَرْحُ الشُّلُوْغِ عَنْهُ عَنْ مَيْمُونَةَ بِلَفْظِ الْمَصَابِيحِ)

توضیح:

لا تقرأ الحائض: لا تقرأ کے ہمزہ پر ضم ہے یہی کا صیغہ ہے جنی کے معنی میں مستعمل ہے بعض نے جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ بھی کا صیغہ ہے یعنی حائضہ اور جنی قرآن سے کچھ نہ پڑھے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ حرجان اور حائلت نفس کے لئے حائضہ اور جنی آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ چھوٹی آیتیں ہوں۔

ان سے دوسری روایت اس طرح منقول ہے کہ جنی آدمی قرآن نہیں پڑھ سکتا اور حائضہ اور نساء عورت کے لئے پڑھنا جائز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنابت تو ہر وقت آسکتی ہے اور اس کا وقت کم ہوتا ہے تو غسل کر لے اور پھر تلاوت کرے اور حیض و نفاس کی مدت لمبی ہوتی ہے اس لئے ان کے لئے گنجائش ہے۔

جمہور علماء اور تمام احناف کے نزدیک جنی اور حائضہ و نساء کے لئے قرآن کا پڑھنا جائز نہیں ہے پوری آیت کے نہ پڑھنے پر تو سب کا اتفاق ہے البتہ ما دون الآیۃ یعنی آدھی آیت کے پڑھنے نہ پڑھنے میں امام طحاوی رحمہ اللہ اور علامہ کرخی رحمہ اللہ کا اختلاف ہے علامہ کرخی رحمہ اللہ کے نزدیک ما دون الآیۃ کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ کے نزدیک ما دون الآیۃ کا پڑھنا جائز ہے کیونکہ اس قلیل مقدار پر قرآن کا حکم نہیں لگتا ہے بعض علماء نے علامہ کرخی رحمہ اللہ کی رائے کو ترجیح دی ہے کہ اس میں احتیاط ہے اور بعض نے امام طحاوی رحمہ اللہ کے قول کو راجع قرار دیا ہے کہ اس میں سہولت اور آسانی ہے اس مسئلہ میں علماء کرام یعنی جمہور اور دیگر علماء کے اقوال میں کافی تفاوت ہے خاص ضابطہ نہیں ہے جس پر اتفاق ہو جائے آج کل معلومات خواتین کے لئے یہ مسئلہ درد سر بنا ہوا ہے تو علماء ان کو امام طحاوی رحمہ اللہ کے مسلک کے متعلق بتاتے ہیں کہ پوری آیت نہ پڑھے بلکہ کاٹ کاٹ کر پڑھے یا صرف سچے کر کے چھوڑ دے بہر حال ظاہر حدیث میں ممانعت ہے اس لئے حلیہ بہانوں میں نہیں پڑھنا چاہیے جمہور علماء کے نزدیک عدم جواز پر فتویٰ ہے۔

مسئله عبور المسجد للحائض والجنب

﴿۱۹﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَجَّهُوا هَذِهِ الْمَيُوتَ عَنِ الْمَسْجِدِ فَإِنِّي لَا أَجِزُ الْمَسْجِدَ لِلْحَائِضِ وَلَا لِلْجَنْبِ. (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”مکانوں کے یہ دروازے مسجد کی طرف سے پھیر دو کیونکہ حائضہ اور جنی کو مسجد میں داخل ہونا (خواہ وہاں ٹھہرنے کے لئے ہو یا وہاں گزرنے کے لئے) میں جائز نہیں

کرتا۔“ (رواہ ابوداؤد)

توضیح: فانی لا احل المسجد: حائضہ، نفساء اور جنبی کے لئے مسجد میں ٹھہرنا یا گزرنا جائز ہے یا نہیں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف عبور اور گزرنا جائز ہے ”مکث“ یعنی ٹھہرنا جائز نہیں ہے امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں وضو کرنے کے بعد مکث اور مرور جائز ہے کیونکہ وضو سے تقلیل نجاست آ جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مرور عبور اور مکث وقوع مطلقاً ناجائز ہے۔

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے سورۃ النساء کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا“

طرز استدلال اس طرح ہے کہ لا تقربوا الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے مواضع صلوٰۃ یعنی مسجدیں مراد ہیں مطلب یہ ہوا کہ نشہ کی حالت میں مسجدوں کے قریب نہ جاؤ جب تک نشہ اتر نہ جائے اسی طرح جب تم جنابت میں ہو تو مسجدوں کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کرو۔

”الا عابری سبیل“ ہاں اگر صرف راستے کو عبور کرنا مقصود ہو تو پھر ممانعت نہیں جنابت کی حالت میں مسجد کو عبور کر سکتے ہیں تو یہ استثناء لا تقربوا الصلوٰۃ سے ہے اور صلوٰۃ سے مراد مواضع الصلوٰۃ ہیں تو صرف عبور جائز ہوا۔

احناف و مالکیہ کی دلیل زیر بحث صحیح اور صریح حدیث ہے جس میں کسی قید کے بغیر مطلقاً عبور و مرور کو ناجائز کہا گیا ہے۔

جواب: شوافع اور حنابلہ کو جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ سے مواضع صلوٰۃ مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے صلوٰۃ سے مراد نماز ہے جو اس کا حقیقی معنی ہے اس کو چھوڑ کر مجازی معنی لینا جائز نہیں ہے۔

نیز اس آیت میں دو حکم بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک نشہ اتر نہ جائے دوسرا حکم یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں نماز نہ پڑھو جب تک غسل نہ کرو ”الا عابری سبیل“ یعنی ہاں اگر تم راستے پر چلنے والے مسافر ہو اور پانی نہیں ملتا ہے تو پھر تم غسل کے لئے تیمم کر سکتے ہو خلاصہ یہ کہ اس عابری سبیل کا تعلق مسافر سے ہے اس سے مسافر مراد ہے مسجد میں گزرنے والے سے اس کا تعلق نہیں ہے نیز یہ مسئلہ مسیح اور محرم کا ہے مسیح و محرم میں جب تعارض ہوتا ہے۔ تو ترجیح محرم کو ہوتی ہے لہذا مرور عبور اور مکث وقوع مسجد میں جنبی اور حائضہ کے لئے جائز نہیں ہے صریح حدیث پر عمل بہتر ہے نیز احتیاطاً احناف و مالکیہ کے مسلک میں ہے۔

تصاویر کی ممانعت

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ صُورَةٌ وَلَا كَلْبٌ وَلَا جُنُبٌ (رواه أبو داود والنسائي) ۱

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”جس گھر میں تصویر یا کتا یا جہی ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔“ (نسائی)

توضیح: لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ: فرشتوں سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں کیونکہ رحمت کے فرشتے تو ہر جگہ آتے ہیں۔ صورۃ: تصویر سے جاندار اور ذی روح کی تصویر مراد ہے تصاویر کی حرمت کے معاملے میں کچھ شرائط اور تفصیل ہے۔

① قد آدم کی پوری تصویر مراد ہے یا کم از کم اہم حصوں کی تصویر مراد ہے جن سے آدمی کی زندگی اور موت کا تعلق ہے لہذا جس تصویر میں سر نہ ہو یا پورا سیدھا اور ناف سے نیچے کے اعضاء نہ ہوں تو وہ تصویر اس وعید سے خارج ہے۔ ۲

② تصویر اتنی چھوٹی اور پتلی نہ ہو کہ اسے اگر زمین پر رکھا جائے اور کھڑا آدمی اس کو دیکھ کر اس کی جنس اور اس کے اعضاء کی تمیز نہ ہوتی ہو اگر اتنی چھوٹی ہے اور اس طرح پتلی ہے تو وہ بھی وعید سے خارج ہے۔

③ شوقیہ تصویر ہو جو بطور اعزاز نمایاں جگہ پر رکھی ہوئی ہو اور اگر مہمان ہے یعنی فرش یا قالین تکلیف تلافی وغیرہ ایسی جگہوں میں رکھی ہوئی ہے جسے روندنا جاتا ہے تو وہ بھی اس وعید سے خارج ہے۔

ولا کلب: اس سے شوقیہ یا کتا مراد ہے جو کیداری کا کتا اور شکاری کتا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ۴

ولا جنب: جنب سے وہ جہی آدمی مراد ہے جس نے جنابت میں رہنے کو اپنی عادت بنا ڈالی ہے اور غسل کو اتنا موخر کرتا ہے کہ فجر وغیرہ کی نماز قضاء ہو جاتی ہے۔ صرف غسل کرنے میں تاخیر کرنے پر وعید نہیں ہے۔ ۵

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عُمَارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا تَقْرَبُهُمُ الْمَلَائِكَةُ حَيْفَةُ الْكَافِرِ وَالْمُتَضَمِّنُ بِالْخُلُوفِ وَالْجُنُبُ إِلَّا أَنْ يَتَوَضَّأَ (رواه أبو داود) ۶

ترجمہ: اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”تین شخص ایسے ہیں کہ رحمت کے فرشتے ان کے قریب بھی نہیں آتے: ① کافر کا بدن ② خلوق کا ملنے والا ③ جہی جب تک وضو نہ کرے۔“ (ابوداؤد)

۱۔ أخرجه أبو داود ۲۲۴۵ والنسائي ۱/۱۳۱ ع. المرقاۃ ۲/۱۶۱، ۲۶۲

۲۔ المرقاۃ ۲/۲۶۲ ع. المرقاۃ ۲/۱۶۲ ۳۔ أخرجه أبو داود ۳۱۸

بلا وضو مس صحف کا حکم

۱۴۱۰ هـ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ بْنِ مُحَمَّدٍ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَتْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنْ لَا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرًا. (رواه مالك والدارقطني) ۱

ترجمہ: اور حضرت عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم راوی ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم ﷺ نے جو ہدایت نامہ عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا اس میں یہ (حکم بھی) مرقوم تھا کہ قرآن کریم کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگایا کریں۔“ (مالک، دارقطنی)

توضیح: جمہور علماء و محدثین اور فقہاء کے نزدیک بغیر طہارت کے قرآن عظیم کا چھونا اور اس کو ہاتھ میں لینا جائز نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح بغیر طہارت کے قرآن پڑھنا جائز ہے اسی طرح چھونا بھی جائز ہے۔ جمہور نے زیر بحث حدیث سے استدلال کیا ہے پھر جو چیز مصلحی بالقرآن ہے وہ بھی چھونے میں قرآن کے حکم میں ہے مثلاً قمیص وغیرہاں جو چیز الگ ہے اور قرآن اس میں لپیٹا گیا ہے جیسے غلاف و چادر اور رومال وغیرہ تو اس کے ساتھ چھونا جائز ہے آستین انسان کے جسم سے وابستہ ہے لہذا اس کے علاوہ کسی کپڑے کو چھونے میں استعمال کرنا چاہیئے چھونے سے بچے اس حکم سے بوجہ ضرورت مستثنیٰ ہیں۔

جمہور نے قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے ”لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ یہاں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور مطہرون سے مراد با وضو لوگ ہیں اس تفسیر کے مطابق یہ آیت جمہور کی دلیل ہے۔ بعض مفسرین نے لا یمسہ کی ضمیر کو ”کتاب مکنون“ یعنی لوح محفوظ کی طرف لوٹائی ہے اور المطہرون سے فرشتے مراد لئے ہیں اس صورت میں یہ آیت جمہور کی دلیل نہیں رہے گی امام مالک رحمہ اللہ نے اسی تفسیر کو لیا ہے بہر حال صریح و صحیح حدیث اور احتیاط و ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جمہور کے مسلک پر عمل کیا جائے اور بلا وضو قرآن کو ہاتھ نہ لگایا جائے البتہ یاد سے پڑھ سکتا ہے۔ ۲

سلام کے جواب کے لئے وضو

۱۴۱۰ هـ وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ إِنَّمَا لَقِيتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي حَاجَةٍ فَقَطِي ابْنُ عُمَرَ حَاجَتُهُ وَكَانَ مِنْ حَدِيثِهِ يَوْمَئِذٍ أَنْ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ فِي سَكَّةٍ مِنَ الشَّكَاكِ فَلَمَّ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَقَدْ خَرَجَ مِنْ غَايِطٍ أَوْ بُولٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتَّى إِذَا كَادَ الرَّجُلُ أَنْ يَتَوَازَى فِي السَّكَّةِ ضَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِيَدَيْهِ عَلَى الْحَايِطِ وَمَسَحَ بِمَا وَجَّهَهُ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرَى فَتَسَحَّحَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَى الرَّجُلِ السَّلَامَ وَقَالَ إِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرُدَّ عَلَيْكَ السَّلَامَ إِلَّا أَنِّي لَمْ أَكُنْ عَلَى طَهَرٍ. (رواه أبو داود) ۳

تیمم کے بعد حضرت تابع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما استنجاء کے لئے جا رہے تھے میں بھی ان کے ہمراہ ہوں (پہلے تو) انہوں نے استنجاء کیا اور اس کے بعد انہوں نے اس روز یہ حدیث بیان کی کہ ایک شخص کسی کوچہ میں جا رہا تھا اور سرکارِ دو عالم ﷺ پیدائش یا پاخانہ سے فارغ ہو کر تشریف لارہے تھے اس شخص نے آپ سے ملاقات کی اور سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا جب یہ شخص (دوسرے) کوچہ میں مڑنے کو ہوا تب سرکارِ دو عالم ﷺ نے (تیمم کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ کو دیوار پر مار کر منہ پر پھیرے پھر (دوسری مرتبہ) مار کر اپنے ہاتھوں پر کھینچیں تک پھیرے اس کے بعد اس شخص کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا ”مجھے تمہارے سلام کا جواب دینے سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا فقط یہ بات تھی کہ میں بے وضو تھا۔“ (ابوداؤد)

توضیح: ثم ضرب ضربۃً اُخری: اس حدیث سے ایک یہ بات واضح طور پر معلوم ہوئی کہ تیمم کے لئے دو ضربیں ہیں یہ مسئلہ تیمم میں آئے گا کہ اختلاف کے ہاں دو ضربیں ضروری ہیں۔ اس کے بعد اس حدیث پاک سے دو قاعدے مستنبط ہو جاتے ہیں۔

● پہلا قاعدہ یہ مستنبط ہو گیا کہ اگر کسی عمل کے لئے وضو ضروری ہو لیکن وہ عمل ایسا ہو کہ اسکے فوت ہونے کے بعد وہ ہاتھ نہیں آسکتا ہو اور نہ اس کا بدل ہو اور نہ قضاء ہو مثلاً جنازہ ہے یا عیدین کی نماز ہے کہ اس کے فوت ہونے سے نہ اس کا بدل مل سکتا ہے نہ قضاء کر سکتے ہیں اگر اس وقت وضو بنانے میں آدمی لگ جائے اور اس عمل کے فوت ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس آدمی کو چاہیے کہ وضو کے بجائے تیمم کرے اگرچہ پانی موجود ہے جس طرح یہاں آنحضرت ﷺ نے سلام کے جواب کیلئے تیمم کیا کیونکہ اس آدمی کے چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

● دوسرا قاعدہ یہ مستنبط ہوا کہ جس کام کے لئے طہارت شرط نہ ہو یا وہ عبادت غیر مقصودہ ہو یعنی غیر کے لئے وسیلہ ہو، اس کے لئے تیمم کرنا جائز ہے، اگرچہ پانی قریب میں موجود ہو۔

مثلاً مسجد میں داخل ہونے کے لئے تیمم کیا، زبانی تلاوت کے لئے کیا، فقہ کی اسلامی کتابوں کو ہاتھ لگانے کے لئے تیمم کیا یا رات کو سونے کے لئے تیمم کیا یہ سب جائز اور باعثِ ثواب و برکت ہے آنحضرت ﷺ نے صرف سلام کے جواب کے لئے تیمم کیا حالانکہ اس کے لئے طہارت شرط نہیں درمختار نے اس ضابطہ کو قبول کیا ہے اگرچہ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اس پر رد کیا ہے۔ حضرت شاہ انور شاہ صاحب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ قاعدہ صحیح ہے۔

۱۶۱ وَعَنِ الْمُهَاجِرِ ابْنِ قُصَيْدٍ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ يَتَوَلَّى قَسْلَمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يُدْعَ عَلَيْهِ حَتَّى تَوَضَّأَ ثُمَّ اعْتَلَدَ إِلَيْهِ وَقَالَ إِنِّي كَرِهْتُ أَنْ أَذْكَرَ اللَّهَ إِلَّا عَلَى ظَهْرِي.

(بخاری) ابو داؤد و ترمذی و النسائی قال قولہ عفی تو وضاً وقال فلما تَوَضَّأَ رَدَّ عَلَيْهِ

ترجمہ: حضرت مجاہد بن جسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ یہ (ایک مرتبہ) سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جبکہ آپ پیشاب کر رہے تھے انہوں نے سلام عرض کیا آنحضرت ﷺ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ آپ نے وضو فرمایا اور پھر یہ عذر بیان فرمایا کہ ”میں اسے ٹکروہ سمجھتا ہوں کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو“ (ابوداؤد) اور نسائی نے یہ روایت لفظ حتیٰ تو ضاء (یہاں تک کہ آپ نے وضو فرمایا) تک نقل کی ہے اور کہا کہ جب آپ نے وضو فرمایا تو سلام کا جواب دیا۔“

الفصل الثالث

جنابت کی حالت میں آدمی سو سکتا ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحْبِبُ ثَمَّ يَنَامُ ثَمَّ يَنْتَبِهُ ثَمَّ يَنَامُ.

(رواہ أحمد)

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ حالتِ ناپاکی میں سو جایا کرتے تھے اور پھر جاگتے اور سو جاتے۔ (رواہ احمد)

وضو میں سات مرتبہ پانی بہانے کا مطلب

﴿۱۸﴾ وَعَنْ شُعْبَةَ قَالَ إِنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يُفْرِغُ بِيَدِهِ الْيُسْرَى عَلَى يَدِهِ الْيُسْرَى سَبْعَ مَرَّاتٍ ثَمَّ يَغْسِلُ قَرْجَهُ فَتَنِي مَرَّةً كَمْ أَفْرَغَ فَسَأَلَنِي فَقُلْتُ لَا أَدْرِي فَقَالَ لَا أَمَرَ لَكَ وَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَدْرِي ثَمَّ يَتَوَضَّأُ وَضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ ثَمَّ يُفِيضُ عَلَى جِلْدِهِ الْمَاءَ ثَمَّ يَقُولُ هَكَذَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَطَهَّرُ. (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: اور حضرت شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب ناپاکی کا غسل فرماتے تو (پہلے) اپنے داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر سات مرتبہ پانی ڈالتے پھر اپنی شرمگاہ دھوتے ایک مرتبہ یہ بھول گئے کہ پانی کتنی بار ڈالا ہے چنانچہ انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے عرض کیا مجھے یاد نہیں انہوں نے فرمایا تمہاری ماں مرے تمہیں یاد رکھنے سے کس نے روک دیا تھا؟ پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کر کے اپنے سارے بدن پر پانی بہالیا اور کہنے لگے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ بھی اسی طرح پاک ہوا کرتے تھے۔ (رواہ ابوداؤد)

توضیح: سب سے مراد: سات مرتبہ پانی بہا کر ہاتھ دھونے کے لئے کوئی حدیث نہیں ہے آنحضرت ﷺ کا عمل مطلق دھونے کا بھی ہے اور دو یا تین بار دھونے کا بھی ہے سات بار کا ذکر نہیں ہے تو شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کسی مخصوص ضرورت کے تحت ایسا کیا ہے اس سے ضابطہ شرعیہ نہیں بنایا جاسکتا ہے یہ کوئی مخصوص جزئی معاملہ ہے۔ ۳

لا اہلک: یہ کلمہ مذمت میں استعمال ہوتا ہے اور "لا اہلک" زیادہ تر مدح میں استعمال ہوتا ہے پہلے کلمہ کا مطلب یہ کہ تم لقیط ہوتماہری ماں کا پتہ نہیں اور دوسرے کلمہ کا مطلب یہ کہ تم خود مستقل آدمی ہو تمہیں باپ کی کیا ضرورت ہے باپ نہ بھی ہو تو تم خود باپ ہو یہ مدح کا پہلو ہے۔

﴿۱۹﴾ وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَافَ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى نِسَائِهِ يَغْتَسِلُ عِنْدَ هَذِهِ وَعِنْدَ هَذِهِ قَالَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَا تَجْعَلُهُ غُسْلًا وَاحِدًا آخِرًا قَالَ هَذَا أَزْكَى وَأَطْيَبُ وَأَظْهَرُ.
(رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ایک روز اپنی تمام بیویوں کے پاس آئے (یعنی سب سے جماع کیا) اور ہر ایک بیوی سے (جماع سے فارغ ہو کر علیحدہ علیحدہ) غسل فرمایا ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے آخر میں ایک ہی مرتبہ کیوں نہ غسل کیا آپ نے فرمایا یہ (یعنی ہر جماع کے بعد غسل کرنا) خوب پاک کرتا ہے (نفس کو) بہت خوش آئند ہے اور (جسم) کو خوب صاف کرتا ہے۔ (احمد و ابوداؤد)

عورت کے غسل اور وضو سے بچے ہوئے پانی کا حکم

﴿۲۰﴾ وَعَنِ الْحَكَمِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَقُولَ: مَنْ تَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طَهْوَرِ الْمَرْأَةِ.
(رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ و الترمذی و زاد أَوْ قَالَ بِسُورَةٍ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ ضَعِيفٌ)

ترجمہ: اور حضرت حکم ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے عورت کے (غسل یا وضو) کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع فرمایا ہے (ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی) اور ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "آپ نے منع فرمایا عورت کے (وضو کے) بقیہ پانی سے نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مرد و عورت ایک دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کریں

﴿۲۱﴾ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَبِيبِ قَالَ لَقِيتُ رَجُلًا صَاحِبَ النَّبِيِّ ﷺ أَرْبَعِ سِنِينَ كُنَّا صَحْبَهُ أَبُو هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَقُولَ: مَنْ تَوَضَّأَ الرَّجُلُ أَوْ يَغْتَسِلُ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ زَادَ

مُسْنَدٌ وَلِيَعْتَرِفَا بِجَوْنِهِمَا. (رواة أبو داود والنسائي وزاد أحمد في أوليه على أن يَتَمَيَّزَ أَعْدَا كُلَّ يَوْمٍ أَوْ يَتَوَلَّى مُغْتَسِلًا وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْجَسٍ) ۱

ترجمہ: حضرت حمید حمیری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں ایک شخص سے ملا جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح چار برس سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں رہ چکے تھے انہوں نے کہا کہ سرکارِ دو عالم رضی اللہ عنہ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورت مرد (کے غسل) کے بچے ہوئے پانی سے نہائے یا مرد عورت (کے غسل) کے بچے ہوئے پانی سے نہائے۔ مسند و رحمہ اللہ نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ دونوں اکٹھے ہو کر (علحدہ علیحدہ) چلو لے کر نہائیں (تو جائز ہے)۔

(ابوداؤد، نسائی) اور امام احمد نے اس روایت کے شروع میں یہ الفاظ ذکرِ نقل کئے ہیں کہ آپ نے اس سے (بھی) منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص ہر روز نکلتی کرے اور نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے یہ روایت عبد اللہ بن مر جس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔



باب احکام المیاء

پانی کے مسائل

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر شعبے کے مسائل کا حل موجود ہے پانی زندگی کیلئے اہم ضرورت ہے اس کے پاک اور ناپاک ہونے کے لیے چوڑے مسائل ہیں اسلام نے مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے پانی کے سارے مسائل و فضائل اور آداب و مستحبات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

یہاں میاء جمع کا صیغہ لایا گیا ہے جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ پانی خواہ بارش کا ہو کنوئیں کا ہو نہر کا ہو یا سمندر اور دریا کا یا چشموں کا ہو قلیل ہو یا کثیر ہو مستعمل ہو یا غیر مستعمل ہو سب کے احکام بیان ہوں گے۔

اسلام کے احکام میں عجیب حکمت ہوتی ہے مثلاً وضو کی ابتداء میں ہاتھ دھونے کا حکم ہے تاکہ ہاتھوں سے اندازہ ہو جائے کہ پانی ابلا ہوا سخت گرم یا سخت ٹھنڈا تو نہیں جب معلوم ہوا کہ قابل استعمال ہے تو پھر منہ میں ڈالنے کا حکم دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ پانی ہے شور یا یا شربت وغیرہ نہیں ہے پھر ناک میں ڈالنے کا حکم دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ بدبودار مڑا ہوا تو نہیں ہے جب خوب اطمینان ہو تو حکم ملا کہ اب چہرہ پر ڈالتے جاؤ۔

الفصل الاول

پانی میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَبْتُولُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَا يَجْرِي ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ﴾ (مسند ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) قَالَ لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ قَالُوا كَيْفَ يَفْعَلُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ يَتَّقَا وَكَيْفَ تَقَاؤُكُمْ ۚ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بہنے والا نہ ہو پیشاب نہ کرے کہ پھر اس میں غسل کرنے لگے (یعنی کسی دائمی ٹھہرے سے یہ بعید ہے کہ وہ پانی میں پیشاب کرے پھر اسی پانی سے غسل کرے) (بخاری و مسلم) مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ”آپ نے فرمایا تم میں کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے (تاکہ پانی ناپاک نہ ہو جائے) لوگوں نے کہا اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پھر کس طرح نہانا چاہیے انہوں نے فرمایا اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی (چلو سے) لے کر (پانی سے باہر نہانا چاہیے)۔

توضیح: فی الماء الدائم: اس روایت میں الدائم کا لفظ ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی آنے والی روایت میں را کد کا لفظ آیا ہے عام علماء کے نزدیک دائم اور را کد کا مطلب "الذی لا یجری" ہے یہ دائم کے لئے صفت کا وہ ہے کہ دائم سے مراد غیر جاری پانی ہے۔

لیکن شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ماء دائم اور را کد سے مراد وہ پانی ہے جو غیر منقطع ہو یعنی دائمی ہو نہ ختم ہونے والا پانی ہو خواہ وہ جاری ہو یا جاری نہ ہو تو یہاں جو الذی لا یجری کے الفاظ ہیں یہ کوئی قید احترازی نہیں نہ یہ بیان تعریف کے لئے ہے بلکہ ماء دائم کی ایک قسم کے لئے یہ قید لگائی گئی ہے کہ دائم کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو الذی لا یجری ہے۔

دائم و را کد پانی میں پیشاب کرنے سے اس لئے روکا گیا ہے کہ اگر یہ قلیل پانی ہوگا تو پیشاب کرنے سے نجس ہو جائے گا اور اگر کثیر ہوگا تو ایک کے پیشاب کو دیکھ کر دوسرا آ کر کرے گا۔ اس طرح بالآخر پانی خراب ہو جائے گا ویسے بھی پانی میں پیشاب کرنا انسانی شرافت کے منافی ہے چنانچہ منع ہے۔

ثم یغتسل فیہ: "یغتسل" کا صیغہ مشہور روایت کے مطابق مرفوع ہے یعنی "لا یسل ثم ہو یغتسل فیہ" تو یہ لا یسل کے پورے جملے پر عطف ہے بعض علماء نے اس صیغہ کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کو لائمی کے ماتحت یسل پر عطف کیا ہے اور دونوں جملوں کو نہی کے ماتحت داخل کیا ہے۔

بہر حال پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی شخص کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور یہ کتنی غیر معقول بات ہے کہ پہلے پیشاب کیا اور پھر اس سے غسل کر لیا ہے اس صورت میں ثم استبعاد اور تعجب کے لئے ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں حدیث کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ کوئی شخص نہ کھڑے پانی میں پیشاب کرے اور نہ کھڑے پانی میں غسل کرے، اس صورت میں دونوں باتوں سے منع کیا ہے بعض علماء نے ثم کے بعد "ان" مقدّر مان کر منصوب پڑھا ہے۔

﴿وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُسَالَ فِي الْمَاءِ الرَّائِي. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)﴾

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

﴿وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ ذَهَبْتُ بِي خَالَتِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ ابْنِي أَخْبَتِي وَجَعْتُ فَتَسَحَّ رَأْيِي وَدَعَا لِي بِالْبِرِّ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَعَرَّبْتُ مِنْ وَضُوئِهِ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَتَنَظَّرْتُ إِلَى خَائِمِ الثُّبُوقِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ رِيِّ الْحَجَلَةِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)﴾

تیسرے جہیز: اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری خالہ مجھے سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! (یہ) میرا بھانجا بیمار ہے چنانچہ آپ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا کی، پھر آپ نے وضو کیا اور میں نے آپ کے وضو کا پانی پی لیا اس کے بعد میں آپ کی پشت مبارک کے پیچھے کھڑا ہو کر مہرِ نبوت کو دیکھنے لگا جو آپ کے مونڈھوں کے درمیان تھی اور لہن کے پلنگ کی گھنڈی کی طرح (چمک رہی) تھی۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: فشریت من وضوئہ: وضو میں اگر دوا کا ضمہ پڑھیں گے تو اس سے وضو کا عمل اور نام مراد ہوتا ہے اور اگر دوا پر فتح پڑھیں گے تو اس سے مراد وہ پانی ہوتا ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچتا ہے اور اگر دوا کا کسرہ پڑھیں گے تو اس سے وضو کے پانی کا برتن مراد ہوتا ہے یہاں اگر دوا کا فتح ہے تو مراد یہ کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے وضو سے بچا ہوا پانی بطور تبرک پی لیا اس میں کسی قسم کی قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے اور حدیث کے اس مطلب کی طرف بہت سارے علماء گئے ہیں۔

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لمعات میں لکھا ہے کہ اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وضو کے اعضاء سے جو پانی نیچے گرتا تھا میں نے اس کو حاصل کر کے پی لیا شیخ فرماتے ہیں کہ بہت سارے علماء نے اس مفہوم کو لیا ہے یہاں سے مستعمل پانی کے استعمال میں فقہاء کے اختلاف کا مسئلہ سامنے آتا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں آئے گی۔

یہاں تو ماء مستعمل کہنا بھی مشکل ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے مبارک اعضاء سے الگ شدہ پانی تو باعثِ برکت تھا جس پر صحابہ کرام لڑتے تھے یہ آپ کی خصوصیت تھی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے فضلات پاک تھے تو مستعمل پانی کا کیا کہنا۔

خاتم النبوة: یہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کی نشانی تھی اس کو مہرِ نبوت اور ختمِ نبوت کہتے ہیں یہ آپ کے کندھوں کے درمیان بائیں کندھے کی غضروف کی ہڈی کے نیچے تھی یہ آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک ہی کا ابھرا ہوا نہایت خوشنما حصہ تھا سابقہ کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا اس لئے اہل کتاب بطور خاص اس کو دیکھ لیا کرتے تھے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ختمِ نبوت پیدائش کے وقت سے آپ کے جسد اطہر پر موجود تھی ایک ضعیف قول ہے کہ مہرِ نبوت پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "سرفانت منصور" بعض علماء کا خیال ہے کہ شقِ صدر کے وقت سے یہ مہر ظاہر ہوئی تھی اور وفات کے وقت جسم میں غائب ہو گئی۔

زرد الحجلۃ: حجلۃ اس مسہری کو کہتے ہیں جو لہن کی مجلس میں اس کے لئے سجائی جاتی ہے اس پر خوبصورت پردے لگائے جاتے ہیں اور اس میں جو گھنڈیاں ہوتی ہیں اسی کو "زرد" کہتے ہیں جس کی حج ازاد ہے۔ شاعر نے کہا:۔

لا تعجبوا من ہلی غلالته قل زر ارادة علی القبر
بعض نے اس لفظ کو را کی تقدیم کے ساتھ "زر الحجلة" پڑھا ہے "زر" انڈے کو کہتے ہیں اور "حجلہ" چکور کو کہتے ہیں
یعنی چکور کے انڈے کے برابر ختم نبوت تھی مہر نبوت کی مقدار اور رحم کے بارے میں مختلف الفاظ آئے ہیں سب میں تعارض
معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کوئی تعارض نہیں ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے کے مطابق اظہار خیال فرما کر تشبیہ دے دی ہے
زیادہ واضح کیونتر یا چکور کے انڈے سے تشبیہ ہے۔

الفصل الثانی

مسئلة بئر بضاعة وحديث القلتين

﴿٤﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْمَاءِ يَكُونُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْأَرْضِ وَمَا يَكُونُهُ
مِنَ الدُّوَابِّ وَالشَّجَرِ فَقَالَ إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلْتَيْنِ لَمْ يَحْتَمِلِ الْحَبَشَ.

(رواه أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي والدارقطني وابن ماجه وفي الهري لأبي داود ولأئمة لا يمتنع)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے اس پانی کا حکم پوچھا گیا جو جنگل میں زمین پر جمع
ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر چوپائے درختوں سے اس پر آتے جاتے رہتے ہیں (یعنی جانور وغیرہ اس پانی پر آکر اسے پیتے ہیں اور پیشاب
وغیرہ بھی کرتے ہیں) آپ نے فرمایا کہ اگر پانی دو قلوں کے برابر ہو تو وہ ناپاک کی قبول نہیں کرتا (یعنی نہاست و گھبرہ پڑنے سے
ناپاک نہیں ہوتا) احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

﴿٥﴾ وَعَنِ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْتَوُهَا مِنْ بئرِ بَضَاعَةٍ وَهِيَ بئرٌ يُفْلَى فِيهَا
الْحَبَشُ وَالْحَوْمُ الْكِلَابِ وَالثَّغْنُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْمَاءَ ظُهُورٌ لَا يُتَجَسَّسُ فِيهِ.

(رواه أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي)

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم
بضاعہ کے کنوئیں (کے پانی) سے دھو کر سکتے ہیں جبکہ اس کنوئیں میں حبش (خون میں بھرے ہوئے) کپڑے، کتوں کا گوشت
اور گندگی ڈالی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اس کنوئیں کا) پانی پاک ہے (جب تک اس کے رنگ، مزہ اور بوی میں فرق نہ
آئے) اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

توضیح: اذا كان الماء قلتين الخ: حدیث بئر بضاعہ اور حدیث قلتین چونکہ دونوں پانی میں نجاست گرنے اور
پھر پانی کے پاک رہنے یا ناپاک ہو جانے سے متعلق ہیں اس لئے عمومی طور پر دونوں کی تشریح ایک ساتھ ہوتی ہے اور

ترتیب کے اعتبار سے حدیث بر بضعہ کی تفصیل پہلے ہوتی ہے اور حدیث قلتنین کی بعد میں ہوتی ہے حالانکہ مشکوٰۃ میں ذکر کرنے کے اعتبار سے حدیث قلتنین پہلے آئی ہے اور حدیث بر بضعہ بعد میں ہے لیکن اسی معروف ترتیب کے لحاظ سے یہاں بھی پہلے بر بضعہ پر بحث و تحقیق لکھی جاتی ہے اس مسئلہ کا عنوان اس طرح ہے۔

مسئله وقوع النجاسة في الماء

پانی الطبع ظاہر و مطہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وانزلنا من السماء ماء طهورا" اس لئے اگر پانی میں کوئی پاک چیز شامل ہو جائے اور پانی کی رقت و سیلان باقی ہو اور اسم مآز ازل نہ ہو اور فحش ظاہر کے اختلاط اور غلبہ سے پانی کی طبیعت میں تغیر نہ آیا ہو تو پانی پاک ہے پانی کی طبیعت رقت اور سیلان ہے اور یہی پانی کی ماہیت اور ذات ہے اور اگر پانی میں کوئی نجاست شامل ہو جائے تو پھر دیکھیں گے اگر پانی جاری ہے یا جاری کے حکم میں ہے تو جب تک احد الاوصاف میں تغیر نہ آئے پانی نجس نہیں ہوگا بلکہ پاک رہے گا۔

احد الاوصاف کا مطلب یہ ہے کہ پانی کے تین اوصاف ہیں رنگ، بو، ذائقہ، ان میں سے کسی ایک میں تغیر نہ آیا ہو تو پانی اتقا تا پاک رہے گا اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اور اگر پانی قلیل ہے یعنی نہ جاری ہے اور نہ جاری کے حکم میں ہے اور اس میں نجاست واقع ہو جائے تو اس میں فقہاء کرام کا طویل اختلاف ہے اہم اور مشہور مذاہب کے بیان پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ اور اہل غواہر کے نزدیک پانی کے قلیل اور کثیر ہونے کا اعتبار نہیں احد الاوصاف کے تغیر کا اعتبار ہے تو جب تک کسی وصف یعنی رنگ، بو اور ذائقہ میں تغیر نہ آیا ہو پانی پاک رہے گا اگر جمہور فرماتے ہیں کہ قلیل پانی صرف وقوع نجاست سے پلید اور نا پاک ہو جاتا ہے احد الاوصاف کے تغیر کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن ان حضرات کے آپس میں قلت و کثرت کی تحدید یقین میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے ہاں جب پانی مقدار قلتنین کو پہنچ گیا تو وہ کثیر ہے ورنہ وہ قلیل ہے اس میں انہوں نے اتنا غلو اور تجاوز کیا ہے کہ مثلاً ایک قلدہ اور مقلدہ میں نجس پانی ہے اور دوسرے میں بھی نجس پانی ہے مگر جب دونوں کو ملادیا گیا اور دو قلدے ہو گئے تو اب پانی پاک ہو گیا اور جب الگ الگ کیا تو پھر نجس ہو گیا علامہ نووی رحمہ اللہ شارح مسلم نے ایسا ہی لکھا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک قلت و کثرت کا فیصلہ کرنے میں اس آدمی کی رائے کا اعتبار ہے جو اس مسئلہ میں جتلا ہو گیا ہو یعنی رائے مجتہلی بہ کا اعتبار ہے اگر اس کو یقین ہے کہ یہ پانی کثیر ہے اور ایک جانب کی حرکت و نجاست دوسری جانب تک نہیں جاتی ہے تو کثیر ہے ورنہ قلیل ہے فقہ حنفی کی کتابوں میں جو یہ مشہور ہے کہ "عشر فی عشر"

یعنی وہ درودہ کی مقدار کثیر ہے ورنہ قلیل ہے تو مدار مذہب دراصل اس پر نہیں ہے البتہ اس کی شہرت کی وجہ یوں ہوئی کہ امام محمد رحمہ اللہ نے اپنے ہاں پانی کی قلت و کثرت کا مسئلہ بیان فرمایا اور کثیر پانی کے لئے کہہ دیا "کحوض مسجدی هذا" یعنی میری اس مسجد کے حوض کا جو پانی ہے یہ کثیر ہے سلیمان جوزجانی رحمہ اللہ نے آپ کے چلے جانے کے بعد اس حوض کو ناپ دیا تو وہ درودہ نکل آیا تو عوام میں یہ مسئلہ مشہور ہو گیا اور اس میں عوام کیسے سہولت بھی ہے۔

مالکیہ کے دلائل:

امام مالک اور اہل ظواہر نے اپنے مسلک کے استدلال میں حدیث بحر بضاعہ کو پیش کیا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں "ان الماء طهور لا ینجسہ شیء" اس میں الف لام جنس کیلئے ہے اور شنی نکرہ تحت اللفی واقع ہے جس میں عموم ہے مطلب یہ ہوا کہ جنس پانی پاک ہے۔ کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ ذات پانی باقی ہے اور تغیر نہیں آیا ہے۔ ان حضرات نے تغیر احد الاوصاف کے قاعدہ کے لئے ابن ماجہ کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ استثناء ہے "الا ما غیر لونہ اور یحہ او طعمہ" نیز انہوں نے اجماع امت سے بھی تغیر احد الاوصاف کو لیا ہے کہ رنگ و بو اور ذائقہ بدلنے سے اجماعاً پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل مشکوٰۃ ص ۵۱ فصل سوم پر یحییٰ بن عبد الرحمن رحمہ اللہ کی روایت ہے اور اسی فصل ثالث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ان روایتوں میں واضح طور پر مذکور ہے کہ پانی کو درندوں گدھوں اور کتوں نے استعمال کیا لیکن پھر بھی صحابہ کرام بلکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے نجس قرار نہیں دیا۔

جمہور کے دلائل:

۱۔ ائمہ جمہور نے مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۰ کی حدیث "لا یبولن احد کم فی الماء الدائم" سے استدلال کیا ہے وہاں تغیر اوصاف کا ذکر نہیں بلکہ صرف وقوع نجاست کا ذکر ہے معلوم ہوا اصل مدار وقوع نجاست پر ہے تغیر اوصاف کا قلیل پانی میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔

۲۔ جمہور نے مشکوٰۃ ص ۴۵ پر مذکور حدیث "اذا استیقظ احد کم من نومہ فلا یغسل یدہ فی الاثاء" سے بھی استدلال کیا ہے یہاں بھی پانی میں ہاتھ ڈالنے سے روکا گیا ہے کہ احتمال نجاست ہے حالانکہ اس سے تغیر اوصاف نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ جمہور کی تیسری دلیل مشکوٰۃ ص ۵۲ پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

"اذا شرب الکلب فی اثاء احد کم فیلغسلہ سبع مرات"۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصل اعتبار وقوع نجاست کا ہے تغیر اوصاف کا نہیں یہاں ولو غ کلب سے پانی نجس ہو گیا اور سات دفعہ برتن دھونے کا حکم دیا گیا حالانکہ کسی وصف میں اس سے تغیر نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔

● جمہور کی چوتھی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مشکوٰۃ ص ۳۶۱ پر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

«اذا وقعت الفارقة في السمن فان كان جامدا فالقوها وما حولها وان كان مائعا فلا تقر بوجده»

(سمن ابن داؤد)

اس حدیث میں واضح طور پر مذکور ہے کہ کھی اگر مائع ہے سیال ہے تو چوبھاگرنے سے نجس ہو جائے گا حالانکہ اس سے تغیر اوصاف نہیں ہوتا ہے اسی باب مایحل اکله وما یجرھ میں صاحب مشکوٰۃ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی نقل کی ہے جس کا مضمون مذکورہ حدیث کی طرح ہے جو ص ۳۶۰ پر ہے۔

جواب: بیر بضاع کی روایت کے جمہور نے کئی جوابات دیئے ہیں سبر وار ملاحظہ ہوں۔

① بیر بضاع والی حدیث صحت کے اعتبار سے ان احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے جو جمہور نے پیش کی ہیں یہی وجہ ہے کہ بخاری و مسلم نے بیر بضاع کی حدیث کو اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کیا ہے۔

② بیر بضاع کی روایت کو امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اگرچہ صحیح کہا ہے مگر عیسیٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ نے اس کو سند کے اضطراب کی وجہ سے ضعیف کہا ہے اور جب تصحیح اور تضعیف میں تقابل ہو جائے تو تضعیف کو راجح قرار دیا جاتا ہے۔

③ تیسرا جواب صاحب فتح القدیر نے یہ دیا ہے کہ یہ حکم عام پانی کا نہیں ہے بلکہ سوال بیر بضاع سے متعلق تھا جواب بھی اسی کے متعلق دیا گیا ہے کہ موجود پانی پاک ہے اس سے آئندہ کے لئے عام ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں الف لام عہدی ہے خاص اور معبود پانی مراد ہے۔

اس بات کی وضاحت علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کی تحقیق سے بھی ہو جاتی ہے آپ نے اور میر سید سند شریف رحمہ اللہ دونوں نے لکھا ہے کہ الف لام میں اصل عہد خارجی ہے اگر اس پر عمل ممکن ہے تو دوسری قسموں کی طرف جانا مناسب نہیں ہے اس قاعدہ کا مطلب بھی یہ ہوا کہ یہاں خاص پانی کے متعلق سوال تھا چنانچہ خاص پانی کے متعلق ہی جواب دیا ہے لہذا یہ عام ضابطہ نہیں ہے۔

④ صحابہ کرام کا سوال زمانہ ماضی سے متعلق تھا کہ پہلے اس میں گندگی ڈالی جاتی تھی اب نہیں تو کیا اب ہم وضو کر سکتے ہیں آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پانی طبعاً پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی۔

⑤ بلاذری اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بیر بضاع "غدير" تھا اور غدير بڑے کنوئیں کو کہتے ہیں یعنی یہ قلیل پانی نہیں تھا بلکہ کثیر پانی تھا اس میں ہمیں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کثیر پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

● امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام التاریخ علامہ واقدی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیر بضاعہ چشمہ دار کنواں تھا اس سے قریب کے باغات سیراب ہوتے اس قول سے یہ ثابت ہو گیا کہ بیر بضاعہ کا پانی قلیل نہیں بلکہ کثیر اور جاری کے حکم میں تھا علامہ واقدی رحمہ اللہ پر اگرچہ روایت حدیث میں اعتراض ہے لیکن تاریخ میں وہ امام عند الامام ہیں۔

● سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر بیر بضاعہ کا پانی قلیل تھا تو اتنی نجاستوں کے باوجود آنحضرت ﷺ نے اس کے استعمال کا کیسے حکم دیا اور آپ نے اس کو خود کیسے استعمال فرمایا حالانکہ یہ بدبکلی بات ہے کہ اتنی گندگیاں گرنے کے بعد ایسے پانی کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا ہے اور نہ نوکرے بھر بھر گندگی ڈالے جانے سے پانی کے اوصاف تغیر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

نیز کافر اور مسلمان دونوں پانی کی صفائی ستھرائی اور اس کے صحت بخش ہونے پر متفق ہیں پھر ایک عقلمند کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگوں نے عمد اس میں گندگیاں ڈالیں اور واقعی گندگی پڑی تھی اور وہ اس پانی کو استعمال کرتے تھے لاحالہ یہاں اس روایت میں کئی احتمالات ہیں ان تمام احتمالات پر غور کرنا چاہیے اور بیر بضاعہ کے اس جزئی واقعہ کو ضابطہ نہیں بنانا چاہیئے۔

● صحابہ کا یہ سوال تو ہم اور احتمال دوہم پر مبنی تھا کیونکہ یہ کنواں نالے میں تھا اور سیلاب کے پانی کے ساتھ گندگی آنے کا احتمال اور خطرہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے اسلوب حکیم کے طور پر جواب دیا کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی تم اوہام اور احتمالات کو چھوڑ دو کیونکہ "الیقین لا یزول بالمشک" ایک قاعدہ مسلمہ ہے۔

● شاہ انور شاہ رحمہ اللہ نے بیر بضاعہ کے چشمہ دار کنوئیں اور کثیر پانی ہونے پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ وہاں ایک بوڑھی عورت رات ہی تھی اور بیر بضاعہ کے قریب اس کے چند رکاباغ تھا وہ اس باغ کو اس کنوئیں سے سیراب کرتی تھی اور جمعہ کی نماز کے بعد چند رکاباغ کو کھلاتی تھی صحابہ جمعہ کے انتظار میں رہتے تھے کہ بوڑھی اماں چند رکاباغیں گی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیر بضاعہ چشمہ دار کنواں تھا جس کا پانی جاری تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کا پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی ہے۔

باقی ابو داؤد میں جو مولف نے بیر بضاعہ کا واقعہ لکھا ہے اس میں کئی راوی محمول ہیں وہ قائل استدلال نہیں۔ اور مشکوٰۃ شریف میں حوضوں سے متعلق جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعات ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بڑے حوض تھے جو جاری پانی کے حکم میں تھے کیونکہ مدینہ منورہ کی زمین کے پیش نظر وہاں چھوٹے حوض باقی نہیں رہ سکتے تھے۔

لغات: ... بیر بضاعہ مشہور روایت کے مطابق باکے ضمرہ کے ساتھ ہے بعض نے کسرہ کو بھی جائز کہا ہے ضاد مشہور ہے کسی نے صا بھی پڑھا ہے یہ مدینہ منورہ میں ایک کنوئیں کا نام ہے جو مسجد نبوی سے احد کی طرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر سے پہلے راستے میں دائیں طرف کہیں واقع ہے ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے خود پانی کا ایک ڈول بھرا اور اس سے وضو فرمایا اور پھر وضو کا بچا ہوا پانی لعاب دہن سے ملا کر کنوئیں میں ڈالا۔

صحابہ کرام حضور ﷺ کے زمانہ میں اس پانی سے حصول شفاء کے لئے بیماروں کو غسل دیتے تھے اللہ تعالیٰ شفاء عطا فرماتا تھا۔ بیرضاعہ کے مالک ابن سید علیہ السلام کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اس کنوئیں میں لعاب دہن ڈالا اس کے بعد ہم اس کے پانی کو بطور تبرک استعمال کرتے تھے۔ (کنز الدقائق ج ۱ ص ۱۳۸)

الحیض: حاک کے کسرہ اور یا کے فتح کے ساتھ یہ حیضہ کی جمع ہے اس سے مراد حیض میں استعمال شدہ کپڑے اور چھتھڑے ہیں۔

اللعین: بدبو کو کہا جاتا ہے یہاں مراد بدبودار اشیاء ہیں۔ لحوہ الکلاب یعنی مردہ کتوں کو اور اس کے کٹے ہوئے اعضاء کو پھینکتے تھے۔

حدیث قلتین کی بحث

اذا بلغ الماء قلتین: جمہور اور مالکیہ کے درمیان ماہ قلیل و کثیر میں نجاست پڑنے سے متعلق اختلاف تھا اب ائمہ احناف اور شوافع و حنابلہ کے درمیان پانی کے قلیل و کثیر کی تحدید اور تعیین میں بڑا اختلاف ہے شوافع نے قلیل و کثیر کے لئے قلتین کو معیار بنایا ہے اور احناف نے مبتلی بہ آدمی کی رائے کو معیار بنایا ہے اس کی تشریح پہلے درس میں گزر چکی ہے یہاں ان حضرات کے دلائل کو پیش کیا جاتا ہے۔

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ نے اپنے استدلال میں حدیث قلتین کو پیش کیا ہے کہ کثیر پانی کی حد قلتین ہے اور حدیث میں ہے: "اذا بلغ الماء قلتین لم يحمل الخبث" ای لہ یقبل الخبث یعنی نجاست گرنے سے وہ پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ایک زنجی چاؤ زمزم میں گر کر مر گیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے کنوئیں کے پورے پانی کے اخراج کا حکم دیا روایت میں ہے کہ زمزم کا کنواں چشمہ دار تھا پانی ختم نہیں ہو رہا تھا اور لوگ نکالتے رہے اور ناپاک سمجھ کر کنواں خالی کرتے رہے اس کنوئیں میں ہزاروں قلعے پانی موجود تھا پھر بھی اس کو ناپاک سمجھا گیا اور تمام صحابہ کی موجودگی میں اس پر عمل ہوا کسی نے اعتراض نہیں کیا تو یہ ایک قسم کا اجماع ہو گیا اسی کو لیا جائے گا اور حدیث قلتین کو یا اجماع کے خلاف ہے اس کو تحدید ماہ کیلئے معیار قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

جکبائے: حدیث قلین کا جواب ائمہ احناف اس طرح دیتے ہیں کہ یہ حدیث ① سنداً ② متناً ③ اور معنی مضطرب ہے جس کی وجہ سے حدیث ضعیف ہو جاتی ہے سنداً مضطرب یہ ہے کہ اس حدیث کی روایت کا مدار تین آدمیوں پر ہے۔ اول محمد بن اسحاق، دوم ولید بن کثیر اور سوم حماد بن سلمہ۔

محمد بن اسحاق کے بارے میں تقریباً تمام محدثین متفق ہیں کہ وہ ضعیف ہیں بلکہ امام مالک رحمہ اللہ نے ان کو دجال من الدجاجلہ کے نام سے یاد کیا ہے لہذا حدیث کی سند کا یہ طریق قابل اعتماد نہیں رہا۔

ولید بن کثیر کے طریق میں دو اضطراب ہیں کہیں محمد بن جعفر کا ذکر ہے اور کہیں محمد بن عباد بن جعفر کا ذکر ہے کہیں عبد اللہ بن عمر رحمہ اللہ کا ذکر ہے اور کہیں عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر رحمہ اللہ کا ذکر ہے اسی وجہ سے شیخین نے اس روایت کو نہیں لیا اور امام ابو داؤد نے اپنی کتاب میں اس اضطراب کا ذکر کیا ہے جو ان کی عادت کے مطابق حدیث کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

نیز ابو داؤد کے پرانے نسخوں میں یہ بات ملتی ہے کہ ابو داؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ معارف السنن میں ابو داؤد کے نسخوں پر محدث العصر حضرت بنوری رحمہ اللہ نے بات کی ہے اور فرمایا ہے کہ پہلے نسخوں میں یہ بات ملتی ہے کہ امام ابو داؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، صاحب ہدایہ نے انہیں دو وجوہات کی وجہ سے ابو داؤد کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے حدیث قلین کو ضعیف کہا ہے، حماد بن سلمہ کے طریق میں اس حدیث کے متوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف ہے یہ الگ اضطراب ہے لہذا حدیث قلین سنداً مضطرب ہے اور مضطرب ضعیف ہے قابل استدلال نہیں ہے۔

متناً اضطراب: یہ کہ بعض روایات میں قلین کا ذکر ہے بعض میں ثلاث قلال کا ذکر ہے کسی میں اربع قلال ہے تو کسی میں اربعین قلۃ ہے بعض روایات میں اربعین غربا ہے اور بعض میں اربعین دلوأ ہے بعض میں قلین و ما زاد کے الفاظ ہیں لہذا یہ روایت متن کے اعتبار سے بھی مضطرب ہے جو ضعیف ہونے کی دلیل ہے۔

معنی اضطراب یہ کہ "قلۃ" لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ① قامۃ الرجل ② رأس الجبل ③ الحجرۃ الکبیرۃ یعنی بڑا سنگ شوافع کہتے ہیں کہ ہم مکہ مراد لیتے ہیں احناف کہتے ہیں کہ مکہ بھی بڑے چھوٹے ہو کر مختلف ہو جاتے ہیں۔ شوافع فرماتے ہیں کہ پانچ مشکیزوں والے دو مکے مراد ہیں یعنی ایک مکہ میں ڈھائی مشک پانی بھرتا ہے دو میں پانچ مشک جو تقریباً سوا چھ پن پانی بن جاتا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ مشک کا بھی علم نہیں کہ بھینس کی ہے اونٹ کی یا بکری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس مشک میں تیس یا پچاس استار پانی آجائے وہ مراد ہے احناف کہتے ہیں کہ استار میں بھی تفاوت ہوتا ہے اور اگر قلۃ سے رأس الجبل مراد لو گے تو یہ تمہارے بھی خلاف ہے تو جہالت در جہالت آگئے تو فائین التحدیں؟ ایک اضطراب باعث تضعیف ہوتا ہے یہاں تو تین اضطراب کی لائن لگی ہوئی ہے۔

دوسرا جواب یہ کہ اس حدیث کی صحت و عدم صحت میں علماء کا بھی اختلاف ہے بہت سے محققین نے اس کو صحیح کہا ہے لیکن مذاہب اربعہ کے بہت سارے جہال العلم نے اس کی تضعیف بھی کی ہے علی المدینی نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن القیم رحمہ اللہ جیسے اونچے پائے کے اہل علم نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

بدر الدین یعنی رحمہ اللہ اور صاحب ہدایہ جیسے محققین نے اس کو ضعیف کہا ہے نیز اس حدیث میں ایک علت قاذبہ بھی ہے جس سے حدیث معلول بن جاتی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ پانی جیسے عام استعمال کی چیز میں جب روایت آتی ہے تو جماعت صحابہ میں صرف عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کوئی اور صحابی نہیں کرتا اور پھر آپ کے شاگردوں میں صرف عبد اللہ یا عبید اللہ آپ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں یہ خفی علت ہے جس سے حدیث معلول بن جاتی ہے۔ امام طحاوی نے یہ کہا ہے کہ حدیث صحیح ہے لیکن ہم اس کے معنی کو نہیں سمجھتے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے دو قلعے پانی کے لئے ایک گڑھا کھدوایا اور پھر اس میں دو قلعے پانی بھر دیا وہ فرماتے ہیں کہ یہ دو قلعے وہ درودہ کی مقدار کا پانی تھا لہذا اس میں احتلاف و شوافع کا اختلاف ہی نہیں رہا دونوں کے نزدیک یہ کثیر پانی کے حکم میں ہو گیا۔

حدیث قلتین کا مصداق:

بہر حال اگر حدیث ثابت ہو جائے اور صحیح ہو تو پھر اس کا اصل مصداق کیا ہونا چاہیے؟ تو امام ابو یوسف اسی غلطی کو دل میں رکھ کر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا اصل مصداق کیا ہے اور اس کا مکمل کیا ہونا چاہیے؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا مصداق جنگل کا وہ تھوڑا سا پانی ہے جو ٹپک ٹپک کر ایک گڑھے میں گرتا ہے اور وہاں جمع ہو جاتا ہے اس گڑھے سے یہ پانی کچھ آگے جا کر سوکھ جاتا ہے اور عادۃً اس گڑھے میں دو قلعے جمع رہتا ہے تو یہ نہ نہر ہے نہ بڑا حوض ہے نہ جاری چشمہ ہے لیکن پلید اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ اس میں نجاست نہیں ٹھہرتی ہے کیونکہ تھوڑا تھوڑا بہتا رہتا ہے تو جاری کے حکم میں ہے یہ سن کر امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کھڑے ہو کر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پیشانی کا خوشی سے بوسہ لیا اور کہا آپ کو اللہ نے بڑا منصب عطا کیا ہے۔

بندہ عاجز عرض کرتا ہے کہ میں نے بار بار ایسے پانی کو اور جمع شدہ گڑھوں کو شکار کے دوران دیکھا ہے یہ واقعی دو قلعے کے برابر ہوتا ہے اور جنگل میں ہوتا ہے جمع بھی ہے اور جاری بھی ہے اور یہ حدیث تو چچی چیچ کر پکارتی ہے کہ قلتین سے اسی قسم کا کنواں مراد ہے جو جنگل میں ہوتا ہے اور شہری پانی مراد نہیں کیونکہ حدیث میں درندوں اور جانوروں کی آمد و رفت اور پینے کا ذکر موجود ہے تو کیا کوئی درندہ امپریس مارکیٹ کراچی میں آ کر منگے میں منڈا لے گا جس کی وجہ سے یہ مسئلہ کھڑا ہوگا؟

اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر کروڑ ہا رحمتیں نازل فرمائے وہ علوم نبوت کے امین تھے۔

مسئله ماء البحر ومیته

۶۶ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَتَزَكِبُ الْبَحْرَ وَتَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِيلَ مِنَ الْمَاءِ فَإِنْ تَوَضَّأْنَا بِهِ غَطَّيْنَا أَفْئَتَوْضًا جَاءَ الْبَحْرُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هُوَ الظُّهُورُ مَأْوُهُ وَالْحُلُ مَيْتَتُهُ. (رواه مالك والترمذي وأبو داود والنسائي وابن ماجه والدارقطني)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ! ہم (کھارے) دریا میں کشتی کے ذریعہ سے سفر کرتے ہیں اور (میٹھا) پانی اپنے ہمراہ تھوڑا لے جاتے ہیں اس لئے اگر ہم اس پانی سے وضو کر لیں تو یہاں سے رہ جائیں گے تو کیا ہم دریا کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں (یا تم کر لیا کریں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا سمندر ہی کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردہ طال ہے۔ (مالک ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی)

توضیح: سأل رجل: بعض کہتے ہیں کہ اس شخص کا نام عبد تھا جو دلجمی تھا جس نے سمندر کے پانی سے متعلق سوال کیا تھا بعض نے ان کا نام عبد العزیٰ بتایا ہے بعض نے کہا کہ ان کا نام ”عری“ تھا کہتے ہیں سوال کرنے والا یہ شخص سمندر میں کشتی بانی کا کام کرتا تھا یعنی بچھیرا تھا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَفَتَتَوَضَّءُوْنَ بِمَآءِ الْبَحْرِ: یہاں قائل غور بات یہ ہے کہ سمندر کے پانی سے متعلق یہاں سوال کیسے ہوا ہے اس کا منشاء کیا تھا جبکہ صحابہ اور عرب ذہانت میں بہت آگے تھے وہ چھوٹے چھوٹے کنوؤں کے متعلق علم رکھتے تھے تو سمندر کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں ان کو اشکال کیوں پیدا ہوا؟

سوال کے محرکات و اسباب تین تھے اول یہ کہ ابو داؤد و شریف کی روایت میں ہے کہ ”و ان تمحنت البحر داراً“ (ج ۱ ص ۳۷) اسی طرح قرآن کریم کی آیت ”و اذا البحار سمجرت“ اور آیت ”و البحر المسجور“ یہ سب اس پر دال ہیں کہ سمندر کے نیچے آگ ہے اور قیامت کے وقت یہ آگ بھڑک اٹھے گی اور یہی سمندر کا نچلا حصہ دوزخ بنے گا جب اس پانی کے نیچے آگ ہے اور آگ منظر غضب الہی ہے تو اس کے ساتھ والے سمندری پانی میں پاکی اور ناپاکی کا شبہ ہو سکتا تھا اس لئے صحابی نے یہ سوال کیا بہر حال یہ جواب بہت کمزور ہے۔

ثانی: یہ ہے کہ سمندر میں بڑے بڑے جانور رہتے ہیں جو بڑے پہاڑ کے برابر ہو سکتے ہیں کیونکہ مچھلی ان حیوانات میں سے ہے جن کے جسم کے بڑے ہونے کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ حیوانات سمندر میں مرتے بھی ہیں تو سمندر کے پانی کے نجس ہونے کا شبہ پیدا ہو گیا تو سوال کیا: یہ وجہ کچھ غنیمت ہے۔

جو قوی بھی ہے اور حقیقت پر مبنی بھی ہے وہ یہ ہے کہ سمندر کا پانی اپنے تینوں اوصاف لون رائحہ اور ذائقہ میں عام پانیوں سے مختلف ہوتا ہے نہایت ترش اور بدبودار ہوتا ہے اس لئے صحابی کو شبہ ہو گیا تو سوال کیا جس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے ان کے انکار کی صحت کو نہایت حصر اور تاکید کے ساتھ رد فرما کر "هو الطهور ماؤه" فرمادیا کہ پاک پانی اگر ہے تو وہ سمندر ہی کا ہے۔

سوال: آنحضرت ﷺ نے صحابی کے اس سوال کے جواب میں نعم کے مختصر لفظ کی جگہ اتنا طویل جملہ کیوں ارشاد فرمایا؟
جواب: نعم کہنے سے سائل کا جواب تو ہو جاتا کہ وضو جائز ہے مگر پانی کی حیثیت اور اس سے عموم طہارت کے حصول کا حکم ظاہر نہیں ہو سکتا تھا اور جب یہ طویل جملہ ارشاد فرمایا تو شریعت کا ایک ضابطہ اور قاعدہ سامنے آ گیا کہ اس پانی سے وضو غسل اور کپڑے دھونا وغیرہ سب جائز ہے۔

والحل مینتہ: مینتہ میں سارے حیثیات البھو مراد نہیں ہے بلکہ اس سے صرف انواع صحت مراد ہیں یعنی یہاں اضافت اشتقاق کے لئے نہیں بلکہ اضافت عہدی ہے اور صرف معبود حیوان یعنی مچھلیاں مراد ہیں۔
سوال: یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس سائل نے صرف پانی کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے پانی کے متعلق جواب کے ساتھ سمندری جانوروں کے متعلق جواب کی ضرورت کیوں محسوس کی اور اس جملے کا مائل سوال کے ساتھ ربط کیا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس آدمی نے سمندر کے پانی سے وضو کا مسئلہ پوچھا تھا وہ سمندر میں کشتی بانی کا کاروبار کرتا تھا اور اکثر و بیشتر اس کا سفر سمندر میں ہوتا تھا تو جس طرح پانی استعمال کرنے کا مسئلہ اس کے لئے ضروری تھا اسی طرح کھانے کا مسئلہ بھی اس کے لئے اہم تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس کی حالت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر سمندری جانوروں کے متعلق حلت اور حرمت کا مسئلہ بیان فرمادیا کہ اسی سمندر میں حیرا پانی ہے اسی میں حیرا کھانا ہے نیز اس تفصیلی جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندری پانی صرف ضرورت کے وقت نہیں بلکہ ہر وقت قابل استعمال ہے۔

سمندری جانوروں کا شرعی حکم:

مینتہ البھو: یعنی سمندری جانوروں کی حلت و حرمت میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے مچھلی کی تمام اقسام حلال ہیں اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں میں اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

امیر علاء یعنی مالک شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں۔

پہلا قول:

یہ ہے کہ جو اشیاء خشکی میں حلال ہیں اس کی نظیر بحر میں حلال ہے اور جو بحر میں حرام ہیں ان کے مانند جانور بحر میں حرام ہیں۔

دوسرا قول:

یہ ہے کہ بحری اشیاء تمام حلال ہیں حتیٰ کہ انسان بحری کلب بحری اور خنزیر بحری بھی حلال ہیں کسی نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ سمندری انسان اگر باتیں کر رہا ہو اس کا کھانا بھی حلال ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "نعم ولو یتکلم بالعربیۃ الفصحی" یعنی اگرچہ فصیح عربی بولتا ہو اس کا کھانا بھی حلال ہے ہاں اس قول میں ان حضرات کے ہاں سمندری جانوروں میں سے تین چیزیں دیگر نصوص کی وجہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اول ضفدع مینڈک، دوم سلحفاۃ کچھوا اور سوم تمساح یعنی مگر مجھ گھڑیاں نہنگ۔ ان حضرات کے ہاں یہ دوسرا قول سب سے زیادہ مختار ہے۔

جمہور کا تیسرا قول:

یہ کہ جو اشیاء نہریں ہیں وہ حرام ہیں باقی چیزیں حلال ہیں بہر حال جمہور کے ان تینوں اقوال میں کوئی ضبط اور انضباط نہیں ہے جس کو ہر خاص و عام آسانی سے سمجھ جائے اور اس پر عمل کرے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انواع سمک کے علاوہ تمام سمندری اشیاء حرام ہیں۔

دلائل:

① جمہور کی پہلی دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں "والحل مہیئتہ" کے الفاظ آئے ہیں وہ حضرات اس میں اضافت استغراق کے لئے مانتے ہیں یعنی سمندر کے تمام حیات حلال ہیں۔

② جمہور کی دوسری دلیل "احل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارة"۔

③ جمہور کی تیسری دلیل قصہ عنبر ہے کہ صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا تھا جب ان کے پاس کھانا ختم ہو گیا تو پتے کھانے لگے پھر اللہ تعالیٰ نے ایک سمندری "حایۃ" بھیجا جسے عنبر کہا جاتا ہے صحابہ نے اسے کھا لیا جمہور فرماتے ہیں کہ یہاں دایہ کا لفظ آیا ہے جس سے مراد جانور ہے اور صحابہ نے کھایا ہے اور بخاری میں یہ حدیث موجود ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت "ویحرمہ علیکم الخبائث"۔^۱ ہے وہ فرماتے ہیں کہ انواع سمک کے علاوہ تمام بحری اشیاء خبائث میں داخل ہیں جو موزیات اور خبائث ہیں بلکہ بعض تو اتنے زہر لے ہیں کہ ان کے کھانے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے۔

جیسٹیکے کا حکم:

یہاں ضمنی طور پر مختصر انداز سے جیسٹیکے کے متعلق بھی کچھ ملاحظہ فرمائیں۔ پھر جمہور کے دلائل کا جواب ہوگا۔

جھینگے میں شوافع مالکیہ حنبلیہ کے علاوہ ائمہ احناف کا آپس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض احناف جو بالخصوص ساحلی علاقوں کے باشندے ہیں وہ جھینگے کو حلال سمجھتے ہیں اور اکثر علماء احناف اس کو حلال نہیں کہتے ہیں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیا جھینگا مچھلی کی اقسام میں داخل ہے یا اس سے خارج ہے، اگر یہ مچھلی کی اقسام میں داخل ہے تو پھر اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر یہ مچھلی کی اقسام سے خارج ہے تو پھر اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ احناف انواع و اقسام کے علاوہ دیگر سمندری حیوانات کو حلال نہیں سمجھتے ہیں تو پھر جھینگا کو بھی حلال نہیں کہنا چاہیے۔ اب یہ مسئلہ علماء حیوانات کے کورٹ میں چلا گیا کہ ماہرین حیوانات یہ فیصلہ کریں کہ جھینگا مچھلی ہے یا کچھ اور چیز ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس کو مشکلی کا کیز قرار دیا ہے فتاویٰ رشیدیہ میں اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علماء حیوانات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اس کو کس میں شامل کرتے ہیں اگر مچھلی ہے تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ علماء حیوانات کا کہنا ہے کہ مچھلی میں ہڈی کا ہونا ضروری ہوتا ہے جھینگے میں ہڈی نہیں نیز مچھلی کے کھمبڑے ہوتے ہیں جھینگے میں یہ بھی نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھینگا مچھلی کی قسم نہیں ہے کوئی اور چیز ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس مسئلہ کی تحقیق غیر جانب دار علماء کو کرنا چاہیے جو علماء صبح و شام جھینگے جھنگے داموں خرید کر استلاذ کمال کے ساتھ کھاتے ہیں ظاہر ہے وہ اس کے جواز اور حلال طیب بنانے کے لئے ہر غٹ و سمین قسم کے دلائل کا سہارا لیں گے چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ شوافع حضرات نے جن دلائل سے بحری اشیاء کی حلت پر استدلال کیا ہے جھینگا کھانے والے حضرات انہیں دلائل کو جواز کے لئے بطور استدلال پیش کرتے ہیں حالانکہ زیر بحث حدیث کی تشریح کرنے میں علماء احناف شد و مد کے ساتھ شوافع حضرات کے ان دلائل کا مدلل انداز سے جواب دیتے چلے آئے ہیں۔ جس میں اس حدیث کا جواب بھی ہے، جھینگے کے خواہشمند شوقین حضرات اکثر و بیشتر لغت کی کتابوں کے حوالے نکال کر پیش کرتے ہیں کہ جھینگا حلال ہے اور کہتے ہیں دیکھو لغت کی فلاں فلاں کتاب نے اس کو مچھلی کہہ دیا ہے تو یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لغات کی یہ اکثر کتابیں شافعی مسلک حضرات کی ہیں ان سے احناف کیسے استدلال کریں گے نیز یہ کھانے نہ کھانے کے حرام اور حلال کا مقابلہ ہے اور اس طرح کی صورت میں ترجیح حرام کو دی جاتی ہے تاکہ حرام کے کھانے میں پڑنے سے آدمی بچ جائے۔

یہاں میں علماء لغت کے دو تین حوالے بھی دوں گا تاکہ جھینگا نہ کھانے والے حضرات کو تسلی ہو جائے اور کھانے والوں کے لئے کچھ سوچنے کا سامان ہو جائے۔

جھینگا کو عربی میں ”رو بیان“ کہتے ہیں لہذا لغت والے اس کو باب الرءاء میں لکھتے ہیں لغت میں اس کو ”ار بیان“ بھی کہتے ہیں اس لئے باب الف میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے چنانچہ مولف المنجد الابدی حرف الرءاء ص ۵۰۳ پر لکھتے ہیں:

الروبیان جنس سرطان بحری من القشریات العشاریة الاقدام و يعرف بالقریدس۔

یعنی جھینگہ سمندری کیڑا اور سرطان ہے اس پر چھلکے ہوتے ہیں اور اس کے دس کے قریب پنچے ہوتے ہیں اور قریدس یعنی کیڑے کے نام سے مشہور ہے۔

نفت کی ایک کتاب المنجد فی اللغة کے ص ۸ پر اس کا مصنف لکھتا ہے:

اربیان وروبیان جنس سرطان بحری من القشریات العشاریة الاقدام و يعرف بالقریدس
اصناف عديدة للذین الطعم۔

اس عبارت میں یہ آخری الفاظ مزید آئے ہیں کہ جھینگہ کی بہت ساری اقسام ہیں اور یہ ایک لذیذ چیز ہے۔

نفت کی مشہور کتاب المنجد فی اللغة والادب والعلوم میں اس کا عیسائی مصنف لوئیس معلوف نے جھینگہ کے متعلق لکھا ہے "اربیان نوع من سرطان بحری" یعنی یہ کیڑوں کی ایک قسم ہے۔ (المجد فی اللغة والعلوم ص ۷)

نفت کی ایک اور کتاب الادوس کے ص ۵۶ پر لکھتے ہیں "اربیان ہو غوث البحر" یعنی جھینگے سمندر کے پو ہیں۔ خلاصہ یہ نکلا کہ جھینگے کو کیڑا کہا گیا کیڑا کہا گیا پسو کہا گیا اب اس کے کھانے والوں کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کیا چیز کھا رہے ہیں قیمت اور لذت میں نہیں پڑنا چاہیے حضرت مولانا مفتی محمود عثمانی فرمایا کرتے تھے میں جھینگے کو حرام نہیں کہتا ہوں لیکن دسترخوان پر میرے سامنے نہ لایا جائے۔ بہر حال پسند اپنی اپنی نصیب اپنا اپنا اجتہاد ہی مجاہدہ ہے ہر طرف منہ بٹھانے کا جھجھک مسلسل جاری ہے کوئی کھا رہا ہے کوئی ٹھکرا رہا ہے۔

احناف کی طرف سے جمہور کو جواب:

بہر حال جھینگے کے جملہ معترضہ کے بعد اب زیر بحث حدیث والعلم میقتہ کا جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ یہاں میتہ سے مراد عام سمندری جانور نہیں ہیں بلکہ اس سے صرف مچھلی مراد ہے اور مچھلی پر میتہ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے لئے ذبح کی ضرورت نہیں پڑتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"أحلت لنا الميتتان السمك والحراد والدمان الكبدة والطحال۔"

ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابن ماجہ اور نسائی نے بھی الفاظ کے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جمہور کی دوسری دلیل احل لكم صید البحر کا جواب یہ ہے کہ یہاں صید مصید کے معنی میں نہیں جس کے معنی شکار شدہ چیز کے ہیں بلکہ یہ لفظ اپنے مصدری معنی "اصطیاد" شکار کھیلنے کے معنی میں ہے تو آیت سے محرم (حالات احرام) کے

لئے سمندری شکار کھیلنے کی اجازت مل گئی ہے کھانے کی بات یہاں نہیں ہے اور شکار تو حرام جانوروں کا بھی ہوتا ہے اور اگر شکار کرنے اور کھانے کی بات بھی ہو تو صید البحر کا مصداق پھلی کا شکار ہے جو معروف ہے جائز بھی ہے اور حلال بھی ہے۔

جہور کی تیسری دلیل منبر والی حدیث تھی جس میں دابۃ کا لفظ آیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی بعض روایات میں منبر پر سبک کا اطلاق بھی موجود ہے دابۃ اس لئے کہا گیا کہ وہ وسیلہ اور دھار پھلی تھی کہ تین سو صحابہ نے ایک ماہ تک اس کو کھایا اس کی آنکھ کے خانہ میں نو آدمی بیٹھ جاتے تھے اور ایک صحابی اس کی ہڈی کے دونوں جانب زمین میں گاڑ کر اونٹ پر سوار ہو کر ہڈی کے نیچے سے آرام سے گزر گئے اتنی بڑی پھلی تھی اس لئے اس پر دابۃ کا اطلاق ہوا ہے ورنہ اس کا نام منبر تھا اور منبر پھلی ہی کی ایک قسم ہے۔ (مجلس بحرہ مستزنی، نزہۃ المکرر، شارع شمس، دار عمر عبداللطیف، ۲۰ رمضان ۱۴۲۲ھ)

مسئله نہیل التمر

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي زَيْدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ لَيْلَةُ الْحَجِّ مَا فِي إِذَا وَتَكَ قَالَ قُلْتُ نَهَيْدٌ قَالَ خَمْرَةٌ طَيِّبَةٌ وَمَاءٌ ظَهُورٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَالزُّمَيْلِيُّ فَتَوْضُأٌ مِنْهُ وَقَالَ الزُّمَيْلِيُّ أَبُو لَيْثٍ فَهَهُوْلٌ وَضَخَّ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَمْ أَكُنْ لَيْلَةَ الْحَجِّ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. (رواهُ مُنْشِلًا)

اور حضرت ابو زیدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے لیلۃ الحج (یعنی جن کی رات) میں ان سے پوچھا کہ تمہاری چھاگل میں کیا ہے عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا نہیل (یعنی کھجوروں کا شربت) ہے آپ نے فرمایا کھجوریں پاک ہیں اور پانی پاک کرنے والا ہے۔ (ابوداؤد) اور امام احمد اور امام ترمذی نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں پس آپ نے اس سے وضو کیا نیز امام ترمذی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابو زید کا پتہ نہیں کہ یہ کون ہیں حضرت علقمہ البیتہ عبداللہ بن مسعودؓ سے صحیح طور پر یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ”میں لیلۃ الحج میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہیں تھا۔“ (مسلم)

توضیح: فتوضاً منہ: اس حدیث سے نہیل التمر کا مسئلہ نکلا ہے نہیل فعیل بمعنی مفعول یعنی منہو ذہے اس کا مطلب پھینکنا اور چھٹکی ہوئی چیز ہے اگر تمر ہے تو نہیل تمر کہلاتا ہے اگر زبیب ہے تو نہیل زبیب کہا جاتا ہے۔

در اصل عرب میں پانی کے کھار اپن ختم کرنے اور پانی کو ذائقہ دار بنانے کے لئے اس میں کھجوریں ڈالی جاتی تھیں اور چند دنوں کے بعد پانی کو استعمال کیا جاتا تھا یہی نہیل کی حقیقت ہے لیکن اس کی بڑی قسمیں تین ہیں دو قسمیں اتفاقی ہیں اور ایک میں اختلاف ہے۔

- ① کھجوریں پانی میں ڈال کر حلاوت آنے سے پہلے پہلے وضو بنایا جائے یہ سب کے نزدیک جائز ہے۔
 ② کھجوریں پانی میں ڈال کر بال دی جائیں یا طویل مدت کی وجہ سے اس میں جھاگ آگیا اور حد شکر تک پہنچ گیا تو بالائے اتفاق اس سے وضو بنانا جائز نہیں ہے۔
 ③ پانی میں کھجوریں ڈالی گئیں اور اس میں حلاوت آگئی لیکن ابھی پانی مزہ نہیں ہوا اور رقت بھی باقی ہے مطبوخ بھی نہیں تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ لے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیذ التمر کی یہ قسم اگر موجود ہے تو آدمی اس سے وضو بھی کرے اور پھر تیمم بھی کرے امام ابو یوسف رحمہ اللہ جمہور فقہاء کے ساتھ ہیں اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس قسم کے پانی کی موجودگی میں اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہے بلکہ تیمم کرنا فرض ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے اس کی موجودگی میں تیمم جائز نہیں ہے نوح بن ابی مریم نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا جمہور کے قول کی طرف رجوع نقل کیا ہے اور احتاف کے ہاں فتویٰ بھی عدم جواز کا ہے لہذا اب امام ابو حنیفہ اور جمہور کے درمیان کوئی اختلاف نہ رہا لیکن مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے یہ فتویٰ صحیح نہیں دیا ہے اس لئے دلائل اور بحث و تحقیق کی حد تک اس مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ دلائل کی دنیا کو دنیا دیکھ لے۔ لے۔

دلائل:

جمہور نے قرآن کریم کی آیت "فان لم تجدوا ماء فتیمموا صعیباً طیباً" سے استدلال کیا ہے طرز استدلال اس طرح ہے کہ جب مطلق پانی نہیں ہے تو تیمم کی طرف جانے کا قرآن حکم دیتا ہے طہارت کے لئے پانی ہے یا مٹی ہے یہ نہیذ التمر کا واسطہ چچ میں کہاں سے آگیا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیر بحث حدیث ہے جس کے ظاہری الفاظ اور ظاہری مطلب سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نہیذ التمر سے وضو کرنا جائز ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ "تمر طیبہ وماء طہور فتوضاً منه" میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ لے۔

اعتراض:

جمہور نے اس حدیث پر دو اعتراضات کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی ابو زید ہے اور وہ مجہول ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں کہ "ما شهدنا ما اُحد" یعنی ہم میں سے کوئی بھی ایلیۃ الجن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہیں تھا۔ جب خود صاحب واقعہ اس کا انکار کرتا ہے تو آپ اس

سے کیسے استدلال کرتے ہو؟

جواب: پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر ابو زید میں جہالت عینہ ذاتیہ ہے کہ اس کی ذات مجہول ہے تو ہم بتاتے ہیں ترمذی کے مشہور شارح ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ابو زید عمرو بن حریش کا غلام تھا اور راشد بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ اور ابو ورق رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے روایت کی ہے اور فن اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص سے دو ثقہ راوی روایت کرتے ہیں تو وہ مجہول الذات نہیں رہتا ہے بلکہ معلوم الذات بن جاتا ہے اور اگر اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ ابو زید معلوم الوصف نہیں ہے یعنی ”مجہول الصلہ“ ہے معلوم نہیں کہ ثقہ ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں ابو زید اکیلا نہیں بلکہ چودہ آدمی اس کے متابع ہیں اور چودہ آدمی جس شخص کے متابع ہوں تو وہ خود کیونکر ثقہ نہیں ہوگا اور اس کی روایت کا اعتبار کیوں نہیں ہوگا۔

رہ گیا دوسرے سوال کا جواب کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ ہم میں سے لیلة الجن میں کوئی بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ترمذی نے ابواب الامثال جلد ثانی میں تصریح کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ لیلة الجن میں تھے اور اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ دوسرا جواب اس سوال کا یہ ہے کہ احکامہ المرجان فی احکامہ الجنان میں علامہ بدرالدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ لیلة الجن کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ چھ مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ تفصیل اس طرح ہے:

① مکہ مکرمہ میں پیش آیا جس میں ”اشتہیل واستطیر“ کے الفاظ آئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اکیلے تھے۔

② مقام حجون میں پیش آیا تھا۔

③ اہلی مکہ میں پیش آیا تھا۔

④ مدینہ منورہ میں بقیع الغرقہ میں پیش آیا۔

⑤ خارج المدینہ میں پیش آیا تھا جس میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔

⑥ حالت سفر میں پیش آیا جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔

تو تین مقامات میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے اور تین میں ساتھ نہیں تھے تو لہذا کن لیلة الجن کی نفی صرف تین واقعات کے ساتھ متعلق ہے مطلق نفی مراد نہیں ہے۔ لہ

یہ جواب ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ لیلة الجن کے واقعہ میں تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص مقام میں نہیں تھے۔ بلکہ نکیر کے حصار میں آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر بٹھلادیا تھا اور جنات کے پاس اندر خود چلے گئے تھے۔ باقی جمہور نے جس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مطلق پانی جب نہ ہو تو تیمم کیا کرو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماء مطلق سے کیا مراد ہے؟ اور مقید کا کیا مطلب ہے؟ اگر پانی کی اضافت کسی چیز کی طرف ہونے سے آپ اس کو مقید کہیں گے مثلاً

”ماء العبدین“ تو پھر ماء السماء، ماء البحر، ماء النهر، ماء البئر وغیرہ سب کو اضافت کی وجہ سے مقید ماننا ہو گا پھر تو کوئی پانی مطلق نہ ہوا حالانکہ یہ تمہارے نزدیک بھی مطلق پانی ہے اور مقید نہیں ہے۔ اور اگر مطلق پانی سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے پانی مانگے اور وہ شخص پانی پیش کرے اور لوگ اس شخص کو غلطی پر نہ سمجھیں بلکہ یہ تسلیم کریں کہ ہاں یہ مطلق پانی ہے تو نیز میں بھی ایسی ہی صورت ہے کہ اس کے پیش کرنے سے معاشرہ کے لوگ اس کو غلطی پر نہیں سمجھتے ہیں لہذا العبدین الثمر بھی مطلق پانی کے حکم میں ہے بہر حال حضرت امام صاحب کا رجوع ثابت ہے زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے احتیاط جمہور کے مذہب میں ہے نیز یہ اختلاف بھی صرف نہیدل ثمر میں ہے زہیب و شعیر وغیرہ کی نیز سے وضو اتفاقاً جائز نہیں ہے۔ لہ

مسئلة سؤر الهرة

(۸) وَعَنْ كُبْشَةَ بِنْتِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ وَكَانَتْ تَحْتُ ابْنِ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّ أَبَا قَتَادَةَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَسَكَبَتْ لَهُ وَضُوًا فَجَاءَتْ هِرَّةٌ فَشَرِبَ مِنْهُ فَأَصْلَى لَهَا الرِّكَاءَ حَتَّى دَرَبَتْ قَالَتْ كُبْشَةُ فَرَأَى أَنْظُرَ إِلَيْهِ فَقَالَ أَلْتَعْجِبِينَ يَا ابْنَةَ أُمِّی قَالَتْ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّهَا لَيُسْتَبْطَنُجِسُ بِهَا مِنَ الطَّلَافِ أَوْ الطَّلَافَاتِ

(رواه مالك وأحمد والترمذي وأبو داود والنسائي وابن ماجه والدارقطني)

ترجمہ: اور حضرت کبشہ بنت کعب بن مالک جو حضرت ابو قتادہ کے بیٹے کی بیوی تھیں، سے روایت ہے کہ (ایک روز) ان کے سر حضرت ابو قتادہ ان کے پاس آئے (کبشہ کہتی ہے کہ) میں نے ان کے وضو کے لئے (ایک برتن میں) پانی رکھ دیا تو ایک بلی آکر اس میں سے پانی پینے لگی حضرت ابو قتادہ نے برتن کو اس کی طرف جھکا دیا (تاکہ وہ آسانی سے پانی پی لے) چنانچہ بلی نے پانی پی لیا کبشہ کہتی ہیں کہ جب حضرت ابو قتادہ نے مجھے دیکھا کہ میں (تعجب سے) ان کی طرف دیکھ رہی ہوں تو انہوں نے کہا میری بھتیجی کیا تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے میں نے کہا جی ہاں حضرت ابو قتادہ نے کہا سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا بلیاں ناپاک نہیں ہیں کیونکہ یہ تمہارے پاس آنے جانے والوں میں سے ہیں یا یہ فرمایا کہ آنے جانے والوں میں سے ہیں۔ (مالک، احمد، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی)

توضیح: یا ابنة امی: حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے عرب کی عادت کے مطابق حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کو بھائی کی بیٹی کہا اس سے اسلامی چارہ بھائی چارہ مراد ہے رشتہ داری کی بات نہیں ہے۔

انہا لیست بنجس: یہاں سوال یہ ہے کہ بنجس کا لفظ مذکر ہے تو ہرے کے لئے کیسے استعمال ہوا ہے؟ اس کا ایک

عام جواب بطور لطیفہ اور چٹکے اس طرح ہے کہ "یہ دھاوا ہو" یعنی اس سے لفظ مراد لوگے تو مذکر کی ضمیر لاء گئے کیونکہ یہ مذکر ہے لیکن یہ "کلمۃ" کا ارادہ کرو گے تو مونث کی ضمیر بھی جائز ہے یہ لطیفہ ہر جگہ چلتا ہے سوال کا حقیقی جواب شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مشکوٰۃ اور مصابیح کے تمام نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح مذکر ہے لیکن شروحات میں "انھا لجمۃ" ثابت کے ساتھ آیا ہے شیخ فرماتے ہیں کہ ترمذی کے بعض پرانے نسخوں میں یہ لفظ تکریر کے ساتھ آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا اصل لفظ نجس مذکر ہے کسی نے اس میں تعمیر کر کے مجسہ کر دیا ہے اور شروحات نے اس کو ذکر کر دیا آنے والی حدیث کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مونث کے لئے مذکر کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ "ہرة" سے "سلور" مراد لیا گیا ہے آنے والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں لفظ "ہریسہ" آیا ہے گوشت کے ٹکڑے اور مصالحہ اور دیگر چند چیزوں کو ملا کر ایک شیرہ قسم کی چیز کا نام "ہریسہ" ہے عرب میں اب بھی یہ ایک مرغوب خوراک ہے۔

سورۃ الہرة میں فقہاء کا اختلاف:

بلی کے جھوٹے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے اور اختلاف کا نشاء کراہت کی علت ہے کہ اس کی علت کیا ہے بعض نے بلی کے گوشت کو دیکھ کر حکم لگایا ہے بعض نے یہ علت بیان کی کہ بلی ناپاک چیزوں میں منہ ڈالنے میں احتیاط نہیں کرتی ہے تو ناپاکی کا احتمال ہے۔

تینوں ائمہ اور امام ابو یوسف و امام محمد یعنی جمہور کے نزدیک اگر بلی نے فی الوقت کوئی نجس چیز نہ کھائی ہو اور کسی نجس چیز میں منہ نہ ڈالا ہو تو اس کا جھوٹا پاک ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام کوفی رحمہ اللہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ کے نزدیک بلی کا جھوٹا مکروہ ہے پھر علت کو دیکھ کر امام طحاوی رحمہ اللہ نے مکروہ تحریمی کا قول اختیار کیا ہے امام کوفی نے مکروہ تنزیہی کا قول اختیار کیا ہے اور بلی قول راجح اور قائل فتویٰ ہے اس سے تمام ائمہ کا اختلاف ختم ہو جائے گا کیونکہ مکروہ تنزیہی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

دلائل:

جمہور کی دلیل زیر نظر حضرت کہنہ رضی اللہ عنہا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ طوافین اور طوافات سے علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو موجب تخفیف ہے اور وہ عدم کراہت ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلی سے متعلق مختلف احادیث ہیں جو آپس میں متعارض ہیں ایک حدیث میں ہے "الہرقۃ سمیع" جس کا تقاضا ہے کہ بلی کا جوہا حرام ہے۔ ترمذی جلد اول ص ۲۷ پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر

میں یہ الفاظ آئے ہیں "اذا ولغت فيه الهرة غسل مرة" یہ بھی دلیل مخمس ہے کہ اس کا جھوٹا ناپاک ہے اس لئے ایک بار دھونے کا حکم دیا گیا ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے فرمایا: "طهور الاثناء اذا ولغ فيه الهر ان يغسل مرة او مرتين" اس حدیث کا تقاضا بھی ہے کہ پانی کا جھوٹا ناپاک ہے۔

اسی طرح قیاس کا بھی تقاضا ہے کیونکہ پانی کا گوشت اتفاقاً حرام ہے اور لعاب گوشت سے پیدا ہوتا ہے تو قیاس کہتا ہے کہ اس کا جھوٹا ناپاک ہے۔ لیکن چونکہ جواز و عدم جواز اور پاک و ناپاک ہونے میں روایات میں تعارض ہے پھر ائمہ مجتہدین میں بھی جواز و عدم جواز میں اختلاف ہو گیا لہذا "اختلاف امتی رحمة" کے قاعدہ کی برکت سے بات حرمت سے کراہت کی طرف آگئی۔

اب امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس کو ترجیح دی اور فرمایا کہ پانی کا جھوٹا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ گوشت سے متولد ہے اور گوشت حرام ہے لہذا جھوٹا حرام ہے۔ امام کرنی رحمۃ اللہ علیہ نے علت کو دیکھا جو طوافات ہے تو اس سے تخفیف کا پتہ چلا تو آپ نے کراہت تزیہی کا فتویٰ دیا اور یہی رائج ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ طوافین اور طوافات کی علت سے شریعت کا یہ ضابطہ حاصل ہو گیا کہ "المخرج مدفوع في الشرع" اور "المشقة تجلب التيسير" یعنی حرج اور مشقت آسانی کو کھینچ کر لاتی ہے۔ ل

﴿وَعَنْ دَاوُدَ بْنِ صَالِحٍ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أُمِّهِ أَنَّ مَوْلَاهُ أَزْسَلَهَا بِهَرِيسَةٍ إِلَى عَائِشَةَ قَالَتْ فَوَجَدَهَا تُصَلِّي فَأَشَارَتْ إِلَيَّ أَنْ ضَعِيفَتُ فَجَاءَتْ هِرَّةٌ فَأَكَلَتْ مِنْهَا فَلَمَّا إِنْصَرَفْتُ عَائِشَةُ مِنْ صَلَاتِهَا أَكَلْتُ مِنْ حَيْثُ أَكَلَتِ الْهَرَّةُ فَقَالَتْ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّهَا لَيْسَتْ بِتَجَبٍ إِنَّهَا مِنَ الطَّوَاهِينِ عَلَيْكُمْ وَإِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْتَضِي بِفَضْلِهَا. (رواه أبو داود)﴾

ترجمہ: حضرت داؤد بن صالح بن دینار رحمۃ اللہ علیہ اپنی والدہ کمرہ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک روز) انہیں آزاد کرنے والی مالکہ نے ہریرہ یعنی (حریرہ) دے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت اقدس میں بھیجا ان کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں نے (وہاں پہنچ کر) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نماز پڑھتے ہوئے پایا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اشارہ سے اسے رکھ دینے کے لئے مجھ سے کہا (چنانچہ میں نے ہریرہ کا برتن رکھ دیا اتنے میں) ایک پانی آکر اس میں سے کھانے لگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب نماز سے فارغ ہوئیں تو حریرہ کو پانی نے جس طرف سے کھایا تھا اسی طرف سے انہوں نے بھی کھالیا۔ پھر فرمایا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ پانی ناپاک نہیں ہے اور وہ تمہارے پاس آنے جانے والیوں میں سے ہے اور میں نے خود سرکارِ دو عالم ﷺ کو پانی کے جوٹھے (پانی) سے وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ (ابوداؤد)

وحشی جانوروں کے جوٹھے کا بیان

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ تَوْحًا يَمَّا أَفْضَلَتِ الْحُمْرُ قَالَ نَعَمْ وَمِمَّا أَفْضَلَتِ السَّبَاعُ كُلُّهَا. (زَوَائِدُ مَزَجِ الشُّعْلَةِ)

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم اس پانی سے وضو کر سکتے ہیں جس کو گدھوں نے جوٹھا کر دیا ہو آپ نے فرمایا کہ ہاں (اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے) اور اس پانی سے بھی (وضو کرنا جائز ہے) جس کو درندوں نے جوٹھا کر دیا ہو۔ (شرح الن)

توضیح: السباع: درندوں کو عربی میں سباع کہتے ہیں جیسے شیر، بچھڑ، بھینڑیا، لومڑی وغیرہ ہیں ان جانوروں کے جوٹھے میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

جنگلی درندوں کا جوٹھا مالکیہ اور شوافع کے نزدیک پاک ہے اور احناف اور ایک قول کے مطابق حنابلہ کے نزدیک ناپاک ہے۔

دلائل:

شوافع نے مذکورہ روایت سے استدلال کیا ہے جو اپنے مدعا پر واضح دلیل ہے۔ نیز حدیث نمبر ۱۲ اور حدیث نمبر ۱۳ سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے۔

احناف نے شریعت کے اس ضابطہ سے استدلال کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ جس چیز کا گوشت حرام ہے اس کا جوٹھا بھی حرام ہے کیونکہ لعاب گوشت سے متولد ہے۔ نیز احناف نے مشکوٰۃ فصل ثالث کی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں "هَلْ تَبُودُ حَوْضُكَ السَّبَاعُ" یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ درندوں کے جوٹھے کو ناپاک سمجھتے تھے ورنہ سوال کی کیا ضرورت تھی۔ یہ حدیث شوافع کی دلیل ہے، اگر مذکورہ الفاظ سے احناف نے استدلال کیا ہے۔

جواب: شوافع کی دلائل کا جواب یہ ہے کہ یہاں یقین کی بات نہیں بلکہ صرف ایک احتمالی بات تھی کہ شاید درندوں نے پانی میں منہ ڈالا ہو آپ نے اس کو رد فرمایا کیونکہ "الْيَطْفِين لَا يَزُولُ بِالشَّكِّ" شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں یہ جواب بھی دیا ہے کہ طہارت پر دلالت کرنے والی روایات میں کلام ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بڑے حوضوں سے متعلق ہیں جس میں کثیر پانی ہوتا ہے اور کسی طرح ناپاک نہیں ہوتا ہے۔

مما أفضلت الحمر: احناف کے ہاں گدھے کا جو ٹھاٹھ مشکوک ہے یعنی دلائل کے تناظر میں جو شک وشبہ آتا ہے اس کی وجہ سے مشکوک ہے ورنہ شریعت کو حکم سنانے میں کوئی شک نہیں ہے سمجھنے میں شک اس طرح آ گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے جس کا تقاضا ہے کہ لعاب اور پسینہ دونوں نجس ہوں لیکن آنحضرت ﷺ نے گدھے پر سواری کی تو لامحالہ پسینہ لگا ہوگا آپ نے اس کی نجاست کی کوئی بات نہیں بتائی تو پسینہ پاک ہو گیا اور چونکہ پسینہ کی طرح لعاب بھی گوشت سے متولد ہے تو لعاب بھی اسی طرح پاک ہونا چاہئے اس کی وجہ سے شک پڑ گیا تو مسئلہ مشکوک ہو گیا لہذا مشکوک پانی سے پہلے وضو کیا جائے گا پھر تیمم ہوگا مذکورہ حدیث کا تعلق شاید حمار وحشی سے ہے اور وہ حلال ہے۔ ۱۔

﴿۱۱۱﴾ وَعَنْ أَقْرِهَائِي قَالَتْ إِشْتَسَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَهْوًا وَمَيْمُونَةً فِي قِصْعَةٍ فِيهَا أَكْرُ الْعَجِينِ.
(رواہ النسائی وابن ماجہ) ۱۔

ترجمہ: ۱۔ اور حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ملٹ میں کہ جس میں گدھے ہوئے آنے کا کچھ حصہ لگا ہوا تھا غسل فرمایا۔ (نسائی ابن ماجہ)

الفصل الثالث

﴿۱۱۲﴾ وَعَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ قَالَ إِنَّ عُمَرَ خَرَجَ فِي رَكْبٍ فِيهِمَا عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ حَتَّى وَرَدُوا حَوْضًا فَقَالَ عَمْرُو يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرُدُّ حَوْضَكَ الشِّبَاعَ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ لَا تُخَيِّزْنَا فَإِنَّا تَرُدُّ عَلَى الشِّبَاعِ وَتَرُدُّ عَلَيْنَا. رَوَاهُ مَالِكٌ وَزَادَ رِزِينَ قَالَ رَأَيْتُ بَعْضَ الرُّوَاةِ فِي قَوْلِ عُمَرَ قَالِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَهَا مَا أَخَذْتُ فِي بَطُونِنَا وَمَا بَلَّيْ فَهُوَ لَنَا ظُهُورٌ وَشَرَابٌ. ۱۔

ترجمہ: ۱۔ حضرت یحییٰ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ہمراہ نکلے جس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے آپ نے تالاب والے سے پوچھا کہ اے تالاب کے مالک کیا تمہارے اس تالاب پر (پانی پینے کے لئے) درندے بھی آتے ہیں یہ سن کر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے تالاب کے مالک یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ ہم درندوں پر آتے ہیں اور درندے ہم پر آتے ہیں (یعنی کبھی تو ہم پانی پر آتے ہیں اور کبھی درندے پانی پر آتے ہیں اور چونکہ تالاب میں پانی زیادہ ہے اس لئے درندوں کے پینے سے ناپاک نہیں ہوتا)۔ (رواہ مالک) اور رزین نے کہا ہے کہ بعض راویوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) میں نے خود سرکارِ دو عالم ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے درندے جو اپنے پیٹ میں لے جائیں وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے

پینے کے قابل اور پاک کرنے والا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْحَيَاضِ أَلَيْسَ بَذَنٍ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةَ
ثَرَكُهَا السَّمَاعُ وَالْكَلَابُ وَالْحُمُرُ عَنِ الظُّهْرِ مِنْهَا فَقَالَ لَهَا مَا عَمِلْتَ فِي بَطْنِهَا وَلَكِنَّا مَا غَوَّرَ
ظُهُورُ. (رواۃ ابن ماجہ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے ان تالابوں کے بارے میں پوچھا گیا
جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں اور ان پر (پانی پینے کے لئے) درندے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں کہ آیا اس سے کوئی چیز
پاک کی جاسکتی ہے کہ نہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو ان کے بیٹوں میں آجائے وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے
لئے پاک کرنے والا ہے۔ (ابن ماجہ)

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَغْتَسِلُوا بِالْمَاءِ الْمَشْتَمِسِ فَإِنَّهُ يُورِثُ الْبَرَصَ.
(رواۃ الدارقطنی)۔

ترجمہ: اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوپ سے گرم کئے ہوئے پانی سے
غسل نہ کرو کیونکہ یہ برص (یعنی سفیدی کی بیماری) کا سبب ہوتا ہے۔ (دارقطنی)



باب تطهير النجاسات

نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان

نجاست طہارت کی ضد کو کہتے ہیں نجاسات کو جمع کے صیغہ سے اس لئے ذکر کیا کہ نجاستوں کی بہت ساری قسمیں ہیں اور اس کے الگ الگ احکام ہیں۔ احکام میاہ اور تطہیر نجاسات کے باب میں فقہی لحاظ سے سب سے زیادہ لمبے چوڑے مسائل بیان ہوئے ہیں۔

لفظ نجس باب صبح اور کرم دونوں سے آتا ہے صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ نجس کے جیم پر کسرہ اور فتح دونوں پڑھا جاتا ہے۔ فقہاء کرام کی اصطلاح میں اگر جیم کا کسرہ ہو تو یہ یمن اور ذات نجاست کو کہتے ہیں اور اگر جیم کا فتح ہو تو یہ عام ہے ذات نجاست کو بھی کہتے ہیں اور اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ نجاست لگی ہوئی ہو۔

الفصل الاول

مسئلة سور الكلب

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي إِثَاءِ أَحَدٍ كُفِّرَ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ طَهُورُ إِثَاءِ أَحَدٍ كُفِّرَ إِذَا وَلَغَ فِيهِ الْكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ أَوْ لَا هُنَّ بِالتَّوَابِ)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی لے اس (برتن) کو سات مرتبہ دھو لینا چاہیے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ ”تم میں سے جس کے برتن میں کتا پانی پی جائے اس کو پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھو ڈالے اور پہلی مرتبہ مٹی سے دھوئے۔“

توضیح: اذ شرب الكلب: کتوں اور درندوں کا کسی برتن میں منہ ڈالنے کیلئے عربی میں کچھ مخصوص الفاظ آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے:

”ولغ بلغ ولغا وولوغا اذا ادخل الكلب او السبع لسانه في الماء“ حرکہ فیہ ولحس الكلب لحسا فاذا كان الاناء خاليا فهو لحس واذا كان فیہ شیء فهو ولغ۔

یعنی زبان کے کناروں سے درمے اور کتے وغیرہ جو پانی چاٹ کر پیتے ہیں اس کو دغ کہتے ہیں۔

کتے کے جوٹھے میں اختلاف:

کتے کے جوٹھے سے پاکی کے بارے میں مختلف احادیث آئی ہیں بعض میں "سبع مرات" کا ذکر ہے بعض میں آٹھ بار دھونے کا ذکر ہے۔ دارقطنی میں تین یا پانچ یا سات بار دھونے کی روایات بھی ہیں جس میں ہر ایک پر عمل کا اختیار دیا گیا ہے بعض روایات میں دھونے کے ساتھ مٹی ملنے کا ذکر بھی آیا ہے اور بعض میں نہیں ہے پھر بعض روایات میں ابتداء میں مٹی کے استعمال کا حکم ہے بعض میں آخر میں استعمال کا حکم ہے، بعض میں ساتویں بار مٹی کے استعمال کی تعلیم ہے، بعض روایات میں آٹھویں بار مٹی کے استعمال کی بات ہے روایات کے اس اختلاف کی وجہ سے فقہاء اہل حرام میں بھی اختلاف آگیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں دو مسئلوں میں الگ الگ اختلاف ہے۔

ایک اختلاف کتے کے جوٹھے کے پاک اور ناپاک ہونے میں ہے اور دوسرا اختلاف اس سے نجس ہونے کی صورت میں برتن کے طریق تطہیر میں ہے پہلے مسئلہ میں جمہور فقہاء ایک طرف ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ ایک طرف ہیں دوسرے میں جمہور کا آہیں میں اختلاف ہے۔

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہما اللہ کا مسلک ہے کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے پھر ان حضرات پر اعتراض ہوتا ہے کہ جب پاک ہے تو آپ حضرات برتن کے دھونے کو کیوں ضروری قرار دیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ حضرات یہ دیتے ہیں کہ یہ دھونا تعبدی حکم ہے یعنی شریعت کا حکم ہے نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ شریعت نے دھونے کا فرمایا ہے تو ہم دھوتے ہیں یہ چیز عقل میں آنے والی نہیں ہے اور یہ نص غیور معقول المعنی اور خلاف القیاس ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے ہاں کتے کے جوٹھے کی تطہیر اور پاکی سات بار دھونے پر موقوف ہے کم سے کم پاک نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتے کے جوٹھے کی پاکی تین بار دھونے سے حاصل ہو جاتی ہے ہاں سات بار تک مبالغہ کر کے دھونا مستحب ہے۔

دلائل:

کتے کے جوٹھے کے پاک ہونے پر امام مالک رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہما اللہ نے قرآن مجید کی آیت سے استدلال کیا ہے شکاری کتوں کے بارے میں قرآن کا حکم ہے کہ جن کتوں نے شکار کر کے تمہارے لئے روکا ہے تم اس کو کھاؤ۔

"فکلوا مما امسکن علیکم" طرز استدلال اس طرح ہے کہ شکار کو جب کتے نے منہ میں پکڑ لیا ہے تو اس کا لعاب ضرور لگا ہوگا اور قرآن میں اس کے کھانے کا ذکر ہے دھونے کا نہیں ہے معلوم ہوا کتے کے جوٹھے سے وہ شکار نجس نہیں ہوا تو

اس کا جوٹھا پاک ہوا۔ دوسری دلیل بخاری کی روایت ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے فصل ثالث ص ۵۳ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کی ہے کہ "کانت الکلاب تعقب وتدبر فی المسجد فی زمان رسول اللہ ﷺ یکنونوا یرشون من خلک"۔ تو ظاہر ہے کہ کتے جب مسجد میں آتے جاتے رہتے تھے تو لعاب مسجد میں گرنا ہوگا اور دھونے کا ذکر نہیں تو معلوم ہوا کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے۔ تیسری دلیل بخاری شریف کی وہ حدیث ہے جس میں ایک فاجرہ عورت کی مغفرت کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے موزہ میں پیاسے کتے کیلئے کنویں سے پانی نکال کر پلایا۔ طرز استدلال اس طرح ہے کہ اس موزہ سے اس عورت نے نماز پڑھی ہوگی اور دھونے کا کوئی ذکر نہیں ہے معلوم ہوا کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے۔ جمہور نے کتے کے جوٹھے کی نجاست پر مذکورہ صریح اور صحیح احادیث سے استدلال کیا ہے جمہور فرماتے ہیں کہ نجس ہونے کی وجہ سے طہارت کے حصول کے لئے غسل اور دھونے کے واضح الفاظ موجود ہیں اس کو امر تعبدی پر حل کرنے کی کیا ضرورت ہے جس میں تحصیل حاصل ہے کہ پاک تو ہے مگر پھر دھو لے ہیں ایسا کیوں نہیں کہتے کہ نجس تھا اس لئے دھونے کا حکم دیا گیا۔ جمہور نے عقلی دلیل بھی پیش کی ہے کہ کتابدترین نجس ہے اس کا گوشت اتفاقی طور پر حرام ہے تو اس سے پیدا شدہ لعاب کیسے پاک ہو سکتا ہے۔

جواب: امام مالک رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے قرآن کی آیت سے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر "کلوا" کے امر کو کسی قید کے لحاظ کرنے کے بغیر مطلق لو گے تو پھر بتاؤ کہ کچا گوشت کھاؤ گے پروں اور آنتوں اور آلودہ خون کے ساتھ کھاؤ گے؟ کیونکہ قرآن میں "کلوا" آیا ہے یعنی کھاؤ اگر دھونے کی قید نہیں تو ان سب چیزوں کی بھی قید نہیں حالانکہ آیت کا مطلب انتفاء النجس کے طور پر یہ ہے کہ اس شکار کے گوشت کو بناؤ، دھو لو، پکا لو اور پھر کھاؤ تو بغیر دھونے کھانے کا ثبوت کہاں سے آیا جب آیت لازمی طور پر مقید ہے تو پھر دھونے کی قید بھی ہے جس سے جوٹھے کی نجاست ثابت ہوگی۔

جہاں تک مسجدوں میں کتوں کی آمد و رفت اور لعاب گرنے کی دلیل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نئی مسجد تھی ریت کے تودے تھے کوئی چار دیواری نہیں تھی رات کو کتے آجاتے صبح کو لعاب و پیشاب کی جگہ کا پتہ نہیں چلتا تھا گرم ملک تھا سخت دھوپ کی وجہ سے زمین پاک ہو جاتی تھی اور زکاة الارض یہ مسہا پر عمل ہوتا تھا۔ ہم یہاں مالکیہ کو لازمی جواب دیتے ہیں کہ اگر لعاب گرنا تھا اور وہ پاک تھا تو کتے تو پیشاب بھی کرتے ہوں گے اس کے دھونے کا بھی ذکر نہیں وہ بھی پاک ہو گیا؟ علامہ خطابی نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتے پیشاب باہر کر کے پھر مسجد میں آجاتے تھے ہم نے کہا "شبابش!!"

باقی اس فاجرہ عورت کے موزے کا معاملہ بھی مطلق نہیں بلکہ دھونے کے ساتھ مقید ہے اگر دھونے کا ذکر نہیں تو دوسری چیزوں کا ذکر بھی وہاں نہیں نیز اس کے ساتھ نماز پڑھنے کا تذکرہ بھی نہیں ہے کہ اس نے اسی کے ساتھ نماز بھی پڑھی تھی۔

طریقہ تطہیر میں اختلاف:

کتے کے جوٹھے کے طریقہ تطہیر کے بارے میں جمہور کا آپس میں اختلاف ہے۔

دلائل:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سات بار دھونا واجب ہے وہ مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں سات بار کا ذکر ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین بار دھونے سے پاکی حاصل ہو جاتی ہے یہ عام ضابطہ ہے جو کتے کے جوٹھے کو بھی شامل ہے۔ احناف نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کو ابن عدی نے اپنی کتاب الکامل میں ذکر کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”اذا ولغ الکلب فی اداء احدا کمر فلیہرقہ ولیغسلہ ثلاث مرارۃ۔“

نیز احناف نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے فتویٰ سے استدلال کیا ہے جس میں تین مرتبہ دھونے کا ذکر ہے اور طحاوی اور دار قطنی نے اس کو نقل کیا ہے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل بھی تین مرتبہ دھونے کا تھا ان روایات سے شوافع کے مستدلان منسوخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جواب شیخ: احناف شوافع کو یہ جواب دیتے ہیں کہ سات مرتبہ دھونے کا حکم ابتداء اسلام میں تھا تا کہ کتوں کی نفرت مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ جائے بعد میں اس حکم میں تخفیف ہو گئی یہ ایک جواب ہو گیا شوافع کی دلیل اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ سات بار دھونے کی روایت استحباب پر محمول ہے اور تین بار دھونے کی روایت فرض پر محمول ہے اس میں ہمارا بھی اختلاف نہیں ہے۔

تیسرا جواب یہ کہ ابتداء بحث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ بعض روایات میں تین اور پانچ اور سات بار دھونے میں اختیار بھی دے دیا گیا ہے جیسا دار قطنی کی روایت میں ہے جب اختیار ہے تو سات بار دھونے کو واجب نہیں کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ جواب یہ کہ تین بار دھونا حصول طہارت کے لئے ہے اور سات بار طہارت و حکمت اور علاج کے لئے ہے اسی وجہ سے آخر میں مٹی کا ذکر آیا ہے کیونکہ مٹی میں اجزائے نوحہ اور شامل ہیں جس سے کتے کے منہ کے جراثیم خاص طور پر مر جاتے ہیں اسی وجہ سے اس حکمت کی تحقیق جب ایک ڈاکٹر نے کی تو وہ مسلمان ہو گیا کہ یہ حکمت صرف وحی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ اغسلہ النجاسات خنزیر کا جوٹھا اور اس کی غلاظت، خود کتے کی غلاظت، حیض کا خون اور دیگر نجاسات سب تین بار دھونے سے پاک ہو جاتے ہیں تو کتے کا جوٹھا کیوں پاک نہیں ہوتا؟ حالانکہ اس میں تو اختلاف بھی ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کو پاک کہتے ہیں۔

آخر میں الزامی جواب یہ ہے کہ اگر نہیں مانتے ہو تو حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت میں آٹھ بار دھونے کا ذکر ہے تعزیر کا ذکر بھی ہے تو آپ نے خود حدیث پر پورا عمل نہیں کیا ہے۔

لطیفہ:

اگر کسی کتے نے کسی کا کپڑا منہ میں دبایا تو اگر غصہ کی حالت میں دبایا ہے تو کپڑا نجس نہیں ہوگا اور اگر پیار سے دبایا تو نجس ہو جائے گا ورنہ فرق یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں لعاب خشک ہو جاتا ہے نیز غصہ میں دانت کام کرتے ہیں جس میں لعاب نہیں اور پیار سے چومنے میں لعاب بھی زیادہ ہوتا ہے اور ہونٹوں سے پیار کر کے پکڑتا ہے جس سے لعاب لگ کر کپڑا نجس ہو جاتا ہے۔

مسئله تطہیر الارض

﴿وَعَنْهُ قَالَ قَامَ اَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَتَنَّا وَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوهُ وَهَرِّقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجَلًا مِنْ مَاءٍ أَوْ ذَنُوبًا مِنْ مَاءٍ فَإِنَّمَا يُعَفِّئُكُمْ مَيْتَتَيْنِ وَلَكُمُ تَبَعُفُوا مُعْتَبِرَتَيْنِ﴾ (رواۃ البخاری) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک دیہاتی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا (یہ دیکھ کر) لوگ اس کے پیچھے پڑنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اسے چھوڑ دو اور ایک ڈول پانی اس کے پیشاب پر بہا دو (پھر آپ نے فرمایا) تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو چکی کرنے والے نہیں۔“ (بخاری)

توضیح: قَامَ اعرابی: عرب کے صحرائیوں کو اعراب کہتے ہیں اس کی طرف نسبت اعرابی ہے یعنی دیہاتی بادیہ نشین۔ اس دیہاتی کا نام بعض نے ذوالخویصرہ بتایا ہے یہ ایک گنوار آدمی تھا ترمذی کی روایت میں ہے کہ اس نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے بعد دعا میں کہا ”اللھم ارحمنی وارحم محمدًا ولا ترحم معنا احدًا“۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم نے وسیع رحمت کو بند کرنے کی کوشش کی اس کے کچھ دیر بعد اس شخص نے کھڑے ہو کر مسجد میں پیشاب کیا یہ شخص بعد میں خوارج کا سرغنہ بن گیا بعض نے کہا کہ اس شخص کا نام اقرع بن حابس تھا۔

بہر حال اس جیسی حدیثوں میں منکرین حدیث پر ویزی لوگ مضحکہ اڑاتے ہیں اور صحیح حدیثوں کا انکار کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عقلمند مسجد میں پیشاب کرے پھر حضور ﷺ نے پیشاب کرنے کی مہلت اور اجازت کیسے دے دی معلوم ہوا یہ داستانیں ہیں حدیث نہیں۔

ان عقل کے اندھوں نے اس پرانے زمانے کی سوسائٹی اور ماحول کو آج کے ماحول پر قیاس کیا حالانکہ اس وقت مسجد کی کچی زمین تھی مسجد اور غیر مسجد کی زمین کا امتیاز مشکل تھا آدمی نو وارد اور نو مسلم تھا اور نادان تھا بھی تھا مسجد کی زمین سو گز رقبہ پر محیط تھی کچھ آباد تھی باقی غیر آباد اور بغیر چار دیواری کی تھی مٹی اور ریت کے تودے پڑے تھے یہ شخص احکام سکھنے کی غرض سے قریب میں کھڑا ہو گیا کہ جلدی فارغ ہو جاؤں گا ان کو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ مسجد ہے اب اگر اس کو حضور اکرم ﷺ بھگا دیتے تو

مزید جگہیں پیشاب سے آلودہ ہو جاتیں اور پیشاب روک کر خطرناک بیماری کا خطرہ بھی تھا جگہ ناپاک ہو چکی تھی دھونا لازم تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اب اس کو مت روکو پیشاب کرنے دو بعد میں جگہ دھولیں گے یہ صحیح نقشہ ہے اب اگر کوئی شخص نقشہ خراب کرنا چاہتا ہے اور مسئلہ اور واقعہ صحابہ کے زمانے کا لیا اور ماحول آج کل کے زمانے کا لیا تو یہ ایک آدمی کی گمراہی کے لئے کافی ہے۔

تعاولہ الداس: یعنی لوگوں نے زبان سے اس کو گھیر لیا ان پر آوازیں کیں روکنے کے لئے کہا۔
 مہ مہ: مت کر مت کر اس کو ڈانٹا یہ سب تناول کا مفہوم ہے ہاتھوں سے پکڑ کر مارنا مراد نہیں ہے۔ پشتوں میں کہتے ہیں۔
 ”مہ کوہ مہ کوہ“۔

خلوبا: بڑے ڈول کو ذنوب کہتے ہیں جس میں خوب پانی بھرا ہوا ہو۔

زمین کی طہارت کے طریقہ میں فقہاء کا اختلاف:

جہور فرماتے ہیں کہ اگر زمین ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ پانی سے اس کو دھویا جائے۔
 امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ناپاک زمین کے پاک کرنے کے تین طریقے ہیں اول یہ کہ پانی سے دھویا جائے یہ اتفاقی صورت ہے۔ دوسرا یہ کہ اس حصہ کی مٹی کو کھود کر نکالا جائے اور نئی مٹی لا کر وہاں بھر دی جائے۔ تیسرا طریقہ یہ کہ دھوپ سے زمین کو خشک ہونے دیا جائے۔ خشک ہونے سے زمین پاک ہو جاتی ہے۔

اب اگر مسجد کے وسط میں کسی نے پیشاب کیا تو اس کو دیکھا جائے گا اگر فرش پکا ہے تو پکڑا یا تولیہ لے کر پہلے اسے خشک کرے پھر پکڑا دھو کر پانی میں بھگو کر اس بخش جگہ پر مل لیا جائے دو تین مرتبہ ملنے سے جگہ پاک ہو جائے گی وسط مسجد میں پانی بہا کر پورے فرش پر پھیلا دے اور پھر دھونا صحیح نہیں ہے اور اگر پیشاب مسجد کے پکے فرش کے کنارے پر ہے تو اس جگہ کو ہر حال میں دھو کر پانی باہر کی طرف گرایا جائے گا اور اگر فرش پکا ہے تو اگر مٹی مضبوط ہے تو اسے کھود کر باہر پھینکا جائے اور پاک مٹی وہاں بھر دی جائے اور اگر مٹی ریتیلی ہے اور پانی اس میں جذب ہو سکتا ہے تو اس پر پانی ڈال دیا جائے اور جذب ہونے تک انتظار کیا جائے تین دفعہ ایسا کرنے سے زمین پاک ہو جائے گی اور اگر دھوپ پڑتی ہے تو سوکھ جانے سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے البتہ جہور اس کا انکار کرتے ہیں۔

دلائل:

جہور نے زیر بحث حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں پانی استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ احناف اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ کتے مسجد نبوی میں آتے جاتے رہتے تھے اور اس کو دھویا نہیں جاتا تھا

احناف کہتے ہیں کہ یہ "ذکوۃ الارض بیسہا" پر عمل ہوتا تھا احناف نے مصنف ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کی ایک روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو محمد بن حنفیہ کا اثر ہے فرماتے ہیں "اذا جفت الارض فقد ذکت" یعنی جب زمین سوکھ جاتی ہے تو پاک ہو جاتی ہے۔

ہاں ایسی زمین پر نماز تو پڑھی جاسکتی ہے لیکن اس پر تیمم نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ تیمم میں قرآن کریم کے اندر نص قطعی کے ساتھ پاک مٹی کی قید لگائی گئی ہے اور ذکوۃ الارض بیسہا خبر واحد ہے جو تیمم کے جواز کے لئے کافی نہیں ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِذْ جَاءَ أَعْرَابِي فَقَامَ يَمُولُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْ مَهْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تُزِرُمُوهُ دَعُوهُ فَكَرَّ كَوُّهُ حَتَّى بَالَ ثُمَّ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَعَاَهُ فَقَالَ لَهُ إِنَّ هَذِهِ الْمَسَاجِدُ لَا تَصْلُحُ لِمَنْ هُوَ مِنْ هَٰذَا النَّبُولِ وَالْقَدْرِ إِنَّمَا هِيَ لِلَّهِ وَالصَّلَاةِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ أَوْ كُنَّا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ وَأَمَرَ رَجُلًا مِنَ الْقَوْمِ فَجَاءَ بِدَلْوٍ مِنْ مَاءٍ فَسَلَّاهُ عَلَيْهِ. (متفق علیہ)

تَرْجُمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک روز) ہم سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا (یہ دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کے صحابہ اس سے کہنے لگے کہ ٹھہر جا! ٹھہر جا! آنحضرت نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اسے پیشاب کرنے سے نہ روکو بلکہ اسے چھوڑ دو اور پیشاب کرنے دو (کیونکہ اگر تمہارے دھمکانے سے اس کا پیشاب رک گیا تو یہ اس کے لئے تکلیف دہ ہوگا یا پھر اس طرح اس کا پیشاب جو ایک ہی جگہ ہے کئی جگہ پھیل جائے گا) صحابہ نے اسے چھوڑ دیا اور اس دیہاتی نے (جب پورا) پیشاب کر لیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے بلایا اور (نہایت شفقت و مہربانی سے) فرمایا کہ مسجدیں پیشاب و گندگی وغیرہ کے لئے نہیں ہیں بلکہ کراچی اور نماز و قرآن پڑھنے کے لئے ہیں یا آپ نے اس کے مثل فرمایا (یعنی راوی کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ نے اعرابی سے یہی الفاظ فرمائے تھے یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مجلس میں سے ایک شخص کو حکم دیا اس نے ایک ڈول پانی لا کر پیشاب پر بہا دیا۔ (بخاری و مسلم)

﴿۴﴾ وَعَنْ أَنَسٍ بَنِي تَبَكْرٍ قَالَتْ سَأَلْتُ إِمْرَأَةً رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ إِذَا أَصَابَتْ قُوْبَهَا الدَّمُ مِنَ الْخَيْضَةِ كَيْفَ تَصْنَعُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَصَابَتْ قُوْبُ إِحْدَانَا الدَّمُ مِنَ الْخَيْضَةِ فَلْتَقْرُضْهُ ثُمَّ لِيَتَضَخَّ بِمَاءٍ ثُمَّ لِيَتَّصِلْ فِيهِ. (متفق علیہ)

میں سے کہ اگر ہم میں سے کوئی حیض کا خون کپڑے پر لگا ہوا پائے تو کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیے کہ (پہلے) چکیوں سے اسے لے پھر پانی سے دھو لے اور اسی کپڑے سے (خواہ وہ تری کیوں نہ ہو) نماز پڑھ لے۔ (بخاری و مسلم)

مسئله المني

۶۵۰ وعن سليمان بن يسار قال سألت عائشة عن النبي يصيب الثوب فقالت كُنْتُ أَعْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَيَجْعُزُ إِلَى الطَّلَاةِ وَأَكْرَأُ الْغَسْلَ فِي ثَوْبِهِ. (معلق عليه) ۱

میں سے کہ اگر ہم میں سے کوئی حیض کا خون کپڑے پر لگا ہوا پائے تو کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیے کہ (پہلے) چکیوں سے اسے لے پھر پانی سے دھو لے اور اسی کپڑے سے (خواہ وہ تری کیوں نہ ہو) نماز پڑھ لے۔ (بخاری و مسلم)

۶۶۰ وعن الأسود وهما عن عائشة قالت كُنْتُ أَقْرَأُكَ النَّبِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. (رواه الشَّيْخُ أَبُو وَائِلَةَ عَائِشَةَ وَالْأَسْوَدُ عَنْ عَائِشَةَ لَعْنَةُ الْبُخَارِيِّ وَابْنِ أَبِي شَيْبَةَ)

میں سے کہ اگر ہم میں سے کوئی حیض کا خون کپڑے پر لگا ہوا پائے تو کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیے کہ (پہلے) چکیوں سے اسے لے پھر پانی سے دھو لے اور اسی کپڑے سے (خواہ وہ تری کیوں نہ ہو) نماز پڑھ لے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: سألت عائشة عن النبي: مندرجہ بالا دونوں حدیثوں کا تعلق منی سے ہے کہ آیا یہ پاک ہے یا نجس ہے اور اس کے ازالہ اور تطہیر کا طریقہ کیا ہے۔ سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں اس لئے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منی کے متعلق پوچھا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا ہے دونوں روایتوں کا تعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔ یہ کلام پردہ میں ہوتا تھا۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اور امام احمد رضی اللہ عنہ کے اصح قول کے مطابق منی پاک ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک منی نجس ہے ہاں ان دونوں میں آپس میں اتنا فرق ہے کہ امام صاحب کے ہاں اگر منی

کپڑے پر سوکھ جائے اور پھر کھرچ لی جائے تو کپڑا پاک ہو جائے گا یہ بھی تطہیر کا ایک طریقہ ہے اور اگر منی تر ہو تو ہر حال میں دھونا لازم ہے لیکن امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منی تر ہو یا خشک ہو ہر حال میں اس کا دھونا فرض ہے کھرچنے سے کپڑا پاک نہیں ہوگا۔

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اپنے استدلال میں فرماتے ہیں:

① کہ حدیث میں منی کے ازالہ کے بارے میں "حَلَّ" اور "حَتَّ" کے الفاظ آئے ہیں جو رگڑنے اور کھرچنے کے معنی میں ہیں اور یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ کھرچنے سے پوری نجاست اکھڑ نہیں جاتی بلکہ کچھ باقی رہ جاتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے کھرچنے پر اکتفا فرمایا ہے معلوم ہوا منی پاک ہے تب ہی تو اس کے قلیل اجزاء کو برداشت کیا گیا ہے۔

② گویا منی پستان کے دودھ کی طرح ہے۔

③ منی سے ماں کے پیٹ میں بچہ غذا حاصل کرتا ہے تو اس کو پاک ماننا ہوگا۔

④ نیز اس سے اولیا و دانیاء پیدا ہوئے ہیں تو اولیا و دانیاء کی بنیاد اور اصل کو کیسے نجس کہو گے؟

⑤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو دارقطنی نے اس طرح نقل کیا ہے:

"سئل النبی ا عن المني يصيب الثوب فقال انما هو بمنزلة المغاط والبزاق۔"

یعنی منی کی تشبیہ آپ نے ناک کی آلائش ریختہ سے دی ہے ظاہر ہے ریختہ پاک ہے تو منی بھی پاک ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی حدیث سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منی کے ساتھ نماز پڑھی ہو یا منی کے ازالہ کے طریقے مختلف ہیں کبھی غسل اور دھونے سے زائل کی گئی ہے کبھی خشک ہونے کی صورت میں "حَلَّ" "حَتَّ" اور کبھی "طَرَك" کے طریقہ سے اس کا ازالہ کیا گیا ہے ازالہ کی جو صورت بھی ہو یہ بات سچ ہے کہ منی کے ساتھ کبھی نماز نہیں پڑھی گئی ہے جو اس کی نجاست کی بڑی دلیل ہے اگر یہ پاک ہوتی تو بیان جواز کے لئے ایک آدھ مرتبہ آنحضرت ﷺ ازالہ کے بغیر اس کے ساتھ نماز پڑھتے پڑھاتے معلوم ہوا کہ منی نجس ہے۔

اگر شوافع یہ کہہ دیں کہ "حَلَّ" "حَتَّ" "طَرَك" اور "حَتَّ" سے منی کا ازالہ بالکلیہ نہیں ہوتا ہے کچھ اجزاء باقی رہتے ہیں اور آنحضرت ﷺ نے حَلَّ وغیرہ پر اکتفا کیا ہے معلوم ہوا یہ پاک ہے۔ اس کا لازمی جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ قضاء حاجت کے بعد استنجاء بالا حجار آپ مانتے ہو حالانکہ حجار سے مکمل ازالہ نہیں ہوتا ہے نجاست کے ذرات باقی رہتے ہیں جس کو قلیل ہونے کی وجہ سے برداشت کیا گیا ہے لہذا آپ حضرات انسانی غلاظت کو بھی پاک کہہ دیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ احناف کے ہاں قدر درہم سے کم نجاست معاف ہے لیکن شوافع کے ہاں نجاست کی کوئی مقدار معاف نہیں ہے۔ اسی لئے وہ مجبور ہوئے اور ان کو کہنا پڑا کہ منی پاک ہے لیکن استنجاء بالا حجار میں وہ کیا کریں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ طلائم

اشیاء سے نجاست کے پونچھنے اور رگڑنے سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے جیسے آئینہ چاقو، گوار، موزہ وغیرہ ان ملائم اشیاء کی پاکی کے شوافع بھی قائل ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو نہ دھویا گیا وہ پاک ہے استناف اور مالکیہ نے ترمذی کی اس واضح حدیث سے استدلال کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”واغسله اذا كان رطباً وافرکه ان كان يابساً“۔

صحیح ابوعوانہ اور امام طحاوی نے بھی اسی قسم کی روایت نقل فرمادی ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:

..كنت افراث المعنى من ثوب رسول الله ﷺ اذا كان يابساً واغسله اذا كان رطباً..

شوافع حضرات نے جو دلائل پیش کئے ہیں اس کے جوابات احناف اس طرح دیتے ہیں۔

جواب: منی کو پستان کے دودھ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کیونکہ دودھ کے نکلنے کا راستہ اور ہے اور منی کے نکلنے کا راستہ اور ہے۔ دودھ کا راستہ پاک ہے اور منی کے نکلنے کا راستہ پیشاب اور نذی اور ودی جیسے نجس اشیاء کے خروج کا راستہ ہے نیز ایک حلال طعام جب پیٹ میں منقلب ہو کر گوہر بن جاتا ہے تو وہ نجس سمجھا جاتا ہے اسی طرح منی بھی طعام سے مبدل ہو کر نجس ہو جاتی ہے نیز خروج منی موجب حدث ہے اور جو چیز موجب حدث ہے وہ نجس ہے تو منی بھی نجس ہے بلکہ یہ تو حدث اصغر نہیں حدث اکبر کو واجب کرتی ہے۔

باقی بچے کی غذا کی جو بات ہے تو اس سے منی کی طہارت پر دلیل نہیں لائی جاسکتی ہے کیونکہ بچہ تو دم حیض سے بھی غذا حاصل کرتا ہے تو کیا حیض کا خون بھی پاک ہوگا۔ باقی ان حضرات کی یہ دلیل کہ منی سے اولیاء اور انبیاء پیدا ہوئے ہیں تو سن لو کہ منی کی تحلیل دم کی طرف ہے دم کی تحلیل گوشت کی طرف ہے اور گوشت کی تحلیل و جویں ہڈی کی طرف ہے تو اس جویں و تحول اور تبدیل و تبدل اور ماہیت کے تغیر کی وجہ سے شے پاک ہو جاتی ہے۔

باقی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے منی کی تشبیہ رینٹھ سے جودی ہے تو یہ پاکی میں نہیں ہے بلکہ طریقہ ازالہ کو بتایا ہے کہ میں اس کو رینٹھ کی طرح ہٹاتا ہوں تو وہ زائل ہو جاتی ہے رینٹھ کی طرح سخت ہے غلیظ ہے چپکنے والی چیز ہے ہٹانے سے پوری ہٹ جاتی ہے یاد رہے موجودہ زمانہ میں منی کی یہ کیفیت نہیں رہی بلکہ چائے وغیرہ غیر معیاری خوراک کی وجہ سے منی پتلی ہوتی ہے تو اب اس کے ازالہ کے لئے بانی ہی استعمال کرنا چاہیے۔ ویسے بھی احتیاط احناف و مالکیہ کے مسلک میں ہے۔

مسئله غسل بول الغلام

(۷) وَعَنْ أُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مَخْضَنٍ أَنَّهَا أَتَتْ بِإِثْنَيْنِ لَهَا صَغِيرَيْنِ لَمْ يَأْكُلِ الطَّعَامَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَجْلَسَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي عَجْرِ دَقْبَالٍ عَلَى تَوْبِهِ فَدَعَا بِمَاءٍ فَغَسَّحَهُ وَلَمْ يَغْسِلْهُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۷

ترجمہ: حضرت ام قیس بنت محسن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں لائیں آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھالیا اس نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا آنحضرت ﷺ نے پانی منگوا یا اور کپڑے پر بہا دیا اور خوب مل کر نہیں دھویا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: چھوٹا شیر خوار بچہ یا بچی جس نے ابھی تک دودھ کے سوا کھانا شروع نہ کیا ہو اس کے پیشاب کے بارے میں سب علماء کا اتفاق ہے کہ ناپاک ہے صرف داؤد ظاہری نے لڑکے کے پیشاب کو پاک کہا ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے ہاں فقہاء کا لڑکے کے پیشاب کے طریقہ تطہیر میں اختلاف ہے جس سے وہم ہوتا ہے کہ شوافع کے ہاں لڑکے کا پیشاب پاک ہے یہ وہم صحیح نہیں ہے کیونکہ شوافع کی کتابوں میں اس کے ناپاک ہونے کی تصریح موجود ہے۔

بول الغلامہ کے بارے میں احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں کہیں "رشع الماء" ہے کہیں "نضح الماء" کا لفظ ہے کہیں "رش الماء" کا ذکر ہے کہیں "اتباع الماء" کے الفاظ ہیں اور کہیں "صب الماء" اور کہیں "لم یغسلہ غسلا" کا جملہ ہے اسی اختلاف کی وجہ سے فقہاء کرام میں بھی اس کے طریقہ تطہیر میں اختلاف آ گیا ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے ہاں بول غلام پر صرف چھیننے مارنا کافی ہے دھونے کی ضرورت نہیں ہے امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک دھونا ضروری ہے لیکن خفیف غسل کافی ہے۔ غسل خفیف کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ احادیث میں رش، نضح، صب اور لم یغسلہ غسلا کے مختلف الفاظ آئے ہیں تو اس کے لئے ایسا معنی لینا چاہیے جو سب الفاظ پر صادق آجائے اور وہ غسل خفیف کے الفاظ ہے جو تمام الفاظ پر صادق آتا ہے اور تمام روایات کا تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے شوافع اور حنابلہ نے بہت احتجاج کیا کہ صریح حدیث ہے جس کے احناف و مالکیہ خلاف جارہے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچے کا پیشاب پاک ہے یا نجس؟ اگر نجس مانتے ہو تو پھر چھیننے مارنے سے نجاست مزید پھیلے گی جو مزید تکوید کا باعث ہے لہذا ان الفاظ سے غسل خفیف کا معنی لینا بہت ضروری ہے شوافع حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ام قیس رضی اللہ عنہا کی روایت میں "فنضحه ولم یغسلہ" الفاظ آئے ہیں جس میں نضح کے بعد غسل کی صریح نفی ہے اور نضح کو چھیننے مارنے کے سوا کسی اور معنی میں نہیں لیا جاسکتا ہے دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔

جواب: احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نضح نئے مراد غسل خفیف ہے اور لم یغسلہ سے مراد مبالغہ کے ساتھ دھونے کی نفی ہے کیونکہ مسلم شریف کی روایت میں "لم یغسلہ غسلا" کے الفاظ آئے ہیں تو مفعول مطلق تاکید کے لئے آیا ہے اور نفی اسی تاکید کی طرف متوجہ ہے جو مؤکد اور تاکید کا معروف قاعدہ ہے یعنی "لم یغسلہ غسلا مؤکدا"۔

نیز ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے "غصب الماء ولم يغسله" اور ص ب کا لفظ عربی میں بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے آیت میں ہے "انما صبغنا الماء صباً" جب بہانے کا لفظ موجود ہے تو پھر صرف رش یا شرح یا نضح سے کام نہیں لے گا نیز نضح کا لفظ عربی میں دھونے کے لئے بھی آتا ہے چنانچہ اس سے پہلے اسی باب میں اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی روایت میں "ثم لتنضجه" کا لفظ حیض کے خون دھونے کے لئے آیا ہے جبکہ وہاں جھینٹے مارنے کا معنی نہیں لیا جاسکتا ہے بہر حال غسل خفیف سے تمام احادیث پر عمل بھی ہو جاتا ہے اور نجاست کے دھونے کا شرعی ضابطہ بھی محفوظ رہ جاتا ہے اور احتیاط پر عمل بھی ہو جاتا ہے تو یہ بہتر ہے باقی لڑکی کے پیشاب دھونے کا ضابطہ وہی ہے جو عام نجاست کا ہے اب سوال یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں کیا فرق ہے کہ شریعت نے ایک میں سہولت دی ہے دوسرے میں نہیں دی ہے جس پر عورتیں احتجاج کر رہی ہیں کہ ہمارے حقوق پامال ہو گئے۔

علماء نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ طبیعت اور مزاج کے فرق کی وجہ سے مسئلہ کی حیثیت میں فرق آ گیا ہے لڑکی کے پیشاب میں تقصیر اور بدبو ہوتی ہے لڑکے میں ایسا نہیں ہے لیکن بہتر جواب وہ ہے جو شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لغات میں دیا ہے کہ یہ فرق دراصل لوگوں کی عادت اور مجبوری کی وجہ سے ہے کیونکہ لڑکوں کو مجلسوں میں لایا جاتا ہے کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے گود میں بٹھایا جاتا ہے تو اس میں مشقت اور حرج ہے کہ ان کے پیشاب کو بار بار مبالغہ کے ساتھ دھویا جائے لہذا شریعت نے لڑکے میں سہولت دی ہے اور لڑکیوں میں یہ حرج اور مجبوری نہیں ہے لہذا اس میں سہولت نہیں دی ہے عورتوں کو اپنے ہر حصہ اور قسمت پر مہر کرنا چاہیے جو شریعت نے ان کو دی ہے اس پر شکر کرنا چاہیے تقسیم کرنے والے ہم نہیں شریعت ہے۔

مردار کھالوں کی دباغت کا حکم

﴿۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا دُبِغَ الْإِهَابُ فَقَدْ ظَهَرَ
(رواہ ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب چمڑا دباغت دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: اذا دبغ الإهاب: دباغت کی تعریف اس طرح ہے: الدباغ هو اصلاح الجلد مما يمنع الدنن والفساد۔

دباغت کئی طریقہ سے ہوتی ہے تزیب یعنی مٹی سے، تھمیس یعنی دھوپ میں ڈالنے سے تقریظ یعنی بعض درخت کے چمکوں سے اور نمک ملنے سے ہوتی ہے۔ دباغت کے لئے ضروری ہے کہ کھال قابل دباغت بھی ہو لہذا سانپ اور چوہ کی کھال نا قابل دباغت ہونے کی وجہ سے اس علم سے خارج ہے پھر حلت و حرمت اور دباغت کا یہ حکم مردار جانوروں کی کھالوں کے لئے ہے حلال تو حلال ہے۔ انسان کی کھال بوجہ عظمت اور خنزیر کی کھال بوجہ سخت نجاست قابل دباغت نہیں ہے۔

ترجمہ: سرکارِ دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودة رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہماری ایک بکری مر گئی تھی ہم نے اس کی کھال نکال کر دباغت دے لی اور ہمیشہ اسی میں غنیز (یعنی پانی اور کھجوروں کا شربت) بناتے رہے یہاں تک کہ وہ پرانی مشک ہو گئی۔ (بخاری)

الفصل الثانی

لڑکی کا پیشاب مکمل دھونا ہوگا

﴿۱۱﴾ وَعَنْ لُبَابَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ فِي عَجْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَبَالَ عَلَى تَوْبِهِ فَعُلْتُ الْبَشَّ تَوْبًا وَأَعْطِيَنِي إِذَا زَكَتِ عَلَيَّ أَغْسِلُهُ فَقَالَ إِنَّمَا يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْأَنْثَى وَيُنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهٍ وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ وَالْأَسْنَدُ عَنْ أَبِي السَّنَحِ قَالَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْحَارِيَّةِ وَلَيْشُ مِنْ بَوْلِ الْعَلَامِ. ۱

ترجمہ: حضرت لبابہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما اکرم ﷺ کی گود میں تھے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کیا میں نے عرض کیا کہ آپ (دوسرا) کپڑا لیکن کر یہ بند بچھدے دیجئے تاکہ میں اسے دھواؤں آپ نے فرمایا لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی کا چھینٹا دینا کافی ہے (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور ابوداؤد و نسائی کی ایک روایت میں ابورکب سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

راستے کی گندگی کا حکم

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا وَطِئَ أَحَدُكُمْ بِنَعْلِهِ الْأَدَى فَإِنَّ الْكِرَابَ لَهُ ظَهْوٌ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهٍ وَتَفَاتُحًا)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے جوتوں کے ساتھ گندگی پر چلے تو مٹی اس کو پاک کر دینے والی ہے (ابوداؤد) اور ابن ماجہ نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔
توضیح: اذا وطئ: اگر جوتے یا موزے کے ساتھ راستے کی گندگی لگ جائے تو اس کے حکم میں ائمہ کا اختلاف ہے تفصیل اس طرح ہے کہ یہ نجاست ذی جرمہ محسوس یعنی تہہ جمنے والی ہوگی یا رقیق ہوگی۔ اگر شراب یا پیشاب یا خون کی طرح رقیق اور نرم ہے تو سب کے نزدیک جوتے اور موزے کو پانی سے دھونا پڑے گا بغیر دھوئے پاک نہیں ہوگا۔ اور اگر نجاست ذی جسد ہو اور اس پر مٹی وغیرہ ڈال کر خوب جذب ہو جائے اور پھر کھڑچا جائے تو اس صورت میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، اور اسی شام اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نجاست رطب ہو یا خشک ہو دونوں صورتوں میں رگڑنے سے پاکی حاصل ہو جائے گی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی یہی ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر یہ نجاست خشک ہو تو رگڑنے سے پاکی آجائے گی اور اگر تر اور رطب ہو تو دھونے کی ضرورت پڑے گی۔ چمڑا یا جوتا اگر نرم ہے تو کپڑے کی طرح تین دفعہ نچوڑ کر دھونا ہوگا اور جوتا موزہ اگر سخت ہے تو پھر کٹڑی کی طرح دھونا ہوگا کہ اوپر اوپر پانی ڈال کر مل لیا جائے اور پانی بہایا جائے اس کے علاوہ نجاست اگر کپڑے یا بدن انسان پر لگ جائے تو وہ مسامات میں گھس جاتی ہے اس کے لئے صرف دھونا ہے، رگڑنا کافی نہیں ہے۔

باقی مذکورہ حدیثیں سب ائمہ کے خلاف ہیں تو بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ یہاں حقیقی بات نہیں بلکہ یہ احادیث تو ہم نجاست پر محمول ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم خشک نجاست کے متعلق ہے مگر فصل ثالث کی روایت کی تفصیل اس کے خلاف ہے۔ کہا ان احادیث کا تعلق طین شارع یعنی راستے کی کچھڑ کے ساتھ ہے کیونکہ وہ بوجہ مجبوری پاک کے حکم میں ہے، آنے والی روایت کی بھی اس طرح تشریح ہے۔ ل

تو اُٹھم نجاست کچھ نہیں ہے

﴿١٣﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَهَا إِمْرَأَةٌ إِنِّي أُطِيلُ ذَيْبِي وَأَمْشِي فِي الْمَكَانِ الْقَلِيلِ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُطَهِّرُ مَا بَعْدَهُ.

(رواه مالك وأحمد والبخاري وابن ماجه والدارمي وقال المزي في الميزان ولم يوافقه عليه غيره) **باب** في حديث عبد الرحمن بن عوف **ع**.

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان سے ایک عورت نے کہا کہ میرا دامن لٹکا ہوا ہے اور میں ناپاک جگہ میں چلتی ہوں (یہ خیال ہے کہ دامن کو ناپاک کی لگ جاتی ہے) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے (اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں) فرمایا تھا کہ اس کو وہ چیز پاک کرتی ہے جو اس کے بعد ہے (یعنی پاک زمین یا مٹی) (احمد، مالک، ترمذی، ابوداؤد، دارمی) اور ابوداؤد و دارمی نے کہا ہے کہ (سوال کرنے والی) وہ عورت ابراہیم بن عبد الرحمن بن عوف کی ام ولد تھی (جس کا نام حمیدہ تھا)

دورندہ کی کھال پر بیٹھنے کا حکم

﴿١٤﴾ وَعَنِ الْيَهُودِ بْنِ مَعْدٍ يُكْرِبُ قَالَ تَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ لُبِّسِ جُلُودِ السَّبَاعِ وَالرُّكُوبِ عَلَيْهَا. (رواه أبو داود والنسائي)

ترجمہ: حضرت مقدم بن محمد کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھالوں کے پسینے اور ان پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد نسائی)

﴿۱۵﴾ وَعَنْ أَبِي الْمَلِیحِ بْنِ أَسَمَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ عَنْ جُلُودِ السَّهَاجِ: (وَأَمَّا أَخَذُوهَا وَأَمَّا دَاوُدُ النَّسَائِيُّ وَآدَاؤُ الدَّارِمِيُّ وَالْإِسْنَاءِيُّ أَنَّهُمْ قَالُوا)

ترجمہ: حضرت ابوالحسین اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کرم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھال کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد، احمد، نسائی) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور دارمی نے اس روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ) درندوں کی کھالوں کا فرش بنایا جائے۔

توضیح: نبی عن جلود السہاج: دونوں حدیثوں میں درندوں کی کھال پر بیٹھنا یا سواری میں استعمال کرنا یا پہننا سب منع ہیں اس لئے علماء کے فتویٰ کے مطابق درندوں کی کھال پر بیٹھنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس پر بیٹھنے سے انسان کی طبیعت میں درندوں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ درندوں کی کھال دباغت کے بعد فروخت کی جاسکتی ہے اور یہ جائز ہے۔ لیکن دباغت سے پہلے اس کا خریدنا، فروخت کرنا جائز نہیں ہے شکاری لوگوں کو سوچنا چاہئے جو دباغت سے پہلے درندوں شیر وغیرہ کی کھالوں کو فروخت کرتے رہتے ہیں۔

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي الْمَلِیحِ أَنَّهُ كَرِهَ فَمَنْ جُلُودِ السَّهَاجِ: (وَأَمَّا.....)

ترجمہ: حضرت ابو الملیح کے بارے میں منقول ہے کہ وہ درندوں کی کھالوں کی قیمت کو (بھی) مکروہ سمجھتے تھے۔

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُكَيْمٍ قَالَ أَكَلْنَا كِتَابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَن لَا تَلْتَمِصُوا مِنَ الْمَيْتَةِ بِأَهَابٍ وَلَا عَصَبٍ: (وَأَمَّا الدَّارِمِيُّ وَآدَاؤُ الدَّارِمِيُّ وَالْإِسْنَاءِيُّ وَالْإِسْنَاءِيُّ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے (قبیلہ جمہیہ کے) پاس سرکارِ دو عالم ﷺ کا (جو) مکتوب گرامی آیا (اس میں یہ لکھا تھا) کہ تم مردار کے چمے اور اس کے پٹھے سے نفع نہ اٹھاؤ۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ أَنْ يُسْتَمْتَعَ بِجُلُودِ الْمَيْتَةِ إِذَا خُبِثَتْ: (وَأَمَّا مَا لَكَ وَأَمَّا دَاوُدُ)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردار کے چمے سے دباغت کے بعد فائدہ اٹھایا جائے۔ (ابو داؤد)

﴿۱۹﴾ وَعَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ يَجْرُونَ شَاةَ لَهُمْ مِثْلَ الْحِمَارِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ أَخَذْتُمْ إِبَاهِبَهَا قَالُوا إِنَّمَا مَيْمَنَةٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَطْهَرُهَا الْمَاءُ وَالْقَرْظُ. (رواه أبو داود)

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے چند آدمی اپنی ایک مری ہوئی بکری کو گدھے کی طرح کھینچتے ہوئے سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس سے گزرے آپ نے (یہ دیکھ کر) ان سے فرمایا کہ کاش اتم اس کے چرے کو نکال لیتے (تو یہ اپنے کام آجاتا) انہوں نے عرض کیا کہ یہ تو مردار ہے (یعنی ذبح کی ہوئی نہیں ہے) آپ نے فرمایا اسے بکھرے پتے اور پانی پاک کر دیتا ہے (یعنی ان دونوں چیزوں کے ذریعے دباغت سے چڑا پاک ہو جاتا ہے)۔ (ابوداؤد)

﴿۲۰﴾ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمَعْبُطِيِّ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ جَاءَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَلَى أَهْلِ بَيْتٍ فَاذًا قِزْبَةً مُعَلَّقَةً فَسَأَلَ الْمَاءَ فَقَالُوا آلَهُ يَارَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِنَّمَا مَيْمَنَةٌ فَقَالَ جَبَاغُهَا ظَهُورُهَا. (رواه أبو داود)

ترجمہ: حضرت سلمہ بن معیط رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ تبوک کی جنگ کے موقع پر ایک گھر تشریف لائے تو اچانک آپ کی نظر ایک لگی ہوئی مشک پر پڑی آپ نے پانی مانگا تو لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ تو (دباغت دی ہوئی) مردار کی کھال ہے آپ نے فرمایا دباغت نے اسے پاک کر دیا ہے۔ (احمد، ابوداؤد)

الفصل الثالث

خشک گندگی لگنے سے وضوء نہیں

﴿۲۱﴾ وَعَنْ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِي عَبْدِ الْأَشْهَلِ قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِنَّا ظَرِينَا إِلَى الْمَسْجِدِ مُنْتَبِئَةً فَكَيْفَ نَفْعَلُ إِذَا مُطِرْنَا قَالَتْ فَقَالَ أَلَيْسَ بَعْدَهَا ظَرِينُنِي هِيَ أَطْيَبُ مِنْهَا قُلْتُ بَلَى قَالَ فَهَذِهِ بِهَذِهِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ: بنو عبد اشہل کی ایک عورت کا بیان ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسجد میں آنے کا ہمارا جو راستہ ہے وہ گندہ ہے جب بارش ہو جائے تو ہم کیا کریں وہ کہتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کیا اس راستہ کے بعد کوئی پاک صاف راستہ نہیں آتا، میں نے عرض کیا جی ہاں آپ نے فرمایا یہ پاک راستہ اس ناپاک راستہ کے بدلے میں ہے۔ (ابوداؤد)

﴿۲۲﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ كُنَّا نَضْمِي مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنَ الْمَوَاطِي.

(رواہ العزمی ص ۱)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور زمین پر چلنے (کی وجہ) سے وضو نہیں کرتے تھے۔ (ترمذی)

توضیح: لا نتوضأ من الموطی: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں وضو سے لغوی وضو مراد ہے یعنی پاؤں دھونا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ اگر نجاست خشک تھی تو اس وقت ہم وضو لغوی بھی نہ بناتے یعنی پاؤں نہ دھوتے کیونکہ نجاست لگی ہی نہیں صرف کمرانے سے پاؤں نہیں دھوتے تھے اور اگر وضو سے شرعی وضو مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب نجاست تر ہوتی تو اس گندگی کے لگنے سے ہم وضو شرعی نہیں بنایا کرتے تھے بلکہ صرف پاؤں دھوتے تھے کیونکہ گندگی لگنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

﴿۲۳﴾ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ الْكِلَابُ تُقْبِلُ وَتُذِيرُ فِي الْمَسْجِدِ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَلَمْ

يَكُونُوا يُزْشُونَ شَيْئًا مِنْ خِلَاقِ. (رواہ البخاری ص ۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے زمانے میں مسجد میں کتے آتے جاتے تھے اور صحابہ ان کے آنے جانے کی وجہ سے کچھ بھی نہ دھوتے تھے (کیونکہ ذکوۃ الارض پیسھا پر عمل ہوتا تھا) تفصیل گزر چکی ہے (بخاری)

مسئله بول ما یؤکل لحمہ

﴿۲۴﴾ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَأْسُ بِبَوْلِ مَا يُوْكَلُ لَحْمُهُ وَفِي رِوَايَةٍ جَابِرٌ قَالَ

بِمَا أُكِلَ لَحْمُهُ فَلَا تَأْسُ بِبَوْلِهِ. (رواہ احمد والدارقطنی ص ۱)

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے تھے کہ جس چیز کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں ہے۔ (احمد و دارقطنی)

توضیح: لا تأس ببول ما یؤکل لحمہ: غیور ما کول اللحم جانوروں کا پیشاب بالاتفاق ناپاک ہے ما کول اللحم جانوروں کے پیشاب کے حکم میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ ۵

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ما کول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک

۱۔ البحرہ العزمی ۷۲۶ ص ۱ المرقات ۲/۲۱۱ ص ۱ البحرہ البخاری

۲۔ البحرہ احمد والدارقطنی فی سنۃ کتاب الطہارۃ ص ۱ المرقات ۲/۲۱۲

ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ما کول اللحم جانوروں کا پیشاب نجس ہے۔ البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ما کول اللحم جانوروں کے پیشاب سے تداوی اور علاج مطلقاً جائز ہے خواہ حالت اختیار میں ہو یا حالت اضطرار میں ہو مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے علاج صرف حالت اضطرار میں جائز ہے یعنی جان بچانے کے لئے جب ماہر اور دیندار طبیب کہہ دے کہ پیشاب پینے میں علاج ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ یاد رہے جب فقہاء کا دلائل کی روشنی میں کسی چیز کے ظاہر اور نجس ہونے میں اختلاف ہو جاتا ہے تو اس میں نجاست غلیظہ باقی نہیں رہتی چنانچہ ما کول اللحم جانوروں کا پیشاب اس اختلاف کی وجہ سے نجاست غلیظہ سے نجاست خفیفہ کے درجہ میں آگیا ہے اسی کو کہا گیا ہے "اختلاف اصعبی رحمۃ اللہ علیہ"۔

دلائل:

فریق اول کی دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں "لا یأسہ بول ما یؤکل لحمہ" کے الفاظ آئے ہیں ان کی دوسری دلیل عربین کا قصہ ہے جس میں اشر بوا من البانہا و ابوالہا کے الفاظ ہیں۔ فریق ثانی کی پہلی دلیل "استنزهوا من البول فان عامة عذاب القہر منہ" حدیث ہے جس میں البول عام ہے خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا ہو جب اس سے اتنا بچنے کا حکم ہے تو اس کو پاک کیسے کہا جاسکتا ہے۔ فریق ثانی کی دوسری دلیل قرآن کی آیت میں اشارۃً اُنس ہے فرمایا:

"نفسکم مما فی بطونہ من بین فرث و دم لہنّٰ خالصّا سائغاً للشاربین"۔

طرز استدلال اس طرح ہے کہ دودھ کو دو نجس چیزوں کے درمیان سے صاف طور پر نکالنے کا ذکر فرمایا ہے تو دو نجس پیشاب، لید اور خون ہے۔ ان حضرات کی تیسری دلیل میں استنذان طبع ہے کہ طبیعت اور فطرت سلیمہ اس چیز کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔

جواب: فریق اول کے استدلال کا جواب یہ کہ زیر بحث روایت قابل استدلال نہیں ہے کیونکہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"هذا الخبر باطل موضوع" کذا فی آثار السنن۔

نیز اس میں لا یأس کا لفظ ہے جو قاعدہ کے مطابق خلاف افضل کی طرف اشارہ کرتا ہے باقی عربین کی حدیث منسوخ ہے کیونکہ اس میں شلہ کا حکم تھا جو بالاتفاق منسوخ ہو گیا ہے تو بول کا حکم بھی منسوخ ہو گیا بشرطیکہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ تاریخ میں استنزهوا کی حدیث متاخر ہو، نیز عربین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پینے کا کہا تھا اور بول سے استنشاق کا فرمایا تھا انہوں نے پینا شروع کر دیا یا وہ لوگ مرتد ہونے والے تھے تو وحی کے ذریعہ سے ان نجسوں کو نجس ہی پلانا مقرر ہوا۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ فیذا تہر کے مسئلہ سے باب المسح علی الخفین تک کی تشریح و توضیح بندہ عاجز نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے قرب و جوار میں لکھی ہے "اللہم لک الحمد حمداً کثیراً کثیراً"۔

(فضل محمد غفرلہ نزیل المدینۃ المنورہ ۲۳ رمضان ۱۴۲۲ھ)

باب المسح علی الخفین

موزوں پر مسح کا بیان

موزوں پر مسح کرنا چونکہ کتاب اللہ کی آیت الوضو سے ظاہری طور پر متعارض تھا کیونکہ قرآن میں پاؤں دھونے کے ساتھ الی الکعبین کا لفظ آیا ہے اور نخیوں تک مسح کسی کے ہاں نہیں ہے اس قید نے پاؤں دھونے کے سوا ہر حکم کو رد کر دیا ہے اسی وجہ سے پاؤں پر مسح کرنے کے حکم کو امت نے بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا۔ خود صحابہ کرام موزوں پر مسح کرنے کی روایت کرنے والے صحابی حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بطور تعجب واستفسار پوچھ لیا کرتے تھے کہ کیا موزوں پر مسح کا حکم سورت ماکدہ کی آیت کے نزول سے بعد آیا ہے یا پہلے کا ہے تو آپ فرماتے تھے کہ بھائی سورت ماکدہ کے نزول سے پہلے تو میں نے اسلام کو قبول نہیں کیا تھا میں تو اس کے بعد مسلمان ہوا ہوں لہذا آنحضرت ﷺ کا موزوں پر مسح نزول سورت ماکدہ کے بعد کا ہے۔

گویا احادیث کثیرہ مشہورہ کی وجہ سے قرآن کی آیت میں تخصیص ہو گئی ہے اور موزوں پر مسح اس کے بعد امت نے قبول کر لیا ہے حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسح علی الخفین کے بارے میں صحابہ کرام میں کوئی اختلاف نہیں پایا اور نہ بعد کے علماء میں کسی نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے احادیث مسح علی الخفین کے راویوں کو جمع کیا تو معلوم ہوا کہ اسی (۸۰) سے زیادہ صحابہ نے اس کی روایت کی ہے جن میں عسکرہ مبصرہ بالمجدة علماء شامل ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ستر سے زیادہ ایسے صحابہ سے ملا ہوں جو موزوں پر مسح کرنے کا عقیدہ رکھتے تھے حضرت ابن عبد البر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کا سلف صالحین میں سے کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔ امام کرخی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو شخص موزوں پر مسح کرنے کا انکار کرے اور اس کو ناجائز سمجھے تو مجھے اس کے کفر کا خطرہ ہے کیونکہ اس بارہ میں احادیث تو اتنی تک پہنچی ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے موزوں کے مسح پر اجماع نقل کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے موزوں پر مسح کرنے کو اس وقت قبول کیا جب آفتاب نصف انہار کی طرح واضح احادیث مجھ تک پہنچ گئیں پھر آپ نے موزوں پر مسح کرنے کو اہل السنۃ والجماعہ کی نشانی اور شعار قرار دیا آپ نے اہل سنت ہونے کیلئے تین چیزیں لازمی قرار دیں اور فرمایا "أَنْ تَقْضِيَ الشَّيْئَيْنِ وَتُحِبَّ التَّخَشُّعَ وَتَرَى الْمَسْحَ عَلَى الْخَفَيْنِ"۔

ایک روایت میں مسح سے آخر تک مخاطب کے صیغہ کے ساتھ مسح کے بجائے تعجب ہے یعنی سنی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کے دو دامادوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت رکھو اور موزوں پر مسح کرنے کو جائز سمجھو اور شیخیں یعنی صدیق رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے افضل سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ موزوں پر مسح کرنا شرعاً جائز ہے اس کا

انکار کوئی مبتدع اور بد باطن کر سکتا ہے جیسے روافض خذلہم اللہ نے کیا ہے اور خوارج نے بھی کیا ہے۔ پھر یہ بات یاد رکھیں کہ موزوں پر مسح کرنا رخصت ہے اور پاؤں کا دھونا افضل اور عزیمت ہے لیکن اگر کوئی تکلف کرتا ہے اور مشقت کے ساتھ پاؤں دھوتا ہے تو اس طرح دھونا افضل نہیں ہاں اگر بغیر تکلف کے کوئی دھوتا ہے تو دھونا افضل ہے۔ صاحب سفر السعاده نے لکھا ہے کہ جو عمل آنحضرت ﷺ کے سامنے آیا ہے تو بغیر کسی تکلف کے آپ نے اس پر عمل کیا ہے اور ذرا بھی تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔

الفصل الاول

مسئلة التوقيت في المسح

﴿۱﴾ وَعَنْ شَرِيحِ بْنِ هَاشِمٍ قَالَ سَأَلْتُ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ عَنِ الْمَسْحِ عَلَى الْخَفَيْنِ فَقَالَ جَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالٍ لِّلْمَسَافِرِ وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِّلْمُعْتَمِرِ. (زَوَاة مُنْبِلَة)۔

ترجمہ: حضرت شریح بن ہاشم نے فرمایا کہ مرکار دو عالم ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور متیم کے لئے ایک دن اور ایک رات کی مدت مقرر فرمائی ہے۔ (مسلم)

توضیح: ثلاثة ايام: توقيت في المسح یہ ہے کہ شریعت نے جب موزوں پر مسح کرنے کا حکم دے دیا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ مسح کرنا کسی مقرر وقت تک ہے یا اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس مسئلہ کو توقيت اور عدم توقيت مسح کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مسح علی الخفین غیر موقت ہے اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے آدمی جب تک مسح کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے اس میں متیم اور مسافر کا بھی کوئی فرق نہیں ہے ائمہ ثلاثہ جمہور محدثین اور جمہور صحابہ کے ہاں مسح علی الخفین موقت ہے متیم کیلئے ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لئے تین دن تین راتیں ہیں۔

مالکیہ کے دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ اور وہ حضرات جو عدم توقيت مسح کے قائل ہیں وہ ابوداؤد شریف باب التوقيت في المسح کی دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں ایک حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ موجود ہیں ”ولو استزدنا لزوادنا“ یعنی جب آنحضرت ﷺ نے مسح خفین کا مسئلہ بیان فرمایا تو متیم کے لئے آپ ﷺ نے ایک دن

اور ایک رات مقرر فرمادیا اور مسافر کے لئے تین دن تین راتیں مقرر فرمادیں اور اگر ہم اس سے زیادہ دنوں تک مسح کی اجازت مانگتے تو آپ زیادہ دنوں کی بھی اجازت دے دیتے۔

امام مالک رحمہ اللہ کی دوسری دلیل بھی سنن ابوداؤد کی انی بن عمارہ رحمہ اللہ کی روایت ہے ایک صحابی نے پوچھا:

”امسح علی الخفین؟ قال نعم قال یوماً قال یومین قال وثلاثہ قال وما شئت۔“

اس آخری جملہ سے عدم توقیت پر مالکیہ استدلال کرتے ہیں کہ آدمی جتنے دن مسح کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ (ابوداؤد ص ۲۱)۔
ابوداؤد میں اسی حدیث کی ایک سند میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

”حتی بلغ سبعاً قال رسول اللہ ﷺ نعم ما ہد الیک۔“ یعنی جب تک چاہو مسح کر سکتے ہو۔

مالکیہ کی تیسری دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے یہ صحابی بہت تیز رفتار تھے شام سے مدینہ منورہ تک ایک ماہ کا سفر ایک ہفتہ میں کرتے تھے صحابہ کرام جنگ کے دوران بعض ضروریات کے لئے ان کو مدینہ بھیج دیا کرتے تھے ایک دفعہ انہوں نے حضرت عمر رحمہ اللہ سے فرمایا کہ میں نے ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک مسلسل مسح کیا ہے۔
جمہور کے دلائل:

اس مسئلہ میں جمہور کے بہت زیادہ دلائل ہیں:

- زیر نظر حضرت شریح بن حانی کی حدیث میں حضرت علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن تین راتیں مقرر فرمائیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات مقرر فرمائی یہ مسلم کی روایت ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۵۳)۔
- اس کے ساتھ والی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اس کو بھی مسلم نے نقل کیا ہے۔
- پھر فصل ثانی کی حضرت ابوبکرہ رحمہ اللہ کی صریح حدیث اور روایت ہے جس میں مسافر کے لئے ایک دن ایک رات اور مقیم کے لئے تین دن تین راتیں مقرر کی گئیں ہیں اس روایت کو دارقطنی اور ابن حزم نے نقل کیا ہے۔
- پھر اسی کے ساتھ والی روایت حضرت صفوان بن عسال رحمہ اللہ کی ہے جس میں تین دن تک موزوں کے نہ نکالنے کی وضاحت اور تصریح ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دلائل ہیں مگر یہ کافی ہیں۔

جواب: امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل خزیمہ بن ثابت رحمہ اللہ کی روایت کا جواب یہ ہے کہ ابن دقیق العید نے تصریح فرمائی ہے کہ اس روایت میں ولو استزدنا لک لہذا کے جملہ کا اضافہ ثابت نہیں ہے۔ اور اگر یہ جملہ ثابت بھی ہو جائے تو یہ صحابی کا ایک خیال ہے اس کی رائے ہے آنحضرت ﷺ کی مرفوع حدیث نہیں ہے پھر لو انتفاء ثانی کے لئے آتا ہے بسبب انتفاء اول تو یہاں زیادت کا سوال بھی نہیں ہوا ہے اور نہ زیادت ہوئی ہے۔

باقی سات دن تک مسح کی مدت والی حدیث ضعیف بھی ہے اور اپنے مقصود میں متعین بھی نہیں بلکہ محتمل ہے اس میں دور ادوی مجہول ہیں امام بخاری اور بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ اور محتمل اس طرح ہے کہ سات دن تک ایک ہی مسح کافی سمجھا گیا تھا

یا سات دن تک ترتیب کے ساتھ مسح کرتا رہا دونوں احتمال ہیں یعنی مسح کے قاعدہ کے مطابق سفر میں تین دن کے بعد موزے نکال کر پاؤں دھو کر پھر مسح شروع کرتا تو سات دن یا ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک موزے پہنے رہتے تھے اور ترتیب کے ساتھ قاعدہ کے مطابق مسح ہوتا رہا جیسے تیمم کے بارے میں حدیث ہے "الصعيد الطيب طهور المسلم الى عشر سنين" تو دس سال تک ایک تیمم نہیں چلتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دس سال تک اگر پانی نہ ملے تو قاعدہ اور ترتیب کے مطابق تجدید کے ساتھ تیمم پر دس سال تک عمل ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح مذکورہ مسح کی حدیث بھی ہے یہ جواب اسی طرح عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت کے سمجھنے کے لئے بھی کافی ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ترتیب اور قاعدہ کے مطابق آٹھ دن تک موزوں پر مسح ہی کرتا رہا۔ آنے والی روایات کی تشریح کے لئے یہ تشریح کافی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ایک رکعت نفل گئی

﴿۲۶﴾ وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ أَنَّهُ عَزَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ غَزْوَةَ تَبُوكَ قَالَ الْمُغِيرَةُ فَتَزَوَّرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَبْلَ الْغَايِطِ فَجَبَلْتُ مَعَهُ إِذَا وَادَةً قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا رَجَعَ أَخَذْتُ أَهْرِي عَلَى يَدَيْهِ مِنَ الرِّدَاوَةِ فَعَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ مِنْ صُوفٍ ذَهَبَ بِخَيْسِرٍ عَنْ ذِرَاعَيْهِ قَضَائِي كُمُ الْجُبَّةِ فَأَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنْ تَحْتِ الْجُبَّةِ وَالْأَلَى الْجُبَّةِ عَلَى مَنْكَبَيْهِ فَعَسَلَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ مَسَحَ بِتَأْصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ ثُمَّ أَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ دَعُهُمَا فَإِنِّي أَدْخُلُهُمَا ظَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا ثُمَّ رَكِبَ وَرَكِبْتُ فَإِنَّهُمَا إِلَى الْقَوْمِ وَقَدْ قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ وَيُصَلِّحُ بِهِمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ وَقَدْ رَكِعَ بِهِمْ رَكْعَةً فَلَمَّا أَحَسَّ بِالنَّبِيِّ ﷺ ذَهَبَ يَتَأَخَّرُ فَأَوْمَأَ إِلَيْهِ فَأَذْرَكَ النَّبِيُّ ﷺ إِخْدَى الرَّكْعَتَيْنِ مَعَهُ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ وَقُمْتُ مَعَهُ فَرَكْعَتَا الرَّكْعَةِ الَّتِي سَبَقْتُنِي (رواه مسلم)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ غزوہ تبوک میں شرکت کی چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ (اسی دن ایک روز) فجر سے پہلے سرکارِ دو عالم ﷺ قضاے حاجت کے لئے تشریف لے گئے میں بھی پانی کی چھال لے کر آپ کے ہمراہ ہوا جب آپ (قضاے حاجت سے) واپس تشریف لائے (اور وضو کرنے کے لئے بیٹھے) تو میں نے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنا شروع کیا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور منہ دھویا آپ ایک ادنیٰ جبہ پہنے ہوئے تھے اس کی آستینیں چڑھانی چاہیں لیکن آستینیں تنگ تھیں (اس لئے چڑھ نہ سکیں) آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جبہ کے اندر سے نکال کر جبہ کو سوندھوں پر ڈال لیا اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھو کر چوتھائی سرکا اور گڑی کا مسح کیا پھر (جب) میں نے آپ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا تا کہ آپ پیر دھولیں (تو) آپ نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو کیونکہ میں نے (پاؤں کی) پاکی کی حالت میں انہیں پہنا تھا (یعنی وضو کرنے کے بعد پہنا تھا) اور آپ نے دونوں موزوں پر مسح کیا، پھر آپ اور میں دونوں سوار ہو کر

لوگوں کے پاس آئے تو (حجری) نماز کے لئے جماعت کھڑی ہو گئی تھی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے اور ایک رکعت پڑھا بھی چکے تھے جب انہیں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا احساس ہوا تو وہ پیچھے ہٹنے لگے (تاکہ آنحضرت ﷺ امامت کریں) مگر آنحضرت ﷺ نے انہیں اشارہ کیا (اپنی جگہ کھڑے رہو اور نماز پڑھائے جاوے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت نماز ان کے ساتھ ہی پڑھی (یعنی آپ نے دوسری رکعت حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ادا کی) جب انہوں نے سلام پھیر لیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور جو (پہلی) رکعت رہ گئی تھی ہم نے اسے پڑھ لیا۔ (مسلم)

الفصل الثانی

مقیم اور مسافر کے لئے مدت مسح

﴿۳﴾ وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمَسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ وَلِلْمَقِيمِ يَوْمًا وَلَيْلَةً إِذَا تَطَهَّرَ فَلَيْسَ خُفْيُهُ أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا.

(وَأَمَّا الْأَنْوَاعُ فِي سَلْبِهِ وَالثَّوْبِ الْحُزْمَةِ وَالذَّارِ فَلَيْسَ وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ هُوَ صَوْنٌ مِنَ الْإِسْتِغَاثَةِ كَمَا فِي الْمُسْطَلَقِ).

ترجمہ: حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت مسافر کو تین دن اور تین رات تک اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات تک دی ہے جب کہ انہوں نے موزوں کو وضو کرنے کے بعد پہنا ہو۔ (اخرم رحمہ اللہ، ابن خزیرہ رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ) اور خطابی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اسناد کی رو سے صحیح ہے اور متفق میں بھی اسی طرح منقول ہے۔

توضیح: اذا تطهر: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں اور اس سے پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ موزہ پر مسح تب صحیح ہے جب اس کو کامل طہارت پر پہن لیا جائے یعنی وضو بنا لیا اور ابھی تک وہ فحش یا وضو ہے اور موزہ پہن لیا تو آئندہ مسح کر سکتا ہے کیونکہ موزہ طہارت پر پہن لیا گیا ہے اور باہر سے نئی نجاست یا حدث جو آتا ہے وہ موزہ کے اندر کو سرایت نہیں کرتا ہے لہذا صرف مسح کافی ہے اس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک پورا وضو نہیں کیا ہو اس وقت تک مسح جائز نہیں بلکہ کامل طہارت پر موزہ پہننا آئندہ مسح کے لئے شرط ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر کسی شخص نے وضو بنا تے ہوئے پہلے پاؤں دھو لئے اور پھر موزہ پہن کر باقی وضو مکمل کر لیا تو اس صورت میں بھی آئندہ مسح جائز ہے کیونکہ اس نے پاؤں کی طہارت کی حالت میں موزے پہن لئے ہیں دراصل یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ آیا وضو میں ترتیب یعنی مرتب وضو فرض ہے یا ترتیب فرض نہیں تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وضو میں ترتیب فرض ہے اب جس نے پہلے پاؤں دھو لئے تو اس نے غیر مرتب وضو بنا لیا جو صحیح نہیں ہوا تو موزے طہارت پر کہاں پہنے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ وضو غیر مرتب بھی صحیح ہے لہذا یہ موزے طہارت

پر پہن لئے گئے ہیں تو مسح جائز ہوا۔ احتیاط شوافع کے مسلک میں ہے اور ظاہر حدیث بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَالٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُكَ إِذَا كُنَّا سَفَرًا أَنْ لَا تَنْزِعَ خِفَافًا وَلَا ثِيَابًا وَلَا يَلْبَسَنَّ الْأَمِنْ جَنَابَةٍ وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَتَوَمُّدٍ (رواه الترمذی والنسائی)۔

ترجمہ: اور حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم سفر میں ہوتے تھے سرکارِ دو عالم ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک (وضو کرنے کے وقت پیروں کو دھونے کے لئے) موزے نہ اتارے جائیں، نہ پاخانہ کی وجہ سے نہ پیشاب کی وجہ سے نہ سونے کی وجہ سے البتہ جنابت کی وجہ سے (یعنی غسل واجب ہونے کی صورت میں نہانے کے لئے اتارے جائیں)۔ (ترمذی، نسائی)

مسئله محل المسح في الخف

﴿۵﴾ وَعَنِ الْمُخَيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ وَصَّاهُ النَّبِيُّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ فَمَسَحَ أَعْلَى الْخَفِّ وَأَسْفَلَهُ (رواه أبو داود والترمذی وابن ماجه وقال الترمذی لهذا حديثه معلول وسألت أبا زرعة ومحمداً بن يحيى البخاري عن هذا الحديث فقالا ليس بصحيح وكذا خلفه أبو داود)۔

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے غزوہ تبوک میں سرکارِ دو عالم ﷺ کو وضو کرایا تھا اور آپ نے موزوں کے نیچے اور اوپر مسح کر لیا تھا۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور امام ترمذی نے کہا) یہ حدیث معلول ہے نیز میں نے اس حدیث کے بارے میں ابوزرعہ رحمہ اللہ اور محمد بن یحییٰ بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو دونوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

توضیح: فمسح اعلی الخف واسفله: موزوں پر محل مسح کے بارے میں اختلاف ہے کل تین صورتیں ہیں دو میں اتفاق ہے ایک میں اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اسفل خف یعنی صرف نیچے کے حصہ کے مسح پر اگر کسی نے اکتفا کیا تو وضو نہیں ہوا لہذا نماز نہیں ہوئی اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص موزوں کے اوپر کے حصہ پر مسح کرتا ہے تو وضو ہو گیا نماز صحیح ہے اگرچہ اس نے موزے کے نچلے حصہ پر مسح نہیں کیا فریضہ ادا ہو گیا اختلاف اس قیصری صورت میں ہے کہ موزہ کے اوپر حصہ کے مسح کے ساتھ نچلے حصہ کے مسح کی حیثیت اور رتبہ کیا ہے یعنی دونوں کو جمع کرنے میں اختلاف ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ وشافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اعلیٰ اور اسفل دونوں پر مسح ہونا چاہیے امام مالک رحمہ اللہ تو اس کے واجب ہونے کے قائل ہیں لیکن امام شافعی رحمہ اللہ اعلیٰ خف پر مسح کو واجب اور اسفل پر مسح کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ امام

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہم موزہ کے صرف اعلیٰ پر مسح کرنے کو فرض کہتے ہیں اور اسل پر نہ فرض ہے نہ واجب ہے اور نہ سنت ہے۔ لہ

دلائل:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل زیر بحث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی تہوک والی روایت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل اسی حدیث کے ساتھ والی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے جس میں ظاہر الخف پر مسح کا ذکر ہے نیز ان حضرات کی مضبوط دلیل وہ روایت بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نقل فرمائی ہے اور جس میں مسئلہ کی علت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ حدیث اس باب کی آخری حدیث ہے کہ دین اگر عقل کے تحت ہوتا تو موزوں کے نچلے حصوں پر مسح کیا جاتا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔

جواب: احناف و حنابلہ نے ان حضرات کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ روایت مطول ہے اور بخاری اور ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے لہذا وہ قابل استدلال نہیں ہے۔ لہ

﴿۶۶﴾ وَعَنْهُ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ عَلَى ظَاهِرِهِمَا. (رواہ الترمذی وأبو داؤد)۔
ترجمہ: اور حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

مسئله المسح علی الجوربین

﴿۶۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم وَمَسَحَ عَلَى الْجُورَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ. (رواہ الترمذی وأبو داؤد وابن ماجہ)۔
ترجمہ: اور حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور نعلین کے ساتھ جوربین پر مسح کیا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

توضیح: مسح علی الجوربین: جوربین تشبیہ ہے اس کا واحد جورب ہے جس کا ترجمہ جراب ہے۔ جورب معرب ہے اصل میں یہ فارسی لفظ گورپ ہے اور اس کا اصل گورپا ہے جس کا معنی پاؤں کی قبر ہے۔ جراب بھی پاؤں کے لیے قبر ہے جوربین اسی طرح تشبیہ ہے جس طرح خفین تشبیہ ہے اس کا مفرد خف ہے اور خف موزہ کو کہتے ہیں ان دونوں کو تشبیہ اس لئے لایا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ تشبیہ ہی کے ساتھ خاص ہے ایک جراب یا ایک موزہ پر مسح نہیں ہو سکتا بہر حال خفین اور جرموقین کے علاوہ سردی سے بچنے کیلئے جراب بھی استعمال کئے جاتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان پر مسح کیا جاسکتا ہے یا نہیں تو اس کے سمجھنے کے لئے جوربین کی قسمیں سمجھنا ضروری ہے پھر فقہاء کا اختلاف سمجھ میں آجائے گا۔ احادیث میں خفین

لے المرقاۃ ۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۲۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۳۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۴۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۵۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۶۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۷۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۸۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۰/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۱/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۲/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۳/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۴/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۵/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۶/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۷/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۸/۲۲۱ لے المرقاۃ ۹۹/۲۲۱ لے المرقاۃ ۱۰۰/۲۲۱

اور جو زمین کے علاوہ جرموقین کا نام بھی آتا ہے یہ خضین کی حفاظت کے لئے خضین کے اوپر پہنا جاتا ہے اب جو زمین میں فقہاء کا اختلاف ملاحظہ کریں۔ لیکن جو زمین کی چند اقسام بھی ملاحظہ ہوں:

فقہاء کا اختلاف:

جو زمین کی چار قسمیں ہیں:

- ① جو زمین مچلے یا یہ وہ ہیں جن کے اوپر نیچے چڑاگا ہوا ہو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ جو زمین خضین کے حکم میں ہیں ان پر مسح جائز ہے۔
- ② جو زمین متعلین یہ وہ جو زمین ہیں جن کے صرف نیچے ٹکڑے پر یا صرف اوپر کے حصہ میں چڑا چڑھا ہوا ہو اس میں بھی اتفاق ہے کہ اس پر مسح جائز ہے۔
- ③ جو زمین رقیقین یعنی اس طرح جو زمین ہیں کہ اوپر نیچے قدم نظر آتا ہے جس میں مسلسل آدمی بغیر جوتے کے نہیں چل سکتا ہو پانی اوپر نیچے جاتا ہو تو اس میں بھی اتفاق ہے کہ اس جیسے جو زمین پر مسح جائز نہیں ہے۔
- ④ اور اگر جو زمین نہ متعل ہیں اور نہ رقیق ہیں بلکہ ٹھخین ہیں۔
- اس ٹھخین میں اختلاف ہے لیکن ٹھخینوں کے لئے چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:
- ① اتنے موٹے اور مضبوط ہوں کہ بغیر جوتے کے تین میل مسلسل چلنا اس کے ساتھ ممکن ہو۔
- ② کسی طرف سے کاشف قدمین نہ ہوں بلکہ سائر قدمین ہوں۔
- ③ اس طرح ٹھخین ہوں کہ پانی پر قدم رکھنے سے اس میں پانی جذب نہ ہوتا ہو۔
- ④ کسی رجز قسم وغیرہ کی مدد سے استساک نہ ہو بلکہ خود پنڈھی سے چپکے ہوں ایسے جو زمین جو ٹھخین ہوں اس پر جمہور اور صاحبین کے نزدیک مسح جائز ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک جو زمین مچلے یا متعلین نہ ہوں اس پر مسح جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کی آیت سے پاؤں کا دھونا معلوم ہوتا ہے لیکن احادیث مشہورہ سے خضین کا مسح بھی ماننا پڑا لہذا جب جو زمین متعلین یا مچلے ہوں گے تو یہ خضین کے حکم میں آجائیں گے تو ان مشہور احادیث کی وجہ سے قرآن کے حکم میں تخصیص ہو جائے گی لیکن اگر جو زمین اس قسم کے مچلے یا متعلین نہ ہوں تو یہ خضین کے حکم میں نہیں آئیں گے لہذا قرآن کی آیت الوضو پر جو زمین کی خبر واحد سے زیادتی جائز نہیں ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بہت سارے محدثین نے ضعیف اور ناقابل استدلال قرار دیا ہے پھر اس حدیث میں ابہام اور کئی احتمالات بھی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی قسم کے جو زمین پر مسح کیا تھا آیا رقیقین تھے یا مچلے تھے یا متعلین تھے یہ سب تفصیل پوشیدہ ہے بہر حال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ان دلائل سے قطع نظر آپ کا وجوہ جمہور کے مذہب کی طرف ثابت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے کہ ٹھخینوں جرائین پر مسح جائز ہے یہاں یہ افسوسناک خبر بھی سن لیں کہ اہل ظواہر حضرات جو اپنے آپ کو

اہل حدیث شمار کرتے ہیں وہ کسی شرط کے بغیر ہر قسم کے جرابوں پر مسح کرتے ہیں اور خوب مزے اڑاتے ہیں **فَالْمَسْحُ بِهِيَ** امت اس پر متفق ہے کہ جو زمین اگر رقیق ہیں تو اس پر مسح جائز نہیں ہے۔

میں اس مسئلہ کو ۲۶ رمضان ۱۴۰۲ھ میں مکہ مکرمہ میں لکھ رہا ہوں کچھ دن قبل میں نے دیکھا کہ یہاں حرم شریف میں ایک پولیس والے نے نہایت نرم جرابوں پر مسح کیا جس سے اس کے قدم آ رہے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہاں گئی احتیاط اور کہاں گئی عبادت کی محنت و محبت اور کہاں گئی دیانت داری اور نقاہت۔

وَالْمَعْلُوبُ: جوتوں پر مستقل طور پر مسح کسی کے ہاں جائز نہیں لہذا اتمام فقہاء اس روایت میں تاویل کرتے ہیں تو بعض نے کہا کہ اصل مسح جو زمین پر تھا مگر آنحضرت ﷺ ایسا جوتا پہنے ہوئے تھے کہ اس کے ساتھ جو زمین پر مسح ہو گیا تو کچھ مسح نظمین پر تبھا ہو گیا اسی کو **وَالْمَعْلُوبُ** کہہ دیا اس وقت واؤ جمعنی مع ہو جائے گا بعض نے اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے جیسا کہ سنن داری میں ہے۔

الفصل الثالث

﴿۸﴾ وَعَنِ الْمُهَاجِرَةِ قَالَتْ مَسَّحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ نَسِيتُ قَالَ بَلْ أَنْتِ نَسِيتِ بِهَذَا أَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ۔ (رواؤ ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت مہاجرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) میں نے عرض کیا کہ آپ بھول گئے ہیں (یعنی موزے اتار کر پیر نہیں دھوئے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا بلکہ تم بھول گئے (کہ میری طرف نسیان کی نسبت کر رہے ہو) کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے مجھے اسی طرح حکم دیا ہے۔ (احمد داؤد)

﴿۹﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ قَالَ لَوْ كَانَ النَّبِيُّ بِالرُّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلَ الْخَلْفِ أَوَّلَى بِالْمَسْحِ مِنْ أَعْلَاهُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَيْهِ۔ (رواؤ ابو داؤد و الترمذی و ابن ماجہ و غیرہ)

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ اگر دین (صرف) رائے اور عقل ہی پر موقوف ہوتا تو واقعی موزوں کے اوپر مسح کرنے سے نیچے مسح کرنا بہتر ہوتا اور یقیناً میں نے خود سرکارِ دو عالم ﷺ کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ابو داؤد و داری)

(الحمد للہ حمدًا کثیرًا کثیرًا کہ آج ۲۶ رمضان ۱۴۰۲ھ کو مکہ مکرمہ میں یہاں تک مشکوٰۃ شریف کی شرح مکمل ہو گئی۔)
(فضل محمد غفرلہ یوسف زئی نزیل بیت اللہ المحرام مکہ المکرمہ)



میری ران پر سر رکھے ہوئے تھے کہ کہیں آپ کو تکلیف نہ ہو جائے اسنے میں حضور اکرم ﷺ جاگ اٹھے اور اس وقت پانی بالکل نہیں تھا کہ اچانک اللہ تعالیٰ نے تیمم کا حکم نازل فرمایا اور لوگوں نے تیمم شروع کیا (اس سہولت کو دیکھ کر) حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ماہی ہا ول ہو کثکم یا آل ابی بکر“ اے ابو بکر کی اولاد یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے۔ ایک روایت میں حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے اس طرح الفاظ ہیں اے عائشہ! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے خدا کی قسم آپ پر جب بھی کبھی پریشان کن صورتحال آتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ آپ سمیت پوری امت کے لئے بھلائی رکھ دیتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں جس اونٹ پر سوار تھی وہ بیٹھا ہوا تھا جب ہم نے اس کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے ہارل گیا۔

الفصل الاول

تمام امتوں پر امت محمدیہ کی فضیلت

﴿۱﴾ وَعَنْ جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَضَّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِفَلَاحٍ جُعِلَتْ صُفُوفُنَا كَصُفُوفِ الْمَلَائِكَةِ وَجُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَجُعِلَتْ نُزُوبُنَا لَنَا ظُهُورًا إِذَا لَمْ نَحِدِ الْمَاءَ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت جدیدہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم لوگ (مکلی امتوں کے) لوگوں پر تین چیزوں سے فضیلت دیئے گئے ہیں ① ہماری صفیں (نماز میں یا جہاد میں) فرشتوں کی صفوں جیسی (شار) کی گئی ہیں ② ہمارے واسطے تمام زمین مسجد بنا دی گئی ہے (کہ جہاں چاہیں نماز پڑھ لیں) ③ جس وقت ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کر دینے والی ہے۔ (مسلم)

توضیح: فضلنا علی الناس بفلاح: یہ فضیلت اور یہ خصوصیت امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیۃ کی ہے یہاں تین خصوصیات کا ذکر ہے دوسری روایات میں اس سے زیادہ کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن اعداد و شمار میں تعارض نہیں ہوتا ہے کیونکہ عدد اقل عدد اکثری نفی نہیں کرتا ہے نیز فضائل میں زیادتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی رہتی ہے۔ تو پہلے تین کا ذکر آیا پھر زیادہ کا ذکر ہوا۔ ”الناس“ سے مراد سابقہ امتوں کے لوگ ہیں کیونکہ آنے والے لوگ قیامت تک اس امت کے دور اول کے حضرات صحابہ کرام کے تابع ہیں۔ لہذا ”الناس“ سے اس امت کے آنے والے لوگ مراد نہیں ہو سکتے ہیں۔ ۱

سید المرسلین ﷺ کی خصوصیات

یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات اور آپ کی امت کی خصوصیات بہت ساری ہیں لیکن یہاں

صرف تین کا ذکر ہے باب ثواب ہذہ الامۃ اور باب فضائل سید المرسلین میں ان تمام خصوصیات کا بیان ہے چند کا ذکر یہاں بھی کرنا مناسب ہوگا چنانچہ آپ نے فرمایا:

- ① مجھے ایک ماہ کی مسافت تک دور دشمن پر رعب پڑنے کی خصوصیت دی گئی ہے۔ ② غنائم کو میرے لئے حلال کیا گیا ہے۔
 - ③ مجھے شفاعت کبریٰ کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ④ مجھے پوری دنیا کے انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔
 - ⑤ مجھے جوامع الکلم دیئے گئے۔ ⑥ میرے ذریعہ سے نبوت کی برکات کی تکمیل ہو گئی ہے۔
 - ⑦ میں خاتم النبیین ہوں۔ ⑧ مجھے پوری زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ ⑨ میرا نام احمد رکھا گیا۔
 - ⑩ اور میری امت کو سب سے افضل امت قرار دیا گیا ہے۔ ⑪ میرے اگلے پچھلے کناہوں (لغزشوں) کو معاف کر دیا گیا۔
 - ⑫ عرش عظیم کے نیچے خاص خزانہ ہے مجھے سورت بقرہ کی آخری آیتیں دی گئیں۔ ⑬ مجھے حوض کوثر دیا گیا۔
 - ⑭ قیامت کے دن مجھے ایسا جھنڈا ملے گا جس کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ سب لوگ ہوں گے۔
- ابوسعید نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”شرف المصطفیٰ“ میں آنحضرت ﷺ کی ساٹھ خصوصیات کا ذکر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ:

فان فضل رسول الله ليس له حد فيعرب عنه ناطق بفهم

صافاً: اس سے میدان معرکہ اور میدان جہاد کی صفیں مراد ہیں بعض نے نماز کی صفوں کا بھی کہا ہے۔
الارض کلھا مسجدنا: یعنی پوری زمین اس قائل بنادی گئی ہے کہ اس پر ہم نماز پڑھ سکتے ہیں جب جگہ پاک ہو خواہ وہ خاص مسجد ہو یا مسجد کے علاوہ مکان بنی اسرائیل پر اتنی تنگی تھی کہ وہ مسجد سے باہر کسی جگہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے اور مسجد میں بھی جماعت کے بغیر پڑھنا جائز نہیں تھا ہال غنیمت کو کھانے کے بجائے جلاتے تھے اور کپڑے سے نجاست کی جگہ کو کانتے تھے رات کا پوشیدہ گناہ گھر کے دروازہ پر لکھا جاتا تھا کہ اس شخص نے یہ گناہ کیا ہے گوشت میں چربی نہیں کھا سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

وجعلت تربعا لدا طھوڑا: یعنی زمین کی مٹی کو پانی کے قائم مقام بنادیا جس طرح پانی سے طہارت حاصل ہو سکتی ہے تیمم کی صورت میں مٹی سے بھی طہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس حدیث اور اس جیسی آنے والی دیگر احادیث میں تیمم کے فضائل اور چند اخلاقی مسائل سامنے آگئے ہیں۔ تیمم کے مسائل میں چار ایسے بڑے مقامات ہیں جہاں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

مسائل تیمم میں فقہاء کا اختلاف:

● پہلا اختلاف: اس میں ہے کہ کن چیزوں پر تیمم جائز ہے اور کن پر جائز نہیں ہے۔

تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور قول کے مطابق تیمم صرف تراب منبت یعنی زر خیز مٹی پر جائز ہے دیگر کسی چیز پر نہیں ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تراب نبت کے ساتھ ساتھ زیت پر بھی تیمم کرنا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ہر وہ چیز جو جنس الارض سے ہو اس پر تیمم جائز ہے پھر امام مالک رحمہ اللہ نے جنس الارض کے متعلق فرمایا کہ ہر وہ چیز جو زمین سے ملحق ہو وہ بھی جنس الارض میں شامل ہے چنانچہ ان کے ہاں اس لکڑی پر بھی تیمم جائز ہے جس کا ایک حصہ زمین سے بہت ہو۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جنس الارض میں یہ قید لگائی ہے کہ جو چیز جلانے سے نہ جلتی ہو، پگھلانے سے نہیں پگھلتی ہو، حل کرنے سے حل نہ ہوتی ہو اور گھسنے سے گھٹی نہ ہو اس پر تیمم جائز ہے لہذا ان کے ہاں لکڑی، سونا، چاندی، پتھر، لہو، تانبا، نمک وغیرہ اشیاء پر تیمم جائز نہیں ہے ہاں اگر ان چیزوں پر گرد و غبار پڑ جائے تو پھر جائز ہے اور وہ تراب نبت کے حکم میں ہے۔
دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ و احمد رحمہ اللہ و ابو یوسف رحمہ اللہ کی دلیل "فَتَيَسَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا اَي تَرَابًا مَسِيًّا" جس میں صرف زرخیز مٹی کا ذکر ہے ہاں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایک حدیث کی وجہ سے ریت پر بھی تیمم کو جائز قرار دیا ہے حدیث اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا:

فَقَالُوا اَنَا نَكُونُ بِالرَّمَالِ الْاَشْهُرِ الثَّلَاثَةِ وَالْاَرْبَعَةِ وَيَكُونُ فَيْدًا مَجْنِبًا وَالْحَائِضُ وَالنَّفْسَاءُ وَلَا نَجِدُ الْمَاءَ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ بِالْاَرْضِ۔ (احمد بیہقی، طبرانی)

اختلاف اور مالکیہ کی دلیل بھی قرآن کی یہی آیت "فَتَيَسَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا" ہے لیکن ان کے ہاں صعيد عام ہے اس سے وجہ الارض مراد ہے تراب نبت سے خاص نہیں کیونکہ دوسری آیت میں "صَعِيدًا جَرًّا" اور صعيداً رَلَقًا کے الفاظ آئے ہیں جو وجہ الارض کے لئے عام ہے تراب نبت سے خاص نہیں ہے۔

دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ تیمم کے جواز کی اصل علت یسر، سہولت اور آسانی فراہم کرنا ہے اور تراب نبت کی قید سے تو پھر عسر میں تبدیل ہو جائے گا خصوصاً عربستان کے ریگستان میں تراب نبت کا ملنا پانی ملنے سے زیادہ دشوار ہے۔

تیسری دلیل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے تیمم کے حکم کے آنے کے بعد بھی نہ حضر میں اور نہ سفر میں تراب نبت کی تلاش کی ہے اور نہ اس کا حکم دیا ہے اور نہ اس کو ضروری سمجھا ہے۔ جمہور کا مسلک قوی تر اور صحیح تر ہے ہاں احتیاط اس میں ہے کہ مٹی کو تلاش کر کے اس پر تیمم کیا جائے۔ بعض حضرات مٹی کی موجودگی میں خالص نرم ملائم پتھر پر تیمم کرتے ہیں اگر مٹی پر کیا جائے تو اختلاف سے بھی نکل جائیں گے اور احتیاط پر بھی عمل ہوگا۔

② دوسرا اختلاف: اس میں ہے کہ تیمم طہارت مطلقہ اصل ہے یا طہارت ضروریہ ہے یعنی ایک تیمم سے کئی نمازیں ادا

ہوسکتی ہیں یا صرف ایک نماز ایک تیمم سے ادا کی جائے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تیمم طہارت ضروریہ ہے "والضرورة تعتقد بالقد الضرورة" لہذا ایک تیمم سے ایک فرض مع لواحقہ جائز باقی جائز نہیں۔ ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ تیمم وضو کا قائم مقام اور خلیفہ ہے وضو اصل اور تیمم اس کا فرع ہے تو جو کام اصل کا ہوگا وہی اس کے قائم مقام اور خلیفہ کا ہوگا ایک وضو سے جب کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں تو ایک تیمم سے کئی نمازیں بھی پڑھ سکتے ہیں یہ احناف کی پہلی عقلی دلیل ہے جو نص شرعی سے مستنبط ہے۔ احناف کی دوسری دلیل یہ کہ تیمم والے آدمی کے پیچھے وضو والے آدمی کی نماز اور امامت شوافع کے نزدیک بھی جائز ہے اس سے یہی بات واضح ہو جاتی ہے اور ضابطہ کے مطابق یہ ماننا پڑے گا کہ تیمم کی طہارت وضو کی طرح طہارت مطلقہ اصل یہ ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر تیمم عبادت غیر مقصودہ کے لئے ہو تو اس سے عبادت مقصودہ ادا نہیں ہوسکتی ہے۔

یہاں بطور لطیفہ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ غیر مقصودہ عبادت کے لئے پانی کی موجودگی میں بھی تیمم جائز ہے ثواب ملے گا مثلاً ایک آدمی مسجد میں جا کر صرف بیٹھنا چاہتا ہے تو اگرچہ حوض میں پانی موجود ہے پھر بھی یہ شخص حصول برکت و طہارت کے لئے تیمم کر سکتا ہے یا رات کو سوتے وقت وضو کے بجائے تیمم کرتا ہے تو جائز ہے یا دینی اور فقہ کی کتابوں کو چھونے کے لئے تیمم کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے اور گناہ سے بچ سکتا ہے خواہ صغیرہ کیوں نہ ہو اور مقام تقویٰ کو حاصل کر سکتا ہے۔

⑤ تیسرا اختلاف: تیمم کی کیفیت میں ہے کہ آیا فعل تیمم میں ضربتین ہیں یا ضربۃ واحدة ہے یا کیا ہے۔

تو امام احمد بن حنبل، رحمہ اللہ داؤد ظاہری، اسحاق بن راہویہ اور اکثر محدثین کے ہاں تیمم میں ضربۃ واحدة کافی ہے یعنی ایک بار ہاتھوں کو مٹی پر مار ڈالا اور چہرہ اور بازوؤں پر مسح کر دیا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہم اللہ یعنی جمہور کے ہاں تیمم میں ضربتین ضروری ہیں: ضربۃ للوجه وضربۃ للیدین الی المرفقین۔ ۱۔

دلائل:

احناف، مالکیہ اور شوافع یعنی جمہور کی ایک دلیل تو مسند بزار کی روایت ہے جس میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "قال كنت في القوم حين نزلت الرخصة في المسح بالتراب اذا لم تجد الماء فامروا فضررنا بواحدة للوجه ثم ضربة اخرى لليدين الى المرفقين"۔ (مسند بزار) ۲۔

اس روایت میں تیمم کے لئے دو ضربیں واضح طور پر مذکور ہیں۔ جمہور کی دوسری دلیل بھی بزار کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

ان النبي ﷺ قال التيمم ضربتان ضربۃ للوجه وضربۃ لليدين الى المرفقين۔ (نصب الراية)

جمہور کی تیسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کی تخریج حاکم نے کی ہے دارقطنی نے بھی اس کو نقل کیا ہے اس مرفوع حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”قال التيمم ضربتان ضربة للوجه وضربة للذراعين الى المرفقين.“ (نصب الواہ)

جمہور کی چوتھی دلیل مشکوٰۃ شریف باب التیمم کی فصل ثالث میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں دو ضربوں کی تصریح موجود ہے ”ثم عادوا فصر بوا با كفهم“۔

جمہور کی پانچویں دلیل مشکوٰۃ ص ۵۰ پر حضرت نافع کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”ضرب رسول الله ﷺ بیدیه علی الحائط ومسح بها وجهه ثم ضرب ضربة فمسح ذراعیه۔
حنابلہ اور محدثین و اہل ظواہر کی دلیل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں ایک ضرب کا ذکر ہے اور پھر چہرہ اور کفین کے مسح کا ذکر ہے اسی طرح حضرت ابو جہیم رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی ایک ضرب کا ذکر ہے۔ ان حضرات نے جمہور کی روایات پر اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ جس کا جواب آنے والا ہے۔ لے

جواب: جمہور کہتے ہیں کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سے صراحت کے ساتھ ایک ضرب کا پتہ نہیں چلتا ہے یہاں صرف اتنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چہرہ اور ہاتھوں پر مسح ایک ساتھ کیا اب دو ضربوں سے کیا یا ایک ضرب سے کیا یہ حدیث میں نہیں ہے نیز یہ تعلیم کے دوران آنحضرت ﷺ نے بطور نمونہ بتا دیا کہ غسل کے لئے مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وضو کے تیمم کی طرح ضرب مار کر اس طرح چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کافی تھا تو یہاں مکمل تیمم کر کے دکھانا نہیں تھا بلکہ یہ بتانا تھا کہ جنابت کے لئے بھی وضو کے تیمم کی طرح تیمم کافی تھا صرف یہی بتانا مقصود تھا۔ باقی اگر جمہور کے دلائل کچھ کمزور ہیں تو پرواہ نہیں کثرت روایات کی وجہ سے اس میں بڑا زور ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ایک ضرب کی حدیث پر عمل کرنے سے دو ضربوں والی حدیث پر عمل نہیں ہو سکتا ہے اور اگر دو ضربوں والی حدیث پر عمل کیا جائے تو ایک ضرب والی حدیث پر خود بخود عمل ہو جائے گا۔ تو احتیاط اسی میں ہے

تیسری بات یہ بھی ہے کہ نمکس مٹی استعمال ہوتی ہے جو اصل کے اعتبار سے مطہر نہیں بلکہ ملوث ہے اور پانی اصل کے اعتبار سے مطہر ہے جب ایک پانی کو استعمال کے بعد دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے تو ایک مٹی کے اثر اور استعمال شدہ اجزاء کو آپ دوسرے عضو پر دوبارہ کیسے استعمال کر سکتے ہیں بہر حال جمہور کے مسلک میں بہت ہی احتیاط ہے۔ لے

● چوتھا اختلاف: محل تیمم میں ہے کیونکہ ”ید“ کا لفظ لغت میں کندھوں تک بولا جاتا ہے اور الی المرافق کی قید قرآن میں وضو کے لئے تو ہے تیمم کے لئے نہیں ہے اس لئے اس میں فقہاء کی رائیں مختلف ہوئی ہیں امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ

اور اسحاق بن راہویہ کا مسلک یہ ہے کہ تیمم صرف مسغین یعنی کلائی تک ہے پورے ہاتھ یعنی کہنی تک نہیں ہے۔ لے
 راجح اقوال کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ یعنی جمہور کے نزدیک پورے ہاتھوں
 کا کہنیوں تک مسح ضروری ہے، البتہ امام مالک رحمہ اللہ مسغین یعنی کلائی تک فرض کہتے ہیں اور کہنیوں تک سنت کہتے ہیں۔ ابن
 شہاب زہری منا کب اور کندھوں تک مسح کے قائل ہیں۔ بہر حال تین یا چار ضربات کا اور اسی طرح کندھوں تک مسح کرنے
 کا ائمہ اربعہ میں سے کوئی قائل نہیں ہے لہذا اس قسم کی روایات اس ابتدائی دور پر محمول ہیں جب تیمم کا نیا نیا حکم آیا تھا اور
 "تیسرے" پر ہر صحابی نے اپنے اپنے انداز سے عمل کیا تھا یہ کوئی ضابطہ نہیں تھا بعد میں ضابطہ ہی بن گیا کہ دو ضربیں ہیں اور
 کہنیوں تک مسح ہے اس پر جمہور امت کا عمل ہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اضطراب بھی ہے امام احمد بن
 حنبل رحمہ اللہ نے کلائی تک مسح کرنے کو قطعید پر قیاس کیا ہے کہ وہاں بھی مطلقید کا ذکر ہے مگر امت نے کلائی تک مراد لیا
 ہے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ قطعید زاجرات میں سے ہے اور تیمم عبادات میں سے
 ہے زاجرات میں شریعت کم سے کم سزا پر عمل کا حکم دیتی ہے لیکن عبادات میں تو زیادہ سے زیادہ کا حکم ہوتا ہے لہذا یہ قیاس مع
 الفارق ہے۔

غسل جنابت کے لئے تیمم

﴿۲﴾ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْكَافِ قَالَ سَفَرْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَصَلَّى بِالنَّاسِ فَلَمَّا انْقَضَ مِنْ صَلَاتِهِ إِذَا هُوَ
 بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ قَالَ أَصَابَتْهُ
 جَنَابَةٌ وَلَا مَاءَ قَالَ عَلَيْكَ بِالصُّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ. (مشفق غلبہ)

ترجمہ: اور حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے آپ نے (ہم)
 لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی علیحدہ بیٹھا ہوا ہے اس نے لوگوں
 کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اسے فلاں! تمہیں لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے
 روک دیا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہو گئی ہے اور پانی نہیں ملا آپ ﷺ نے فرمایا (ایسی صورت میں) تمہیں
 مٹی سے (تیمم کر لینا) لازم تھا اور تمہیں وہی کافی تھا۔ (بخاری و مسلم)

﴿۳﴾ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْكَافِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْكَافِ فَقَالَ إِنِّي أَجْتَنَّبُ فَلَمْ أُصِبِ الْمَاءَ فَقَالَ
 عُمَرُ لِعُمَرَ أَمَا تَذَكَّرُ أَكَا كُنَّا فِي سَفَرٍ أَكَا وَأَنْتَ فَأَمَّا أَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ وَأَمَّا أَكَا فَتَتَعَذَّلُ فَصَلِّتُ

فَدَّ كَرِهْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هَكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفِّهِ الْأَرْضَ وَنَفَعَ فِيهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفِّهِ.

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ) وَيُرْوَى عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «أَنْ تَضْرِبَ بِهَذِهِكَ الْأَرْضَ ثُمَّ تُنْفِثَ ثُمَّ تَمْسَحَ بِهَا وَجْهَكَ وَتَكُنَّ نِكَاحًا».

پیشکش ہے: اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہے اور پانی نہیں ملا (تو اب میں تیم کروں یا کیا کروں؟) حضرت عمار رضی اللہ عنہ (یہ سن کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بولے کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں اور تم سفر میں تھے (اور ہم دونوں کو نہانے کی ضرورت ہو گئی تھی) تو تم نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن میں نے زمین پر لوٹ پوٹ کر نماز پڑھ لی تھی پھر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت حال کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس طرح کر لینا کافی تھا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے پھر ان پر پھونک مار کر (یعنی مٹی جھاڑ کر) ان سے اپنے منہ پر اور ہاتھوں پر مسح کر لیا۔ (بخاری)

توضیح: اصل ہدفی جذابة ولاماء: مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تیمم جس طرح حدیث اصغر میں وضو کا قائم مقام ہے حدیث اکبر یعنی جنابت میں بھی غسل کا قائم مقام ہے خواہ غسل جنابت ہو یا حیض و نفاس کا غسل ہو جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کا یہی مسلک ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم غسل جنابت کے لئے جائز ہے پھر جب پانی پر آدمی قادر ہو جائے تو غسل کرے اور دونوں حدیثیں جمہور کی دلیل ہیں نیز اس باب کی پہلی حدیث میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ مٹی ہر نجاست کے لئے طہور ہے لہذا حدیث اکبر و اصغر دونوں کے لئے مٹی ظاہر اور مطہر ہے طبقہ صحابہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا مسلک یہ تھا کہ تیمم غسل جنابت کے لئے جائز نہیں ہے لیکن اتنی صریح احادیث کی موجودگی میں ان کا قول چھوڑا جائے گا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان کا رجوع نقل کیا جاتا ہے جب رجوع کر لیا تو سب صحابہ اور جمہور کا مسلک ایک ہو گیا بعض محققین نے کہا ہے کہ ان حضرات کا مسلک پہلے سے جمہور کے ساتھ ہے لیکن انہوں نے یہ قول سداً للددائع کے تحت اختیار کیا ہے تاکہ لوگ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں کہ ذرا ساعذر آگیا یا معمولی سی سردی آگئی اور اس جنابت والے نے غسل کے بجائے تیمم کا آغاز کر دیا لوگوں کی اسی سستی کی وجہ سے ان حضرات نے تیمم سے لوگوں کو منع کر دیا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بحث کے دوران حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اصل حقیقت کو اس طرح اجاگر کر دیا فرمایا:

اور حدیث کا پس منظر اس طرح ہے کہ سائل کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تیمم سے روک دیا تو حضرت

عمار رضی اللہ عنہ نے پورا واقعہ سنایا کہ میرا اور آپ کا تنازعہ ہوا تھا مگر آنحضرت ﷺ نے تیمم کو جائز قرار دیا تھا لہذا اس سائل کے لئے بھی تیمم کا حکم ہونا چاہیے۔

سلام کے جواب کے لئے تیمم

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي الْجَهْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّتَّةِ قَالَ مَرَرْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ يَقُولُ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَزِدْ عَلَيَّ حَتَّى قَامَ إِلَى جِدَارٍ فَحَنَّهُ بِعَصَا كَانَتْ مَعَهُ ثُمَّ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَخِزَانَتَهُ ثُمَّ رَدَّ عَلَيَّ

(وَلَمْ أَجِدْ هَذِهِ الزَّوَانَةَ فِي الصَّوْنِ عَنِّي وَلَا فِي كِتَابِ الْمُتَنَبِّئِينَ وَلَكِنْ ذَكَرْتُ فِي تَرْجِمَتِي الشُّعْبَةَ وَقَالَ هَذَا عَدِيْفٌ حَسَنٌ) ۱۔

ترجمہ: اور حضرت ابو جہم ابن حارث ابن صمد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ میں) نبی کریم ﷺ کے قریب سے گزرا آپ اس وقت پیشاب کر رہے تھے میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نے جواب نہیں دیا (اور پیشاب سے فارغ ہو کر) ایک دیوار کے پاس کھڑے ہوئے اور ایک لاشی سے جو آپ کے پاس تھی دیوار کھرج کر اپنے دونوں ہاتھ اس پر مارے پھر اپنے منہ اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر مسح کر کے میرے سلام کا جواب دیا۔ (مشکوٰۃ کے مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت نہ صحیحین میں ملی ہے اور نہ حمیدی کی کتاب میں ہاں ہی السنہ نے شرح السنہ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے) (لہذا صاحب مصابیح کو چاہیے تھا کہ اس روایت کو پہلی فصل میں ذکر نہ کرتے)۔

توضیح: فسلمت علیہ: اس سے پہلے دو دفعہ یہ مسئلہ لکھا گیا ہے کہ عبادت غیر مقصودہ کے لئے جو تیمم کر لیا جائے اس سے عبادت مقصودہ ادا نہیں ہو سکتی ہے مقصودہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت خود اصل اور مقصود ہو کسی اور عبادت کے لئے ذریعہ نہ ہو جیسے نماز ہے تلاوت وغیرہ ہے۔ اور غیر مقصودہ وہ عبادت ہے جو غیر کے لئے ذریعہ اور وسیلہ ہو یا یوں سمجھ لو کہ عبادت مقصودہ وہ ہے جو خود مقصود اور اصل ہو اور عبادت غیر مقصودہ وہ ہوتی ہے جو خود اصل نہ ہو بلکہ کسی عبادت مقصودہ کے ضمن میں ہو جیسے تیمم ہے اور وضو اور غسل ہے اسی طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ تیمم ایسی عبادت کے لئے بھی ہو سکتی ہے جس کے مکمل فوت ہونے کا خطرہ ہو اور اس کا کوئی خلیفہ و نائب نہ ہو جیسے عیدین اور جنازہ کی نماز ہے یا سلام کا جواب ہے یہاں سلام کے جواب کے لئے آنحضرت ﷺ نے تیمم اس لئے کیا کہ جواب فوت ہونے کا خطرہ تھا۔ ۲۔

الفصل الثانی

پانی نہ ملے تو تیمم کرتے رہو

﴿۸﴾ وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الصَّغْبَةَ الْقَلْبِيَّةَ وَضُوءَ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَمْ يَجِدْ

الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُسِّسْهُ بَهَرٍ تَهَ فَإِنْ ذَلِكَ خَيْرٌ

(رواہ احمد والترمذی وأبو داؤد وروی النسائی لَعْنُوا قَوْلَ عَشْرَ سِنِينَ)۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”پاک مٹی مسلمان کو پاک کرنے والی ہے، اگرچہ وہ دس برس تک پانی نہ پائے اور جس وقت پانی مل جائے تو بدن دھو لیتا چاہے کیونکہ یہ بہتر ہے۔“ (احمد، ترمذی، ابو داؤد) اور نسائی نے بھی اسی طرح کی روایت عشرین تک نقل کی ہے۔

بغیر علم مسئلہ نہ بتاؤ

﴿۶﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا فِي سَفَرٍ فَأَصَابَ رَجُلًا مَنَا حَجَرٌ فَشَجَّهَ فِي رَأْسِهِ فَأَخْتَلَمَ فَسَأَلَ أَصْحَابَهُ هَلْ يَمُوتُونَ فِي رُخْصَةٍ فِي التَّيْمِيمِ قَالُوا مَا يَمُوتُ لَكَ رُخْصَةٌ وَأَنْتَ تَقْدِرُ عَلَى الْمَاءِ فَأَغْتَسَلَ فَمَاتَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أَخْبَرَهُ بِذَلِكَ قَالَ قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ الْأَسْأَلُ إِذَا لَمْ يَعْلَمُوا فَإِنَّمَا شَفَاءُ النَّبِيِّ الشُّوَالُ إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَتَيَمَّمَ وَيُعْصِبَ عَلَى جُزْءٍ خِزْفَةٍ ثُمَّ يَمْسَحَ عَظْمَهَا وَيُغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِهِ (رواہ ابو داؤد وروی النسائی ما جاء عن عطاء بن أبي نزاع عن ابن عباس)۔

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”ہم سفر میں جا رہے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص کے پتھر کا جس نے اس کے سر کو زخمی کر ڈالا (اتفاق سے) اسے نہانے کی حاجت بھی ہو گئی چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک (اس صورت میں) میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا ”ایسی صورت میں جبکہ تم پانی استعمال کر سکتے ہو ہم تمہارے لئے تیمم کی کوئی وجہ نہیں پاتے“ چنانچہ اس شخص نے غسل کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس کا اشغال ہو گیا۔ جب ہم (سفر سے واپس ہو کر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ سے یہ واقعہ بیان کیا آپ نے (انتہائی رنج اور تکلیف کے ساتھ) فرمایا ”لوگوں نے اسے مار دیا، خدا انہیں مارے (پھر فرمایا کہ) ان کو جو بات معلوم نہ تھی اسے انہوں نے جاننے والے سے دریافت کیوں نہ کر لیا؟ (کیونکہ) نادانی کی بیماری کا علاج سوال ہے اور اسے تو یہی کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور رُخ پر ایک ہٹی باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور پھر اپنا تمام بدن دھو لیتا“ (ابو داؤد) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو عطاء بن رباح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

توضیح: قتلہ قتلہم اللہ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اس مریض کو جو مسئلہ بتایا اس میں ان کو غلطی ہوئی اور یہی مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا وہاں بھی ان سے غلطی ہوئی کہ

فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا تمہارے لئے وہ نماز کافی ہے اور جس شخص نے وضو کر کے نماز لوٹائی تھی آپ نے اس سے فرمایا ”تمہارے لئے دو گنا اجر ہے“ (ابوداؤد و دارمی)

توضیح: مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے تیمم سے نماز پڑھ لی بعد میں پانی مل گیا تو نماز ہو گئی اور اگر تیمم کے بعد اور نماز سے پہلے پانی مل گیا تو وضو بنا لے دونوں مسئلوں میں اتفاق ہے اور اگر تیمم کر لیا اور نماز شروع کی پھر درمیان میں پانی نظر آ گیا تو اس تیسری صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے احناف اور حنابلہ کے نزدیک نماز باطل ہو گئی یہ آدمی وضو کرے اور نماز پڑھے امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ آدمی تیمم ہی کے ساتھ نماز کو پورا کر لے احناف اور حنابلہ نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جس میں ”ان لحد یجد الماء“ کے الفاظ بطور شرط مذکور ہیں اور ”فاذا وجد الماء فلیمس بشمۃ“ کے الفاظ ہیں تو جب بھی پانی ملا تیمم ختم ہو جائے گا تو دور ان نماز پانی دیکھنے سے نماز بھی ختم ہو جائے گی۔

الفصل الثالث

﴿۸﴾ وَعَنْ أَبِي الْجَهْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصَّيِّفَةِ قَالَ أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ تَحْوِيلٍ بِجِلٍّ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَزِدْ النَّبِيُّ ﷺ شَيْئًا أَقْبَلَ عَلَى الْحِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو جہم ابن حارث ابن صرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ”نبی کریم ﷺ (مدینہ میں) جمل کنویں کی طرف سے تشریف لائے آپ سے ایک شخص (یعنی خود ابی جہم) ملے اور سلام کیا سر کا ردو عالم ﷺ نے ان کو سلام کا جواب نہیں دیا اور ایک دیوار کے پاس تشریف لائے چنانچہ (پہلے) آپ نے منہ اور ہاتھوں کا مسح کیا (یعنی تیمم کیا) پھر سلام کا جواب دیا۔ (بخاری و مسلم)

تیمم کے لئے دو ضربتیں کا ثبوت

﴿۹﴾ وَعَنْ عُمَارِ بْنِ بَابِرٍ أَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ أَقْبَلَهُمْ فَسَبَّحُوا وَهُمْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِالصُّعَيْدِ بِصَلَاةِ الْفَجْرِ فَطَرَبُوا بِأَكْفِهِمُ الصُّعَيْدَ ثُمَّ مَسَحُوا بِوُجُوهِهِمْ مَسْحَةً وَاحِدَةً ثُمَّ غَاثُوا فَطَرَبُوا بِأَكْفِهِمُ الصُّعَيْدَ مَرَّةً أُخْرَى فَسَبَّحُوا بِأَيْدِيهِمْ كُلُّهَا إِلَى الْمَتَاكِيبِ وَالْأَكْبَاطِ مِنْ بَطْنِ أَيْدِيهِمْ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)

ترجمہ: اور حضرت عمار بن بابر بن یاسر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دفعہ) چند صحابہ نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے (اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے) فجر کی نماز کے لئے انہوں نے پاک مٹی سے (اس طرح) تیمم کیا (کہ پہلے) اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہرہ پر

پھیرا پھر دوسری مرتبہ اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے پورے ہاتھوں پر یعنی مونڈھوں اور بغلوں کے اندر تک مسح کیا ہاتھوں کے اندر کی طرف سے۔ (ابوداؤد)

توضیح: ثم عاھوا۔ فصر ہوا: یہ حدیث انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ بات بتا رہی ہے کہ تیمم کے لئے دو ضربیں ہیں۔ ۱۔

المناکب: مونڈھوں تک تیمم میں مسح کرنا اور بغلوں تک تیمم کرنا یہ صحابہ کرام کا ظاہری آیت سے ایک اجتہادی استنباطی حکم تھا یعنی ”ید“ کے لفظ سے انہوں نے پورا ہاتھ کندھوں تک سمجھ لیا کیونکہ لغت میں ”ید“ کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے لیکن چونکہ شارع علیہ السلام کے فعل سے کہنیوں تک کا حکم ملتا ہے اس لئے اسی پر عمل کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لغت کے زور سے اور عربی دانی کی قوت سے شریعت کو کامل طور پر سمجھنا انتہائی مشکل ہے آج کل کچھ عربی جاننے والے پروفیسر حضرات کو اسی مشکل نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے جب وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا ہے تو اس کے قائم مقام تیمم میں بھی اسی طرح ہونا چاہیے۔ تیمم کے جواز کے لئے چار شرائط ہیں: ۱۔

- ۱ پانی کے استعمال سے حقیقتہً یا حکماً عاجز ہونا
- ۲ جس چیز سے تیمم کیا جائے اس کا پاک ہونا
- ۳ اعضاء تیمم کے تمام حصوں پر اس طرح ہاتھ پھیرنا کہ کوئی جگہ مسح کے بغیر نہ رہ جائے
- ۴ عبادت مقصودہ کی نیت سے تیمم کرنا۔



باب الغسل المسنون

مسنون غسل کا بیان

صاحب مشکوٰۃ اس سے پہلے باب الغسل کے عنوان سے ایک باب قائم کر چکے ہیں لیکن اس کے بعد غسل مسنون کے عنوان سے یہاں انہوں نے ایک اور باب قائم کر دیا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ پہلے اس غسل کے احکام تھے جو فرض اور واجب کی قسم سے تھا اور یہاں اس غسل کا بیان ہے جو سنت یا مستحب کی قسم میں سے ہے چنانچہ اس باب میں صاحب مشکوٰۃ نے چار قسم کے غسلوں کا بیان کیا ہے پہلا جمعہ کے دن کا غسل دوسرا مردے کو غسل دینے کے بعد خود غسل کرنا تیسرا سنگی اور حجامہ کرانے کے بعد غسل کرنا اور چوتھا اسلام قبول کرتے وقت غسل کرنا۔

اس کے علاوہ عیدین کے لئے غسل کرنا فقہاء نے مسنون لکھا ہے مگر اس کے لئے جو دو یا زیادہ احادیث آئی ہیں وہ ضعیف ہیں شاید اس وجہ سے مؤلف نے اس کا ذکر نہیں کیا تاہم صحابہ کے دور سے امت میں عیدین کے لئے غسل کرنے کا معمول چلا آیا ہے اسی طرح یوم عرفہ کے لئے اور بوقت احرام غسل کرنے کو فقہاء نے مستحب لکھا ہے اسلام کا عام حکم تمام مسلمانوں کو یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں کم از کم ایک بار غسل کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پاکیزگی کا یہ بڑا تحفہ دیا ہے جس سے غیر مسلم محروم ہیں۔

الغسل: غین کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے جسم کو سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء کے دھونے کا نام غسل ہے۔ اور غین کے فتح کے ساتھ کسی بھی چیز کے دھونے کو غسل کہتے ہیں اور غین اور سین دونوں کے ضمہ کے ساتھ غسل ہو تو یہ غسل کے پانی پر بولا جاتا ہے اور غین کا کسرہ اور سین کا سکون ہو تو غسل کے پانی کے اندر صابن یا سرف یا اشان وغیرہ ملی ہوئی اشیاء کو کہتے ہیں۔

الفصل الاول

غسل یوم الجمعة

﴿۱﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ الْجُمُعَةُ فَلْيَغْتَسِلْ. (مشفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی جمعہ کی نماز پڑھنے آئے تو

اسے چاہیے کہ غسل کر لے۔ (بخاری و مسلم)

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ.

(مشفق علیہ)۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر بالغ پر جمعہ کے روز نہانا واجب ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: اذا جاء احدكم الجمعة فليغتسل: جمع کے لئے غسل کرنے کے بارے میں "فليغتسل" کا لفظ بھی آیا ہے جو امر کا صیغہ ہے "حق" کا کلمہ بھی آیا ہے اور "واجب" کا لفظ بھی موجود ہے اسی طرح تاکید کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں جس کی وجہ سے فقہاء کا اختلاف ہو گیا کہ آیا یہ غسل واجب ہے یا مسنون ہے یا مستحب ہے۔

غسل جمعہ میں فقہاء کا اختلاف:

اہل ظواہر کے ہاں غسل جمعہ فرض اور واجب ہے۔ جمہور فقہاء کے ہاں جمعہ کا غسل سنت ہے جمہور صحابہ کرام بھی سنت ہونے کے قائل تھے تاہم حضرت ابو ہریرہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما جمعہ کے غسل کے وجوب کے قائل تھے اور یہ مسلک حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔

دلائل:

اہل ظواہر اور غسل جمعہ کے وجوب کے قائلین کے دلائل زیر بحث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیثیں ہیں جس کے ظاہر سے وجوب کا پتہ چلتا ہے بلکہ وجوب کے واضح الفاظ ہیں اور یہ تینوں حدیثیں باب الغسل المسنون کی فصل اول میں ہیں۔

جمہور فقہاء نے مشکوٰۃ ص ۵۵ پر حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو فصل ثانی کی پہلی حدیث ہے جس میں "فَالْغُسْلُ الْفَضْلُ" کے الفاظ ہیں اور اسی صفحہ پر حضرت مکرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے ان حضرات کی تیسری دلیل حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مکالمہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اتنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیر سے آنے پر تنبیہ کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اے امیر المؤمنین! میں وضو بنا رہا تھا کہ دیر ہو گئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "الوضوء ایضاً"۔ (لمعات) یعنی دیر سے بھی آئے اور غسل بھی نہیں کیا صرف وضو بنا کر آئے؟ پس اتنا مکالمہ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے اور جمعہ پڑھ لیا جمہور فرماتے ہیں کہ اگر غسل واجب یا فرض ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور غسل کے لئے بھیج دیتے معلوم ہوا واجب نہیں جمہور نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفصیلی گفتگو سے بھی

استدلال کیا ہے جو باب الغسل کے آخر میں آرہی ہے اور حضرت مکرمہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور تابعی ہیں انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔ ان تمام روایات کی روشنی میں جمہور جمعہ کے غسل کو مسنون اور مستحب قرار دیتے ہیں۔

جواب: جمہور نے قائلین وجوب غسل کے دلائل کے کئی جوابات دیئے ہیں فرماتے ہیں کہ جہاں امر کا صیغہ آیا ہے وہاں غسل کی دیگر روایات کے پیش نظر امر کو استحباب پر حمل کریں گے کیونکہ قرینہ صارفہ موجود ہے کہ اس امر کو وجوب پر حمل نہیں کیا جاسکتا ہے تو یہ امر "واذا حللتہم فاصطادوا" کے امر کی طرح استحباب پر محمول ہے۔

اور جہاں احادیث میں حق یا واجب کے الفاظ آئے ہیں وہ ثابت کے معنی میں ہیں یا حق سے مراد سنت مؤکدہ کا حکم لیا جائے گا یا یہ روایات موقوف و منسوخ ہیں یعنی انتہاء حکم بسبب انتہاء علت ہو گیا ہے اس کا قصہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مشکوٰۃ ص ۵۵ فصل ثالث میں اس باب کی آخری حدیث میں بہت تفصیل سے مذکور ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس زمانہ کا پورا نقشہ پیش کیا ہے گویا غسل کا وجوب ابتداء اسلام میں تھا پھر موقوف ہو گیا بہر حال دلائل جیسے بھی ہوں لیکن افضل اور بہتر غسل کرنا ہی ہے اور احتیاط ان حضرات کے مسلک میں ہے جو جمہور کے علاوہ ہیں۔ اور غسل جمعہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

غسل جمعہ، دن کے لئے ہے یا نماز کے لئے؟

﴿وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ يَغْتَسِلَ فِي كُلِّ سَبْعَةِ أَيَّامٍ يَوْمًا يَغْتَسِلُ فِيهِ رَأْسَهُ وَجَسَدَهُ﴾ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ہر (عائلہ بالغ) مسلمان پر حق ہے (یعنی ثابت اور لازم ہے یا لائق ہے) کہ ہر ہفتہ میں ایک دن (یعنی جمعہ کو) نہائے اور اپنا سر اور بدن دھوئے"۔ (بخاری و مسلم)۔

توضیح: جمعہ کے غسل میں دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ آیا یہ غسل یوم جمعہ کے لئے ہے یا صلوٰۃ جمعہ کے لئے ہے۔ جمہور کے ہاں یہ یوم الجمعۃ کے لئے ہے اور احناف کے ہاں صلوٰۃ الجمعۃ کے لئے ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دو قول مروی ہیں ایک قول جمہور کے موافق ہے اور دوسرا احناف کے ساتھ ہے۔

اختلاف کا ثمرہ:

اس اختلاف کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوگا کہ جو حضرات غسل کو جمعہ کی نماز کے لئے سنت قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ سنت تب پوری ہوگی جب کہ اسی غسل کے ساتھ نماز ادا کی جائے اگر صبح سویرے غسل کیا اور پھر وضو ٹوٹ گیا اور اس غسل سے نماز نہ پڑھی تو سنت پوری نہیں ہوگی اور جو حضرات اس غسل کو یوم جمعہ کے لئے قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اگر جمعہ کے

دن صبح کو غسل کیا تو سنت ادا ہو جائے گی نماز اس غسل سے ہو یا نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص نماز کے بعد غسل کرتا ہے تو کسی کے نزدیک سنت ادا نہ ہوگی۔

احادیث میں جو یوم جمعہ اور صلوٰۃ جمعہ اور ہفتہ میں ایک بار غسل کرنے کا حکم آیا ہے تو بظاہر اس میں تعارض نظر آرہا ہے مگر احادیث میں تعارض نہیں بلکہ تین قسم کے غسل مستحب ہیں اور تینوں کے لئے مختلف احادیث آئی ہیں اب جمعہ کی نماز کے لئے جس غسل کا حکم ہے اگر اس میں یہ نیت کر لی جائے کہ جمعہ کے دن اور نماز کا غسل بھی کر رہا ہوں اور یہ نیت بھی کر لے کہ ہفتہ وار غسل کر رہا ہوں تو کوئی تعارض نہیں ہوگا اور تمام احادیث پر عمل ہو جائے گا۔

الفصل الثانی

جمعہ کے غسل میں نرمی

﴿۷﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَرِحَ بِهَا وَنَعِمَتْ وَمَنْ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ (رواه أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي والبخاری) ۱

ترجمہ: حضرت سرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”جس نے جمعہ کے روز وضو کر لیا تو اس نے فرض ادا کیا اور یہ بہت اچھا فرض ہے اور جس شخص نے (نماز جمعہ کے لئے) غسل کیا تو یہ بہت ہی اچھا ہے“ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، بخاری)

﴿۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ غَسَلَ مِثْرًا فَلْيَغْتَسِلْ. (رواه ابن ماجہ وزاد أحمد والترمذي وأبو داود ومن غسلة فليغتسل) ۲

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے مردے کو نہلایا ہو اسے خود بھی نہا لینا چاہیے۔“

(ابن ماجہ) اور احمد، ترمذی و ابوداؤد نے (اس حدیث میں) مزید نقل کیا ہے کہ (آپ نے یہ بھی فرمایا کہ) جو شخص جنازہ کو کاٹنا دھا دینے کا ارادہ کرے اسے وضو کر لینا چاہیے۔

چار چیزوں کی وجہ سے غسل

﴿۹﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ مِنَ الْحَبَاثَةِ وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ وَمِنْ الْحِجَامَةِ وَمِنْ غَسْلِ الْمَيْتِ. (رواه أبو داود) ۳

تین جگہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے نہانے کا حکم دیا کرتے تھے

① جنابت (یعنی ناپاکی) سے ② جود کے واسطے ③ سنگی کچھوانے سے ④ مردہ کو نہلانے سے۔“ (ابوداؤد)

توضیح: اس حدیث میں چار چیزوں کی وجہ سے غسل کا حکم دیا گیا ہے۔ میت کو غسل دینے کے بعد غسل دینے والے پر جمہور فقہاء کے نزدیک غسل نہیں ہے اسی طرح اس شخص پر بھی غسل نہیں ہے جس نے میت کا جنازہ اٹھایا ہو اور نہ اس شخص پر غسل ہے جس نے سنگی لگوائی ہو ہاں جنابت والے پر غسل فرض ہے۔

اہل ظواہر کے ہاں جنازہ اٹھانے والے کو اور میت کو غسل دینے والے پر خود غسل واجب ہو جاتا ہے ان حضرات نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں ”من غسل میتاً فلیغتسل“ کے الفاظ ہیں اور دوسرا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے کیا ہے جس میں ”ومن غسل المیت“ کے الفاظ ہیں جمہور کے ہاں ان دونوں پر اس لئے غسل نہیں ہے کہ موجب غسل کوئی چیز موجود نہیں ہے محض اس وہم کی بنیاد پر کہ کہیں چھبھیں پڑنے سے جسم پر نجاست لگی ہوگی وجوب غسل کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے ”کنا نغسل المیت فبعضنا یغتسل وبعضنا لا یغتسل“ (اخرجه الخطیب)

اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر کہیں نجاست لگ جائے تو غسل کریں گے ورنہ نہیں کریں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ”من حملہ فلیتوضأ“ میں حمل سے مراد یہ کہ جب ایک شخص جنازہ اٹھا کر اس کے ساتھ جا رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وضو بنا کر جائے کیونکہ آگے جا کر اس کو جنازہ کی نماز پڑھنی ہوگی تو تیار رہے گا یا یہ روایت منسوخ ہے ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ روایت منسوخ ہے یا امر استحبائی ہے۔

ومن غسل المیت: یعنی مردے کو نہلانے کے بعد غسل فرماتے تھے یاد رکھو آنحضرت ﷺ نے زندگی بھر کسی مردے کو خود غسل نہیں دیا ہے یہاں اسناد اور نسبت مجازی ہے جیسے ”ہنی الامیر القصر“ میں اسناد الی غیر ماہولہ ہے یا جس طرح حدیث ہے:

”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رحمہما عزا“ ای امر برجہ۔

﴿۷﴾ وَعَنْ قَنِسِ بْنِ عَاثِمٍ أَنَّهُ أَسْلَمَ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ بِمَاءٍ وَيَسْدِرَ۔

(رواہ البیہقی وأبو داؤد والنسائی)۔

تین جگہ: اور حضرت قنیس بن عاصم رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے تو نبی

اکرم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ پانی اور بھیری کے ہتھوں سے نہ لیں۔ (ترمذی، ابوداؤد و نسائی)

توضیح: اِنَّ اسلم: اسلام سے پہلے اگر کافر جنابت کی حالت میں ہو تو اسلام قبول کرنے کے بعد اس پر غسل کرنا فرض ہے اور اگر اسلام قبول کرنے کے بعد وہ شخص جنابت میں نہ ہو تو غسل کرنا مستحب ہے خلاصہ یہ ہے کہ اسلام غسل کے بغیر بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ لہ

الفصل الثالث

غسل جمعہ کا پس منظر

﴿٨﴾ وَعَنْ عِكْرَمَةَ قَالَتْ إِنَّ أَنَسًا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ جَاءَهُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاجِبًا قَالَ لَا وَلَكِنَّهُ أَظْهَرُ وَخَبَّرَ لَيْسَ اغْتَسَلَ. وَمَنْ لَمْ يَغْتَسِلْ فَلَيْسَ عَلَيْهِ وَاجِبٌ وَسَأَلَهُمْ كَيْفَ بَدَأَ الْغُسْلَ كَانَ النَّاسُ مَجْهُودِينَ يَلْبَسُونَ الصُّوفَ وَيَعْمَلُونَ عَلَى ظُهُورِهِمْ وَكَانَ مَسْجِدُهُمْ حَقِيقًا مُقَارِبَ السَّقْفِ إِنَّمَا هُوَ عَرِيشٌ فَخَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي يَوْمٍ حَارٍّ وَعَرِقَ النَّاسُ فِي ذَلِكَ الصُّوفِ حَتَّى قَارَتْ مِنْهُمْ رِيَاحٌ آذَى بِذَلِكَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَلَمَّا وَجَدَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تِلْكَ الرِّيحَ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا كَانَ هَذَا الْيَوْمَ فَاغْتَسِلُوا وَلَيْسَ أَحَدُكُمْ أَفْضَلَ مَا يَجِدُ مِنْ طَهْرٍ وَطَيِّبٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ثُمَّ جَاءَ اللَّهُ بِالْخَيْزِ وَلَبَسُوا خَيْزَ الصُّوفِ وَكَفُّوا الْعَمَلَ وَوَسَّعَ مَسْجِدَهُمْ وَذَهَبَ بَعْضُ الَّذِينَ كَانَ يُؤَدِّي بَعْضُهُمْ بَعْضًا مِنَ الْعَرَقِ.

(رواه الألباني)

ترجمہ: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عراق کے چند آدمی آئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ کیا آپ کی رائے میں جمعہ کے دن نہانا واجب ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! مگر (جمعہ کے دن نہانا) بہت زیادہ صفائی اور ستھرائی ہے اور جو شخص غسل کر لے اس کے لئے بہتر ہے اور جو شخص نہ نہائے اس پر واجب بھی نہیں ہے اور میں تم کو بتانا ہوں کہ جمعہ کے دن غسل کی ابتداء کیونکر ہوئی؟ (یعنی جمعہ کے روز غسل کس وجہ سے شروع ہوا) تو اصل بات یہ تھی کہ اسلام کے شروع زمانہ میں بعض نادار صحابہ صوف پہنتے تھے اور پیٹھ پر (جو جمعہ اٹھانے کا) کام کرتے تھے ان کی مسجد تنگ تھی جس کی چھت نیچی اور کھجور کی

نہینوں کی تھمی ایک مرتبہ جمعہ کے دن جب کہ سخت گرمی تھی سرکارِ دو عالم ﷺ (مسجد میں) تشریف لائے (سخت گرمی کی وجہ سے) صوف کے اندر لوگ پسینہ سے تر ہو گئے یہاں تک کہ (پسینہ کی) بدبو پھیلی جس سے لوگ آپس میں تکلیف محسوس کرنے لگے جب سرکارِ دو عالم ﷺ کو بدبو کا احساس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”لوگو! جب جمعہ کا دن ہو تو غسل کر لیا کرو بلکہ تم میں سے جسے تیل یا خوشبو میسر ہو تو وہ اسے بھی لگا لیا کرے (یعنی بالوں میں تیل لگائے اور کپڑوں پر خوشبو (مثلاً عطر وغیرہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی فراوانی کی تو لوگوں نے صوف چھوڑ کر (عمدہ) کپڑے استعمال کرنے شروع کر دیئے محنت و مشقت کے کام بھی چھوٹ گئے، مسجد بھی وسیع ہو گئی اور پسینہ کی وجہ سے لوگوں کو آپس میں جو تکلیف ہوتی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ (ابوداؤد)

اظہار تشکر

الحمد للہ جمعہ کے غسل کی یہ توضیح و تشریح میں ۲۹ رمضان ۱۴۲۲ھ جمعہ ہی کے دن مسجد حرام میں بیت اللہ کے سامنے لکھ رہا ہوں۔

(الحمد لله على انعامه)

فضل محمد یوسف زئی نزیل بیت اللہ الحرام



باب الحيض

حيض کا بیان

فقہاء میں یہ بحث چلی ہے کہ حیض انجاس میں سے ہے یا احداث میں سے ہے دونوں طرف فقہاء کی رائیں ہیں مگر اس اختلاف کی وجہ سے مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑا البتہ حیض کی تعریف پر اس کا اثر پڑتا ہے جن حضرات نے حیض کو نجاست اور انجاس میں شمار کیا ہے ان کے ہاں حیض کی جو تعریف ہے اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔ لہ

حیض کی تعریف:

حیض کا لغوی معنی بہنے کا ہے عرب کہتے ہیں "حاض الوادی" اسی سال اور اسی مفہوم میں حوض ہے جس کی طرف پانی بہہ کر جمع ہو جاتا ہے اور شریعت میں حیض کی تعریف فقہاء نے اس طرح کی ہے "هو دم ينفضه رحم امرأة بالغة من غير داء" اس مرض میں مبتلا عورت کو حائض بھی کہتے ہیں اور حائضہ بھی بولا جاتا ہے بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ "الحائض" میں دوام کا مفہوم پڑا ہے اور "الحائضۃ" میں حدوث اور جدت کا مفہوم پڑا ہے۔ "الحیضۃ" حائضہ کے فتح کے ساتھ ایک بار حیض آنے کو کہتے ہیں اور "حائضہ" پر اگر کسرہ آجائے تو یہ حیض کا نام بھی ہے اور وہ حالت بھی ہے جس حالت میں یہ عورت مبتلا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بچے کی غذا کے لئے ماں کے رحم میں حیض کے خون کا انتظام کیا ہے چنانچہ چار ماہ کے بعد بچے میں جان آ جاتی ہے تو وہ اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار ماہ کا جو خون رحم میں جمع ہوتا ہے وہ بچے کی ولادت کے بعد نفاس کی شکل میں باہر آتا ہے چار ماہ کے بعد کا خون بچہ پی جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے منہ کو پاک رکھا ہے تاکہ اس سے اللہ کا مبارک نام لیا کرے لہذا بچہ منہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ناف کی نالی کے ذریعہ سے اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے اور منہ کو اللہ تعالیٰ کے مقدس نام لینے کے لئے پاک رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے:

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال ہے ادبی است

حیض کا پس منظر:

حیض کی ابتداء کیسے ہوئی اور یہ بیماری عورتوں کے ساتھ کیوں لگی۔ اس کے بارے میں ایک تو نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض کی اس بیماری کو آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے ساتھ لگا رکھا ہے (لمعات) لے گویا حیض عورت کی طبیعت اور بشری تقاضا ہے اور یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ سب سے پہلے حیض بنی اسرائیل کی عورتوں کو آیا تھا مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ

کی ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتیں اور مرد اسٹھے مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے تو عورتوں نے یہ شرارت شروع کی کہ پیچھے سے مردوں کے مستور اعضاء کو جھانک کر دیکھتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حیض کی بیماری ڈال دی۔ حضرت امین عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حوا علیہا السلام کو جنت سے زمین پر اتارا تو اس کے ساتھ حیض کی بیماری لگا دی یہ سب کچھ لغات میں شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت حوا نے جنت میں جب گندم کے درخت کی ٹہنی سے دانہ حاصل کرنا چاہا تو وہ ٹہنی اوپر کی طرف بلند ہو گئی حضرت حوا نے جب اس کو کھینچا تو وہ ٹوٹ گئی اور اس سے خون بہنے لگا اس ٹہنی نے بد دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے ایسا خون جاری کر دے جیسے خون تو نے مجھ سے جاری کیا اس بد دعا کے بعد عورتوں کو حیض آنا شروع ہو گیا۔ بہر حال حیض عورت کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے اور اولاد کا نظام بھی حیض کے ساتھ لگا ہوا ہے جس عورت کو حیض نہیں آتا وہ بیمار بھی رہتی ہے اور اولاد بھی نہیں ہوتی گو یا یہ ایک طبعی نظام ہے جو عورت کی فطرت اور تخلیق کا حصہ ہے۔

الفصل الاول مباحث الحيض

۱۰۱) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ إِنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يَأْكُلُوا وَلَمْ يُجَامِعُوهُنَّ فِي الْيَمِينِ فَسَأَلَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ الْآيَةُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُّ نَحْيٍ إِلَّا الْبِكَاحَ فَبَلَغَ ذَلِكَ الْيَهُودَ فَقَالُوا مَا يَرِيدُ هَذَا الرَّجُلُ أَنْ يَدَعَ مِنْ أَمْرِ كَاشِفِنَا إِلَّا خَالَفْنَا فِيهِ لِحَاءِ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ وَعَبَادُ بْنُ بِشْرٍ فَقَالَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ الْيَهُودَ يَقُولُ كَذَا وَكَذَا أَفَلَا نُجَامِعُهُنَّ فَتَحْكُمَ وَجْهَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَتَّى ظَنَنَّا أَنْ قَدْ وَجَدَ عَلَيْهِمَا فَخَرَجَا فَاسْتَقْبَلَهُمَا هَبْيَةُ مِنْ لَيْلٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَرْسَلَ فِي آثَارِهِمَا فَسَقَاهُمَا فَعَرَفَا أَنَّهُ لَمْ يَجِدْ عَلَيْهِمَا. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”یہود میں جب کوئی عورت ایام سے ہو جاتی تو لوگ نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ گھروں میں سونا بیٹھنا تک جھوڑ دیتے تھے چنانچہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے آپ سے اس کے بارے میں حکم پوچھا (کہ حائضہ عورتوں کے بارے میں یہودیوں کا تو یہ عمل ہے ہم کیا کریں؟) جسی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ الْآيَةُ (یعنی یہ لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں الخ) نازل فرمائی (آیت کے نازل ہونے کے بعد) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (تم اپنی عورتوں کے ساتھ جب کہ وہ حائضہ ہوں) سوائے محبت کے جو چاہو کرو

جب یہ خبر یہودیوں کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ شخص مجھے آنحضرت ﷺ ہمارے جس دینی امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں ہماری مخالفت ضرور کرتے ہیں (یہودیوں کی زبانی یہ سن کر دو صحابہ) حضرت اسید ابن حضیر اور حضرت عباد ابن بشر رحمہما اللہ دربار رسالت میں) حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہودی ایسا ایسا کہہ رہے ہیں (یعنی انہوں نے یہودیوں کا کلام نقل کیا اور پھر یہ کہا کہ) اگر اجازت ہو (تو یہودیوں کی موافقت کے لئے) ہم اپنی عورتوں کے پاس (ایام حیض میں) رہنا سہنا چھوڑ دیں۔ (یہ سن کر) آنحضرت کے چہرہ مبارک تاریک متغیر ہو گیا اور ہمیں یہ گماں ہو گیا کہ آپ ان دونوں پر خفا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بھی نکل کر چل دیئے ان کے جاتے ہی آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے تحفہ میں دودھ آ گیا آپ نے دونوں کے پیچھے (کسی شخص کو بلانے کے لئے) بھیجا (جب وہ آ گئے تو) آپ نے انہیں وہ دودھ پلا دیا (تاکہ انہیں آپ کے لطف و کرم کا احساس ہو جائے چنانچہ دودھ پینے کے بعد) انہوں نے جانا کہ آنحضرت ﷺ ہم سے ناراض نہیں۔“ (مسلم)

توضیح: حیض سے متعلق کئی مباحث ہیں اور اکثر میں اختلاف ہے۔

بحث اول:

حیض سے متعلق پہلی بحث اس کی مدت میں ہے تو اقل مدت حیض اور اکثر مدت حیض دونوں میں اختلاف ہے چنانچہ اس اختلاف کی تفصیل اس طرح ہے۔

حیض میں فقہاء کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اقل مدت حیض ایک قول کے مطابق "دفعة واحدة" ہے یعنی ایک بار خون کا چھلکانا کافی ہے، دوسرا قول "یوم وليلة" کا ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد کا قول بھی یوم وليلة کا ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اقل حیض دو دن اور تیسرے کا اکثر ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک اقل مدت حیض تین دن تین راتیں ہیں یہ تو اقل مدت حیض میں ان حضرات کا اختلاف ہے۔ اب اکثر مدت حیض میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر مدت حیض سترہ دن ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر مدت حیض پندرہ دن ہے اور احناف کے ہاں اکثر مدت حیض دس دن ہے۔

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے پاس اقل مدت حیض کے لئے دلیل کے طور پر کوئی حدیث یا نص شرعی نہیں ہے اور اکثر مدت حیض کے لئے ان حضرات نے "تقعدا احدا کن شطر عمرها لا تصلى ولا تصوم" سے استدلال کیا ہے۔ یہ حضرات شطر کے لفظ کو نصف کے معنی میں لیتے ہیں اور ہر ماہ کا نصف پندرہ دن ہوتا ہے۔

احناف کا استدلال ان روایات سے ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

مرفوعاً منقول ہیں۔

صاحب ہدایہ نے دارقطنی اور طبرانی کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

﴿۱﴾ "اقل الحيض للجارية البكر ثلاثة أيام ولياليها واكثره عشرة أيام".

﴿۲﴾ "عن معاذ رفعه قال لا حيض دون ثلاثة أيام ولا حيض فوق عشرة أيام".

(اخرجہ ابن عدی واسنادہ واہ)

عقیلی نے ایک اور سند سے مندرجہ بالا حدیث کو مختصر متن کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے:

﴿۳﴾ "ولا حيض اقل من ثلاث ولا اكثر من عشر".

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایات بھی ہیں۔

﴿۴﴾ "عن عائشة مرفوعاً اكثر الحيض عشر واقله ثلاث". (اخرجہ ابن حبان فی الضعفاء)

جواب: شوافع کی دلیل کا احناف نے یہ جواب دیا ہے کہ شطر نصف کے لئے مستعین نہیں بلکہ شطر کا اطلاق جزم پر بھی ہوتا ہے نیز اس سے اقل حیض یوم وليلة پر کہاں دلالت ہوتی ہے تو تقریباً تام نہیں نیز یہ روایت ضعیف بھی ہے۔

مسئلة الاستمتاع مني الحائض

بحث دوم:

فقہاء کرام کے درمیان دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ حالت حیض میں عورت کے ساتھ کیسا معاملہ رکھنا چاہئے کس قسم کا تعلق جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز ہے۔

کیونکہ یہود نے عورت کو حیض میں نجس سمجھ کر الگ تھلگ کیا کہ گھر میں رہنا سہنا، اس کے ساتھ ملنا جلنا، اس کے ہاتھ کا کھانا پکانا سب کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا گویا ایام کے دنوں میں عورت سے سوشل بائیکاٹ کرتے تھے ادھر عیسائیوں نے سب کچھ جائز قرار دیا تھا یہاں تک کہ جماع کرنے کو بھی جائز کیا اور حیض کا انکار کیا اسلام چونکہ معتدل اور افراط و تفریط سے پاک مہذب مذہب ہے اس لئے اس نے مسلمانوں کو راہ اعتدال دکھائی کہ نہ سوشل بائیکاٹ کرو اور نہ جماع کرو آنحضرت ﷺ نے اپنے قول و فعل سے امت کے سامنے ایک معیار رکھا جس کی تفصیل فقہاء کرام نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

حالت حیض میں عورتوں سے میل جول اور تعلق رکھنے کی چند صورتیں ہیں:

① حالت حیض میں اپنی بیوی سے بوس و کنار اور مواصلت و ملاست سب کے نزدیک جائز ہے اہل اسلام میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

② حالت حیض میں عورت سے جماع و ہم بستری کرنا ناجائز و حرام ہے۔

③ حالت حیض میں استمتاع بما تحت الازار کیا جائے یا نہیں اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ امام محمد رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ استمتاع جائز ہے بشرطیکہ جماع سے آدمی بچا رہے اور موضع دم یعنی خون کی جگہ سے اجتناب کرے۔ جمہور ائمہ کے نزدیک استمتاع بما تحت الازار ناجائز ہے۔ لہذا دلائل:

امام احمد رحمہ اللہ و محمد رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "اصنعوا کل شیء الا النکاح" تو تحت الازار استمتاع جائز ہو گیا کیونکہ جماع کے سوا سب کچھ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لہذا

جمہور کی دلیل مشکوٰۃ ص ۵۶ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جو فصل ثالث میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"فلما تقرب رسول اللہ ﷺ ولم یجد منہ"۔

اسی صفحہ اور اسی فصل میں حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "ثم شأنتك باعلاها" یعنی ازار بند کے اوپر سے فائدہ اٹھاؤ نیچے سے نہیں، اس طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: "قال ما فوق الازار" یہ حدیثیں اصل میں مسائل کے سوال کے جواب میں ہیں جس کے انداز جواب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا

جواب: "اصنعوا کل شیء الا النکاح" کا مطلب یہود کے غلو کو توڑنا تھا جو سوشل بائیکاٹ کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اصنعوا کل شیء" یعنی بالکل بائیکاٹ نہ رکھو بلکہ بوس و کنار کرو میل جول رکھو لیکن جماع نہ کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے جماع اور دواغی جماع دونوں کی نفی اور نفی مراد ہے اور تحت الازار کا جو استمتاع ہے وہ تو خالص دواغی جماع میں سے ہے لہذا جس طرح جماع ممنوع ہے اسی طرح دواغی بھی ممنوع ہیں۔

بہر حال فوق الازار کی صریح حدیثیں موجود ہیں اور تحت الازار استمتاع کرنا یقیناً دواغی جماع ہے تو یہ بھی ناجائز

ہے۔ ناف سے نیچے اور گھٹنے کے اوپر اس درمیانی حصہ کو ماتحت الارز کہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوفوق الارز کہتے ہیں کیونکہ رات کو استعمال کرنے والے الارز بندی کی یہی حدود ہیں۔

افلا نجامعہن: اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ ہے کہ کیا ہم ان سے رہنا سہنا الگ نہ کریں تاکہ یہود سے موافقت آجائے حدیث کے ترجمہ میں یہی مطلب مراد لیا گیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا ہم ان کا نصفہ عورتوں سے جماع ہی نہ کریں تاکہ یہود جل جائیں، علماء نے اس دوسرے مطلب کو رائج کہا ہے اور اس وجہ سے آنحضرت ﷺ ناراض ہو گئے تھے۔ لہ

حائضہ عورت سے میل جول رکھنے کی اجازت ہے

٢٥ وعن عائشة قالت كنت أغتسل أنا والنبي ﷺ من إناء واحد وكلانا جنب وكان يأمرني فأثرو فيبايعني وأنا حائض وكان يخرج إلى رأسه وهو معتكف فأغسله وأنا حائض.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ۲

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ”میں اور نبی کریم ﷺ دونوں جنابت کی حالت میں ایک برتن سے نہ لیا کرتے تھے (اور بعض اوقات) میں ایام سے ہوتی تھی اور آپ ﷺ مجھے (تہ بند باندھنے کے واسطے) ارشاد فرماتے جب میں تہ بند باندھ لیتی تھی تو آپ ﷺ مجھ سے (ناف کے اوپر اوپر) اپنا بدن لگا کر پلٹ جایا کرتے تھے اور (بعض مرتبہ) آپ اعتکاف میں ہوتے اور اپنا سر مبارک (مسجد سے) باہر نکال دیتے تو میں اپنے ایام کی حالت میں آپ کا سر مبارک دھوپا کرتی تھی۔“ (بخاری، مسلم)۔

﴿٣٥﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أَكَلُوهُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعٍ فِي
فَيْشْرَبُ وَأَتَعْرِقُ الْعَرَقُ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أَكَلُوهُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعٍ فِي.

(رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ”میں حالت ایام میں پانی پی کر (وہی برتن) نبی کریم ﷺ کو دے دیا کرتی تھی آپ اسی جگہ سے جہاں میرا منہ لگا کر پی لیتے اور کبھی میں ایام کی حالت میں ہڈی سے گوشت نوج کر کھاتی پھر وہ ہڈی آنحضرت ﷺ کو دے دیتی آپ اسی جگہ پر منہ رکھ کر گوشت کو نوچتے جہاں میں نے منہ رکھ کر نوچا تھا۔“ (مسلم)

﴿٤٤﴾ وَعَمَّا قَالَتْ كَأَنَّهُ بُذِرَتْ لَمْ يَمْسَسْهَا بَشَرٌ تَلْعَاقُ جِثَّتَيْنِ دَرَكًا فَاذْهَبِي فِي سَبِيلِكِ ۚ إِنَّكِ فِي الْغَرَابِ مُجْتَرِي ۚ وَأَنَّا حَامِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ٤٤

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ”میں ایام کی حالت میں ہوتی اور نبی کریم ﷺ میری گود میں سہارا دے کر بیٹھ جاتے اور قرآن مجید پڑھتے۔“ (بخاری و مسلم)

﴿۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ تَأْوِيلِي مِنَ الْحُمْرَةِ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقُلْتُ إِنِّي حَائِضٌ فَقَالَ إِنَّ حَيْضَتَكَ لَيْسَتْ فِي يَدَيْهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ”مسجد میں سے چھوٹا پوریا (جانناز) اٹھ کر مجھ سے دو (یعنی مسجد کے باہر کھڑی ہو کر اندر ہاتھ وال کر پوریا اٹھاؤ) میں نے عرض کیا کہ میں تو ایام سے ہوں (اس لئے مسجد میں ہاتھ کیسے داخل کر سکتی ہوں) آپ نے فرمایا تمہارے ہاتھ میں تو حیض نہیں ہے۔ (مسلم)

توضیح: اس حدیث سے یہ ضابطہ نکلتا ہے کہ ہر آدمی کے قیام و مقام اور مکان کا اعتبار اس کے قدمین اور پاؤں پر ہے جن پر اس کا پورا جسم متوازن کھڑا ہے اب آدمی اگر پاؤں پر مسجد سے باہر کھڑا ہے اور جسم کا بوجھ پاؤں پر ہے تو یہ شخص مسجد سے باہر شمار ہوگا خواہ اس کے ہاتھ یا سر وغیرہ مسجد میں کیوں نہ ہوں یہ شخص خارج مسجد ہے تو جنہی آدمی یا حائضہ عورت اگر ایسا کرے تو اس کی گنجائش ہے اور مسجد میں داخل نہ ہونے کی اگر کوئی شخص قسم کھائے اور پھر اس طرح عمل کرے تو وہ حائض نہیں ہوگا اسی طرح مسجد کے اندر اگر کھڑا ہے اور سر یا ہاتھ یا ہاتھ باہر کے تو اس کا اعتبار نہیں اعتبار پاؤں اور اس پر قیام کا ہے اوپر والی حدیثیں اور آنے والی حدیثیں امت کو حائضہ عورت سے میل جول رکھنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ اور جماع سے روکتی ہیں یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔

﴿۶﴾ وَعَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي فِي مِرْطٍ بَعْضُهُ عَلَى وَبَعْضُهُ عَلَيْهِ وَأَنَا حَائِضٌ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے کہ جس کا کچھ حصہ تو آپ کے اوپر ہوتا تھا اور کچھ حصہ مجھ پر ہوتا تھا اور میں ایام میں ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

الفصل الثانی

تین افعال پر کفر کا حکم

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أُنِيَ حَائِضًا أَوْ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا أَوْ كَاهِنًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُتِرَ عَلَى مُحَمَّدٍ. (رواه الترمذی وابن ماجہ والدارقطنی ورواہہا فضئلہ بما یقول فقد کفر وقال الترمذی: لا نعرف هذا الحديث إلا من حکیم الکرم عن ابن نمیرة عن أبي هريرة). ۷

﴿تَرْجُمَةٌ﴾: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میری بیوی کے ایام کی حالت میں میرے واسطے کیا کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ چیز جو تہ بند کے اوپر ہو اور اس سے بھی بچنا بہت ہی بہتر ہے۔ (بخاری) اور مجی السنہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

حالت حیض میں جماع کا کفارہ

﴿۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا وَقَعَ الرَّجُلُ بِأَهْلِهِ وَهِيَ حَائِضٌ فَلَيْتَ تَصَدَّقَ بِنِصْفِ دِينَارٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ)۔

﴿تَرْجُمَةٌ﴾: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اگر کوئی شخص اپنی حائضہ بیوی سے جماع کرے تو اسے نصف دینار صدقہ کر دینا چاہیے۔“ (ترمذی، ابوداؤد، دارقطنی، ابن ماجہ، نسائی)

﴿۱۰﴾ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا كَانَ دَمًا أَحْمَرَ فَيَدِينَا وَإِذَا كَانَ دَمًا أَصْفَرَ فَيَنْصَفُ دِينَارٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)۔

﴿تَرْجُمَةٌ﴾: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (ایام کی حالت میں اگر حیض کا خون سرخ رنگ کا ہو) اور اس حالت میں کوئی صحبت کرے (تو ایک پورا دینار اور اگر خون کا رنگ زرد ہو تو آدھا دینار) (صدقہ لازم ہے)۔

(ترمذی)

توضیح: اذا كان دما احمر: یہ فرق اس لئے ہے کہ خمن ابتدائی حیض میں سرخ ہوتا ہے تو ایسے خون کے دوران جماع کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ابھی عورت حائضہ ہوئی ہے اس سے کچھ وقت قبل شوہر جماع کرتا تھا ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا کہ شوہر بے قاعدگی اور بے صبری کرتا ہے لہذا اس پر جرمانہ بھی زیادہ ہے کہ ایک دینار دے گا۔ لیکن جب وقت کافی گزر جاتا ہے تو خون پیلا پڑ جاتا ہے لہذا یہ شخص کچھ نہ کچھ معذور ہے کہ کئی دن تک چھٹی کی تو اب اس پر نصف دینار کا جرمانہ آئے گا۔ فرق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب خون سرخ ہوتا ہے تو یہ حیض کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے ایسے وقت میں جماع کرنا زیادہ جرم ہے تو پورا دینار دینا ہوگا ورنہ نصف دینار دینا ہوگا۔

یہ معمولی سا جرمانہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو ایک احساس دلایا جاتا ہے کہ شرم کرو و مذہب مرد و حالت حیض میں جماع کرتے ہو اب اس جرم کا تاوان ادا کرو جب ایک دفعہ تاوان دے دیا پھر جرم کے قریب نہیں جائے گا۔ جرمانہ کا فرق حیض کی قوت اور ضعف کی بناء پر ہے۔

نیز صدقہ کا حکم اس لئے دیا کہ "الصدقۃ تطہر غضب الذیوب" تو جرم کو صدقہ ہلکا کر دے گا ویسے جمہور کے نزدیک صدقہ کا حکم استحبائی ہے اصل چیز استغفار ہے اور سچے دل سے توبہ کرنا ہے۔

الفصل الثالث

حائضہ سے بوس و کنار جائز ہے

(۱۱۶) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ قَالَ إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ مَا يَحِلُّ لِي مِنْ امْرَأَتِي وَهِيَ حَائِضٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَشُدُّ عَلَيْهَا إِذَا رَهَاقَ شَأْنُكَ بِأَعْلَاهَا.

(رواہ مالک و الثوریٰ عن زید بن اسلم)۔

ترجمہ: حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے لئے میری بیوی سے جبکہ وہ ایام کی حالت میں ہو کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اس کے جسم پر اس کا تہہ بند خوب مضبوط باندھ لو، پھر تہہ بند کے اوپر تمہارا کام ہے (یعنی ناف سے اوپر تم کو اختلاط مباح اور ناف کے نیچے حرام ہے) امام مالک رحمہ اللہ اور امام دارمی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بطریق ارسال روایت کیا ہے۔

حیض کے اثرات

(۱۱۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ إِذَا حِضْتُ نَزَلْتُ عَنِ الْبَيْتِ عَلَى الْخَصِيءِ فَلَمْ تَقْرُبْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَلَمْ تَذَنْ مِنْهُ حَتَّى تَطْهُرَ.

(رواہ ابو داؤد)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب میں ایام سے ہو جاتی تو بستر سے اتر کر بوریہ پر آ جاتی چنانچہ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جاتیں نہ تو نبی کریم ﷺ ان کے نزدیک آتے تھے اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک آتی تھیں۔ (ابوداؤد)

توضیح: حیض کئی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور کئی چیزوں کے لئے مانع ہے چند چیزیں ملاحظہ کریں:

۱. حیض طہارت کے لئے مانع ہے جب تک حیض ہے طہارت نہیں آ سکتی۔
۲. وجوب الصلوٰۃ کے لئے مانع ہے اسی طرح صحتہ الصلوٰۃ کے لئے بھی مانع ہے۔

- ① صحیحہ الصوم سے بھی مانع ہے یعنی صوم اگر چہ واجب ہو جاتا ہے لیکن اس کا اس حالت میں رکھنا صحیح نہیں ہے۔
- ② تلاوت قرآن اور مس صحف سے مانع ہے۔
- ③ دخول مسجد سے مانع ہے۔
- ④ جماع سے مانع ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھ لیتا چاہئے کہ یہ حدیث ساہقہ کئی احادیث سے معارض ہے جس میں حائضہ سے میل جولی اور بوس و کنار کا ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حضور اکرم کی اجازت کے بغیر قریب نہیں جاتیں اجازت سے بوس و کنار ہوتا تھا۔
 دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے یا ضعیف ہے یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ اس حدیث میں ایک نسخہ فلہو یقرب ہے، مذکورہ ترجمہ اسی نسخہ کے مطابق ہے۔ لہ



باب المستحاضة

مستحاضہ کا بیان

مسائل مستحاضہ مہمات فقہ میں سے عمیق اور مشکل ترین مسائل ہیں علماء نے ہر زمانہ میں اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل کتاب لکھی ہے امام محمد رحمہ اللہ نے مستقل کتاب لکھی ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اس پر مستقل کتاب لکھی ہے مستحاضہ اور استحاضہ کے متعلق چند ابحاث کو الگ الگ لکھنا ضروری ہے اس کے بعد تمام احادیث کو ان ابحاث کی روشنی میں سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔

بحث اول:

پہلی بحث اس میں ہے کہ استحاضہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اور حقیقت کیا ہے تو استحاضہ باب استفعال کا مصدر ہے اس کا مجر حیض ہے جو باب حاض یحیض حیضاً سے آتا ہے باب استفعال میں جو سین اور تا کی زیادتی ہوتی ہے اس کے کئی خواص ہیں یہاں سین اور تا زیادتی یا تو مبالغہ کے لئے ہے یعنی بہت زیادہ خون کا بہنا اور یا یہ مصدر تحول کے لئے آیا ہے یعنی ایک حقیقت سے نکل کر شے دوسری حقیقت میں چلی گئی ہے مثلاً استنوق الجمل ای تحول الجمل الی العاقۃ یا کہا جائے "کان حماراً فاستن ای صار الحمار ائناً" یعنی پہلے گدھا تھا اب گدھی بن گئی یہاں بھی استحاض یعنی صار الحیض شیئاً اخر ای تحول الحیض استحاضہ۔ یا کہا جاتا ہے: استعجر الطین ای صار الطین حجراً۔

اب بطور لطیفہ علمیہ یہ بات سمجھ لو کہ استحاضہ کے مادہ اور صیغہ سے آپ جو بھی صیغہ استعمال کرو گے وہ مجہول کا ہوگا معروف کا صیغہ نہیں آئے گا اسی طرح اسم فاعل استعمال نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے اسم فاعل کو تو ذکر اسم مفعول بنانا پڑے گا۔ تو استحاضت المرأة نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ تُسْتَحَاضُ الْمَرْأَةُ یا أُسْتَحِیْضُ الْمَرْأَةُ مجہول کا صیغہ بولنا پڑے گا امرأة مستحیضة کہنا صحیح نہیں بلکہ مستحاضة ضروری ہے جو اسم مفعول ہے تو یہ استحاضہ کی لغوی تحقیق تھی۔

استحاضہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے حیض اور نفاس کے علاوہ عورت کے قبل سے جو خون آتا ہے وہ استحاضہ کہلاتا ہے۔ لہٰذا احادیث میں استحاضہ کی وجہ اور اس کے اسباب کے بارے میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ایک جگہ انہا رکضة الشیطان کے الفاظ ہیں دوسری جگہ "عرق النقط" کے الفاظ وارد ہیں اس کی تشریح میں ایک حدیث میں داء عُرَض کے الفاظ ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک رگ ہے جس کا نام ”عاذل“ ہے اور حضرت شاہ انور رحمہ اللہ اس کو رحم کا نام دیتے ہیں جو کچھ بھی ہو یہ خون بہر حال رحم سے آتا ہے البتہ یہ غیر طبعی خون ہے جو مزاج کے فساد کی وجہ سے آتا ہے حدیث میں ”داء عرض“ کے الفاظ جو آئے ہیں یہ اسی غیر طبعی نظام کی طرف اشارہ ہے اب رکضۃ الشیطان ان آخری دونوں اسباب کو شامل ہے کہ شیطان کی یہ ٹھوکر کبھی تو عرق النقطع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی داء عرض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے عرق عاذل کی اصطلاح اطباء کے ہاں نہیں باقی چیزوں میں وہ متفق ہیں بہر حال کبھی کبھی یہ خون رحم کے اندر کی کسی رگ سے بھی آتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے مستحاضہ عورت اصحاب انذار اور شرعی معذورین کے حکم میں ہے لہذا یہ دیگر معذورین کی طرح نماز پڑھے گی تمام عبادات ادا کرے گی شوہر اس کے ساتھ جماع کر سکتا ہے۔ گویا استحاضہ سلسل البول، رعاف دائر، استطلاق البطن اور انفلات الریح طبیسی بیماریوں کی طرح ایک بیماری ہے جو کسی امر شرعی کے لئے مانع نہیں ہے۔

بحث دوم: مستحاضہ کی اقسام:

ائمہ احناف کے نزدیک مستحاضہ کی کل تین قسمیں ہیں متعادہ، مبتدأہ اور متخیرہ ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں جمہور علماء کی بھی یہی رائے ہے لیکن ان کے ہاں مستحاضہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو میزہ کے نام سے مشہور ہے آئندہ اس کی تفصیل آئے گی۔

متعادہ کا حکم:

متعادہ وہ عورت ہے جس کی مدت حیض اور اس کے دن معروف اور مقرر ہوں کہ مثلاً آٹھ یا دس دن یا پانچ دن حیض آتا ہے یہ اس کی عادت ہے ائمہ احناف کے ہاں تین بار جب ایک ہی انداز سے حیض آگیا تو عادت کے ثبوت اور تقرر کے لئے یہی کافی ہے متعادہ کا حکم یہ ہے کہ مدت عادت تک حیض شمار ہوگا اور اس کے بعد استحاضہ شمار ہوگا حیض کے ایام میں یہ عورت شرعی احکام ادا نہیں کر سکتی ہے اور استحاضہ میں سب ادا کرے گی احادیث میں جن مستحاضہ عورتوں کا بیان آیا ہے احناف کے ہاں وہ اکثر متعادہ تھیں۔

مبتدأہ کا حکم:

مبتدأہ اس مستحاضہ عورت کو کہتے ہیں جس کو بلوغ کے وقت جو پہلی بار خون آیا وہ اتنا لمبا ہو گیا کہ اکثر مدت حیض سے بھی آگے بڑھ گیا۔ مبتدأہ کا حکم احناف کے ہاں یہ ہے کہ دس دن اس کا حیض ہے باقی استحاضہ ہے شوافع کے ہاں ۱۵ دن حیض ہے باقی استحاضہ ہے مالکیہ کے ہاں ۷ دن حیض ہے اور باقی استحاضہ ہے ہر ماہ میں اس کا یہی حکم رہے گا۔

متحیرہ کا حکم:

متحیرہ وہ مستحاضہ عورت ہے جو اپنے ایام حیض اور زمانہ استحاضہ میں تمیز نہ کر سکے اور خود حیران رہ جائے کہ اب میں کیا کروں یا عالم دین اور فقیہ کو اس کے دقیق اور معمیر و پیچیدہ مسائل نے حیران کر کے رکھ دیا اس متحیرہ کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ سے اس کی تین قسمیں ہیں یعنی ایک قسم متحیرہ فی مدۃ الزمان ہے کہ کتنے دن خون آیا تھا اس میں حیران و پریشان ہے دوسری قسم متحیرہ فی اوقات الزمان کہ کب سے یہ خون شروع ہوا تھا آیا ابتداء مہینہ میں تھا یا وسط کا وقت تھا یا آخر مہینہ تھا، تیسری قسم یہ کہ سب میں حیران و پریشان ہے۔ اس کا حکم اجمالی طور پر سمجھ لیں کہ یہ عورت اپنے مسائل میں سوچ و بچار اور تحری کرے اور پھر ظن غالب پر عمل کرے فقہاء احناف کی تفصیلات کا یہی خلاصہ ہے، اس سے زیادہ اس کے مسائل میں پڑنے سے صرف حیران ہونا پڑے گا حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ اس متحیرہ کو ضالہ بھی کہتے ہیں جو خود بھیگی ہوئی ہے یا مُضِلُّہ ہے جو عالم کو بے راہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

بحث سوم: خون کے رنگوں میں تمیز کرنا

احناف کے نزدیک مستحاضہ کی وہی تین قسمیں ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے دیگر فقہاء کے نزدیک مستحاضہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جس کو لمیزہ کہتے ہیں جو اپنے ایام کا قہین خون کے رنگوں کو دیکھ کر کر سکتی ہے احناف کے ہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

بہر حال یہاں یہ بحث ہے کہ کونسے الوان اور کونسے رنگ کا خون حیض کا ہے اور کونسے رنگ کا استحاضہ کا ہے۔ فتح القدیر میں لکھا ہے کہ خون کے کل رنگ چھ ہیں: ① حمرة ② صفرة ③ کدرۃ ④ خضرة ⑤ تربۃ ⑥ اور سواد۔ ان اقسام میں سے دو قسمیں یعنی حمرة اور سواد بالاتفاق حیض کا خون ہے اور صفرة اور خضرة کے بارے میں بھی علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ وہ بھی حیض کا خون ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

اب اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ الوان اور خون کے رنگوں کا اعتبار ہے یا نہیں ہے یعنی دم کے رنگ کا اثر صاحب دم پر پڑے گا یا نہیں؟ تو جمہور کے نزدیک الوان اور خون کے رنگوں کے اختلاف کا اعتبار ہے پھر آپس میں ان کا یہ اختلاف ہے کہ اگر عادت اور خون کے رنگ میں اختلاف آیا تو ترجیح کس کو دی جائے گی یعنی عادت کا تقاضا اور ہے اور رنگ کا اور ہے تو ترجیح کس کو ہوگی؟ تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عادت کو ترجیح ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لمیزہ کی تمیز کو ترجیح دی جائے گی بہر حال جمہور کے ہاں الوان دم کا اعتبار ہے اور اسی سے ان کے ہاں لمیزہ پیدا ہوگئی ہے کہ ایک مستحاضہ لمیزہ بھی ہے جو خون کے رنگ کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتی ہے کہ یہ خون حیض کا ہے یا استحاضہ کا ہے۔ احناف کے ہاں الوان کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ تو بسا اوقات اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اطباء اور ڈاکٹر بھی اس کا فرق نہیں کر سکتے ہیں۔

دلائل:

جمہور نے فاطمہ بنت ابی جیش رضی اللہ عنہا کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "فانہ دم اسود یعرف" یعنی حیض کا خون سیاہ ہوتا ہے جو پہچانا جاتا ہے اس کی تمیز عورت کر سکتی ہے۔ لہذا تمیز بالالوان کا اعتبار ہے اور تمیزہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جمہور کے ہاں تمیز بالالوان اور تمیزہ بطور ضابطہ وقاعدہ تسلیم شدہ ہے ائمہ احناف نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کو امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں نقل کیا ہے روایت یہ ہے:

"كان النساء يبعثن الدرجة الى عائشة فيها الكرسف فيه الصفرة من دم الحيض يستلنها عن الصلوة قالت لا تعجلن حتى تورين القصة البيضاء"۔ (موطا مالک ص ۴۲)

یعنی عورتیں اپنے کرسف حیض کے چوتھے بڑے بند کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجا کرتی تھیں تاکہ وہ فیصلہ کرے کہ یہ خون حیض کا ہے یا استحاضہ کا ہے تاکہ نماز پڑھنے کا حکم معلوم ہو جائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ تم عورتیں جلدی نہ کرو یہاں تک کہ تم خالص سفیدی دیکھ لو جب سفید پانی آجائے تو وہ حیض کا خون نہیں ہو گا تم نماز پڑھ سکتی ہو۔
یہ بھی دیکھئے: احناف نے فاطمہ بنت ابی جیش رضی اللہ عنہا کی روایت "اذا كان دم الحيض فانه دم اسود يعرف" پر دو اعتراض کئے ہیں پہلے اعتراض کا تعلق جمہور کے اس استدلال کے الفاظ اور سند سے ہے:

- نیکی نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مضطرب ہیں۔
- ابن ابی حاتم نے کہا کہ میں نے اپنے باپ سے ان الفاظ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ روایت منکر ہے۔
- یحییٰ بن سعید قطان نے کہا کہ یہ منقطع ہے طحاوی نے اس روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

دوسرا اعتراض احناف نے یہ کیا ہے کہ الوان کا اختلاف اغذیہ، امکانہ اور ازمنہ کی وجہ سے ہوتا ہے چنانچہ گوشت کھانے والی عورت کے حیض کا خون کالا آتا ہے اور بیزی کے زیادہ استعمال سے خون کے رنگ میں بیزی کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اور گرمی اور سردی کے مقامات و بلدان اور آب و ہوا کا اثر لازمی طور پر انسانی طبیعت پر پڑتا ہے لہذا خون کے رنگوں کو حیض اور استحاضہ کے خون کے لئے معیار اور ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ عادت ایک مضبوط نظام طبعی ہے اسی کو معیار کے طور پر قبول کرنا چاہئے نیز احادیث کے زیادہ تر الفاظ کے اشارے عادت کی طرف ہیں صرف یہ ایک جملہ جو اوپر مذکور ہوا اس میں الوان کا ذکر ہے لیکن یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے خصوصاً جبکہ اس کے مقابلہ میں دیگر احادیث بھی ہیں۔

جمہور نے فصل اول کی پہلی حدیث "فاذا اقبلت حیضتک فدعی الصلوة" سے بھی استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث سے الوان دم پر استدلال کرنا ناقابل فہم ہے لہذا اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

بحث چہارم: مصداق احادیث:

باب الاستحاضہ میں مستحاضہ کے بارے میں احادیث میں مختلف احکام مذکور ہیں تتبع اور تلاش سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تین قسم کے احکام کا ذکر آیا ہے۔

● مستحاضہ کے لئے آنحضرت ﷺ کا پہلا حکم یہ ہے کہ تداع الصلوۃ ایامہ اقراہا کہ حیض کے ایام میں یہ عورت نمازیں چھوڑے گی۔

● "اذا قبلت حیضتک فدعی الصلوۃ واذا ادبرت فاعسلی عندک الدم۔"

اس روایت میں حیض کے آنے جانے کے اوقات کی طرف اشارہ ہے اور عورت کے غسل کو بتایا گیا ہے۔ جس سے معتادہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

● "تنتظر عند اللیالی والا یامہ الی کانت تمحیضھن من الشهر۔"

اس روایت میں بھی اشارہ ہے کہ عورت کو اپنے ایام کا خوب حساب کرنا چاہئے۔

ائمہ احناف کے نزدیک ان تمام روایات کا تعلق معتادہ سے ہے اور یہ احکام بھی معتادہ کے بیان ہوئے ہیں اور شوافع کے ہاں دوسری روایت میں معتادہ اور میزہ دونوں کا احتمال ہے اور تیسری روایت میزہ کے لئے ہے احناف اور حنابلہ کے ہاں میزہ کا وجود نہیں مستحاضہ یا معتادہ ہے یا مبتدہ ہے اور یا متحیرہ ہے جس کو ضلۃ اور مضلہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ عورت یا حقیقت پانے سے خود گم شدہ ہے یا فقیہ کو گمراہ کر رہی ہے۔

بحث پنجم: مستحاضہ کے وضو کا حکم:

باب المستحاضہ کی روایات میں مستحاضہ عورت کے احکام وضو اور احکام غسل کے بارے میں کئی قسم کے الفاظ آئے ہیں مثلاً ایک روایت میں تنوضاً لكل صلوۃ کے الفاظ ہیں دوسری روایت میں تغتسل لكل صلوۃ کے الفاظ آئے ہیں ایک روایت میں تنوضاً لوقت کل صلوۃ کے الفاظ ہیں ایک روایت میں تجمع بین الصلواتین بغسل واحد کے الفاظ ہیں مشکوٰۃ شریف کی روایات کا مفہوم بھی اسی طرح نکلتا ہے اگرچہ اوپر کے الفاظ سے مشکوٰۃ کے الفاظ مختلف ہیں۔

فقہاء کرام کا اختلافی:

انقضاء حیض کے بعد مستحاضہ پر ایک غسل بالاتفاق فرض ہے وضو کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استحاضہ کے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور جن روایتوں میں وضو کا حکم آیا ہے وہ مالکیہ کے نزدیک استحباب پر محمول ہیں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دم استحاضہ کا خروج موجب للوضو ہے مستحاضہ کو وضو کرنا پڑے گا پھر ان حضرات کا آپس میں وضو کے بارے میں

اختلاف ہوا ہے کہ آیا ہر نماز کے لئے مستحاضہ وضو کرے یا ہر وقت کے لئے وضو کرے۔

شوافع کے نزدیک مستحاضہ پر لازم ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے وضو کرے اگر ایک وقت کے اندر کئی نمازیں پڑھنی ہیں تو ہر فرض نماز کے لئے نیا وضو بنانا پڑے گا ہاں وقت کی نماز کے ساتھ جو توالیع سنتیں ہیں وہ اس وضو سے پڑھ سکتی ہیں گویا فرض نماز کے بعد مستحاضہ کا وضو ٹوٹ گیا۔

ائمہ احناف اور حنابلہ کے نزدیک مستحاضہ نماز کے وقت کے لئے وضو کرے گی جب نماز کا وقت نکل جائے گا تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا وقت جب تک موجود ہے یہ مستحاضہ اس وقت میں ہر قسم کی کئی نمازیں پڑھ سکتی ہے خواہ نوافل ہوں یا فرائض ہوں۔ لہٰذا

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ نے تتوضاً لكل صلوٰۃ اور تتوضاً عند كل صلوٰۃ والی روایات سے استدلال کیا ہے اور حکم لگایا کہ مستحاضہ جب بھی نماز پڑھے گی نیا وضو بنائے گی بہت ساری حدیثوں میں وضو کرنے کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کی فصل ثانی میں عدی بن ثابت کی روایت میں تتوضاً عند كل صلوٰۃ کے الفاظ موجود ہیں جو شوافع کی دلیل ہے۔

احناف اور حنابلہ کی دلیل وہ روایت ہے جس میں تتوضاً لوقت كل صلوٰۃ کے الفاظ آئے ہیں اس روایت کو ابن قدامہ نے اپنی مشہور کتاب مغنی میں ذکر کیا ہے یہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بعض روایات کے الفاظ ہیں بعض روایات میں حتی یحییٰ فلك الوقت کے الفاظ آئے ہیں اس سے بھی احناف نے استدلال کیا ہے کہ وقت کے لئے وضو ہے کیونکہ وقت کی صراحت موجود ہے۔ لہٰذا

تتوضاً لكل صلوٰۃ اور عند كل صلوٰۃ والی روایتوں سے ان کے لئے مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ان پر عمل کیسے ہوگا اور اس کا جواب کیا ہے گا۔

تو احناف کے مشہور محقق ابن حام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احادیث میں تین قسم کے الفاظ ہیں لوقت كل صلوٰۃ، لكل صلوٰۃ، عند كل صلوٰۃ پہلا لفظ وقت کے لئے متعین ہے اور آخری دونوں جملوں میں وقت اور نماز دونوں معنوں کا احتمال ہے کیونکہ لام اور عند تعلیلیہ بھی ہو سکتے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ مستحاضہ ہر نماز کی وجہ سے وضو بنائے اور وقت پر بھی ہو سکتے ہیں۔

تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ مستحاضہ نماز کے ہر وقت کے لئے وضو بنائے اب ان محتمل کلمات کو ان متعین کلمات پر حمل کرنا چاہئے جن میں وقت کا تعین کیا گیا ہے۔ جیسے تتوضاً لوقت كل صلوٰۃ ہے خلاصہ یہ کہ مجمل اور محتمل کو مفسر اور متعین پر حمل کریں گے اور عربی لغت میں لام وقت کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے قرآن کریم کی آیت ہے: اقم الصلوٰۃ لدلوك الشمس یہاں لام وقت کے لئے ہے ای وقت دلوك الشمس اسی طرح عرب کہتے ہیں آتیک للظہر ای فی وقت الظہر۔

● غسل کی تمام احادیث کا تعلق علاج سے ہے مطلب یہ کہ ان مستحاضہ عورتوں کو غسل کا حکم اس لئے دیا گیا تاکہ ٹھنڈے پانی کے استعمال کرنے سے خون میں کمی آجائے اور خون رک جائے۔

● احادیث غسل کا تعلق متحیرہ کی بعض صورتوں سے ہے جس کے غسل کے احتلاف بھی قائل ہیں۔

● غسل اور وضو کی تمام احادیث کا نقشہ بہت اچھے طریقہ سے امام محمدی نے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سہل بن سہیل رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے ابتداء میں ہر نماز کے لئے غسل کا حکم دیا تھا پھر آپ نے اس میں نرمی کر کے دو نمازوں کے لئے ایک غسل کا حکم دے دیا جب یہ بھی ان پر شاق ہو گیا تو آپ نے ہر نماز کے لئے وضو کا حکم دیا تو دو نمازوں کے لئے ایک غسل کے حکم سے ہر نماز کے لئے غسل کا حکم منسوخ ہو گیا پھر ہر نماز کے لئے وضو کرنے کے حکم سے غسل کا حکم منسوخ ہو گیا اور اگر غسل کا حکم منسوخ نہیں ہے تو علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بطور علاج تیرید کے حصول کے لئے غسل کا حکم دیا تھا۔ (واللہ اعلم)

ان پانچ مباحث سے الحمد للہ باب الاستحاضہ کی تمام احادیث کی آسان تشریح سامنے آگئی اور یہ کتاب الطہارۃ کی آخری تفصیلی توضیح تھی جو کہ مکہ مکرمہ میں ۳ شوال ۱۴۲۲ھ میں مکمل ہو گئی ہے اور جس سے التوضیحات اردو شرح مشکوٰۃ کی پہلی جلد مکمل ہو گئی جس کی ابتداء گزشتہ سال ۱۴۲۱ھ مکہ مکرمہ اردو بیہ منورہ میں ہوئی تھی۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك لك الشكر على ما انعمت ولك الشكر على ما مننت ولك الشكر أولاً وأخيراً ولك الشكر ظاهراً وباطناً انت الخالق والناص والمالك وانت الرازق لا رب الا انت ولا مالك الا انت ولا ناصر الا انت بيدك الخير وانت على كل شيء قدير وصلى الله تعالى على اشرف الخلق وخاتم النبيين جيش الانبياء والمرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين. آمين يا رب العالمين.

فضل محمد بن نور محمد يوسف زئی

استاذ جامعہ بنوی ناؤن کراچی

حال نزیل مکہ المکرمہ زادھا اللہ عزہ وعظمتہ وھیبہ ومہابہ

۳ شوال ۱۴۲۲ھ

الفصل الاول

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حَبَشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي إِمْرَأَةٌ اسْتَحَاضُ فَلَا أَظْهَرُ أَفَادِعُ الصَّلَاةِ فَقَالَ لَا إِنَّمَا ذَلِكَ عِزْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضُكَ فَدَعِ الصَّلَاةَ وَإِذَا أَذْهَبَتْ فَأَغْسِلِي عَنْكَ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ میں ایک ایسی عورت ہوں جسے برابر (استحاضہ کا) خون آتا رہتا ہے چنانچہ میں کسی وقت پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟“ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں، یہ تو ایک رگ کا خون ہے حیض کا خون نہیں ہے لہذا جب تم کو حیض آنے لگے تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو (جسم سے) خون کو دھو ڈالو اور (نہا کر) نماز پڑھ لو۔ (بخاری، مسلم)

الفصل الثانی

﴿۲﴾ عَنْ عُرْوَةَ ابْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ أَبِي حَبَشٍ أَنَّهَا كَانَتْ تُسْتَحَاضُ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ إِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضِ قِوَانَةً دَمٌ أَسْوَدُ يُغْرَفُ فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ فَإِذَا كَانَ الْآخَرُ فَتَوَضَّعِي فَإِنَّمَا هُوَ عِزْقٌ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)۔

ترجمہ: حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (تابعی) حضرت فاطمہ بنت ابی حبشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ”انہیں استحاضہ کا خون آتا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ جب حیض کا خون آئے جس کی پہچان یہ ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے تو اس وقت تم نماز پڑھنے سے رک جایا کرو اور جب استحاضہ کا خون آنے لگے (یعنی خون سیاہ رنگ کے علاوہ اور کسی رنگ کا ہو) تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو کیونکہ (یہ حیض نہیں بلکہ) ایک رگ کا خون ہوتا ہے۔“ (ابوداؤد و نسائی)

﴿۳﴾ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ إِنَّ امْرَأَةً كَانَتْ غُلَزَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاسْتَفْتَتْ لَهَا أُمُّ سَلَمَةَ النَّبِيُّ ﷺ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِعَنْظُرٍ عِنْدَ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامِ أَلَيْسَ كَانَتْ تَحِيضُ مِنْ الشَّهْرِ قَبْلَ أَنْ يُحِيضَ بِهَا الْيَدَى أَصَابَهَا فَلْتَعْرِضِ الصَّلَاةَ قَدْ دَخَلَ مِنْ الشَّهْرِ فَإِذَا خَلَقْتَ ذَلِكَ فَلْتَعْرِضِ ثُمَّ لِيَسْتَفْرِغْ بِغُوبٍ ثُمَّ لِيُغْضَلِ. (رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَمُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

میں سے کہیں: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک عورت کو استحاضہ کا خون آتا تھا (اور وہ معادہ تھی) چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسے چاہیے کہ وہ دیکھے کہ اس بیماری کے آنے سے پہلے اسے مہینہ میں حیض کا خون کتنے دن رات آتا تھا (جب معلوم ہو جائے تو) ہر مہینہ اتنے ہی دنوں کی نماز پڑھنا چھوڑ دے اور جب وہ دن گزر جائے تو نہالے اور (پا جامہ کے اندر) کپڑے کی لٹکوی باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔" (مالک، ابوداؤد، دارمی) اور نسائی نے اس روایت کو با معنی نقل کیا ہے۔

﴿۱۰﴾ عَنْ عَبْدِ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ: جَدُّ عَبْدِ اللَّهِ إِسْمُهُ دِينَارٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ فِي الْمُسْتَحَاضَةِ تَدْعُ الصَّلَاةُ أَيَّامَهُمْ أَقْرَابَهَا إِلَيْهِ كَأَنَّهُ تَحِيضُ فِيهَا ثُمَّ تَغْتَسِلُ وَتَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَتَصُومُ وَتُصَلِّي. (رواه الأئمة الأربعة).

میں سے کہیں: حضرت عدی ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد اپنے والد یعنی عدی کے دادا سے نقل کرتے ہیں "یحییٰ ابن معین کہتے ہیں" کہ عدی کے دادا کا نام دینار ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "آپ نے ایک مستحاضہ کے بارے میں فرمایا کہ جن دنوں میں اسے (عادت کے موافق) حیض آتا ہے اسے چاہئے کہ ان میں نماز چھوڑ دے پھر (ان دنوں کے بعد ایک مرتبہ) نہالے اور ہر نماز کیلئے تازہ وضو کرے اور روزہ رکھے اور نماز بھی پڑھے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

﴿۱۱﴾ وَعَنْ حَنَنَةَ بِنْتِ بَحْشٍ قَالَتْ كُنْتُ أَسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ وَأُخْبِرُهُ فَوَجَدْتُهُ فِي بَيْتِ أُخْتِي زَيْنَبِ بِنْتِ بَحْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً فَمَا تَأْمُرُنِي فِيهَا قَدْ مَنَعَتْنِي الصَّلَاةَ وَالصِّيَامَ قَالَ أُنَعِّثُ لِكَ الْكُرْسَفِ فَإِنَّهُ يُذْهِبُ الدَّمَ قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ قَالَ فَتَلَجَّبِي قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ قَالَ فَاتَّخِذِي ثَوْبًا قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ إِنَّمَا أُفْجِئُهَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ سَامُرُكِ بِأَمْرَيْنِ أَيْهُمَا صَنَعْتَ أَجْزَأَ عَنْكَ مِنَ الْآخَرِ وَإِنْ قَوَيْتَ عَلَيْهِمَا فَأَنْتِ أَغْلَمُ قَالَ لَهَا إِنَّمَا هَذِهِ رَكْعَتُهُ مِنْ رَكَعَاتِ الشَّيْطَانِ فَتَحْيِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ فِي عِلْمِ اللَّهِ ثُمَّ اغْتَسِلِي حَتَّى إِذَا رَأَيْتِ أَنَّكَ قَدْ ظَهَرَتْ وَاسْتَنْقَابَ فَصَلِّي ثَلَاثًا وَعِشْرِينَ لَيْلَةً أَوْ أَرْبَعًا وَعِشْرِينَ لَيْلَةً وَأَيَّامَهَا وَصُومِي فَإِنَّ ذَلِكَ يُجَرِّدُكَ وَكَذَلِكَ فَافْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ وَكَمَا يَطْهَرْنَ مَيْقَاتَ حَيْضِهِنَّ وَطَهْرَهُنَّ وَإِنْ قَوَيْتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِي وَتَجْمَعِي بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ الظُّهْرِ

وَالْعَصْرِ وَتَوَجَّهْتُمُ الْمَغْرِبَ وَتَعَجَّلْتُمُ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلُونَ وَتَجْمَعُونَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَأَقْبَلِي وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الْفَجْرِ فَأَقْبَلِي وَصُومِي إِنْ قَدَرْتِ عَلَى ذَلِكَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهَذَا أَحَبُّ الْأَمْرِ إِلَيَّ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی)۔

حضرت حضرت جمشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”مجھے بہت ہی کثرت سے استحاضہ کا خون آتا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تاکہ آپ کو اس کی خبر دوں اور اس کا حکم پوچھوں چنانچہ میں اپنی بہن زینب بنت جمش کے مکان میں سرکارِ دو عالم ﷺ سے ملی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے استحاضہ کا خون بہت ہی کثیر آتا ہے جس نے مجھے نماز روزہ سے بھی روک رکھا ہے اس کے بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے روٹی کو بیان کرتا ہوں کیونکہ وہ خون کو لے جاتی ہے (یعنی خون لگنے کی جگہ روٹی رکھ لو تاکہ وہ باہر نہ نکلے) رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وہ تو (اس سے نہیں رکے گا کیونکہ) بہت زیادہ ہے آپ نے فرمایا (روٹی رکھ کر) اس پر لگام کی طرح کپڑا (یعنی لنگوٹی) باندھ لو۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ) زیادہ ہے آپ نے فرمایا تو پھر (لنگوٹ کے نیچے) ایک کپڑا رکھ لو انہوں نے کہا کہ وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ بہت ہی) زیادہ ہے یہاں تک کہ خون بارش کی (دھار کی) طرح آتا ہے۔ آپ نے فرمایا پھر تو میں تمہیں دو باتوں کا حکم کرتا ہوں ان میں سے تم جس کو بھی اختیار کرو گے دوسری کی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر تمہارے اندر دونوں (پر عمل کرنے) کی طاقت ہوگی تو تم خود ہی دانا ہو (کہ بہت بڑا اجر ملے گا لہذا تم اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے جو چاہو کرو) چنانچہ آپ نے رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ استحاضہ شیطان کی لاتوں میں سے ایک لات مارنا ہے لہذا (ہر مہینہ) چھ یا سات روز جس کا علم اللہ کو ہے حیض کے ایام قرار دو اور پھر (مدت مذکورہ جانے کے بعد) نہاڑو اور جب تم جان لو کہ میں پاک اور صاف ہو گئی ہوں تو تمہیں (۲۳) دن رات (ایام حیض سات دن قرار دینے کی شکل میں) نماز پڑھتی رہا کرو اور (اسی طرح ہر مہینے رمضان وغیرہ کے) روزے بھی رکھتی رہا کرو، چنانچہ جس طرح عورتیں اپنی اپنی مدت پر ایام سے ہوتی ہیں اور پھر دقت پر پاک ہوتی ہیں تم بھی ہر مہینہ اسی طرح کرتی رہا کرو (کہ چھ دن یا سات دن تو حیض کے ایام قرار دو اور بقیہ دن طہر یعنی پاکی کے ایام قرار دو) تمہارے لئے یہ کافی ہوگا اور اگر تمہارے اندر اتنی طاقت ہے کہ طہر کا وقت اخیر کر کے اس میں نہاڑو اور عصر میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھ لو اور پھر مغرب کا وقت اخیر کر کے نہاڑو اور عشاء میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھ لو اور نماز فجر کے لئے (علیحدہ) نہاڑو تو اسی طرح کر لیا کرو اور (جن دنوں نماز پڑھوان دنوں میں نفل اور فرض جیسے بھی چاہو) روزے رکھ لیا کرو اگر تم میں اس کی طاقت ہو تو (اس طرح کرتی رہا کرو) پھر سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ان دنوں باتوں میں سے آخری بات مجھے پسند ہے۔“ (احمد ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: حمنہ بنت جحش یہ صحابیہ آنحضرت ﷺ کی سالی ہے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ حضرت جحش کے ساری بیٹیاں مستحاضہ کی یہ ری میں مبتلا تھیں، مذہبہ منورہ میں تقریباً بارہ خواتین مستحاضہ کی بیماری کا شکار تھیں ان میں سے حمنہ بنت جحش کا بیان اس حدیث میں ہے۔

انعت لك الكرسف: فرج کے اندر روئی کے مناسب بنڈل رکھنے کا نام کرسف ہے۔

فتلجمی: لجام لگانے کو کہتے ہیں اور فارسی میں لجام ہے عربی میں لجام کتاب کے وزن پر ہے یہ اس لنگوٹ کو کہتے ہیں جو حائضہ اور مستحاضہ عورت کرسف کے اوپر خون بند کرانے کے لئے باندھ لیتی ہے۔

فاتخذی ثوباً: یعنی کپڑے کا مضبوط بنڈل بنا کر رانوں کے درمیان فرج پر رکھ کر اوپر لجام اور لنگوٹ لگا لو۔

انثج: مثلاً یعنی سیلاب کی طرح خون آتا ہے حدیث میں ہے الحج العج الشج یعنی حج زور سے تلبیہ پڑھنے اور خون بہانے کا نام ہے قرآن میں ماء ثجاج کا لفظ آیا ہے۔

فتحیضی: یعنی اپنے آپ کو حائضہ شمار کرو اور حیض کے احکام کو لازم پکڑو۔

اوسبعة ایام: یہ "اوشک کے لئے نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو دو کاموں کا حکم دیا گویا او شوح کے لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو کچھ ہو اس پر عمل کرو خواہ چھ دن حیض ہو یا سات دن ہو تجھری کرو اور عمل کرو۔

اعجب الامرین: یہاں یہ سوال ہے کہ دو امرین کون سے ہیں؟ تو ملا علی قاری رحمہ اللہ اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ دونوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اعجب الامرین میں پہلا امر تو آنحضرت ﷺ نے یہ دیا تھا کہ ہر نماز کے لئے مستقل غسل کرنا چاہیئے لیکن پھر بوجہ حرج آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرو یعنی ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل ہوگا مغرب و عشاء کے لئے دوسرا اور فجر کے لئے الگ غسل ہوگا تو پانچوں نمازوں کے لئے پانچ غسلوں کے بجائے تین غسلوں میں حرج کم ہو گیا۔

استحاضہ کی ایک حدیث میں "التستشفّر" کا لفظ آیا ہے استشفار گھوڑوں اور گدھوں پر سامان لادنے کے وقت دم کے نیچے ایک بٹی دبا کر مضبوط باندھی جاتی ہے تاکہ اترائی میں سامان گدھے کے سر کی طرف سرک نہ جائے پھر کتے کے بیٹھنے کے وقت جب وہ دم رانوں کے درمیان دبا کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اسکو استشفار کہتے ہیں مستحاضہ عورت کو بھی یہی حکم ہے کہ آرام سے بیٹھ کر کپڑے کا بنڈل بنائے اور پھر فرج میں دبا کر اس کے اوپر لنگوٹ باندھ لے تاکہ خون بند ہو جائے، یہ استشفار ہے۔

الفصل الثالث

﴿۶۹﴾ عَنْ أَنَسٍ بَنِي عُمَيْسٍ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ أَسْتَحْضِضْتُ مِنْذُ كُنَّا وَكُنَّا فَلَمْ تُصَلِّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَبْكَانَ اللَّهُ إِنَّ هَذَا مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَتَجَلَّسَ فِي مِزْكِنٍ فَإِذَا رَأَتْ صَفَارَةً فَوْقَ الْمَاءِ فَلْتَفْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا وَاجِدًا وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْحُمْاءِ غُسْلًا وَاجِدًا وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلًا وَاجِدًا وَتَوَضَّأُ بَيْنَهُنَّ ذَلِكَ.

(رواہ ابو حاتم و ترمذی رحمہما علیہ عن النبی عیسیٰ لما اشدت علیہا الغسل اتمرها ان تجتمع بین الغسلات)۔

ترجمہ: حضرت انس بن عُمیس سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! فاطمہ بنت ابی حبیش کو (پہلی مرتبہ) اتنی مدت سے استحاضہ آرہا ہے اس لئے وہ (خیال کر کے کہ شاید یہ بھی حیض کے حکم میں ہو) نماز نہیں پڑھ رہی ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ! یہ نماز کا چھوڑنا تو شیطان کا اثر ہے اسے چاہیے کہ ایک گھنٹہ میں پانی ڈال کر بیٹھ جائے جس وقت پانی پر زردی معلوم ہونے لگے تو ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل کرے، مغرب اور عشاء کے لئے ایک غسل کرے اور فجر کے لئے علیحدہ غسل کرے (اور جب ضرورت ہو تو) ان کے درمیان وضو کر لے۔" یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب فاطمہ کو (ہر نماز کے لئے) غسل کرنا دشوار معلوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو (ایک غسل سے) دو نمازیں اکٹھی پڑھنے کا حکم دیا۔

توضیح: مجلس: یعنی غسل کے لئے ایک ٹب کے پاس بیٹھ جائے یا ظہر کے آخری وقت اور عصر کے اول وقت کے معلوم کرنے کے لئے ایک ٹب کے پاس بیٹھ جائے۔

مرکن: ٹب اور بڑے تھال کو کہتے ہیں۔

رأت صفارۃ فوق الماء: یعنی سورج کا رنگ متغیر ہو جائے اور پانی کے اوپر سورج کے رنگ کا پیلا پن نمودار ہو جائے یعنی ظہر کا آخری وقت ہو جائے اور عصر کا اول وقت آجائے تو اس وقت غسل کر کے دونوں نمازیں اپنے اپنے اوقات میں ادا کرے۔ پہلے رنگ سے عصر کا کردہ وقت مراد نہیں بلکہ ظہر کا آخری وقت مراد ہے جس میں سورج ایک طرح متغیر ہو جاتا ہے۔

وتوضاً فیما بین ذلک: یعنی ظہر اور عصر کے لئے جب ایک غسل کرے تو عصر کے لئے اس غسل کے باوجود وضو بھی کرے اور جب مغرب اور عشاء کے لئے ایک غسل کرے تو عشاء کے لئے ایک وضو بھی کرے اور فجر کے لئے الگ ایک غسل کرے، مستحاضہ کے احکام غسل میں تخفیف کا یہ پہلا مرحلہ ہے اس کے بعد تخفیف وضو تک ہوگئی۔ شکر الحمد للہ کہ جلد اول مکمل ہوگئی۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم و تب علينا انک انت التواب الرحيم

وصلی اللہ علی نبیہ الکریم محمد و علی آلہ وصحبہ اجمعین

گزارش

قارئین کرام سے مودبانہ گزارش ہے
کہ اس جدید ایڈیشن میں حتی الوسع اغلاط کی تصحیح
کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے ادارہ
کو مطلع فرما کر ممنون و مشکور ہوں۔

فقط ناشر

0315-3788955

0321-3788955

0321-3788956

021-35470973